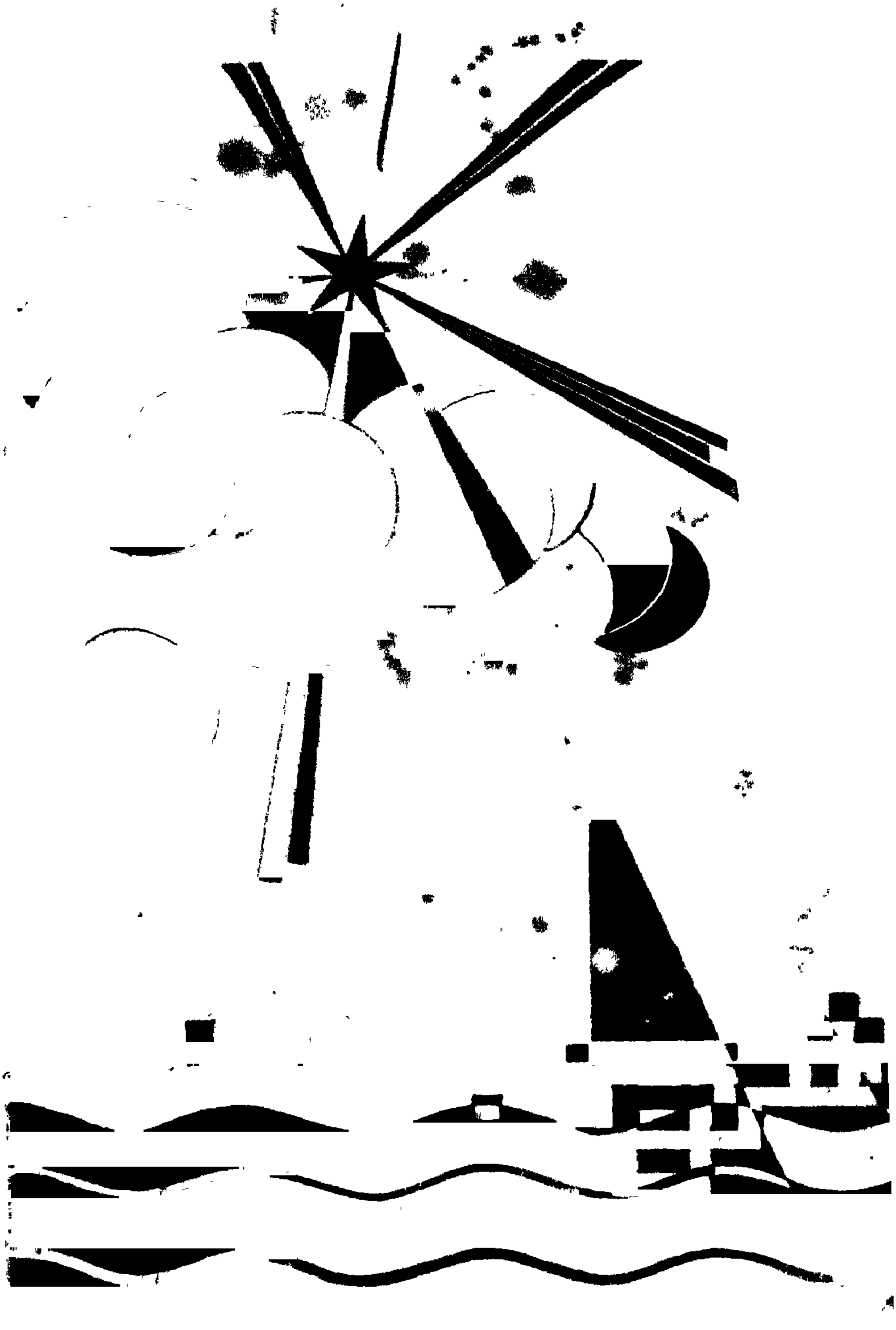
DUE DATE

Cl. No. ______________ Acc. No. ______________

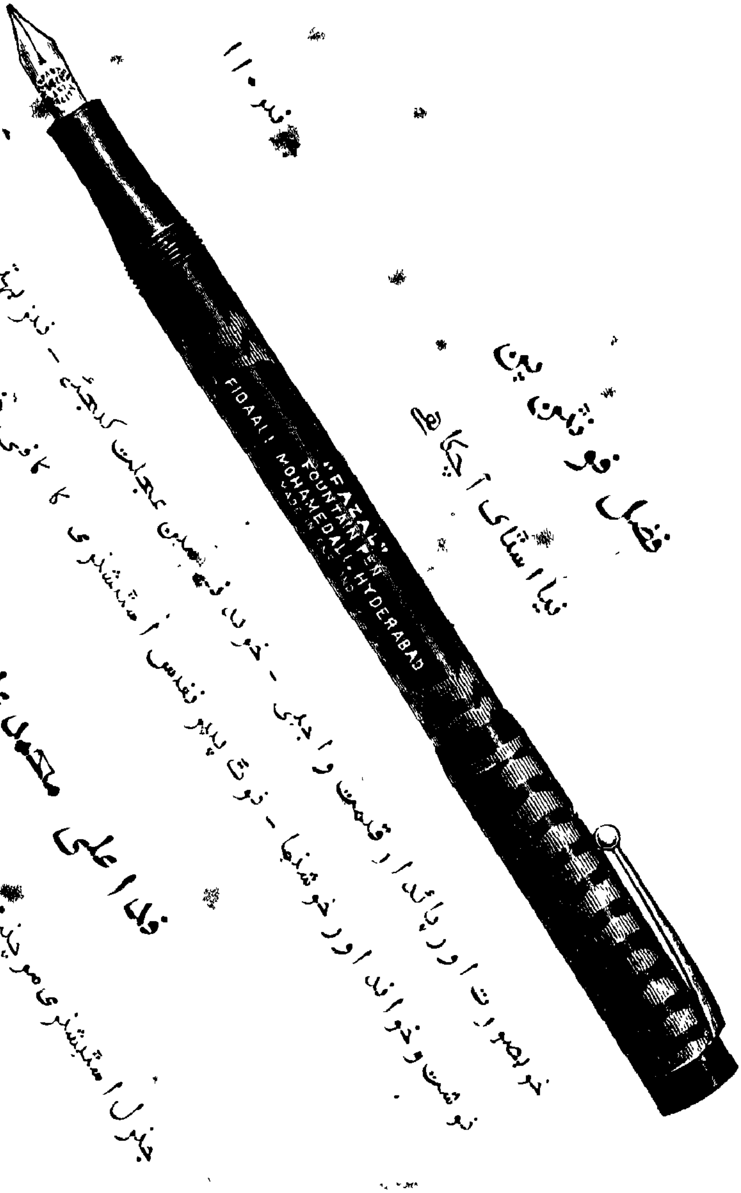
Late Fine Ordinary books **25 p.** per day, Text Book **Re. 1/-** per day, Over night book **Re. 1/-** per day.



نمبر ۱۰۱۱

فضل فونٹین پین

نیا اسٹاک آ گیا ہے



خوبصورت اور پائدار ار قیمت واجبی - خوب نفیس عجائبات کی جگہ - نئی تیز ساماں

نوعیت و خواند اور خوشنما - ذوق پیدا ہو نفیس اشتہاری کا کوئی ذخیرہ تیار رہے

فدا علی محمد علی

جنرل اشتہاری مرچنٹ پتھر گٹی حیدرآباد دکن

فون نمبر ۷۶۵

ضمیمہ ۷۱۲



PRINCESS NEILOPHER FARHAT BEGUM

شہاب

جلد (۳) ذی ۱۳۴۴ھ ف م نومبر ۱۹۳۴ عیسوی نمبر (۱)

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (عـــ۵)

(برقی پریس میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد شائع ہوا)

ذرّات

جنوری ۱۹۳۵ء میں بمقام الہ آباد "کل ہند جرائد" کی دوسری سالانہ نمائش کا ایک وسیع پیمانہ پر انتظام ہو رہا ہے ایک کتابچہ جس میں ہندوستان کے شائع ہونے والے جرائد کا تذکرہ ہے مفت تقسیم کرنے کیلئے تیار کیا جا رہا ہے بالحضوص تازہ جرائد کے نمبر اور ہندوستانی اور بیرونی جرائد کے پرانے نمبر بھی حتی الامکان نمائش میں رکھے جائینگے۔ کیا اچھا ہوتا کہ جامعہ عثمانیہ میں بھی "صحافت نویسی" کی تعلیم کا ایک شعبہ کھول دیا جاتا اور وہ تعلیم یافتہ حضرات جو ملازمت کی کاوش میں مصروف ہیں اس جانب توجہ کرکے اپنے لئے ذریعہ معاش تلاش کر لیتے۔ ضرورت ہے کارفرمایان جامعہ عثمانیہ اس خصوص میں توجہ فرمائیں۔

۶ آذر ۱۳۴۴ف روز یکشنبہ حیدرآباد کی تاریخ میں یادگار دن ہے کہ انتخابات عامہ بلدیہ عمل میں آیا۔ اور ہمیں ایک جدید قسم کی زندگی ملی ہے۔ صبح ۸ بجے سے شام کے چار تک تمام شہر میں عجیب ہما ہمی تھی اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہر ایک مصروف کار ہے۔

جامعہ ازہر مصر کی مجلس تعلیمی کے ارکان نے متفقہ طور پر یہ طے کیا ہے کہ آئندہ سال سے جامعہ ازہر میں شعبۂ وعظ و ارشاد کے طلباء کیلئے انگریزی اور بعض مشرقی چینی اور جاپانی حبشی زبانوں کی تعلیم لازمی قرار دی جائے گی۔

روس میں بھی یوم فردوسی شاندار پیمانہ پر منایا گیا اس جلسہ کے اہم خصوصیات یہ تھے کہ سویٹ گورنمنٹ کی مجلس تنقیدی کے سکرٹری موسیو نوکوز نے اس کی صدارت کی۔ گورنمنٹ ایران نے بھی اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت روانہ کی تھی۔

شہر انگورا کا نام عنقریب "مصطفےٰ کمال" رکھا جانیوالا ہے۔

اُردوئے معلّٰی

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی اے امرتسری (پنجاب)

سوز دل چھیڑتا ہے ساز زبان اُردو — ایک نغمہ ہے کہ آواز زبان اُردو

دہلی والوں پہ زباندانی نہیں کچھ موقوف — اور بھی جانتے ہیں راز زبان اُردو

گو نہیں اہل زبان منہ میں زباں رکھتے ہیں — ہم کو معلوم ہیں انداز زبان اُردو

والئی ملک دکن کچھ ہے "ولی" سے بڑھکر — ریختہ جس کا ہے آغاز زبان اُردو

زندگی قوم کی ہے زندہ زباں پر موقوف — اعلیٰ حضرت کا ہے اعجاز زبان اُردو

اختر دہر و ملک سب ہیں دعا میں شامل — آسماں پر بھی ہے پرواز زبان اُردو

لکھنو والے ہیں گو مرثیہ خوان اُردو — زندہ عثمان علی سے ہے زبان اُردو

شہ اقلیم سخن خسرو شیریں دہناں — والئی ملک دکن جان جہان اُردو

اعلیحضرت کا یہ اعجاز مسیحائی ہے — ورنہ مٹ جاتا زمانہ سے نشان اُردو

تھی کبھی مرکز اُردوئے معلیٰ دھلی — اب تو دکھن میں نظر آتی ہے شان اُردو

داغ دلی سے کھچے آئے بقول استاد — حیدرآباد میں ہے قدر زبان اُردو

یہ بھی منجملہ کرامات دکن ہے کہ یہاں — سب سے پہلے تھا "ولی" ریختہ خوان اُردو

ملک پنجاب میں سکہ ہے رواں اُردو کا — ہند کشور ہے تہ تیغ زبان اُردو

جنس مشرق ہے یہاں اور متاع مغرب — اندنوں گرم ہے بازار دکان اُردو

میر و مومن سا سخنور ہو کوئی سودا ہو — ذوق و غالب ہوں یہ ہیں اہل زبان اُردو

بات کرنے کا سلیقہ نہیں جس کو اختر
اہل پنجاب کہاں اور بیان اُردو

مسلمان عورتوں کا لباس

(جناب محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی)

رسالہ شہاب بابتہ آذر ۱۳۴۶ف میں مولوی حافظ محمد مظہر صاحب کا قابل قدر مضمون "ہندوستان کی مسلمان عورتوں کا لباس" کے عنوان سے شائع ہوا ہے مولوی صاحب نے بلحاظ یکسانیت، ارتقاء تمدن، سہولت و آسائش، خوش نمائی و زیبائش، سرپرستی صنعت ملک، کفایت و پائیداری عورتوں کو پاجامہ اور ڈوپٹہ کے استعمال کرنے کی رائے دی ہے۔

آج سے تقریباً دو سال قبل راقم کا ایک مضمون "ہمارے خواتین کا لباس" کے عنوان سے "ساقی دہلی" میں شائع ہوا ہے جس نے ساڑی کے متعلق رائے دی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اپنے دلائل بیان کریں مولوی صاحب کے پیش کردہ اصول پر اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ بیشک مشرق سے مغرب تک مسلمانوں کی بود و باش ہے مگر جس طرح عورتوں کے لباس میں یکسانیت نہیں ہے اسی طرح مردوں کے لباس کی حالت ہے آج مسلمانوں کا بڑا حصہ یورپین لباس کا عادی ہے مگر پھر بھی ان کے لباس میں یکسانیت نہیں ہے جب مردوں کے لباس کی یہ حالت ہے تو عورتوں کو یکسانیت کے لحاظ سے اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ پائجامہ اور ڈوپٹہ کا استعمال کریں علاوہ ازیں آج ٹرکی۔ ایران۔ عراق۔ حجاز اور مصر میں بھی لباس کی یکسانیت باقی نہیں ہے یورپین لباس کا استعمال ہو رہا ہے تو پھر یکسانیت کا خیال کہاں باقی رہتا ہے۔

تمدن کے لوازم میں بیشک بغیر سئے ہوئے لباس سے سئے ہوئے لباس کو ترجیح ہے مگر بغیر سئے ہوئے لباس میں بھی مدارج ہیں ایک کپڑا لپیٹ لینا اور آج کل کی طرح ساڑی کا پہننا بڑا فرق رکھتا ہے اور پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انتہائی تمدن اور جہالت کا ابتدائی دور دائرہ کی شکل میں ملجاتے ہیں مثلاً تمدن کے پہلے برہنگی تھی اور تمدن کے ساتھ ساتھ لباس میں زیادتی ہوتی گئی مگر اب انتہائی تمدن کے زمانہ میں برہنگی کی طرف قدم جارہا ہے خصوصاً عورتوں کا حسن اس وقت ہی نمایاں ہوتا ہے

جب کہ ان کے جسم کا ایک حصہ لباس کی منت پذیری سے بے نیاز ہوتا ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پائجامہ پہننا تمدن کی دلیل ہے اور ساڑی میں تمدن کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔

سہولت اور آسائش کے جو اسباب حافظ صاحب نے لکھے ہیں وہ پائجامہ اور ڈوپٹہ سے زیادہ ساڑی میں حاصل ہو سکتے ہیں گرمی اور خلوت میں جو امور ڈوپٹہ کے نکالنے سے حاصل ہو سکتے ہیں وہی سہولت اور آرام ساڑی کے اتارنے اور "پیٹی کوٹ" میں حاصل ہو سکتے ہیں اور عورت ہرگز عریاں نہیں ہو سکتی بے ستری کا موقع سوتے وقت اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ "چڈی" کا استعمال نہ ہو آج کل ساڑی کے ساتھ ساتھ "پیٹی کوٹ" اور "چڈی" کا استعمال عام طور سے ہوتا ہے جس کے باعث بے ستری کا کوئی شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

خوش نمائی اور زیب و زینت ہر شخص کے خیال میں علیحدہ علیحدہ ہے کوئی ساڑی اور جمپر کو خوش نمائی خیال کرتا ہے کوئی پائجامہ اور ڈوپٹہ کو۔ اس لئے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

آج کل ساڑی اور قمیص یا جمپر ایک ہی رنگ بلکہ ایک ہی کپڑے کے بنائے جاتے ہیں جس کے باعث خوش نمائی زیادہ ہو جاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ دیگر لباس بھی اسی رنگ کا ہوتا ہے یہ صورت پاجامہ اور ڈوپٹہ میں حاصل نہیں ہو سکتی ان وجوہ سے "خوش نمائی" ساڑی میں زیادہ ہے نہ کہ پائجامہ اور ڈوپٹہ میں۔

ملکی صنعت و حرفت کی قدر جس طرح پائجامہ اور ڈوپٹہ میں ہو سکتی ہے اسی طرح ساڑی میں ہو سکتی ہے اس لئے اس اصول پر زیادہ صراحت کی ضرورت نہیں ہے ریشمی کپڑا جو ڈوپٹہ کیلئے کار آمد ہو سکتا ہے وہی ساڑی کیلئے کام آسکتا ہے اس کے علاوہ نارائن پیٹھ، پٹن وغیرہ کے ریشمی اور زربن ساڑیاں ملکی صنعت و حرفت کو ہر طرح فروغ دے سکتی ہیں۔

کفایت اور پائیداری بھی ساڑی میں زیادہ ہے پائجامہ کسی وقت بھی نکالا نہیں جا سکتا اس لئے زیادہ استعمال سے جلد تبدیلی کی ضرورت ہو جاتی ہے اس کے برخلاف ساڑی سوتے وقت علیحدہ کی جا سکتی ہے اور "پٹی کوٹ" میں آرام کر سکتے ہیں اور یہ پیوند لگا ہوا بھی استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ ساڑی کے اندر ہونے سے نظر نہیں آتا اور پھر پائجامہ کے ساتھ قمیص یا کرتا طویل ہونا ضروری ہے اس کے برخلاف ساڑی میں اس کی ضرورت نہیں جمپر کا طول زیادہ نہیں ہوتا غرض اس طرح کفایت بھی ساڑی میں ہے

نہ کہ پائجامہ اور ڈوپٹہ میں۔

اسی طرح مولوی صاحب نے جن اصول کے تحت پائجامہ اور ڈوپٹہ کی رائے دی ہے وہ قابل لحاظ نہیں ہیں اس کے برخلاف جو امور ساڑی کے استعمال میں قابل لحاظ ہیں ان کی یہاں صراحت کیجاتی ہے جن سے ہمارے دعوی کی پوری تائید ہوتی ہے۔

۱۔ آج کل تمام دنیا میں مسئلہ زر خاص اہمیت رکھتا ہے اور ہر طرف روپیہ کی قلت ہے ایسی صورت میں وہی لباس زیادہ مفید از زیادہ سود مند ہو سکتا ہے جو بہ کفایت تیار ہو جائے اس اصول کے تحت اگر ہم حساب کریں مثلاً

پائجامہ	تین روپیہ
کرتا جو پائجامہ کے لحاظ سے طویل ہونا چاہئے۔	ایک روپیہ
ڈوپٹہ	تین روپیہ
جملہ	سات روپیہ

اس کے برخلاف

ساڑی	تین روپیہ
کرتا یا قمیص	آٹھ آنے
پٹی کوٹ اور چڈی	ایک روپیہ آٹھ آنے
جملہ	پانچ روپیہ

ظاہر ہے وہی لباس مفید ہوگا جو کم خرچ ہو اس لئے ساڑی کو ترجیح دینی لازمی ہے۔

۲۔ ستر پوشی ساڑی پیٹی کوٹ اور چڈی میں زیادہ ہوتی ہے خواہ خلوت ہو یا جلوت جس طرح ساڑی مفید ہے اس طرح ڈوپٹہ اور پائجامہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ زیبا دز ہینت اور خوبصورتی و خوش نمائی ہر شخص کے خیال سے علیحدہ ہے مگر پھر بھی ریشمی ساڑی اور جمپر میں کوئی عورت ملبوس ہو اور جمپر بلا آستین کا ہو اور گداز جسم کے سڈول ہاتھ پورے برہنہ

ہوں تو عورت کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اس طرح ساڑی میں ہی خوبصورتی زیادہ ہوتی ہے۔

۴ - لباس تمدن کے لوازمات سے ہے مذہب سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے ہمارے ہندوستان میں بسنے والی دوسری قومیں ہندو، پارسی، اور عیسائی یہودی سب ہی ساڑی میں ملبوس ہوتی ہیں۔ اس طرح ساڑی گویا ہندوستان کا قومی لباس ہے اس لئے مسلمان عورتوں کو بھی اپنی دوسری بہنوں کا ساتھ دینا ضروری ہے جب تک ایک ملک میں رہنے والی قوم ایک زبان نہ بولے اور ایک تمدن نہ ہو کوئی ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

مذہب اسلام ساڑی کا مخالف اور پائجامہ اور ڈوپٹہ کی طرفداری نہیں کرتا اس لئے ہم کو تمدن خصوصًا لباس میں اپنے ملک کی پیروی کرنی چاہئے۔

غزل

(جناب فانی بدایونی)

اداہیں آگئیں گوشے بتاں کی
زمیں تک ہے رسائی آسماں کی

زباں کٹتی ہے ذکر آشیاں پر
تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی

امید مہر ہے ایمان اپنا
قسم ہے اس دل نامہرباں کی

یہ دل ہے یادگار ناوک ناز
نشانی ہے یہ زخم بے نشاں کی

تو ید ربط ہے مہر جو رلیکن!
کہاں سے لاؤں طاقت امتحاں کی

میری تربت کے سناٹے میں ابتک
صدائیں گونجتی ہیں الاماں کی

حرم میں آہی نکلے ہیں تو فانی!
یہ کیا کہئے کہ نیت تھی کہاں کی

غزل

(جناب شرف الدین صاحب ساقیؔ وکیل)

کسی جا نقش ہستی کو ملا رنگ بقا مجھ سے
کہیں خمیازہ کش ہے جوہر عرض فنا مجھ سے

وہ ہوں درد آشنا وابستہ ہے ہر اک بلا مجھ سے
وہ دیوانہ ہوں میں اے دل کہ ڈرتی ہے قضا مجھ سے

وہ عاشق ہوں کہ جبتک ربط جسم و جان باقی ہے
میری محرومیاں ہونے نہ پائینگی جدا مجھ سے

چھپے وہ دل میں آ کر سن چکے جب مدعا میرا
تمنا نے میری ایسا پشیماں کر دیا مجھ سے

کسی کے عشق میں دل سے نہ کیونکر جان دوں اپنی
حیات جاوداں دینے کو کہتی ہے قضا مجھ سے

سواد شام غربت ہوں مگر اے تیرہ سامانی!
وطن کی یاد بھی ہونے لگی ہے اب جدا مجھ سے

بنایا میرے ہونے نے کسی کے حسن کو خود بین
مذاق عشق کو اک رتبۂ عالی ملا مجھ سے

گرہ ایسی لگی تھی عشق تھا اک راز سربستہ
ہوا جب دست حسرت شل تو یہ عقدہ کھلا مجھ سے

تلاش رہنما سے ہاتھ دھو بیٹھوں ابھی اے خضر
فسانہ اپنے مٹنے کا جو کہدے نقش پا مجھ سے

بنیگی جان پر اس کارزار شوق و حرماں میں
اگرچہ بن جائیگا میرا دل بے مدعا مجھ سے

نہ کیوں ہو خواب راحت خواب نوشین اجل میرا
کہ بعد مرگ بھی باقی رہا نام وفا مجھ سے

سکون آمیز بیتابی سے نکلی جان دم آخر
نگاہ یار نے جس دم کیا عذر جفا مجھ سے!

سبکروی ہوا ہے نگہت گل سے میری بلبل
اٹھیگا خاک ہو کر بھی نہ احسان صبا مجھ سے

شکیب یاس سے نکلا تو آخر مدعا دل کا!
میری امید کو کس بات کا ہوگا گلا مجھ سے

رہا اس عشق سے خون دو عالم میری گردن پر
نگاہ یار کو باقی ہے لینا خون بہا مجھ سے

حریم دل میں تجھ کو جلوہ گر دیکھوں گا اے ساقیؔ
جدا ہو جائے گا جس دن خیال ماسوا مجھ سے

بُت سومنات

(جناب ہادی جعفری صاحب)

محمود غزنوی نے ہندوستان پر جتنے حملے کئے ہیں اون کی تعداد سترا ہے اور ان حملوں میں سومنات کا وہ عظیم الشان حملہ تھا جس سے غنیمت میں کثیر مال و دولت کی توقع تھی اس امید پر وہ اپنی کثیر فوج ظفر موج کو لیکر غزنی سے کوچ کرتا ہے جس عجلت سے یہ کوچ عمل میں آیا ہے اوس سے تو اوس کی فوج ہی آگاہ ہے سومنات پہنچکر محمود خاموش ہے فوج میں ایک بےچینی حملہ کیلئے پھیل گئی ہے مگر کسی کی جراءت نہیں ہوتی کہ تامل کا سبب دریافت کریں۔ ایاز جو محمود کی بارگاہ میں زیادہ دخیل ہے ایک دن جب کہ محمود تن تنہا بیٹھا ہے آداب شاہی بجالا کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔ محمود ایاز کو خاموش کھڑا دیکھکر کہتا ہے "ایاز خاموش کیوں ہو؟"

"جہاں پناہ اجازت ہو تو کچھ عرض کروں!"

"ہاں! کہو جو کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جہاں پناہ فوج میں بےچینی پیدا ہو گئی ہے"

"میں اس کو محسوس کر رہا ہوں"

پھر حضور حملہ میں تاخیر کیوں اندیشہ ہے کہ اس عرصہ میں کہیں دشمن اور اضافہ نہ کرلیں"۔

مگر اطمینان رکھو کہ ہندوستانی سپاہ ہمیں کبھی شکست نہیں دےسکتی۔

جانباز سپاہیوں سے یہی توقع ہے مگر آپ تامل کس لئے فرما رہے ہیں؟

چاہتا ہوں کہ حملہ کردوں مگر کوئی قوت مجھے اندرونی طور پر اس حملہ سے روک رہی ہے۔

حضور ایسے موقع پر توقف اندیشے سے خالی نہیں جس قدر جلد ہو سکے حملہ ہو جانا چاہئے۔

تم ذہنے کیوں [illegible] اپنا دل بہلاؤ۔ ان خیالات کو دل سے دور کرو۔ جب وقت آئیگا۔ حملہ بھی ہو جائیگا۔

جہاں پناہ کی جیسی خوشی۔ یہ کہکر ایاز باہر آگیا۔

دوسرے روز محمود گھوڑے پر سوار تفریح کیلئے نکلا اور کیمپ سے اس قدر دور ہو گیا کہ سامنے سومنات کے سنہرے کلس پر نظر پڑی دل میں کہنے لگا عنقریب اس پر حملہ ہوگا اور یہ میرے قبضہ اقتدار میں آجائے گا۔

اسی قبیل کے خیالات میں محو جا رہا تھا کہ ایک جانب سے کسی کی دردناک چیخ سنائی دی دیکھتا ہے کہ ایک بھیڑیہ کسی چیز کو اٹھائے لئے جارہا ہے محمود نے اس کا تعاقب کیا بھیڑیہ اپنا شکار زمین پر رکھکر بھاگ گیا جب قریب پہنچا تو اس کو ایک خوبصورت بچہ نظر آیا فوراً گود میں اٹھا لیا بچہ کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اوس کو صاف کیا سینہ سے لگاتے ہوئے پریشان کھڑا تھا کہ کیا کیا جائے دوسری جانب سے ایک عورت درختوں کو ہٹاتا یا نہ ہٹاتی ہوئی نکل رہی ہے اور محمود کو دیکھکر سہم گئی محمود نے بچہ کو دکہلایا وہ افتاں و خیزاں اس کی جانب بڑھی اور مادرانہ جوش میں بچہ کو محمود کے ہاتھوں سے لیکر بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی پھر محمود کی جانب دیکھکر کہنے لگی۔

"ایشور اس کا اجر خیر دیگا کہ تم نے ایک غریب کے لال کو بھیڑیہ کے منھ سے بچایا ہے خدا تمہاری تمناؤں کو پورا کرے جس کام کیلئے نکلے ہو اوس میں کامیابی نصیب ہو"

محمود نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور کہنے لگا "خدایا تجھ کو اس ماں کی محبت کا واسطہ کہ میں اس مہم میں کامیاب رہوں"

پھر اس حسین ہندو عورت نے کہا۔ بہادر نوجوان تمہارا نام کیا ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو "میرا نام اور وطن نہ پوچھو جس کو سن کر شاید تمہیں صدمہ ہو"

صدمہ! آخر ہوگا کس لئے میں جاننا چاہتی ہوں کہ میرا محسن کون ہے؟ جس نے میرے معصوم کی جان بچائی ہے اگر تم نہ ہوتے تو آہ میرا بچہ کبھی کا مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہوگیا ہوتا۔

خدا نے تمہارے بچہ کو بچایا ہے اس میں میرا احسان ہی کونسا ہے۔

مگر پھر بھی التجا ہے کہ آپ اپنا نام بتائیں میں آپ کو آپ ہی کے دھرم کی سوگند دیتی ہوں۔

اچھا تم جب اس قدر مصر ہو تو یہ بھی سن لو میں محمود غزنوی ہوں اور سومنات کے مندر پر عنقریب حملہ کرنیوالا ہوں۔

یہ سُن کر وہ عورت بے اختیار چونک اٹھی دور جا کھڑی ہوئی محمود کو غور سے دیکھنے لگی۔ کیا تم ہی محمود غزنوی ہو؟ اتنا کہکر خاموش ہوگئی پھر کہنے لگی تم ہمارے مندر کو توڑنے آئے ہو؟ مگر تم نے تو میرے بچہ کو بچایا ہے یہ احسان قابل فراموش نہیں۔

محمود عورت کو دیکھتا رہا وہ پریشان تھی پھر کہنے لگی اب مجھے جانا چاہئیے کیونکہ "وہ" بیمار ہے اور میرا انتظار

کر رہا ہوگا" وہ" کون؟ شرم سے گردن جھکا کر میرا شوہر اس بچہ کا باپ۔
جی ہاں سخت علیل ہے میں یہاں آشنان کرنے آئی تھی اور یہ واقعہ پیش آیا۔ یہ کہکر عورت روانہ ہوگئی۔

(۲)

کملا۔ کملا!
ہاں۔ سوامی۔
بڑی دیر لگائی۔ میں کب سے منتظر ہوں۔
سوامی۔ ایشور نے بڑی کرپا کی۔
کیوں کملا ہوا کیا تھا۔
پران۔ موہنا کو ایک بھیڑیہ اوٹھا لیگیا مگر ایک بہادر کا احسان تھا کہ وہ موت سے بچگئی۔
وہ کون بہادر تھا۔؟
ایک مسلمان
اس کا نام۔
محمود غزنوی۔
محمود غزنوی! آہ کملا بہتر ہوتا کہ اس احسان کے بدلے جو مسلمان نے ہم پر کیا ہے موہنا بھیڑیہ کی غذا بنجاتی۔
نا تھ وہ یہاں مندر پر حملہ کرنے آیا ہے۔
لاؤ میری تلوار۔ میں جاتا ہوں۔ یہ کہکر وہ بستر بیماری سے اوٹھنے لگا۔ ایک راجپوت یوں پڑا ہوا اپنے ملک کی بربادی دیکھ نہیں سکتا۔
مگر دیکھئے۔ . . . آپ ناتوان ہیں۔ ایسا نہ کرنا۔ بیماری اور بڑھجائیگی یہ کہکر اوس کو بستر پر لٹا دیا۔
بیمار پر اس کیفیت سے اس قدر اثر ہوا کہ وہ بیہوش ہوگیا جب ہوش آیا تو کملا کو آواز دی جاؤ پنڈت کو بلا لاؤ۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جب برہمن آیا تو بیمار نے اپنی نحیف اور ناتوان آواز میں کہا۔" مہاراج میرا وقت بالکل قریب ہے آرزو تھی کہ سومنات کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دوں مگر ایشور کو میری خدمت منظور نہیں ہے البتہ میرا ایک بچہ ہے اس کو تم جیسے بزرگ کی حفاظت میں چھوڑتا ہوں تاکہ آئندہ چل کر

مذہب کی خدمت کر سکے"۔

"نہیں تم گھبراؤ نہیں اگر تمہاری استری آج رات کو کچھ نذرانہ لیکر مندر میں آئے اور دعا مانگے تو یقیناً انہیں صحت ہو جائیگی۔ برہمن نے کہا۔

بیمار پر پھر غشی طاری ہو گئی برہمن نے عورت کو مخاطب کر کے کہا "آج رات ضرور سونا لیکر آنا اور اپنے پتی کیلئے دعا کرنا۔ خدائے سومنات غریبوں کی دعا ضرور سنتا ہے یہ کہکر برہمن چلا گیا۔

شام ہوتے ہی محبت کیش غمزدہ عورت شوہر کے پاس سے اٹھی اور ایک تھال میں کچھ سونا اور پھول لیکر سومنات کے مندر کیطرف چلی جبکہ اوس کا دل کانپ رہا تھا جب وہ مندر میں داخل ہوئی تو اس کو ایسے فرسودہ قصے یاد آنے لگے جس کو سن کر عورتیں مندر میں جانے سے گھبراتی ہیں لیکن کیا کرتی شوہر کو موت سے بچانا تھا۔

عورت نے پوجا کیا۔ سونا مورتی کے سامنے رکھدیا اور سر کے بل گر کر کہنے لگی :۔" برہما دیو میرے پتی کو بچائیو! جس سے میری امیدیں وابستہ ہیں جو عورت کیلئے سنگار ہے ورنہ ستی ہونا تو میرے قسمت میں لکھا ہی ہے ابھی اس کی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مندر میں ایک عجیب و غریب آواز گونجی جس کو سن کر وہ چونک پڑی سر اٹھا کر دیکھا تو وہی برہمن سامنے کھڑا ہے۔

" ایشور تم سے خوش ہیں۔ تمہاری دعا قبول ہو گئی۔ آج آدھی رات کو تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ گھبرانا نہیں۔

کیا ایشور منش کے لباس میں آئیں گے؟

ہاں وہ اس پر قادر ہیں جس طرح چاہیں آسکتے ہیں انہیں کون روکنے والا ہے وہ مختار کل ہیں آج رات تم انہیں ایک برہمن کی ہیئت میں دیکھو گی کس قدر احسان ہے ان کا تم پر کہ وہ تم سے باتیں کر کے تسکین پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ مژدہ سنا کر برہمن رخصت ہو گیا۔

عورت آدھی رات تک مندر ہی میں بیٹھی رہی جب ہر طرف کامل سکوت ہو گیا تو اوس کو عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ دیوی کی پرستار لڑکیاں مصروف رقص ہیں تھوڑی دیر بعد ایک چیخ سنائی دی اور مورتی سے آواز آئی "کہ سومنات کا خدا تجھ سے ملنا چاہتا ہے یہ آواز سن کر وہ حیران تھی۔ اوس کو یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی یہ آواز کہیں سنی ہے۔ پھر آواز آئی "آ۔ کیوں دیر لگا رہی ہے؟" جہاں وہ

اپنے کرم سے سرفراز فرماتا ہے وہاں وہ اپنے بندوں سے اطاعت کا بھی خواہاں ہے " اب اس نے پہچان لیا کہ یہ آواز برہمن کی ہے غصہ میں کہنے لگی۔ بدمعاش۔ دغاباز۔ تم دھوکہ دینا چاہتے ہو مگر یہ یقین رکھو کہ میں تمہارے فریب میں آنیوالی نہیں تمہارے راز کا پردہ چاک ہوگیا۔

نہایت غصہ کی حالت میں وہ مندر سے نکل کر گھر پہنچی دیکھتی کیا ہے کہ اس اثنا میں اس کا شوہر ہمیشہ کیلئے رخصت ہوچکا ہے۔

(۳)

عزیز و اقارب جمع ہوگئے عورتیں بال کھولے لاش پر بین کر رہی ہیں۔ مگر کملا خاموش تھی آنکھیں لاش پر جمی ہوتی ہیں مگر پلک پر کوئی آنسو نہیں برہمن بھی آگیا اوس نے تسلی آمیز باتیں کیں یہ بیخبر تھی اوس نے وعدہ کیا کہ اوس کو آگ میں جلنے سے بچائیگا۔

بیٹی اطمینان رکھو میں تم کو ستی ہونے سے بچاؤں گا۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے ستی ہونا چاہئے۔

نہیں۔ خدا اپنے اکثر بندوں کو ایسی کڑی آزمائشوں سے معاف بھی کر دیتا ہے۔

وہ کس طرح؟

یہی کہ دنیا میں خدا کے جو نائب ہیں یعنی برہمن کی اطاعت کرو۔ اون سے محبت کرو۔ چلو تمہیں ایک ایسی جگہ پہنچاؤں جہاں کسی قسم کا رنج و غم نہ ہوگا۔

براہ مہربانی آپ تشریف لیجائیں میں ان الفاظ کے سننے کی متحمل نہیں۔

خواہ مخواہ موت کو کیوں دعوت دے رہی ہو؟

موت ایک نوجوان شوہر کے بغیر کہیں بہتر ہے بہ نسبت ایک فریب کار برہمن کے ساتھ رہنے سے۔

برہمن اس کو خونی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

میت کے پورے رسومات پورے کئے گئے اب کسی میں جرات نہ تھی کہ وہ بڑھے اور ستی کے رسومات ادا کرے پرستار شوہر کملا خود آگے بڑھتی ہے اور رسومات ادا کرتی ہے ہاتھوں میں مہندی لگاتی۔ زیورات پہنے۔ غرض وہ بالکل تیار ہوگئی زور شور سے باجے بجنے لگے۔ برہمنوں نے جوش آمیز دعائیں شروع کیں اور اس کو

نشہ آمیز چیز پلا دی گئی وہی برہمن پھر آگے آیا اور اس کو ستی سے روکنے کی کوشش کی۔ لکڑیوں کا انبار لگا ہوا تھا اوس پر چڑھ گئی۔ شوہر کی لاش کو سینہ سے لپٹا لیا پھر مجمع کو مخاطب کر کے کہا "میرا بچہ کہاں ہے؟" لوگوں لے بچہ اوس کی گود میں دیدیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور تمام مجمع پر رقت طاری تھی بچہ کو الوداعی بوسہ دے کر عزیزوں کے حوالہ کر دیا جسم کے جواہرات اقربا میں تقسیم کر دے اور کہا لکڑیوں میں آگ لگا دی جائے دو برہمنوں نے لکڑیوں میں آگ لگا دی اس پر رفتہ رفتہ ایک بیخودی طاری ہونے لگی تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ اس کو کوئی اٹھا کر لیجا رہا ہے وہ خیال کر رہی تھی کہ اپنے شوہر کے ساتھ آسمان پر جا رہی ہے

(۴)

جس وقت چتا میں آگ لگا دیگئی ہے اوسی وقت محمود نے سومنات پر حملہ کیا لوگ منتشر ہو گئے بعض تو مندر میں پناہ لینے بھاگے اور بعض فصیل پر چڑھ کر دشمنوں کی مدافعت میں مصروف تھے محمود نے حکم دیا کہ فصیل پر سیڑھی لگا دی جائے سپاہی نہایت ہمت اور جرأت سے چڑھنے لگے مگر سومنات والوں نے ہر مرتبہ اونہیں نیچے گرا دیا۔ ہندو نہایت دلاوری سے مدافعت کر رہے تھے باوجود انتہائی کوشش کے محمود کو کامیابی مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ دوسرے دن محمود نے پھر حملہ کیا مگر پھر بھی ناکام رہا یہ حملے مسلسل کئی دنوں تک ہوتے رہے ہندوں نے مندر کو بچانے میں جان لڑا دی۔ جب حملوں کا کئی دنوں تک یہی حال رہا تو ہندوؤں نے شہر سے باہر آ کر کھلے میدان میں داد شجاعت دینی شروع کی مسلمان پیچھے ہٹتے گئے ہندو نہایت مسرور تھے کہ میدان مار لیا مسلمانوں کے قدم عنقریب میدان جنگ سے اکھڑنے والے تھے کہ محمود نے اللہ اکبر کے نعرہ شگاف نعرے مسلمانوں میں ایک جوش پیدا کر دیا اور پوری طاقت سے ایک فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ دوسرے حملہ میں وہ شہر کے اندر تھا "زن بکیر" کا عمل جاری ہو گیا۔

جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو وہ افسران فوج کے ساتھ سومنات کے معائنہ کیلئے مندر میں داخل ہوا۔ محمود اس رت کو بھولا نہ تھا جس کے بچہ کو اوس نے بھیڑیہ سے بچایا تھا مندر میں پہنچتے ہی لوگوں سے دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ ستی ہو گئی۔ محمود نے نہایت برافروختہ ہو کر پوچھا کہ کس نے اجازت دی؟ چند برہمنوں نے آگے بڑھ کر کہا "ہم نے"

کیوں؟
اس لیئے کہ وہ ایک نہایت اچھی جگہ پہنچگئی ہے جہاں آرام سے رہیگی۔ دنیوی جھگڑوں سے نجات پائیگی۔ اچھا توتم بھی اسی کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ کہکر اوس نے برہمنوں کو قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ بڑے برہمن کی تلاش کیگئی۔ مگر وہ غائب تھا پھر بچہ کی نسبت پوچھا۔ بچہ حاضر کیا گیا۔ محمود نے بچہ کو گود میں لیکر پیار کیا۔ سینہ سے لپٹا لیا۔ بچہ بھی اوس سے مانوس دکھائی دیتا تھا محمود نے اس کی پرورش اپنے ذمہ لی۔
ہندوؤں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں میں پرورش پائے۔

(۵)

جب عورت کو ہوش آیا تو اوس نے اپنے آپ کو ایک تاریک مقام میں پایا۔ جہاں کچھ سوجھائی نہ دیتا تھا شوہر کی لاش کی بہت کچھ تلاش کی مگر پتہ نہ چلا۔ اسی اثنا میں کوئی شے اس کے جانب بڑھتی ہوئی سی دکھائی دی آواز آئی "آ کہ خدائے سومناتھ تجھ سے بغلگیر ہونا چاہتا ہے جب کہ تو علائق دنیوی سے پاک ہوچکی ہے وہ پریشان ہو گئی اور پوچھا کہ "میں کہاں ہوں"؟ جواب ملا۔ "خدا کے گھر میں! ایشور کے محل میں!"
وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھنے لگی پھر آواز آئی دیر نہ کر عورت نے برہمن کی آواز پہچان لی۔ اور کہا فریبی انسان آخر یہ کس دن کیلیئے۔ برہمن نے دیکھا کہ اب کوئی حربہ کارآمد نہیں ہوسکتا وہ خاموش پیچھے ہٹ گیا۔ عورت ان پریشان واقعات پر غور کر رہی ہے کہ ان کا مدعا کیا ہے سامنے سے دو عورتیں نمودار ہوئیں ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ دونوں قریب آئیں اور کہا "ہمارے ساتھ چلو!" "تم مجھے کہاں لے چلوگی؟" "جہاں ہم چاہیں" چنانچہ کھینچتے ہوئے لے گئیں۔ اور ایک دروازہ کے پاس پہنچ کر کہا "اس میں چلی جاؤ!" "میں کہاں پہنچوں گی؟" "تم سومنات کے سینہ میں ہوگی" اس کو متامل دیکھ کر زبردستی اندر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔ دیکھتی ہے تو سامنے وہی برہمن موجود ہے جو کہہ رہا ہے "اب کہاں جاؤ گی؟"
خاموش رہو میں ایسی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والی نہیں۔ ایشور یہاں بھی اپنے بندوں کا

بان ہے"۔

"اُوف۔ اس قدر جرأت۔ آخر میں بھی تو دیکھوں تمہیں میرے پنجہ سے کون رہائی دلا سکتا ہے"
ہکر وہ گھنٹہ بجانا چاہتا تھا کہ باہر سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ برہمن کانپ اٹھا کیونکہ یہ آواز
طان محمود غزنوی کی تھی۔ جو اپنے سپاہیوں سے کہہ رہا تھا کہ "اس کو توڑ دو"۔ مندر میں ایک
رام مچا ہوا ہے۔ بعض برہمنوں نے آگے بڑھکر عرض کیا کہ آپ جتنی دولت چاہیں ہم سے لیں مگر
س بت کو نہ توڑیں"۔

محمود نے جواب دیا: "میں بت شکن کہلانا چاہتا ہوں نہ کہ بت فروش" یہ گفتگو سن کر
لا مسرور ہو رہی تھی چنانچہ جب بت توڑا گیا تو اوس کے سینہ سے "کملا" برآمد ہوئی۔ اور فوراً محمود
قدموں پر گر کر عرض کرنے لگی۔ "اس سے پہلے بھیڑیہ سے میرے بچہ کو بچا کر آپ نے احسان
م فرمایا تھا اور آج میری "عصمت" بچا کر مجھے زیر بار احسانات فرمایا ہے"۔ چنانچہ برہمن کو بھی
نکالا گیا اور محمود کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

آئندہ یہی کملا محمود غزنوی کی چہیتی ملکہ کہلانے لگی۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

محمود سومنا تھ گیا تھا کہ وہاں سے بیشمار زر و جواہر ساتھ لائے۔ مگر قدرت کا یہ کس قدر حیرت انگیز
م ہے کہ سومنات کے مال غنیمت میں اس سے زیادہ "قیمتی ہیرا" اس کو نہ مل سکا۔
لطف دیکھئے کہ گیا تو تھا "مندر" توڑنے کیلئے لیکن اپنے ساتھ ایک "بت" لے کر غزنی واپس

بُت شکن محمود تھا "بُت" کا پجاری ہو گیا۔

بس آئندہ اعانت منظور نہ ہو وہ مطلع کریں وی پی واپس کر کے دفتر کو نقصان تو نہ پہنچائیے۔

دریچہ

(جناب د ج ، نقوی صاحبہ)

لرزتا ہے میرا دل ۔ زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہر خار بیاباں پر

ایک غریب مزدور کے رہائشی مکان کا اندرونی حصہ جس کو تاریکی و عدم گنجائش کے لحاظ سے اگر قید خانہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا ـــــ اس میں صرف ایک دریچہ ہے جس میں سے آسمان نظر آتا ہے سیدھے جانب ایک دروازہ ۔ ایک گوشہ میں چند ظروف رکھے ہوئے ہیں ایک عورت جو اس مزدور پیشہ مرد کی بیوی ہے بیٹھی کچھ پکا رہی ہے دو بچے (بھائی بہن) آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے مصروف کلام ہیں۔

شنکر ۔ موہنا ! تم نے کبھی ابر دیکھا ہے ؟ (موہنا مارے خوشی کے تالیاں بجانے لگی)
وہ دیکھو ابر ایک گھوڑا ہے اور حقیقت میں وہ گھوڑا ہی ہے۔

موہنا ۔ مگر وہ لنگڑا ہے ۔ وہ تو تیز بھاگ ہی نہیں سکتا۔

شنکر ۔ وہ لنگڑا تو نہیں ۔ ہاں بڈھا ہے ۔

موہنا ۔ کیوں شنکر ابر بالکل داداجان کی داڑھی کی طرح سفید ہے نا ۔ سفید ۔ سفید ۔ بالکل سفید ۔ (ہنستے ہوئے)

شنکر ۔ دیکھو ۔ دیکھو ۔ وہ کس طرح اپنی جگہ سے سرکتا ہے مجھے حیرت ہے کہ آخر وہ جاتا کہاں ہوگا۔

موہنا ۔ اونہہ ۔ وہ تو ایک اونٹ کی طرح ہے ۔ دیکھو نا اس کی پشت پر کیا ہے ۔ اونچا سا ۔ میرے خیال میں کوئی اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہے ۔ تمہیں دیکھو نا ۔ ادھر دیکھو مجھے کیا دیکھتے ہو ؟ وہ وہ دیکھو ۔ وہ چلا ۔ کہیں دور جا رہا ہے !!

شنکر ۔ اونہہ ۔ وہ اونٹ کیسے ہو سکتا ہے ۔ تم بڑی بیوقوف ہو ۔ اگر اونٹ ہوتا تو اس کی گھنٹی

آواز سنائی دیتی۔ کیا تم سُن رہی ہو؟ پھر کیسے کہا کہ وہ اونٹ ہے؟ دیکھو۔ دیکھو وہ کیسا سرخ
لیا ہے۔ اوہ کس قدر سرخ۔ جیسے ابا کی آنکھیں۔ جب وہ گھر واپس آتے ہیں۔ مجھے تو سرخ
کھیں بالکل پسند نہیں۔ اور تم کو؟

موہنا۔ مجھے بھی پسند نہیں وہ بالکل کثیف ہوتے ہیں۔ کارخانہ کی چمنی سے نکلتے ہوئے
ہوئیں کی طرح۔ شنکر؟ وہ اس آگ کی طرح سرخ نہیں ہوتے جس سے دادا کی چتا کو جلایا تھا؟
ب کہ وہ گہری نیند سو رہے تھے؟ ان کی آنکھیں کیسی بند تھیں شنکر۔ اور لوگ سب کہہ رہے تھے
، وہ مر گئے۔

شنکر۔ ہاں موہنا۔ میں تمہیں بتاؤں سرخ ابر کیسا ہوتا ہے وہ پتاجی کے دوست پریم سنگھ۔
ن کے بازو مشین میں کچل گئے تھے تم کو یاد ہو گا ان کے لٹکتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے
رنگ؟

موہنا۔ اُنہو۔ غلیظ شنکر۔ مجھے تو اب سرخ بادلوں سے دلی نفرت ہو گئی۔

شنکر۔ لیکن مجھے سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔ آبا کے کارخانہ کا مالک ہمیشہ ایک سرخ گلاب
پنے کوٹ میں لگاتا ہے۔

ماں۔ (ان کی بکواس سے اکتا کر) اب ختم بھی کرو اپنی رام کہانی۔ شنکر جاؤ چراغ روشن کرو۔

شنکر۔ اماں ابھی تو کافی اجالا ہے۔

موہنا۔ مجھے دریچہ بہت پسند ہے اور تم کو بھی کیوں شنکر۔؟

شنکر۔ مجھے آسمان پسند ہے جب کہ میں اس کھلے ہوئے دریچہ سے اس کو گھورتا ہوں مجھے
ت کے وقت اس دریچہ کے آئینوں میں سے آسمان پر بکھرے ہوئے تارے اور چاند کا منظر بہت
بلا معلوم ہوتا ہے۔ موہنا۔ میں تم کو بتا نہیں سکتا مجھے جو خوشی آسمان کے دیکھنے سے ہوتی
ہے۔ رات آئی کہ مجھے آسمان کو گھورنے کی بیماری شروع ہو جاتی ہے۔

موہنا۔ رات کیا ہے شنکر؟

شنکر۔ کیا تمہیں سچ مچ نہیں معلوم ؟
موہنا۔ (کچھ جھیپ کر) بیشک مجھے معلوم ہے۔ لیکن کیا تم کو معلوم؟ اچھا معلوم ہے تو بتاؤ تا کیا ہے ؟
شنکر۔ جب خدا سونے کیلئے خوابگاہ میں جاتا ہے رات ہو جاتی ہے جب وہ بیدار ہو کر باہر نکلتا ہے صبح ہو جاتی ہے۔
موہنا۔ شنکر! وہ دیکھو بادل سب کتنی دور نکل گئے آسمان پر اب ان کا کہیں پتہ نہیں میرے خیال میں جہاں دادا گئے ہیں یہ سب وہیں جا رہے ہیں۔ کیسے ضعیف دادا تھے جیارے۔ وہ ہمیشہ مغموم رہتے تھے۔
شنکر۔ موہنا۔ کیا تم کبھی مغموم رہتی ہو ؟
موہنا۔ بس اسی وقت جب کہ اماں کو غمگین دیکھتی ہوں میرا دل بیٹھا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پتھر کی سل ڈال دی۔ کیا اسی کو غمگین ہونا کہتے ہیں شنکر؟ پھر جب اس دریچہ پر نظر پڑی اور آسمان پر چاند نظر آیا۔ دل فرط مسرت سے اوچھل پڑا۔ لیکن اس کو دیکھکر کبھی دل پر ایسا غم ہوتا ہے کہ بتا نہیں سکتی اس وقت تو یہاں کا غمگین رہنا بھی یاد نہیں آتا۔ چاند میں عجیب کیفیت ہے شنکر۔ کسی کو مغموم کرتا ہے کسی کو مسرور۔
شنکر۔ اوہ۔ اب رات ہو گئی۔ میں چراغ جلاؤں گا۔ اماں دیا سلائی کہاں ہے ؟
ماں۔ لو یہ رکھی ہے۔ مگر دیکھنا شنکر۔ اس میں صرف تیرہ دیا سلائیاں ہیں احتیاط سے جلانا۔ کہیں ساری کی ساری ختم نہ کرنا۔ پہلے دریچہ بند کردو۔ اس میں سے تو توبہ اس غضب کے ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔
شنکر۔ نہیں اماں۔ میں ایک دیا سلائی بھی ضائع نہ کروں گا دریچہ کھلا رہنے دو (دیا سلائی روشن کرتا ہے)
موہنا (تالیاں بجاتی ہے) آہا کیسی پیاری آنچ ہے اس کے شعلہ کا رنگ ایک خوبصورت

۔جیسا ہے۔

شنکر۔ ارے موہنا شریر چپ رہ۔ شور نہ کر۔ دیکھا دیکھا وہ ہوا چلی۔ ارے دیکھا دیا سلائی بُجھ گئی ―― یہ موہنا تیرا قصور ہے۔

موہنا۔ واہ ― میں کیا کی؟ کہیں شور کرنے سے دیا سلائی بجھتی ہے۔ تم بھی نرے احمق ہو شنکر۔

ماں۔ دیکھا۔ آخر تم دونوں میں ایک دیا سلائی کا خون ہوا۔

شنکر۔ دوسری روشن کرتا ہے جس کو ہوا بجھا دیتی ہے، ارے توبہ! اماں ان دیا سلائیوں نے پہلے کبھی اتنا نہ ستایا تھا آج ان کو کیا ہو گیا۔ ؎

انہیں اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

ماں۔ (جس کو افلاس نے حد درجہ کا بخیل کر دیا تھا) دو دیا سلائیاں تو گیئں جہنم میں۔ اب بارہ ہوں گی۔

موہنا۔ (جس کیلئے دنیا بازیچہ اطفال کے سوا کچھ اور نہ تھی) اماں کارخانہ میں لوگ کہتے ہیں کہ (۱۳) کا ہندسہ منحوس ہوتا ہے۔

ماں (غصے سے اٹھتے ہوئے) نکلو یہاں سے شریر کہیں کے۔ میں خود روشن کر لوں گی اگر تمہارے ابا اس وقت آ جایئں تو کیا ہو۔ سارا گھر اندھیرا پڑا ہے۔ بچارا غریب باپ تمہارا۔ تھک کر چور ہو جاتا ہے تمام دن ایک مشین کی طرح کام کرتا رہتا ہے جس کو لمحہ بھر کی فرصت کارخانہ میں نہیں ملتی اس کی واپسی کے بعد گھر کی یہ حالت کہ ایک دیا تک روشن نہیں۔ چلو دریچہ بند کرو۔ (دریچہ بند کر دیا جاتا ہے)

شنکر۔ موہنا۔ کیا تم اندھیرے سے گھبراتی ہو؟

موہنا۔ ارے تو کیا تمہیں اندھیرے سے گھبراہٹ نہیں ہوتی۔

شنکر۔ نہیں تو مجھے تاریکی میں کبھی خوف نہیں ہوتا۔

موہنا۔ ایک دن میں نے سنا والد اماں سے کہہ رہے تھے کہ انہیں دن کے وقت خوف

ہوتا ہے شنکر۔ یہ دن کے وقت خوف زدہ ہونے کے کیا معنی؟

شنکر۔ انہیں تمام دن محنت جو کرنی پڑتی ہے رات ہی تو ہے جو ادنہیں آرام پہنچاتی ہے۔ ارے موہنا وہ دیکھو پہاڑوں کے پیچھے وہ زرد خوبصورت سی کیا چیز ہے وہ وہاں ــــ پہاڑوں کے اوس طرف!

موہنا۔ وہ تو چاند ہے۔ آہ چاند۔ کتنی پیاری چیز مالک نے بنائی ہے مجھے چاند سے محبت ہے شنکر۔

شنکر۔ مگر کیا فائدہ۔ وہ ہمیں مل نہیں سکتا۔

ماں۔ (چراغ روشن کرنے کے بعد دیوار میں کیلا لگاتے ہوئے) اُف۔ ہماری بھی کیا زندگی ہے ایک ادنیٰ مزدور پیشہ طبقہ کی زندگی۔ تن کو کپڑا ملے نہ پیٹ کو روٹی۔ بے علم بے آرام۔ نان شبینہ کو محتاج۔ ایسے گھونسلوں کے گھر جن کو زندگی گذارنے کو میسر ہیں۔ ڈرتے۔ سہمے۔ بھوکے پیاسے۔ بسر اوقات کرنا! آہ۔ میرا غریب مصیبت زدہ شوہر تمام تمام رات نیند میں ہذیان بکتا ہے۔ غریب کے دل کو سکون نہیں جو محلوں میں پھولوں کے سیج پر سوتے ہیں انہیں جھونپڑ کا حال کیا معلوم؟ افسوس۔ ـــــــ

(یہ کہتے ہوئے وہ پھر پکانے میں مصروف ہو جاتی ہے)

شنکر۔ کتنا بڑا۔ خوبصورت اور گول ہے ایک طلائی تھال کی طرح زرد اور روشن ہے۔ کیوں موہنا۔؟

موہنا۔ نہیں شنکر مجھے تو وہ ایک طلائی سکہ معلوم ہوتا ہے اگر وہ مجھے ملے تو میں اس سے مٹھائی خرید دوں گی۔ مجھے میٹھی چیزیں بہت پسند ہیں۔

شنکر۔ مجھے ملے تو ایک گیند خرید دوں گا۔ کیوں موہنا۔ چاند خود ایک گیند کی طرح ہے نا؟ شاید خدا اس سے کھیلتا ہے۔

ماں۔ چلو اب تم دونوں جا کر سو جاؤ۔ تمہارا شوربا کہاں ہے پی لو۔

(دونوں بڑے فرماں بردار بچے بن کر شوربا پی لیتے ہیں اور اپنے اپنے بستر پر لیٹ جاتے ہیں)

ایک نوجوان عورت ہمسایہ سے اندر داخل ہوتی ہے)

نووارد عورت۔ کیا تم ایک مٹی کا کٹورہ مجھے صرف ایک رات کیلئے مستعار دے سکتی ہو؟ میرا کٹورہ ٹوٹ گیا۔

ماں۔ ہاں کیوں نہیں ضرور۔ مگر دیکھو واپس کرنیکا خیال نہ کرنا۔

عورت۔ تم کتنی مہربان خاتون ہو۔ میرے شریر بچے نے آج میرا کٹورہ توڑ دیا۔

ماں۔ آہ بہن۔ ہر چیز دنیا میں فنا ہونیوالی ہے کوئی چیز جلد ٹوٹ جاتی ہے کوئی دیر سے!

عورت۔ آج تمہارے شوہر نے واپسی میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔؟

ماں۔ میں ابھی تم سے پوچھنے والی ہی تھی کہ کیا تمہارے شوہر کام پر سے واپس آچکے۔؟

عورت۔ نہیں۔ وہ بھی تو ابتک نہیں آئے کل وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آج کسی خاص بات کا تصفیہ کرنا ہے سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور مشورہ کریں گے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا خاص نکتہ ہوگا اونہوں نے مجھے بھی کچھ نہ بتایا اور نہ میں نے خود پوچھا۔

ماں۔ یہ سب بہت تھک جاتے ہیں پیشہ ور مزدور کی بھی کچھ زندگی ہے۔ تمام دن کی محنت سے ان کا فشار نکل جاتا ہے میں تمہاری طرح محنت مزدوری نہیں کرسکتی تم اس کی کمائی میں شریک تو ہو۔ تمہیں اس کا تو فخر حاصل ہے کہ ایک بڑی حد تک تم اس کی معاون ہو۔ مگر افسوس میں اس نعمت سے محروم ہوں لیکن میرا ارادہ ہے کہ میں بھی کچھ محنت کروں میری صحت اس کی مانع ہے۔ تمہیں نہیں خبر میرے دونوں شش متاثر ہیں انمیں آٹھوں پہر درد رہتا ہے رات دن کی فکر کا آخر انجام یہی ہوتا ہے اطباء تبدیل آب وہوا کا مشورہ دیتے ہیں یہاں جینے کے ہی لالے پڑے ہیں۔ گذر اوقات ہی مشکل ہے میرا خیال ہے کہ فی الحال چونکہ میں کچھ محنت نہیں کرتی مشقت سے تن چرانا بھی بیمار کر دیتا ہے اب ٹھان لیا ہے کہ خواہ کچھ ہو محنت کرونگی

شاید صحت پھر عود کر آئے۔

عورت۔ لو۔ چونی بھی کہے مجھے کمی سے کہاؤ۔ پگلی ہوگئی ہو۔ اب اور کیا محنت کروگی؟

صحت جو بیکار ہو رہی ہے کہتی ہو شش متاثر ہیں اور پھر مشقت کی لگی ہے۔ آہ محنت محنت۔ محنت۔ آخر اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ آخر ہماری زندگی کا نصب العین محنت ہی کیوں ہوگیا ہے ہم کیوں خلق کئے گئے ہوں گے؟ کیوں دنیا میں کئی ایسے لوگ ہیں جو محض راحت و آرام میں بسر کرتے ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ مہد سے لحد تک ہمارا دار و مدار ہستی صرف محنت پر ہے مصیبت جھیلنا۔ آرام وچین سے ناآشنا رہنا۔ ایک دن یوں ہی مرجانا۔ آہ راحت۔ راحت۔ تیرا وجود دنیا میں ہے؟ نہیں۔ کم از کم ہمارے لئے تو تو عنقا کا دوسرا نام ہے۔

ماں۔ حکماء کا قول ہے کہ یہ ہماری "قسمت" ہے۔ آہ قسمت۔ تمہیں نہیں معلوم قسمت کیا ہے؟ اس کا دوسرا نام "خدا کی مرضی" ہے ہاں یہی اس کے کیا معنی ہیں اور یہی اس کا مقصد جو مشیت الٰہی ہے وہ ہماری قسمت سے معنون ہے۔ ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے۔

عورت۔ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں اس کی حمد وثنا میں مصروف رہنا ہمارا مسلک زندگی ہے۔ بس اسی آرزو میں ہم لب گور ہو جاتے ہیں کہ وہ کبھی تو ہماری سنیگا۔ ہماری مصیبت کو راحت سے بدل دیگا۔ ——

شنکر۔ موہنا چلو دیکھیں آسمان پر اب کتنے ستارے ہیں چاند ہے بھی یا غائب ہوگیا۔ مگر دیکھو آہستہ۔ اماں ہماری آہٹ سن لیں تو پھر چلانے لگیں گی۔

موہنا۔ اچھا چلو۔ مگر مجھے نیند آرہی تھی۔ شنکر تم بڑے خود غرض ہو۔

عورت۔ ہاں خدا کی حمد وثنا کرو۔ اگرچہ اس سے تمہاری پیٹھ درد سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ تمہارے ہونٹ جم جائیں۔ تمہاری ہڈیاں چور چور ہو جائیں۔ تمہاری جلد کا رنگ خزاں کے پتہ کی طرح زرد پڑ جائے تمہاری آواز سلب ہو جائے تمہاری طاقت کو یا جواب دیدے۔ غرض۔

تمہاری سب قوتیں فنا ہو جائیں یہاں تک کہ تم خود فنا ہو جاؤ ——

عورت۔ لیکن خدا کی ہستی کو بقا ہے وہ تو زندہ جاوید ہے۔

ماں۔ مجھے تعجب ہے (دوسرے مکان سے ایک بچہ کی چیخ سنائی دیتی ہے)

عورت۔ یہ میرا بچہ ہے ہمیشہ روتا اور ضد کرتا ہے تم سب کی نیندیں اس کی چیخ پکار سے اچاٹ ہو جاتی ہوں گی۔

ماں۔ کیا وہ تمہارا بچہ ہے؟ کیوں کیا اس کی صحت کچھ خراب ہے؟ آخر روتا کیوں ہے؟

عورت۔ نہیں کوئی خاص بات نہیں شاید رونے کی عادت ہو گئی ہے بلا کا ضدی اور نٹ کھٹ ہے میں آنکھوں سے دور ہوئی اور الاپنے لگا۔ سو رہا تھا جب میں یہاں آئی۔ تمہارے کٹورہ کا مکرر شکریہ ادا کرتی ہوں (چلی جاتی ہے)

ماں —— اے خدا —— کیا تو حقیقت میں موجود ہے؟ وہاں اس سیاہ گہرے عمیق آسمان میں؟ کیا تو ہماری تکلیفوں کو دیکھ نہیں رہا؟ (معاذ اللہ) کیا تو بہرہ ہے؟ اگر سن رہا ہے تو گونگا ہے؟ تو کون ہے؟ کیا ہے؟

(ایک شخص نشہ کی حالت میں اندر داخل ہوتا ہے)

مرد۔ ارے بیوقوف —— تو پھر اس خدا کو پکارتی ہے۔ کیا تو اس کو پکار پکار کے عاجز نہیں آتی۔ تجھے ابھی اس کا تجربہ نہیں کہ وہ بڑا سخت بڑا ہی ظالم ہے؟ تجھے نہیں خبر کہ اس کے پاس ہم جیسے مصیبت زدوں کی مصیبت کے سننے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ وہ امراء کا دوست ہے اونہوں نے اس کو (خاکم بدہن) خرید لیا ہے۔ تو کیوں اپنی آواز کو ضائع کرتی ہے۔ جب کہ نتیجہ معلوم۔ ان چمنیوں کا دھواں۔ یہ کارخانوں سے نکلی ہوئی زہر آلود ہوا۔ اس اجاڑ ویران کمرہ کی ناگفتہ بہ رہائش۔ جس میں ہوا اور سورج کی روشنی بھی آنے کی مجاز نہیں۔ خود تیری بگڑی ہی ہوئی صحت کیا یہ سب تیرے لئے کم سامان مصیبت ہیں۔

عورت۔ تم آج بہت دیر سے آئے۔

مرد۔ بچے کہاں ہیں۔؟
عورت۔ وہ ابھی ابھی تو سوئے ہیں ایک جدوجہد کے بعد۔ایک ہنگامہ کے بعد کبھی ابر کا جھگڑا کبھی چاند پر بحث۔ کبھی آسمان پر تکرار کبھی دادا کی سفید داڑھی کی واردات۔غرض جو باتیں ان کی ذہن میں آتی گیئں اس دریچہ کو دیکھ کر۔اسی کے پاس کھڑے ہوکر!!
مرد۔ میرے غریب بدقسمت بچے۔ ان کو اس دریچہ سے انس ہے۔یہی تو ان کی دلچسپی کا سامان ہے آسمان۔ یہ ابر آلود۔تاروں بھرا۔چاند سے مرصع آسمان۔ان کے کھیل کا ڈبہ ہے جو مختلف اوقات میں مختلف رنگوں میں تبدیل ہوکر ان کی دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ہاں۔ہم جیسی تباہ شدہ ہستیوں کے کاشانوں میں جو پیدا ہوگا اس کیلئے یہی اسباب مسرت ہیں۔خدا۔اُف خدا۔اس کو کیا کہوں بس کچھ نہیں کہہ سکتا۔ (اگر گویم زبان سوزد) ——!
عورت۔ کیا تم اب وہیں سے آرہے ہو؟ یعنی کارخانے سے۔
مرد۔ ہاں۔لیکن راستہ میں کچھ دیر ٹھیرنا ہی پڑا۔تمام دن کے تھکن کو دور کرنے کا جو ذریعہ ہے۔
عورت۔ لیکن سنو تو۔محنت ومشقت کے بعد ہم اگر خدا کی عبادت کریں تو زیادہ باعث اطمینان قلب ہے نہ کہ شراب۔اچھا اب کچھ کھالو
مرد۔ میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ بالکل اشتہا نہیں۔
عورت۔ اور آج تم کچھ سراسیمہ بھی دکھائی دیتے ہو!
مرد۔ ایک افواہ نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔
عورت۔ وہ کیا افواہ ہے؟
مرد۔ یہی کہ اب ہر شئے پر محصول لگیگا۔کم وبیش ہر چیز پر۔
عورت۔ اور یہ قانون کس نے بنائے ہیں؟
مرد۔ قانون بنانیوالوں کو آج تک کسی نے دیکھا بھی ہے؟ وہ تو دیوتاؤں کی طرح ہیں؟
عورت۔ سب خرافات!

مرد۔ ہاں ہاں۔ قانون ملوں کیلئے۔ کارخانوں کیلئے۔ زمینات کیلئے۔

عورت۔ اور قسمت کا قانون بھی ——— کیوں؟

مرد۔ سب سے چالاک اور ہوشیار قانون تو یہی ہے اس قانون کے ذریعہ ہم پر واضح کیا جاتا ہے کہ یہ جو ہم فاقہ زدہ، غریب، مفلوک الحال ہوگئے ہیں ——— یہ سب ہمارے ہی کردہ گناہوں کی سزا ہے، پاداش عمل ہے جو ہم بھگت رہے ہیں۔ اف ——— لعنت بھیجو ان پر۔ اور سر تسلیم خم کرکے اس کو قبول کرو۔ سنگ آمد وسخت آمد ——— ہاں ——— اور تم ہو کس خیال میں ——— سنا؟ وہ ایک قانون جاری کرنیوالے ہیں جس کے متعلق آج کمیٹی ہوئی تھی۔ تم گمان تک نہیں کرسکتیں کہ وہ کیا قانون ہے۔

عورت۔ للہ بتاؤ وہ ایسا کون قانون ہے جس نے صرف کنایوں اشاروں میں ہوش اڑا دئے!

مرد۔ بدقسمت ——— مظلوم ——— آہ میرے غریب بچے!! (آبدیدہ ہوجاتا ہے)

عورت۔ یہ کیا کہا ——— للہ بتاؤ ——— کیا ہمارے بچوں کو ہم سے چھین لیا جائیگا؟ جب تک میرے جسم میں جان ہے، میری آنکھوں میں دم ہے، میرے قلب میں حرکت ہے ان کو کوئی طاقت مجھ سے جدا نہیں کرسکتی ———

مرد۔ دیوانی ہوگئی ہو۔ تم یہ کیسے سمجھ گئیں کہ تمہارے بچوں کو تم سے چھین لیا جائیگا۔ سٹرن کہیں کی جب تک میں زندہ ہوں کیا یہ ہوسکتا ہے۔

عورت۔ پھر آخر وہ ہے کیا کمبخت قانون؟ بتاؤ نا۔ صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے۔ جیسے پہیلیاں بجھواتے ہو ———!

مرد۔ نہیں ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ میں تم کو بتا نہیں سکتا (آپ ہی آپ) اُف۔ میرے پیارے غریب بچے۔ اچھا۔ اچھا۔ انہیں کوشش کرنے دو۔ ان کو اپنا فرض منصبی ادا کرنے دو۔ او خدا ———!!

(اچانک ایک شخص ہمسایہ سے داخل ہوتا ہے)

نووارد ۔ بھائی وہ افواہ بالکل صحیح ہے ۔ بالکل ٹھیک ۔ اس کی اب تو پابجائی بھی ہو رہی ہے۔

(چلا جاتا ہے)

مرد ۔ ایک سکتہ کے عالم میں ــــ لو وہ سب آ چکے ــــ ہم کو کچلنے ۔ مار ڈالنے تکلیف دینے زندگی سے بیزار ہو کر خودکشی پر ہم کو مجبور کرنے ۔ وہ چند ظالم ۔ خونخوار ۔ ستم پیشہ ہستیاں ۔ اب آ چکیں جنھوں نے ہمارے ہاتھوں کو محنت کی مشینوں سے منسلک کر دیا ہے ۔ ہماری زبانوں میں لگام دیدی ہے مویشیوں کی طرح جہاں چاہے ہانکتے ہیں ہماری گردنوں پر کام کا جوا رکھدیا ہے ہمارے ہاتھ پیر کو جکڑ دیا ہے وہ ہمیں "بے زبان کندے" کہکر پکارتے ہیں ۔ اچھا ۔ ہم بھی اونہیں مزہ چکھا دیں گے ۔ ہم کندے ہیں ۔ واقعی ہم کندۂ ناتراش ہیں ۔ ہمارے ان اندھیرے اجاڑ کوٹھریوں میں انہیں آنید و ۔ پھر اونہیں ان کی سرکشی کا مزہ ملیگا ۔ جب معلوم ہوگا کہ "ہاں یہ بھی کچھ ہیں" جہاں باہم اتفاق واتحاد نے ایک جان اور کئی قالب کا نقشہ کھینچ دیا ہے ایک دل کے دھڑکنے سے سب ہی دل دھڑکنے لگ جاتے ہیں ان کی آواز جو متفق ہو کر "ایک" نکلتی ہے اس میں کامرانی کا راز پوشیدہ ہے جس کو ہم ایک نقارے سے تشبیہ دیسکتے ہیں ۔ جو میدان جنگ میں فتحمندی کا اعلان کرتا ہے ۔

عورت ۔ میرے غریب تھکے ہوئے دوست ! میں تمہاری مصیبت اور پریشانیوں کو خوب سمجھتی ہوں ۔ انسان کو چاہئے جب مصیبت در پیش ہی ہے تو مردانہ وار اس کا مقابلہ کرے ۔ نہ کہ اس طرح خود بھی پریشان اور ماحول کو بھی سراسیمہ بنائے ۔

مرد ۔ (پرجوش لہجہ میں) بتاؤ ایک مزدور پیشہ انسان کیا نہیں کرسکتا ۔ وہ سوچ سکتا ہے اس کی بھی عقل کو بلند پروازی حاصل ہے وہ رو سکتا ہے چیخ سکتا ہے ۔ آسمان و زمین ایک کر سکتا ہے اس کو بھی خداوند کریم نے محبت کرنیکا اہل بنایا ہے ۔ آج نہیں تو کل سہی ان پہ ثابت ہو جائیگا ۔

ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

ان کے قانون کے چٹان ہمارے آنسوؤں کی موجوں اور آہوں کے تھپیڑوں سے ٹکرا کر نیست و نابود نہ ہو جائے تو جب کہنا وہ ہم کو مردہ سمجھ کر ہم پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ جب ہمارا خون جوش ماریگا تو معلوم ہوگا کہ ان مردوں میں جان بھی تھی۔ بہر صورت! تم ان کے ظلم و ستم ہی کو غنیمت سمجھو کہ اس نے ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ ان کا غضب ہر آن ہم پر نازل ہوتا ہے اور ہم دم نہ ماریں آخر کیوں؟ اس سکوت و انجماد کا سبب کیا؟ ہم غلامی کے طوق کے اب متحمل نہیں ہو سکتے۔ بس بہت سہے۔ جب خدا نے ہمیں بھی انسان بنایا ہے تو کیوں ایک عضو معطل کی طرح ساکت و صامت زندگی بسر ہو۔ ہماری زندگی کیا ہوئی ایک چرخہ ہے کہ چل رہا ہے اس کی کل انہیں کے ہاتھ ہے وہ جسطرح چاہتے ہم سے اپنا کام چلاتے ہیں ایک جانور بھی جب سرکشی پر مائل ہو جاتا ہے تو اس کے سردار کے جھٹکے ہی چھپڑا دیتا ہے صبر۔ صبر۔ آخر۔ صبر کی کوئی حد بھی ہے؟ آزادی کو ترس گئے شاید اسی غلامی میں مرنا قسمت سے ودیعت کیا گیا ہے آہ ہمارے لئے آزادی کیا ہے؟ ایک فقیر مفلس کیلئے خزانہ۔ ایک خزاں رسیدہ بیابان کیلئے موسم بہار۔ قیدی کیلئے رہائی کا حکم۔ ایک ناکام آرزو کیلئے امید کی ایک جھلک!!

اے بھوک پیاس کے خوفناک دیو! اور ہماری در و دیوار پر ہمیشہ چھائے ہوئے بلائے بے درمان کی طرح نازل رہنے والی آفت ناگہانی۔ تو ایک دھواں بن کر نکلجا۔ او مصیبت و سختی کے ابا مو کیا تم کسی یادگار کی طرح خود کو ثابت نہیں کر سکیتں؟ کیا ان سکرات موت کی ہچکیوں سے ہمیں نجات نہ ملیگی۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے کل تو ہم خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے۔

عورت۔ (تسکین دلانیکی ہزار کوشش کرتی ہے) یہ کیوں۔ کہاں تو وہ جوش و خروش تھا۔ کہاں خواب عدم کی سمائی ہے۔ نہیں۔ نہیں مصائب کے بعد ہمیشہ انسان مسرت سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔

مرد۔ (لفظ قانون سے اکتا کر) نہیں۔ اچھے دن۔ اور ہم۔ دو متضاد چیزیں ہیں اگر

قدرت کا یہ قانون ہے تو ہمارے لئے یہ بھی اپنی روش بدل دینگے اور نہ اب ہم میں اتنی سکت ہے کہ ان خوش آئند لمحوں سے علیحدہ زندگی بسر کریں

زندگی کو طرب آمیز سنا کرے سکتے ! یہ تو اک قصہ پُردرد و پُر ارماں نکلا۔

(ڈامبر لگانیوالا ایک شخص داخل ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ڈامبر کا ڈبہ اور برش ہے)

عورت۔ ارے یہ کون ہے؟ یہ یہاں کیوں آیا؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟

مرد۔ یہ وہی افواہ ہے جس کی تمہیں اب تصدیق ملیگی۔ ہاں وہ دیکھ وہ "دریچہ" ہے وہ کسی کے لئے سامان دلچسپی ہے کسی کیلئے ذریعہ نجات۔

ڈامبر لگانیوالے نے دریچہ کو ڈامبر سے رنگنا شروع کیا)

"گناہوں کی طرح سیاہ اور خوفناک مصیبت کے غار کی طرح تاریک و ہیبت ناک ڈامبر اسی کا تو نام ہے اور میں اپنا فرض منصبی ادا کر رہا ہوں" ڈامبر لگاتے ہوئے بڑبڑاتا ہے۔

عورت۔ یہ آخر کر کیا رہا ہے؟ مجھے تو کچھ سودائی معلوم ہوتا ہے۔ نہ اجازت لی۔ نہ پوچھا لگے آپ دست شفقت پھیرنے۔ خوب! مال مفت دل بے رحم۔

مرد۔ وہ مجبور ہے۔ حکم حاکم تو مرگ مفاجات ہی ٹھہرا۔ دریچہ کے آئینوں کو ڈامبر لگا رہا ہے وہ تم سے اجازت کیوں لیتا۔ تم کون ہو؟ ظالم قانون سازوں نے یہ نیا قانون تراشا ہے انہیں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں تو یہی سوجھی کہ اب روشنی پر ہی محصول لگایا جائے۔

عورت۔ کیا کہا روشنی پر بھی محصول؟ آفتاب کی روشنی تو محل اور جھونپڑے کا امتیاز نہیں کرتی۔ کیا مہر درخشاں کا رخ بھی ایکدن قانون سازوں کے قبضۂ قدرت میں آجائیگا کہ جدھر چاہا پھیر لیا۔ اچھا تو اب قضا و قدر پر بھی اختیار ہے ان کا۔

ڈامبر لگانیوالا —— ہاں اب روشنی تمہاری جھونپڑیوں میں نہیں آئیگی جب تک کہ تم اس کا واجبی محصول نہ ادا کرو گے اس کی ایک مقدار ہے جس کی حد تک تم روشنی سے مستفید ہو سکتے ہو۔

(وہ تو سہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم ــــ رخصت ہوا۔ اور ان دونوں میں پھر بحث آ پڑی)

مرد۔ دیکھا۔ دن کی روشنی بھی ہم پر اب حرام۔ خدا سمجھے ان ظالموں سے۔

عورت۔ اب تو کیا ہے وہ ہر چیز پر ڈامبر لگا دیں تو کچھ عجب نہیں۔ ہماری آنکھوں پر۔ ہماری زبانوں پر۔ ہمارے خواب و خیال کو بھی ڈامبر سے لیپ دیں گے۔ ہمارے آہوں۔ ہمارے قہقہوں پر بھی اب ڈامبر کا تسلط ہو جائیگا۔ اچھا ہے نا وہ اگر اس کی بھی پیروی کریں! جب روشنی پر محصول لگے جس کا فیض کہ عام ہے تو پھر اب رہا کیا۔

مرد۔ لیکن کیا ہماری دعائیں، ہماری عبادتوں پر دو آنچ لا سکتے ہیں ہماری وہ حرکتیں جو "اس معبود" سے منسوب ہیں۔ (آسمان کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک قسم کا مجنونانہ دورہ جھٹکہ کی قسم سے اس کو ہوتا ہے بے ساختہ دیوانوں کی طرح قہقہہ لگاتا ہے۔ بے اختیار آنسو بھی نکل آتے ہیں) "وہ سب دیکھتا ہے لیکن نہ معلوم کیوں ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔" وہ "صرف غریبوں کا خدا ہے۔ لیکن افسوس اس کو تونگروں نے خرید لیا ہے۔ کیوں نہیں۔

عورت۔ او ستمگر۔ قاتل۔ سفاک قسمت کیا یہ سب سچ ہے۔

مرد۔ ہاں۔ سچ اور بالکل سچ ــــ!

(گھنٹہ نے صبح کے سات بجائے) یہ کیا بج رہا ہے؟

عورت۔ صبح کے (۷) بج رہے ہیں۔ چراغ سحری ٹمٹما رہا ہے اس کی لو تو دیکھو کیسی دھیمی ہوتی جاتی ہے جیسے کسی بیمار کی نبض جس کو اندر ہی اندر کوئی مرض گھلا دیتا ہے۔ لیکن اللہ۔ ابتک بھی کس قدر اندھیرا ہے۔ دن نکل آیا ہوگا۔ لیکن ہماری قسمتوں پر سایہ پڑا ہے۔ ہمارے در و دیوار اب تک اس سے روشن نہیں ہوئے۔

مرد۔ اف تاریکی۔ تاریکی جیسے کسی گرنی کا دھواں۔ کسی نابینا کی آنکھیں۔ قید خانہ ہے۔ گھر نہیں۔ جیسے بجلی گری ہے۔ او مالک!!

(بچے دونوں گھبرائے ہوئے ہیں وہ اپنی نیند پوری کر چکے ہیں لیکن حیران ہیں کہ صبح کدہر نکل گئی۔ اس کو کس نے پکڑ لیا۔ کیا وہ ایسی مجبور ہوگئی کہ پوچھکر بھی نہ دیکھا۔)

ہمسایہ سے بھی یہی گڑ بڑ سنائی دیتی ہے ع میرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا۔

سب اندھیرے کے شاکی۔ صبح کی پری کے دیوانے چوطرف سے یہی نعرہ بلند ہوتا ہے کہ یا اللہ آج صبح کو کیا ہو گیا۔

مرد ـــ صبح ـــ ہائے وہ تو باہر پڑی ہوئی ہے وہ تو اس کی منتظر ہے کہ تم سب اس کا خیر مقدم کرو ــــــــــــــــ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انہہ۔ ع

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

ایک دیوانگی کے عالم میں دریچہ کی طرف لپکتا ہے اور اس کے آئینوں کو پاش پاش کر دیتا ہے روشنی اندر آتی ہے بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگتے ہیں۔

مرد۔ اگر ان میں ہمت ہے جنھوں نے قانون بنائے ہیں تو آئیں مقابلہ پر

چشمک کرے مجھی سے وہ ایسی کہاں کی ہے بجلی تو خانہ زاد میرے آشیاں کی ہے۔

(ترجمہ بہ تصرف)

غزل

(جناب بہبود علی صاحب صفی)

شور نے لیلے کے لوگوں میں مجھے رسوا کیا – واہ تجھ سے آس کیا تھی اور تو نے کیا کیا
دوسروں سے پوچھ تیرے منہ پہ تو آنکھیں نہیں – کس نظر سے ہم نے تجھ کو آج تک دیکھا کیا
میں برا ہوں تم نہیں لیکن میرے اللہ نے – آپ کو اچھا بنایا یہ بہت اچھا کیا
عشق کی تاثیر اگر یہ ہے کہ ہو دونوں طرف – پھر یہ جو کچھ آج تک ہم نے کیا تو کیا کیا
دوست کا جلوہ کہاں یہ بدنصیب آنکھیں کہاں – جو کہا یا اپنی قسمت نے مجھے دیکھا کیا
اف رے ضد - اللہ ری ہٹ یہ طبیعت یہ مزاج – جو کہا تھا آپ نے آخر اوسے پورا کیا
ہم رہے بھی ان کی محفل میں تو بس ایسے رہے – ضبط نے گونگا بنایا صبر نے اندھا کیا
اب تمہاری دوستی کو دونوں ہاتھوں سے سلام – جو ہوا اچھا ہوا جو کچھ کیا اچھا کیا
کچھ پشیمانی ہے کچھ حیرت کہیں، تو کیا کہیں – آپ اوس کے ہو گئے ہم یا اسے اپنا کیا
اب تو جینے کی دعائیں مانگتا ہوں رات دن – اے صفی اس کی قسم جس نے مجھے پیدا کیا

وجدانیات

جناب سکندر علی صاحب وجد (عثمانیہ)

آتا ہے شب غم میں بہت نام تیرا یاد – سچ ہے کہ اٹھے درد تو آتی ہے دوا یاد
صحرا میں جو کانٹوں نے نکالیں ہیں زبانیں – شاید اونہیں آیا ہے کوئی آبلہ پا یاد
کس منہ سے کروں ان کے نہ آنیکی شکایت – کیا کم ہے یہ احسان کہ آتے ہیں سدا یاد
دن عیش کے کٹتے ہیں پرستش میں بتوں کی – افتاد جو پڑتی ہے تو آتا ہے خدا یاد

اے وجد مرے خون نے وہ رنگ جمایا
بھولے سے بھی آیا نہ اونہیں رنگ حنا یاد

محبت

(جناب بیکار بی۔ اے)

"محبت" زندگی میں ضروری شئے ہے میرا مطلب سچی محبت سے ہے نہ کہ وہ بناوٹی اور مذموم جذبات جو "محبت" کے نام سے انجام پاتے ہیں عموماً شفقت والدین۔ پرستش اور حسن پرستی کو کس قدر بیجا طور پر "محبت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حالانکہ یہ جذبات بجائے خود عمدہ صفات رکھنے والے ہیں اگرچہ ان میں سے ہر ایک انسانی زندگی کا ایک رکن اعظم ہے لیکن کسی کو بھی "محبت" کہنا جائز نہیں میرا خیال ہے کہ "اصلی اور سچی محبت" انہی صفات کے مجموعہ کا نام ہے میں نہیں سمجھتی کہ وہ مرد اور عورتیں جو مجھ سے زیادہ فہیم اور عقلمند ہیں اس انسانی زندگی کے اہم اور محرک جذبہ کی کوئی مکمل تعریف یا کلیہ پیش کرنے کی کوشش کئے ہوں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ "محبت" کے دو درجہ ہیں ایک اوائل عمر کی عاشقانہ دلفریبی اور جوش جوانی کی امنگیں۔ دوسرا درجہ پختہ عمر کے سنجیدہ۔ مخلصانہ اور دیرپا جذبات بلاشبہ ان دو تعریفوں کا وجود ضرور ہے لیکن "محبت" کے اصلی مفہوم کا اطلاق ان پر نہیں ہو سکتا میرے نزدیک "سچی محبت" ان دو تعریفوں کی یکجائی کا نام ہے۔

"سچی محبت" پہلے ایک حسین اور رنگین خیال کیطرح وجود میں آتی ہے پھر دماغ اور جسمانی میل جول سے ترقی پاکر آخر میں اپنے اصلی مفہوم میں ظاہر ہو جاتی ہے اس میں نہ تو عمر کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ کسی درجہ یا دور کا۔ اس کا ہر پہلو بجائے خود نہایت اہم ہوتا ہے "اصلی محبت" کیلئے رنگین مزاجی، شوخی۔ جسم اور دماغ کی مناسبت۔ ہمدردی۔ سمجھداری۔ اور برداشت کا ہونا لازمی ہے ان میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں "سچی محبت" کا مفہوم ساقط ہو جائیگا۔ اگر کوئی شخص "محبت" کے جذبہ سے متاثر ہو جائے تو اس کو اس رنگین اور خداداد خیال کو فراموش نہ کرنا چاہئے انسان کو چاہئے کہ ایک شئے کو ہر وقت ایک ہی نظر سے دیکھا کرے مثلاً اگر اس نے کسی صورت کو صبح مسکراتے دیکھا ہے تو اس صورت کو شام میں بھی انہی نظروں سے دیکھے جن نظروں سے کہ اس نے صبح دیکھا تھا اور

اس طرح وہ آدمی کو چھوڑ ساری پر نہ جائے یہی خیالات اور تاثرات ایک "سچی محبت" کا پیش خیمہ بن جائینگے۔
اور پاک جذبات کی پرورش ہوتی جائیگی اور یہی جذبات بجائے زود ردی اور جلد ٹھنڈا پڑ جانے کے
ہمیشہ کیلئے مستحکم اور دیرپا ہو جائیں گے "سچی محبت" کی افزونی اور پائیداری میں جسمانی تعلق بھی ایسا
ہی اہم ہے جیسا دماغی اور روحانی اور اس کے ساتھ ساتھ اعانت۔ رحمدلی۔ رفاقت وغیرہ بھی ضروری ہیں۔
"محبت پُرامن اور پُرعیش ہے" میں نہیں سمجھتی کہ قدیم مقولہ یعنی "وادیٔ عشق پرخار ہوتی ہے"
کا کیا مطلب ہے یہ ناممکن ہے کہ "سچی محبت" کے راستہ میں نشیب و فراز اور رکاوٹیں پیدا ہو جائیں
ہاں! یہ ضرور ہے کہ "اصلی محبت" کا بیجا استعمال اس کی شیرینی اور حلاوت کو کھو دیتا ہے اور ممکن
ہے کہ بناوٹی اور جھوٹے جذبات کے تحت محبت کرنے سے مذکورہ مقولہ صادق آتا ہو "محبت" کا دوسرا
نام برداشت بھی ہے اور برداشت ٹوٹے اور مجروح دلوں کو ایک نمایاں آس دلانیوالی ہوتی ہے
اس طرح "سچی محبت" میں ایک برداشت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے یہی وہ خداداد نعمت ہے کہ انسان
اپنی ہر مایوسی اور ہر تکلیف کو مسرت سے برداشت کر لیتا ہے اور بعض اوقات اسی "برداشت" کے
مفہوم کی تسلی سے اس کی مایوسی خوشی اور اطمینان سے بدلجاتی ہے۔
میں سمجھتی ہوں کہ آدمی کو زندگی میں ایک مرتبہ "سچی محبت" ضرور ہوتی ہے گو یا کہ "محبت" کے
ساتھ ساتھ اور دوسرے جذبات کا پیدا ہونا بھی ممکن ہے لیکن جذبۂ محبت سب پر حاوی رہتا ہے
سچ تو یہ ہے کہ "محبت" کے ساتھ دوسرے جذبات کو بھی دل میں جگہ دینے سے بہتر تو یہ ہے کہ محبت
ہی نہ کی جائے ہر شخص کو زندگی کے ہر دور اور ہر حالت میں "محبت" کے ایک واحد اور پاک جذبہ کو
اپنے دل میں رکھنا چاہیے اس سے زندگی میں ایک لذت کاروبار میں ایک وسعت اور کوششوں
میں ایک مجسم تحریک پیدا ہوتی ہے اور امیدیں قوی سے قوی تر ہو جاتی ہیں مرد اور عورتیں اگر
واقعی آپس میں "سچی محبت" رکھتے ہیں تو ان کی زندگی میں کامیاب کاروبار اور نفع بخش جدوجہد کا
پایا جانا لازمی ہے مجھے ہرگز یقین نہیں آتا کہ ایک آدمی "سچی محبت" میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔
اگر وہ کامیابی کی خاطر اپنی کوششوں کو عملی جامہ پہنائے اور یہ محسوس کرنے لگے کہ کوشش اور محنت ہی

اوس کی "محبت" کو کامیاب کرین گی تو بس یہی خیال اور تحریک اس کی "اصلی محبت" کا باعث
عورت کو محبت میں یک لخت گرفتار نہ ہونا چاہیئے ورنہ ناامیدی اور مایوسی سے دوچار
پڑیگا۔ "محبت" کرنے سے پیشتر ایک عورت کو چاہیئے کہ وہ خود کو "محبت" کرنے کے قابل بنالے ہر
جو خود کو دلچسپ اور خوبصورت بنانے کے لئے کیا جاتا ہے "محبت" کی کامیابی میں ضرور مدد د
ایک عورت کو کسی مرد کی "محبت" میں کامیاب ہونے سے ایسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسی ایک م
ایک عورت کی "محبت" میں فائز ہونے سے "اعتدال" سے محبت میں ایک توازن قایم ہو جاتا ہے "
محبت" میں اگر مرد اور عورت ایک دل ہوں تو کوئی چیز رکاوٹ نہیں پیدا کرسکتی۔

بعض اوقات دنیا کی پسندیدگی اور قدر بھی "محبت" میں چار چاند لگا دیتی ہے عورتیں چا
ہیں کہ دنیا اون کے حسن کی قدر کرے تاکہ ان کے مطلوب کے دل میں ان کے حسن کا سکہ بیٹھ جا
اور مرد بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کی مطلوب کے حسن کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہو۔ بہرحال قدر و
"محبت" کے ضروری اجزا ہیں یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اسی شئے کو زیادہ پسند کرتا ہے جس کی
لوگ بھی قدر و منزلت اور عزت کرتے ہوں "سچی محبت" دنیا کی ترقی کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ
عورت اور مرد جب ایک دوسرے کے دل میں قدر و منزلت بڑھانا چاہتے ہیں تو وہ زیادہ محنت
جد وجہد کرتے ہیں تاکہ ان کا پوزیشن اس قابل ہو کہ مطلوب ان پر دل وجان سے فدا ہو جائے
طرح مرد اور عورتیں زیادہ جانکاہی کریں گے۔ جراءت سے کام لیں گے۔ تکالیف متقل مزاجی سے
برداشت کرینگے۔ اور یہی ان کی "سچی محبت" قوم و ملک کی ترقی کا ایک آلہ بن جائیگی۔ (ترجمہ

ختم چندہ کی اطلاع صرخ چٹھی کے ذریعہ دیدی جاتی ہے۔ براہ کرم جنھیں آئندہ اعانت م
نہ ہو وہ بذریعہ کارڈ مطلع کر دیں ورنہ وی۔ پی کو واپس کرکے دفتر کو یوں ص
نقصان نہ پہنچایا جائے جس کی نسبت بارہا گزارش کی گئی ہے۔

شکست

جناب شمیم صاحبہ (ایران)

تم پھر وہی جھگڑا لئے بیٹھیں"۔ محمود نے چیں بر جبیں ہو کر جواب دیا۔"

"ایں! . . . کیا میں؟؟ . . . طاہرہ نے کہا۔ اور خاموش ہو گئی خیالات کا جائزہ لینے کے لئے اس نے اپنی آنکھیں محمود کے چہرہ پر گاڑ دیں۔ ——

مگر وہ بدستور چند کوڑیوں کو ادھر ادھر پھینک کر بار بار اٹھانے میں منہمک تھا۔ پانچ۔ آٹھ۔ دس۔ بارہ اور پندرہ منٹ مکمل سکوت میں گذر گئے کوڑیوں کے گرنے اور اٹھائے جانے کی آواز کے سواد بالکل سناٹا تھا۔

"اچھا تو کیا اس کا یہی مطلب ہے کہ مجھے اس گھر پر کوئی اختیار نہیں؟؟ طاہرہ نے پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ اس کی نرم آواز حزن و یاس کا رنگ لئے ہوئے تھی۔

محمود نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ اس عجیب و غریب کھیل میں بالکل محو تھا۔

"میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ اس گھر پر مجھے بھی ویسا ہی اختیار ہے جیسا کہ تمہیں"! اب طاہرہ کی آواز بدل چکی تھی اس نے کسی قدر ترش لہجہ میں گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تمہارے رشتہ دار روز آتے ہیں اور میں ہمیشہ ان کی خدمت کرتی ہوں۔ مگر . . . . . مگر . . . . .

"بہشت!! . . . چپ رہو!! میں اس کے آگے ایک لفظ سننا نہیں چاہتا" محمود نے کھڑکی میں سے کوڑیاں باہر پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے غصہ میں جواب دیا

"بہت خوب! نہ سنو! یہ تمہاری مرضی ہے۔ مگر میری اماں آئینگی اور ضرور آئینگی" طاہرہ نے بھی بگڑ کر جواب دیا۔

"اچھا! آنے دو دیکھا جائے گا!! محمود نے سر کو جھٹک کر کہا۔ اور بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اب پھر قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری

کر نہیں کھڑکی کے شیشوں پر مصروف رقص تھیں چند منٹ اور بھی گذر گئے۔ یہی حالت طاری رہی۔ آخر کار محمود سگریٹ اٹھانے کے لئے اس میز پر جھکا جس کے پہلو میں ایک کرسی پر طاہرہ خاموش بیٹھی تھی۔

"ہاں! سنو ایک اور! . . . طاہرہ نے کچھ کہنا چاہا۔ اگر ننھے میاں کے بیدار ہو جانیکی اطلاعی چیخ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ اٹھکر تیزی سے جھولے کی طرف بھاگ گئی۔

محمود نے اطمینان کا سانس لیا۔ سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا کش لگا کر منہ سے انجن کی طرح دھواں نکالتے ہوئے جلدی جلدی قدم اٹھا کر دروازے کے باہر چلا گیا

(۳)

"صوفیہ! اری او صوفیہ!! ذرا خیال سے پکانا! دیکھنا روٹیاں نہ جل جائیں! کچن سے باہر نکل کر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے۔ طاہرہ نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں ننھے میاں جھولے میں تنہا پڑے پاؤں کا انگوٹھا چوس رہے تھے۔ "اُف . . . اوف!! . . . آج کس بلا کی گرمی ہے! مگر تمہارے ابا نے اپنے نصف درجن دوستوں کو دعوت دے رکھی ہے میں ان کے لئے کھانا پکا کر آتی ہوں۔ سنتے ہو؟ میرے بچے!! سنتے ہو؟ یہ کہکر طاہرہ نے پیار سے بچہ کو گدگدایا۔

ننھے میاں بھی ہوا میں ہاتھ پاؤں اچھالتے ہوئے جواب میں "آغوں آغوں" کرنے لگے۔

"دعوت کیلئے بہت سی چیزیں پکائی ہیں" طاہرہ نے پھر کہا۔ بریانی، تنجن، قورمہ۔ مرغ، نرگسی کباب اور فرنی۔ بچہ برابر ہنس رہا تھا طاہرہ نے گدگدا کر کہا "آج تمہارے ابا ضرور خوش ہوں گے اور خاص کر مجھ پر بہت زیادہ مہربان۔ کیونکہ سب چیزیں میں نے خود تیار کی ہیں اور یہ کھانے ان کو بہت مرغوب ہیں۔ طاہرہ نے بچہ کو پیار کرکے ہنستے ہوئے کہا۔ دیکھو۔ آج میں پھر ان سے کہوں گی امید ہے ضرور مان جائیں گے . . . . پھر تمہاری نانی اماں آجائینگی۔ بچہ بدستور کھل کھلا کر ہنس رہا تھا —— مگر تمہارے ابا خود غرض اور بہت ہی خود پسند ہیں میرے بچے! خدا تمہیں ان کی عادتیں نہ سکھائے۔ وہ سب کو برا کہتے ہیں۔ اب ننھا ہنستے ہنستے تھک گیا ہے۔ مگر طاہرہ برابر کہتی گئی۔

"وہ مجھے ضدی کہتے اور تمہاری نانی اماں کو جھگڑالو اور بدمزاج گردانتے ہیں یہ ان کی کتنی سخت غلطی . . .
. . . " ننھے میاں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ طاہرہ چونکی اور خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا
کوئی اس کی باتیں تو نہیں سن رہا تھا۔ اور فوراً ننھے میاں کو اٹھا لیا۔ گود میں لیکر دودھ پلانے لگی۔
ننھا سو گیا۔ محمود کے دوست بھی وقت مقررہ پر آئے اور کھانا کھا کر چلے گئے۔

(۳)

لیلیٰ شب اپنی زلفیں شانوں پر بکھیر چکی تھی نیلگوں آسمان پر سفید سفید بادلوں میں سے دو چار دن کا چاند ہلکی ہلکی ضوفشانی سے عالم کو مدہوش کرنے لگا۔ نرم و لطیف ہوا کے سوا ہر چیز ساکت تھی۔
وہ اب تک نہیں آئے! طاہرہ نے گھبرا کر دیوار پر لگی ہوئی کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اُف!
. . . دس بج چکے ہیں" "اگر اماں جان یہاں آ جائیں تو سچ مچ ایسے وقت میں ضرور ناراض ہونگی
مگر میں اسے برداشت نہیں کرتی" اس نے اپنا سر چارپائی پر ڈال دیا" اور وہ بہت غمگین ہونگی
کیا اچھا ہوتا اگر اماں میرے پاس آنیکا نہ لکھتیں" اس نے ان لفظوں کو زور سے دھرایا "مگر اب تو
کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اماں ضرور آ جائیں گی . . . . . ! . . . . اوہ خدایا !! . . . . میں کتنی
سخت مصیبت میں مبتلا ہوں"! طاہرہ کی آواز اندرونی درد و کرب کا اظہار کرتی ہوئی بتدریج
مدھم ہونے لگی "وہ میری اماں ہیں میں ان کو بُرا نہیں کہہ سکتی وہ میری بہترین خیر خواہ ہیں" اس
نے یہ الفاظ آہستہ آہستہ کہے اور خاموش ہو کر خیالات کے وسیع سمندر میں غرق ہو گئی۔
ایک گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا مگر وہ بدستور خاموش تھی کہ دفعتہً زنجیر کھٹکی۔ طاہرہ چونک پڑی۔
اور اٹھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ محمود مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا اور بے انتہا مسرور۔
مگر طاہرہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔
"آج کھانا بہت لذیذ تھا۔ میرے تمام دوست تمہاری بہت تعریف کرتے تھے" محمود نے طلسم
خاموشی کو توڑتے ہوئے کسی قدر تحنر سے کہا۔
" . . . . اس کی ضرورت نہیں کہ لوگ میری تعریف کریں"! طاہرہ نے لاپروائی سے

منہ پھیر کر جواب دیا۔ محمود نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا اور جلدی جلدی کپڑے اتارنے میں مشغول ہوگیا۔
"جہنم کی سی گرمی۔ میں تمہارے دوستوں کی خاطر میں اتنی تکلیف برداشت کرتی ہوں۔ پھر جب کہ تم میری اماں کا یہاں آنا گوارا نہیں کرتے تو مجھے بھی تمہارے دوستوں کا یہاں آنا منظور نہیں"! طاہرہ نے کرسی کا سہارا لیکر کہا۔ اور اتنا بھی خیال رہے ۔۔۔ کہ ۔۔۔ کہ ۔۔۔ " نہیں روک سکتی !! اور تم ہرگز نہیں روک سکیتں !! یہ میرا اپنا گھر ہے۔ کپڑے کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے محمود نے نہایت ہی تیز ہو کر خشم آلودہ آواز میں جواب دیا۔ "ہر وقت یہی ذکر بلائے بے درماں کی طرح گلے کا ہار ہوگیا ہے"۔
اسی طرح کیا میرا بھی یہ اپنا ہی گھر نہیں ہے ؟؟ تم میری اماں کو یہاں آنے سے کیوں روکتے ہو؟ تمہیں کیا تکلیف ہوتی ہے ؟"؟ اب طاہرہ کے غصہ کا پارہ بھی آخری ڈگری پر تھا۔
"تمہاری اماں کا بیجا رعب اور بے موقع پند ونصیحت مجھے زہر معلوم ہوتی ہے۔ سنا تم نے ؟ اس لئے اور ضرور اس لئے"! یہ کہکر محمود بھی مقابلہ کی کرسی پر دراز ہوگیا۔
"ذرا انصاف کرو! کیا میں نے کبھی تمہارے رشتہ داروں کے بیجا اعتراض اور ان کی بدعادات کا اظہار یا کبھی ایسی اور فضول باتوں کی شکایت کی ہے ؟"؟ یقیناً وہ ایسی لغزشوں سے خالی نہیں ہیں لیکن تم کیوں نقص پر نقص نکالتے جارہے ہو؟ کیا میری ہی اماں میں خدائی بھر کے عیب جمع ہوگئے ؟ کرسی کا سہارا چھوڑ کر طاہرہ پھر سیدھی کھڑی ہوگئی اور اپنی ساری قوت کو انہی لفظوں پر ختم کردیا۔
"مجھے کیا ؟ تمہارا جی چاہے بلالو! مگر یاد رہے کہ میں بیجا نکتہ چینی برداشت نہیں کرتا" محمود نے کسی قدر مغلوب ہوکر نرم اور شکست خوردہ آواز میں کہا۔
"ہاں ہاں! پھر مرغ کی وہی ایک ٹانگ ؟ کیوں ؟ میں نے تمہارے ماں باپ کے علاوہ تمہارے ماموں جان کی بھی سال بھر خدمت کرتے ہوئے کتنی بیجا باتیں برداشت کی ہیں۔ کیا تم نے وہ سب فراموش کردیں ؟ کیا میں نے تمہارے چچازادوں۔ پھوپی زادوں۔ خالہ زادوں۔ اور ماموں زادوں۔ کے علاوہ خالہ۔ خالو پھوپھا۔ پھوپی چچا چچی۔ غرضکہ تمام رشتہ داروں کیلئے بہت سی تکلیفیں نہیں

اٹھائیں؟ اور جس کے تم خود بھی گواہ ہو" طاہرہ کی آواز لحہ بہ لحہ بلند ہوتی گئی "اب خود ہی غور کے بعد انصاف کرو کہ تم کتنی سخت غلطی اور ضد پر قائم ہو"؟

محمود ان باتوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا اس کا سانس جلدی جلدی چلنے لگا۔ اور وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا اس کی آنکھیں بجلی کے پنکھے کیساتھ ساتھ گردش کرنے لگیں اس نے اپنی داہنی کلائی ماتھے پر رکھ لی اور اپنی حماقت پر دل ہی دل میں پشیمان ہونے لگا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ طاہرہ بالکل حق بجانب ہے۔

"یہ صرف پہلا اتفاق ہے کہ میری اماں آرہی ہیں" طاہرہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے کہا "دیکھو میں پھر کہتی ہوں کہ آخر تمہیں اپنے قلم سے اماں کو آنیکی دعوت دینی پڑیگی!"

"اچھا! یونہی سہی۔ چلو اب اس جھگڑے کو طول نہ دو۔ میں خط لکھ دوں گا" محمود نے لاجواب ہوکر اپنے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ اب رات بہت گذر گئی ہے سو جانا چاہیے۔"

"پھر لکھوگے کب؟ ابھی تو گیارہ ہی بجے ہوں گے" طاہرہ نے جلدی سے کہا اور محمود کے چہرے پر اپنی نگاہوں کو اس طرح جما دیا گویا اس کے دل کی گہرائیوں تک اترنا چاہتی ہے"

"کل! . . . یا پرسوں تک" محمود نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ اور خاموش ہوگیا۔

"نہیں، نہیں آج ہی!! اور اسی وقت!!!" طاہرہ نے فاتحانہ انداز میں سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

محمود اٹھکر میز کے قریب جا بیٹھا اور چند سکنڈ کے بعد اس نے اپنے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں اس وقت خط نہیں لکھتا صبح تار دیدوں گا۔ بس اب خوش ہو۔"

"اوہو! خط کی بجائے تار! خط کی بجائے تار!" طاہرہ نے بیساختہ الفاظ دہرائے اور بدستور کرسی سے ٹیک لگائے کھڑی رہی مگر اس کی آنکھیں فرط مسرت سے ناچنے لگیں وہ اپنی اس غیر معمولی کامیابی پر بہت نازاں تھی۔

"ہپ ہپ ہُرے!" کہکر محمود نے اپنی خفت مٹانے کیلئے تالی بجائی اور یہ شعر گنگناتا ہوا اپنے بستر پر چلا گیا۔

ہم خستہ جاں ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تو نے یہاں دم نکل گیا۔

آبپاشی

(جناب عبد الباسط بیگ صاحب)

ہندوستان کے مختلف مقامات کا مقابلہ کیا جائے تو بعض جگہ آبپاشی کی کوئی اہمیت نہیں اور بعض جگہ وہ ناگزیر ہے ——— کیونکہ انسان کو بارش پر قابو حاصل نہیں ہے اسی لئے بارش کا پانی محفوظ کر کے اس کو حسب ضرورت تقسیم کر لیا جاتا ہے ساتھ ہی یہ بے ضرورت پانی کی نکاسی بھی لازمی ہے۔

ہندوستان میں بارش کی یہ کیفیت ہے کہ پنجاب، راجپوتانہ اور سندھ کے اکثر علاقے نہایت زرخیز ہیں مگر بارش نہیں ہوتی دکن میں مجموعی طور پر کافی بارش ہو جاتی ہے مگر وقت کا تعین نہ مقدار کا۔ اسی وجہ سے ان علاقوں میں ذرائع آبپاشی کی بہت اہمیت ہے صوبہ جات متحدہ و متوسط میں زمینات بھی زرخیز ہیں اور بارش بھی اچھی ہو جاتی ہے پھر بھی بہ نظر احتیاط پانی کے خزانوں کی ضرورت محسوس کیجاتی ہے۔

آسام کے اکثر علاقوں میں اوسطاً (۱۰۰) انچ بارش ہو جاتی ہے ہمارا ملک اس قدر وسیع ہے کہ اس کے ہر حصہ میں ایک جداگانہ کیفیت ہے اس کے علاوہ مقامی طور پر بھی تغیرات ہوتے ہیں فرض کیجئے کہ کسی مقام کا اوسط (۴۰) ہے مگر کبھی (۲۷) اور کبھی (۴۸) انچ ہو جاتی ہے۔

فصلوں کے لحاظ سے غور کیا جائے تو بعض فصلیں ایسی ہیں کہ وقتاً فوقتاً کثیر مقدار میں پانی کی ضرورت ہوتی ہے جیسے نیشکر کی کاشت کیلئے۔ اور ظاہر ہے کہ وقت پر بارش نہ ہونے سے کئی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں ہماری دولت کا سب سے بڑا ذریعہ زراعت ہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کو ترقی دی جائے ایک بڑے فینانس ممبر کا قول ہے کہ:۔

Finances in India are a mere gamble in the rain. یعنی

فینانس کا دار و مدار محض بارش پر ہے ہماری آبادی کا (۸۰) فیصد حصہ کاشتکار ہیں اگر افلاس دور کرنیکی حقیقتاً کوئی تدبیر ہو سکتی ہے تو یہی کہ زراعت کے پیشہ کو ترقی دیجائے اور ذرائع آبپاشی مہیا کر کے کاشتکاروں کیلئے سہولت مہیا کی جائے۔

قدیم تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ مصر اور میسوپوٹیمیا کے علاوہ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کئی صدیوں سے ذرائع آبپاشی کو اہمیت حاصل ہے اس کے باوجود ہندوستان کے رقبۂ کاشت کا صرف (۱۹) فیصد حصہ ان ذرائع سے مستفید ہو رہا ہے اور بقیہ (۸۱) فیصد علاقہ ایسا ہے جو ابھی تک ان وسائل سے محروم ہے۔

اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ بدامنی اور پھر امن کے دور یکے بعد دیگرے ایسے نصیب ہوتے رہے کہ زراعت کو فروغ نہ ہو سکا امن کے زمانہ میں یقیناً آبپاشی کے ذرائع کو وسعت ہوتی رہی مگر جب طوائف الملوکی کا دور آتا تو پھر تباہی آجاتی تھی حقیقت یہ ہے کہ بدامنی کے عہد میں کسی حکومت کو یہ موقع نہیں ملتا کہ ان ذرائع کی تعمیر، ترمیم یا وسعت پر غور کر سکے۔ مغلوں کی حکومت کا ایک طویل زمانہ امن سے گذرا۔ اس عرصہ میں مغل شہنشاہوں نے اس طرف کافی توجہ کی اور ان وسائل کو ترقی ہوئی۔ مگر ان کے بعد ایک طویل عہد بدامنی کا آیا۔ اور جب حکومت قایم ہوگئی تو وہ اس طرف ابتداً توجہ نہ کر سکی۔ اس کے بعد جب حکومت کے آگے ہندوستان کی معاشی ترقی کا مسئلہ آیا تو وہ ادھر کچھ توجہ کرنے کے بجائے (۱۸۵۳ء) سے انیسویں صدی کے آخر تک ریلوں کی طرف متوجہ رہی۔ اس زمانہ میں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں انگریز ریلوں کے گتوں کے کوشاں رہے اس کے سوا ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کے تسلط کو مستحکم کرنے کے لئے تیز تر وسائل آمد و رفت کی ضرورت بھی ناگزیر تھی۔

اسی زمانہ میں انگریز نوآبادیات (Colonies) بساتے جاتے تھے اور حکومت کی توجہ زیادہ تر اسی طرف تھی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں انگریزوں کو ہندوستان میں بھی کھپایا جائے۔ جب اس کام سے مہلت ملی تو خام پیداواروں کی برآمد اور انگلستان کی صنعتوں کی نکاسی کے لئے ہندوستان کی مارکٹ پر قبضہ کرنا تھا۔ اول تو حکومت کے استحکام کے لئے تیز تر وسائل آمد و رفت کا لحاظ کر کے ریلوں پر زور دیا گیا اب مارکٹ پر قبضہ کرنے کے لئے انہیں ریلوں کو وسعت دینے میں منہمک ہونا پڑا۔ (اگرچہ ایک عرصہ تک حکومت کو نقصان آتا رہا) یہاں تک کہ قوم میں

رامیش چندر دت جیسا نمائندہ پیدا ہوا جس نے حکومت پر نکتہ چینی کرکے یہ ثابت کیا کہ ریلوں کو وسعت دینے کے بجائے ذرائع آبپاشی کو وسعت دی جائے رفتہ رفتہ یہ معاشی مسئلہ سیاسی بحث بن گیا اگرچہ یہ مسائل متضاد ہیں اور ہندوستان کی ترقی کیلئے ریلوں کی جس قدر ضرورت تھی اتنی ہی اہمیت ذرائع آبپاشی کو حاصل تھی۔ مگر ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ عوام یہ سمجھنے لگے کہ حکومت آبپاشی پر کوئی رقم صرف کرنا نہیں چاہتی بلکہ ایسی چیزوں پر بیحد رقم صرف کر رہی ہے جس کی ضرورت اس وقت کے معاشی حالات کے لحاظ سے بالکل نہ تھی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ حکومت نے وسائل آمدورفت اور ذرائع آبپاشی کے مصارف میں کوئی توازن نہ رکھا بلکہ ریلوں پر زیادہ سے زیادہ اخراجات برداشت کئے انیسویں صدی کے اواخر میں حکومت پر نکتہ چینی بڑھنے لگی اسی زمانہ میں پے درپے قحط ہوئے اور لاکھوں جانیں تلف ہوئیں خود حکومت کو بھی کافی نقصان ہوا۔ اس کے بعد ہی (۱۹۰۲ء میں) ایک کمیشن مقرر ہوا جس نے ایک مکمل اور جامع رپورٹ تیار کی گورنمنٹ اب تک اس کمیشن کے سفارشات پر عمل کر رہی ہے اس کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت سے ایکسال پہلے یعنی ۱۹۰۱ء میں ہندوستان میں کل رقبہ (۱۹½) کروڑ ایکڑ زیر کاشت تھا۔ (یہ اعداد صرف برطانوی ہند کے ہیں دیسی ریاستیں شامل نہیں) لیکن نہایت سرعت سے اس رقبہ میں توسیع ہوئی چنانچہ ۱۹۳۰ء میں کل رقبہ کاشت ۳۲ کروڑ ایکڑ تھا۔ اس کے بعد گزشتہ چار برس میں صوبہ پنجاب میں سکر بیاریج اور صوبہ مدراس میں میسور پراجکٹ کی تکمیل سے اس رقبہ میں مزید توسیع ہوئی اس لحاظ سے موجودہ رقبہ کاشت تخمیناً چالیس کروڑ ایکڑ ہے ۱۹۰۱ء تک برطانوی حکومت نے (۳۵) کروڑ اور ۱۹۳۰ء تک (۱۳۰) کروڑ کی رقم ذرائع آبپاشی کی تعمیر و ترمیم میں صرف کی جس پر (۸½) فیصد منافع مل رہا ہے اس قدر ترقی کے باوجود سارے ہندوستان کا صرف (۱۹) فیصد علاقہ ایسا ہے جو ان ذرائع سے مستفید ہو رہا ہے اور بقیہ (۸۱) فیصد ابھی تک اصلاح کا محتاج ہے۔

اب ہم سرسری طور پر مختلف ذرائع کا بیان کریں گے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ذرائع آبپاشی مختلف ہیں۔ کہیں نہریں۔ چھوٹے چھوٹے تالاب اور کنٹے ہیں اور کہیں باؤلیوں کے تحت کاشت

ہوتی ہے دیسی ریاستوں کو شامل کرکے ہندوستان میں کم وبیش (۲۵) لاکھ کنویں ہیں جن کے تحت ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ رقبہ زیر کاشت ہے بالعموم آبپاشی کے کنویں رعایا اپنے صرفہ سے تیار کرتی ہے البتہ انجمن امداد باہمی کی طرف سے کاشتکاروں کو قرضے ضرور ملجاتے ہیں (اس کے برعکس جو کنویں پانی کے روزمرہ استعمال کیلئے تیار ہوتے ہیں انہیں حکومت تیار کرتی ہے جیسے حیدرآباد کے ضلع رائچور میں) یوپی کا تقریباً نصف اور پنجاب کا ربع رقبہ کاشت محض کنوؤں کی وجہ زیر کاشت ہے۔

شمالی ہند میں باؤلیوں کی تعمیر جنوبی علاقوں کے مقابلہ میں بہت آسان ہے اگر مزید کنویں کھودے جائیں تو مفید ہوگا۔ مگر گذشتہ چند سال سے کنوؤں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہورہا ہے زرعی کمیشن کے بیان کے مطابق اس کا سبب یہ ہے کہ کاشتکار موجودہ حالات کے تحت ان کی تعمیر کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے اس کے علاوہ ان کے ہاں زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعہ ہیں یا اگر زیادہ زمین ہے بھی تو منتشر۔ اس انتشار کی وجہ سے وہ اپنی زمین میں باؤلی نہیں کھودتے جو واجبی امر ہے علاوہ بریں حصہ دار ہوتے ہیں جو مصارف میں شریک ہونا نہیں چاہتے مگر پیداوار میں ان کی شرکت ناگزیر ہے اس لئے اگر محکمہ امداد باہمی اس طرف توجہ کرے اور Well Sinking Societies قائم کرے تو کاشتکار اس میں شریک ہوکر اپنی توقی کے مواقع پیدا کرسکتے ہیں ورنہ خود ان میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔

کنوؤں کا منشا تو یہ ہے کہ سطح زمین سے نیچے جو پانی ہے اسے جمع کیا جائے مگر تالاب کا مقصد یہ ہے کہ بارش یا ندی کے پانی کو روک کر ضائع ہونے سے بچایا جائے باؤلیوں کی طرح تالاب بھی قدیم ذریعہ آبپاشی ہے جس کا زیادہ تر رواج دکن اور صوبہ مدراس میں ہے مگر مرمت نہ ہونیکی وجہ کثرت سے ایسے تالاب پائے جاتے ہیں جو بالکل بیکار ہیں ہندوستان میں سب سے زیادہ اہم اور حکومت کے نزدیک سب سے مقبول ذریعہ نہروں کا ہے اس سے یہ مطلب نہیں کہ موجودہ عہد ہی کی یہ بھی ایک برکت ہے بلکہ قدیم زمانہ سے ہندوستان میں نہروں کی تعمیر ہوتی رہی جن میں سے اکثر اب بھی

نہروں کو دو طریقوں پر جاری کیا جاسکتا ہے ایک تو براہ راست ندیوں سے۔ دوسرے خزانۂ آب سے۔ پہلی قسم کی مثال صرف شمالی ہند میں ملسکتی ہے کیونکہ بڑی بڑی ندیاں ہیں جو سال کے ہر موسم میں بہتی ہیں اگرچہ سطح آب بارش کے موسم میں بلند اور دوسرے موسموں میں کم رہتی ہے دکن اور جنوبی ہند میں ندیوں کی رفتار تیز ہوتی ہے اور ہر موسم میں ندیاں نہیں بہتیں۔ اسی لیئے جنوب کے علاقوں میں خزانۂ آب کی تعمیر کو بہت اہمیت حاصل ہے برطانوی دور کا نمایاں کارنامہ ہے کہ ملک میں کثرت سے نہریں جاری کی گیئں چنانچہ سندھ میں سکر بیاریج سے (جس کا ماہ جنوری ۱۹۳۲ء افتتاح ہوچکا ہے) تقریباً (۵۲) لاکھ ایکڑ افتادہ زمینات زیر کاشت آجائینگی۔ دریائے ستلج کی اسکیم کے تحت اندازہ کیا گیا ہے کہ (۵۰) لاکھ ایکڑ کے قریب کاشت ہوگی۔ کاویری میٹور پراجکٹ سے تقریباً (۳!) لاکھ ایکڑ۔ کاریائے آبپاشی ساردا" سے تخمیناً (صوبہ جات متحدہ میں) (۱۳½) لاکھ ایکڑ اور صوبہ بمبئی میں لائڈ بیاریج اور خزانہ بھنڈرواراسے (۴½) لاکھ ایکڑ کاشت ہوگی برطانوی دور میں نہروں کی تعمیر کے علاوہ ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صوبہ پنجاب میں نہروں کے کنارے اکثر علاقے آباد کیئے گئے (جیسے لائیل پور۔ شاہ پور وغیرہ) جو نہایت زرخیز اور شاداب ہیں حفظان صحت کا بھی ان نوآباد اضلاع میں معقول انتظام ہے۔ گورنمنٹ نے ان اضلاع پر جو رقم صرف کی اس پر معقول شرح پر منافع حاصل ہو رہا ہے۔

دیسی ریاستیں بھی برطانوی ہند کے برابر ترقی کررہی ہیں میسور کی ریاست میں وسائل آبپاشی کا اچھا انتظام ہے ہمارے حیدرآباد میں بھی کثیر رقم صرف کرکے نہریں جاری کی گئی ہیں اور کئی تالاب گزشتہ چند سال کے عرصہ میں تیار ہوئے جن میں واٹرا۔ پالیر۔ فتح نہر۔ سنگابھوپالم۔ راشن پلی۔ اور پوچارم کے پراجکٹ قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ نظام ساگر کی تعمیر سے حیدرآباد کی معاشی خوشحالی میں زبردست اضافہ ہونیکی توقع ہے اس خزانۂ آب کی تعمیر پر ہماری حکومت نے تقریباً (۴½) کروڑ روپیہ صرف کیا ہے اس پراجکٹ کے تحت تقریباً دو لاکھ بیس ہزار ایکڑ ملکیفصلہ کاشت ہوگی۔ نیشکر کی کاشت کو فروغ دینے کی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں توقع ہے کہ بیس ہزار ایکڑ اراضی پر

عمدہ قسم کے نیشکر کی کاشت ہوگی۔ اور تخمیناً پانچ ہزار ایکڑ باغات ہونگے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ حکومت کو (۴۶) لاکھ سالانہ کی آمدنی ہوگی۔ نہر کے کنارے آبادیاں بسانے کی کوشش کیجا رہی ہے کاشتکاروں کے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا ہوگی اور حفظان صحت کا ان نوآباد علاقوں میں معقول انتظام ہوگا۔

غزل

(جناب محشر صاحب)

اوٹھی بہار سے موج شراب شیشے میں
عروس دہر ہوئی بے نقاب شیشہ میں

لگی نہ منھ کو یہاں دخت رز تو کیا اے شیخ
پری ملیگی وہاں بے حجاب شیشہ میں

بلاکشوں سے پڑا سابقہ تو ساقی نے
شفق کو کھینچ کے رکھدی شراب شیشہ میں

چمن سے چھوٹ کے بلبل کی یاد آتی ہے
عرق عرق ہے خمیر گلاب شیشہ میں

سرور بادہ کشی عارضی ہے کیفیت
خمار کا ہے انوکھا سراب شیشہ میں

طلوع صبح قیامت کا ہو رہا ہے گمان
وہ دیکھتے ہیں نمود شباب شیشہ میں

متاع حسن لٹائے ہے وہ پری پیکر
نظر سے ہو کے نہاں بے نقاب شیشہ میں

تو ان کے چشم فسوں گر کی شوخیاں مت پوچھ
تڑپتی بجلیاں رقصاں شہاب شیشہ میں

لگا ہے لب ساغر صراحی مے سے
کہ حوصلوں کا ہے ساقی حساب شیشہ میں

وفور درد سے سب خشک ہو گئے آنسو
اوٹھے ہیں آہوں کے محشر سحاب شیشہ میں

سیّاح کی کہانی اپنی زبانی

جناب علیم الدین صاحب (نظام کالج)

(۱)

روس کی سیاحت کیلئے میں نے روم کو عین موسم سرما میں اس لئے خدا حافظ کہا کہ وہ سڑکیں جو جرمنی پولینڈ اور لیونیہ کے شمالی حصہ میں ناقابل گذر ہیں برف گرنے کی وجہ قابل عبور ہوگئی ہونگی میں گھوڑے کو بہترین سیاحی سواری سمجھ کر اس پر سوار ہوا۔ اور سیاحت کیلئے چل کھڑا ہوا۔

میرے جسم پر گرم کپڑے زائد نہ تھے اور جیسے جیسے میں شمال مشرق کی طرف بڑھتا گیا اس کو اور محسوس کیا۔ میں نے پولینڈ میں ایک بیچارے غریب کو دیکھا جو شدت سردی کی وجہ سڑک پر کسمپرسی کی حالت میں پڑا کانپ رہا تھا میں از راہ ہمدردی اس پر اپنے چند کپڑے اوڑھا دیے گو اس وقت میں خود بیحد سردی محسوس کر رہا تھا۔ . . . . مجھے آسمان سے ایک آواز سنائی دی " میرے بیٹے! تمہاری اس نیکی کا صلہ ضرور تمہیں ملیگا "

میں آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ چو طرف اندھیرا چھا گیا اور آس پاس کی سب چیزیں نظروں سے چھپ گئیں کوئی گاؤں دکھائی نہ دیتا تھا۔ پورا قصبہ برف سے ڈھکا پڑا تھا اور سڑک کا کہیں نام نشان بھی نہ تھا۔

میں بیحد تھک گیا تھا اس لئے گھوڑے سے اتر پڑا۔ گھوڑے کو ایک کھونٹی سے باندھ دیا جو درخت کی ٹہنی معلوم ہوتی تھی اور برف سے اوپر کو نکلی ہوئی تھی میں نے اپنے پستول نکال کر نیچے رکھدئے اور برف پر دراز ہو کر ایسا بے خبر سویا کہ دوسرے دن کے بڑھتے ہوئے سورج کی کرنوں کے جگائے بغیر بیدار نہ ہوا۔

میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے آپ کو ایک گاؤں کے قبرستان کے درمیان پایا۔ میرا گھوڑا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا لیکن کہیں اور بلندی سے اس کے ہنہنانے کی آواز صاف

سنائی دیر ہی تھی حقیقت یہ تھی کہ گاؤں رات تمام برف باری کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ چونکہ موسم یکدم تبدیل ہو گیا اور برف پگھلنی شروع ہوئی اور سوتے ہیں میں بتدریج قبرستان میں پہنچ گیا اندھیرے میں جس کو میں درخت کی ٹہنی سمجھ رہا تھا اور جس سے میں نے اپنا گھوڑا باندھا تھا دراصل وہ گاؤں کے گرجا کے مینار کی صلیب تھی۔

میں نے فوراً اپنا پستول اٹھا کر فیر کیا اور لگام کے دو ٹکڑے کر دے جس سے گھوڑا زمین پر آرہا اور میں سیاحت کیلئے آگے چل کھڑا ہوا۔

(۲)

روس میں میں نے اپنا زائد وقت شکار میں صرف کیا۔ ایک روز شکار کی تلاش میں بہت دور نکل گیا اور میری گولیاں سب ختم ہو گئیں۔ یکایک خلاف امید مجھے ایک بارہ سنگھا نظر آیا جو میری طرف ایسی خوفناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے کہ اس کو میری خالی بندوق کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ میں نے فوراً اپنی بندوق میں بارود اور ایک مٹھی شاہ دانے بھر دئے اور اس کی طرف نشانہ لگایا جو عین اس کی پیشانی پر دونوں سینگوں کے درمیان لگا وہ بے دم ہو گیا۔ لڑکھڑایا۔ لیکن بھاگ گیا۔

سال یا دو سال بعد، چند دوستوں کے ساتھ میرا پھر اسی جنگل میں دوبارا گذر ہوا۔ وہاں پر میں نے ایک خوبصورت بارہ سنگھے کو دیکھا جس کی سینگوں کے درمیان شاہ دانوں کا ایک بہت بڑا درخت اوگ آیا تھا مجھے فوراً پچھلے سال کے واقعات یاد آگئے اور میں نے ایک ہی نشانہ میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس سے میرے لئے گوشت اور میوہ دونوں مہیا ہو گئے چونکہ درخت اس قدر لذیذ شاہ دانوں سے بھرا ہوا تھا جس کو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں چکھا تھا۔

(۳)

میں ہمیشہ کامیاب نہیں رہا ایک دفعہ ترکیوں سے لڑ رہا تھا کہ بد قسمتی سے ان کی کثیر تعداد کے سبب مجھے اپنی شکست کا اقرار کرنا پڑا۔ میں جنگ کا قیدی بنا لیا گیا اور اس سے بڑھکر میری اور بد قسمتی کیا ہو گی کہ مجھے غلام کی طرح بازار میں نیلام کیا گیا۔ ایام غلامی میں مجھے جو کام ملا تھا وہ سخت

ادرخت طلسماتی تھا لیکن عجیب اور ناگوار تو ضرور تھا کام یہ تھا کہ روزآنہ بادشاہ کی شہد کی مکھیوں کو ان کے مرغزار کو ہانک لیجاتا دن بھران کی خبر گیری رکھتا اور شام کو واپس ان کے چھتوں کو لے آتا۔

ایک روز ایک مکھی غائب ہوگئی میں پریشان ہوگیا اور چوطرف دھونڈنے لگا اور میں نے اس کو پالیا دیکھتا کیا ہوں کہ دو ریچھ اس کو حاصل کرنے کیلئے جھپٹ رہے ہیں میرے پاس سوائے اس شاہی نقرئی کلہاڑی کے جو شاہی باغبانوں اور کسانوں کا نشان تھا کوئی اور ہتھیار نہ تھا ان حملہ آوروں کو ڈرا کر بھگانے اور بیچاری مکھی کو آزاد کرانے کی خاطر میں نے اس کلہاڑی کو اس طرف پھینکا لیکن بدقسمتی سے میرے ہاتھ کی غلط حرکت کی وجہ کلہاڑی اوپر کو آئی اور بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ وہ چاند میں پہنچگئی۔

میں بیحد پریشان ہوا اور اس کو دوبارہ حاصل کرنیکی تدابیر سوچنے لگا مجھے فوراً خیال آیا کہ ترکی پھلی بہت جلد نشوونما پاکر ایک غیرمعمولی بلندی کو پہنچ جاتی ہے میں نے ایک بیج بویا۔ بہت جلد درخت اگ آیا اور بڑھتے بڑھتے چاند کے ایک کنارے سے پیچ مخلوط ہوگیا مجھے سوائے اوپر چڑھنے کے اور کچھ کام نہ تھا۔ جہاں پر میں نہایت عافیت سے پہنچ گیا۔ مجھے اپنی کلہاڑی دھونڈ نکالنے میں بہت سی دقتیں برداشت کرنی پڑیں چونکہ وہ ایک ایسی جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں پر ہر چیز چاندی کی طرح چمکدار تھی۔ آخر کار میں نے اس کو گھانس کے ایک ڈھیر میں پالیا۔

میں واپس ہونا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ سورج کی گرمی نے میری پھلی کو سکھا دیا تھا اور میرے اترنے کے قابل نہ رہی تھی۔ میں پریشان ہوا۔ آخر بہت کچھ سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ اور اس پڑی ہوئی گھانس کی میں نے اتنی لمبی اور مضبوط رسی بنانی شروع کی جتنی مجھ سے ممکن تھی۔ اس رسی کو میں چاند کے ایک کنارے سے باندھکر نیچے اترنا شروع کیا اس کو میں نے بائیں ہاتھ سے مضبوط پکڑ لیا۔ اور سیدھے ہاتھ کی مدد سے اوس اوپر کے حصہ کو میں نے کلہاڑی سے کاٹ لیا جو اب بیکار ہوچکا تھا اور اس کو نیچے کے سرے کو باندھ دیا اس طرح میں بہت کچھ نیچے اتر آیا۔

لیکن اس طرح کے کاٹنے اور باندھنے سے رسی بہت بلندکمزور ہوگئی اور جب میں زمین سے چار یا پانچ میل کی بلندی پر تھا۔ رسی ٹوٹ گئی اور میں تیزی کے ساتھ نیچے گرا۔ میں اس تیزی کے ساتھ

نیچے گر پڑا۔ میں اس تیزی کے ساتھ زمین پر گرا کہ میرے جسم کے بوجھ کی وجہ زمین میں دس گز گہرا گڑھا پڑ گیا اور میں بیہوش ہوگیا مجھے بہت جلد ہوش آگیا لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے بہرحال میں نے ناخنوں سے (جن کی عمر اس وقت چالیس کی تھی) چڑھنے کیلئے سیڑھیاں بنائیں اور اوپر نکل آیا۔

(۴)

بہت جلد ترکوں سے صلح ہوگئی اور مجھے آزادی ملجانے پر میں سینٹ پیٹرز برگ کیلئے چل کھڑا ہوا۔ اس وقت تمام یورپ میں غیر معمولی سردی اور کہر تھی۔

میں نہایت ہی سرعت کیساتھ گاڑی میں سفر کر رہا تھا ایک دن جب ایک تنگ گلی سے گذرنے لگا تو میں نے اپنے سائیس کو ہارن بجانے کیلئے کہا تاکہ اس تنگ راستہ میں کسی اور گاڑی کی ہم سے مدبھیڑ نہ ہو جائے سائیس نے ہارن بجانے میں اپنی پوری طاقت صرف کی لیکن وہ ہارن نہ بجنا تھا نہ بجا۔ اور یہ بہت برا ہوا چونکہ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری گاڑی کی ایک اور گاڑی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ گذرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی میں گاڑی سے اتر پڑا اور چونکہ میں بیحد طاقتور اور مضبوط تھا اس لئے گاڑی کو سر پر اٹھالیا اور ایک نو فیٹ اونچی باڑ کود کر کھیت میں آگیا اور دوسری مرتبہ اسی طرح کود کر سڑک پر اس گاڑی کے پرے آگیا اسی طرح دونوں گھوڑوں کو ایک کو سر پر اور دوسرے کو بغل میں ڈالکر لے آیا۔ اور گاڑی جوت کر آگے چل کھڑا ہوا اور دن ختم ہونے پر ایک سرائے میں قیام کیا۔

میں آپ سے یہ کہنا بھول گیا کہ وہ گھوڑا جو میری بغل میں تھا بیحد شریر تھا اور اس کی عمر چار سال سے زائد نہ تھی جب میں دوسری مرتبہ باڑ کو دنے لگا تو وہ بہت کچھ دولیتاں جھاڑنے لگا۔ لیکن میں نے اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں جیب میں رکھ لیں اور اس طرح اس کو خاموش کیا۔ آخرکار ہم سرائے پہنچکر آرام سے ..... میں اور سائیس کچھ کھاپی کر یہاں پر تازہ ہوئے سائیس نے اپنے ہارن کو چولھے کے اوپر ایک کھونٹی کو لگادیا اور میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔

یکایک ہم نے "ترنگ ترنگ، ٹنگ ٹنگ" کی ایک زوردار آواز سنی۔ میں نے اپنے اطراف

دیکھا اور سمجھ گیا کہ ہارن بجانے سے سائیس کیوں قاصر تھا اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ ہارن سے نکلنے کے پیشتر ہی سائیس کی آواز منجمد ہو جارہی تھی اور اب گرمی لگنے پر پگھل کر نکل رہی ہے اس طرح اس ایمان دار ہارن نے ہمیں بہت دیر تک مختلف اقسام کے ترانوں سے محظوظ کیا — "سلطان پروشیا کی روانگی"، "جھیل اور پہاڑی" اور بہت سے دوسرے۔ آخر کار یہ آوازیں اس طرح ختم ہو گئیں جس طرح اب میں اپنی روسی سیاحت کی داستان کو ختم کر دوں گا۔

اکثر سیاح مبالغہ سے کام لینے میں بہت ماہر ہوتے ہیں اگر کسی کو میری داستان کی سچائی میں شک ہے تو اس سے صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے آپ کی ضعیف الاعتقادی پر رحم آتا ہے اور بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نو، دو گیارہ ہو جائیے تاکہ میں داستان آگے بیان کرنا شروع کر دوں جو اسی قدر صحیح ہے جتنی پچھلی داستانیں۔

غزل

(جناب ضامن صاحب کنتوری)

وہ آئے چشم عاشق سے نگاہ واپسیں نکلی
کسے معلوم حسرت دل کی نکلی یا نہیں نکلی

نہ پایا چین اک دن عمر گردش میں کٹی ساری
میرے حق میں فلک سے بھی سوا یہ سرزمیں نکلی

ملایا خاک میں ہم کو امید سرفرازی نے
تواضع کش کسی مغرور کی چین جبیں نکلی

دیا اکثر ہمیں دھوکا حبابوں کی نمائش نے
گہر تھے جس صدف کے بطن میں وہ تہ نشیں نکلی

میری کشتی لب تسنیم نکلی یا لب کوثر!
نہ نکلی صحن میخانہ میں جب پھر کیا کہیں نکلی

وہ دولت تھک گئے تھے ہر جگہ پر ڈھونڈ کر اس کو
خدا کی شان ہے ویرانہ دل کے قریں نکلی

خبر کیا تھی قناعت بار ہے ضامن یہ ناکامی
جسے تلخی غم سمجھے ہوئے تھے انگبیں نکلی!

داماد

(جناب سید ظہیر الدین صاحب)

نلینی علی پور میں پوسٹ ماسٹر تھا۔ دوپہر کے وقت خاموش اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ چونکہ پوجا کا تہوار قریب تھا وہ چھٹی لیکر الہ آباد اپنے سسرال جانے کیلئے بیتاب۔ مگر اس کی درخواست کا اب تک کوئی جواب نہیں ملا۔ اگر اس وقت بھی اسے معلوم ہو جاتا کہ اسے چھٹی مل گئی تو شام کی ڈاک گاڑی سے وہ الہ آباد روانہ ہوسکتا۔ شادی ہوکر دوسال کا عرصہ گذر چکا۔ لیکن اس درمیان میں اب تک، وہ ایک مرتبہ بھی سسرال نہ جاسکا اپنے ساتھ وہ گھر کے بچوں کیلئے کھلونے۔ کچھ مٹھائیاں عورتوں کیلئے خوشبو تیل۔ صابن خرید چکا تھا۔ بکس بستر بھی وہ باندھے تیار صرف چھٹی کے انتظار میں تھا۔ چار بجے ٹیلیفون کی گھنٹی ٹن! ٹن! ٹن! بجی نلینی نے رسیور کو بیتابانہ کان سے لگایا۔

"ہلو!"

لیکن چھٹی کی کوئی اطلاع نہ تھی ایک منی آرڈر کے متعلق تفتیش تھی جو غلط تقسیم ہوگیا تھا نلینی انتہائی آزردگی کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور جیب سے ایک خط نکال کر پڑھنے لگا۔ یہ اس کی بیوی کا خط تھا۔ اس عطوفت نامہ محبوب کو وہ کئی بار پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ مگر ایکمرتبہ اس نے اس کو پھر پڑھا۔

پیارے!!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ بڑی حد تک اطمینان نصیب ہوا۔ اور خوشی ہوئی کہ جدائی کے طویل ترین لمحے اب ختم ہورہے ہیں میری بدقسمتی کے لئے یہی کیا کم ہے کہ شادی کو دوسال ہوگئے لیکن ہم ٹھیک ایک دوسرے سے نہ مل سکے تھے۔ خدا کرے آپ کو چھٹی مل جائے "مجدی" آج دیناج پور سے آگئی ہے۔ لکھنے کو دل تو بہت کچھ چاہتا ہے اور بہت کچھ لکھا بھی جا سکتا ہے مگر اس بہت کچھ لکھے جانے کے بعد بھی یہی رہیگا کہ ابھی کچھ نہیں لکھا۔

آپ کی "سروجنی"

ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی نیلنی نے ٹیلیفون اوٹھایا۔

"ہاں ؟"

(۲)

آخرکار دو ہفتہ کی چھٹی مل ہی گئی۔ وہ الہ آباد جانے کیلئے بیقرار تھا۔ اسے صرف بیوی ہی سے ملنا نہ تھا۔ اسے "مجدی" سے بھی انتقام لینا تھا۔

نلینی کی جب شادی ہوئی تھی۔ وہ بالکل دُبلا پتلا تھا۔ اوس کے رخسار نازک اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں نرم تھیں اس کی گردن بالکل دستہ عاج تھی۔ اس کے جسم میں بڑی حد تک زنانہ نزاکت تھی۔ اسی لئے اس کی سالی "مجدی" ہمیشہ مذاقاً کہا کرتی تھی۔

"دولہا بھائی تو نرگس ہیں۔ شاخ گل ہیں"

انسان کی طبیعت پر نصیحت کے خشک جملے اس قدر اثر نہیں کرتے ہیں لیکن مذاق وطنز کا ایک ایک لفظ دل میں چبھ جاتا ہے اور مذاق بھی جب ایک خوبصورت عورت کرے اور وہ عورت بھی جو رشتہ میں سالی ہو۔ اس وقت ایک ایک لفظ کی طاقت ہزار گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔

شادی کے بعد "نلینی" "کلکتہ" چلا آیا تھا۔ سسر صاحب الہ آباد واپس جا چکے تھے لیکن سالی کے طنزیہ جملوں کی آواز ابتک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "دولہا بھائی تو نرگس ہیں شاخ گل ہیں" ایکمرتبہ جب وہ تھکا ماندہ دفتر سے واپس آکر بیٹھا ہوا تھا۔ معاً اس کے دماغ میں ایک نیا خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے آپ کو ایک مضبوط۔ تنومند۔ خوشرو نوجوان بنا سکتا ہے دوسرے ہی دن اس نے بازار سے ایک جوڑا "سینڈو زڈمبل" خریدا۔ روزآنہ گھر پر ورزش کرنے لگا۔ روزآنہ کی خوراک میں بھی اس نے خاصی تبدیلیاں کیں۔ غیر مفید چیزوں کی جگہ اس نے گھی۔ مکھن۔ انڈے۔ اور پھلوں کو نسبتاً زیادہ کھانا شروع کردیا۔ ایک سال کے بعد کی متواتر ورزشوں کے بعد واقعی اب وہ بہت زیادہ مضبوط تنومند ہوگیا تھا اس خیال سے کہ مردانہ حسن پورا نمایاں ہو جائے اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ بندوق کا لائسنس بھی لےچکا تھا اور چھٹی میں اکثر آس پاس کے قریبی گاؤں میں

شکاریوں کے ساتھ وہ شکار کرنے بھی جایا کرتا تھا۔ دو سال اسی طرح گذر گئے اب نیلنی وہ "پہلا نیلنی" نہ تھا۔ اب اس کا جسم ورزشی تھا۔ اب اس کی پنڈلیاں سخت۔ بازو مضبوط۔ اور سینہ و مونڈھے بھی ابھرے ہوئے اور چوڑے تھے حقیقتاً اب اسے شاخ گل سے کوئی مناسبت نہ تھی۔

(۳)

دوسرے دن دو بجے نیلنی الہ آباد پہنچ گیا اس وقت وہ ڈھیلی لنگی۔ لمبا پنجابی کوٹ۔ اور ایک بڑی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ اور ہاتھ میں موٹا ڈنڈا تھا۔ سامان میں ایک بندوق بھی تھی جسے وہ فرصت کے دنوں شکار کے خیال سے ہمراہ لیتے آیا تھا۔ "نیلنی" نے چاروں طرف دیکھا کہ اسے کوئی لینے ضرور آیا ہوگا کیونکہ اس نے ایک تار اپنی آمد کا پہلے ہی کر دیا تھا مجبوراً اپنے سامان کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آکر اس نے تانگہ والے سے پوچھا۔ دیا بندرناتھ بابو وکیل کا گھر جانتے ہو؟؟

ہاں بابو آ بیٹھے!!

نیلنی تانگہ میں سوار ہوگیا۔ آدھے گھنٹہ کے بعد تانگہ ایک بڑے کمپونڈ والے مکان کے دروازہ پر آکر رکا۔ سامنے ہی سائبان میں ایک نو دس برس کی لڑکی کچھ کھیل رہی تھی کمپونڈ کے اندر ہی ایک ملازم کنوئیں پر برتن دھو رہا تھا تانگے سے اترتے ہی نیلنی نے پوچھا!

دیا بندرناتھ بابو وکیل کا گھر یہی ہے۔

جی ہاں۔

وکیل صاحب اندر ہیں۔

جی نہیں۔ وہ کیدار بابو کے یہاں گئے ہیں۔

خیر اندر جاؤ اور کہو جمی بابو آگئے ہیں۔

لڑکی سنتے ہی دوڑ کر اندر گئی اور بولی جمی بابو آگئے۔ رامچرن نوکر نے ہنستے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ جمی بابو یہی ہیں؟ اور جلدی سے اپنے ہاتھوں کو دھو کر نیلنی کو جھک کر آداب بجا لایا۔ رامچرن نے تمام سامان تانگے سے اتارا۔ گھر کے تمام بچے دوڑ کر جمی بابو سے ملنے آئے۔

ایک لڑکی نے گلاس میں شربت دیتے ہوئے کہا۔

"جی بابو شربت پئیں!"

نلینی نے گلاس کو منہ سے لگایا اور ایک گھونٹ پیتے ہی سب تھوک دیا کیونکہ یہ محض مذاقاً نمک کا پانی دیا گیا تھا۔ راجرن نے بازو والے کمرہ میں کھانا تیار رکھا تھا۔ آکر اطلاع دی۔

بابو آئیے کھانا تیار ہے!

نلینی خاموش اوٹھکر کمرہ میں گیا اور کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اس اثنا میں اسے پیر کے کڑوں کی جھنکار سے محسوس ہوا کہ کوئی عورت آرہی ہے "یہ چھوٹی سالی ہے" نلینی نے اپنی موٹی کلائیوں کی نمائش کیلئے اپنی آستینوں کو اوپر چڑھا لیا۔ تاکہ اس کی مضبوط موٹی کلائیاں بہ آسانی معلوم ہو سکیں۔

"شکر ہے اتنے دنوں بعد آپ کو ہمارا خیال آیا"

جوان عورت کی آواز تھی۔ نلینی نے گردن اوٹھائی ہر ایک نے دوسرے کو دیکھا لیکن نلینی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ یہ اس کی سالی مجدی نہ تھی عورت سراسیمہ اپنے انچل کو منہ پر کھینچے ہوئے کمرہ کے باہر بھاگی۔

تم کیوں بھاگ آئیں کیا ہوا؟

(ہانپتے ہوئے) خدا کیلئے بچاؤ یہ تو کوئی اور ہی اجنبی ہے۔

"کیا اجنبی ہے ہمارا . . . . . نہیں ہے

"نہیں وہ وہ نہیں ہے

"پھر کون ہے

"مجھے کیا معلوم کون ہے

"پھر کیا یہ کوئی چور ہے کیا؟

"یقیناً وہ معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے

ایک لڑکا بولا "اجی اس کے ساتھ ایک بندوق بھی ہے

"آئیں بندوق! رامچرن۔ رامچرن، کہاں ہو۔ دوڑو بابو کو جا کر اطلاع دو کہ ایک لیڈر آ گیا ہے۔
اسی اثنا میں نلینی کی نظر ایک قانون کی کتاب پر پڑی جس کی جلد پر سنہرے حرفوں سے M.N. Ghosh لکھا ہوا تھا اور یہ مکان مہا بندر ناتھ گھوش کا تھا اور یہ اب تانگے والے کو غلطی نام کے اشتباہ سے ہوئی تھی کہ نلینی بجائے اپنے سسر کے مکان کے غیر کے گھر پہنچ گیا تھا۔

(۴)

رامچرن بھاگتا ہوا کیدار بابو کے گھر پہنچا چھٹی کی وجہ سے آج ان کے یہاں کافی مجمع تھا لوگ شطرنج کھیل رہے تھے۔ مہا بندر ناتھ بابو گھوش۔ مہا بندر ناتھ بابو نبرجی (نلینی کے سسر) اور شہر کے دوسرے وکلا بھی بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے اسی اثنا میں رامچرن ہانپتا ہوا اندر آیا اور مالک کو دیکھتے ہی چلایا۔

بابو! بابو! فوراً گھر چلئے۔

اس کا دم پھول رہا تھا۔ خوف و دہشت سے اس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مہا بندر ناتھ بابو گھوش نے گھبرا کر پوچھا۔

" خیریت ہے کوئی بیمار ہو گیا کیا؟

نہیں۔ ایک چور ——— گھر ——— کے اندر ——— گھس آیا ہے

چور، چور، اس دن دھاڑے میں!

ڈاکو ہے یا پگلا یا چور خدا معلوم کون ہے کہتا ہے کہ میں بابو کا داماد ہوں۔

داماد کا لفظ سنتے ہی سب ہنس پڑے۔ مہا بندر ناتھ بابو نے دوبارہ پوچھا یہ وہ کس وقت آیا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

تین بجے آیا۔ زنانہ حصہ میں بیٹھ کر اس نے کھانا کھایا اور اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی اور ساتھ میں ایک بندوق بھی ہے۔ عورتیں بڑی خوفزدہ ہیں۔ جلدی چلئے۔

لاٹھی اور بندوق بھی لایا ہے۔ بدمعاش۔

بیچارے پاگل کی طرح بھاگتے گھر پہنچے اور سائبان میں چیخ کر پوچھنے لگے " وہ کہاں ہے ؟"

" نلینی " کمرہ سے باہر سائبان میں آیا اور سلام کرتے ہوئے اس نے پوچھا " آپ ہی مہا بندر ناتھ بابو ہیں میں آپ سے معافی چاہتا ہوں ۔

مہا بندر ناتھ بابو نے گھبراتے ہوئے پوچھا ۔ تم کون ہو ؟

میرا نام نلینی کنتا مکرجی " ہے میں بابو مہا بندر ناتھ بنرجی کا داماد ہوں ۔ میں نے تانگے والے سے مہا بندر ناتھ بابو وکیل کا گھر کہا تھا وہ مجھے یہاں لے آیا لیکن مجھے یہ غلطی ابھی معلوم ہوئی ۔ میں صرف معافی کے لئے ٹھیرا ۔ ورنہ چلا جاتا ۔

مہا بندر ناتھ بابو کو اب تسکین ہوئی اور انہیں بیساختہ ہنسی آگئی بولے ۔ یہاں ایک ہی نام کے دو وکیل ہیں جن سے اکثر موکلوں کو بھی غلطی ہو جاتی ہے لیکن داماد کی غلطی کا یہ پہلا ہی موقع ہے ۔

انہوں نے نلینی کے لئے تانگہ منگوا دیا اور وہ معافی مانگتا ہوا رخصت ہو گیا ۔

(۵)

کیدار بابو کے یہاں کھیل ختم کر دیا گیا تھا تھوڑی دیر لٹیرے ڈاکوؤں اور شہری چوروں کے متعلق لوگوں نے مختلف قسم کے قصے بیان کئے پھر سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے ۔ مہا بندر ناتھ بابو بنرجی بھی اپنے گھر واپس آگئے نوکر سے چائے اور حقہ مانگا اپنے کمرہ میں بیٹھکر چائے پی اور پھر آنکھیں بند کرکے حقہ کا دم لینے لگے ۔ جسے نوکر بڑی چلم رکھکر پنکھا جھیل رہا تھا تھوڑی دیر میں انہیں تانگے کے پہیوں کی سرسراہٹ معلوم ہوئی لیکن یہ تو مکان ہی ایک وکیل کا تھا صبح سے شام تک لوگ آتے جاتے رہتے تھے اس لئے انہوں نے کچھ خیال نہ کیا آنکھیں بند کرکے بدستور حقہ پیتے رہے ۔

کیا مہا بندر ناتھ بابو وکیل کا یہی گھر ہے ؟

جی ہاں

اطلاع کرو کہ میں بابو کا داماد آیا ہوں ۔

داماد کا لفظ گویا بم کا گولا تھا ۔ سنتے ہی مہا بندر ناتھ بابو چونک کر کرسی سے اٹھے اور

کھڑکی کے پردہ کو اٹھا کر انہوں نے دیکھا ـــــ باہر ایک مضبوط جوان آدمی جس کے ہاتھ میں موٹی لاٹھی تھی کھڑا ہوا تھا اور تانگے والا گاڑی میں سے بندوق اتار رہا تھا۔ مہابندر ناتھ بابو چیختے ہوئے باہر برآمدہ میں آئے۔

ارے کوئی ہے، بدمعاش یہاں سے نکل، چور کہیں کا۔ شہر کا چکر لگاتا ہوا اب ادھر آیا ہے کوئی اور گھر سسرال بنانے کو نہ ملا تھا۔ پاجی۔ بدمعاش۔ الو۔

گھر کے نوکر چاکر دربانی سب دوڑ پڑے مہابندر ناتھ بابو نے گرج کر کہا "اس بدمعاش چور کو یہاں سے نکالو۔ گردن پکڑ کر۔ بیہودہ کو باہر کردو۔" دربان ذرا آگے بڑھا اور چاہتا تھا کہ دھکہ دیکر مارے کہ نلینی نے اپنی لاٹھی کو زوروں سے گھما کر کہا "خبردار اگر ہاتھ لگایا تو ہڈی توڑ دوں گا۔"

نلینی کی وجیہہ صورت اس کے جسم کے ڈیل ڈول اور قوی بدن کو دیکھکر دربان کو مزید مزاحمت کی ہمت نہ ہوئی۔ نلینی نے مہابندر بابو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں جانتا ہوں لیکن آپ کو دھوکا ہو رہا ہے۔ میں نلینی آپ کا داماد ہوں۔

مہابندر بابو کے غصہ کی اب انتہا نہ رہی غصہ سے دم پھول گیا آنکھیں لال ہوگئیں۔ منھ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ اچھل اچھل کر چیخ رہے تھے، بدمعاش۔ شیطان تم اپنے سسر کو جانتے ہو اور میں ایسا احمق ہوں کہ اپنے داماد کو آپ نہیں جانتا ہوں؟ کیا وہ تمہاری طرح چھٹا لیٹرا ہے۔ مردود یہاں سے نکل ورنہ ابھی پولیس بلواتا ہوں نامعقول کہیں کا چور۔ نلینی نے مصلحت وقت خاموشی میں دیکھا چپ چاپ تانگہ میں بیٹھ گیا اور اسے اسٹیشن چلنے کو کہا۔

(۶)

مہابندر بابو ذرا دم لیکر زنانخانہ گئے ان کی بیوی بولیں۔

خبط کیوں؟ ذرا ہوش ہے کہیں، داماد کو یوں نکالا کرتے ہیں۔

کیا کہا داماد۔ اجی وہ تو لیٹرا چور تھا۔

کیسے معلوم کہ وہ چور تھا۔

دہا بندر بابو نے ابتداء سے انتہا الف تا ی وہ تمام باتیں سنا دیں جو انہوں نے کیدار با
کے یہاں سنی تھیں۔ اس پر بیوی بولیں۔
لیکن اس سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ڈاکو چور تھا دونوں کا ایک ہی نام ہے شا
وہ غلطی سے پہلے وہاں چلا گیا ہوگا۔
دہا بندر بابو نے تمام واقعات کو از سر نو غور کرنا شروع کیا لیکن لاٹھی کا خیال ان کے دماغ کو
برابر پریشان کر رہا تھا اور بندوق کی دہشت سے ان کے حواس اس درجہ پراگندہ تھے کہ وہ اب تک
اس قابل نہ ہوئے کہ معاملہ کو صحیح طرح سمجھ سکیں۔ بولے۔ بالفرض اگر داماد ہوتا تو پہلے ضرور کوئی اطلا
کرتا۔ ہم اسٹیشن جاکر خود لاتے کیا کوئی داماد پہلی بار سسرال اس طرح اچانک آیا کرتا ہے؟ بغیر اطلا
مجھدی بولی۔ وہ دلہا بھائی ہرگز نہ تھے میں نے بھی اس لفنگے کو دیکھا تھا۔ دہا بندر بابو
تم نے کیسے دیکھا؟
جب ہنگامہ و شور ہوا میں کوٹھے پر چڑھ گئی نلینی بھائی تو چینی کی مورت ہیں۔ یہ تو کوئی پہلو
بدمعاش صورت شخص تھا۔
یہی تو میں نے بھی اس تُچّے سے کہا کہ کیا میں اپنے داماد کو نہیں پہچانتا ہوں وہ تو بالکل
موم کا پتلا ہے اور یہ! یہ تو جیسے کوئی کاشی کا گنڈا ہو۔
اسی درمیان میں نوکر نے ایک تار لا کر دیا۔ یہ وہی نلینی کا تار تھا۔ تار پڑھکر دہا بندر بابو
زرد اور صورت پریشان ہوگئی۔ بیوی نے پوچھا۔ کیا خبر ہے؟
دہا بندر بابو کے تمام اعضاء ڈھیلے بت کی طرح خاموش نہایت ہی آہستگی سے بولے۔ تا
واقعی نلینی ہی تھا۔
پھر؟ جاؤ اور اونہیں واپس لاؤ۔
ہاں۔ میں جاتا ہوں۔ کیا کیا جاوے اس نے ٹانگہ والے سے اسٹیشن چلنے کہا تھا۔ کلکت
والی اس وقت کوئی گاڑی نہیں ہے۔ لامحالہ اسٹیشن پر ہوگا۔ میں جاکر منت سماجت کرکے

واپس لاتا ہوں۔

نلینی جب دوبارہ سسرال آیا تو اس نے اس واقعہ کا مطلق کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ہر شخص بجائے خود شرمندہ و متاسف تھا اور یہ بہت کافی تھا۔ ہاں ایک دن جب دیا بندر بابو گھوش کا کوئی شخص تذکرہ کر رہا تھا۔ اس وقت نلینی نے صرف اتنا کہا۔

"بہرحال کچھ بھی ہو جیسا ہمارا "خوش آمدید" میرا دوسرے کے سسرال میں کیا گیا۔ اتنا بہت سے بدقسمتوں کو اپنے سسرال میں بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔"

حسیات

(جناب نبی الحسن صاحب شمیم بی۔ اے)

جو تیرا شکر کریں اور لوگ بھی یارب — مصیبتوں میں ہنسیں اور لوگ بھی یارب
ہر ایک شعر سے ظاہر ہو جذب دل میرا — کہ بے خبر نہ رہیں اور لوگ بھی یارب
جو میرے دل میں ہو آئے وہی زبان پہ مری — اسی کو منہ سے کہیں اور لوگ بھی یارب
دل و جگر میں ہے جو سوز منتشر ہو جائے — مری طرح سے جلیں اور لوگ بھی یارب
مجھے جو دار پہ کھنچوائے میری حق گوئی — تو ایسی موت مریں اور لوگ بھی یارب
فنا دلیل ہے احساس فرض ہونے کی — میں مٹ گیا ہوں مٹیں اور لوگ بھی یارب
لئے ہوئے مجھے پھرتا ہے درد ملت کا — تڑپ تڑپ کے اٹھیں اور لوگ بھی یارب
شمیم کو تو بنا دے نمونۂ قدرت — جو وہ کرے وہ کریں اور لوگ بھی یارب

قلعہ کپّل کو دیکھکر

نواب سالار جنگ بہادر کی جاگیر کا یہ قلعہ سلاطین بہمنیہ کے باجگزار ہندو راجاؤں کی تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ مشہور قلعہ جنوبی ہند کے نہایت مضبوط قلعوں میں سے ایک ہے۔ اس پر صرف معمولی مقابلے ہوا کئے اور اکثر یہ بیجانگر کے سرکش راجاؤں کی وجہ سے سرداران بہمنیہ کی قیامگاہ بنا رہا۔ راقم کے وطن کی یہ بہترین یادگار ہر سیاح کے دل پر اپنی عظمت کے نقش مرتسم کئے بغیر نہیں رہتی — انہیں جذبات کا یہ حقیقی مرقع پیش نظر ہے۔ (سید ابو الفضل)

انسان کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے کوہ — کہتے ہیں حسن کو "جنگ" خلل ہے دماغ کا (غالب)

اے عظمت رفتہ کی پرشکوہ یادگار! کیا تیرے سینہ میں اب بھی فتح کی مسرت کا احساس یا شکست کا دلخراش زخم باقی ہے؟ کیا تیرے کان اب بھی مصروف جدال سپاہیوں کی کشمکش باہم کی صدا اُول اور جانکاہ نالوں کے سننے کو بیتاب ہیں!! اے قدرت کے اٹل قانون کے پرہیبت نمونے! جانباز سپاہیوں اور بہادر سرداروں کو درس عبرت دینے والے پہاڑ! کیا تیرے سینہ کی یہ امٹ لکیریں تیرے غمہائے نہانی کے اُبھرے ہوئے نقوش ہیں جن کو باوجود صدیوں کی اشک فشانی کے تو بھلا نہ سکا؟!!

جنگ وجدل کے پُر آشوب زمانہ میں بہادران قوم تیری محصور دیواروں میں نبرد آزما رہتے اور دوسری طرف بیفکر بچے مصروف لہو لعب ہوتے! جنھیں اس وحشت ناک منظر سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔

زمانہ قدرت کے ان ننھے پروانوں کے پروان چڑھنے میں مدد دیتا — وہ کھیل کود کر بڑے ہوجاتے۔ بالآخر آلات حرب سے مسلح . . . ذرہ بکتر سے لدے پھندے وہ تیرے اعضا پر چلتے پھرتے لیکن تیری نظروں میں وہ ابھی بچے ہی ہوتے۔

جوان سے بوڑھے اور بوڑھوں سے آگے چلکر وہ نحیف و ناتوان ہوجاتے اور اپنے بچوں کو نصیحت آمیز

گفتگو کیا کرتے لیکن ان کی اس پیرانہ سالی اور ناصحانہ انداز پر تیری کہن سالگی ہنس دیتی اور صد اسے خاموش سے کہنے لگتی۔

"میرے بچے کس قدر جلد اپنے آپ کو تجربہ کار اور بوڑھے سمجھنے لگتے ہیں۔ . . . ." اس کے ساتھ ہی تیری اس قدیم لوری کو سنتے ہوئے تیرے دامن میں وہ ہمیشہ کے لئے سو جاتے !!

(*)

لوگوں نے مجھ سے "انقلابات زمانہ" عالم فانی" کشمکش حیات "عیش و نشاط" رنج و غم" غصہ نفرت اور جنون" کے معانی دریافت کئے — ان کے تجربے اور ان کی عقلیں اس قابل نہ تھیں کہ زندگی کے راز کو ضبط تحریر میں لاسکیں نسلیں یونہی عالم بقا کو سدھارتی رہیں . . . .

اس سے تنگ آکر انہوں نے اس راز کے حل کرنے کو تجھ سے مدد لینی چاہی لیکن باوجود اس راز سے آگاہ ہونے کے تو نے نہایت تحمل اور بے انتہا ضبط سے کام لیکر ان کو اس دنیا کی تفسیر سے آگاہ نہ کیا — کیونکہ تو جانتا تھا کہ اگر درد و غم کی وہ امٹ کتھا تو اپنے بچوں کے گوش گزار کر دیتا تو ممکن تھا کہ امید موہوم کی تکمیل کے ایقان کے باوجود یہ دنیا ان کے خیال میں "ناقابل بسر" ہو جاتی !!

کہہ رہی ہے تیری خاموشی ہی افسانہ تیرا کنج خلوت خانہ قدرت ہے کاشانہ تیرا

پوجا پاٹ کو جانیوالی رانیوں ! اور داسیوں کے حلقہ میں گھری ہوئی شہزادیوں کے زیور سے آراستہ قدموں کی سریلی جھنکار اور ان کی سحر آگیں موسیقی سے تیرے کان لطف اندوز ہوتے رہے !

دوسرے رازوں کی طرح تو نے اپنے دل میں نوجوان حسین کماروں اور مہ جبین شہزادیوں کے دل کی کتھاؤں کو بھی محفوظ رکھا ! تیری آنکھیں ان مناظر سے خوب واقف رہیں جب سر شام کسی تالاب کے کنارے "اپنی" نوخیز حسینہ کے تصور میں کسی جوان رعنا نے انتظار کی لا انتہائی ساعتوں کو اپنے آشیانوں کو واپس ہونے والے طیور کے گننے میں کاٹے !!

کبھی یوں ہوتا کہ اس جانکاہ انتظار کے باوجود شہزادی کو اس بات کی اجازت نہیں ملسکتی تھی۔ کہ وہ سیر کیلئے باہر جائے — آہ ! مایوس تمنا نوجوان کس حسرت سے گھر واپس ہوتا تھا۔

یا کبھی شہزادی آ ہی جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو بیتاب دل ملجاتے ۔ ۔ ۔ شکوہ ہائے رنگین کے بعد وہ پریم کی دنیا میں کھو جاتے ! حتیٰ کہ آسمان میں چاند اور ستاروں کی حکومت قایم ہو جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ستاروں کی شوخ اور بیباک نگاہوں سے وہ پسینہ پسینہ ہو جاتے ۔!!

ماہ کامل کی وسیع نورانی دنیا میں یہ محو خرام ہو جاتے یا پانی کی نقرئی سطح کے پرسکون ماحول میں اپنی کشتیوں میں بیٹھکر نرم و نازک موسیقی کی ایک دنیا پیدا کر دیتے ۔

چھوٹی چھوٹی موجیں کنارے سے آ کر نہایت مدھم آواز سے چھوتیں کہ کہیں ان حسین نوجوانوں کی سرگوشی میں خلل انداز نہ ہوں ۔

مست فضائیں ! نکہت بیز ہوا !! اور پُرسکون ماحول ان کو بیخود بنا دیتا اور یہ اسیران الفت ـــــ اسیران دام خیال ہو کر رہ جاتے ـــــ آہ ! تو نے یہ سب کچھ دیکھ لیا ہے !!!

سازشی دشمنوں اور نمکحرام سپاہیوں کی پرمکر و فریب چالوں اور تجویزوں کو بھی تو نے سُن لیا ہے لیکن تیرے صبر نے یہاں بھی تجھے افشائے راز سے باز رکھا !

زیادہ سے زیادہ تو نے اپنی قدرت سے یہی کیا کہ محو خواب راجہ کے قتل کو جانے والے بدطینت سردار کو اپنے سینے سے پھسلا کر گرا دیا جہاں اس کا جسم چکنا چور ہو کر رہگیا اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا ـــــ ہاں تو نے غافل راجہ کی اس طرح جان بچالی !

زمانہ بدل گیا ۔ جنگ کے طریقے بدل گئے ۔ لوگ تبدیل ہو گئے ۔ انسانوں نے امن کو حرب پر ترجیح دی ۔ ہر طرف ترقی و اصلاح کا دور دورہ ہو گیا ۔ محنت اور جفاکشی کی اس سادہ زندگی کو بھول کر لوگ عیش و آرام کی طرف مائل ہو گئے ـــــ عیش و طرب سے ان کے اعضاء کمزور اور ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے ـــــ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے دشمنوں کی جانیں تلف کرنے کے نہایت آسان مگر خوفناک طریقے ڈھونڈنے شروع کئے ـــــ جہاں تیری ضرورت مفقود تھی ۔

"تاہم تہذیب انسانی کے اے زبردست رہنما! قدرت کے اٹل قوانین کے درس اولین میں تو اب بھی یہی دہرا رہا ہے"۔

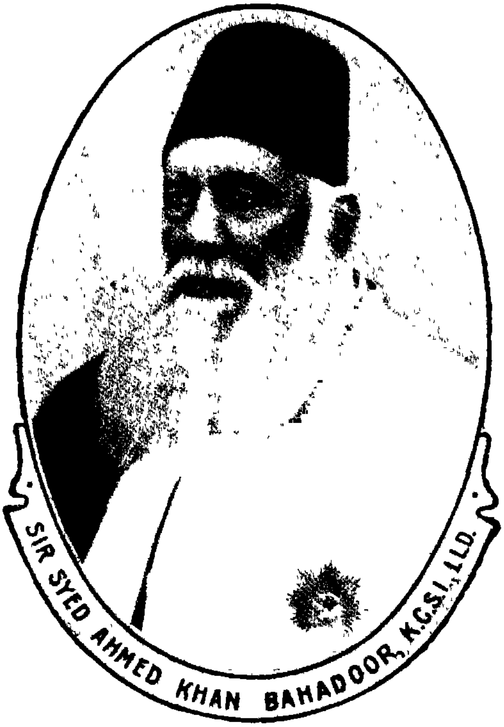
"آنکھ اے دل کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ — اس فضا کو اس گل و گلزار کی رنگت کو دیکھ"
"اپنی پستی دیکھ اور اس "کوہ کی رفعت کو دیکھ — اس خموشی میں سرور گوشۂ عزلت کو دیکھ"
"شاہد مطلب ملے جس سے وہ یوں سامان ہیں"
"درد دل جاتا ہے جس سے وہ یوں درمان ہیں" (اقبال)

عفو عام کی بشارت

بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ "اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہوگے اور مجھ سے آس لگائے رہوگے میں تمہیں بخشتا رہونگا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں مجھے پروا نہیں اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی چاہو تو میں معاف کردوں۔ خواہ تم میں کچھ ہی عیب ہوں۔ مجھے پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم ہمارے پاس آؤ، اور میرا کسی کو شریک نہ بناتے ہو تو میں تمہارے پاس پوری زمین بھر مغفرت لیکر تمہارے پاس آؤں، کیا انسان کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے؟

"اے ربانی عشق و محبت کے طلبگارو! اگر واقعی تمہارے دل فانی محبت سے ہٹ کر کسی باقی کی محبت کے خواہشمند ہیں؟ اگر درحقیقت تمہیں ازلی و ابدی محبوب کی تلاش ہے؟ اگر در اصل تمہارا جسم نہیں بلکہ تمہاری روح کسی کی محبت کی سرشاری کیلئے بیتاب ہے تو آؤ کہ یہ دولت صرف "اسلام" کے آستانہ پر بٹتی ہے اور اسی خزانہ سے ملتی ہے"

(سید سلیمان ندوی)


SIR SYED AHMED KHAN BAHADOOR, K.C.S.I., LL.D.

شہاب

جلد (۳) بہمن ۱۳۴۴ف م دسمبر ۱۹۳۴عیسوی نمبر (۲)

(مرتبہ)
محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (للعہ)
گورنمنٹ سے (عسہ)

(برقی پریس ... میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد سے شائع ہوا)

ذرات

(۹)

معین الدولہ آل انڈیا کرکٹ ٹورنمنٹ نے تین ایک سال سے ملک میں کرکٹ جیسے مردانہ کھیل کی ایک لہر دوڑا دی ہے جس کی بدولت ہر سال ہندوستان کے بہترین کھلاڑیوں کا کھیل گھر بیٹھے دیکھنے میں آرہا ہے چنانچہ اب کے بھی ۱۴ نومبر کو اس کا آغاز ہوا۔ اور ہندوستان کی بہترین کھلاڑی جمع ہوئے تھے "یہ کپ" جو طلائی اور نہایت قیمتی ہے رولنگ قرار دیا گیا کہ تین سال تک مسلسل جیتنے والی ٹیم کا حق ہوگا اس مسابقت میں "فری لوٹرس" بمبئی دو سال سے بازی لیجا رہی تھی اور اس سال اس کپ کے دائمی استحقاق کیلئے فری لوٹرس نے کوشش کی تھی کہ ٹیم نہایت شاندار بن جائے لیکن عجیب اتفاق ہوا کہ "یوراج ٹپیالہ" نے اب کے ایک نئی ٹیم "ریٹریورز" تیار کرکے بہترین کھلاڑی اپنے یہاں جمع کرلئے جس میں وزیر علی۔ نذیر علی۔ کے نیتی۔ نائڈو۔ نثار۔ امرناتھ جیسے مشہور کھلاڑی تھے۔ یہ سہ روزہ مقابلہ نہایت دلچسپ اور دونوں ٹیموں کیلئے عجیب امید وبیم کی حالت میں گزرا۔ ایک ٹیم دوسری ٹیم سے بازی لیجانے میں مصروف تھی لیکن ۲۰ نومبر کو میدان یوراج ٹپیالہ کی ٹیم کے ہاتھ رہا۔ اس طرح اور دو سال تک اعلی کھلاڑیوں کو پھر دیکھنے کا اتفاق ہوگا۔

اب کے "فری لوٹرس" کی جانب سے ویسٹ انڈیز کے مشہور "بولر" کانسٹنٹائن کی بولنگ بھی حیدرآباد والوں نے دیکھ لی۔ شک نہیں کہ اس کی بولنگ قابل بولنگ تھی کھلاڑیوں میں بڑی حد تک ناامیدی پھیل گئی۔ مگر ہوا وہی جو قدرت کو منظور تھا جس طرح گذشتہ دور میں سر وقار الامراء نے حیدرآباد میں "پولو" کو زندہ کر دیا تھا اوسی طرح نواب معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ نے کرکٹ کی برقی رو دوڑا دی۔ ہے۔ کیا تعجب کہ مستقبل میں حیدرآباد بھی کئی نذیر علی اور نائڈو و نثار پیدا کردے۔ ملک میں ایسے مردانہ کھیلوں کی شدید ضرورت ہے۔

ماہے آہی

۱۳۱۵ھ عفرلہ

جناب سید مودود احمد صاحب (تشنہ)

طریق مختصر پر گر تیرے القاب یکجا ہوں ۔۔۔ تو مشکل ہے کہ ابجد میں رہے حرف ہجا باقی

اگرچہ آج بھی اس اجڑی دلی کے کھوسٹ بڈھے کی یاد ہمارے دل میں ویسی ہی باقی ہے جو اب
علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے احاطہ میں آسودہ ہے۔ عام مسلمان تو پھر عام ہیں۔ لیکن نہایت تعجب کی
اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ اس کی درسگاہ میں علم کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر عزت و راحت کیساتھ بسر
والوں نے بھی اسے بالکل بھلا ڈالا۔ یوں برسبیل تذکرہ تھیناک یو کہنے والے ریت کے ذروں۔ پانی کے قط
جو گنتی تعداد میں بھرے پڑے ہیں۔ مگر ان کے دلوں کو اندر سے ٹٹولو تو اُن میں خاک نہیں۔ واللہ یہ
ہے۔ اور یہی انقلاب ہے جس سے "مردِ آخر بیں تماشہ" کے لوگ عبرت حاصل کیا کرتے ہیں۔

اور مقامات سے ہمیں کیا سروکار ہے۔ اس حیدرآباد ہی میں کئی سال ادھر فتح میدان کی
لائین میں۔ برابر ہر برس تعزیتی جلسے ہوا کرتے تھے نہ جانے اب کیا ہو گیا۔ دل سرد پڑ گئے ہیں یا
مٹ گئے جس طرح کہ اعراس و جاترائیں ایام جاہلیت کی یادگاریں قرار پا گئی ہیں۔ بعینہٖ اُسی طرح ان
نے اس پرانی بدعت کو نئی تہذیب کے ریزر سے چھیل دیا۔ کیونکہ وہ ابتدائی عہد تھا۔ ابھی آفتاب مغر
متنوّر شعاعوں نے انسانیت سوزی شروع ہی نہیں کی تھی اُس وقت کیلئے وہی مناسب تھا۔ ا
ہوسکتا۔ کیا دیکھتے نہیں؟ کہ دنیا کیا کچھ ترقی سائنس اور آرٹ کے بدولت حاصل کر چکی ہے جو لوگ
وقت اعلیٰ پائے کے ادیب۔ شاعر۔ آرٹسٹ۔ سیاس۔ سائنسٹ کیا اور کیا سب کچھ تھے۔ آج ا
قلی سے بھی بدتر ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمان آج نظر آرہے ہیں و
صدقہ ہے۔ اے کاش اندلس میں بھی ایک آدھ ایسا ہی نیچری موجود ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہا
مسلمان یوں دیکھتے دیکھتے غارت ہو جاتے۔ "ہائے آقا ہم نہ ہوئے" کہنے والوں کی کمی تو اب بھی ن

خیر جی ہونے دو چونکہ ہم بھی پیر پرست اور پیرزادے واقع ہوئے ہیں لہذا ہمیں نہ صرف بوڑھوں سے بلکہ بوڑھوں کی ہر ایک بات سے دلی انس ہے۔ رہیگا۔ رہنا ہی چاہئے کیوں نہ رہے ہاں تو اس بوڑھے میں جہاں اور خوبیاں تھیں وہیں شعر و سخن سے بھی محض لگاؤ ہی نہیں تھا اس میں اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی جتنے اشعار بھی اس وقت غدر کی لوٹ سے بچے ہوئے اور منتخب ملے ہیں اُن کو دیکھو۔ غور سے پڑھو۔ پھر سمجھو۔ تنقیدی نظر ڈالو جتنا جی چاہے ان کی تعریض بھی کر ڈالو۔ کیا مقدور جو کہیں سے بھی کوئی پہلو اعتراض کا نکلسکے۔ یوں تو وہ ایک انسان ہی تھا۔ کوئی فرشتہ نہ تھا۔ اور نہ اس نے پیغمبری کا دعویٰ ہی کیا تھا۔ سہو نظری قابل گرفت نہیں ہو سکتی۔ اس ضعیف الحرکتی سے ٹھہکر پڑھو تو معلوم ہوگا کہ عرفی۔ طالب۔ نظیری۔ ظہوری وغیرہ کی روح بول رہی ہے۔

مضمون کی خوبی۔ الفاظ کی خوش اسلوبی۔ بندش کی چستی۔ شوخی غرض کہ ایک شعر کو جانچنے کے جو اصول مقرر ہیں اس معیار پر وہ پورا اُتر رہا ہے پھر اثر موجود ہے جو دل کے جوش اور قلبی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ ایک کہنہ مشق شاعر اپنے کلام میں اس سے زیادہ کیا پختگی دکھا سکتا ہے اور اگر ہوگی بھی تو بس وہ اتنی ہی ہوگی۔ رتی بھر بڑھکر نہ چاول بھر کم۔ اس بوڑھے نے وہ سب سکھا دیا تھا جس کا نمونہ دیکھنے کو آج بھی ہماری آنکھیں ترس رہی ہیں مغرب کی اچھی اور کام کی باتوں کی ریس۔ مغربیوں سے میل جول۔ اُن کے اعتراضوں کا معقول اور مدلل جواب۔ ان کے خیالات فاسدہ کی اصلاح۔ مبلغ عالم (روحی فداہ) سے محبت۔ اسلام کی حمایت۔ شعائر اسلام کی عزت۔ مسلمانوں کی وکالت۔ اہل ملک سے برادرانہ الفت۔ وہ کونسا پہلو ہے جو اس کی دوربین نظر سے چھوٹ گیا ہو آج وہ کتنے ہیں جو اس کی ان خوبیوں کے خوگر تو نہیں مگر اس کے انھیں اوصاف کے مداح ہیں۔

کیا کہیں۔ کس سے کہیں۔ کیوں کہیں۔ دلوں سے جب احساس ہی جاتا رہا تو "تا بہ جلسہ چہ رسد"۔ شاہنامہ والے فردوسی کی ہزار سالہ برسی نے دنیا سے خراج تحسین حاصل کر لیا۔ اور رضا شاہ پہلوی والیٔ ایران کی روشن خیالی کے ڈنکے چار دانگ عالم میں پٹ گئے۔ لیکن ہزار افسوس کہ اقلیم ہند کو اسباب بغاوت ہند لکھکر تباہی سے بچانے والے کے احسان کو بھی اس کی لاش کے ساتھ ہنسی خوشی دفن کر دیا۔ بس مان لو کہ

عہد حاضرہ میں دانا لوگ احسان کا معاوضہ یوں ہی دیا کرتے ہیں۔ کیا جانے آئندہ آنیوالے زمانہ میں یہ بدلہ کس طریقہ سے دیا جانیوالا ہے۔

تذکرۂ گلستان سخن مصنفہ صاحب عالم مرزا قادر بخش گورگانی مرحوم صابر تخلص۔ اور حیات جاوید مولفہ شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین مرحوم حالی سے فراہم شدہ فارسی اور ایک اردو شعر ذیل میں درج ہے یہ بات قرین عقل نہیں معلوم ہوتی کہ سر سید کے اردو شعر کہنے کا علم ہو اور صابر نے تذکرہ میں شریک نہ کئے ہوں۔ آخر حالی نے گو وہ ایک ہی بیت سہی مگر اپنی کتاب میں لکھہ تو دی۔ ہاں ذرا اس شعر کو پڑھنا جو اس کی اچھوتی فکر کا پہلا مظاہرہ ہے۔ کہتا ہے۔ ؎

به مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی ز فیض نقشبند وقت جان جان جانانی

وہ اسرار کیا تھے۔ وہ اصول اسلام کے مطابق انجیل و توراۃ کی تفسیر۔ سائنس کے مطابق نئے اصول کلام پر قرآن مجید کی تفسیر۔ آخری مضامین۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین۔ خطبات احمدیہ۔ لکچر و اسپیچ۔ اور خطوط میں مرقوم ہیں۔ مولویان فتوی نگار۔ واعظان زینت المنابر کی شر انگیزی و فتنہ پردازی پر نہ جاؤ۔ انھوں نے کسی زمانہ میں کسی وقت بھی نہ تو آپ کچھ کیا اور نہ کسی کرتے ہوئے کو (مدد نہ دی نہ سہی) ٹھنڈے پیٹوں دیکھ بھی نہ سکے۔ انصاف بالاتر۔ طاعت است۔ کہ چند انسانی لغزشوں سے اعتنا کر کے دیکھا جائے تو آج تک کسی سے وہ بات نہ ہو سکی جو اس مغفور بوڑھے نیچری سے اپنے وقت میں ہو گئی۔

اب اس نعتیہ غزل کو پڑھو۔ اور لطف اٹھاؤ۔ ہم کیا کریں مقطع نہیں ہے ورنہ وہ بھی درج کر دیتے۔ ؎

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک می آرد بہ درمانے کہ من دارم

خدا دارم دل بریان ز عشق مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز کفر من چہ می خواہی ز ایمانم چہ می پرسی
ہماں یک جلوۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

ز جبریل امین قرآن بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم

ز ایماں تا بہ برہاں سنگہا دارد رہ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ہم چو برہانے کہ من دارم

کہنے اور کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے محبت کا اظہار زبان سے ہو ہی نہیں سکتا۔ محض گڑھ کہہ دینے

سے کہیں کچھ بھی میٹھا ہوا ہے سرکار دو عالم (صلعم) کے عشق و محبت میں بہت کچھ کہا گیا اور کہا جا رہا ہے لیکن وہ سیدھی سادھی باتیں جو مولوی خیر المبین ؒ کی زبان مبارک سے نکلی تھیں ان کی تاثیر آج کے دن بھی کیف آور طور پر اپنے مسرور دل میں پاتے ہیں۔

نادار طلبا کے امدادی سرمایہ کی فراہمی کا تخیل پنی ری ڈنگ تھیٹر کا بانی ہوا۔ ہر چند کہ ہمعصروں نے اس میں عملی حصہ لینے سے ثقاہت کا واسطہ دیکر منع کیا اور بعض منھ پھٹ طعن و تشنیع پر اتر آئے۔ لیکن ارادے کے پکے نے اپنا عزم پورا کیا۔ حافظؒ کی غزل میں اپنے بھی دو شعر ملا کر اپنا سوانگ ادا کر ہی دیا۔ ذرا انداز بیان اور طرز تخاطب کو دیکھو۔ یوں کہتا ہے۔ ؎

کیست آں سرو سہی کاندر سرش
با خستم دین و دل و آرام را

قوم ما اے قوم کز بہر تو !
داد ہ ام بر باد ننگ و نام را

اپنا سب کچھ بھی قوم کی راہ میں لگا کر خود بھی آخر کو قوم کے واسطے مٹ گیا۔ جس مدعی میں ایسا اور اتنا ایثار ہو کیا اوس کی نشان دہی کر سکو گے؟ للہیت اور خلوص یہی دو چیزیں ہیں جن سے انسان اپنی زندگی اور بعد میں بھی جانچا جاتا ہے یہی دو چیزیں اس میں بوجہ اتم موجود تھیں۔

بادشاہ وقت شاہ عالم ثانی یا ابوظفر مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ رحمۃ اللہ علیہ خاتم سلاطین تیموریہ کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے ظاہر ہے کہ اس وقت بادشاہ کی موجودہ حیثیت اگرچہ شطرنج کے ایک مہرے سے بھی زیادہ نہ تھی۔ تاہم آج کل کے عام احساس کے مقابلہ میں یہ جوش عقیدت قابل شکریہ اور لائق تقلید ہے کہتا ہے۔ ؎

شاہد دنیا ئے دہر زینت دیگر گرفت
دلبر زیبائے باغ چہرہ زیور گرفت

ملک ز بالیدگی میکدہ بنیاد کرد۔
ساقی ما از نشاط جام بکف زر گرفت

ہم ز پئے شاہدان حلہ بر آراست باغ
ہم پئے سودائے مے غنچہ بکف زر گرفت

شب بفروزندگی طعنہ بنوا و ز زرد
شام بہ تابندگی خردہ بجا در گرفت

آسی خستہ جگر گشتہ چو مداح شاہ
جائزہ را خامہ اش تاج ز عبہر گرفت

اختر بختم نگر چوں ز نحوست رہد　　گرز یکے عقدہ است عقدہ دیگر گرفت

جو د تو و قف سخن بذل تو صرف ہنر
ہر چہ گفت بر فشاند جملہ سخنور گرفت

ایک اور نعتیہ غزل درج ہے افسوس کہ یہ بھی بلا مقطع ہے لیکن حسن عقیدت - پاکیزہ جذبات - اور خیال رسالت میں انتہائی خلوص - درود پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

دل درخم گیسوئے پریشان تو یابند　　جانہائے دو عالم ہمہ خواہان تو یابند
گر راز بجویند ز سر رشتۂ جانہا!　　موئے ز سر طرۂ پیچان تو یابند
طومار شفاعت چو دم حشر کشایند　　حرفے است کہ از دفتر دیوان تو یابند
باشند بہ جمعیت خاطر بدم حشر!　　آنانکہ سر زلف پریشان تو یابند
خاکم چو بجویند بہ میدان قیامت　　افتادہ بہر گوشۂ دامان تو یابند

سحرے کہ بود غیرت اعجاز مسیحا
رمزیست کہ در نرگس فتان تو یابند

بہت جستجو کی گئی لیکن حیات جاوید سے یہی ایک اردو شعر ہمدست ہوا - شاعرانہ شوخی اور تفنن طبع متانت سے بھی بیساختہ تبسم کا خراج وصول کر رہی ہے -

بتوں پر دل و دین فدا کر رہے ہیں　　بنارس میں یاد خدا کر رہے ہیں

سر دست یہی سرمایہ ہے جو ہمارے ہاتھ لگا - جسے اس پیر نیچریاں کی ہمیشہ یاد منانے کے لئے زینت رسالہ کر رہے ہیں امید ہے کہ ترقی یافتہ قوم با دل ناخواستہ ہی سہی مگر پسند کرے گی آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن جو مطبع نولکشور میں چھپا ہے ہمیں نہ ملا -

---

براہ کرم حضرات تبدیل پتہ سے دفتر کو مطلع کریں ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں

دل کی خلش

(جناب نور جہاں ناز بمبئی)

اچھی!! مجھے مت چھیڑ۔ جا اور اپنا دل کسی مرغزار میں بہلا۔ اب میرے پاس کیا دھرا ہے۔ میرے دلکش نغمے اور میری بانسری کے سہانے گیت میں وہ جوش کہاں!! میرے ربط میں وہ ارتعاش نہیں رہا۔

بچپن کی امیدیں ایک لال کی پرواز کیطرح اڑ گیئں۔ غائب ہوگیئں۔ اجڑ گیئں۔ اللہ! مچھلیوں کو پانی سے علیحدہ کرنے میں۔ بھونرے کو پھول سے جدا کرنے میں۔ پروانہ کو شمع سے باز رکھنے میں ان لوگوں کو آخر کیا ملجاتا ہے۔

میری الفت کا خواب شیریں اب تو تلخیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اوس کی تعبیریں الٹی نکلیں۔ میری وہ خوش نصیبی جس پر دوسروں کو رشک آتا تھا اب تو اوس پر لوگوں کو ترس آرہا ہے۔

میرے شیریں نغموں میں اور میٹھے میٹھے گیتوں میں وہ اثر کہاں؟ جو دنیا کو گہری نیند سے بیدار کرتے تھے۔

آہ وہ تو دل کی مسرتوں کی ایک پکار تھی جو بانسری کے ذریعہ نکل کر فضا کو مرتعش کردیا کرتی تھی۔ وہ امید جس کو دنیا کی حاسدانہ نظروں سے چھپا کر دل میں پرورش کرتی رہی تھی اون کو ظالموں کے بیدرد ہاتھوں نے نکال کر ہوا میں منتشر کردیا۔

خاک کا ہر ذرہ آج مایوسیوں سے لبریز ہے کائنات کی روشنیاں تاریک بالکل تاریک ہیں۔

سہیلی۔ اونہہ۔ کیا میرے دل کا درمان تو کرسکتی ہے؟ پھر کیوں رہ رہ کر چھیڑتی ہے۔ آہ! تیری ...... اب وہ پہلی کی طرح نہیں رہی جس میں مسرتیں اور امنگیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھیں۔ اور مستقبل شادمانیوں سے معمور دکھائی دے رہا تھا۔

اب تو ایک تودۂ یاس۔ مجسمۂ حزن و ملال ہوں۔ وہ عزیز جو میری خوشی پر لبیک کہنے کیلئے آمادہ تھے نہ جانے کیوں طوطی کی طرح آنکھیں پھیر لیں "اونہیں" جن سے میری مسرتیں وابستہ تھیں جواب دیا

میری آنکھیں آج اوس طائر زرّین کو اڑتا ہوا دیکھ رہی ہیں جس کو میں نے قفس دل میں مدتوں سے خون جگر پلا پلاکر بڑا کیا تھا۔ محض اس دن کیلئے کیا کچھ آرزوئیں نہ تھیں مگر دنیا کو رنگ بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ برسوں کی امیدیں لمحوں میں نذر یاس ہوگئیں۔ آہ! ان ظالموں کو اس کا کچھ خیال بھی آیا؟

میرا دل وہ دل نہیں ہے۔ اب تو خود دل ایک گریہ مضطر ہے میری وہ بانسری کا لوچ جو دلوں کے اندر سما جاتا تھا۔ نالہ ہائے شکستہ سے بڑھکر نہیں رہا۔ میرا ساز بیخودی الم کش غم ہے۔ دنیا کو کیا خبر کہ "محبت" کا خمیر آنسوؤں کے پانی سے گوندھا جاتا ہے۔

ہاں تجھے میرے ساتھ ہمدردی ہے اور میری بپتا سنکر تیرا دل پسیجتا ہے تو جا۔ جا کسی کے سرکار حسن میں ایک پرستار محبت۔ ایک دکھے ہوئے جی کی یہ مضطرب بیقراریاں پہنچادے۔

خوب امیدیں بندھ رہی تھیں آخر ہوئی حرماں نصیب ۔۔۔ بدلیاں اوٹھیں مگر بجلی گرانے کے لئے

دشمنوں کی چالاکیاں کام آگئیں۔ اون کا مقصد پورا ہو گیا۔ بھونرا کیتکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اچھی گتیاں کیا بتاؤں کہ یہ آئندہ زندگی کے دن کیسے کٹیں گے۔ حاصل عمر کیا ہو گا 'وہ' تو اچھے رہینگے مگر ــــــــ میرا حال کیا ہو گا ــــــــ

میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں ۔۔۔ مانا کہ اُس کے رخ سے نگہ کامیاب ہے

اون کی یاس اور آخری الوداعی نظروں کا جب خیال آتا ہے تو دل پر اک چوٹ لگتی ہے وہ کس حسرت سے میری جانب دیکھ رہے تھے اون کا ہر تار نظر اپنے اندر لاکھوں پوشیدہ سوال رکھتا تھا۔ مگر کہنے کا یارا نہ تھا۔ وہ خاموش نظریں دیباچہ حسن و عشق کا متن تھیں جس کی تفسیر بجز میرے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

کاش یہ ظالم۔ یہ بیدرد۔ بھی اوس کو سمجھ جاتے کہ دو دلوں کے توڑنے کے بجائے ان دونوں دلوں میں گرہ محبت کو اور استوار بنانے میں کس قدر لذت ملتی ہے۔

آہ! میں کیا کہسکتی ہوں جس کی زبان پر مہر خاموشی ہو میرے بس میں تو سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہیں۔ ہاں تجھ سے ہو سکتا ہے تو میری زندگی کے یہ چند شکستہ صدائیں اون کے کانوں تک پہنچادے اگر وہ کبھی ملجائیں تو۔ ورنہ میری یہ روداد خود ایک فریاد الم بن کر دل کو تڑپا دے گی ــــ

بھٹک کر تیری منزل سے قدم گر جادہ پیما ہو | مٹادے۔ خاک کر دے۔ خاک گر دے۔ کارواں گر دے
تیری الفت کا دم بھر نہیں دم بھر کی جو غفلت ہو | نوید زیست کو پیغام مرگ ناگہاں کر دے
مٹادے اعتبار زندگی کو جیتے جی میرے | میرے قصہ کو ہم عنوان یاد رفتگاں کر دے

غزل

(جناب نواب سید عباس حسین خاں صاحب برزم ناظم عدالت ضلع نظام آباد)

دل رہا کیونکر ہو زلف یار سے | باندھ رکھا ہے ہزاروں تار سے
چومتا ہوں میں گلوں کو پیار سے | ملتے جلتے ہیں کسی رخسار سے
اپنی صورت دوسرے رخ پہ بدلی | اون کو جب محفل میں دیکھا یار سے
گو کہ ایفا کا نہیں اون سے یقین | پھر بھی تسکیں ہوتی ہے اقرار سے
کس قدر میرے گناہوں کا ہے بوجھ | سر اٹھا سکتا نہیں اس بار سے
اون کو کیا پروا ہے اس سے کیا غرض | دل پہ کیا گذری یہاں افکار سے
تھی لہو میں بھی میرے الفت تیری | بیوفا تو پوچھ لے تلوار سے
غیر سے ملجاؤ وہ کہتے ہیں برزم | ہو نہیں سکتا یہ غیرت دار سے

جناب لیلی بیگم صاحبہ لیلیٰ

دل آپ سے باہر ہے میرے دل سے ملا کون | اللہ غنی آج یہ کرتا ہے دغا کون
فریاد جو کی حشر میں خود بنگئے مجرم | تقصیر کسی کی تھی خطاوار ہوا کون
دل مفت ملیں جن کو اونھیں کون ہے کہتا | دل چھین لیا تم نے کہیگا یہ بھلا کون
مرجھائے ہوئے دل پہ میرے آگئی رونق | اس خانہ ویران میں ہوا جلوہ نما کون
یہ کس نے گرایا مہ کامل کو نظر سے | مہتاب کو شرمانے لگا نام خدا کون
کیا بات ہے کیوں عرش بریں کانپ رہا ہے | ہاتھوں کو اٹھائے ہوئے کرتا ہے دعا کون
ہیں آنسوؤں کیساتھ دل زار کے ٹکڑے | لیلیٰ سے خدا جانے ہوا آج جدا کون

کانا باتی

(جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

ٹیلیفون کا ترجمہ "کانا باتی" کیا گیا ہے جو دلچسپ ہے اور جس انداز میں ذیل کا مضمون لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے یہ وہ باتیں ہیں جن سے روزآنہ سابقہ پڑتا ہے لیکن کتنے ایسے ہیں جنہیں اس کا عملی تجربہ ہے۔ بہت سارے پڑھے لکھے ایسے ہیں کہ جنہیں منی آرڈر یا وی پی فارم کا لکھنا ایک پیچیدہ حسابی سوال سے زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے؛ اور جب لکھا بھی تو غلط۔ پھر ٹیلیفون کا بھی یہی عالم ہے۔ اچھا ہوگا کہ حضرات ایسے واقعات کو دلچسپ انداز میں قلمبند کر کے روانہ کریں تو ایک پُر لطف مفید مواد فراہم ہو جائیگا جس سے بیسیوں کام کی باتیں نکل آئینگی اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس کو ہمایوں میں شائع کر دینگے۔

دنیا کی کایا پلٹ ہو رہی ہے ہر پرانی چیز اپنی کینچلی بدل رہی ہے اور زمانہ شناس طبیعتیں بھی نیا ماحول اختیار کر رہی ہیں۔ گھر کی جگہ ہوٹل نے گھوڑے گاڑی کی جگہ موٹر نے۔ قبا و عمامہ کی جگہ کوٹ پتلون نے اور مولوی کی جگہ مسٹر نے لیلی ہے۔ واللہ کیا تغیر ہے۔ اگر سائنس کے کسی کرشمہ کی بدولت پچاس سال قبل کا مردہ اس وقت زندہ ہو کر دنیا میں آجائے تو یہ دنیا اس کو بالکل بھول بھلیاں نظر آئیگی تعلیم تو ہمیشہ ضروریات زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے دیجاتی ہے۔ بھلا کیسے ممکن تھا کہ ایسے عظیم الشان تغیر کے سیلاب سے ہماری تعلیم بچی رہتی چنانچہ موجودہ زمانہ کے حالات کے اعتبار سے ہماری تعلیم کے نصاب میں بھی معقول انقلاب ہو چکا ہے ہم کو پرانی اور نئی تعلیم کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں کیونکہ نئی کے آگے پرانی شئے ہمیشہ پھیکی پڑجاتی ہے یہی حال تعلیم کا بھی ہے لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ کم از کم ایک اعتبار سے پرانی تعلیم کو تفوق حاصل تھا یعنی اگر آج کل کی تعلیم جیک آف آل (Jack of all) بناتی ہے تو پرانی تعلیم ماسٹر آف ون (Master of one) بنا دیتی تھی پہلے فارغ التحصیل ہونے کے بعد طالب علم کسی ایک شعبہ میں پختہ ہو جاتا تھا اور اس کو اس شعبہ کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر عبور حاصل ہو جاتا تھا لیکن فی زمانہ معاملہ ذرا برعکس نظر آتا ہے یعنی ہم سطح تو بہت سے مضامین کی کھرچتے ہیں مگر تہ تک کسی کی بھی نہیں پہنچتے بالخصوص تعلیم کا عملی پہلو تو حد درجہ تشنہ رہجاتا ہے۔

نظری تعلیم کی حد تک تو ہم اپنے آپ کو کافی لائق بلکہ عالم و فاضل تصور کرتے ہیں لیکن جس وقت نظری تعلیم کو روزمرہ کے معاملات میں عملی طور پر استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو بس بغلیں ہی جھانکتے نظر آتے ہیں مثلاً مدرسہ میں سود اور نفع و نقصان وغیرہ کے ہزاروں ہی سوال حل کر ڈالے ہونگے لیکن اگر کبھی اتفاق سے ٹکسال میں حالی و کلدار کے تبادلے کے پھیر میں آ پھنسے تو بس یقین مانئے کہ سیٹھ جی کی ایمانداری پر بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چھٹکارے کی صورت نظر نہیں آتی اور یا اگر کبھی خدانخواستہ گھر میں کسی نے کہا کہ ذرا دودھ والے کا حساب تو کر دو۔ روپئے کا پونے چار سیر کے حساب سے (۲۷) روز آیا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ کاغذ و پنسل کی مدد سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں شاید صحیح حساب نکال سکیں ہم یہ نہیں کہتے کہ سب کے سب ہم ہی جیسے کودن ہوتے ہیں ممکن ہے کہ ہم ہی ایسے ہوں مگر ہاں اپنے متعلق تو اتنا جانتے ہیں کہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کہ باوجود بھی عملی دنیا میں ہم سے وہ وہ حماقتیں سرزد ہوتی ہیں کہ بس سننے کے قابل ہیں لیکن اون کا پورا پورا لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جو خود بھی اسی قبیل کی حرکتوں سے ذاتی طور پر آشنا ہو چکے ہوں۔ سنئے صاحب ہم بی۔ اے میں پڑھ رہے تھے یعنی تعلیم کا زمانہ قریب الختم تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ ہمارے عام معلومات کافی اچھے تھے۔ سوسائٹی میں اکثر موضوع پر باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ سائنس میں بھی کافی دسترس تھا چنانچہ وائرلیس۔ ریڈیو۔ اور ٹیلی وژن وغیرہ وغیرہ جدید انکشافات کے آئندہ اثرات پر بہت پرجوش مباحث ہوا کرتے تھے مختصر یہ کہ ہم تعلیم یافتہ تھے۔ شامت اعمال ایک روز ہمارے بھائی صاحب قبلہ نے ہم کو کچھ روپئے دئے اور کہا کہ میاں ذرا جاکر یہ منی آڈرز تو کر آؤ مگر بذریعہ تار کرنا جلدی کا معاملہ ہے فارم ڈاک خانہ ہی سے لیکر بھر دینا۔" ایمان کی بات یہ ہے کہ ہم نے دو ایک مرتبہ منی آڈرز تو ضرور کیا تھا مگر اوّل تو فارم خود کبھی نہیں بھرا تھا۔ دوسرے منی آڈرز بذریعہ تار نہیں کیا تھا لیکن اگر اس وقت انکار کرتے یا اپنی لاعلمی ظاہر کرتے تو بھی شان کے خلاف تھا۔ اس لئے روپیہ لیکر سیدھے چلدئے اور سوچا کہ وہیں جاکر کسی سے پوچھ لیں گے ڈاک خانہ پہنچ کر منی آرڈز فارم لیا ایک اور صاحب بھی منی آرڈز کرنے کے لئے آئے تھے کچھ ان کی مدد سے کچھ اپنی انگریزی دانی سے فارم پورا کیا اور فاتحانہ انداز میں روپئے نکال کر فارم کے ساتھ پیش کر دئے۔

ی آرڈز ہوگیا اور اب ہم وہاں سے رسید لیکر آگے چلے۔ تار گھر پہنچے۔ فارم حاصل کیا اور مندرجہ ذیل عبارت
لکراوس کو بھی چلتا کیا
(RS. 757. Sent Acknowledge receipt.
یہ کام پورا کرکے شان سے گھر واپس آئے دونوں رسیدیں نکال کر بھائی صاحب کے حوالہ کردیں
انہوں نے جرأت سے پوچھا میاں یہ تار کیسا۔
ہم۔ آپنے کہا تھا ناکہ منی آرڈز بذریعہ تار کرنا۔
بھائی صاحب۔ تو منی آرڈز بذریعہ تار اسی طرح کرتے ہیں۔
ہم۔ تو پھر اور کیا کرنا تھا۔
بھائی صاحب۔ واہ! کیا کہنے آپ کے۔ بڑے لائق ہو۔ اچھی تعلیم حاصل کی۔
اس وقت ہماری پوزیشن جس بری طرح پر متاثر ہوئی اور سب کے سامنے ہماری جو کیفیت ہوئی
اس کا نقشہ قلم کی بجائے ذہن زیادہ عمدہ طور پر کھینچ سکتا ہے اس لئے اس کو تو ہم بس یہیں ختم
کردیتے ہیں لیکن اس واقعہ نے کم از کم اتنا ضرور کیا کہ ہمارے اندر یہ احساس پیدا کردیا کہ سوسائٹی میں
روزمرہ جن چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے اون سے عملی طور پر واقف ہونا بیحد ضروری ہے لہذا اب ہم نے
اپنے دل میں یہ قطعی فیصلہ کرلیا کہ خواہ کچھ ہی ہو کہ سب چیزوں سے عملی واقفیت حاصل کرینگے۔
ان میں سب سے پہلی چیز جس کا عملی تجربہ حاصل کرنیکا فیصلہ ہم نے کیا تھا وہ ٹیلیفون تھا اس سے
قبل ہم سے متعدد موقعوں پر ٹیلیفون کرنے کے لئے کہا گیا تھا مگر چونکہ ہم عملی طور پر اس سے ناواقف تھے
اس لئے ہم نے نہایت ہوشیاری وچالاکی سے اوس کام کو کسی اور صاحب کے سپرد کرکے اوس مصیبت سے
نجات پائی تھی لیکن اب جس وقت سے وہ منی آرڈز والا واقعہ پیش آیا تھا۔ ہم اس فکر میں تھے کہ کسی نہ
کسی طرح اس کے استعمال سے واقف ہوجائیں ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وقت اس معاملہ میں بھی ندامت
اٹھانی پڑے۔
ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم ایک دوست کی شادی میں گئے یازو کے کمرہ میں ذرا اوپر ٹیلیفون کا آلہ

نصب تھا دل میں اس کی لو تو لگی ہوئی تھی معلوم نہیں کیونکر اس وقت یہ خیال آگیا کہ اگر موقع ملے تو یہاں اس کا استعمال کریں حسن اتفاق بایوں کہئے کہ سوء اتفاق سے دوپہر کے بعد وہ کمرہ خالی ہوگیا اور سب لوگ توشہ والے کمرہ میں جاکر گانا سننے میں مصروف ہوگئے اور ہم نے موقع کو غنیمت سمجھا اس موقع کی موزونیت یا غیر موزونیت سے ہم کو بحث نہیں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ کسی نامعلوم قوت نے ہم کو اس موقع سے تجربہ حاصل کرنے پر مجبور کردیا چنانچہ ہم اپنی جگہ سے اٹھے اور دبے پاؤں اوس کونہ میں جاکر کھڑے ہوئے جہاں پر ٹیلیفون کا آلہ لٹک رہا تھا ہم کو اس بات پر ضرور تعجب ہو رہا تھا کہ اس مکان میں ٹیلیفون اس قدر اونچی جگہ پر کیوں لگایا گیا ہے کہ ہاتھ بھی نہیں پہنچتا پھر سوچا کہ شاید بچوں کے خیال سے اونچا لگایا گیا ہوگا۔ بہرحال اول ہم نے چوروں کی طرح ادھر ادھر نظر ڈالی قریب ہی ایک نہایت خوبصورت و نازک تپائی جو رکھی تھی اس کو آہستہ سے اٹھاکر ٹیلیفون کے نیچے لاکر رکھا اور پھر ذرا اطمینان کرنے کیلئے باہر نکل کر دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں جب اطمینان ہوگیا تو بسم اللہ کہکر اوپر چڑھے ٹیلیفون لگانے والے کی حماقت دیکھو کہ اس کو اتنی بلندی پر لگایا تھا کہ تپائی پر چڑھ جانے کے بعد بھی کان اوس تک نہ پہنچا۔ آخر تپائی پر پنجوں کے بل کھڑے ہوئے اور آہستہ سے وہ آلہ لیکر اپنے کان سے لگایا۔ اس میں سے تو کچھ آواز نہ آئی البتہ دل اس زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ پاؤں الگ تھر تھرا رہے تھے عین اوس وقت جبکہ آلہ ہمارے کان سے لگا تھا معلوم نہیں کیا ہوا کہ کمبخت تپائی نے دغا دیدی اور چڑ چڑ چڑ کرکے یکدم بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی ہم بھی دھم سے نیچے آپڑے آواز کے ساتھ ہی برابر والے کمرہ میں سے احباب نکل کر ہمارے گرد جمع ہوگئے ہم اس عرصہ میں کھڑے ہوچکے تھے مگر بدحواسی کے عالم میں ٹیلیفون کا آلہ ہمارے ہاتھ ہی میں تھا اس وقت "صورت ببین حالت مپرس" والا مقولہ ہم سے بڑھکر کسی اور پر صادق نہ آسکتا تھا۔ گھڑوں پانی پڑ رہا تھا کسی سے آنکھ ملانے کی جراءت ہم میں نہ تھی۔ بس جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں دل ہی دل میں اپنے اساتذہ کو لعن طعن کر رہے تھے کہ ان کمبختوں کی حماقت کے باعث آج ہم کو یہ شرمندگی اٹھانی پڑی اگر مدرسہ اور کالجوں میں اس چیز کی عملی تعلیم بھی دیدیجاتی تو آج

بہ زور بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ادھر تو ہماری یہ کیفیت' اس پر یار لوگوں کے فقرے۔ بس یوں سمجھئے کہ زخم پر نمک چھڑک رہے تھے کوئی کہتا تھا کہ بیچارے اپنے گھر ٹیلیفون دینے آئے تھے، کوئی کہتا کہ نہیں بھئی ماہر فن ہے ٹیلیفون خراب ہوگیا ہے اوس کو درست کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر مکان والے صاحب بولے کہ بھئی ٹیلیفون تو میں نے نکال دیا ہے یہ اوس کا خالی (Receive) ہے بس کو میں نے ذرا اونچے لٹکا رکھا ہے شاید آپ اس کو ٹیلیفون سمجھے۔

اب آپ سے کیا کہیں کہ ہماری کیا کیفیت ہوئی بڑی مشکل سے صرف اتنا منہ سے نکلا کہ جی نہیں یونہیں ذرا اوس کو دیکھنا چاہتا تھا وہ تپائی مڑگئی۔

ایک صاحب۔ جی ہاں خراب تھی اور اس قدر کمزور۔

دوسرے صاحب۔ اور ان حضرت (مالک مکان) کی عقلمندی ملاحظہ ہو کہ Receive کو اتنے اونچے لٹکایا ہے۔

تیسرے صاحب۔ آپ کو کچھ ضروری بات کرنی تھی کس سے ملانا چاہتے تھے۔

غرض یہ کہ جتنے منہ اوتنی باتیں اور ہماری حالت یہ کہ زمین میں گڑے جائیں۔ کھسیانی ہنسی کے ذریعہ شرمندگی کو دور کرنے کی ہزار کوشش کی مگر سب بےسود۔ تمام محفل میں تماشہ بن گئے۔ گانے کو تو سب بھول گئے اور ہم جاذب توجہ بن گئے اور میاں غضب تو یہ ہوا کہ وہ البیلی رقاصہ بھی اپنا تان شر چھوڑ کر ہم پر نگاہ جما کر سامنے کھڑی ہوگئی اور زیر لب تبسم سے ہم کو شرماتی رہی۔ ایسے جانگداز واقعہ کے بعد ایسی نوجوان محفل میں بیٹھا رہنا تو کسی غیر معمولی صاحب دل کا کام تھا۔ ہم موقع کی تاک میں بیٹھے رہے۔ آخر موقع پاکر وہاں سے چپکے سے کھسکے۔ باہر قدم رکھا ہی تھا کہ آواز آئی دیکھو بھئی وہ چلے ٹیلیفون دینے جارہے ہیں۔ اجی حضت فرمائیے تو میں جاکر دے آؤں؟" ہمارا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور پاؤں لڑکھڑا رہے تھے جوں توں کرکے باہر تو نکل آئے ایمان کی یہ ہے کہ عمر بھر کیلئے اپنی حماقت کی یادگار قایم کر آئے۔ ہم کو یقین ہے کہ ہماری طرح اور بہت سے احباب نے بھی اس قسم کی یادگاریں چھوڑی ہونگی کیا اچھا ہو تا کہ کسی طرح ان سب کو ایک جگہ

رکے "مجموعہ حماقت" کے نام سے طبع کرایا جائے اور اس کو مدرسہ کے نصاب میں داخل کر دیا جاتا تاکہ
پند اور دو کاج والا مضمون ہوتا یعنی تفریح کی تفریح اور سبق کا سبق۔

کیف نغمہ

جناب سروپ رانی صاحبہ نگار (بمبئی)

گائے جا۔ گائے جا۔ شوجی کی مقدس پجارن۔ مندر تیرے بھجن کی گونج سے ایک مقدس نغمہ
لیا ہے . . . . شوجی کی مقدس مورتی ایک نغمہ خاموش میں تبدیل ہو گئی ہے
سے الوہیت اور تقدس کے نغمے ٹپک رہے ہیں۔ اے حسین پجارن دیکھ شوجی کی مقدس
ہیں تیرے پوتر نغموں کے تاثرات سے منجمد ہو گئی ہیں۔ اے حسین ساحرہ تو نے دیوتاؤں پر بھی
پالی ہے۔ گائے جا —— گائے جا —— تاکہ شوجی تیری —— اور صرف تیری ذات
گم ہوئے جا رہے ہیں۔ کسی دوسرے کی نہیں سنتے —— مگر تیرے اس نغمۂ سرمدی میں وہ
یس ہے جو میری آقا کو بھی شانتی کی لوریاں دے رہی ہے . . . .
مجھ سے کہا . . . . کیا؟ . . . . . . میں سو گئی تھی . . . . . . ؟ . . . . . .
. . بھولی پجارن تیرے نغموں نے اس قدر مدہوش کر دیا تھا کہ میں خود ایک مجسم نغمہ
گئی . . . . . . دیکھتی ہیں تیرا مقدس نغمہ اب مجھے سن رہا ہے . . . . . .

. . . .

کہاں جا رہی ہے . . . ٹھہر . . . ٹھہر . . . ورنہ شوجی اپنے استھان کو چھوڑ کر تیرے
تھ نکل جائیں گے . . . . . . یہ سنسار سونا ہو جائیگا . . . . نہیں سنتی . . . . .
. . چلی جا رہی ہے . . . . گائے جا رہی ہے۔ آہ! . . . . . لیگئی
. . وہ بھگتی بھاؤ میں ڈوبی ہوئی . . . . . شر دہالو . . . . . مدہوش
رن . . . . شوجی کو ساتھ لیگئی۔

آنریری مجسٹریٹ

(منشی جی)

"ناشتہ کر چکے ہو تو پان بنا دوں؟" آفتاب بیگم نے آہستہ سے کہا۔

"خان صاحب" شیخ اسد علی ناشتہ میں مصروف رہے۔ بیچاری بیوی کی بات کا جواب ندارد۔ دو چار روغنی روٹیاں ایک دودھ سے لبالب بھرا ہوا پیالہ جب ختم ہو لیا تو سر اٹھا کر فرمایا۔ اب بھی پان نصیب ہو گا؟ ہمارا تو ناک میں دم ہے کسی وقت کوئی چیز قرینے سے ملتی ہی نہیں۔ آج دودھ ٹھنڈا تو کل ٹکیاں باسی۔ پرسوں شکر نہیں۔ ہماری تو پرواہ ہی نہیں گویا ہم اس گھر کے مالک ہی نہیں۔ شادی بیاہ پیغام سلام سب کچھ بالا بالا طے ہوتا ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں کی جاتی تماشا ہے کہ ہماری اپنی لڑکی کی شادی بیاہ کی باتیں ہوں۔ اور ہم سے جھوٹوں بھی نہ پوچھا جائے کہ میاں تمہاری کیا رائے ہے۔ بہ خود مختاری! یہ جراءت! ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ ہم سے بے پوچھے کیسے شادی کر لو گی۔ ایک اخبار کا چیتھڑا بیچ کر روٹی کمانیوالا سفلہ لونڈا اور سرکاری خطاب یافتہ کی لڑکی! غضب خدا کا!"

آفتاب بیگم سرکاری مزاج کا پارہ چڑھا ہوا دیکھ کر بولیں تم بات تو سنتے نہیں کہ وہ لونڈا کون ہے کس خاندان سے ہے، کس لیاقت کا ہے" کون کہتا ہے کہ وہیں کرو۔ ہم نے تو ایک نیک صلاح پیش کی تھی اب اگر ناپسند ہے تو تم جانو۔

"اگر ناپسند ہے! یعنی تمہارے نزدیک ناپسندیدگی میں شک کی بھی گنجائش ہے۔ عورت جس کے ناک نہ ہو تو . . . کھائے وہ مرد کو۔ خاص کر مجھ جیسے مرد کو صلاح دینے چلے۔ ارے میں تمہارے سکھانے پڑھانے کا نہیں۔ تمہارے ہی سکھانے پڑھانے کا ہوتا تو آج یہ مجسٹریٹی نہ کرتا ہوتا۔ قیامت تک مجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے اور اگر تم یہ خیال کرو کہ میں اس رشتہ پر راضی ہو جاؤں گا تو قطعی اطمینان رکھو کہ تمہارا خیال غلط۔ سرتاپا غلط۔ بالکل غلط۔ اس سفلے بمبٹی کے چور بازار کے رہنے والے

لونڈے کو ہرگز اپنا داماد نہیں بناؤں گا" یہ دیکھا کہ "خطاب یافتہ" غصہ کم ہی نہیں ہوتا اور یہ سوچ کر کہ گھی ٹیڑھی انگلیوں سے ہی خوب نکلتا ہے۔ بیگم نے طرزِ جنگ بدلا۔ اور تیوری پر بل ڈالکر درشت لہجہ میں کہا "تو پھر جو جی چاہے وہ کرو۔ لونڈیا کو بھاڑ میں جھونکو یا کنوئیں ندی میں ڈھکیلو"

"ہاں ہاں! جو ہمارے جی میں آئیگا وہی کرینگے تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے اس بگڑنے سے ڈر جاؤنگا؟ تو یاد رہے کہ یہ خان صاحبی کا خطاب مفت نہیں ملا ہے۔ ہم لاٹ صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں حاکم ضلع کی برابر بیٹھنے والے ہیں اور ایسے ویسے ڈپٹیوں اور تحصیلداروں کو چٹکیوں میں اڑاتے ہیں تم گھر میں رہنے والی ناقص العقل ہماری سمجھ بوجھ کو کہاں پہنچو۔ اب ذرا آدمی بن کر سنو میرا خیال ہے کہ جمیلہ کی شادی خان بہادر میر قاسم علی کے اکلوتے لڑکے سے کی جائے میر صاحب کی اس ضلع میں جو عزت و آبرو ہے وہ کسی دوسرے رئیس کی نہیں اور پھر عزت و آبرو ہی نہیں مال و دولت بھی ہے پانچ مسلم درست گاؤں، قصبہ میں دس بارہ دوکانیں پانچ چھ مکان۔ بیل۔ گائے۔ بھینس گھوڑے۔ ہاتھی، رتھ۔ پالکی غرض خدا کا دیا بہت ہی کچھ ہے اس پر برف کے کارخانے سے بھی ہزاروں کی آمدنی ہے اگر میری کھنڈسار اور میر صاحب کا برف کا کارخانہ ایک ہی ہاتھ میں پہنچ جائے اور وہ ہاتھ جمیلہ کا ہو (کیونکہ اوس کے دولہا کا ہاتھ بھی اسی کا ہاتھ ہے) تو اس سے بڑھ کر میری کیا خوشی ہوسکتی ہے غضب خدا کا کہ میری برسوں کی تمنا کا خون اس طرح کیا جائے کہ ایک اخبار کا چھپڑا بیچ کر پیٹ پالنے والے کو جمیلہ دی جائے"

پانوں کی تھالی فرش پر پھینک کر یہ کہتے ہوئے کہ "آج مجھے عدالت کا کام بہت ہے فیصلے لکھنے ہیں۔ دفعہ ۳۲۔ والا مقدمہ ہے" باہر چلے گئے اور چند ہی منٹ میں جناب کی ذات سے عدالت کی کرسی مزین ہوگئی دوران عدالت میں یہ خیال آیا کہ بمبئی میں ہماری شکر کے جو آڈرز دئے ہیں اور جن سے شکر کا حساب کتاب ہے ان سے گفتگو کرنے کی غرض سے بمبئی جانے کا خیال تو تھا ہی اسی وقت کیوں نہ بمبئی جائیں اور آڑہتوں سے گفتگو طے کرنے کے ساتھ ساتھ اس بدمعاش اخبار والے لونڈے کو اچھی طرح سمجھا آئیں "کہ حلوا خوردن را روئے باید" چنانچہ اٹھتے وقت

کلکٹر صاحب کو "عدالت" کے بمبئی جانے کی اطلاع دگئی خطاب یافتہ "خاں صاحب" کو اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ بمبئی میں ٹھہریں کہاں۔ پہلے یہ خیال آیا کہ اپنے بڑے آڑھتیے سیٹھ وٹھل داس جیتھا مل کے یہاں ٹھہریں مگر چونکہ بمبئی کے سیٹھوں کو بہ چشم خود دیکھنے اور اُن کی دولت و امارت کا اندازہ کرنے کا ابھی تک اتفاق نہیں ہوا تھا سمجھے کہ سیٹھ وٹھل داس باوجود ہزاروں کا کاروبار کرنے کے ایسا ہی مفلوک صورت ہوگا جیسا کہ قصبہ کا مارواڑی چھدی لال ہے جس کے سر پر ٹوپی اور پاؤں میں جوتی تک سلامت نہیں۔ لہذا سیٹھ وٹھل داس کے یہاں کے قیام کو پس پشت پھینکدیا۔ بدیں وجہ کہ ہم جیسے معزز آدمی کو ایک ٹھرپل دھوتی اور پھٹیل مرزئی والے بنئے کا مہمان ہونا خانصاحبی اور آنریری مجسٹریٹی کو گالی دینا ہے چنانچہ کچھ دیر کے غور و فکر کے بعد سلاو، خدمتگار خاص کی معرفت حاجی نسیب اللہ بلائے گئے جو قریب والی مسجد کے حجرے میں رہتے تھے۔ حاجی صاحب کی بحث و گفتگو کے بعد "خاں صاحب کی معلومات میں امور ذیل کا اضافہ ہوا۔

۱۔ شہر بمبئی سمندر کے اندر آباد نہیں بلکہ کنارے پر آباد ہے "

۲۔ مکانات سطح زمین پر بنائے گئے ہیں سطح آب پر نہیں۔

۳۔ شہر میں پختہ سڑکیں ہیں اور ان پر موٹر، ٹمٹم، بیل گاڑیاں، چھکڑے اسی طرح چلتے ہیں جس طرح اور بڑے بڑے شہروں میں چلتے ہیں۔

۴۔ کرایہ کی سواریاں بآسانی مل سکتی ہیں اور جسیم شحیم "خاں صاحب" کی جیب اگر شکم سیر ہے تو پیادہ پا چلنے کی زحمت قطعاً نہ ہوگی۔

۵۔ مسافروں کے قیام کیلئے ایسی سرائیں نہیں ہیں جیسی لکھنؤ میں" دریچے سنگھہ کی یا "آغا میر" کی اور دہلی میں احمد پائی کی اور جوہر کی سرائے۔

۶۔ حج کو جانے والے پردیسی سیٹھ اسمعیل حبیب کے مسافر خانہ میں ٹھہرتے ہیں۔

۷۔ دنیوی کام دھندے کی غرض سے آنے والے یا تو (ا) دھرم سالوں میں رہتے ہیں یا (ب) اپنے ملاقاتیوں کے یہاں اترتے ہیں (ج) مکان کرایہ پر لیتے ہیں یا (د) ہوٹلوں میں

قیام کرتے ہیں۔

۸۔ اظہار وقعت و وجاہت اور حصول آرام و راحت کیلئے ہوٹل میں قیام کرنا ضروری ہے چنانچہ خطاب یافتہ دماغ نے فیصلہ کرلیا کہ چونکہ ان جیسی معزز ہستی کا پہلا فرض انسانیت اظہار وقعت و وجاہت ہے۔ لہذا ہوٹل کے سوا اور کہیں قیام ہونا نہ چاہئے اب رہی یہ بات کہ اس سے قبل کسی ہوٹل میں فروکش ہونیکا اتفاق نہیں ہوا۔ اس امر کے مانع نہیں کہ آئندہ بھی ہوٹل میں نہ ٹھیریں کیونکہ حصول علم کیلئے انسان کبھی بڈھا نہیں ہے۔

ہوٹل کے انتخاب کا معاملہ مقامی تحصیلدار صاحب سے رجوع کیا گیا جو علی گڈھ کے بگڑے "جنٹلمن" تھے اور جب یہ طے پا گیا کہ خاں صاحب کا فیضم سراوقات اقبال "تاج محل ہوٹل" ہوگا تو تحصیلدار صاحب ہی نے ایک کمرہ محفوظ رکھنے کیلئے ہوٹل کے منیجر کو منجانب خاں صاحب چٹھی لکھدی۔ خاں صاحب کا قصد تھا کہ سلار و بھی ہمراہ رکاب ہو۔ مگر تحصیلدار صاحب کی کفایت کہو یا واقفیت سنگ راہ ہوئی۔ اسٹیشنوں پر ہر چیز ریل کے کمرے کی کھڑکی سے ایک فٹ کے فاصلہ پر بکتی ہے اور ہوٹل میں بیرے اور خدمتگار تعمیل حکم کیلئے ضرورت سے زیادہ موجود اور مستعد ہیں۔

سامان سفر کی درستی، مکان سے روانگی، اسٹیشن پہنچے۔ ٹکٹ خریدنے۔ ریل میں جگہ تلاش کرنے اور بالآخر کامیاب ہوجانے اور راستہ طے کرنے کے واقعات اگرچہ بذات و مراتب اور لطف وحظ کے کروڑ ہا بلکہ ارب ہا اجزا شے ومتفرطیفی سے مرکب ہیں لیکن وقائع نگار کا قلم اون کے استقصا سے عاجز ہے۔ لہذا مختصر اعرض ہے کہ روانگی سے تیسری صبح کو پہلے "وکٹوریہ ٹرمنس" اور اس کے بعد تاج محل ہوٹل کے پلیٹ فارموں کے سمنٹ زدہ سطح کو خطاب یافتہ بوٹ سے مس کرنیکا فخر حاصل ہوا۔ ہوٹل میں قدم رکھتے ہی "خاں صاحب" کو منیجر سے ملنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ "ارے بھائی منیجر کہاں ہیں؟"

ایک کلرک قریب سے گزر رہا تھا اوس نے کہا "منیجر کا کیا کروگے؟"

ہم اس سے دریافت کریں گے کہ ہماری چٹھی کی تعمیل ہوئی یا نہیں؟"

"آپ کون ہیں"؟

"ہم ہیں خاں صاحب شیخ اسد علی مجسٹریٹ درجہ دوم سہراب نگر ضلع رستم گنج"

جناب کی برزخ کلرک کے لب و دنداں میں پہلے ہی برقی رو دوڑا چکی تھی۔ اظہار خطاب اور اختیارات درجہ دویم کے "ڈائنمو" نے اس رو کی طاقت کو کئی سو وولٹ اور بڑھا دیا لہذا ازبر دست سے زبردست بریک بھی قہقہہ کے روکنے میں کامیاب رہا۔ مگر چونکہ ہوٹل اور سرائیں چڑیا خانے ہوتے ہیں جن میں بہانت بہانت کا جانور آتا ہے اس لئے کاروباری تہذیب نے پہلے تصادم کے بعد ہی اس برقی اثر کو زایل کر دیا اور اس نے کہا "آپ نے ٹھیرنے کی جگہ کو لکھا ہو گا"؟

"بیشک! ہم نے لکھا تھا کہ ہم بمبئی آرہے ہیں اور ہمارے لئے ہوٹل میں ٹھیرنے کی جگہ محفوظ رکھو"

کلرک نے میز پر جاکر رجسٹر دیکھ کر کمرے کا نمبر معلوم کیا اور ایک قلی سے کہا "نمبر(۱۳۹) والے کمرے میں صاحب کو لیجاؤ" قلی نے مختصر سا اسباب اٹھایا اور خطاب یافتہ ہستی کو ایسے انداز میں پیچھے آنیکا اشارہ کیا جس میں ادب مرعوبیت کا کوئی عنصر نہ تھا اس قلی اور سرا میں ہوٹل کے سب قلیوں اور ملازموں کی اس درجہ بے اعتنائی اس ذات گرامی کے ساتھ دیکھ کر جیسے سہراب نگر اور قصبات متصلہ سہراب نگر کا ہر شخص جھک جھک کر دونوں ہاتھوں سے سلام کرنا اپنا فخر اور فرض سمجھتا ہے جس قدر غضب آمیز تعجب یا تعجب آمیز غضب خاں صاحب کے مزاج پر مسلط ہوا۔ ان کی کیفیت و کمیت کا اندازہ ناظرین میں سے صرف وہی اللہ کے بندے کر سکتے ہیں جو خان صاحب کی طرح خطاب پرست ہوں اور بمبئی جاکر ہوٹل میں ٹھیریں چلتے چلتے قلی ایک آہنی دروازے میں داخل ہوا اور خاں صاحب سے اشارہ کیا کہ وہ بھی تشریف لائیں مگر خاں صاحب کو یہ دیکھکر تاج محل ہوٹل بلکہ خود شاہجہاں بادشاہ بلکہ تمام سلاطین مغلیہ سے مایوسی ہوئی کہ ایسے خطاب یافتہ مجسٹریٹ کے لئے ایسا مختصر پنجرہ نما کمرہ محفوظ رکھا گیا ہے۔

"بمبئی ابمبئی میں ہمیں جانور مقرر کیا ہے جو اس پنجرے میں بند کرتے ہو۔ ہم اس میں نہیں رہینگے"

"قلی" جلدی آؤ صاحب ہمیں اور مسافروں کا اسباب بھی رکھنا ہے"

ہمیں اپنے عجز کا اعتراف ہے کہ ہم صحیح طور پر یہ سمجھ سکے کہ خاں صاحب مرعوب ہو گئے یا ایسے تنگ پنجرہ میں قیام پر رضامند لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اس کے اندر داخل ہوئے ابھی وہ اچھی طرح کھڑے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سارا کمرہ بہ جسد آہنی اوپر کو اڑا۔ اور درجہ دوم کا مجسٹریٹ ھکا بکا ہو کر رہ گیا۔ لیکن تعجب یا توحش کے اظہار کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ "لفٹ" نے ساٹھ فیٹ اڑ کر پانچویں منزل پر دم لیا۔ قلی کواڑ کھول کر نکلا اور کمرہ نمبر (۹۱۳) پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھول کر سامان اندر رکھا اور چلتا بنا۔

کوٹ اتارنے کے بعد خاں صاحب کی ہمہ گیر نگاہ نے کمرہ کے عرض و طول اور سامان آسائش کا جائزہ لیا۔

"نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ گا و تکیہ اور قالین کیسا۔ کمرہ میں چاندنی کا فرش بھی نہیں اور دس روپیہ روزآنہ لیتے ہیں کوئی اور آدمی لٹ جائے تو لٹ جائے مگر خاں صاحب اور مجسٹریٹ تو نہیں لٹ سکتا۔ ذرا منہ ہاتھ دھولوں تو منیجر کی وہ خبر لوں کہ یاد کرے کہ کوئی عزت دار مسافر آیا تھا"

قلی نے واقعی یہ نالائقی کی کہ خاں صاحب کو کمرہ کے جغرافیہ سے واقف اور سامان راحت کے استعمال اور استمتاع کے طریقہ سے آگاہ نہ کر دیا۔ منہ ہاتھ دھونے کا استعمال غسل خانہ میں ہوتا ہے۔ مگر یہ کس نے بتایا تھا کہ غسل خانہ کس مقام پر واقع ہے اور اس تک کیسے پہنچتے ہیں لہذا ایمان کی یہ ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی کا انتظام نہیں خاں صاحب کے دماغ کا قصور نہ تھا۔ اور جب یہ ہے کہ پانی کا انتظام نہیں تو منیجر سے اس کی شکایت نہ کرنا کیا معنی! کوئی دوسرا ہوتا تو صبر کر بھی لیتا لیکن ایک خطاب یافتہ مجسٹریٹ کو یارائے صبر کہاں! لہذا اتارے ہوئے کوٹ کو دوبارہ پہننے میں وقت صرف کرنا گوارا نہ کرکے کرتے پاجامے ہی میں نکل کھڑے ہوئے ماشاءاللہ

الغرض بہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ پچاس سے ادھر اور ساٹھ سے ادھر سن و سال۔ چہرہ نہایت طویل و عریض۔ اتنی اونچی اور لمبی ناک کہ اگر چہرہ کو جغرافیہ کی اصطلاح میں براعظم ہند مانا جائے تو ناک کو

سلسلۂ کوہ بندھیاچل کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ شمالی کنپٹی سے جنوبی کنپٹی تک نہایت سفید مگر نہایت موٹی اور کرخت اون کی جھالر جسے نہ باعتبار ہیئت کذائی بلکہ باعتبار جائے وقوع داڑھی کہہ سکتے ہیں سر کے سامنے اور اوپر کے حصے کے بال چونکہ افراط دولت یا کثرت مطالعہ سے گر چکے تھے لہٰذا سر کا دو تہائی حصہ پیشانی کی قلمرو میں شامل و داخل پچھلے حصہ میں لمبے لمبے مگر مضمحل بالوں کی قطار، جوانی کے بانکپن کی یادگار۔ گلا کھلا کرتہ۔ منغلی پاجامہ، ہاتھ میں صرف لوٹا اور پاؤں میں محض جراب صوبجات متحدہ کے لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی نشین خطاب یافتہ مجسٹریٹ کی تصویر کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے جسے وقائع نگار کا ٹوٹا پھوٹا قلم پیش کر سکا۔ قلی کے ساتھ کمرہ میں جاتے وقت ایک شخص کو دیکھا تھا کہ قریب والے کمرے میں سے پانی کا ایک ظرف لا رہا تھا خیال ہوا کہ آبدار خانہ یہی ہوگا لہٰذا یہ طے کیا کہ یہیں سے پانی لیکر ہاتھ منہ دھولیں تب منیجر سے ملیں گے۔" دروازہ کھول کر اندر جانا چاہتے ہی تھے کہ ایک چنچناتی لہجہ والی آواز نے دل ہلا دیا۔ "چلا جا ڈم کالا گدھا"

کوئی اور شخص اگر خاں صاحب کو "کالا گدھا" کیسا "سرخ گھوڑا" یا "سفید ہاتھی" بھی کہتا تو مجسٹریٹی تنور کا طوفان اس گنہگار کو معہ بہت سے بیگناہوں کے فنا کر دیتا مگر یہ چنچناتی لہجہ والی آواز ایک ایسی ہستی کی تھی جس کے تومی بوٹ کے تلے کی خاک مجسٹریٹی کی طاقت بڑھانے میں اشتہاری چٹکلی سے بھی زیادہ مجرب اور سریع العمل ہے۔

چپکے سے دروازہ بند کرکے سرپٹ بھاگنے کے سوا چارہ کار ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ایسی طویل و عریض ہستی کو اس سن و سال میں ایک نئی جگہ اس قدر تیزی سے مشق کرنی پڑی اور دوران مشق میں سینکڑوں آنکھیں ادھر ادھر سے اسے دیکھ رہی ہوں تو اسے پسینہ آنا اور دم پھول جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ تھوڑی دیر میں بمبئی کا "اپالو بندر" کشمیر کا زعفران زار ہوگیا۔ تیز اور گرما گرم مشق کتنی دیر تک رہی ضرور نہیں کہ گھنٹوں اور منٹوں کی صحیح تعداد بتائی جائے البتہ عرض کرنا ضرور یہی ہے کہ جب آنکھیں دیکھتے دیکھتے اور منہ ہنستے ہنستے تھک گئے

تو ہوٹل کا وہی قلی پھر خاں صاحب کو کمرے تک پہنچانے آیا اور اس مرتبہ کمرہ کے جغرافیہ اور حصول سامان تعیش کے رازوں سے واقف کر گیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ قلی نہایت بھلا مانس تھا۔ اس نے وقتاً فوقتاً خبرگیری کی اور ضرورت کے وقت مدد بھی دی۔

سہ پہر کی چائے پی کر خاں صاحب شہر میں گئے اور اپنے آڑتیوں سے مل آئے افسوس کے اخبار کا چیتھڑا بیچنے والا لونڈا نہ مل سکا۔ کیونکہ اخبار کا نام نہ معلوم تھا اور یہ پتہ بتانے کے قابل نہ تھا کہ وہ بصیغۂ مستقبل احتمالی۔ خاں صاحب کا داماد ہونے والا تھا۔

شام کے وقت قلی پھر آیا کہ کپڑے پہن کر کھانے پر چلیئے۔ چنانچہ زرد الپاکے کی اچکن زیب تن کر کے بنارسی سفید عمامہ باندھکر فلالین کا نیفہ دار پتلون جاپانی رنگین جرابیں، سیاہ کانپوری گرگابی پہن کر ہاتھ میں سفید رومال لیکر خاں صاحب تاج محل ہوٹل کے "ڈائننگ روم" میں داخل ہوئے۔ قلی جو اب تک سایہ کی طرح ساتھ تھا ایک کرسی پر بٹھا کر چلا گیا۔

الوان نعمت کی جو میز خاں صاحب کے حصہ میں آئی اس پر ایک پارسی اور پارسن موجود تھے ضلع کے صدر مقام پر جانیکی وجہ سے خاں صاحب کو وہاں کے سوداگر "شاہ پورجی" ناناجی سے ملنے اور باتیں کرنے کا اتفاق ہوا تھا اور خاں صاحب موصوف کے دل میں پارسیوں کی وقعت صاحبان حکام عالی شان سے دوسرے درجہ پر تھی۔

کرسی پر بیٹھتے ہی خاں صاحب نے پارسی کو نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور مزاج شریف پوچھا اس نے متعجب ہو کر دریافت کیا "آپ کون ہیں"؟

"میں جناب کی توجہات سے مجسٹریٹ درجہ دوم ہوں اور خطاب "خاں صاحب" سرکار دولتمدار کے دربار سے حاصل کر چکا ہوں۔ میرا نام "خان صاحب شیخ اسد علی مجسٹریٹ درجہ دوم سہراب نگر ضلع رستم گنج و مالک کارخانہ شکر سازی ہے"۔

پارسی عرصہ تک حیدر آباد رہ آیا تھا اس لیے صاف اردو بول سکتا تھا اس نے خان صاحب کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھ کر اپنی زبان میں پارسن سے کچھ مسکرا کر کہا۔

ہوٹل کے کھانے نہ خاں صاحب کی سمجھ میں نہ آنے اور نہ ادن کے کام و دہان کے لیے تھا۔
"ویٹر" سے جو میز کے قریب کھڑا تھا۔ مجسٹریٹانہ لہجہ میں فرمانے لگے "ارے یہ کیا اول جول کھانے ہیں اوّل تو تولہ دو تولہ سے زائد نہیں اس پر سیٹھے پھیکے، بدمزہ۔ کچھ پر اٹھے یا قرخانی۔ تھمن۔ بریانی۔ پلاؤ۔ درزدہ لائے ہوتے اور کچھ نہیں تو چپاتیاں اور کباب اور چٹنی ہی لاؤ"
ویٹر کچھ دیر کے بعد پڈنگ لایا اور کہا "یہ پرسند" ہو تو کھاؤ"
واقعی یہ چیز خاں صاحب کو نہایت "پرسند" ہوئی۔ کئی مرتبہ اور منگوائی پارسی اور پارسن کی بہ اصرار تمام تواضع کی۔ سگار کا کلش بھی پارسی کی طرف بڑھا دیا۔ پارسی اور پارسن جو خاں صاحب کی بزرخ مبارک کو دیکھ دیکھ کر اپنی زبان میں باتیں کرتے اور مسکراتے جاتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی دیر کے بعد وہ خاں صاحب کو اور خاں صاحب کے فہم و فراست اور مزاج و طبیعت کو سمجھ گئے چنانچہ ادنھوں نے خان صاحب کی تواضع سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور کہا۔
پارسی "تو آپ خاں صاحب و مجسٹریٹ صاحب ہیں"
خان صاحب۔ جی ہاں۔ صاحب بہادر حاکم ضلع نے "خان بہادری" اور اختیارات درجہ اوّل کی سفارش کا وعدہ فرمایا ہے"
پارسی۔ صاحب بہادر کی سفارش تو منظور ہو ہی جائیگی اس لئے ہم آپ کو ابھی سے خان بہادر کہتے ہیں۔
خان صاحب۔ "آپ کی مہربانی"
پارسی نے اپنی زبان میں پارسن سے پھر کچھ کہا۔
پارسن (پارسی کی طرف اشارہ کرکے) یہ صاحب بمبئی کے کروڑپتی سر رستم جی کاوس جی جہاز والا ہیں۔ بادشاہ سے ملاقات کر آئے ہیں اور "سر" کا خطاب رکھتے ہیں اور بمبئی میں ان کے کئی کارخانے کپڑا بننے کے ہیں۔
خان صاحب۔ "یعنی جو خطاب علی گڈھ والے سید احمد خاں کو ملا تھا؟"

پارسن۔ "ہاں اور جو ہندوستان کے راجوں اور نوابوں کو ملتا ہے"

پارسی۔ (پارسن کی طرف اشارہ کرکے) یہ میری بیوی لیڈی رستم جی ہیں"

جو مسرت اس وقت خان صاحب کی پیشانی اون کی آنکھوں اون کے ہونٹوں۔ ان کی داڑھی کے بالوں بلکہ جسم کے رونگٹے رونگٹے سے برس رہی تھی اسے وقائع نگار نے چشم تصور سے نہیں بلکہ چشم سر سے دیکھا ہے اور اس کے بعد ہی اس نے اُس افسوس کو بھی دیکھا ہے جو اعضائے متذکرہ بالا سے ٹپ ٹپ برستا تھا۔ بدیں وجہ کہ اس وقت ابنائے سہراب نگر ہیں سے کوئی موجود نہ ہوا اور نہ دیکھا کہ ان ہی میں کا ایک فرد بمبئی کے کروڑ پتی کپڑا بننے کے کارخانوں کے مالک "سر" کا خطاب رکھنے اور بادشاہ سلامت سے ملاقات کرنے والے سے دُو بدُو بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔

سر رستم جی "ہاں خان بہادر تو آپ بمبئی میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ آپ بمبئی کو کیسا پسند کرتے ہیں۔

خان صاحب۔ حضور میں بمبئی پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ مجھے تو یہ شہر بالکل پسند نہیں آیا۔ نہایت لغو جگہ ہے ادنےٰ طبقہ کے مسافر کو کسی قسم کا آرام نہیں مل سکتا آدمی یہاں کے نہایت بے ادب اور بدتمیز ہیں۔

رستم جی۔ "تعجب ہے کہ آپ کو پسند نہ آیا۔ یہ تو ہندوستان میں پہلا شہر ہے ہماری رائے میں تو کوئی آرام نہیں جو اس شہر میں نہ مل سکتا ہو۔ ہاں دام پاس ہونے چاہئیں یہاں کے آدمی بیوپاری ہیں اس لئے آپ کے شہروں کی آدمیت تو ان میں نہیں ہو سکتی۔

خان صاحب۔" حضور! دام پاس ہونے کی تو یہ حالت ہے کہ (جیب میں سے نکال کر) یہ دیکھئے دو ہزار کے نوٹ جو آج ہی یہاں کے آڑتیے سے وصول ہوئے ہیں"

رستم جی نے اپنی زبان میں لیڈی رستم جی سے کچھ کہا اور کے خان صاحب سے کہا: خان بہادر" آپ نے یہاں کے اونچے درجہ کے آدمیوں سے ملاقات نہیں کی ورنہ آپ کا خیال ہماری شہر یوں کے متعلق اس قدر خراب نہ ہوتا۔ اگر آپ کو کوئی کام نہ ہو تو آئیے ہم آپ کو اپنے دوست آنریبل سر اسمٰعیل کریم اللہ سے ملائیں جو آپ کے ہندوستان تک مشہور ہیں۔

جو شخص معمولی ڈپٹی صاحب کی ملاقات کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہو اس کے نزدیک

سر اسمٰعیل کریم اللہ کے سی آئی ایس ۔ جے ۔ پی بمبئی کے مشہور ارب پتی سے مصافحہ کرنے کی عزت حاصل ہونا بلکہ عزت حاصل ہونے کی امید پیدا ہونا گزشتہ اور آئندہ کئی پشتوں کی نجات کیلئے کافی ہے ۔

خان صاحب " حضور کی مہربانی مجھے کوئی ضروری کام ہوتا بھی تو اتنے بڑے شخص سے ملاقات کی خاطر چھوڑ دیتا ۔حضور کس وقت چلئے گا ؟

رستم جی (اپنی زبان میں لیڈی سے کچھ بات کرکے) " چلئے ابھی چلیں "۔

خان صاحب ۔ جو تاج محل ہوٹل کے زبردست " ویٹر " سے سوائے " پڈنگ " کے چند چمچوں کے مطلق متمتع نہ ہوئے تھے ۔مر و اور لیڈی رستم جی کی معیت میں ڈائننگ حال سے نکلے اور لفٹ کے ذریعے سے نیچے آئے ۔

سر رستم جی ۔ " خان بہادر مصافحہ کیجئے ۔آپ انگریزی جانتے ہیں ؟"

خان صاحب " حضور نہیں ۔ والد مرحوم نے . . . . . . "

سر رستم جی ۔ " تو پہلے ٹیلیفون سے سر اسمعیل کو آپ کے آنیکی اطلاع کر دیں اس کے بعد روانہ ہونگے ۔" یہ کہکر ایک طرف کو چلے ۔ خان صاحب نے دیکھا کہ سر رستم جی نے ایک کالا چونگا سا اٹھایا جس میں سے گھنٹی بجی اور دیر تک انگریزی میں ہنستے اور بولتے رہے پھر چونگے کو رکھدیا ۔اور خان صاحب سے کہا " خان بہادر ہم نے اطلاع کر دی ۔سر اسمٰعیل آپ سے مل کر بہت بہت خوش ہوں گے ۔"

خان صاحب ۔" یہ حضور کی مہربانی ہے جو ایسے بڑے لوگوں سے اس خاکسار کو ملاتے ہیں "

سر رستم جی " آپ بھی بڑے آدمی ہیں "

خان صاحب (خوش ہوکر) " حضور کی مہربانی ! ہاں اپنے ہم چشموں میں تو میں نے بھی آپ کی توجہات سے بہت عزت پیدا کی ہے "

ایک موٹر میں لیڈی رستم جی نے بڑے اصرار سے خان صاحب کو اپنے برابر صدر پر بٹھایا اور سر رستم ان کی جگہ بیٹھیں ۔ مگر رستم جی نے فرمایا کہ " آپ عمر اور عزت دونوں میں بڑے ہیں "

سر رستم جی نے چپکے سے " شوفر کو " حکم دیا مگر وقائع نگار نے کرائیٹرین رستوران " میں کہا کچھ

گیس سے روشن سڑک پر چلنے کے بعد موٹر ایک عمارت کے دروازہ پر رکی سر اور لیڈی رستم جی معہ خان صاحب موٹر سے اتر کر عمارت میں داخل ہوئے اور لفٹ کے ذریعہ سے اوپر جاکر ایک کمرے کی طرف چلے کمرے کے دروازہ پر ایک خدمتگار کھڑا تھا جس سے سر رستم جی نے پوچھا "سر اسمٰعیل ہیں"

خدمتگار نے اثبات میں جواب دیا مگر قائم نگار کی نظر نے خدمتگار کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ دیکھ لی۔ کمرہ کا دروازہ کھول کر سر رستم جی خان صاحب کا ہاتھ پکڑ کر داخل ہوئے اس کے بعد لیڈی رستم جی۔

ایک دبلا پتلا نہایت گورا شخص انگریزی وضع کے کپڑے پہنے مگر سر پر زری کی بنی ہوئی پگڑی رکھے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اِدھر اُدھر کی کرسیوں پر دو تین اور نوجوان انگریزی کپڑے پہنے ننگے سر بیٹھے تھے سر رستم جی نے جاتے ہی کہا "سر اسمٰعیل! مجھے مہلت دیجئے کہ میں آپ کی خدمت میں اپنے ایک بہت بڑے دوست کو پیش کروں۔ مولوی۔ . . . . ارر . . . (خان صاحب سے مخاطب ہوکر) معاف کیجئے گا میں آپ کا نام بھول گیا۔ خان صاحب (براہ راست سر اسمٰعیل سے) حضور! میرا نام شیخ اسد علی اور خطاب خان صاحب ہے میں سہرآب نگر ضلع رستم گنج میں آنریری مجسٹریٹ درجہ دوم اور کارخانہ شکر سازی کا مالک ہوں۔

سر اسمٰعیل "آپ سے ملاکات" کرکے بہت (خوش) ہوا۔"

خدمتگار نے آکر کہا۔

سیٹھ — چھ سنگل چاء اور چھ پٹی پان بڑی لے آیا" جس کے جواب میں سر اسمٰعیل نے ناراض ہوکر کہا "کیا بکتا ہے سالا چلا جاؤ۔

کہان صاحب۔ آپ کب تشریف لائے میں بہت دلگیر ہوں کہ مسلمانی بولی میں اچھی بات نہیں کر سکتا"

"حضور کیا حاضر ہوا تھا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی زبان دوسری ہے"

سر رستم جی "بہتر ہوگا سر اسمٰعیل کہ میں آپ کے اور خان بہادر کے درمیان ترجمانی کا کام دوں"

سر اسمٰعیل نے ہنس کر اپنی زبان میں ایک فقرہ کہا جس میں لفظ ممنوعہ کا استعمال تین مرتبہ کیا رستم جی نے اس کا ترجمہ یوں کیا "سر اسمٰعیل فرماتے ہیں کہ میں آپ کے ملک میں ہو آیا ہوں۔ مجھے وہاں مسلمانوں کی پست حالت دیکھ کر نہایت افسوس ہوا۔ میں اب وائسرائے بہادر کی کونسل میں ایک "بل" پیش کروں گا جس سے آئندہ مسلمانوں کی حالت میں بہت کچھ ترقی ہوگی۔

خان صاحب۔ "حضور اس بات کی کوشش فرمائیں کہ مسلمانوں کو خطابات اور اختیارات اب سے زیادہ تعداد میں ملا کریں قصبہ سہراب نگر میں صرف ایک میں ہی خطاب یافتہ اور مجسٹریٹ ہوں قریب کے قصبہ دار انگر میں میر قایم علی کا بیٹا دائم علی بہت لائق نوجوان ہے۔

وقائع نگار اس کرخت اور کریہہ لفظ کے استعمال کے لئے ناظرین سے معافی طلب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بمبئی کے طبقہ سافل کے افراد کی گفتگو کی نقل اس وقت تک مطابق اصل نہیں سمجھی جا سکتی جب تک اس میں لفظ مذکور کا اتنا خرچ نہ ہو جتنا حیدرآباد کے سالن میں مرچ کا۔

انگریزی مڈل تک پڑھ چکا ہے اس کا باپ زمیندار اور دولت مند ہے اگر اسے حضور مجسٹریٹی دلادیں تو میں بڑا احسان مند ہوں گا"

سر رستم جی نے سر اسمٰعیل کے جواب کا انتظار کئے بغیر فرما دیا کہ "سر اسمعیل فرماتے ہیں کہ اس کے متعلق بھی کوشش کروں گا۔ (خدمتگار سے) سگار اور شراب لاؤ۔

چنانچہ خدمتگار۔ پہلے ایک بلوری طشتری میں سگار اور اس کے بعد نقرئی تھالی میں گلاس لایا اور حاضرین میں سے ایک صاحب نے دونوں چیزیں تقسیم کردیں۔

خان صاحب۔ شربت کا گلاس ہاتھ میں لیتے جھجکے۔ مگر رستم جی نے سمجھایا کہ "کیوڑے کا شربت ہے کوئی چیز خلاف احتیاط نہیں ہے چنانچہ سب نے شربت پیا اور خان صاحب نے بھی۔

شربت میں یقیناً شیرینی بھی تھی کیوڑے کی خوشبو بھی۔ خان صاحب سگار بہت کم اور کبھی کبھار پیتے تھے دیا سلائی لیکر سگار روشن کیا اور دو چار کش لئے کہ کچھ غنودگی سی معلوم ہوئی سمجھے کہ رات زیادہ گئی ہے۔ سفر کی کسلمندی ہے۔

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

ازہ کھلتے ہی خان صاحب کی آنکھ کھلی دیکھا تو دن بہت چڑھ آیا ہے قلی چائے کی تھالی لئے کھڑا ہے چاروں
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے حواس مجتمع ہوئے تو اتنا خیال آتا تھا کہ رات کو سر اسمٰعیل کریم اللہ کے سی۔
آئی۔ جے۔ پی کے مکان پر بمعیت سر رستم جی اور لیڈی رستم بھی گئے تھے۔ مگر کب آئے، کیسے آئے یہ !!
آتا تھا۔ بہرحال چائے تو پی لی اور یہ سوچنے لگے کہ "اب اس شہر میں زیادہ قیام کرنا وقت اور روپیہ دونوں
باہ کرنا ہے روپیہ کے نام پر خان صاحب کو نوٹوں کا خیال آیا اور جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر یہ دیکھ کر کہ
ب ویسی ہی گداز اور سخت ہے اس طرف سے اطمینان ہوا۔ خیر نوٹ سلامت ہیں مگر یہاں زیادہ قیام
ناک ہے " ہمراہی میں ایسا کون گٹھریوں سامان تھا جس کے جمع کرنے اور باندھنے میں گھنٹے لگتے بیگ
سلیپر اور دوپلی ٹوپی اور لوٹا رکھکر بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد جب قلی آیا تو اسے بیگ دیکر نیچے اترے
ٹ کے دروازہ کے سامنے ہی مینجر کا کلرک رجسٹر لئے بیٹھا تھا جو خان صاحب سے خاصی واقفیت رکھتا
اس نے ایک قلی کو دوڑایا کہ اگر یہ مسافر ہوٹل سے جا رہے ہوں تو پہلے حساب بے باق کر کے جائیں۔
ن صاحب قلی کے ساتھ آئے اور کلرک کو ڈانٹ بتائی "ہم تم سے کل ہی کہہ چکے ہیں کہ ہم خان صاحب
ی اسد علی مجسٹریٹ درجہ دوم سہراب نگر ہیں کچھ ایسے ویسے نہیں جو چوری چھپے بغیر حساب صاف کئے
ے جائیں"۔ کلرک نے بل پیش کیا۔

کرایہ کمرہ دو یوم بحساب دس روپیہ یومیہ عـــہ ۲۰
کرایہ موٹر پانچ گھنٹہ بحساب چار روپیہ فی گھنٹہ عـــہ ۲۰
سگار چھ عدد فی سگار ایک روپیہ ـــہ ۶
پڈنگ زائد پلیٹ چار عدد بحساب ایک روپیہ للعہ ۴
کل ـــہ ۵۰

خان صاحب بل دیکھ کر نہایت جزبز ہوئے اور فرمانے لگے "سوائے کمرہ کے کرایہ کے اور کوئی
اہم نہ ادا کریں گے۔ یہ سب رقوم سر رستم جی صاحب کے بل میں داخل ہونی چاہئیں"

کلرک ۔ آپ کی میز والے ویٹر نے لکھا یا ہے کہ سگار اور پڈنگ آپ نے اپنے لیڈی اور جنٹلمن دوست دے اور موٹر میں میں نے خود آپ کو آپ کے دوستوں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا "

خان صاحب ۔ نہیں جی! سر رستم جی ہمیں اپنے دوست سر اسمٰعیل جی سے ملانے کے لئے لیگئے تھے رقم ان کے بل میں داخل ہونی چاہئے ۔

کلرک ۔" کون سر رستم جی ۔ ہم کیا جانیں "

خان صاحب ۔" واہ بمبئی کے کروڑپتی، کپڑا بننے کے کارخانوں کے مالک، اور بادشاہ سلامت سے ملاقات کرنے والے ۔ انہیں تم کہتے ہو کہ ہم نہیں جانتے "

کلرک نے بمبئی " ڈائرکٹری دیکھ کر کہا" سر رستم جی تو بمبئی بھر میں کوئی نہیں ہے ۔ خیر ۔ اس سے کیا مطلب ۔ کوئی رقم غلط نہیں ہے ۔ بل ادا کرنا ہوگا "

خان صاحب ۔ باوجود مجسٹریٹ اور آتشیں مزاج ہونے کے پھر کاروباری آدمی تھے سمجھے کہ جو ہوا سو ہوا اب جھنجھلاہٹ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا ۔ ناچار جیب میں ہاتھ ڈالا کہ بلا سے دو ہزار ہیں سے پچاس شد شد نوٹوں کا لفافہ کھولا ۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ نوٹوں کی جگہ ایک انگریزی اخبار کے ورق رکھے ہوئے ہیں دماغ چکرا گیا ۔" سائیکل اسٹینڈ " پاس تھا جسے تھام لیا ورنہ تیورا کر دھم سے زمین پر آرہتے ۔ بیچارے نے کلرک سے کہا کہ " ہمارے نوٹ چوری گئے " اور سارا ماجرا از اول کہنا چاہا ۔ مگر کون سنتا ہے یہ رستم و افراسیاب کی داستان سنانا چاہتے ہیں اور وہ پولیس کے ہفت خوان کی دھمکی دیتا ہے خان صاحب طرح طرح سے کوشش کرتے ہیں مگر بحث و تکرار بے اثر ۔ غصہ و درشت مزاجی بے سود ۔ دو چار مسافر دس پانچ قلی آس پاس جمع ہو گئے ۔

ایک خوبصورت نوجوان جنٹلمن جو سر سے پا تک بے عیب مگر سادہ انگریزی لباس پہنے ٹکٹکی باندھے اس ہنگامہ کو دیکھ رہا ہے سلگا ہوا سگار ہاتھ میں ہے مگر وہ واقعات کو دلچسپی سے دیکھنے میں اس قدر مشغول ہے کہ دیر سے ایک کش بھی نہیں لیا اور چاہتا ہے کہ نگاہ ہٹنے نہ پائے اور کوئی چیز نہ دیکھنے یا سننے سے رہ نہ جائے جب خان صاحب بحث و تکرار اور غصہ و درشت مزاجی

کے اونچے چبوترے سے اتر کر خوشامد کی سب سے نیچی سیڑھی پر پہنچے تو اس نوجوان نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور کلارک سے انگریزی میں کچھ کہا۔ کلارک اس کے پاس گیا اور اس کے پیچھے پیچھے خان صاحب کی سابق خطاب آمود اور حال عجز آلود نگاہ بھی گئی جنٹلمن نے کلارک سے پھر کچھ انگریزی میں کہا اور اس نے بل دکھایا۔ جنٹلمن نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تین سا وران اور ایک نوٹ نکال کر کلارک کو دیا اس نے میز پر جاکر بل پر ٹکٹ لگایا اور دستخط کرکے خان صاحب کو لاکر دیدیا اور کہا "آپ کا حساب بے باق ہوگیا"

چند لمحوں تک تو خان صاحب مبھوت رہے اس کے بعد ان کا دماغ اس امر کے سمجھنے کے قابل ہوا کہ ایک اجنبی انگریز کی دستگیری نے انہیں سمندر میں ڈوبنے سے بچالیا ورنہ بمبئی جیسے شہر میں جس شخص کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو وہ تاج محل ہوٹل کا پچاس روپیہ کا بل کیسے ادا کرسکتا۔ اور نہ کرسکتا تو "اسپلنیڈ پولس کورٹ" جانے سے کیسے بچ سکتا۔ خان صاحب اس جنٹلمن کے پاس گئے اور کلارک کو اس غرض سے ساتھ لیتے گئے کہ وہ جو کچھ کہیں اس کی ترجمانی صاحب سے کردے اور انہوں نے سچی احسان مندی کے لہجے میں صاحب سے کہا "حضور نے میری عزت و آبرو بلکہ جان بچائی اس احسان کا میں شکریہ ادا کر نہیں سکتا۔ حضور اپنا نام نامی اور پتہ مجھے بتائیں تاکہ میں وطن پہنچ کر حضور کا عطیہ شکریہ کے ساتھ واپس کرسکوں اور حضور کے جان و مال کو دعا دیتا رہوں" خان صاحب منتظر تھے کلارک ان کی اس مختصر اسپیچ کا ترجمہ صاحب کو سنائے مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس جنٹلمن نے نہایت شستہ اردو میں کہا "آپ بزرگ ہیں۔ . . . (دفعتاً لہجہ بدل کر) میں نے محض ایک انسانی فرض ادا کیا ہے۔ میں نہ کسی شکریہ کا مستحق ہوں اور نہ واپسی رقم کا خواستگار"

خان صاحب۔" اوہو! حضور تو اردو خوب بول اور سمجھ سکتے ہیں یہ حضور کیا فرماتے ہیں کہ شکریہ کا مستحق نہیں، میں اور میرا خاندان حضور کا قیامت تک شکر گزار رہیگا اور رقم تو میں مکان پہنچتے ہی حاضر کروں گا۔ میں خدا کے فضل سے مالدار ہوں کچھ محتاج نہیں "

جنٹلمن " آپ مجھے حضور نہ کہئے میں ہندی اور آپ کا ہم مذہب ہوں ۔
خان صاحب ۔ (فوراً لہجہ بدل کر) تو میں آپ کا احسان مندضرور ہوں آپ اپنا پتہ مجھے بتا ئیں تاکہ گھر جاتےہی یہ رقم آپ کے پاس بھجوادوں "۔
جنٹلمن " اگر آپ اس خفیف ادائی فرض انسانی کو احسان سمجھتے ہیں تو اس کے معاوضہ کی ایک صورت ہے "۔
خان صاحب " وہ کیا ؟ "
جنٹلمن " وہ یہ کہ احمد کے ساتھ جمیلہ کا عقد فرما دیجئے "۔
تاج محل ہوٹل کی اس سرزمین پر جہاں یہ باتیں ہورہی تھیں اگر چھت پر سے کوئی " بم " گر کر پھٹتا تو خان صاحب اس قدر حواس باختہ نہ ہوتے جس قدر تو اس جملہ کے سننے سے ہوگئے ۔
خان صاحب " احمد کون اور آپ جمیلہ کو کیا جا نیں "
جنٹلمن " احمد میرا ایک دوست ہے جو یہاں کے ایک انگریزی اخبار کا سب ایڈیٹر ہے مجھے جمیلہ کا نام اس سے معلوم ہوا ہے "
خان صاحب " خدا کی شان ! ایک شریف زادی کا نام اس طرح لوگوں کی زبان پر مارا مارا پھرے ۔ سنو صاحب ! میں یہ کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا کہ میری لڑکی کا عقد ایک اخبار کا چھچھڑا بیچنے والے لونڈے سے ہو ۔ اور تم میرے خانگی اور ذاتی معاملات میں دخل دینے والے ہوتے کون ہو ؟ "
جنٹلمن " جناب کی مرضی ۔ اس بحث کو جانے دیجئے ۔ ہاں آپ کے یہاں سے کوئی اخبار نکلتا ہے ؟ "
خان صاحب " قصبہ سے تو کوئی اخبار نہیں نکلتا مگر ضلع کے صدر مقام سے ایک ہفتہ وار اردو اخبار " ذوالقرنین " نکلتا ہے ۔
جنٹلمن ۔ کیا اس اخبار کو مقامی حکام اور رؤسا پڑھتے ہیں ؟
خان صاحب ۔ مقامی حکام کیسے صوبہ کے لاٹ صاحب تک پڑھتے ہیں اور رؤسا میں تو آپ صاحب رامپور اور حضور نظام تک ملاحظہ فرماتے ہیں ۔
جنٹلمن ۔ تو میرا ارادہ ہے کہ ایک نہایت گرجتا ہوا مضمون لکھ کر اس اخبار میں چھپوادوں جس میں

ان تکالیف و مصائب کا مشرح حال درج ہو جو خان صاحب اسد علی آنریری مجسٹریٹ کو بمبئی میں پیش آئیں۔

خان صاحب تم ان واقعات کو اخبار میں چھاپنے والے کون اور تمہیں ایسا کرنے کا کیا حق ہے

جنٹلمن۔ میں ایک انسان ہوں اور مجھے حق ہے بلکہ میرا فرض ہے کہ بدمعاشوں کی بدمعاشیاں عالم آشکارا کروں۔ تاکہ میرے دوسرے ابنائے جنس اس آسانی سے ان بدمعاشیوں کا شکار نہ ہوں جس آسانی سے مجسٹریٹ صاحب ہو گئے۔

خان صاحب۔ اگر ایسا کروگے تو میں عدالت میں دعویٰ کروں گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں مجسٹریٹ ہوں۔ اور خطاب یافتہ خان صاحب ہوں۔

جنٹلمن۔ میرے خیال میں جناب کی تشخص کیوجہہ سے مقدمہ نہایت درجہ پُرلطف ہو گا۔ ہوٹل والوں کو اگر جناب کے ارجاع نالش کے ارادہ کا علم ہو جائے تو وہ ادائی شہادت کے لئے ابھی سے بیتاب اور اس وقت کے منتظر ہوں گے جب کہ ان واقعات کا ثبوت دیسکیں۔

خان صاحب۔ تو کیا واقعی آپ اخبار میں مضمون چھپوائینگے۔ ؟

جنٹلمن۔ ارادہ تو کر چکا ہوں۔

خان صاحب۔ کیا میں جناب کو اس ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتا ؟

جنٹلمن جس طرح میں جناب کے ذاتی اور خانگی معاملات میں دخل دینے والا ہوتا کون ہوں اسی طرح بہ کمال ادب یہ عرض کرتا ہوں کہ جناب میرے علمی اور قلمی مشاغل میں دخل دینے کی زحمت کیوں فرمائیں۔

خان صاحب۔ ہاں جناب تو آپکے وہ دوست جو کسی اخبار کے مالک ہیں کون صاحب ہیں کہاں کے باشندے ہیں کس خاندان سے ہیں۔

جنٹلمن۔ یہ تو سب کچھ اپنے وقت پر عرض کیا جاتا مگر جنابنے تو دیباچہ سے پہلے تمت بالخیر لکھنے کا فیصلہ فرما دیا۔

خان صاحب جس دوست کے متعلق آپ درخواست پیش کرنا چاہتے ہیں میں اس درخواست کو

سننے کیلئے تیار ہوں اگرچہ حسب مراد حکم دینے کا وعدہ نہیں کرتا مگر یہ سب اس وقت جب میں بخیریت مکان پہنچ جاؤں۔

جنٹلمن۔ بہتر ہے اپنے دوست کی طرف سے یہ درخواست میں جناب کے دولت خانہ پر حاضر ہو کر ہی پیش کرسکتا ہوں۔

خان صاحب۔ مگر جناب والا پہلے اس مخمصہ سے تو نجات ہو جائے جو میرے لئے سوہان روح ہو رہا ہے۔

جنٹلمن۔ وہ کیا ؟

خان صاحب۔ یہی کہ آپ ان بمبئی والے واقعات کو اخبار میں چھاپ دینگے ؟

جنٹلمن۔ جناب کی جو وقعت میرے دل میں ہے اس کی بناء پر یہ وعدہ کرسکتا ہوں کہ جناب کے فیصلہ سے پہلے میں ان واقعات کو درج اخبار نہ کروں گا۔

خان صاحب۔ میں جناب کے وعدہ کا یقین و اعتبار کرتا ہوں۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔

جنٹلمن۔ کیا وطن کو تشریف لیجاتے ہیں ؟

خان صاحب۔ جی ہاں !

جنٹلمن۔ چلئے میں بھی جناب کی معیت میں چلتا ہوں۔

خان صاحب۔ (حیران ہوکر) کہاں ؟

جنٹلمن۔ رستم گنج وہاں میرے اکثر احباب ہیں اُن سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور جناب کے دولت خانہ پر حاضر ہو کر میں اپنے دوست کی درخواست بھی پیش کرسکوں گا۔

خان صاحب۔ (دل میں وہاں پہنچنے کے بعد بلطائف الحیل ٹال دوں گا) بہتر جنٹلمن نے سکنڈ کلاس کا اور خان صاحب نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور گاڑی میں سوار ہو گئے جنٹلمن بمقتضائے انسانیت بڑے بڑے جنگشنوں پر اتر کر خان صاحب کے کمرے کے دروازہ پر آتا تھا اور دریافت کرتا تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہو میں حاضر ہوں۔

خان صاحب کو اکثر لوٹے میں پانی بھروانے کی ضرورت ہوئی بیچارہ اپنے ہاتھ سے نل سے پانی

لے آیا چاء کی پیالی لایا۔ انگریزی کھانا چونکہ خان صاحب کو پسند نہ تھا جس کا تلخ تجربہ تاج محل ہوٹل میں ہو چکا تھا۔ اس لئے روٹی کباب خرید کر لایا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ خان صاحب بھی راستہ بھر اس سے نہایت اخلاق سے پیش آئے دو ایک مرتبہ غیر ضروری سوال بھی کئے۔

خان صاحب۔ جنابنے تعلیم کہاں تک پائی ہے؟

جنٹلمن۔ جناب میں نے پہلے علی گڈھ کالج سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم۔اے پاس کیا۔

خان صاحب۔ یہ "اسپغول" کس شہر کا نام ہے؟

جنٹلمن (نہایت متانت سے) "اسپغول" نہیں جناب آکسفورڈ ولایت میں ایک شہر کا نام ہے۔

خان صاحب۔ تو آپ صاحبان حکام کی ولایت میں رہ آئے ہیں!

جنٹلمن۔ جی ہاں۔

خان صاحب۔ معاف فرمایئے۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔

جنٹلمن۔ نہیں جناب۔

راستے میں خان صاحب کو ایک سے زیادہ مرتبہ خیال ہوا کہ یہ شخص نہایت شریف اور لائق آدمی ہے مجھ سے جان پہچان کچھ نہ تھی مگر اس نے میرے بدلے ہوٹل کا بل ادا کیا پھر اپنے ایک دوست کیلئے یہاں تک ساعی ہے کہ میرے ساتھ میرے وطن جا رہا ہے کہ وہاں جا کر اس کی درخواست پیش کرے۔ ہندوستان کا بی۔اے ہے اور ولایت کا ایم۔اے ہے۔

خوبصورت ہے، نوجوان ہے، ناکتخدا ہے، اگر ایسا شخص ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ قایم علی کا لڑکا اگرچہ ایک دولتمند زمیندار کا لڑکا ہے لیکن اسے اس سے کیا نسبت۔

بارے یہ سفر ختم ہوا اور ضلع کے صدر مقام کا اسٹیشن آیا۔ خان صاحب اپنے کمرے سے اور جنٹلمن اپنے کمرے سے نکلے۔

خان صاحب۔ لیجئے رستم گنج تو پہنچ گئے آپ تو یہیں مقام کیجئے گا۔ مجھے ایک اسٹیشن آگے جانا ہے

یہاں کہاں مقام فرمائیے گا۔

جنٹلمن۔ یہاں میرے چند شنا سا ہیں ۔

خان صاحب۔ کون کون ۔؟

جنٹلمن۔ مرزا قسم بیگ چغتائی۔ مرزا محمد وجیہہ۔ مولوی ظفر عمر۔

خان صاحب۔ (مرعوب ہوکر) اخاہ آپ کی ان حضرات سے ملاقات ہیں۔

جنٹلمن۔ جی جناب۔ مگر میں اس وقت یہاں نہیں اتروں گا ۔ بلکہ جناب کی معیت میں سہراب نگر چلونگا۔ اور جناب کو آپ کے دولت خانہ پر پہنچا کر دوسری گاڑی سے واپس آجاؤں گا ۔

خان صاحب۔ تو آپ اس قدر تکلیف کیوں گوارا فرماتے ہیں۔

جنٹلمن۔ اگر میں پہلے اس شہر میں اتر پڑا۔ اور اپنے کسی دوست کی معیت میں اخبار "ذوالقرنین" کے دفتر میں چلا گیا تو ممکن ہے میں اپنے وعدہ پر قایم نہ رہ سکوں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلے جناب کے دولت خانہ پر جاکر کم از کم پان ہی کھا آؤں تاکہ پان فراموشی نہ کر سکوں ۔

خان صاحب۔ بہتر ہے میں نان جویں پیش کر سکوں گا۔

چنانچہ دونوں پھر اپنے کمرہ میں بیٹھ گئے ۔

خان صاحب ۔ راستے میں پھر اپنے خیالات میں منہمک ہو گئے ۔

علاوہ ان خوبیوں کے جنھیں میں پہلے سوچ چکا ہوں حکام ضلع سے دوستانہ بھی ہے اگر کسی طرح جمیلہ کی ماں راضی ہو سکے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے اسلئے پیغام تو دے نہیں سکتے ۔خیر خدا مالک ہے ۔

سہراب نگر کا اسٹیشن آگیا۔ دونوں اپنے اپنے کمروں سے اُترے خان صاحب نے ایک یکہ کرایہ کیا جنٹلمن کو اگرچہ یکہ کی سواری میں تکلیف ہوتی مگر اس نے براہ سعادتمندی اس کا اظہار نہ کیا۔ مکان پہنچے خان صاحب نے اسباب رکھوا کر جنٹلمن سے کہا۔

میں ذرا اندر ہو آؤں آپ یہاں قیام فرمائیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں ۔

جنٹلمن ۔ بہتر

خان صاحب اندر تشریف لیگئے۔ آفتاب بیگم اور جمیلہ دونوں کھڑی ہوگئیں۔

خان صاحب قصد فرماتے تھے کہ حسب عادت اظہار سوء مزاجی کریں . . . .

"خالہ جان آداب عرض کرتا ہوں"

آفتاب بیگم ۔ "ارے احمد آؤ بیٹا تم کہاں؟"

خان صاحب پیٹھ پھیر کر جو دیکھتے ہیں تو وہی جنٹلمن جو بمبئی سے اُن کے ساتھ آئے تھے ۔ (ن)

مشہور قطعات

کلام کی خوبی یہ ہے کہ ایک دفعہ پڑھ لینے کے بعد مدتوں دل اسی کا لطف اوٹھاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ :- "کسی کے آنکھ میں جادو تیری زبان میں ہے" کہا گیا ہے۔ یا یہ صحیح ہے کہ شعر خود ایک نغمہ اور ہمہ تن موسیقی ہے اور دلوں کو مسحور اور مسخر کرلیتا ہے۔ ذیل میں چند ایسے قطعے درج کئے جاتے ہیں کہ جس کو ایک دفعہ پڑھنے کے بعد دل اس کو فراموش کردینے کیلئے کبھی آمادہ دکھائی نہیں دیتا ÷

قطعات نمبر ۱ و ۲ کا پتہ نہ چل سکا کہ کس کے لکھے ہوئے ہیں البتہ نمبر ۳ و ۴ ذکا اور سخی کے ہیں ÷

(۱)

کل بن کے شیخ مجتہد العصر سامنا ... دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہ تبحر مجھے بہ طنز ... معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ ہم بھی ہیں یہ خوب جانتے ... پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
ساقی ہو۔ کنج باغ ہو اور حور ماہ وش ... کوئی وہاں مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب ... دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئیں ... گر پی نہ جائیں آپ یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو ... گر خوف کچھ بھی کیجئے روز حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام ... قائل نہیں جناب کسی شیخ وشاب کا

(۲)

ایک دن کوچہ جاناں میں پکارا میں نے ... ایک دل بیچتا ہوں ہے کوئی لینے والا
دلفروشی کی صدا سن کے یکایک گھر سے ... مست ناز آگیا دروازہ پہ اک متوالا
پس مجھے دیکھ کے خوش ہوکے لگا یوں کہنے ... ہاں ابھی کون پکارا تھا کھرا دل والا

عرض کی میں نے کہ حاضر ہوں میں موجود ہے دل | دل سی شیشے بیچتا ہوں ہے کوئی لینے والا
پھر جو کچھ سمجھ آگئی دل میں تو یکایک دل کو | لے لیا ہاتھ میں اور خوب سا دیکھا بھالا
وائے قسمت کہ کچھ سوچ کے بولا ظالم | جنس ناقص ہے ہٹا میں نہیں لینے والا

(۴۳)

اے خدا نام سنا ہے ترا ستار و غفور | تجھ سے اک بات بصد خوف و رجا کہتے ہیں
دے کے ترغیب ہمیں زہد و ورع کی زاہد | حور مل جائے گی کل اس کی جزا کہتے ہیں
تیری صناعی کی کیا بات ہے سبحان اللہ! | حور کے وصف جو کرتے ہیں بجا کہتے ہیں
پر یہ دریافت ہے کیا ان میں ہیں یہ بھی حرکات | جن کو ہم غمزہ و انداز و ادا کہتے ہیں
یا نرے پتلے ہیں کافور کے بھولے بھالے | رات دن صل علیٰ صل علیٰ کہتے ہیں

(۴۴)

کل وہ کچھ لوگوں کو لے کر اپنے ساتھ | تربتیں دو چار دکھلاتے رہے
بولے اس میں قیس اس میں کوہکن | عاشقان ناز تھے جاتے رہے
بعد ہماری قبر پر آکر وہ پھر | دیر تک افسوس فرماتے رہے
پوچھا لوگوں نے کہ اس میں کون ہے | آپ جو رہ رہ کے پچھتاتے رہے
بولے ہے ہے یہ سنحیؔ کا ہے مزار | جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے

کل گذر کوچۂ محبوب میں میرا جو ہوا | دی مجھے اس نے صدا کون ہے جانے والا
شامت آئی جو کہیں مڑ کے پلٹ کر دیکھا | نگہ ناز نے بے خود مجھے کر ہی ڈالا
آہ کے ساتھ ہی دل تھام کے میں بیٹھ گیا | خود بخود آ ہی گیا میرے لبوں پر نالا
بولا پھر پاس میرے آکے یہ دلسوزی سے | ایسا حال آپ کا ہے جیسے کوئی متوالا
خیر ہے آپ نے کھوئی تو نہیں کوئی چیز | جستجو کیجئے یاں کون ہے لینے والا

عرض کی دل میرا پہلو سے گیا ہے اس وقت
مدتوں جس کو کہ تھا نازوں سے میں نے پالا

دہونڈئیے دیکھئے گر آپ نے پایا ہے کہیں
کیجئے واپس اسے مجھکو جناب والا

سن لیا اور بگڑ کر یہ دیا اُس نے جواب
چل نکل سامنے سے دور ہو منھ کر کالا

واہ - وا خوب ملا یہ صلۂ ہمدردی
دل گیا آپ کا بدنام مجھے کر ڈالا

تو یہ سمجھا تھا کہ چکھا تیرا چل جائیگا
تیری باتوں میں نہیں میں کبھی آنیوالا۔

دوشیزہ صحرائی

شال دوشالہ کی ہاں تجھ کو ہوس کب ہوتی
دوش پہ تیرے حسین رہتی ہے اک اوڑھنی

دشت کی سلطانہ ہے کھیت کی ہے تو پری
شام کے منظر میں یوں جیسے کوئی تیتری

قدرتی چشموں میں عکس دیکھ کے کہنا تیرا
جلوہ فگن آب میں کون ہے ہمتا مرا

لوٹنا گھر کی طرف شام کو ریوڑ سے لئے
آپ ہی ہنستے ہوئے آپ ہی گاتے ہوئے

دامن کہسار میں چھوٹی سی اک جھونپڑی
دور سے تجھ کو پیام عیش کا ہے دے رہی

قصر شہی میں کہاں اس کی سی آسائشیں
گو ہیں مقرر وہاں سینکڑوں آرائشیں

دامن وادی میں وہ بہتی ہوئی آبشار
تیرے کرشموں کی سب دیکھی ہے اس نے بہار

زندگی ایسی تو ہو جس میں ملیں کچھ مزے
فائدہ پھر اس سے کیا کھاٹ پہ پڑے سو رہے

شہر کے غل شور سے جی میرا گھبرا گیا
قلب سکون پائیگا مجھکو جگہ دے ذرا

فکر نہ ہو کچھ کبھی پاس نہ آئے الم!
نعمت پروردگار تیرے لئے ہے بہم

عزت و دولت کی بھی تجھ کو نہیں کچھ ہوس
تو ہے تیرا کھیت ہے اور ہے اللہ بس

کودتی پھرتی ہے تو چھیل چھبیلا بنی
ہم کو میسر کہاں لطف سرور و خوشی

[illegible]
[illegible] ہم تو حجاب تیری ہے ساری زمین

قوت متخیلہ

جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی۔اے۔ایل۔ایل بی (علیگ)

جب ہم نئے مکان میں آکر رہے تو گھر والی نے ایک نئی حرکت شروع کی۔ دیوار سے اُچک اچک کر اور لٹک لٹک کر پڑوس کے مکان میں تاک جھانک شروع کی اس کے بعد اشارہ بازیاں ہوئیں جب دو دل ملنے پر تیار ہوں تو دیواریں حائل نہیں ہوسکتیں نتیجہ یہ کہ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بھولی بھالی نوعمر سیٹھانی سونے میں غرق ایک سایہ کی طرح خاموشی سے چلی آرہی ہیں خانم نے اپنی پڑوسن کی خاطر اپنی آنکھیں بچھادیں۔ کرسیاں زور زور سے گھسیٹیں قالینوں پر دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیمن اور سوڈے کی بوتلیں گھمائیں کیلوں اور دوسرے پھلوں سے دھمکی دی۔ میں نے بھی پکار کر کہا کہ سیٹھانی جی خبردار جو تکلف کرنے پائیں انہوں نے بے تکلفی کا پختہ وعدہ کرتے ہوئے الائچی اور چکنی کو ملاحظہ کیا پھر اس کے بعد اتنی زیادہ دیر قدم رنجہ فرمائے رہیں کہ مجھے گھر والی کو بلاکر اس کے کان میں کہنا پڑا کہ یہ ہماری بھولی بھالی پڑوسن افسوس کہ اب ہمارے یہاں پھر کبھی نہ آئیں گی۔ افسوس صد افسوس کہ دوبارہ ہمارے یہاں پھر کبھی آئیں گی ہی نہیں۔ وہ ہمارے یہاں پھر کبھی قدم (بغیر جوتہ کا) رنجہ فرمائیں گی ہی نہیں گو اونہوں قطعی یقین دلایا کہ یہ ناممکن ہے اور دیوار بیچ کا معاملہ ہے وہ روز آسکتی ہیں اور اب کہ یہ سلسلہ شروع ہوا ہے آنا جانا روز ہی کا سمجھئے مگر خود خیال فرمائیے کہ میں کیسے یقین کرلیتا اور کہدیتا ان سے۔ اور خود اپنی پیاری رفیقۂ حیات سے' کہ اے جان من۔ و دلارام من' یہ تیری بھولی بھالی سہیلی یعنی سیٹھانی یہاں سے جائیگی ہی نہیں تو بھلا پھر آئندہ کبھی آئیگی کہاں سے!

گھروالی کی سہیلیوں کے شوہروں سے حسب فرمائش ملنا کم از کم اس خاکسار کیلئے تمام وہی خوشگواریاں اپنی جلو میں لاتا ہے جو بخطا پولس میں پکڑے جانے اور زیر حراست و زیر چالان رہنے میں مہیا ہوسکتی ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کیا جاوے پولس میں بھی آخر پکڑے ہی جاتے ہیں

"بندگی بیچارگی" ہی سہی ورنہ بقول سعدیؒ "در گلویم "سمجھئے ورنہ بقول ایں ہم اندر" تو ہے ہی! کچھ بھی ہو میری محدود معلومات میری پیاری خانم نے یہ اضافہ فرمایا کہ ہمارے پیارے پڑوسی خوبیوں کا ایک ایسا عجیب غریب اور دلکش مجموعہ ہیں کہ ان سے بغیر ملے میں بدمعاش ہی تو رہ جاؤں گا منجملہ اور خوبیوں کے ایک خوبی ان میں یہ بھی ظاہر کیگئی کہ بیمار ہیں۔ گو یا یہ کہ کم از کم میری یہاں آئینگے تو نہیں اور اصل پوچھئے تو ان سے تعارف حاصل کرنے میں شاید ایسی بات ایک درخشاں مستقبل نظر آیا۔

مجھ سے وہ کیسے ملے؟ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اٹھنے اور دوڑ جھپٹ سے وہ قاصر تھے ورنہ شاید مجھ سے کشتی لڑتے۔ آخر کو پتہ چل ہی گیا کہ اخلاق کیا چیز ہے۔ ہمانوں کو خوشامد یا اس طرح کہی جاسکتی ہے! بیماری کا ذکر آیا تو میں نے سخت تشویش ظاہر کی رنجیدہ صورتیں پیش کرنے کی کوششوں میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے اپنی بیماری اور اطبا کی لاچاری کا ذکر کیا اور ایک طول وطویل تقریر کے بعد آپ یقین مانئے گا کہ مجھ سے اپنے انتقال فرما جانے کا نہ صرف صدق دل سے بلکہ پختہ اور حتمی وعدہ کیا اور چونکہ ایسے موقع پر عموماً سچ اور دیانت دار آدمیوں کو جھوٹا۔ مکار۔ فریبی۔ دھوکہ باز۔ وعدہ خلاف وغیرہ وغیرہ کہنا سب جائز ہے بلکہ عین اخلاق ومحبت ہے لہذا یہی میں نے کیا۔ یعنی ان کے روبرو ان کے منھ پر کہدیا کہ تم جھوٹے ہو اور ہرگز نہیں مروگے لیکن میں نے غور سے دیکھا کہ واقعی ان کو اپنی جوان مرگی کا احساس تھا رنج تھا۔ صدمہ تھا۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ اپنی بھولی بھالی نو عمر سیٹھانی کو بیوگی کے صدمات سے دوچار ہونیکو تنہا چھوڑ جائیں مجھے خود ان پر اور ان کی مغموم رفیقہ حیات سیٹھانی جی پر رحم آیا اور ڈاکٹروں اور طبیبوں پر غصہ۔ اس سے زیادہ میں کرہی کیا سکتا تھا۔

(۲)

بہت جلد گھر والی اور سیٹھانی میں ایسی گہری دوستی ہوگئی کہ نہ صرف نسخوں بلکہ نسخے لکھنے والے حکیموں اور ویدوں کے آبا واجداد تک سے ہمیں واقف ہونا پڑا۔ کیونکہ پڑوسی کے حقوق میں یہ بات بھی شامل ہے اور خدا کے فضل اور اس ارشاد عالی کی یہی تفسیر ہے جو مسیح الدہر کہہ گیا ہے آپ کہیں گے کہ یہ مسیح الدہر کون؟ عرض ہے جناب کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم

گو تو آپ جانتے ہونگے جن کے خاندانی اور صدری نسخے اب بلپنٹیوں مسیح الملکوں کے قبضہ میں آگئے ہیں حتیٰ کہ جس طرح کسی زمانہ میں سڑکوں کو غسلخانوں کی ضرورت نے مجبور کر دیا اور کانپور کی ایک سڑک کو مسجد کے غسلخانہ کی ایسی ضرورت ہوئی کہ خون کروا لے سڑک نے۔ پر غسلخانہ نہ چھوڑا۔ اور چیخ اٹھے علامہ شبلی نعمانی۔ "عجب کیا ہے جو ہر ایک شاہراہ سے یہ صدا آئے" مجھے بھی کم سے کم ایک غسلخانہ کی ضرورت ہے تو عرض ہے کہ اسی طرح اب مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے بعد درجنوں مسیح الملکیوں کی ضرورت پڑ گئی ہے اور دہلی میں ان کی تخلیق گو مشرقی فن دوا سازی کے اصول کے ماتحت ہو رہی ہے لیکن جدید سائنٹفک اصول کو بھی مدنظر رکھا جا رہا ہے ان مسیح الملکیوں کی وہ مانگ ہے کہ خدا کی پناہ۔ ہر عطار یہی چلا رہا ہے کہ مجھے بھی ایک مسیح الملک چاہئیے۔ ہر دواخانہ (الا ماشاء اللہ) یہی کہہ رہا ہے کہ مجھے بھی ایک مسیح الملک چاہئیے۔ تو یہ تو ہوئے مسیح الملک لوگ مسیح الدہر وہ جس پر انجیل مقدس نازل ہوئی اور جس نے کہا "پڑوسی سے محبت کرو" واضح رہے کہ خود پڑوسن کا یہاں ذکر نہیں۔ مگر لوگ ایک کائیاں اور لگے ہاتھوں مفسّرین نے "سی" اور "سن" کی بحث شروع کرکے ایک اور فتنہ کا باب کھول دیا۔ قصہ مختصر ہمیں کچھ اسی طرح حقوق ہمسایہ ادا کرنے پڑ رہے تھے ہم دونوں میاں بیوی کیا کرتے۔ سوائے اس کے کہ اپنے پیارے پڑوسی کو مختلف طریقوں سے مرنے سے منع کرتے رہیں۔

(۳)

لیکن رفتہ رفتہ سیٹھانی کا چہرہ عجیب وغریب طرح منقلب ومتغیر ہوتا گیا وہ آہستہ سے ہمارے گھر میں آ بیٹھیں ایک آہ دل دوز کی طرح ان کی سرمگیں آنکھوں میں جوانی ایک چراغ سحری کی طرح ٹمٹماتی معلوم ہوتی چہرہ کے آئینہ میں بجائے جوانی کی تڑپ کے ایک خاموش دھندلکا سا نظر پڑنے لگا۔ نوجوانی اور دلربائی کے بجائے چہرہ پر ملکوتی سنجیدگی کا اثر نمایاں تھا باوجود نوجوانی اور حسن کے دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ مردے کی بیوی ہے! خدا کی پناہ! ایک نوجوان عورت کا حسن بیوگی سے کچھ پہلے انگارے کی طرح تیز ہو کر کیا خوفناک ہی ہو جاتا ہے۔

بہت جلد سیٹھ جی کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ طبیب یہ بتا دے کہ ہم کب مریں گے اور آیا مرینگے

بھی یا نہیں آج کل کے طبائع "نوٹس" اور "اطلاع" کے بہت قائل ہیں ہمیں معلوم ہوجائے کہ کیا ہونیوالا ہے تاکہ ہم ویسا ہی انتظام کریں چنانچہ سیٹھ جی کو فکر ہوئی کہ اگر پہلے سے یہ معلوم ہوجائے کہ اب بغیر مرے چارہ کار نہیں تو اپنی جائداد کے ساتھ وہ حرکتیں شروع کردیں جو وصیت سے متعلق ہیں اور جو اس نیت سے کی جاتی ہیں کہ بعد مرنے کے جھگڑے نہ کھڑے ہوں لیکن دراصل وہی تمام خاندانی جھگڑوں اور وکیلوں کی روزی کا باعث ہوتی ہیں چنانچہ بڑی تیزی سے دو تین حکیم بدلے گئے۔ مگر کسی حکیم نے نہ کہا کہ تم مرجاؤ گے۔ ہوں ہاں کرکے چپ ہوگئے جس کا گو مطلب یہی تھا مگر سیٹھ جی تو صاف جواب مانگتے تھے مجبوراً ایک ڈاکٹر نے فرمایش پوری کی اور صاف صاف کہدیا کہ مرجاؤ گے مگر دشواری یہ آن پڑی کہ خود سیٹھ جی نے ڈاکٹر کو احمق خیال کیا بالآخر ایک حکیم صاحب جیپور کی طرف سے آئے۔ بڑے تجربہ کار۔ ہوشیار۔ ان کا سکہ سیٹھ جی پر اس طرح بیٹھا کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ گویا نعوذ باللہ۔ اللہ میاں کے اسسٹنٹ اور ملک الموت کے والد بزرگوار ہی تو ہیں۔ میں نے تنہائی میں ان سے پوچھا تو بولے "مریض ہمت ہار چکا ہے۔ مرض کا حکیم علاج کرسکتا ہے مگر مریض کا علاج بہت مشکل ہوتا ہے اگر یہی حالت رہی تو کوئی علاج کارگر نہ ہوگا"۔ ان حکیم صاحب نے پندرہ روز علاج کیلئے مانگے تھے کہ اس کے بعد بالو جواب دیدینگے کہ مجھ سے علاج نہیں ہوسکتا اور موت کی تیاری کیجئے ورنہ پھر اچھا کردیں گے۔

میں نے ایک دن حکیم صاحب سے پوچھا کہ آپ مریض کو دھوکے میں کیوں رکھتے ہیں آخر کہہ کیوں نہیں دیتے۔ کہ خاتمہ سامنے ہے تو بولے کہ "برادرم۔ جب مریض اپنے معالج پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ رکھے اور معالج کا بیحد قائل ہو تو طبیب کو یہ چاہئے کہ سوچ سمجھ کر زبان کھولے میں حقیقت حال کہدوں اور وہ نہ مرتا ہو تو مرجائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ کہو تو اور نہ کہو تو مریض ایسے بھی مریگا۔ اور ویسے بھی۔ تو جب وہ درجہ آجائے تب حکیم کو موت کا فتویٰ دینا چاہئے جب سمجھ لے کہ اب اصلیت چھپانے سے کوئی نتیجہ نہیں ہے لہذا جب تک میں دیکھوں گا کہ امید ہے میں تو یہی یقین دلائے جاؤں گا کہ تم اچھے ہوجاؤ گے لیکن چونکہ مجھے بلایا ہی اسی لئے گیا ہے کہ سچ سچ بتادوں لہذا میں بہت جلد اپنی رائے کا اظہار کردوں گا۔ ابھی مریض کی حالت زیادہ خراب نہیں ہے۔

(۴)

یہ حکیم صاحب بھی عجیب شخص تھے دس دس دن کی مہلت لیتے لیتے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نکل گیا لیکن فیصلہ ندارد۔ وہ مضمون ہوا کہ سنی سے سوم بھلا۔ اس سے تو ڈاکٹر ہی اچھا تھا جو فیس کے روپے نقد گن کر تڑسے جواب دیکر چلا گیا اور سیٹھانی کو سنی کی کو سنی رہ گئیں (ڈاکٹر کے جھوٹ پر نہیں) غرض صورت معاملات یہ تھی کہ سیٹھ جی کی حالت متغیر تھی۔ سیٹھانی جی دن میں تین دفعہ منٹ منٹ بھر کے لئے آتیں۔ مگر آتی ضرور تھیں، پرنم آنکھوں سے خانم سے پوچھتی تھیں وہ بات جو حکیم صاحب بتا سکتے تھے یعنی یہ کہ کیا ہوگا۔ سیٹھ جی اچھے ہونگے یا نہیں۔ حکیم کیا جواب دیگا؟ خانم روز یہی کہدیتی تھی کہ حکیم یہ جواب دیگا کہ سیٹھ جی اچھے ہو جائینگے غرض معاملات اسی صورت پر تھے کہ ایک عجیب ہی معاملہ پیش آیا۔

ہمارے گھر میں ایک روز بلی گھیری گئی تھی۔ جب ایسا غدر مچا تھا بو کھلا کر جو میں چیخ کر لپکا ہوں تو سیٹھانی جی سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ سیٹھانی جی کا خوبصورت چہرہ مارے خوشی کے چاندنی چوک ہو رہا تھا۔ کچھ ایک دم سے اپنے باؤلے پن پر جھیپ سی گئیں اور فوراً پوچھا "بائی جی کہاں گئیں" درحالیکہ وہ اس خبر فرحت اثر کو لیکر میرے پاس دوڑی تھی۔ کہ سیٹھ جی اچھے ہو گئے قبل اس کے کہ میں جواب دوں کہ کہاں گئی ہے پیچھے سے خانم بھی پہنچی "سیٹھ جی اچھے ہو گئے"؟ مارے خوشی کے کانپتے ہوئے لہجہ میں خانم نے کہا۔

اب میں سیٹھانی کو دیکھتا ہوں۔ پھر خانم کو اور پھر سیٹھانی کو۔ یہ تحقیق کرنے کے لئے کہ ان دونوں میں کون زیادہ احمق ہے آپ خود غور فرمائیں کہ کہاں تو سیٹھ جی مرے جا رہے تھے اور کہاں اب یہ اطلاع! چنانچہ یہ سوچ کر ضرور ان دونوں کی عقل خراب ہو گئی ہے میں نے تفصیل پوچھی تو معلوم ہوا کہ ان دونوں کا تو ذکر ہی کیا آگے جا کر عورت پھر عورت ہے معاملہ دراصل کچھ اور ہے وہ یہ کہ خیر سے خود حکیم صاحب کے "دماغ اعظم" کا کوئی پرزہ "بارہ بجانے" پر مصر ہے یعنی یہ کہ سیٹھ جی کے نام خط آگیا ہے کہ تم بالکل اچھے ہو گئے۔ کل سے دوا بھی ترک کر دو۔ اور ہوا کھانے کے لئے بستر علالت چھوڑ کر چہلقدمی کرو۔

ورنہ برآمدہ میں آرام کرسی پر بیٹھو۔ اور دل خوش کرو۔ خط چونکہ اُردو میں ہے اور پڑوس کے دکاندار سے ٹھیک پڑھا نہیں گیا ہے لہذا سیٹھ جی مجھے پڑھوانے کے لئے بلوا رہے ہیں اور سیٹھانی مارے خوشی کے خود آئی ہیں۔

(۵)

میں جو سیٹھ جی کے پاس پہنچا تو عجیب ہی معاملہ! گویا کہ ؎

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ سیٹھ جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔

سیٹھ جی کے مرنے کے وعدوں کے بارہ میں یہ شعر ورد زبان کرنا پڑا۔

مجھے دیکھتے ہی مارے خوشی کے دہیں سے دانت نکال کر چیخے۔ برآمدہ میں آرام کرسی پر بڈبول کی مالا رکھی تھی۔ اور ایک نوکر تولیہ سے چنور کر رہا تھا ہاتھ میں وہی خط تھا ہنس کیا رہے تھے کہ رونے کا منھ چڑا رہے تھے بس یہ معلوم ہوا کہ گھڑی کا ڈبل تیڑھا ہو گیا ہے اور سوئیاں کہیں کی کہیں جارہی ہیں۔

سب سے پہلے سیٹھ جی نے اپنے اچھے ہونے پر اس خاکی تپلے کو مبارک دی۔ اور اپنے "زار و قطار" چہرہ کو ایک قہقہہ کا شرمندہ احسان کر کے متزلزل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے حکیم صاحب کا خط میرے ہاتھ میں دیا خط حسب ذیل تھا۔

مکرمی۔ سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کو صحت دی۔ اس سے پیشتر مجھے ڈر تھا کہ اگر کہدوں گا کہ آپ اچھے ہیں تو بد پرہیزی کریں گے اور آپ تھے کہ روز آنہ جان کھائے جاتے تھے کہ میں کوئی قطعاً جواب دوں جس سے میں مصلحتاً گریز کر رہا تھا۔ آخری مرتبہ جو میں نے آپ سے پندرہ دن کی مہلت مانگی تھی جب ہی آپ خطرہ سے باہر ہو گئے تھے۔ مگر میں نے مصلحتاً آپ سے نہ کہا اب آپ دوا بند کریں آج شام کو اگر ممکن ہو برآمدہ میں چہل قدمی کے طور پر دو چار قدم احتیاط سے چل کر دیکھیں ورنہ سہارا لیکر

آرام کرسی پر تفریح کریں - اگلے جمعہ کو غسل صحت فرما لیجئے - پرہیز جاری رکھئے گا ضرورت ہو مجھے طلب فرمالیں ورنہ چنداں ضرورت نہیں فقط

میں نے اس خط کو غور سے پڑھا - اور پھر سیٹھ جی کی طرف دیکھا - مسرت اور شادمانی ان کے چہرہ مبارک پر خندقیں پھاندنے اور زقن لگانے کی مشق بہم پہنچا رہی تھی معًا مجھے خیال گزرا کہ کہیں خود حکیم جی ہی بقول کسے ؏ مسیحا خود گرفتار بلا ہیں . . . . . کسی دماغی اسپتال کے ڈاکٹروں کے علاج کی فکر میں تو نہیں پڑ گئے جو ذہن رسا اس طرح طبی پولو میں مشغول ہو گیا -

پھر خود سیٹھ جی کا یہ حال کہ اس مسئلہ پر بھلا کیوں غور کرنے دیتے سارے گھر میں تو گویا توپیں دغ رہی تہیں نوکر چاکر ملازم رشتہ دار گویا معلوم ہو کہ کانگریس کے والنٹیرز ان میں نام لکھا کر کسی جلسہ کے سلسلہ میں بدنظمی کا انتظام کر رہے ہیں سارے گھر میں چہل پہل اور زندگی کے آثار پھیلے ہوئے تھے ہر شخص کو عام اجازت معلوم ہوتی تھی کہ خوب زور سے چلائے ایک عدد گائے پن کی جا چکی تھی - دوا پھینک دی گئی تھی - کپڑے بدل کر اپنا آئندہ کا پروگرام مرتب فرما رہے تھے - کہ دس دن بمبیء کرنا ہے - فلاں ادھورا کام دیکھنا ہے - وغیرہ وغیرہ - پھر اپنی بزدلی کا احساس بھی تھا - طرح طرح سے اور بار بار اس امر پر زور دیتے تھے کہ وہ پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ اچھے ہو گئے ہیں اچھے ہونے کے تمام آثار جن کا احساس دو کتنی روز پہلے کر چکے ان کی تفصیل سننے کے قابل تھی - اور پھر لطف یہ کہ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کو اس امر کا پیشتر سے علم تھا حکیم صاحب ان کی تندرستی کے اہم معاملہ کو ان سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں ان تمام باتوں کے ساتھ حکیم صاحب کی قابلیت کا اعتراف جن طریقوں سے بھی ممکن تھا کیا جا چکا تھا اور کیا جا رہا تھا -

اب ایسے موقع پر اس خاکسار کو بھی اپنے پیارے پڑوسی کی ناقابل یقین صحت یابی پر خوش ہونا پڑا - اول تو میرا اس میں نقصان ہی کیا تھا اور پھر پڑوسی کی خوشی میں کیسے شریک نہ ہوں - ہمیں اس سے کیا بحث کہ انہیں مرنا چاہئے یا جینا یا یہ کہ وہ اچھے ہونیکے مستحق نہیں تھے ہمیں تو خوش ہونے سے مطلب چنانچہ باوجود اس بات کے کہ کچھ یقین نہ آیا کہ معاملہ اصل کیا ہے میں نے بھی

نہایت ہی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ مبارک باد دینا اور خوشی میں شریک ہونا شروع کر دیا۔

حکیم صاحب کی خدمت میں اسی روز سیٹھ جی نے نقدی اور کپڑے ارسال فرمائے اور ان کو بڑے تپاک اور محبت سے بلوایا بھی گیا میں گھر واپس آیا۔ گھر والی سیٹھانی کیساتھ اس خوشی کی ہڑ بونگ میں اضافہ کرنے کے لئے بہ نفس نفیس گئی ہوئی تھی۔

اسی روز کا ذکر ہے شام کو میں ٹہلنے کی نیّت سے جو گھر سے نکلا تو تھوڑی دور جاکر پیچھے سے آکر برابر ہی ایک تانگہ رکا اس میں حکیم صاحب "درج" تھے جنھوں نے بیک وقت ایک ہی جملہ میں تمام سوال وجواب بند کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ میں اُن سے اور وہ مجھ سے سوال وجواب کے متمنی تھے اس کا حل اس طرح طے پایا کہ میں بھی ان کے ساتھ تانگہ میں بیٹھ جاؤں۔

اب اصل حقیقت معلوم ہوئی حکیم صاحب نے دو خط لکھے تھے ایک کوئی قاضی صاحب تھے ان کو اور ایک ہمارے سیٹھ جی کو۔ دونوں خط علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے بعد میں نے اس کا پتہ اس پر غلطی سے لکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ قاضی صاحب کے حصہ کا خط سیٹھ جی نے پاکر مرنے سے باز رہنا اور اچھا ہونا شروع کر دیا۔ اب سیٹھ جی کے حصہ کا خط جو قاضی صاحب کو ملا تھا۔ اس کے بارہ میں حکیم صاحب کو معلوم کرنا تھا کہ وہاں کیسی گذری سیٹھ جی کے یہاں سے حکیم صاحب کے پاس تحفہ تحائف اور اچھا کر دینے کا شکریہ پہنچکر ان کے حواس زائل کرنے کا موجب تو ہو چکا تھا لیکن قاضی صاحب کے یہاں سے کوئی خبر خیر نہ آئی تھی لہذا حکیم صاحب جلد سے جلد اپنی حماقت کے نتائج سے باضابطہ مطلع ہونا چاہتے تھے کیونکہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے جو خط سیٹھ جی کو لکھا گیا تھا مگر حصہ میں قاضی صاحب کے آیا تھا وہ حسب ذیل تھا جو میں نے بعد میں دیکھا تھا۔

جناب من تسلیم۔ مجھے سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں جناب کا علاج کرنے سے قاصر ہوں مرض اپنا کام کر چکا ہے اور خود آپ کو معلوم ہی ہے کہ آپ کی حالت قابل اطمینان نہیں لہذا بہتر ہے جناب اپنی جائداد وغیرہ کے بارہ میں ضروری انتظام کرلیں۔ فقط

جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو قاضی صاحب سخت "پسپائیت" کے عالم میں تھے معلوم ہوا کہ خط پہنچتے ہی قاضی صاحب نے اپنی زوجہ محترمہ کو تنہائی میں بلایا۔ اپنے مرجانے کے پاک ارادہ سے ان کو مطلع کیا۔

اور بغیر خط وغیرہ کا حوالہ دئے ہوئے اپنے مرنے کی دردناک تمہید اٹھا کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ کہا سنا معاف کرانیکا سلسلہ شروع کیا بیوی بچاری خود بے قابو ہو گئی بیمار تو میاں تھے ہی لہٰذا وجہ دریافت کرنا بیکار۔ چنانچہ لگی غریب اپنی ہمت کو توڑ کر شوہر کی ہمت کو جوڑنے۔ روئی خوب امید دلانیکی نیت سے۔ مگر توبہ کیجئے۔ وہاں تو وہ حال کہ۔ ع۔ اپنے بچنے کی نہ ہو جس کو امید۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے۔ جذبات ہمیشہ واقعات پر غالب آتے ہیں۔ قاضی صاحب نے آبدیدہ ہو کر حکیم صاحب کے خط کا آخر کو ذکر کرکے دکھا ہی دیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے ایک دل سوختہ بیوی جب ایسا خط دیکھے تو نہ معلوم اسے کیا نہ کچھ دکھائی دے۔ نتیجہ یہ کہ خط ہاتھ میں دیکھتے ہی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ تیورا کر غش کھا کر گری۔ پھر کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے ایک نہایت ہی دل دوز ٹریجیڈی کا آغاز ہو گیا۔ عزیز و اقارب دوڑ پڑے۔ قاضی جی کو مرنے سے باز رکھنے کے لئے اور ادھر قاضی صاحب نے خطائیں بخشوانا اور وصیتیں کرنا شروع کر دیں غرض خوب اودھم مچا دوڑنیوالوں نے غل مچانا اور غل مچانے والوں نے دوڑنا شروع کیا۔ یہ شور قیامت شباب پر پہنچ کر کچھ تھوڑا بہت ہی کم ہوا تھا جو ہم پہنچے اور یہ رنگ دیکھ کر جو حکیم صاحب نے پٹہ بازی شروع کی ہے تو مزہ آ گیا۔ سب ہی کچھ کیا حکیم جی کو دنے بھی۔ پھاندے بھی۔ خفا بھی ہوئے گرم بھی ہوئے اور پھر پیٹ بھر کے غل بھی مچایا۔ اپنی حماقت کے خیال کو چھوڑ کر دوسروں کو احمق بنانے لگے اور فیصلہ میرے ہاتھ۔ حکیم صاحب کا کہنا بھی صحیح تھا۔ انہوں نے جو حماقت کی تھی اس کا تو ذکر نہ ہونا چاہئے مگر پتھر پڑیں قاضی جی کی لامحدود عقل پر کہ خط پڑھا تو یہ بھی نہ دیکھا کہ جائداد کا انتظام کرنے کو حکیم صاحب انہیں کیوں لکھتے۔ کیا کبھی انہوں نے اپنی جائداد کے بارہ میں تشویش کا اظہار کرکے حکیم صاحب سے موت یا زیست کا فتویٰ مانگا؟ ہرگز نہیں! تو پھر بندہ خدا نے اتنا نہ سوچا کہ حکیم صاحب کو کیا غرض پڑی تھی جو اپنے دل سے جائداد کے انتظام کے بارہ میں مشورہ دیتے۔ پھر قاضی صاحب کو یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ خط کا جواب تو حکیم صاحب دیتے ہیں مگر خط پہنچنے کی رسید نہیں دیتے اور پھر علاوہ ان باتوں کے قاضی صاحب کو یہ کیا سوجھی جو انہوں نے یقین کر لیا کہ مرض لاعلاج ہے کیا اپنی حالت کا انہیں خود بھی کچھ اندازہ نہیں پھر لطف یہ کہ دوسرے لوگوں کی عقل بھی چیل لے گئی۔ جو بغیر سوچے سمجھے انہوں نے

بھی آنکھ میچ کے قاضی صاحب کے کہنے کا یقین کر لیا اور خود کچھ بھی نہ سوچا غرض یہ دلائل تھے جن کو ایک ایک کر کے حکیم صاحب نے زور کیساتھ پیش کیا۔ خوب برہم ہوئے اچھی طرح سمجھایا کہ کس طرح خط بدل گیا بڑی مشکل سے قاضی صاحب کی جان میں جان آئی۔ بال بال بچے۔ مگر صدمہ اور اضطراب نے ان کی ایسی نبضیں ڈھیلی کر دی تھیں کہ حکیم صاحب نے کہا کہ صحت کا پروگرام اب ہفتہ پیچھے رہ گیا ہے۔ دوا بند ہونے کے بجائے ہفتہ بھر تک تقویات کی ضرورت پڑ گئی قاضی صاحب کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو اس عجیب وغریب تماشہ کو ختم کر کے ہم دونوں واپس ہوئے۔ اب میں نے حکیم صاحب سے سیٹھ صاحب کے بارہ میں پوچھا کہ اپنی غلطی کی تلافی کب کیجئے گا اور سیٹھ صاحب کو ان کا اصل خط کب پہنچائیگا اس کے جواب میں حکیم صاحب نے مجھے غور سے دیکھا گویا یہ معلوم کرنیکو میں ان سے زیادہ احمق ہوں یا کم۔ میں نے پھر جو تقاضا کیا تو کہنے لگے۔ "آپ بھی عجب آدمی ہیں" جب میں نے کہا کہ "پھر کیا ہوگا؟" "کیا سیٹھ جی کو دھوکہ میں رکھیئے گا" تو اس کے جواب میں اونہوں نے کہا کہ سوائے اس کے اب کوئی چارہ ہی نہیں کہ سیٹھ صاحب کا نہایت ہی تن دہی سے علاج کیا جائے درحالیکہ علاج کر کے انہیں اچھا کر دینے کی فیس معہ نذرانہ حکیم صاحب وصول ہی کر چکے تھے۔

حکیم صاحب سیٹھ جی کے پاس پہنچے تو ذرا غور تو فرمائیے کہ لگے الٹی مبارکبادی دینے اور تمام ان وجوہات پر روشنی ڈالنے جن کی بناء پر سیٹھ صاحب کی صحت کی ترقیوں کو ان سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے نبض بھی دیکھی جو غیر معمولی فرحت اور انبساط کے باعث سچ مچ ناچ رہی ہوگی سیٹھ جی ایک روز دعوت جشن کے انعقاد کے ہوشربا امکان پر غور فرما رہے تھے جس کو غسل صحت سے متعلق ومنسوب فرما کر سچ مچ اچھے ہو جانیکا ہر کس وناکس سے اقرار کرا لیا جاوے!

حکیم صاحب نے سوچ ہی لیا تھا کہ سیٹھ جی کی طبیعت کی خوشی کو ترقی کرنے دیا جاوے بوجہ غیر معمولی حرکتوں کے سیٹھ جی پر تکان کا بھی غلبہ تھا لیکن مسرت نے اس کو دبا دیا تھا حکیم صاحب کے کندھے پر سیٹھ جی نے ایک قیمتی دوشالہ اوڑھوایا۔ اور یہ مال غنیمت لیکر حکیم صاحب میرے یہاں آئے اس نیت سے کہ مجھ سے موٹی موٹی قسمیں لیں کہ میں سیٹھ جی کو مغالطہ سے باہر کرنے کی کوشش

نہ کروں گا۔ میں چونکہ ویسے بھی سیٹھ صاحب کے مرنے کے خلاف تھا لہذا صدق دل سے راضی ہوگیا حکیم صاحب کہنے لگے کہ سیٹھ جی کو دوا کی بڑی سخت ضرورت ہے لیکن کیا کیا جاوے مصلحتاً دو روز کی ناغہ کرکے کسی دوسرے بہانہ سے پھر شروع کرا دی جائے۔

(۷)

خدا کی شان ہے کہ سیٹھ جی کی قوت ارادی نے وہ زبردست کروٹ لی کہ ہر دوا کے تیر بہدف ہو کر لگنے لگی ہفتہ ہی بھر میں بجائے مردنی کے چہرہ پر رنگ آگیا مرض کو مریض کی طبیعت نے دبانا شروع کر دیا۔ اور دس پندرہ ہی روز میں سیٹھانی جی کا چہرہ جس پر غم کی بدلیاں چھائی رہتی تھیں اندر کا اکھاڑہ بن کر مزین ہوگیا اور دو مہینے کے مسلسل علاج کے بعد جاکر کہیں سیٹھ جی کی وہ حالت ہوسکی جس کو محض اپنی حماقت اور حکیم صاحب کی غلطی اور مجبوری سے وہ پیشتر ہی سمجھے ہوئے تھے اگر قاضی صاحب نے حکیم صاحب کے چند امور کی طرف توجہ نہیں کی تھی تو ہمارے سیٹھ صاحب کو کیا ضرورت تھی جو وہ اس بات کی طرف توجہ کرتے کہ خط میں حکیم صاحب لکھتے ہیں اول تو اسلامی سلام "سلام مسنون" اور پھر یہ کہ آپ کا خط ملا۔ درحالیکہ سیٹھ جی نے کوئی خط ہی نہ لکھا تھا جس کے جواب کی رسید خط میں موجود تھی۔ دراصل سیٹھ جی کو اپنی جائداد کی بڑی فکر تھی اور ایک دفعہ نہیں دس دفعہ حکیم صاحب سے تقاضا کر چکے تھے کہ میرا مرض لاعلاج ہو جائے تو مجھے معلوم ہو جانا چاہیے تاکہ جائداد کا انتظام کر سکوں۔ کچھ بھی ہو نتیجہ اس کا اچھا نکلا۔ ایک حکیم صاحب کے علاج سے اچھے ہوئے دوسرے محض اپنی حماقت کے زور سے اچھے ہوگئے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسے قصے تو آئے دن ہی ہوتے رہتے ہیں مگر غضب ہے خدا کا کہ پھر بعض ڈاکٹر صاحبان مریض کے منہ پر اس کے خون یا بلغم کا معائنہ کرکے کہہ دیتے ہیں کہ J.B. present in large Numbers (یعنی تپ دق کے مہلک جراثیم کثرت سے ہیں) مریض سنتا ہے اور گولی کھا کر رہ جاتا ہے۔ نتیجہ معلوم ۔ (ھ)

برائے کرم وی پی واپس کرکے نقصان نہ پہنچائیے خریداری منظور نہ ہو تو ذریعہ کارڈ مطلع کیجیے!

ضمیر کی کشمکش

جناب مس فاطمہ بیگم (لکھیم پور)

(۱)

شام کا وقت تھا اور مارچ کا روح پرور موسم - چودھویں رات کا دلفریب چاند نیلگوں بلند آسمان پر چمک رہا ہے جس کی ہلکی شعاعیں دریا کے صاف و شفّاف نیلے پانی میں اپنے انعکاس سے دلکشی پیدا کر رہی ہیں دور تک ایک چادر نور بچھی نظر آتی ہے - ننھی ننھی چمکیلی موجیں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ساحل سے ٹکرا کر واپس جاتی ہیں نسیم خوشگوار کے معطر جھونکے فرحت آگیں لوریاں دے رہی ہیں - دور سے آنیوالی بربط کی سریلی نغمہ سرائی دلوں میں وجد آفریں کیف پیدا کر رہی ہے -

جب کہ ایک عالم ایسے مسرور ساعتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے - شہر سے دور ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان میں چند معصوم بچے شدت گرسنگی سے بیتاب ہیں - ظہیر کو باوجود جان توڑ کوششوں کے دن بھر روٹی کا ٹکڑا نصیب نہیں ہوا - اس کے مضبوط اور قوی اعضاء مضمحل ہو گئے ہیں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں وہ نہایت صبر و ضبط سے کام لے رہا ہے مگر معصوم بچوں کی جان گسل زاری اس کے ہوش و حواس پراگندہ کر رہی ہے اس کا مصیبت کیش دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے -

آہ ! دنیا اور اس میں بسنے والے متمول کیسی کیسی نعمتوں اور ساز و سامان سے بہرہ ور ہیں - لیکن آہ ! اسی زمین اور اسی آسمان کی فضا میں چند معصوم بچے افلاس اور مصیبت کے شکار ہیں جن کے منہ میں تین وقت سے ایک کھیل تک اڑکر نہ گئی -

کیا انصاف اور انسانیت کا یہی تقاضا ہے کہ عیش و تنعم میں مصروف غریبوں کو بھول جائیں - کیا اخلاق اور مروت اسی کا نام ہے کہ ذی مرتبت ہستیوں کو غربت زدہ کی تکلیفوں کا احساس ہی نہ ہو -

کنگرۂ عرش کو ہلا دینے والی غریبوں کی آہ و فریاد - اشرف المخلوقات ہونیکا دعویٰ کرنے والوں کے دلوں کو ہلا نہیں سکتی ——— ؟

ظہیر پر جب کہ تمام راہیں بند تھیں اور آنکھوں کے آگے معصوم بچوں کی بیتابی کا ہولناک نظارہ تھا عالم یاس میں بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ "چوری" کرے مگر اس خیال ہی سے اسے وحشت ہو رہی تھی اوس کا پاک ضمیر لعنت و ملامت کر رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے چنانچہ وہ بڑی بڑی مصیبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کر چکا ہے لیکن —— کیا وہ اس ذلیل حرکت کو پسند کر سکتا ہے —— ؟

مگر چھوٹے یتیم و یسیر بھانجوں کی روح فرسا گرسنگی اور ان کی گریہ وزاری اس کے پیروں کو صراط مستقیم سے ڈگمگا رہی تھی۔

آہ! مجبوری سب کچھ کراتی ہے —— اس لئے بلا سوچے سمجھے نتائج سے بیخبر ایک صراف کی دکان سے کچھ زیور چرائے ابھی وہ لیکر بڑھا ہی تھا کہ گرفتار ہو گیا اس کو کیا معلوم تھا کہ چوری کس ہوشیاری اور چالاکی سے کیجاتی ہے۔

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔

عدالت نے سخت سزا تجویز کی۔ غریب ظہیر جیل کی بلند اور مضبوط چار دیواری میں قید کر دیا گیا —— کیا یتیم و یسیر کی امداد جرم ہے —— ؟

کیا بھوک سے تڑپتے ہوئے بچوں کے لئے کوئی تھوڑا سا ایثار کرنیکو تیار نہیں —— ؟ زمانہ کا عجیب لیل و نہار ہے۔ . . . . کیا ایثار و قربانی کی موجودہ دنیا میں کوئی وقعت نہیں —— ؟

سوسائٹی درد آشنا دل کی قدر نہیں کرتی۔ جرم کوش چیرہ دستوں کو بھی دنیا میں رہنے بسنے کا حق ہے۔

ظہیر کا دل غم و غصہ سے لبریز ہو گیا —— اس کی نگاہوں سے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا —— فیصلہ —— انصاف —— اس کیلئے ظاہر داری تھا۔ اس کو انصاف کش دنیا کے ظالم بسنے والوں سے نفرت تھی۔

اس کے بعد بچوں کا کیا حشر ہو گا —— تڑپ تڑپ کر بھوکوں جان دینگے —— آہ غریب معصوم بچے —— یہ خیال اس کو رہ رہ کر بے چین کر دیتا تھا۔ اس کا اندوہگیں —— لیکن رحم و ہمدردی سے لبریز دل تڑپ جاتا —— فکر و پریشانی اس کے زرد اور مضمحل چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

(۲)

مولوی ریاض اپنے خوشنما بنگلہ کے زمّردین دلان میں بیٹھے ہوئے "ہسٹری آف دی اسلام" کے مطالعہ میں مصروف تھے بہار کی رنگینیوں نے تمام صحن کو خیابان ارم بنا رکھا تھا۔ مہرجہاں تاب کی ہلکی ہلکی زرتار شعاعیں آم کے بلند درختوں پر جلوہ پاش تھیں۔ لہلہاتا ہوا سبزہ۔ گلہائے رنگین۔ جلوہ قدرت کو بے حجاب کر رہا تھا ـــــ کہ دفعتہً مولوی ریاض کو خیال آیا اور وہ اپنے "ہاسپٹل" کی سیر کیلئے چلدیے۔ پاک باطن دل درد آشنا ریاض نے اپنی وسیع کشادہ ہوادار کوٹھی ہاسپٹل کیلئے وقف کر دی تھی جس میں غرباء کا علاج بلا کسی معاوضہ کے مفت کیا جاتا تھا۔ مفلوک الحال مریضوں کو مالی امداد بھی دیجاتی تھی ـــــ اس وسیع اور مرجع عام ہاسپٹل کے اخراجات کیلئے مولوی ریاض نے اپنی جائداد وقف کر دی تھی۔

اسلام صرف روزہ نماز کا نام نہیں کہ پانچ وقت مسجد میں حاضری دیجایا کرے۔ بلکہ اسلام دل کی ٹیس اور جگر کی کسک سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلام روح کی گہرائیوں کا نام ہے جو ریاض کے دل میں موجود تھا۔

یہ ہاسپٹل سے واپس آکر آفس میں بیٹھ گئے۔ وفادار بوڑھی ملازمہ، ریحانہ کو کھانا لانیکا حکم دیا ـــــ کہ دفعتاً کسی نے دروازہ کو زور زور سے کھٹکھٹایا ـــــ اجازت دینے پر بھاری بدہئیت بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے ایک شخص داخل ہوا جس کے چہرہ پر پریشانی اور آنکھیں وحشت سے کھلی ہوئی تھیں۔

ریاض۔ کہئے کیا کام ہے؟ کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟

ظہیر۔ (مایوس اور پریشان لہجہ میں) آپ . . . . آپ کیا ـــــ کیا مفرور قیدی کو پناہ دیسکتے ہیں ـــــ؟

ریاض۔ مسکرا کر یقیناً . . . .

کھانے کی گھنٹی ہوئی نیکدل ریاض مجرم مہمان کو لیکر کھانے کے کمرہ میں گئے اور کھانا کھلایا۔

ریاض (کھانے کے بعد) اچھا چونکہ آپ کافی تھکے اور خستہ ہونگے۔ آرام کیجئے۔ چلئے میں آپ کو کمرہ دکھا دوں ـــــ دنیا کی نگاہوں میں مجرم ظہیر اپنے مہمان کی حیرت انگیز مہمان نوازیوں اور حسن اخلاق پر تعجب کرتا ہوا کمرہ میں پہنچا ـــــ

نرم گداز صاف بستر ـــــ آراستہ کمرہ ـــــ اس نے سونیکی کوشش کی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے

کوسوں دور تھی ـــ دنیا سے اس کو نفرت تھی ـــ اور دنیا کے بسنے والوں کیخلاف اس کے دل میں غم و غصہ کی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اپنے دل سے باتیں کرتا رہا۔ کیوں نہ ان ظالموں کو برباد کیا جائے جب کہ ناکردہ گناہوں کو انصاف کے پردے میں سزا دیجاتی ہے تو کیوں نہ ایسا گناہ کیا جائے جس میں لذت ہو مجھے یہاں سے جاکر بھوکوں مرنا ہے ... کیوں نہ یہ چاندی کا سامان لیلوں جو یہاں سے جانے پر کچھ فاقہ سے بچالیگا ـــ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اپنا دست آز الماری کی جانب دراز کیا لیکن یہ دیکھ کر وہ متعجب تھا کہ قفل کھلا ہوا ہے اس نے بلا تامل قیمتی سامان اٹھالیا ـــ رات کی پردہ پوش تاریکی میں باغ کی دیوار پھاند کر چلدیا۔

(۳)

صبح کا سہانا وقت ہے۔ آفتاب گوشہ مشرق سے اپنی زرین کرنیں دنیا والوں کیلئے بطور سوغات بھیج رہا ہے۔ نسیم سحری کے عنبر بیز جھونکے غنچہ دل کھلا رہے ہیں۔ پھولوں کی نازک پتیوں پر شبنم کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کی طرح درخشاں ہیں۔

مولوی ریاض اپنی روزانہ عبادت سے فارغ ہوکر باغ کی روشوں پر ٹہل رہے تھے کہ پولس کے دو سپاہی رات کے مفرور مہمان کو گرفتار کرکے لائے ہیں اور کہتے ہیں جناب ہم نے یہ قیمتی اشیا اس کے پاس سے برآمد کی ہیں مگر اس کا بیان ہے کہ یہ چیزیں آپ نے اس کو دی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے ـــ ؟

ریاض۔ ٹھیک یہ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں ـــ کیوں جناب آپ بقیہ چیزیں لیجانا بھول گئے ؟

سپاہیوں کے جانے کے بعد فرشتہ خصلت ریاض نے ظہیر کو نیکی اور تدین کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرکے بقیہ چیزیں اور روپیہ دیا۔ مولوی ریاض کی صاف اور کشادہ پیشانی سے تقدس اور ایمان کا نور جلوہ افروز تھا۔ بڑی اور سیاہ آنکھوں سے رحم و کرم الطاف و نوازش کی بارش ہو رہی تھی۔

مجرم ظہیر سر جھکائے خاموش کھڑا ہے دل حیرت اور تعجب سے بری طرح دھڑک رہا ہے آنکھیں جذبات تشکر اور اظہار ندامت سے چھلک رہی ہیں۔

(۴)

نصرت پور میں کپڑے کا کارخانہ نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ غریبوں۔ بیروزگاروں کو روٹی کا سہارا
ں گیا ہے کارخانہ کا مالک شفیق درحقیقت شفیق اور رحمدل ہے جس کی رگ رگ میں انسانیت جاری
ساری ہے جس کے پہلو میں درد آفریں دل ہے جو زندگی کی لذتوں سے محروم ہستیوں کی حالت پر آٹھ پہر
ر ہنا رہتا ہے اس کی بلند شخصیت اعلیٰ کردار سے ہر متنفس متاثر ہے ــــــ غریبوں کی امداد کیلئے
ا رخانہ سے متصل ایک چھوٹا سا دواخانہ اور اسکول بھی کھول دیا گیا ہے جس میں ان کے بچے بلا کسی اخراجات
ے تعلیم میں مصروف اور صحت سے مالامال ہو رہے ہیں حتیٰ کہ نادار اور مفلوج کی تنخواہوں سے بھی دل دہی
لی جا رہی ہے انسانیت کا مفہوم سمجھنے والے شفیق کا دامن ۔ دامن رحمت تھا۔ اس کی ہستی غریبوں
لیلئے لازوال نعمت اس کا وجود ایک ایسا دریا تھا جس سے لطف و کرم۔ ہمدردی اور غرباء نوازی کے چشمے
جاری تھے ۔

غریب بیوہ نصیرہ ہر طرح مجبور ہو کر شریف و احساسات لطیفہ کے عامل شفیق کے زیر سایہ پناہ لیتی ہے
جس نے اس کی ہر طرح اعانت کی اور آسائش و آرام کے اسباب مہیا کر دے لیکن اب بیکسی اور غربت
کی پُر مصائب زندگی کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ وہ ایک ایسی روحانی دنیا میں پہنچنے والی تھی جہاں پریشانی
اور غم کا نشان نہ تھا۔ جہاں وہ ایک معصوم فرشتہ کی طرح اڑتی پھرتی۔ نصیرہ بیمار ہوئی اور باوجود بہترین
طبی امداد کے جانبر نہ ہو سکی مرتے وقت اس نے اپنی چھوٹی لاغر اور کمزور بچی نسیمہ کو شفیق کے سایہ شفقت
میں چھوڑ دیا جس کا اس خود غرض اور بے رحم دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شفیق آٹھ پہر اسی نسیمہ
کی راحت و آسائش میں منہمک رہتا۔ اس کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کرتا تھا محبت و شفقت نے معصومہ
کے دل سے ماں کی الفت کو فراموش کر دیا تھا۔ ایک جانب یہ محبت سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور
دوسری طرف زیور تعلیم سے آراستہ۔ اب وہ ایک نو شگفتہ کلی تھی یا اس گاؤں کی اختر تابندہ شفیق جیسے
شفقت کیش انسان کی تعلیم نے اس کو حقیقی معنوں میں فرشتہ بنا دیا تھا۔ احساسات روحانی سے
اس کا دل معمور تھا۔ حسین غزالی آنکھیں لطف و کرم سے چمکتی تھیں۔ مصور قدرت نے اس کو اپنی صنعت
کا بہترین مُرقع بنا دیا تھا۔ نسیمہ ایک حور تھی جس نے ہر شخص کو خلوص تھا اور اس کی محبت گاؤں والوں

ق میں ابرکرم تھی جس میں شفیق کے اعلیٰ کردار کا عکس آٹھ پہر نمایاں تھا۔ باوجود اس کے نسیمہ اپنی
دت وفراست کے اس معمہ کو حل کرنے سے اپنے آپ کو عاجز پاتی تھی کہ شفیق بیشتر اوقات پریشان
مگر خاموش دکھائی دیتا ہے روحانی انتشار کی علامتیں اس کے مقدس چہرے سے نمایاں ہیں۔ فکر
بدو سے صاف اور کشادہ پیشانی پر شکنیں پڑجاتی ہیں رنج وغم کے بوجھ سے آنکھیں خودبخود جھک جاتی
ں معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی اہم راز کو چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے مگر باوجود اس کے چہرہ
ں کی غماضی کرتا جاتا ہے نسیمہ نے اس راز کے دریافت میں ممکنہ سعی کی مگر یہ عقدہ حل نہ ہونا تھا نہ ہوا۔
تو اس کا تھا کہ وہ اپنے چاہنے والے "باپ" کو اس طرح افسردہ وغمگین دیکھ رہی ہے مگر اس کے
حانی اضمحلال کو دور کرنا اپنے بس کی بات نہیں تھی۔

باوجود اس قدر مقبولیت عام کے شفیق زیادہ تر گوشۂ عافیت ہی کو پسند کرتا تھا بلا کسی خاص
رت کے کسی سے ملنے میں بھی تامل تھا۔ اس کا سارا وقت چھوٹے بچوں کی تعلیم۔ کتب بینی۔ عبادت۔
نت میں صرف ہوتا تھا۔ اکثر صبح وشام وہ پائیں باغ میں تنہا خاموش ٹہلتا نظر آتا۔ ہر شخص اس
پاک شکل اور مقدس چہرہ کو دیکھنے کا آرزومند تھا۔ عوام کی عقیدت اس سے بڑھتی گئی تھی حتیٰ کہ
حکام تک اس کا احترام کرنے لگے تھے۔

مختصر یہ کہ اس کی پاک اور روشن زندگی ہر طرح قابل رشک تھی اور نیکیوں سے معمور۔ ایک دن
سی عالم استغراق میں ٹہل رہا تھا کہ شور وغل کی آواز نے اوسے چونکا دیا۔ باہر پگڈنڈی پر
س کے چند سپاہی اور انسپکٹر ایک شخص کو گرفتار کرکے لیجا رہے تھے پیچھے دیہاتیوں کا جم غفیر تھا۔ دریافت
معلوم ہوا کہ ـــــ مفرور سزا یافتہ ظہیر ایک بنئے کی دکان سے آٹے کی بوری چراتے ہوئے پکڑا گیا
ق کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ روحانی کرب سے چہرہ زرد تھا۔ مفرور۔ سزا یافتہ ظہیر ـــــ
سزا ملیگی ـــــ ایک بیگناہ ـــــ خدایا وہ میرا ہم شکل ہے یہی اس کے مجرم ہونیکا ثبوت
اف۔ میرے جرم کی سزا دوسرا بھگتے۔ اور میں دیکھتا ہوا بیٹھا رہوں میرا ضمیر کیونکر اسے گوارا کرے گا
روا اور دل کیونکر ضبط کریگا۔ ضمیر کی وہ حقیقی ملامت کیا مجھے چین لینے دیگی۔؟

یہ سامانِ راحت اور فارغ البالی - یہ ہردلعزیزی اور پُرسکون زندگی ——— لوگ مجھے فرشتہ
مبرے سایہ کو ظلِ عاطفت سمجھتے ہیں - مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میرا احترام - یہ دواخانہ اور مدرسہ یہ کارخانہ
جس سے ہزاروں لوگ فیضیاب ہوتے ہیں جن کی زندگی سدھر گئی جن کو ہر طرح کی آسائش میسر ہے -
اور یہی وہ انسانی خدمت ہے جو تمام نیکیوں میں افضل ترین کہلا سکتی ہے - اگر ایک شخص کی جان کئی
جانوں کے مقابلہ میں جائے تو یہ بہتر ہوگا - اگر وہ شخص مجرم ظہیر کے دھوکہ میں سزا پا رہا ہے تو پانید و -
اس سے کسی کا کیا نقصان ہوگا ؟ مجھے بیکار فکر نہ کرنی چاہئے ———

اف ! بلند معبود - میرا دماغ خراب ہو جائیگا ——— خیالات کی رو ——— جذبات کی کشمکش
تو مجھے پاگل بنا دیگی - آہ ! ایک بیگناہ - بے قصور - مجرم کہلائے ! نہیں - نہیں - ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا -
ضمیر کی نیش زنی اور ملامت کیا مجھے چین لینے دیگی - روحانی سکون مجھے میسر آ سکیگا ؟ دل کی
ملامت - اخفا کا بار ——— یہ پریشانی اور انتشار - میری برداشت سے باہر ہے - یہ کارخانہ اور
رفاہ عامہ کا کام کوٹی اور دوسرا چلا لیگا -

عوام جن کی نظریں میری جانب محبت سے اٹھتی ہیں اب مجھے حقارت اور نفرت سے دیکھینگی
مجھے مجرم - ذلیل وخوار خیال کرینگے - ہونید و - جو کچھ ہو رہا ہے ضمیر کی ملامت برداشت کرلونگا -
مگر لوگوں کی نظروں میں حقیر ہونا کیونکر گوارا کیا جائے گا - یہ تاثرات کی کشمکش تمام رات شفیق کے
ساتھ جاری تھی - صبح وہ بستر سے اٹھا تو اس کی آنکھیں خمار آلودہ اور سرخ تھیں -

(۵)

عدالت تماشائیوں سے بھری ہوئی ہے ایک غریب کمزور تیس سالہ نوجوان کٹہرے میں خاموش
سر جھکائے کھڑا ہے مجرم کا وکیل براءت میں انتہائی بحث کر رہا ہے کہ اس کا موکل کبھی اصلی مفرور
ظہیر نہیں ہو سکتا ——— لیکن عدالت موجودہ شہادت سے اس کو مجرم سمجھنے پر مصر ہے - فیصلہ
سنا دیا گیا اور غریب مجرم کو پانچ سال کی سزا دیگئی -

فیصلہ کے الفاظ ابھی کمرہ کی فضاء میں گونج ہی رہے تھے کہ عدالت کے چپراسی نے ایک ملاقاتی کارڈ

کر جج کے سامنے رکھدیا ـــــ خان بہادر محمد شفیق ـ نصرت پور کا رئیس اعظم ـ غریبوں کا ملجا ـ عدالت میں ـــــ اور اس وقت جج وغیرہ پیشوائی کیلئے دروازہ کی جانب جاتے ہیں ـ شفیق کے مقدس اور نورانی چہرہ سے ایک نور چمک رہا ہے ـ عزم صمیم ـ ارادہ مستحکم کی علامتیں ظاہر ہیں اطمینان اور سکون اطراف حلقہ کئے ہوئے ـ روحانیت اور انسانیت کمال معیار پر ہے عبادت اور ریاضت کی کامل تفسیر ہو رہی ہے شفیق نے جج کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور موثر الفاظ میں کہا ـ آپ جسکو مجرم سمجھ رہے ہیں جس کیخلاف شہادت گذر چکی ہے ـ دراصل وہ مجرم نہیں ہے بلکہ ـــــ اصلی مجرم یہ بندہ گنہگار ہے جو اس وقت آپ سے مصروف تکلم ہے ـ مجھ میں اور فرضی مجرم میں اگرچہ مشابہت بہت کچھ ہے لیکن انصاف اور عدل کا خون نہیں کیا جا سکتا ـ ـــــ

میں نہایت خوشی سے اس سزا کیلئے تیار ہوں جو مجرم کیلئے تجویز فرمائی گئی ہے مجرم میں ہوں میرا ضمیر میرے جرم کے بدلے دوسرے کو سزا پاتے ہوئے دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا جو جرم اس پر عائد کیا گیا ہے جس کیلئے جرمانہ بھی تجویز ہوئی ہے اس کے ادا کرنے کیلئے میں آمادہ ہوں یہ کہکر جرمانہ کی رقم میز پر رکھدی ـ

عدالت میں سناٹا چھا گیا ہر شخص فرط حیرت سے تصویر بنگیا ـــ کسی کو یقین کسطرح آتا لیکن اتنی اہم شخصیت کا اس طرح اقبال جرم کرنا حقیقت کیخلاف کیونکر ہو سکتا تھا ـ اے مقدس وجود ـ اے ملکوتی ہستی جس سے فیض و کرم کے چشمے جاری ہیں اور یہ سزا ـــــ غریبوں کی مدد کرنیوالا ـ ہردلعزیز ـ قید نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا ـ حاضرین کے جذبات متحرک ہوئے اور ایک قابل وکیل نے ان تاثرات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا اگرچہ کہ عدالت کا فیصلہ مبنی بر انصاف ہے لیکن اب سزا کس کو دیجائیگی ـ کون شخص جیل کی چار دیواری میں بند ہو گا ـ مسئلہ غور طلب اور نظر ثانی کا محتاج ہے ـ ان کو جیل جاتے ہوئے کس کی آنکھیں دیکھ سکیں گی ـــــ ؟

عدالت نے عوام کے جذبات کا اندازہ لگاتے ہوئے مجرم کو بری کر دیا ـ اب ان کی قدر سہ چند ہو گئی ایثار کے اس عظیم الشان مظاہرے نے ہردلعزیزی اور عقیدت میں مزید چار چاند لگا دئے ـ

مندرجہ بالا افسانہ کا پلاٹ تھوڑے سے تغیر اور اضافہ کیساتھ فرانس کے مشہور ناولسٹ "وکٹر ہیوگو" کے ناول سے اخذ کیا گیا ہے۔

فلسفۂ حکومت

جناب محمد اقبال الدین احمد خان صاحب (مولوی فاضل)

یہ زمانہ کی نیرنگیاں ہیں کہ جو قومیں آج سب سے زائد پست اور متبذل نظر آتی ہیں یہی ایک زمانہ میں آسمان کمال کے مہر و ماہ کا کام دیچکی ہیں ہندوستان جو آج جہالت کا مسکن اور غربت کا گھوارہ ہے یہی صدیوں تک علوم و فنون کا ماوی و ملجا رہچکا ہے۔ یونان آج ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے ہے حالانکہ فیثاغورس سقراط۔ افلاطون اور ارسطاطالیس کا آغوش مادر یہی ملک تھا۔ مصر کا شمار آج زندہ اقوام میں نہیں۔ حالانکہ دنیا میں علم و فن کی روح مدتوں اسی کے دم قدم سے وابستہ رہی۔ یہی حال آج بدنصیب چین کا بھی ہے۔ چین کا نام آتے ہی انحطاط اور مردہ دلی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور عارضی چین مفقود ہوجاتا ہے حالانکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ جہالت اور مذلت کی تاریکی ساری دنیا پر چھائی ہوئی تھی مگر کرۂ ارض کے اس گوشہ میں علم و حکمت کی شمع روشن تھی۔ تہذیب و تمدن کی بزم آراستہ تھی اور اس کے محفوظ حصار میں علوم عقلیہ و نقلیہ اور معارف کے چشمے جاری تھے۔ تشنگان علم کیلئے یہ ایک سیراب کرنے والا دریا تھا۔ آج جو ممالک اپنے قدیم تمدن و تہذیب پر نازاں ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ سب اسی خرمن کے خوشہ چین اور اسی میکدہ کے جرعہ نوش ہیں۔

موجودہ چینی ایک بڑی حد تک مشاہیر رجال عصر حکیم کنفوشس کو عموماً پیمبر خیال کرتے ہیں حالانکہ اس کی تصانیف سے یہ بشکل بہ اطمینان ہوسکتا ہے کہ وہ موحد بھی تھا اگرچہ کنفوشس کے انتقال کو ہزاروں سال ہوچکے تاہم اس کے احکام کا بلا تشبیہ احکام الہٰی کی طرح ایک ایک حرف واجب العمل ہے۔

آج سے تقریباً تین ہزار سال پیشتر جبکہ ولادت حضرت مسیح میں آٹھ نو سو برس کی مدت باقی تھی۔ دنیا اور یہ دفتر لیل و نہار عجیب و غریب انقلابات کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ شام۔ بابل۔ نینوا کے زبردست ایوان حکومت زمین بوس ہو رہے تھے اور ان کے آثار پر ایران کا سر بفلک قصر تعمیر ہو رہا تھا۔ یہود اپنی

ہفتاد سالہ میعاد اسیری ختم کر کے وطن واپس جا رہے تھے۔ ایتھنز میں جمہوریت کو عروج مل رہا تھا۔ روما کے قدیم تاجداروں کا قلع قمع ہو رہا تھا۔ اور ہند میں بدھ مذہب کا اٹھان تھا۔ ارض بنی اسرائیل میں حضرت دانیال۔ حضرت ذکریا۔ حضرت حزقیل علیہم الصلوۃ والسلام فرائض نبوت کے تبلیغ میں منہمک تھے یونان کی زمین پر فیثاغورس اور شیخ علم و حکمت کے خزانے لٹا رہے تھے غرض کہ یہی تماشاگاہ عالم میں حیرت انگیز تماشے ہو رہے تھے جن میں سے ہر ایک بجائے خود رفتار کائنات کا رخ پھیر دینے کیلئے کافی تھا لیکن اس وقت چین میں بدنظمی کا دور دورہ تھا طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا رعب حکومت رخصت ہو چکا تھا خانہ جنگیوں کا زور شور تھا۔ اخلاقی فرائض سب فوت ہو گئے تھے ہر شخص بدچلنی و بدکرداری شراب قمار میں مبتلا نظر آتا تھا۔ شہوت پرستی کا بھوت ہر ہر نفر مرد اور ہر ہر عورت پر سوار نظر آتا تھا چھوٹے بڑے سب لغویات میں بدمست تھے تمام فضاء پر برائیوں کا تیرہ و تار ابر محیط تھا کہ دفعۃً اس کے ایک گوشہ سے ۵۵۱ھ قبل مسیح میں آفتاب اصلاح حکیم کنفوشس طلوع ہوا۔ اس کے ظہور کیساتھ مطلع خود بخود صاف ہوتا گیا۔ کنفوشس نہ پیمبر تھا نہ مجتہد نہ اس نے پیمبری کا دعویٰ کیا نہ اجتہاد کا وہ صرف مجدد تھا اس کا دعویٰ صرف اس قدر تھا "قدما کی تعلیمات کو از سر نو پیش کیا جائے حکمت و دانائی کے جو پھول پژمردہ ہو گئے ہیں انہیں از سر نو تازہ اور سرسبز کیا جائے" اس نے اپنی تصنیف سلسلہ کتب مقدسہ مشرقی جلد ۳ و ۱۶ و ۲۷ میں اپنا اصلی فلسفہ خاص پر یہ بتایا ہے کہ اولاً نظام خانہ داری (تدبیر منزل) کو درست کیا جائے اور جب خانگی حکومت صحیح اصول پر قایم ہو جائے تو ملکی حکومت کی کوشش کرنا چاہئے حکومت کا مقصد رعایا کو نفع پہنچانا ہے اس کا مقولہ ہے کہ "محبت خلایق" سے بڑھکر کوئی عمل صالح اور نفع رسانی مخلوق سے برتر کوئی مقصد حکومت نہیں ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں اسلام کے اصول فلسفہ کنفوشس سے بالکل ملجاتے ہیں اسلام کی تعلیم بھی ابتدا سے یہی ہے اور یہی رہیگی کیونکہ اسلامی قانون اٹل ہے کہ خیر الناس من ینفع الناس۔ بہترین انسان وہ ہے جس کی ذات سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ کنفوشس نے اکثر جگہ لکھا ہے کہ رعیت کو خوشحال بنانا چاہئے ان کو تعلیم دینی چاہئے اس مصلح نے بیان کیا ہے کہ اعلی نظام حکومت کے عناصر صرف تین ہیں۔ رعایا کو رزق کی تنگی نہ ہو۔ مالی و جنگی انتظام درست ہوں۔ رعایا کو حکمرانوں پر اعتماد ہو۔ قدماء کا مقولہ ہے کہ قیام عیش ملکی کیلئے

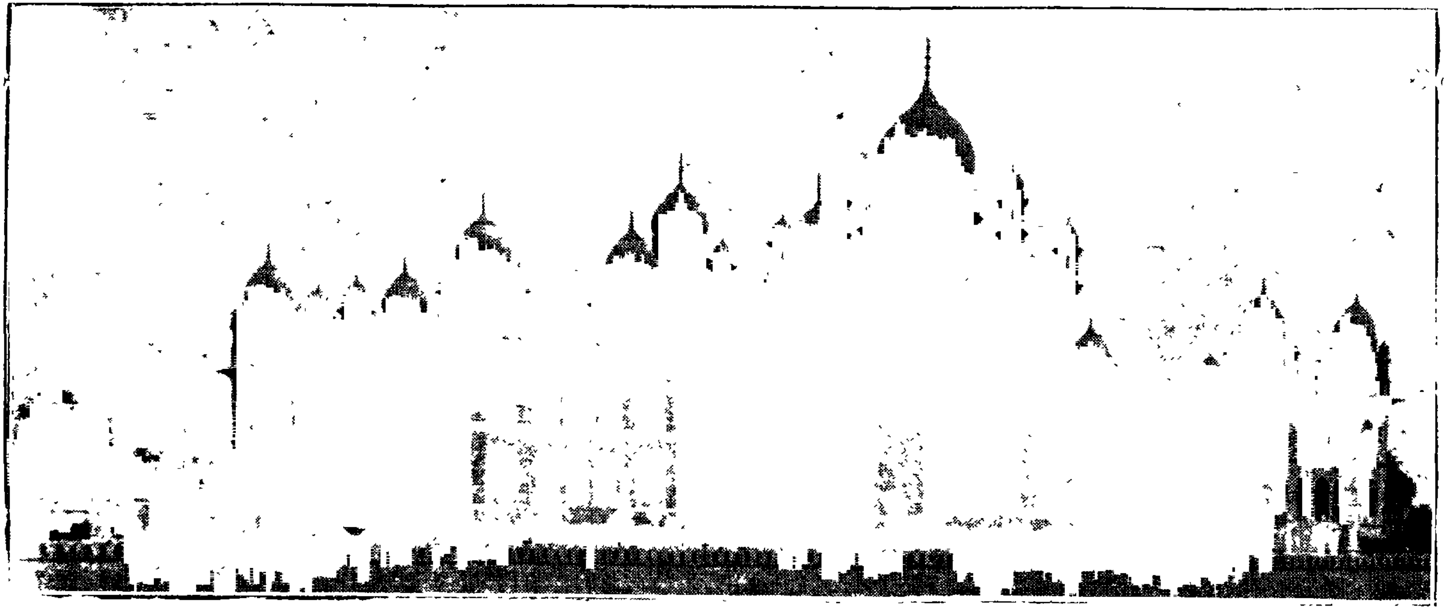
یہ شرط لازمی ہے کہ بادشاہ نہ صرف بذات خود مرد صالح ہو بلکہ ارکان حکومت صادق القول ہوں سعی وسفارش خوشامد۔ ذاتی تعلقات سے متاثر ہونے کے بجائے ذاتی قابلیت اور اہلیت کے حامل ہوں۔ایسا نہ ہو کہ گھوڑوں کو گھاس تک نہ ملے اور گدھے نخود مسلم نوش جاں فرمائیں حکامان دولت وہی لوگ بنائے جائیں جو محتاط۔ دانشمند۔ دیانت دار اور با اخلاق ہوں۔ تاکہ ان کی نظیر و تقلید سے رعایا بھی لامحالہ صالح و محتاط ہو جائے اس مصلح چین نے بیان کیا ہے اور واقعی خوب کہا ہے۔اس کا ہر ہر فرمان واجب الاذعان تھا۔اور اس کی قوم میں رہیگا کیونکہ اس کے مصاحب اراکین دولت اور حاکم دیانتدار۔ نیک کردار۔ بیجا خوشامدوں سے قطعًا دور اور عاری تھے اس نے لکھا ہے کہ ہر افسر و حاکم میں حسن اسلوب فرمان روائی کیلئے پانچ چیزوں کا اختیار اور چار کا ترک لازمی ولابدی ہے۔ امور واجب الاختیار یہ ہیں۔ فیاض[1] ہو مگر مسرف نہ ہو۔ خوددار[2] ہو مگر مغرور نہ ہو۔ بارعب[3] ہو مگر دہشت انگیز نہ ہو۔ بلند[4] نظر و ترفع سے کام لے مگر حق تلفی نہ کرے۔ محکومین[5] سے محبت بھرے الفاظ کہکر جو چاہے کام لے مگر طاقت سے زائد بار نہ ڈالے۔ امور واجب الاحتراز یہ ہیں۔

شقاوت[1] وسفاکی۔ ظلم و ستم[2]۔ سخت گیری و تشدد[3]۔ خوشامد طلبی[4] و ذنات کمظرفی۔اس نے بیان کیا ہے کہ طبقہ حکمران اعیان سلطنت اور عہدہ داروں میں مستقل مزاجی۔ معاملہ سنجی۔ فرض شناسی۔ نیک کرداری اس طور پر نمایاں ہو کہ وہ دوسروں یعنی اپنے ماتحتوں اور برابر والوں کو بھی متاثر کردے نہ یہ کہ وہ شورش و بغاوت کے علم کی آمادگی کا باعث بن جائے اور خود کو بھی محفوظ و سلامت نہ رکھ سکے۔ اس کا قول تھا کہ حاکم کا کام یہ ہے کہ بنظر حفاظت قانون وسیاست کے اسلحہ سے بھی مسلح رہے۔ لیکن اس طرح کہ دلوں پر اس کی حکومت اخلاقی طرز عمل سے ہو۔ وہ ضعیفوں سے ان کے مرتبہ کے مطابق ملے۔ ہمسنوں سے مساویانہ برتاؤ کرے۔ بچوں کمزوروں اور ماتحتوں پر رحم کرے اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں۔ آخر کتاب میں اس نے دعا کی ہے جو درج ذیل ہے۔

میرا حال کپاس کی طرح ہو کہ وہ دوسروں کیلئے سینکڑوں مصیبتیں اپنے سر لیتی ہے اور ہلاک ہو جاتی ہے۔ سن کی طرح نہ ہو کہ وہ رسی بن کر اوروں کے باندھنے اور کھال کھینچوانے کیلئے تیار ہوتا ہے۔

اور وہ اوروں کی بربادی کے خیال میں جلد تر خود بھی برباد ہوجاتا ہے اور نہ اولے اور پالے کی طرح کہ وہ کھیت کو مٹا کر خود بھی ستیاناس ہوجاتا ہے اور نہ دمدار منحوس ستارہ کی طرح جو باعث تکلیف ہوتا ہے۔ بلکہ میرا حال نیکو کار چاند اور سورج کی طرح ہوجائے جو طلوع ہوکر سکھ اور چین پہنچاتے ہیں۔ اور اس نیک آدمی کی طرح جو پرائے دکھ سے پریشان ہو جیسے مکھن کہ اپنی گرمی سے آپ ہی گھلتا ہے جس سے کسی کی ذراسی بھی خدمت ہوجائے وہ اچھا۔ (ترجمہ)





عدالت العالیہ

شہاب

جلد (۳) اردی بہشت ۱۳۴۴ف مارچ سنہ ۱۹۳۵ عیسوی نمبر (۱۲)

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (للعہ)

گورنمنٹ سے (۵ع)

(برقی پریس تیمر میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد شائع ہوا)

اشتہار حاضری مدیونان مرتبہ محکمہ نظامت ضلع نظام آباد

واقع ۲۱؍ فروردی ۱۳۴۲ف نمبر مقدمہ (۲/۴۲) ۱۳۴۲ف۔ باجلاس
نواب میر عباس حسین خان صاحب ناظم عدالت ضلع نظام آباد۔
بھیکاجی دادا بھائی۔ ڈگری بنام بھونگم وغیرہ۔ مدیونان
زر مثبتہ۔ [illegible]

بنام گندم گنگا رڈی ولد وینکٹ رڈی قوم رڈی عمر ۳۰ سال پیشہ بیوپار ساکن جگرم پلی تعلقہ آرمور مدیون نمبر ۲
پنڈری کم ولد دوبا قوم ونجر عمر ۳۲ سال پیشہ بیوپار ساکن کمر پلی تعلقہ آرمور۔ مدیون نمبر ۳۔

ہرگاہ مقدمہ مندرجہ عنوان میں تمہارے نام پتہ مذکورہ صدر پر سمن اجرا کئے گئے تھے جو اس بیان سے بلا تعمیل وصول ہوئے ہیں کہ تم مقام مذکورہ پر سکونت نہیں رکھتے ہیں اور معلوم نہیں کہاں چلے گئے ہیں اور تمہارا صحیح پتہ نہ چلنے سے ڈگریدار نے اجرائی اشتہار کی استدعا کی ہے لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۱۸؍ اردی بہشت ۱۳۴۲ف یوم شنبہ وقت ۱۰ بجے حاضر عدالت ہذا ہو کر مقدمہ ہذا کی پیروی و جوابدہی کرو۔ بصورت غیر حاضری کارروائی ضابطہ عمل میں آئیگی من بعد کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔

میری دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۲۲؍ فروردی ۱۳۴۲ف اجرا کیا گیا۔ فقط

شرحہ دستخط منتظم ضلع۔

اشتہار حاضری مراعلیہا مجریہ محکمہ نظامت عدالت ضلع نظام آباد

واقع ۱۸؍ فروردی ۱۳۴۲ف۔ نمبر مقدمہ ۱۲؍ ۱۳۴۲ف رجسٹر نمبر ۴۔ باجلاس
نواب میر عباس حسین خان صاحب ناظم عدالت ضلع نظام آباد۔
فاطمہ بی وغیرہ۔ مرافعان بنام بالے صاحب وغیرہ۔ مرافعہ علیہم
دعوے۔ زر نفقہ

بنام شبیر الدین ولد ولی الدین و عنایت علی ولد ولی الدین نابالغان بولایت مخدوم بی زوجہ ولی الدین ساکن اندل جوگی پیٹھ ضلع میدک بمکان شیخ محمد چپراسی۔ مرافعہ علیہم نمبر ۴ و ۵۔

ہرگاہ مقدمہ مندرجہ عنوان میں تمہارے نام پتہ مذکورہ صدر پر سمن اجرا کئے گئے تھے جو اس بیان سے بلا تعمیل وصول ہوئے ہیں کہ تم گلبرگہ شریف چلے گئے ہو جس کی وجہ مرافعان نے استدعا کی ہے کہ تمہارا صحیح پتہ نہیں چل رہا ہے اشتہار اجرا فرمایا جائے لہٰذا بذریعہ اشتہار ہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ سماعت مرافعہ کیلئے تاریخ پیشی ۱۸؍ اردی بہشت ۱۳۴۲ف یوم شنبہ مقرر کی گئی ہے پس تاریخ پیشی مقررہ پر حاضر عدالت ہو کر مقدمہ کی پیروی کرو بصورت غیر حاضری کارروائی ضابطہ عمل میں آئیگی من بعد کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔

میری دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۱۸؍ فروردی ۱۳۴۲ف اجرا کیا گیا۔ فقط

شرحہ دستخط
حافظ نیاز علی منتظم عدالت

یورپ کی دلچسپ ڈاک

(جناب نواب شہید یار جنگ بہادر)

محبّی نواب شہید یار جنگ بہادر سے چلتے وقت ہم نے خواہش کی تھی کہ اپنے سیاحت کے حالات بھیجتے رہیں اگرچہ کہ ان کی مصروفیت سے توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد آمادہ نگارش ہو جائینگے لیکن ہمارے پندار کو ان کے موجودہ عنایت نامہ نے شکستہ کر دیا ہے اب تو یقین کامل ہے کہ یہ سلسلہ بدستور جاری رہیگا۔ اور ہم نے بھی آئندہ پیش نظر کر دیا تاکہ ہوٹل میں وہ مقیم ہوں ایک خط بہ پیشگی لکھ دیا ہے کہ ادھر وہ موٹر سے شیروانی جسم سے علیحدہ کرنے نہ پائیں کہ ہوٹل کا منیجر انہیں ہمارا خط پہنچا دے اور وہ اپنی پہلی فرصت میں اس کی پذیرائی کیلئے تیار ہو جائیں۔

چہارشنبہ ۱۳ فبروردی ۱۹۳۵ء "لائیڈ ٹرسٹینو"

"وکٹوریہ"

سلام مسنون اسلام۔ لیجئے حسب وعدہ پہلی قسط حاضر ہے خدا کرے کہ کہیں یہی آخر نہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں خط لکھنے میں بعید کاہل واقع ہوا ہوں۔ پھر تم صرف خط لکھنے کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ چاہتے ہو کہ میں ابن خلدون یا ابن بطوطہ ہو جاؤں خیر تمہارے حکم کی تعمیل کرتے ہی بنیگی۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

سنو بسمل! تم خوب واقف ہو کہ جس قدر عنفوان شباب میں شہرت کی تمنا تھی اوسی قدر اب شہرت سے نفرت سی ہو گئی ہے نثر تو مدت سے چھوٹی ہوئی تھی نظم سے بھی دل برداشتہ ہو گیا ہے۔ قدرت نے یہ جو دنیا کا سینما (ٹاکیز) تیار کیا ہے محض اپنی دلبستگی کیلئے ہے کسی متحرک تصویر کو کیا کوئی خواہش ہو سکتی ہے۔ مگر خیر میں یہ کس سے کہہ رہا ہوں۔ بسمل سے ممکن ہے کہ وہ کسی زمانہ میں مرتبہ رفیقہ شہادت سے فائز ہونے کے بعد اس راز کو سمجھ سکے۔ ابھی تک تو وہ اسی سراب (شہرت) کیلئے سرگشتہ ہے۔ اچھا بھائی بمبئی تک کے سفر کے حالات سے تو تم بھی واقف ہو اگر تکمیل کی ضرورت ہو تو اوتنا حصہ

تم خود بھی لکھ سکتے ہو۔ فبروری کی گیارہ تاریخ دوشنبہ کا روز تھا کہ ہم حضرت ذی الشان شاہزادہ معظم جاہ بہادر کے ہمراہ رکاب جہاز ”وکٹوریہ“ سے بعزم سفر یورپ روانہ ہوئے۔ بمبئی میں چیچک کا زور ہونے سے ٹیکہ لینا لازمی ہو گیا ہے خدا بھلا کرے اولڈ ہام جہاز ڈاکٹروں کا جن کے اخلاق کا سرٹیفکٹ ہم ساتھ ہی لیتے آئے کہ ساڑھے دس بجے ہم جہاز پر سوار ہو گئے اور ساڑھے گیارہ بجے وہ زنجیر محبت کی آخری کڑی یعنی جہاز کی سیڑھی ہٹالی گئی اور ہم ”رخصت اے اہل دکن ہم تو سفر کرتے ہیں“ کا ورد کرتے ہوئے روانہ ہو گئے اب اگر یہاں میں اپنے قلبی کیفیات کا ذکر شروع کر دوں تو ممکن ہے اکثر و بیشتر اہل درد حضرات اسے مرزا دبیر مرحوم کا مرثیہ سمجھنے لگیں۔ اس لئے چھوڑیئے بھی اس سلسلہ کو اور سنئے اس جہاز کی سوانحعمری۔ یہ جہاز جو حضرت وکٹوریہ آنجہانی کے نام سے موسوم ہے اس کا سنہ ولادت ۱۹۲۱ء ہے اس عالم شیر خوارگی میں اس نے وہ ہاتھ پاؤں نکالے کہ ہر ایک اہل نظر ایک گردیدہ ہو گیا۔

اسے دیکھ کر مصلی پہ کہتی تھی دایہ
یہ لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے

اچھا تو پہلے ہمیں یہ تو سمجھا دو کہ ہم یعنی ہندوستانی جنھیں اپنی اردو پر بڑا ناز ہے وہ تو جہاز کو مذکر کہتے ہیں مگر یہ یار اہل یورپ جنھیں نہ صرف اپنے زبان ہی پر ناز ہے بلکہ انہوں نے بڑے بڑے انکشافات علمی کئے ہیں یہ جہاز کو (شی) یعنی مونث کہتے ہیں، تو بھائی صاحب اب آپ ہی فرمائیے اس کے متعلق آپ کا اپنا ذاتی اجتہاد کیا ہے کہیں غالب مرحوم کا وہ جواب پیش نہ فرمائیے کہ رتھ میں اگر مرد سوار ہوں تو مذکر۔ اور اگر عورتیں سوار ہوں تو مونث۔ بھائی یہاں تو دونوں سوار ہیں اور وہ بھی بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز حیثیت یہ تمہیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ بلا امتیاز حیثیت کے کیا معنی ہیں۔ اچھا تو یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

یہ جہاز اٹالین کمپنی لیڈ ٹرسٹینو کا ہے اس جہاز کا وزن (۱۲۰۹۸) ٹن ہے اس میں فسٹ کلاس کے ۲۶۷ مسافروں کی جگہ ہے۔ کرایہ سیزن پر ۶۵ پونڈ خالی وقت میں ۵۵ پونڈ۔ سکنڈ کلاس کے مسافروں کیلئے ۹۷ کی گنجائش ہے کرایہ ۴۵ پونڈ اور ۴۰ پونڈ اس کے سوا اکانمک سکنڈ بھی ہے گنجائش مسافر ۱۰۰ کرایہ ۳۰ پونڈ ۲۵ پونڈ۔ ڈک پر صرف ملازمین کے لئے جگہ ہے کرایہ ۲۰ پونڈ اور ۱۶ پونڈ۔

غرض جملہ مسافر (۴۴۶) علاوہ ڈک کے مسافروں کے اور اس کے عملہ کی تعداد (۲۸۳) ہے۔

غرض اب تک جس قدر جہاز ہندوستان اور یورپ کا سفر کرتے ہیں اون سب میں یہ جہاز (۱) نہایت خوبصورت (۲) بیحد آرام دہ (۳) اور سب سے زیادہ تیز رفتار ہے اس کی رفتار (اگر آپ کی سمجھ میں آجائے تو) ۲۳ ناٹ فی گھنٹہ ہے۔ بھائی صاحب یہاں ناٹ کے متعلق شہتیر سمجھکر قیاس آرائی کی ضرورت نہیں یہ سمجھ لو کہ جس طرح خشکی پر میل ہے اوسی طرح تری میں ناٹ کا کچھ ہی فرق ہوتا ہے۔

سننے میں آرہا ہے کہ ان جہاز صاحب (بھائی اپنی عادت سے مجبور ہیں انہیں مذکر ہی کہیں گے گو تحقیق اس کے خلاف ہو) کی والدہ ماجدہ بی اٹلی صاحبہ کو پورے دن ہیں وہ عنقریب ایک اور مولود پیش کرنیوالی ہیں۔ جو اہل قیاس کی رائے میں اس سے بدرجہا حسین آرام دہ تیز رفتار ہوگا۔ دیکھیں وہ کیا قیامت ڈھاتے ہیں اس جہاز میں جو ڈرائینگ روم ہے (اوس کا کارڈ تمہیں عابد علی سعید سلمہ سے مل سکتا ہے اور بھی کارڈ تمہیں وہیں ملجائیں گے) اس قدر خوبصورت ہے کہ میں نے کسی محل میں اتنا خوبصورت ڈرائینگ روم نہیں دیکھا اطراف میں قالین کا فرش ہے بیچ میں ڈانسنگ فلور ہے صدر میں ڈائس ہے جہاں روز آنہ رات میں بیانڈ بجا کرتا ہے ایک رات درمیان سینما بھی ہوتا ہے اور روز آنہ شب میں ناچ بھی ہوتا ہے بازو میں دو طرف دو میزیں لگی ہوئی ہیں جس پر چار مسافر ہمیشہ خط لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں سب سے بڑا اور بہتر حجرہ ڈائینگ روم یعنی کھانے کا حجرہ ہے جس میں وقت واحد میں ساڑھے تین سو آدمی مختلف میزوں پر کھانا کھا سکتے ہیں اس حجرہ کی ساخت بالکل مصر کے قدیم معبد کی سی ہے چھت بالکل سنہری ہے جس پر نقرئی حاشیہ ہے تمام بہترین لکڑی کا کام ہے جس پر روپہری تصویریں مصر قدیم کی ہیں بیچ میں دو مربع ڈز کھڑی ہیں جن کے سروں پر عود دان ہیں جن میں سے خفیف سے بخارات نکلتے رہتے ہیں یہ در اصل چراغ ہیں جن سے چھت روشن ہوتی ہے اوس حجرے کی ساخت بالکل رقص مصر بحر کی سی ہے کہ اگر دریا گرم ہو تو یہ حجرہ جب جائیں کرہ زمہریر ہو سکتا ہے غرض جی نہیں چاہتا کہ یہاں سے اوٹھیں ڈرائینگ روم کے دوسری طرف دونوں بازو دو چھوٹے حجرے ہیں اور درمیان میں ایک متوسط گول حجرہ ہے ایک بازو کارڈ روم ہے دوسری بازو کا حجرہ گویا لڑکی کا کام دیتا ہے جس میں کونچ پڑے ہوئے ہیں اور سامنے رہنے کے کیبن ہیں دنیا بھر کی ناک چینی کی قسمیں جمع ہیں اس لئے کہ اس پودے کو

نہ پانی کی ضرورت ہے نہ کسی اور چیز کی بڑھنے کے لئے بن ہی میں اپنی قوت نمو جاری رکھتا ہے۔ اب رہا درمیان گول حجرہ۔ وہ وہ حجرہ ہے جو کبھی ویران نظر نہیں آتا۔ سمجھے ہو یہ کیا ہے؟ بھائی صاحب ذرا طبیعت پر بار دیجئے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حجرہ "بار" کہلاتا ہے جہاں داخل ہونا ہمارے لئے بار ہے اور جہاں سے نکلنا دوسرے حضرات پر بار ہے اس سے پیچھے جہاز کے سامنے کے حصہ میں چار کا حجرہ ہے جہاں دو مرتبہ دن میں موسیقی سامع نواز رہتی ہے یہ تو درمیانی ڈاک کا حال تھا اب اس سے اوپر چلئے یہاں پر آپ کو پہلے تو ایک چھوٹا سا (سومنگ پول) تیرنے کا حوض ملیگا اس کے بعد اوپر کی طرف مختلف کھیل ہیں صدر میں ایک حجرہ ہے جس میں ورزشی کرتب کا سامان ہے یہیں سیکل بھی ہے جس پر سوار ہو کر آپ اوسی نقطہ پر پھرتے ہوئے میلوں چلے جا سکتے ہیں یہیں اسپ صبا رفتار بھی ہیں جو بجلی کی قوت سے رواں ہیں اور جناب کی سواری کا امتحان بھی لیتے ہیں پک دولتی غرض کاٹنے کے سوا سارے عیب موجود ہیں یہیں آپ خشکی میں کشتی بھی چلا سکتے ہیں یہیں آپ کے بازی کی مشق خود اپنے گلے جبڑے پر کر سکتے ہیں اور یہیں وہ سواری بھی ہے جس پر سوار ہونے سے نادر شاہ سے بہادر نے انکار کیا تھا۔ عہدہ داران جہاز اس قدر خلیق ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا کھانا اتنے قسم کا اور اتنے مرتبہ ہوتا ہے کہ بعض شوقین حضرات اٹالین جہاز پر محض اسی لئے سفر کرتے ہیں۔ حجرے نہایت صاف و پاک ہیں بیشتر حجروں میں غسل خانہ ہیں بعض ایسے ہونگے جس میں مشترک غسلخانہ ہو۔ ان کے سوا کیا سن ڈی لوکس بھی ہیں جس میں اگر چاہا تو کرۂ زمہریر کا لطف آجائے۔ غرض نہایت خوبصورت اور آرام دہ جہاز ہے۔ فہرست طعام بھی تمہیں عابد سے ملجائے گی۔ آج شام میں جہاز عدن پہنچیگا۔ جہاں سے یہ خط ڈاک میں ڈلوا دوں گا دو تین روز بعد پی اینڈ او کے جہاز سے روانہ ہو کر چوتھے روز تمہیں پہنچیگا۔ غرض آئندہ جمعہ یا شنبہ کو تمہیں ملجائیگا۔

عدن کے متعلق تمہیں کتابوں اور نیز دیگر حضرات کے بیانات سے کافی مواد مل سکتا ہے مگر بھائی صاحب شداد نے جنت کے لئے نہایت ناموزوں مقام کا انتخاب کیا تھا۔ شدت سے گرمی ہوتی ہے پانی نایاب ہے کسی قدر بارش چار پانچ انچ ہو جاتی ہے وہ پانی جمع کر لیا جاتا ہے اور وہی پینے کے کام آتا ہے البتہ عدن میں پہاڑوں پر ایک سلسلہ پختہ حوضوں کا ہے معلوم نہیں کس زمانہ کی تعمیر ہے آج تک بالکل

اچھی حالت میں ہے نہایت بڑے بڑے حوض پختہ گچ اور چونہ کے نہایت مضبوط غرض قدیم زمانہ کی یادگار ہیں ممکن ہے کہ آپ کے شداد نے اپنی بہشت کے نہروں کیلئے یہیں پانی کا خزانہ بنایا ہو۔ اللہ میاں کو بہشت کی تعداد میں اضافہ مقصود تھا تو ارم پر تو قبضہ فرمالیا مگر ان کے یہاں پانی کی کیا کمی تھی یہ خزانہ ہائے آب یوں ہے ویران چھوڑ دئے گئے کہا جاتا ہے کہ اب انگریزی گورنمنٹ کے عہد حکومت میں یہ صاف کرائے گئے ہیں اور بارش کے موسم میں کچھ پانی جمع ہو جاتا ہے۔ عدن کی بستی غلیظ ہے مکانات بالعموم پست اور کچے ہیں غرض کسی سلطنت کے لٹ جانے کے بعد وہاں کیا باقی رہتا ہے یہ تو شداد صاحب کی خدائی کا مقام تھا۔ جب خدائی ختم ہو جائے تو پھر ہُو کے سوا اور کیا ہو گا۔

نوٹ۔ آج پنجشنبہ کا روز ہے چار بجے کا وقت خط لکھنا میں نے کل شروع کیا تھا۔ اب مغرب تک عدن پہنچ جائیں گے ٹپہ کی جلدی ہے چھ بجے تک جہاز کے ڈاک خانہ میں ڈال دینا لازم ہے مجھے اور بھی خط لکھنے ہیں لہذا اب کم سے کم ایک ہفتہ کیلئے رخصت۔

ہاں اگر مناسب سمجھو تو ایک نقل اس خط کی عابد سلمہ کو دیدو کہ میں چاہتا ہوں کسی وقت خیال پیدا ہو کہ حالات سفر یورپ طبع ہو جائیں تو بصورت عمل اس کا کچھ حصہ بھی کام دی جائے گا۔ امید کہ تم معہ متعلقین (معنوی) خیریت سے ہونگے۔ خدا حافظ۔　　تمہارا شہید

بیشتر وی۔ پی۔ ڈاک خانہ مقامی کی اس اطلاع کیساتھ واپس آئے ہیں: "بوجہ زبانی انکار" اور جب ہم مرسل الیہ صاحب سے دریافت کرتے ہیں تو یہ جواب ملتا ہے کہ وی۔ پی ہم تک آیا ہی نہیں۔ اسی طرح ہر مہینہ دفتر کو اخراجات وی۔ پی کے ناگوار مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ کیا اچھا ہو سررشتہ ٹپہ وی۔ پی کے انکاری صورت میں مکتوب الیہ کی تحریر لے لیا کرے اس سے ہمیں یہ سہولت ہوگی کہ آئندہ سے ایسے انکار کرنیوالوں کو ہم دکھا سکیں گے۔

شکریہ مولوی سید دلاور حسین صاحب صدر مہتمم انہار اور نواب محمد کاظم علی خاں صاحب بی۔ اے دوم تعلقدار کا جنھوں نے اس مہینہ خریداروں سے اعانت کی ہے۔

رُباعیات

مولنا امجد

اسباب و علل کا وِرد کرتے رہیے
اپنی فطرت پہ جور کرتے رہیے
جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ ٹل نہ سکا
اب کیوں ہوا؟ اس پہ غور کرتے رہیے

تقدیر سے کیا گلہ، خدا کی مرضی
جو کچھ بھی ہوا، ہوا خدا کی مرضی
امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

"مولوی مدن رکن کنیزت بلدہ سے دستبردار ہوگئے"

(سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی)

دھڑ۔ ۔ دھڑ۔ ۔ ۔ دھڑ۔ ۔ ۔ دھڑ ـــــ کسی نے کواڑ ٹھوکے ـــــ "کون؟ کون؟" میں نے نیند سے یکدم چونک کر پوچھا۔ "خاکسار۔ حقیر۔ ناچیز۔ خادم" ـــــ اسی قسم کے کچھ بے محل الفاظ میرے استفسار کے جواب میں سنائی دیئے میں نے خیال کیا کہ شاید کوئی غریب بھوک کی تکلیف سے سو نہ سکا اور مانگنے آیا ہے اسی لئے آنکھیں ملتے ہوئے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ پیسے نکال کر دروازہ کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو اندھیری رات میں ایک سایہ لرزاں نظر آیا۔ میں نے گفت و شنید کی مزید تکلیف گوارا کرنے کی بجائے مناسب خیال کیا کہ پیسے پیش کر دوں۔

"جی ۔ جی ۔ خاکسار ۔ ۔ ۔ ۔ "

"بس یہی حاضر ہے میں اس وقت اس سے زیادہ کوئی خدمت نہیں کر سکتا" میں نے قصہ مختصر کرتے ہوئے کہا اور کواڑ بند کرنے کا ارادہ کیا۔

"آپ نے اس خادم کا مطلب غلط سمجھا ۔ دراصل" ـــــ

میں غلط فہمی رفع کرنے پر اخلاقاً مجبور ہوا اور بادل ناخواستہ گردن باہر نکال کر سننے لگا۔

"دراصل ۔ ۔ ۔ بات یہ ہے کہ میں حاضر ہوا تھا جناب کو بیدار کرنے کیلئے ۔ ۔ ۔ ۔"

"بیدار کرنے کیلئے!" میرے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

"جی ہاں نماز کیلئے بیدار کرنے ۔ ۔ ۔ "

"نماز کیلئے؟ کیا تہجد کی نماز کیلئے؟"

"صبح کی؟ مگر ابھی تو صرف" ـــــ میں یہیں تک کہنے پایا تھا کہ گھنٹوں کی آواز کے ـــــ

ٹن ۔ ٹن ـــــ"

یہ صحیح ہے کہ ابھی صرف دو بجے ہیں لیکن مجھے سارے محلہ کو جگانا ہے ۔ سب کو جگاتے جگاتے صبح ہو جائیگی۔

یہ سمجھ کر کہ آدمی خطرناک ہے میں نے کواڑ بند کر لئے اور وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔

صبح میں ذرا دیر سے اٹھا منہ پر سے چادر ہٹاتا ہوں تو سامنے نظیر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔
"سلام علیکم" اس نے کہا۔
میں نے سلام کا جواب دینے سے زیادہ ضروری خیال کیا کہ یہ دریافت کروں کہ کیا وہ پرچہ تازہ ہے۔ جب اس کا جواب اثبات میں ملا تو میں نے فوراً بے صبری کیساتھ کہا "گھر کی باتوں کے عنوان پڑھ ڈالو...... کیا دارالمجانین سے کسی پاگل کی فراری کی اطلاع درج ہے؟
"ہا ہا۔ کیا تم اپنے لئے جگہ خالی کرانا چاہتے ہو —— ایسے بھی نہیں جگہ ملسکتی ہے کسی کی فراری سے واسطہ!"
—— گذشتہ شب کا قصہ میں نے ایک سانس میں کہہ سنایا جس کے جواب میں اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے بیان کرنا شروع کیا —— یہی تو ہیں مولوی مدن۔
"ہیں؟ مولوی مدن؟ اس زمانہ میں؟"
"کیوں؟ تعجب کی وجہ؟ ہر زمانہ ایک نہ ایک مولوی مدن پیدا کرتا ہے بغیر مولوی مدن کے کوئی محفل با رونق نظر نہیں آتی۔"
"قصہ مختصر۔ خدا جانے ان بزرگوار کا اسم گرامی کیا ہے لیکن عام طور پر مولوی مدن مشہور ہیں" نظیر کہنے لگا۔
"تعجب تو اس کا ہے کہ تم ان سے ناواقف نہیں اور شاید یہ نہیں اس کی خبر بھی نہیں کہ مولوی مدن رکنیت بلدیہ کے لئے کھڑے ہیں اسی سلسلہ میں وہ قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے حلقہ کے لوگوں کو نماز کیلئے بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔
"اوہو تو اب میں سمجھا دو بجے مجھے بیدار کرنے کا سبب؟"
"آج اونہوں نے اپنے حلقہ کے اصحاب کا ایک عام جلسہ منعقد کیا ہے اور یقیناً ان کی تقریر سننے سے تعلق رکھتی ہوگی میں اس ارادہ سے آیا تھا۔ چلو جلدی کرو؟"
مجھے مولوی مدن سے کافی دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ اسی لئے جلدی جلدی کپڑے پہننے لگا۔

"وہ تو تم نے سنا ہوگا کہ مولانا محمد حسین آزاد الفاظ کے استعمال میں بڑی احتیاط کرتے تھے" نظیر کہہ رہا تھا "مسودہ پر نظر ثانی کرنے وقت اگر کوئی لفظ ذرا بھی ناموزوں معلوم ہوا تو دوسرا لفظ کاغذ کے پرزے پر لکھا اور اس کے اوپر چپکا دیا۔ تیسری دفعہ پڑھا تو تیسرا لفظ چسپاں کر دیا۔ غرض سنتا ہوں کہ بعض الفاظ آدھ آدھ انچ اپنی سطح سے اونچے نظر آتے تھے۔ مگر مولوی مدن کی تعریف میں سنتا ہوں کہ وہ احتیاط میں بڑے آزاد ہیں۔"

اوّل تو مقام مختصر سا تھا دوسرے یہ کہ ہم دیر سے پہنچے۔ بھلا اچھی جگہ ملتی تو کیونکر؟ مولوی مدن کی آواز ہم تک کچھ تو دوری کے سبب اچھی طرح پہنچ نہ سکتی تھی اور کچھ حاضرین کے قہقہوں کی گونج کی وجہ سے۔ کبھی کبھار ایک آدھ فقرہ سننے میں آجاتا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے . . . . . .

"شاہراہوں پر طوائف کے کوٹھے شہر کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں رکنیت بلدہ کیلئے اگر آپ لوگ اس خادم کو منتخب فرمائینگے تو ناچیز وعدہ کرتا ہے کہ وہ انھیں جامعہ سے باہر کر دیگا" (اس پر اتنی تالیاں بجیں کہ سارا ہال گونج گیا اور اس کے بعد مولوی صاحب نے جو کچھ کہا اس کو ہم سن نہ سکے) . . . . عام طور پر مذہب سے بیزاری ملک میں پلیگ کی طرح پھیل رہی ہے جس طرح سے کہ چوہے پکڑنے کا انتظام بلدیہ کی طرف سے ہوتا ہے کیوں نہ اسی طرح ان مذہب سے بیزار اشخاص کیلئے چوہے دان لگائے جائیں۔ دوسرے الفاظ میں اگر میں رکن بلدیہ منتخب ہوا تو ایسے احباب کو وعظ کے ذریعہ ترغیب و تحریص دیکر مذہب کے جال میں پھنساؤں گا۔ . . . ایک اور سوال اہل ملک کو پریشان کر رہا ہے اور وہ بے روزگاری ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کو بہت جلد حل کر دونگا۔ اس طرح سے کہ سارے بیروزگاروں کو بلا معاوضہ دفاتر میں متعین کر دوں گا۔ . . . (ایک ہنگامہ شور نشور بلند ہوا۔ تالیوں کی گونج میں مولوی مدن سلام کرتے ہوئے دکھائی دئے بلد لوگوں نے دوبارہ اور سہ بارہ کے آوازے لگائے اور مولوی صاحب مشاعرہ کی غزل کی طرح اپنی اس تجویز کو کئی مرتبہ پیش کر کے حاضرین سے خراج تحسین حاصل کئے) . . . . . اب میں صفائی

اور حفظانِ صحت کے متعلق ایک اہم تجویز پیش کرنیوالا ہوں۔ ذرا سب حاضرین گوش بر آواز ہو جائیں
ہاں تو میری تجویز یہ ہے کہ کچرا کرکٹ سڑکوں اور راستوں پر ہرگز نہ پھینکا جائے بلکہ گھروں ہی
میں دفن کر دیا جائے نہ راستوں پر کچرا پھینکا جائے نہ غلاظت اور بدبو پھیلے۔ وہ تو آپ نے سنا ہی
ہوگا کہ نہ ناک رہے اور نہ مکھی بیٹھے . . . . . . واللہ بلیگ کے انسداد کیلئے تو ایسی ترکیب سوجھی ہے
کہ حاضرین پھڑک جائینگے (بہت سے حاضرین تو اسی پر پھڑک گئے باقی جو تھے وہ اپنے آپ کو پھڑکنے
کیلئے آمادہ کر رہے تھے) جن لوگوں نے بنگال ریڈر نمبر ۴ پڑھی ہے انہیں یاد ہوگا کہ کسی گاؤں
میں ایک شخص نے سارنگی کچھ اس ڈھنگ سے بجائی تھی کہ گاؤں کے سارے چوہے بلوں سے
نکل کر اس کے ساتھ ہو گئے۔ اسی طرح ہماری فیاض گورنمنٹ کو آمادہ کرنا چاہئے کہ وہ بعض ماہرین
موسیقی کو انگلستان بھیجے تاکہ وہ وہاں رہکر یہ تحقیق کریں کہ بنگال ریڈر نمبر ۴ کے سارنگی ساز
نے کون سی گت بجائی تھی یہ راز معلوم ہوتے ہی سارے چوہوں کو بلوں سے نکال کر رودِ موسیٰ
میں غرقِ آب کر دیا جا سکتا ہے (مولوی مدن کی پیشنگوئی بالکل صحیح ہوئی اور لوگ پھڑکنے لگے
اور اس قدر غلغلہ بلند ہوا کہ ایک حرف بھی اس کے بعد سنائی نہ دیا حتیٰ کہ مولوی مدن نے
تقریر ختم کر دی)

دوسری صبح کو چونکہ اوٹ دینے کا حکم تھا اسی لئے ہر طرف غیر معمولی طور پر چہل پہل تھی میں باہر کھڑا تماشا
دیکھ رہا تھا یکایک لڑکوں کا ایک غول سامنے سے آتا نظر آیا۔ ان کے گلوں میں بڑے بڑے پوسٹر تھے۔
ایک پر لکھا تھا "مولوی مدن کی ایثار قابلِ رشک ہے"
دوسرے پر لکھا تھا "مولوی مدن کا انصاف لایقِ داد ہے"
تیسرے پر لکھا تھا "مولوی مدن ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے"
چوتھے پر لکھا تھا "مولوی مدن نے اپنے سے بہتر شخص کے حق میں فیصلہ کیا"
وغیرہ وغیرہ۔

میں یہ دیکھکر دنگ رہگیا۔ یا تو وہ شورا شوری یا یہ بے نمکی۔ میں کیا سارے محلہ والے۔ دوست احباب اور مویّد اور طرفدار سب ہی انگشت بدنداں تھے اور وہ جو سرگرمی سے مولوی مدن کیلئے اوٹ فراہم کر رہے تھے تھوڑی دیر کیلئے رک گئے۔

کچھ دیر نہ گذری تھی کہ کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی مدن ایک موٹر میں لدے ہوئے تھے چہرہ پر ہوائیاں چھوٹی ہوئیں ہانپتے کانپتے چلے آ رہے ہیں وہ کچھ کہہ رہے ہیں لیکن آواز خستہ ہے اور ایک حرف بھی سنائی نہیں دیتا کیونکہ موٹر کے ساتھ ایک جماعت "زندہ باد مولوی مدن" کے فلک شگاف نعرے لگا رہی ہے۔ البتہ مولوی جی ہاتھیں نچا نچا کر کچھ اشارے کر رہے ہیں اور موٹر کے آگے جس کو غالباً بہت کم لوگوں نے دیکھا ایک پوسٹر چپکا ہوا جس میں لکھا ہے "مولوی مدن دست بردار نہیں ہوئے"

اس تماشے کے بعد ہم سب ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہوئے اور یہ معلوم کرنے کیلئے بے چین تھے کہ واقعہ کیا ہے تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ پھر ایک غول نمودار ہوا جو چلا رہا تھا "مولوی مدن دست بردار ہو گئے"

سوچ بچار میں وقت گذر رہا تھا اسی لئے سبھوں نے تصفیہ کیا کہ مولوی مدن سے خود دریافت کر لیا جائے اسی لئے جو مقام اوٹ دینے کیلئے مقرر ہوا تھا۔ وہاں سب کے سب پہنچے لیکن وہاں مولوی مدن کا پتہ نہ تھا البتہ ان کے "مدمقابل" ایک اونچے مقام پر کھڑے بہ آواز بلند کہہ رہے تھے "مولوی مدن میری تائید میں دستبردار ہو چکے ہیں اسی لئے ان کی بجائے مجھے اوٹ دیجئے" جو اصحاب ان کے گرد جمع تھے وہ "مولوی مدن کا ایثار قابل رشک ہے" کے نعرے لگا رہے تھے ہمارے ساتھیوں کو اور بھی تردد ہوا۔ اسی لئے سبھوں نے ہم زبان ہوکر پوچھ ہی لیا۔ لیکن مولوی مدن نے خود اپنی موٹر پر پوسٹر لگایا تھا کہ وہ دست بردار نہیں ہوئے" یہ سوال سب ہی کے دلوں میں موجود تھا لیکن کوئی پوچھنے کی جرات نہ کرتا اب جو پوچھ لیا گیا تو سب گوش برآواز ہو گئے۔ "مدمقابل" نے اس اہم ترین سوال کے جواب میں ایک نمائشی قہقہہ لگایا۔ اور کہا " او ہو تو آپ سب حضرات اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں اچھا ہوا جو آپ نے دریافت فرمالیا۔ اصل بات یہ ہوئی کہ کاتب کی غلطی سے بجائے "مولوی مدن دستبردار ہو گئے" کے "مولوی مدن دست بردار نہیں ہوئے" پوسٹر پر درج ہو گیا۔ ہم میں سے اکثروں کو کاتب کی غلطیوں کا ذاتی طور پر تجربہ تھا اسی لئے ماننا ہی پڑا کہ فی الواقعی

مولوی مدن دست بردار ہو گئے۔

دوسرے دن جب انتخاب کا نتیجہ شائع ہوا تو مولوی مدن کے نام کا پتہ نہ تھا اور ان کے "مد مقابل" کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ انہیں بہ اتفاق آرا کامیابی ہوئی۔ یہ دیکھ کر مولوی مدن کی حالت غیر ہوئی اور قریب تھا کہ ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ دوستوں کی بے وفائی پر انہیں بڑا ہی غصہ آیا مگر باوجود اس کے وہ موقع پر پھر کھڑے ہونا چاہتے ہیں اور انہیں اپنے انتظامات پر یقین ہے کہ اب کی دفعہ وہ بہ اتفاق آرا منتخب ہونگے۔

سمندر کا راز

(آنسہ فاطمہ جعفر منشی فاضل لکھم پور)

شام کے خوبصورت اور نشاط آگیں وقت میں ——— بہار کی سحر افزا شعریت ——— میری روح کو بیدار کر دیتی ہے ——— میں مسحور ہو کر نیلگوں سمندر کی بے پایانی کی طرف ——— دیکھنے لگتا ہوں ——— تو ——— تمام قدیم افسانے ——— اور میرے خوابہائے از شیں پیش نظر پھر جاتے ہیں ——— وہ قدیم چمکدار خوبصورت بادباں ——— وہ صندلی رستے ——— چشم خیالی میں سطح آب پر ——— پر جگمگانے لگتے ہیں ——— ملاحوں کی نغمہ سرائی کی بازگشت ——— ایک ملایم بہاری نغمہ کی طرح سطح سمندر سے ٹکراتی ہے جس طرح لاتبی سفید موجیں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے ساحل سے ...... آہ یہ کیسی کا اشنٹ کا خوبصورت چھوٹا جہاز خشکی کی طرف تیرتا ہوا نظر آرہا ہے ——— اس کی روح ——— جذبات اور احساسات سے لبریز ہے وہ بیخودی کے عالم میں ——— نغمہ سرا ملاحوں سے ——— "سمندر کا راز" دریافت کرتا ہے ——— ہاں ——— ہاں ——— صرف وہی لوگ ——— "بحر حیات کی وسیع موجوں کا راز" سمجھ سکتے ہیں جو اس کے خطرات کے متحمل ہونے سے نہ گھبرائیں ——— ان کا دل مضبوط ہو اور بہادر ———

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(ترجمہ لانگ فلو)

وجدانیات

(جناب سکندر علی صاحب وجد عثمانیہ)

کیا بتاؤں تجھے میں کیا ہے تو　|　میرے جینے کا آسرا ہے تو
میں تو سایہ نہیں ہوں کچھ تیرا　|　اپنے سایہ سے کیوں خفا ہے تو
راز الفت نہ فاش ہو جائے　|　مجھکو شرما کے دیکھتا ہے تو
میں کہاں منت طبیب کہاں!　|　میرے ہر درد کی دوا ہے تو
وجد طوفان کا پھیر دے دھارا　|　ساتھ تنکوں کے بہہ رہا ہے تو

صہبائے محبت سے میں سرشار رہا!　|　دل جلوۂ امید سے پرنور رہا
دنیا کی ہر اک شئے مرے قدموں میں رہی　|　اور میں تیرے قدموں سے سدا دور رہا

اشتہار حاضری مدعی علیہ مرتبہ عدالت دیوانی ضلع نظام آباد۔ واقع ۲۴ فروردی ۱۳۴۴ف نمبر مقدمہ ۸۱ ۱۳۴۴ف باجلاس نواب میر عباس حسین خاں صاحب ناظم عدالت ضلع نظام آباد۔ نرساگوڑ۔ مدعی **بنام** پنا لال

دعوے دلاپانے زر نقد مبلغ سمہ روپیہ

بنام پنا لال ولد نومی لال قوم مارواڑی عمر ۳۰ سال پیشہ منیب دوکان منشی لال امیر چند سیلو ساکن حال بو اسٹیشن پربھنی مالک دوکان گمر چند پنا لال نظام آباد۔

ہرگاہ مقدمہ صدر میں تمہارے نام اطلاع نامہ جاری ہوا جو تمہاری عدم موجودگی کے باعث مکان پر تعمیل پایا ہے اور تم حاضر نہ ہوئے۔ بنا برآں حسب استدعا مدعی ذریعہ اشتہار ہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اب تاریخ پیشی ۲۳ اردی بہشت ۱۳۴۴ف روز پنجشنبہ واسطے سماعت مقدمہ کے مقرر ہوگئی ہے تم اس تاریخ پر حاضر عدالت ہذا ہوکر پیروی و جوابدہی کرو۔ بصورت غیر حاضری تمہارے کارروائی ضابطہ عمل میں آئیگی اور پھر کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔

آج بتاریخ ۲۴ فروردی ۱۳۴۴ف بہ ثبت میری دستخط اور مہر عدالت کے جاری کیا گیا۔ فقط　مہر و دستخط ناظم عدالت ضلع۔

چاء

ایک خاتون کے قلم سے

تھرماس سے ہاتھ میں جب آئے ساحرہ | محفل میں شور ہو کہ چلے چائے ساحرہ
دیکھو سنبھل چلو کہیں انداز و ناز میں | پیالی کہیں نہ ہاتھ سے گر جائے ساحرہ
منہ پھیر لے نہ رند کا ساغر کو گرا کے | اکبار چاء پلا کے جو گرمائے ساحرہ
کیا جشن عید ہو نہیں قسمت کے زور سے | ٹھیکہ کہیں جو چاء کا ملجائے ساحرہ
ساقی نہ مے سے لاج نہ مینا کی چاہ ہے | وارفتگان چاء ہیں دے چائے ساحرہ
آباد چاء خانے ہیں ہوٹل ہیں دور چاء | پیالہ اسی نوید میں چل جائے ساحرہ
بادل امنڈ رہے ہیں چلے دور ساقیا | خواہش ہے صرف چاء کی ملجائے ساحرہ
پیتا بلا کا ہوں نہ کبھی سیر ہو سکا | تلچھٹ ہی چاء کی مجھے ملجائے ساحرہ
ٹی پاٹ دیکھ دیکھ کے دل باغ باغ ہے | ہے دل گداز قلقل مینائے ساحرہ
آنکھیں ہیں تیری یا کہ ہیں دو پیالے چاء کے | رندان چاء جو سنتے ہیں پائے ساحرہ
چمچوں کے گونج نغمہ شیریں نوا سے ہے | چاء نوش کے جو کان میں پڑ جائے ساحرہ
منصور کو ہوا لب گویا پیام موت | کہتا جو چائے ہوتا نہ رسوائے ساحرہ
فرہاد جوئے شیر پہ دیدے نہ جان اسے | اے کاش! جوئے چاء ہی ملجائے ساحرہ
زاہد خیال و خواب شراب طہور ہے | میکش کجا! شراب الجھا جائے ساحرہ
ہر برگ چاء پہ نام ہے تیرا لکھا ہوا | پتے جہاں میں بکھرے ہیں اسمائے ساحرہ
مجنوں خیال طرۂ لیلیٰ سے کیا ہے قیس؟ | سودائے زلف چاء ہی ہو جائے ساحرہ
سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے | مژگان برگ چاء ہیں برمائے ساحرہ
پتوں نے خوب رنگ جمایا جنون کا | دوڑی رگوں میں ہو گیا سودائے ساحرہ
"اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے" | جو تو ہے میں ہوں اور جو میں چائے ساحرہ
نکہت میں گل تو شہد کی رنگت لئے ہوئے | کچھ سلسبیل سے نہیں کم چائے ساحرہ

وارفتگانِ محبت

۹

آپ جس ملک اور جس قوم کے لٹریچر پر نظر ڈالئے تو اسے حسن و عشق، سوز و گداز سے تہی دست و بے مایہ نہ پائیں گے۔ اہل یونان نے تو اس پر اس قدر توجہ کی کہ مذہبی روایات سے لیکر معاشرتی واقعات تک اس میں ڈبوئے ہوئے ہیں لیکن ان اقوام میں عرب جیسا عشق اور جذبہ کسی قوم میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا۔ پھر سینکڑوں ایسے ہیں جو حقیقی طور پر لیلیٰ و مجنوں کے مدعی اور وہ —

"عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد ‏ ‏ ‏ من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را"

کی صدائیں لگا رہے ہیں۔ البتہ لیلیٰ و مجنون نے نجد کے بیابان سے نکل ہندوستان کی سرزمین میں اپنے جذبات کا تعارف کرایا ہے اور بہت کچھ مقبولیت اور ہمدردی حاصل کرلی ہے۔

مگر ہم آج عرب کی سرزمین سے ایسی دو وارفتہ محبت کے حالات قلمبند کرتے ہیں کہ جن کے واقعات درد و اثر سے لبریز اور سوز و گداز سے معمور ہیں۔

جہاں عرب کا ہر مرد شاعر اور پھر لطیف شاعر ہے وہاں عرب کی لڑکیاں بھی اسی جامے کی جرعہ نوش ہیں اور وہ وہ لطیف استعارات اور کنایات میں درد دل کا اظہار کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

قبیلہ بنی عذرہ تمام عرب میں حسن و عشق کے لحاظ سے ایک نمایاں امتیاز رکھتا ہے جس طرح ان کی ناز آفریں لڑکیاں حسین و پاکباز ہوتی ہیں اسی طرح ان کے لڑکوں میں بھی عشق کے اثرات نے شاعرانہ ذوق پیدا کردیا تھا۔ اسی قبیلہ کے ایک اعلیٰ خاندان کی ناز پروردہ پاکباز عفت شعار لڑکی بثینہ بنت حبا ہے جو اپنے قبیلہ کی تمام لڑکیوں میں بلحاظ رعنائی و دلربائی نمایاں خصوصیت رکھتی تھی جس کے اشاروں پر چلنے کو ہر لڑکی اپنا فرض اولین سمجھتی تھی۔

ناز آفریں بثینہ کی تابش حسن نے بچپن ہی میں اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان شاعر جمیل بن عبد اللہ نے

خرمن صبر و شکیب کو نذر خاکستر کر دیا تھا۔ اس عشق کی داستان رنگین یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن جمیل حسن و عشق کے جھگڑوں سے بےفکر و آسودہ اپنی اونٹنیوں کو چراتا ہوا علاقہ بغیض کی ایک وادی میں جا نکلا اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا جن میں سے کوئی تو چرنے لگی اور کوئی جگال کرنے۔ اور آپ ایک صاف و پاک جگہ لیٹے ہوئے اونٹوں کے مظاہرہ میں مشغول تھا۔ اتفاق وقت دیکھئے کہ اوسی وادی کے دوسری جانب بثینہ کے قبیلہ کا پڑاؤ تھا بثینہ ایک ہمسن سہیلی کو ساتھ لئے پانی بھرنے آتی ہے اور راستہ میں اونٹوں کو بیٹھا ہوا دیکھکر طبیعت میں چہل پیدا ہوتی ہے اور اس سے بیخبر کہ یہ اونٹ کس کے ہیں نتیجہ سے غافل اونٹوں کو چھیڑتی ہے اور وہ بے اختیار بھڑک اوٹھتے ہیں اور ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں اور جمیل اپنے اونٹنیوں کی محبت میں چھیڑنے والے کو گالیاں دینے لگتا ہے۔ بثینہ یہ دیکھ کر کہ وہ ہدف ملامت ہو رہی ہے سامنے آکر ایک کی ستر سناتی ہے لیکن نظارہ حسن سے جمیل کچھ ایسا کھو جاتا ہے کہ باوجود گالیاں سننے کے بثینہ کی بگڑی اداؤں میں وہ شان دلربائی پاتا ہے کہ رونمائی میں دل سا جیسا وقیع تحفہ بطور نذرانہ پیش کر دیتا ہے۔

چنانچہ آغاز محبت کو خود جمیل اس طرح بیان کرتا ہے (جس ادا نے پہلے پہل ہم دونوں میں محبت کی لہر دوڑا دی وہ آئے بثینہ تیرا کوسنا تھا)

شاعر اور عرب کا شاعر اور جمیل جیسا وارفتہ اب رہا کس سے جاتا اپنے بیتابیوں اور جگر صد زخم کے چرکوں کو اشعار میں ظاہر کرنے لگا۔ یہاں جمیل کی زبان سے کوئی شعر نکلا وہ اہل زبان میں قبولیت حاصل کرلیا۔ بہت تھوڑے دن نہ گذرے تھے کہ سارے عرب میں بثینہ کے عشق کا راز طشت از بام ہو گیا روز بہ روز ان کی شوریدہ سری میں اضافہ ہی ہونے لگا۔ آبادی سے نفرت ویرانی سے محبت بڑھنے لگی۔ ہر صحبت اور ہر مجلس اوس کے لئے تکلیف دہ تھی وہ تھا اور بثینہ کا گلہ وہ تھا اور بثینہ کی یاد

جمیل کے والدین اپنے اکلوتے لڑکے کی حالت سے پریشان ہو گئے۔ بیسیوں تدبیریں لاکھوں جتن کئے ایک بھی کارآمد نہ ہوئی۔ جب حالت بد سے بدتر دیکھی تو بثینہ کے والدین کو پیام بھیجا لیکن وہاں سے جواب ملا کہ ایسے بدمعاش کو اپنی لڑکیاں دینا اپنے آپ کو رسوا کرنا ہے جس کو اتنا تک احساس نہیں جو تشبیب میں غیر کی بہو بیٹیوں کو رسوائے عالم کر رہا ہے۔"

ستم تو یہ ہوا کہ جمیل کا درد دل پوچھا جاتا یا اوس کے ساتھ ہمدردی کی جاتی یہ کیا کہ نبیہ بن اسود سے جبراً عقد ثبینہ کا عقد کر دیا کہ چلو جھگڑا طے ہوا۔ لیکن اونہیں کیا خبر تھی۔

تعذیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

محبت جب کبھی آتی ہے تو وہ بے حجاب آتی ہے وہ کسی قید و بند کی پابند نہیں آپ لاکھ کوشش کیجئے لیکن اور اضافہ ہی ہوتا جائیگا کیونکہ "یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے" آخر اس عقد کی خبر نے جمیل کو اور بھڑکا دیا اور رات دن ثبینہ کے ملنے کی فکر میں اوس کا محبوب مشغلہ تھا۔

محبت کے درس اولین کے بعد جمیل کو دوبارہ دیدار یار کا موقع نہیں ملا وہ اسی تلاش و جستجو میں بے تکان گردشیں کرنے لگا لیکن منزل مقصود کا کہیں پتہ نہ تھا وہ اپنی مجبوریوں۔ لاچاریوں پر اوداس و غمگین رہتا تھا۔ عرب میں پہلے یہ ہوتا تھا کہ لڑکیاں بھی بن سنور کر عید گاہ جاتیں اور دوگانہ ادا کرتیں اپنے دوستوں اپنے عزیزوں سے بے تکلف ملتیں۔ جمیل کے برگشتہ قسمت نے ایک دفعہ یہ موقع اوسے دیدیا۔ جمیل بن معمر کے عید گاہ پہنچا دیکھا کہ ثبینہ اپنی رازدار بہن ام الحسنین کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے جمیل کو آتا ہوا دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوئی اور پاس ہی جگہ دیگئی باہمی کرب و بیقراری کی داستانیں سنائی گئیں۔ دیر تک لطف صحبت حاصل رہا جمیل نے انتہائی کوشش کی کہ آج کی ملاقات کا حال افشا نہ ہو لیکن عشق و مشک کبھی پنہاں نہیں رہ سکتا آخر میں راز فاش ہو گیا قبیلہ والوں نے ثبینہ کو تاکید کر دی کہ خبردار آئندہ اس شریر سے کبھی نہ ملنا۔ لیکن اس نے بھی قسم کھائی کہ چاہے کچھ ہو جمیل سے ضرور ملا کریگی۔

اب تو جمیل کی بیتابیاں بڑھنے لگیں اور کسی پہلو اوسے قرار ہی نہ آتا وہی لمحہ حیات آفریں ہوتا کہ جس میں ثبینہ کے دید سے دل بیقرار کو سمجھاتا تھا۔ یہ وارفتہ نوائی - یہ کرب و بیقراری ثبینہ سے بھی نہ سنی جاتی وہ کڑھتی اور دل مسوسے رہجاتی لیکن باوجود اس قدر نگرانی اور قید و بند کے جب کبھی جمیل سے ملنے کا موقع نکل آتا وہ اس کو خالی جانے نہ دیتی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ثبینہ کے والد اور بھائی نے یہ ارادہ کر لیا کہ چھپ کر داستان سنیں اور ان کی محبت میں لغزش دکھائی دے تو فوراً قتل کر دیں یہ تہیہ کر کے جہاں جمیل اور ثبینہ ملنے والے تھے پہنچ گئے اور تلواریں

علم کو کے چھپ رہے۔

آخر دونوں آتے ہیں اور باہمی شکوہ و شکایت کے دفتر کھلتے ہیں۔ جمیل آج ہمیشہ کے خلاف اپنی پری تمثال سے نہایت حسرت و آرزو کے ساتھ کہتا ہے۔ "آہ! بثینہ تم میری آہ و زاری سنتی ہو، میری بے تابیوں اور بیقراریوں کا تماشا دیکھتی ہو۔ لیکن میرے حال پر اب تک رحم نہ آیا۔ اور میری محبت کی جیسی چاہیے ویسی قدر نہ کی۔"

بثینہ نے کہا! "آخر بتاؤ میں کیا کروں تمہاری محبت کی اور کس طرح قدر کروں"

جمیل نے کہا: "جس طرح عورتیں اپنے چاہنے والوں کی قدر کرتی اور ان کی تمناؤں کو کامیاب بناتی ہیں۔"

یہ جواب سن کر بثینہ مبہوت متحیر۔ دور کھڑی ہو جاتی ہے اور نہایت کڑے تیور سے کہتی ہے: "اگر تمہارے محبت کی یہی غرض ہے تو یہاں سے ہٹ جاؤ۔ مجھے اپنی صورت نہ دکھاؤ۔ خدا کی قسم میرے دل میں تمہاری جانب سے کبھی اس کا شائبہ نہیں گذرتا تھا۔ میں ایک شریف عرب کی بی بی ہوں اور گناہ سے ڈرتی ہوں۔ اگر پھر کبھی تمہاری زبان سے ایسے الفاظ نکلے تو یاد رکھو کہ زندگی بھر تمہیں اپنی صورت نہ دکھاؤں گی۔"

یہ الفاظ سن کر جمیل کا چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے۔ "خوش بثینہ۔ پاکباز بثینہ میں نے فقط تمہارا امتحان لینے کے لئے اس تمنا کا اظہار کیا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ تم میری آرزو کے پورا کرنے کی ذرا بھی حامی بھر لیتیں تو میرا دل ٹوٹ جاتا اور اسی تلوار سے تمہارا سر اڑا دیتا اگر اس کا موقع نہ ملتا تو تمہیں چھوڑ کے کہیں اور چل دیتا تاکہ دوبارہ تمہاری صورت نہ دکھائی دے۔ میری محبت ناپاک ہوا و ہوس سے کوسوں دور ہے جس کو میں نے اپنے اشعار میں بارہا بیان کیا ہے۔" یہ کہہ کے اسی مضمون کے چند شعر سناتے باپ اور بھائی ان دونوں کی محبت سے متاثر ہوئے اور اپنی تلواریں نیام کر لیں اور گھر چلے گئے کہ ایسے پاکبازان محبت کی الفت میں مزاحمت کرنا انتہائی ظلم ہے۔

لیکن روز بروز قبیلہ کے طعن اور بدنامی کے خیال سے بثینہ کو جمیل سے ملاقات کرنے میں مزاحم ہوا کرتے تھے۔ لیکن لاکھ روک اور بندش سہی لیکن بثینہ کو جب کبھی معلوم ہوا کہ جمیل فلاں وادی میں ہے وہ کسی نہ کسی بہانہ پہنچ ہی جاتی اس سے بدلہ چاہے مصائب کا پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑتا۔ بثینہ کے قبیلہ والوں نے نبد شوں میں اور زیادہ سختیاں شروع کر دیں جس کے سبب جمیل کو ملنے میں اور بھی دشواریاں بڑھنے لگیں۔ قاصد

تلاش کرتا ہے کوئی ملتا نہیں بیسود گردشیں کیں لیکن ملنے کی کوئی صورت ہی نہیں نکلتی۔

عالم یاس میں سر جھکائے دیدار یار کی دید میں متفکر تھا کہ جمیل کا ہمعصر شاعر کثیر کا اس طرف گذر ہوا جو جمیل کی طرح عزہ نامی نازنین کا شیفتہ اور دیوانہ تھا جمیل نے نہایت مسرت سے پوچھا کہ کثیر کہاں سے آرہے ہو اور کدھر کا قصد ہے؟ جواب دیا کہ بثینہ کے باپ کے پاس سے آرہا ہوں اور عزہ کے شوق دید میں جارہا ہوں جمیل نے کہا للہ میرا اتنا کام کرتے جاؤ تو بڑا احسان ہوگا۔ میری بیتابیوں کی خبر کسی طرح بثینہ کے کانوں تک پہنچا دو اور کسی نہ کسی طرح ملنے کا وعدہ لے آؤ پہلے تو کثیر نے انکار کیا لیکن منت وسماجت سے متاثر ہوکر کہنے لگا۔ اچھا یہ تو بتاؤ آخری ملاقات بثینہ سے کب ہوئی تھی جمیل نے جواب دیا کہ بثینہ ایک دن اپنی لونڈی کے ساتھ وادی روم کے ایک تالاب میں کپڑوں کی گٹھری لئے ہوئے نہانے آئی تھی اور جب وہ پانی میں اتر چکی تو مجھ سے نظریں دوچار ہوئیں پہلے اجنبی سمجھ کر گیلی چادر منہ پر ڈال لی اور لونڈی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ جمیل! نام سنتے ہی چہرہ سے چادر الٹ دی اور شام تک بے تکلف باتیں ہوتی رہیں جب جدائی کا وقت آیا تو میں نے پوچھا کہ پھر کب ملاقات ہوگی؟ تو نہایت رنج وحسرت سے کہنے لگی کہ کسے خبر کہ کب ملاقات ہو کیونکہ عنقریب ہمارا قافلہ یہاں سے کوچ کرنیوالا ہے۔ میں لاچار وہاں سے واپس آیا اور آج تک اسی آرزو میں مر رہا ہوں جس کو ایک طویل زمانہ گذر گیا۔ اب اس درد کا علاج تمہارے ہاتھ میں ہے للہ میری دستگیری کرو۔

کثیر نے کہا اچھا جب تک میں پلٹ کر نہ آؤں تم یہیں میرا انتظار کرنا۔ یہ کہکر بثینہ کے باپ کی طرف پلٹ گیا جب بثینہ کے باپ نے مسرت کیساتھ پوچھا کہو اس قدر جلد کیسے آنا ہوا تو کثیر نے کہا کہ اثنائے راہ میں تین نئے شعر ہوئے ہیں جی نہ چاہا کہ بغیر تمہیں سنائے چلے جاؤں! یہ کہکر کہ ان اشعار کو کہ بثینہ بھی سن لیگی کہنا شروع کیا۔ "میں نے عزہ سے پوچھا کہ اپنا قاصد بھیجوں گا تاکہ تو بتادے کہ کب ملیگی اور وصال کے بارے میں تیرا کیا حکم ہوتا ہے آخری ملاقات وادی روم میں ہوئی تھی جب تو کپڑے دھونے جارہی تھی۔ ان اشعار کو سن کر بثینہ بیتاب ہوگئی بے اختیار سینہ پر دوہتڑ لگائے اور کہنے لگی "ارے، رے، رے، باپ گھبرایا ہوا خیمہ میں دوڑا گیا اور پوچھا بیٹی کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ بولی کچھ نہیں! وہی کتا جو لوگوں کے سوجانے کے بعد رات کو پہاڑوں سے نکل کر آتا ہے میری آواز سن کر بھاگ گیا" یہ کہکر اپنی لونڈی سے کہا۔ جا دیکھتی کیا ہے، دوماتہ سے لکڑیاں لے آ تاکہ

ہم ایک بکرا ذبح کرکے اپنے مہمان کو کھلائیں۔ کثیر نے یہ سن کر کہا کہ تمہیں اس تکلیف کی ضرورت نہیں۔ میں فوراً واپس جانیوالا ہوں اسی وقت آکر جمیل سے ساری داستان بیان کردی یہ کیفیت سن کر جمیل بیتاب ہوگیا۔ اچھا تو بثینہ نے جب کہ اوس کے سارے قبیلہ والے رات کو سوجائینگے دومات میں ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر جمیل اور کثیر دونوں دومات پہنچے۔ جب رات نصف گذرچکی تو بثینہ ام الحسنین اور اپنی خالہ زاد بہنیں لیلیٰ اور نجبا کو ساتھ لیکر آگئی۔ دونوں صبح تک خلوص ومحبت سے مصروف تکلم رہے۔ کثیر کہتا ہے کہ میں نے عمر بھر کبھی اس سے زیادہ عفت اور پاکباز کوئی صحبت نہیں دیکھی اور نہ کبھی اس سے بڑھکر سچی محبت کا جلوہ نظر آیا دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے اس قدر واقف تھے کہ جس کے سمجھنے سے ہماری عقل بالکل قاصر تھی۔

غرض جب آفتاب کی سنہری کرنیں نیلگوں آسمان پر چمکنے لگیں دونوں نے بادیدہ پرنم الوداع کہا اور یاس وحسرت سے پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے اپنے خیموں کو واپس گئے۔

اب تو جمیل کے عشق نے جنون کی شان پیدا کرلی تھی راتوں کو بثینہ کے پڑاؤ کے قریب آتا اور پہاڑوں پر یہ نغمہ بلند کرتا "بثینہ کی خوشبو کا کوئی جھونکا لا اور جمیل پر اتنا احسان کر اور اوس کی طرف چل۔" مدتیں اسی عالم میں گذریں تاریک اور بھیانک راتوں میں پہاڑوں کے دامن میں جوش جنوں اور وارفتہ نوازی کی داد دیتا رہا۔ بثینہ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں سے کہتی "ہائے جمیل کے رونے کی آواز آرہی ہے" سہیلیاں کہتیں ہوش میں آؤ جمیل اور یہاں!!

زمانہ گذرتا گیا لیکن ان ہجراں نصیب کو اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہوئی۔ مارا مارا پھرتا ہوا جمیل کا مصر میں گذر ہوا۔ والی مصر نے اوس کو ایک عالیشان مکان میں ٹھیرایا اور خاطر داریاں کیں لیکن سکون قلب یہاں بھی مفقود تھا۔ وہی جمیل تھا اور بثینہ کی یاد۔ اسی عالم میں وہ مہلک مرض میں گرفتار ہوگیا۔ صحت کی انتہائی تدبیریں کی گئیں۔ اتفاقاً سہیل ساعدی ایک اور شخص جمیل کی عیادت کو آئے کیونکہ جمیل کے اشعار کی ہر طرف دھوم تھی۔ سہیل بڑے فقیہہ اور مقتدائے ملت تھے اون کو دیکھ کر جمیل نے پوچھا "فرمایئے ایسے شخص کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے جس نے زندگی بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور نہ شراب پی ہو نہ کسی کی جان لی ہو اور پچاس سال سے اس کی شہادت دیتا رہا ہو کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ! سہیل نے فرمایا میں سمجھتا ہوں کہ بیشک

اوس شخص کی نجات ہوگی۔ مگر ان خوبیوں کا کوئی انسان ہو بھی! ! جمیل نے کہا یہ میں ہوں۔ سہیل حیران رہگئے اور فرمایا کہ جمیل تم! جس نے تمام عمر بثینہ کی محبت میں گذار دی اور اپنے آپ کو ایسا متقی اور پرہیزگار بتاتے ہو۔ جمیل نے کہا میں اس وقت قریب المرگ ہوں جھوٹ نہیں کہوں گا۔ مجھے محمد رسول اللہ صلعم کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ میں نے کبھی بری نیت سے بثینہ کو چھوا تک نہیں۔ وصال میں میرا کام یہ ہوتا تھا کہ اس کے دست سیمیں کو اپنے دل بیتاب پر رکھ لیتا تھا جو میرے لئے سرمایہ راحت و تسکین تھا۔ اس کے بعد پھر وہی کرب بیقراری۔

اس واقعہ کے چند دن بعد بنی احب کے خیموں کے پاس ایک دن ایک شتر سوار آیا اور ٹیلہ پر چڑھکر نہایت المناک سروں میں یہ نوحہ سنایا" بثینہ اٹھ اور چلا چلا کر بین کر اپنے اوس محب پر رو پر جو سب دوستوں سے زیادہ تھا" یہ اشعار کچھ ایسے اندوہگیں اور سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے تھے کہ خیموں سے تمام عورتیں بدحواس نو وارد کی طرف دوڑنے لگیں جس میں حور وش بثینہ سب سے زیادہ مضطرب و بے چین تھی اجنبی کے قریب پہنچ کر بالحاح و زاری کہنے لگی" اے شخص تو اگر سچا ہے تو مجھے تو نے مار ڈالا۔ اگر جھوٹا ہے تو رسوا کر دیا۔ للہ بتا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ اوس نے جواب دیا میں بالکل سچا ہوں جمیل عذری نے ارض مصر میں انتقال کیا۔ وہاں مجھے اوس سے ارتباط ہو گیا تھا جب وہ بیمار ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ زیست کی کوئی توقع نہیں تو ایک دن تنہائی میں مجھے اپنی داستان حسرت سنائی اور التجا کی کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے دفن کے بعد میری اونٹنی پر سوار ہو جانا اور میرا لباس پہن لینا اور قبیلۂ عذرہ سے قبیلۂ بنی احب جانا اور گریبان چاک ہو کر بآواز بلند میرے یہ اشعار پڑھ دینا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ یہ اونٹنی اوسی کی ہے اور یہ قبا بھی وہی ہے۔

اس قدر سننے کے بعد بثینہ کو چین کہاں زور شور سے بین کرنے لگی۔ قبیلہ کی تمام عورتیں اوس کے شریک ماتم تھیں۔ روتے روتے آخر بیہوش ہو کر گر پڑی پھر جب ہوش آیا تو جمیل کی موت پر اپنے اشعار پڑھنے لگی جس کا سلسلہ تین شبانہ روز رہا۔ یہاں تک کہ تیسرے دن اوس کے ماتم میں وہ بھی دنیا سے چل بسی۔ یہ واقعہ سنہ ۸۲ھ ہے۔ اگرچہ دونوں اب موجود نہیں ہیں لیکن اون کا افسانہ حزیں دلوں کو اب بھی تڑپا رہا ہے۔

حقیقتِ پروانہ

اے عاشقِ دل خستہ۔ اے سوختۂ الفت تو رازِ محبت کا اک سالکِ یکتا ہے
رگ رگ میں نہاں تیری ہے آگ محبت کی تو عشقِ مجسم ہے۔ تو حسن کا بندا ہے

تو رہبرِ کامل ہے۔ اس عشق کی منزل میں ہر نقشِ قدم تیرا اک شمع ہدایت ہے
تقلید تیری واجب ہے رہروِ الفت پر یعنی۔ تیرا جل۔ بجھنا اک درسِ محبت ہے

آ۔ دل میں تجھے رکھ لوں اے شیفتۂ الفت تیری ہی طرح میں بھی بیمارِ محبت ہوں
بیخود بھی ہوں مضطر بھی۔ دیوانہ و رسوا ہوں مستِ مئے الفت ہوں۔ سرشارِ محبت ہوں

تو شمع کا عاشق ہے میں شمعِ حقیقت کا تو اس کا ہے شیدائی میں اوس کا ہوں دیوانہ
آ۔ جان فدا کریں۔ جل بجھ کے سرِ محفل رہ جائیگا دنیا میں دونوں کا اک افسانہ

حقیقتِ شمع

۶

تخلیق کا جب میری قدرت کو خیال آیا شبنم سے لئے آنسو۔ بلبل سے لیا نالہ
پھر برق کی بیتابی رکھدی میرے سینہ میں کچھ رنگ شفق کا بھی طینت میں میری ڈالا
تاروں سے ضیا لیکر۔ غنچوں کے تبسم میں یوں کالبدِ نوری سانچہ میں مرا ڈھالا

پھر میری سر محفل روشن ہوئی جب ہستی — ظلمت کدۂ دل میں باقی نہ تھی تاریکی !
خلوت ہو کہ جلوت ہو میں مونس و ہمدم ہوں — تسکین دل عاشق اک ذات ہی میری تھی

گذری ہیں بہت راتیں ایسی بھی میرے سر پر — تا صبح میں کاہش سے روتی رہی جل جل کر
تھی کس کو پڑی میری کرتا کوئی غمخواری — بے تاب رہا شب بھر آخر یہ دل مضطر

آ۔ کان ادھر لانا اک بات حقیقت کی — کہتا ہوں تجھ ہی سے میں کہنا ! کسی سے بھی
ہو جائیگا گر افشا یہ راز محبت کا ! — عالم میں تلاطم ہو بہہ جائے نہ یہ کشتی

قدرت کا یہ منشا ہے ہو سوز میرے دل میں — اوروں کو جلا کر پھر خود آپ ہی جل جانا

جواب پروانہ

کیا مجھ سے مخاطب ہے اے نرگس مستانہ — کس طرح سناؤں میں حال دل دیوانہ
پرسوز ہے غمگیں ہے بسمل ہے محبت میں — منظور ہے گر تجھ کو سن لے میرا افسانہ

تو نور متشکل ہے۔ میں سوز مجسم ہوں — تو شمع منور ہے۔ میں سوختہ ساماں ہوں
کچھ میری حقیقت کو محسوس کیا تو نے ؟ — جلنا میرا شیوہ ہے۔ میں حسن پہ قرباں ہوں

آنکھیں ہیں کہاں ایسی ہوں قابل نظارا — ہاں تیری محبت میں پھرتا ہوں میں آوارہ

آ۔ دونوں باہم مل کر دکھلادیں زمانہ کو تو شمع میرے دل کی میں ہوں تیرا پروانہ

آرزو

مس۔ ایس۔ احمد حسن

میں وابستۂ آرزو ہوں یا سوگوار تمنا ...... ؟ اس میں شک نہیں کہ مجسمۂ آرزو ہوں۔

بلند معبود! میں تجھ سے یہ التجا نہیں کرتی کہ میری تمام خواہشیں پوری ہوں۔ ہاں یہ درخواست ضروری ہے کہ مجھے فراموش نہ کرنا۔ یہ نہیں کہتی کہ دکھ۔ درد۔ سے محفوظ رکھ۔ مگر اپنے سے قریب رکھ! پاداش معصیت میں سزا نہ دے لیکن نظر حقارت سے مت دیکھ۔ رنج والم سے رستگاری ناممکن ہے مگر اطمینان قلب نصیب فرما۔ بادشاہت کی تمنا نہیں۔ لیکن گداگری سے محفوظ رکھ۔ میری ہرگز یہ آرزو نہیں کہ غربا سے بے خبر رہوں مگر مغرور امراء کے آگے میرا سر نہ جھکا۔ بدبخت ہوں لیکن رحمت کی امیدوار۔ تو مجھ سے محبت کر پھر میری ساری بدنصیبیاں دور ہو جائینگی اور میری بقیہ زندگی کے ایام ایک معصوم بچے کی طرح بغیر کسی کاہش اور کاوش کے گذر جائینگے۔ دوست اچھے دوست۔ محض تجھ سے ملنے کی موہوم آرزو پر زندگی کی ساعتیں کٹ رہی ہیں لیکن معبود تو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

پرواز روح میری ہو اس طرح جس طرح پھولوں سے بوگلاب سے شبنم اڑا کرے
کتبہ لحد پہ ہو نہ نشان مزار ہو تربت پہ کوئی آئے نہ آہ و بکا کرے

شکریہ: مس جناب الحاج مولوی رحمت اللہ شریف صاحب اول تعلقدار ورنگل اور محترمہ ح نقوی صاحبہ مس۔ ایس احمد حسن صاحب اور نور الدین خاں صاحب کا جنھوں نے اس مہینہ میں شہاب کے نشر و اشاعت میں کافی دلچسپی لی ہے۔ کیا آپ بھی توجہ کریں گے؟

عرب کی ذہانت اور حافظہ

جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب ایچ سی ایس - ناظم عدالت

یورپین حکومت کے اثرات کے تحت خلیج فارس کے ساحلی مقامات پر عیسائی پادری بھی روحانی حکومت حاصل کرنیکی تدابیر میں برابر کوشاں ہیں تبلیغی کاموں کیلئے بھی روپیہ اور تنظیم کی ضرورت ہے یورپ اور امریکہ والوں کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ بحرین اور اوس کے متصل علاقہ میں امریکن مشن اپنی کارگذاریوں میں مصروف ہے۔ چنانچہ ایک دواخانہ کھول لیا ہے مفت علاج ہوتا ہے۔ مشنری ڈاکٹر گرد و نواح کے مقامات پر دورہ بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیریسن نے اسی مشن کے سلسلہ میں سالہا سال مشرقی عربستان میں قیام کیا۔ عربی زبان سیکھی اور قافلہ کیساتھ ریگستان میں چکر لگائے سلطان ابن سعود نے بھی علاج کی غرض سے ان کو اپنے ہاں بلایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عینی مشاہدات کی بناء پر عربستان کے متعلق ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ رسالہ شہاب کے ناظرین کی خاطر ایک منتخب حصہ کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے عرب کی جس خصوصیت کا ذکر فرمایا ہے وہ نہایت دلچسپ اور تعجب خیز ہے۔

(ترجمہ)

ایک اجنبی مسافر پر جو عربستان میں پہلی دفعہ داخل ہو عرب کی جو خصوصیت سب سے زیادہ اثر پیدا کریگی یہ ہے کہ وہ اپنے مکلف گرد و نواح کیساتھ تعجب خیز طریقہ پر تعاون کرتا ہے۔ وہ قدرت کے گہوارے میں پلا ہوا ہے اور اس کی حالت ظاہری طبیعت پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے۔ میانہ قامت۔ بدن زیادہ تر چھریرا۔ چہرہ پر بھوک برستی ہوتی۔ نمایاں اور تقریباً نوک دار ناک جسمانی منظر کو زیادہ موثر بنانے کے لئے سیاہ اور شاندار آنکھیں بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ نظر سوچ کے اندر گھسی چلی جاتی ہے۔ فربہ جسم۔ اور اپاہج صورت کا عرب کمیاب ہے۔ البتہ شہروں میں جہاں عیش کے سامان زیادہ ہیں ایسی صورتیں نظر آتی ہیں۔ عرب کو شکرہ سمجھو۔ اس کا دبلا پتلا سیدھا اور گٹھیلا جسم مشقت برداشت کرنے کے لئے خاص طور پر بنایا گیا ہے۔ چہرہ کی جھریاں فاقہ کشی اور مصائب کی داستان ہیں۔ یہ صاف بتلا رہی ہیں کہ عرب ان نعمتوں سے محروم ہیں جن کے ہم لوگ عادی ہوگئے ہیں۔

عرب کی قوت برداشت ضرب المثل ہے۔ عربستان میں اجنبی آدمی اونٹ کرایہ پر لیکر قافلہ کیساتھ ہوجاتا اونٹ والا عرب تمام دن ساتھ ساتھ پیدل چلتا ہے۔ گہرے ریگستان اور سنگلاخ راستوں میں سے اونٹوں بانا اسی کا کام ہے۔ اور جب بارہ یا سولہ گھنٹوں کی کٹھن منزل ختم ہوتی ہے تو تکان سے مغربی مسافر کا حال ربسے بدتر ہوتا ہے۔ تمام راستہ پیدل چلتا رہا اور قافلہ کی خدمت بھی کرتا رہا۔ ریگستان کے یہ عرب پیدل ں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اکثر ہرکارے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ دور دراز کی مسافت طے کرکے ضروری خطوط پر پہنچا دیتے ہیں۔ مشرقی عربستان میں حاسا اور قطیف کے درمیان تقریباً سو میل لمبا ریگستانی راستہ ہے ہوں کہ ہرکاروں نے دو روز کے اندر اس مسافت کو طے کیا ہے۔

عرب نہایت اعلیٰ درجہ کا رہبر ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بینائی اور سماعت ہم لوگوں سے بہتر نہ ہو لیکن فطری خصوصیات اور مدت العمر کی مشق نے ریگستان کو ایک کھلی ہوئی کتاب بنا دیا ہے۔ قافلہ چلتا رہتا اور ریگستان کی خبریں بیان ہوتی رہتی ہیں۔

"تین روز ہوئے کہ اس طرف سے ہرنوں کا غول گذرا ہے"۔ "دیکھو اس راستہ سے بھیڑیئے نے تعاقب کیا ہے"۔ یا "اس طرف سے دہاب گذری ہے"۔ دہاب ایک قسم کی سپلاٹ ہے جسے عرب شوق سے کھاتے ہیں۔

بہرحال ریگستانوں اور میدانوں کی حقیقت معلوم کرلینا اُن کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ مثلاً قافلہ کا ایک سوال کرتا ہے "اس نشان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" جواب "چار روز ہوئے کہ ابن خالد کا قافلہ سے گذرا ہے اس کے ساتھ بارہ اونٹ اور پانچ آدمی تھے"۔ سوال "کیا اونٹ خوب لادے ہوئے تھے؟" "نہیں۔ صرف تین اونٹ لادے ہوئے تھے۔ لیکن بار ہلکا تھا۔ دو پر کھجوریں تھیں اور تیسرے پر چاول"۔ ابن خالد کا بہترین سفید اونٹ جس کو اس نے ابن علی سے تین سو ریال میں خریدا تھا لنگڑا ہو گیا ہے"۔ ستائش کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ گھبرایا ہوا مغربی مسافر ان باتوں کو خلاف عقل سمجھتا ہے۔ عرب جس کے ساتھ ریگستان کے سربستہ راز کو نمایاں کرنیکی کوشش کرتا ہے وہ ایک عجیب و غریب بات معلوم ہے۔ اگر کوئی ایسی ابجد تیار کرے جس میں الف ہرن کے اور ب بھیڑیئے کے راستے کی قائم مقام ہو۔

اور ج سے لنگڑے اونٹ کے معنی نکلتے ہوں تو عرب چند گھنٹوں میں اس کتاب کی تحصیل کر لیگا۔

اس خصوصیت میں سب قبائل یکساں نہیں ہیں۔ لیکن المرّہ قبیلے کے لوگ مسلّمہ طور پر اس معاملہ میں ماہر فن تسلیم کئے جاتے ہیں۔ کویت کے ایک انگریز پولٹیکل ایجنٹ کپتان ولیم شیکسپیر نے اس قبیلہ کے ایک رہبر کو پوری طرح آزما کر دیکھا ہے۔ کپتان صاحب نے عربستان کی سیاحت خوب کی ہے۔ ان کے پاس اسمات وغیرہ معلوم کرنے کے آلہ جات بھی تھے۔ سیاحت کے مقامات کا ایک نقشہ بھی ان کے پاس رہتا تھا۔ ایک دن انہوں نے رہبر سے دریافت کیا کہ اگر ہم اس مقام کو جانا چاہیں جہاں ہمارا کیمپ چند روز قبل تھا تو کونسی سمت اختیار کرنی پڑیگی۔

اب تک مسافت سیدھے راستہ سے طے نہیں ہوئی تھی بلکہ بہت چکّر کا راستہ آلہ جات کی امداد سے اختیار کیا گیا تھا اور درمیان میں وقفہ بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ رہبر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ کر سوچنے لگا۔ پچھلے دنوں کی مسافت پر اچھی طرح غور کیا۔

"گذشتہ کیمپ کو پہنچنے کے لئے ہمیں یہ سمت اختیار کرنی چاہئے" اس نے جواب دیا اور یہی سمت آلہ جات سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔

ایک دوسرے موقع پر اس عرب نے اس سے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیا۔ قافلہ کا پانی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ قریب ترین کنواں مایوس کن فاصلہ پر تھا۔ قریب تر کنواں وہی تھا جسے پیچھے چھوڑ آئے تھے اس لئے واپس جانے کے سوا دوسری صورت نہ تھی۔ رہبر نے کہا واپس جانیکی ضرورت نہیں ہے ایسا کرنے سے چار روز ضایع ہو جائینگے اور پروگرام کے مطابق منزل طے کرنے کے لئے ہمارے پاس وقت کم رہگیا ہے اگر خدا نے چاہا تو ہمارے بائیں جانب دو دن کے راستہ پر پانی ملجائیگا۔ کپتان صاحب نے پوچھا "تم کو اس بات کا پورا یقین ہے؟" اب ہمارے پاس دو دن سے زیادہ کا پانی نہیں ہے وہاں جانے کے بعد اگر پانی نہ ملا تو ہمارا خاتمہ ہی ہو جائیگا" رہبر نے کہا "خدا نے چاہا تو وہاں پانی ضرور ملیگا" کپتان صاحب نے اس معاملہ پر غور کیا خیال ہوا کہ اگر یہ دھوکہ دے رہا ہے تو خود بھی پیاسا مریگا۔ الغرض اس پر بھروسہ کرکے قافلہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ معلوم کرنے کے کوئی آثار نمایاں نہ تھے۔ رہبر کی معلومات ذہنی کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ رہنمائی کا نہ تھا۔ دو روز بعد سہ پہر میں رہبر نے کہا "آخر کار ہم پانی کی جگہ پہنچ گئے ہیں" تقریباً سو فیٹ کے فاصلہ پر ایک طرف چند انچ

یا ریت اس نے کھودی۔ وہاں پانی موجود تھا۔ اطراف میں پانی کے کوئی ظاہری آثار ایسے نہ تھے جن کو مغربی آدمی ظر معلوم کر سکے۔ جہاں پانی برآمد ہوا وہ مقام اس وسیع ریگستان میں چند مربع گز سے زیادہ نہ تھا۔ کپتان صاحب نے یا "تم کو اس قیام کا حال کب معلوم ہوا" جواب ملا کہ "میں تین سال قبل اس طرف سے گذرا تھا۔ اتفاقیہ طور پر پانی کا معلوم ہو گیا" سوال "کیا تم اس کے بعد سے پھر کبھی یہاں نہیں آئے" جواب "نہیں۔ نہ قبل نہ بعد"

عربستان میں ایک روایت مشہور ہے اور حالات کے لحاظ سے یہ کچھ تعجب خیز بھی نہیں کہتے ہیں کہ اگر مرہ قبیلے مرد کو آنکھوں پر پٹی باندھکر تین روز کی مسافت پر لیجائیں اور منزل کے ختم پر رات کے وقت ریگستان کے کسی بے ن مقام پر اس کے ہاتھ سے ایک روپیہ دفن کروا دیا جائے تو دس سال بعد بھی وہ اس مقام پر جاکر روپیہ نکال لائیگا۔

علی ساگر

جناب نواب میر عباس حسین خان صاحب بزم ناظم عدالت

بنا دیتی ہے دل کو شاد گلگشت علی ساگر
غموں سے کرتی ہے آزاد گلگشت علی ساگر

انوکھی ہے چمن بندی نرالے سارے نقشے ہیں
دکھاتی ہے نئی ایجاد گلگشت علی ساگر

گرا دیگا نگاہوں سے قسم ہے اپنی جنت کو
کرے گر کوئی دم شداد گلگشت علی ساگر

دل مغموم کو بھی اس جگہ تفریح حاصل ہو
کرے ناشاد کو بھی شاد گلگشت علی ساگر

نکلواتی ہے ہر لب سے دعا یہ دل کو خوش کر کے
رہے یارب نظام آباد گلگشت علی ساگر

یقیناً بلبل شیراز کو بالکل بھلا دیگی!
کنار آب رکنا باد گلگشت علی ساگر

فرشتے کہتے ہیں حسرت سے ہم محروم ہیں افسوس
کیا کرتے ہیں آدم زاد گلگشت علی ساگر

نظر میں بزم کی پھرتی رہے گی ساری کیفیت
نہیں بھولیگی تیری یاد گلگشت علی ساگر

محبت میں نے بھی کی تھی

(جناب ہادی جعفری)

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا　　تیرا آنا نہ تھا ظالم۔ مگر تمہید جانے کی!

میرے قصہ کا تعلق ایک ایسے نوجوان سے ہے جو حال ہی میں کشمیر کی پر لطف سیر کے بعد اپنے شہر کو واپس ہوا ہے بیچارہ ایک رومانس سے نا واقف ہے چونکہ اس کے نام کا اظہار کرنا موزوں نہیں اس لئے اس کو آئندہ سے کشمیری نوجوان سے مخاطب کیا جائیگا۔

میں ایک نوجوان ہوں اور پھر قدرت کا یہ کس قدر احسان عظیم ہے کہ فطرتاً شاعری سے بھی مجھے ذوق ہے اگر ان نظموں کو جو میں نے کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کی ساعتوں کو پر لطف بنانے کیلئے لکھی ہیں یا مذاحاً کسی دوست اور ہمتا کی شان میں پیار ہجو کہی ہے ایک جگہ اکٹھا کر لوں تو بیشک صاحب دیوان کہلانیکا مدعی ہو سکتا ہوں۔

چونکہ آپ میری شاعری سے زیادہ واقف نہیں اس لئے اس کا قلم انداز کرنا بہتر ہے۔ مگر میری نثر کا نمونہ آپ کے سامنے موجود ہے جس سے آپ میری طرز نگارش کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

واقعہ صرف یہ ہے کہ میں اپنی دلی بیتا بیوں سے اکتا کر اک راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں جو مدتوں سے مجھے بے چین اور میری زندگی کو تلخ بنایا ہوا ہے۔

جہاں میرے حلقہ احباب میں کثیر دوست تھے وہاں اس سے کہیں زیادہ لڑکیاں میرے وقت کو شیریں تر بنایا کرتے تھے اور میں انہیں محبت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا اور وہ بھی اپنی محبت ریز نظروں سے مجھے دیکھنے میں کبھی متامل نہ تھیں۔ ان کا تو مجھے کبھی پتہ نہ چلا کہ مجھ میں ایسی کونسی خوبی تھی کہ اکثر تبہ مجھے دیکھ لینے کے بعد ہر لڑکی خود بخود میرے جانب کھنچی چلی آتی تھی۔ مگر ان تمام میں ایک فیروزہ تھی جس سے دوستی کا سلسلہ تقریباً دو سال سے تھا۔ ہمارے ان بے تکلفانہ مراسم کو ابھی تین ہی ہفتے ہوئے ہوں گے کہ مجھے یہ معلوم ہونے سے بے انتہا صدمہ ہوا کہ وہ اپنے وطن کو جو شہر سے چار سو میل کے فاصلہ پر ہے جانیوالی ہے۔

فیروزہ حسین تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرے قلم میں وہ زور ہے جو میں چاہوں تو کسی کی جیتی جاگتی تصویر الفاظ کے

ذریعہ کھینچ کر رکھ دوں گا مگر آپ باور کیجئے کہ میں نیرذرہ کی اصلی تصویر آپ کے آگے پیش کرنے سے مجبور ہوں اور میرا قلم اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہے صرف اس قدر عرض کروں گا کہ وہ حسین تھی ایسی حسین کہ جیسا کہ باد صبا کے گدگدانے سے پھول ہلکی ڈالیوں پر تبسم دکھائی دیتا ہے یا شبنم کا وہ قطرہ جو ورق گل پر رقصاں نظر آتا ہے منھ غنچہ کی طرح تنگ تھا۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ بیقرارانہ جنبش کا مرکز تھے اوس کے مسکراہٹ میں سفید دانتوں کی جھلک دو آبدار موتیوں کی لڑیاں تھیں اوس کی سادگی اور الہڑپن قدرت کا وہ سبق تھا جو وہ اپنی درس گاہ میں پہلی مرتبہ دیتی ہے جب وہ نیچی نظروں سے کسی کو دیکھ لیتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان حسین چیز نور کے چشموں کو سیاہ پلکیں پردہ بن کر چھپائی ہیں گویا وہ چاہتی ہے کہ اس درس حقیقت سے کوئی واقف نہ ہو اور اس کے خیالات پر پردہ ہی پڑا رہے اگرچہ کہ وہ ملاحت اور صباحت کی کامل حصہ دار تھی لیکن شفاف خون اوس کے نازک لبوں اور گلابی نتھنوں میں شفق کی طرح جھلکتا ہوا نظر آتا تھا گویا شعریت کا چلتا پھرتا پیکر تھا۔ اس کو میری شاعری سے محبت نہیں بلکہ عشق تھا وہ گھنٹوں بیٹھی ہوتی میرے اشعار جھوم جھوم کر سنا کرتی۔ مجھے سنانے میں لطف آتا اور اوس کو سننے میں حظ حاصل ہوتا تھا مگر اس طرح کی زندگی ہم کب تک گذار سکتے ہیں اگرچہ کہ وہ نہایت خلوص اور محبت سے مجھ سے ملتی تھی اور اوس کا ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ جو وقت ان ملاقاتوں میں بسر ہو رہا ہے وہ نہایت مسرور گذرے۔

ایک دن وہ ہمیشہ کی طرح آئی اور یہ المناک خبر سنائی کہ کشمیری نوجوان "عنقریب" واپس ہونیوالا ہے اور وہ اوس کی منگیتر ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ خبر چنداں اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

میں اکثر اوقات اپنے جذبہ محبت سے مجبور ہو کر اس کو اپنے خس پوش جھونپڑہ کی شہزادی پکارا کرتا اور وہ سن کر جواب دیتی "دیکھو مجھے شہزادی نہ کہنا کیا تم نہیں جانتے کہ شہزادیاں عموماً بیوفا اور ظالم ہوتی ہیں" میں یہ جواب دیتا کہ "تم اس قسم کی شہزادی نہیں ہو"

اچھا تو پھر میں بھی تمہیں "شہزادہ بلخ کیوں نہ کہوں" چنانچہ وہ مجھے اکثر اسی نام سے پکارنے لگی۔

جب ہم چاندنی راتوں میں تالاب کے کنارے بیٹھے ہوتے تو میں اس وقت اس کو نہایت دردانگیز لہجہ میں اپنی نظمیں سنانے لگتا جو دن بھر کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتیں جو اس کے جذبۂ محبت [illegible] میرے ارمانوں دل سے نکلا کرتی تھیں وہ سنتی اور ٹھنڈا سانس بھر کر اپنا سر میرے کندھوں پر رکھ دیتی اور اس وقت خود مجھ کو میرا دل

بت آلاپنے لگتا اور میں یہ سمجھتا کہ دنیا میں یہی ایک حقیقی وجود ہے اور مجھ سے زیادہ اس وسیع کائنات میں کوئی خوش نصیب
تا۔

بعض اوقات اوس کو پھر اوسی کشمیری نوجوان کا خیال آجاتا اور وہ میرے پہلو سے مایوسانہ طور پر دور ہٹ جاتی
ی "آہ! شہزادۂ بلخ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں"۔
"ہاں میری حسین اور نازنین فیروزہ میں مانتا ہوں مگر یہ ایک انسانی فطرۃ ہے اور تم مجبور ہو"
میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ اوس کے دل سے کشمیری نوجوان کا خیال دور ہوجائے۔

مگر میں کچھ دنوں سے اوس کو ایک اور شخص زاہد کے ساتھ دیکھ رہا تھا جو غالباً کہیں ملازم تھا۔ فیروزہ سے زیادہ
زیادہ مسن۔ فیروزہ ایک روز مجھ سے کہنے لگی کہ وہ زاہد کے ساتھ شہر سے باہر کسی ضرورت کی وجہ جارہی ہے یہ
مجھے اندیشہ ہوا کیونکہ میں زاہد کے مذاق اور اوس کے حالات سے واقف تھا۔ فیروزہ کو روکنے کی کوشش بے
تھی کیونکہ وہ ہٹ پر آجانے کے بعد کسی کی سنتی ہی نہ تھی۔

اوس کی عدم موجودگی میں میرے دل میں ایک خلا سا پیدا ہوگیا تھا میرے اوقات کا پورا حصہ اس کی یاد
کرنے لگا اور یہ ناممکن سا معلوم ہونے لگا کہ بغیر اوس کے میری زندگی کیسے ہوگی اس سے قبل میں اوس کو محض
دلائی کا ایک کھلونہ سمجھتا رہا کہ یہ بھی اوقات گذاری کا ایک مشغلہ ہے مگر اب . . . . . اب یہ ناممکن تھا وہ
بزم عیش کا ایک سرور رجام تھی اور میری روحانی زندگی اوسی سے وابستہ تھی۔ کاش مجھے ابتدا ہی سے یہ علم ہوتا
ی بھر کا عیش میرے حصہ میں اور برسوں کی حسرتیں "کشمیری نوجوان" کی قسمت میں ہیں تو میں یہ سودا ہی کیوں
بنا۔

اوس کی باتیں رہ رہ کر یاد آتیں تو دل پر ایک چوٹ لگتی اوس کے بار بار چھیڑنے میں مجھے لطف آتا کیونکہ وہ بگڑ
تی "دیکھو تم مجھے اس طرح چھیڑوگے تو میں تم سے نفرت کرنے لگوں گی اور تمہیں مجھ سے محبت ہے تو بہتر ہے کہ تم
سرے سے علیحدہ ہی رہیں غالباً میں جس سے منسوب ہوچکی ہوں اوس کے بعد تم ہی ایک ایسے ہیں جنھوں نے
یار کیا ہے میں سخت پریشان رہتی ہوں کہ ہماری اس ملاقات کا نتیجہ آخر کیا نکلیگا۔ یہ رنج وغم کا کہیں پیش خیمہ
۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہی رہیں"

"خیر اس ذکر کو چھوڑو۔ میں محض تم سے دل لگی کر رہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ محبت کہتے کس کو ہیں"۔
"اور ابھی تم جو تھوڑی دیر پہلے کہہ رہے تھے کہ تم کو مجھ سے محبت ہے آخر اس کا مطلب کیا تھا"
"وہ یوں ہی ایک مذاق تھا۔ محبت بیوقوف کرتے ہیں عقلمندوں کا یہ شیوہ نہیں"
اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے وہ زاہد کے ساتھ باہر چلی گئی۔ اب میری حالت بالکل بدل چکی تھی کالج کی فضاء سے مجھے کچھ دلچسپی نہیں رہی۔ کلب جانے سے نفرت تھی۔ دوسری لڑکیاں اپنی دلربائیوں اور رعنائیوں سے مجھے لبھانے کی کوشش کرتیں مگر ان کی یہ کوششیں میرے لئے کوئی مفید ثابت نہ ہوتیں۔ میری امیدوں آرزو۔ تمناؤں کا تنہا مرکز فیروزہ بس فیروزہ تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر ایک دوست نے مشورہ دیا "تم کسی کام میں مشغول ہو جاؤ تو دل سے اوس کا خیال جاتا رہیگا" لیکن میری حالت اوس مجنوں کی تھی جو ریت سے کاغذ اور انگلی سے قلم کا کام لے کر خاطر ناشاد کی تسلی کیلئے لیلیٰ کو خطوط لکھا کرتا تھا مگر احباب مصر ہی رہتے تھے کہ کب تک یہ حالت رہیگی۔ خدارا کبھی تو ہوش میں آؤ۔ ایک دن کشاں کشاں احباب مجھے ایک رقص گاہ میں لیگئے کسی وجہ سے اس دن رقص موقوف تھا مگر صرف ایک لڑکی رقصاں تھی لوگ حیرت سے اوس کی طرف دیکھ رہے تھے اچانک ہال کا دروازہ کھلا دیکھتا کیا ہوں زاہد اور فیروزہ ہاتھ میں ہاتھ دئے کھڑے ہوئے ہیں۔ زاہد نے مینیجر کو آواز دی اور دروازہ بند کر لیا میں متحیر تھا میرا تو یہ گمان تھا کہ حقیقت میں فیروزہ کہیں باہر گئی ہوئی ہے میں یہ دیکھ کر زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ باہر نکل گیا اور ایک کونے میں کھڑے رہا جب مینیجر ادھر سے گذرا تو اوس سے دریافت کیا کہ جن صاحب نے تمہیں ابھی بلایا تھا وہ کون ہیں"
مینیجر نے کہا "صاحب وہ غالباً شادی شدہ ہوں گے"
کیا اس سے پہلے بھی وہ کبھی یہاں آئے تھے۔؟
جی ہاں وہ صاحب تو اکثر آتے ہی ہیں مگر وہ لڑکی آج سے پہلی مرتبہ کبھی یہاں نہیں آئی۔
یہ دونوں کمرہ نمبر (۸) میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔
معاف کرنا میں نے تمہیں تکلیف دی۔ مینیجر مسکراتا ہوا چلے گیا۔
میں اوس کمرہ کی طرف بلا تامل چلا۔ بغیر آواز دئے اندر داخل ہو گیا۔ زاہد کا ہاتھ فیروزہ کے گلے میں تھا سامنے

سامنے میز پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی فیروزہ مجھے دیکھتے ہی بے اختیار چونک اٹھی اور چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔
زاہد نے پکار کر کہا "اس مداخلت کے کیا معنی ہیں اور آپ یہاں کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟"
میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا "میں آپ کے کمرہ کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ غالباً آپ کی شادی حال ہی میں ہوئی ہے بہتر ہوتا کہ آپ باہر ایک بورڈ آویزاں کردیتے کہ کوئی صاحب بیجا مداخلت نہ کریں۔ معاف کیجئے۔"
"خیر جو کچھ ہوا۔ براہ مہربانی آپ باہر جائیے۔"
میں نے پوچھا "کیوں؟"
میں اوس کی طرف بڑھا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئے حالانکہ زاہد مجھ سے زیادہ طاقتور اور قوی تھا۔ اس وقت نہ جانے مجھ میں کس بلا کی طاقت آگئی تھی کہ میں نے زاہد کو بہت بری طرح دے مارا۔ وہ بیہوش زمین پر گرا اور میں نے بے اختیار آواز دی "کشمیری نوجوان" آ اور میری داد دے کہ میں نے تیری فیروزہ کو بچالیا ہے مگر فیروزہ کے قریب گیا وہ پریشان اور مشوش تھی۔
"بیوفا شہزادی چلو میرے ساتھ گھر چلو" "پہلے زاہد کی خبر لو وہ بیہوش ہے"۔ یہ پہلا جملہ تھا جو اوس کی زبان سے ادا ہوا۔ ہم نے پانی چھڑک کر اوس کو ہوش میں لانیکی کوشش کی جب وہ بیدار ہوا تو کہنے لگا "میں بالکل تندرست ہوں۔ آپ ان کو اون کے گھر پہنچا دیجئے۔"
"اچھا یہ تو فرمائیے آپ سے اور ان سے کب سے یہ ربط ضبط ہے؟"
"کب سے؟ غالباً یہ پہلی مرتبہ ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو ان سے اس قدر دلچسپی ہے ورنہ میں کبھی مداخلت کی جرارت نہ کرتا۔ مگر فیروزہ ایک نہایت ہی نیک لڑکی ہے۔ جائیے اور اوس کو اس کے گھر پہنچا دیجئے گا"
میں فیروزہ کو موٹر کار میں سوار کرکے لیجانے لگا فیروزہ نے کہا "میں خوش ہوں کہ آپ نے مجھ پر بھروسہ کیا اس خرابی کے ذمہ دار آپ ہیں"
"بھلا اس کی ذمہ داری مجھ پر کیسے؟"
"آپ ہی کے اشعار نے میرے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ آپ ہی کے افسانہ محبت نے مجھے آپ سے بدظن کیا۔ یاد ہے وہ جملہ "محبت بیوقوف کرتے ہیں، عقلمندوں کا شیوہ نہیں"!

اس طرح ہماری والہانہ محبت کا خاتمہ ہوگیا ۔ مجھے اب تک اوس کا خیال ستا تا ہے کسی اور لڑکی میں یہ کشش نہیں کہ وہ مجھے اپنا بنا سکے ۔ میں نہیں سمجھ سکتا کسی اور کو فیروزہ پر ترجیح دے سکونگا ۔ میری محبت نہیں بلکہ ایک دیوانگی ہے اور اس دیوانگی کا علاج محض فیروزہ کے دست عیسوی میں پنہاں ہے ۔

آہ ! میرے نادیدہ کشمیری نوجوان ! دیکھ میں فیروزہ کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں آ ۔ اور اوس کا استقبال کر ۔ آ اور محبت بھرے دل سے اس کی پذیرائی کر ۔ میری طرح تجھے فردوس کا لطف آئیگا ۔ جب اس کے رس بھرے نازک ہونٹ تیرے ہونٹوں سے مس ہونگے ۔ مگر —— ہاں —— وہ تو مرے لئے ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے لیکن تیری قسمت میں یہ فردوسی عیش ہمیشہ کیلئے لکھا ہوا ہے ۔ تجھے اس جہنم کی آگ سے دور کا بھی تعلق نہ ہوگا جس کے ملتہب شعلوں سے میرا دل اور میری روح پھنکی جا رہی ہے جس کا خمیازہ میں بھگت رہا ہوں ۔ میرے اچھے کشمیری نوجوان " خدا جانے تو کہاں ہے لیکن میری اتنی عرض ہے کہ یہ میرا عزیز ترین سرمایہ محبت ہے جو تیری خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔

اس کے ساتھ انتہائی نرمی اور بے انتہا محبت سے پیش آنا ۔

کیونکہ : ۔ دل ایسی شے کو جب ٹھکرادیا نخوت پرستوں نے بہت مجبور ہوکر ہم نے آئین وفا بدلا ۔ (ترجمہ)

کیوں مجھ کو نہ یاد آؤ گے تم

جناب ابوالفخر سید سلام اللہ صاحب سلام (حیدرآباد دکن)

جب لیلیٰ شب ہو جلوہ آرا — ہو اوج پہ حسن کا ستارا
جب بام فلک پہ ماہ تاباں! — دینے لگے دعوتِ نظارا
ہر ذرّہ چمک اٹھے جہاں کا — فطرت کے ہوں راز آشکارا
چہرہ نظر آئے زندگی کا! — سندر، دلکش، حسین، پیارا
تارے آنکھیں لڑا رہے ہوں — دیکھے ان کو زمانہ سارا!
کیوں دل میں نہ خارِ غم سا کھٹکے — کیوں دھیان نہ ہو مجھے تمہارا

کیوں مجھ کو نہ یاد آؤ گے تم!
مانا کہ رلائے جاؤ گے تم!

جب صبح بہار آ رہی ہو — نزہت آنکھیں بچھا رہی ہو
جب حسن ازل کی دلفریبی — ہر ذرّے میں مسکرا رہی ہو
جنگل میں مور ناچتے ہوں! — کوئل جادو جگا رہی ہو
شبنم آکاش سے اتر کر — پھولوں کا منہ دھلا رہی ہو
شاخیں مستی میں جھومتی ہوں — بلبل باغوں میں گا رہی ہو
اک کیف سرور کی گھٹا سی — ساری دنیا پہ چھا رہی ہو

کیوں مجھ کو نہ یاد آؤ گے تم!
مانا کہ رلائے جاؤ گے تم!

دوشیزۂ شام بن سنور کر — ہو جبکہ افق پہ جلوہ گستر

خورشید غروب ہوتے ہوتے — کھولے رنگینیوں کا دفتر
آجائے حسین وادیوں میں — اک عالم رنگ و بو سمٹ کر
ندیاں چپ چاپ بہہ رہی ہوں — موجیں مارا کرے سمندر
نکہت رقصاں ہو گلشنوں میں — جھونکے ہوں ہوا کے رُوح پرور
سبزے پہ نگاہ لوٹتی ہوا — جنت کا گماں ہو ہر قدم پر

کیوں مجھ کو نہ یاد آؤ گے تم!
مانا کہ رلائے جاؤ گے تم!

دیوانہ بنا دیا ہے تم نے — وہ رنگ جما دیا ہے تم نے
دنیا کو مری مسرتوں کی! — حسرت سے بسا دیا ہے تم نے
اغیار ہنسی اڑا رہے ہیں — نظروں سے گرا دیا ہے تم نے
واللہ کہ میری خدمتوں کا — کیا خوب صلہ دیا ہے تم نے
پھر بھی میں تمہیں کو چاہتا ہوں — وہ نقش جما دیا ہے تم نے
کچھ یاد نہیں سوا تمہارے — دنیا کو بھلا دیا ہے تم نے

کیوں مجھ کو نہ یاد آؤ گے تم!
مانا کہ رلائے جاؤ گے تم!

گاتا ہوں پریم کا ترانہ! — بھولے گا مجھے نہ وہ زمانہ
اک خاص ترنگ لے اڑی ہے — کب سے مرا رنگ عامیانہ
سنسار میں راحتیں کہاں ہیں — کچھ ہیں بھی تو ان کا کیا ٹھکانہ
کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے — بجلی کی نظر میں آشیانہ
تم عشق کے دیوتا سے کہہ دو — خالی نہ گیا تیرا نشانہ
اک لاگ ہے تم سے اور بے لاگ — اک عشق ہے اور والہانہ

کیوں مجھکو نہ یاد آؤ گے تم!
مانا کہ رلائے جاؤ گے تم!

ستی

میری شمع زندگی، موت کے لبوں نے تجھ کو دفعتاً بجھا دیا۔

تیرا شعلہ کشتہ اب مشتعل نہیں ہو سکتا۔

اے محبوب کیا میں اس تاریکی میں زندگی کے دن کاٹوں؟ میرے شجر حیات، موت کے ظالم قدموں نے تجھ کو تیری بیخ تک روند ڈالا ہے۔

تیری عظمت رفتہ اب تازہ نہیں ہو سکتی۔ کیا پھول زندہ رہینگے جب کہ درخت فنا ہو چکا؟ میری جان حیات موت کی تیغ تلوار نے ہم کو ہمیشہ شکستہ لفظ کی طرح جدا کر دیا ہے۔

ہم دونوں کو جو فی الحقیقت صرف ایک ہی وجود تھے۔ دو کر دیا۔ جسم باقی رہیگا جبکہ روح رخصت ہو چکی ہو؟

طوفان مسرّت

اے میرے محبوب! میری آنکھوں کو ڈھانک لے۔ میری آنکھیں جو نہایت درخشاں اور تکلیف دہ روشنی کی طرح انتہائی کیف و محبت سے لبریز ہیں۔

آ! میرے لبوں کو بوسوں سے خاموش کر دے، وہ لب جو نغموں سے اکتا گئے ہیں۔

او محبوب میری روح کو پناہ دے؟

جس طرح پھول کا جمال بارش کی ذات سے فنا ہو جاتا ہے (اسی طرح) میری روح محبت کے بار اذیت سے دبی جاتی ہے۔

آ، میری روح کو اپنے چہرہ میں پناہ دے! (مسز سروجنی نائڈو)

"مجرم"

(جناب سید ابوالفضل صاحب)

تحقیقات کرنیوالے جج کے سامنے ایک نحیف و نزار شخص کھڑا تھا۔ اس کی قمیص پھٹی اور پتلون پر پیوند تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں کان بہت اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اس پر طرہ یہ کہ بدنما داڑھی اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں نے اسے اور کریہہ المنظر بنا دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بالکل ایک مکڑی کا سا دکھائی دیتا تھا اس کے پیر میں جوتا نہ تھا۔

"ڈینس" جج نے کہنا شروع کیا "قریب آؤ اور میرے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جوابات دیتے جاؤ۔ اناں کی رپورٹ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ۷ رجولائی کے دن حلقہ نمبر (۱۴۱) میں تم ریل کے کسی تختے کا اسکرو کھولتے ہوئے گرفتار کئے گئے۔ وہ اسکرو یہ ہے جو گرفتاری کے وقت تمہارے ہاتھ میں تھا ——— کیا یہ صحیح ہے

"کیا بات ہے؟"

"کیا اناں کی رپورٹ کے سارے واقعات صحیح ہیں؟"

"ہاں بالکل یہی ہوا جس کی اوس نے رپورٹ کی ہے؟"

"اچھا! اس اسکرو کے کھولنے سے تمہارا کیا مقصد تھا؟"

"کیا بات"؟

"تمہارے اس 'کیا بات' کو بند کرو اور میرے سوال کا جواب دو۔ تم نے اس اسکرو کو کیوں کھولا؟"

"اگر مجھے اس کی ضرورت نہ ہوتی تو کھولتا ہی کیوں تھا؟" ڈینس نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

"تمہیں نٹ کی ضرورت کس لئے پیش آئی؟"

"کس لئے؟ ہم تو اس سے مچھلی کے کانٹے کو پانی کی تہ میں پہنچاتے ہیں۔"

"ہم سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"یہی ہم —— آدمی . . . . قصبۂ کلمف کے سارے کسان !"

" ادھر سنو ! بیوقوف مت بنو کانٹا ڈبونیکا جھوٹ کیوں کہہ رہے ہو —— سچ کہو !"

" میں نے اپنی عمر میں کبھی جھوٹ نہیں کہا" ڈینیس نے پلک جھپکاتے ہوئے کہا ۔" آپ ہی فرمائیے بغیر کانٹے کو ڈبونے کے کوئی مچھلی کا کس طرح شکار کر سکتا ہے ؟" ڈینیس نے پلک جھپکاتے ہوئے کہا ۔

" فرض کر لیجئے کہ آپ نے کانٹے پر گوشت یا اور کوئی بو والی چیز لگا دی ۔ بھلا یہ تو بتائیے وہ ڈوبے کس طرح ؟ اور آپ مجھے جھوٹا بھی ثابت کر رہے ہیں" ڈینیس یہاں ہنستے ہوئے کہنے لگا " چمکدار کانٹے پر کوئی چیز لگائی جائے اور اسے پانی میں پھینکا جائے تو وہ اوپر ہی تیرتی رہیگی ۔ سامن ، بالو ۔ بام ، شارک یہ سب مچھلیاں پانی کی تہ میں رہتی ہیں ۔ سطح آب پر تو صرف پر کلی رہتی ہے اور وہ عموماً کانٹے کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتی اس کے علاوہ ہماری ندی میں پر کلی بھی تو نہیں وہ تو کھلے پانی میں رہتی ہے ۔"

" تم مجھے پر کلی کے متعلق کیا سمجھا رہے ہو "

" کیا کہا ؟ کیا آپ نے مجھ سے مچھلی کے شکار کے متعلق دریافت کیا ؟ ہمارے ساتھ سارے معزز آدمی اسی طرح شکار کیا کرتے ہیں ۔ چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی تبلا سکتا ہے کہ مچھلی کے شکار میں کانٹے کو ڈبونے والی وزنی شیشے کی کتنی ضرورت پڑتی ہے ۔ ہاں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے اور وہ بغیر وزنی شیشے کے استعمال ہی کے شکار کرتے ہیں —— یعنی احمقوں کو قاعدے سے کیا کام ہے !"

" بس تم یہ کہتے ہو کہ وزن میں استعمال کرنے کے لئے تم نے اسے علیحدہ کیا ؟"

" سوائے اس کے میرا کام بھی کیا تھا ؟ کیا لٹو ور لڑاتا "

" لیکن تم اس کی بجائے سیسے کے ٹکڑے ، بندوق کی گولی یا آری وغیرہ سے کام لے سکتے تھے !"

" سیسا جھاڑیوں پر تو نہیں لگتا اس کیلئے رقم چاہئے اور آری کام نہیں دیتی ۔ نٹ سے بہتر کوئی چیز نہیں —— وہ وزنی بھی ہے اور اس کے علاوہ اس کے وسط میں سوراخ بھی ہے !"

" کیا بیوقوف بن رہے ہو ! تم ایسی باتیں کرتے ہو گویا ابھی آسمان سے اتر آئے ہو ۔ نرے احمق ہو ۔ —— کیا تمہیں اس کے انجام کا علم نہیں اگر چوکیدار تمہیں دیکھ نہ پاتا تو یقیناً کوئی ریل پٹری سے اتر جاتی ۔

اور اتنے مسافروں کے قتل کا الزام تمہارے سر ہوتا۔"

"خدا کی پناہ حضور! کیا آپ ہمیں کافر اور باغی تو نہیں سمجھ رہے ہیں؟ ——— خدا کی شان حضور قتل تو قتل ہم نے خواب میں اس کا خیال نہیں کیا ——— اللہ بچائے! آپ ہمارے متعلق ایسے شبہات کو کس طرح جگہ دیسکتے ہیں؟"

ڈینس پھٹی پھٹی آنکھوں جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا "ہا ہا! نہیں معلوم کتنے سال گذر گئے لیکن نٹوں کو نکال لینے کے باوجود اس علاقہ میں کسی نے ریل کا کوئی حادثہ نہیں سنا اگر میں کوئی پٹڑی نکال لیتا یا ایک بڑی لکڑی پٹڑیوں پر رکھدیتا تو اس صورت میں ریل کا گذرنا خطرے سے خالی نہ ہوتا ——— مگر ایک نٹ . . . . او خدا ! !"

"لیکن کیا تم جانتے نہیں کہ پٹڑی کو لکڑی کے تختوں سے ملانیوالے نٹ ہی ہوا کرتے ہیں؟"

"ہاں ہم یہ جان کر ہی سارے کے سارے نٹ نہیں نکالتے ——— ہم سمجھتے ہیں اس لئے اس کام کو نہایت احتیاط سے کیا کرتے ہیں" ڈینس نے منہ کھول دیا اور اس پر صلیب کا نشان بنانے لگا

"اسی مقام کے قریب گذشتہ سال ایک ریل پٹڑی سے اتر گئی" مجسٹریٹ نے کہا۔ مجھے اس کی وجہ اب معلوم ہوئی"

"ہاں حضور پڑھے لکھے لوگوں کو یہ باتیں فوراً معلوم ہو جاتی ہیں۔ آپ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر ایک چیز کیوں واقع ہوتی ہے ——— یہ چوکیدار تو دہقان کا دہقان ہے۔ اسے ان باتوں کا کیا علم آدمی کو پہلے فیصلہ کرنا چاہئے تب کسی شخص کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹنا چاہئے۔ اس نے مجھے یوں ہی گھسیٹنا شروع کیا کیوں نہ ہو دہقان تو ہے ——— ہاں آپ یہ تحریر فرما سکتے ہیں کہ اس نے گھسیٹتے ہوئے میرے دو مکے رسید کئے۔ ایک منہ پر دوسرا سینہ میں"

"تلاش کرنے سے ایک اور نٹ تمہارے مکان سے برآمد ہوا۔ بتلاؤ تم نے اسے کب اور کہاں سے علیحدہ کیا تھا؟"

"کیا آپ کا مطلب اس نٹ سے تو نہیں جو سرخ صندوق کے نیچے پڑا ہوا تھا؟"

"مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں تھا ——— کہو! تم نے اسے کہاں سے نکالا؟"

"اسے میں نے نہیں علیحدہ کیا بلکہ کانے سائمن کے لڑکے گنشکا نے اسے مجھے دیا تھا یہ اس نٹ کا ذکر ہے

جو صندوق کے پیچھے تھا ایک اور دالان کے کسی محراب میں ہے جس کو مشر دفن اور میں نے باہم مل کر علیحدہ کیا تھا؟"

"کون مشر دفن؟"

"مشر دفن ہیٹروف' کیا آپ نے اس کے متعلق نہیں سنا وہ مچھلی کے جال بنتا ہے اور انہیں معزز لوگوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ اس کو نوٹوں کی سخت ضرورت ہے تقریباً ہر جال کیلئے نصف درجن نٹ درکار ہیں"

"سنو! قانون کے دفعہ نمبر (۱۰۸۱) کی رُو سے ہر اس شخص کو جو ارادتاً کسی ریل کو نقصان پہنچانا چاہے یا ایسا کام کرے جس کا لازمی نتیجہ ریل کیلئے نقصان دہ ہو! سنتے ہو! بغیر لاعلمی وغیرہ کی فضول بحث کے اس کو سخت سزا دی جائے گی ——— نٹ نکالنے کا انجام تمہیں معلوم ہونا چاہئے تھا ——— اس کی سزا جلا وطنی اور سخت جسمانی اذیت ہے۔"

یقینی۔ یقینی آپ اس کو مجھ سے بدرجہا بہتر جانتے ہیں ——— ہم لوگ جاہل ہیں ان چیزوں کے متعلق ہم کس طرح جان سکتے ہیں۔"

"تم سب کچھ جانتے ہو ——— لاعلمی ظاہر کرنے کے لئے جھوٹ کہکر اپنی عزت بھی کیوں کھوتے ہو۔"

"مجھے جھوٹ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر آپ کو یقین نہ ہو تو دیہات کے کسی آدمی سے دریافت کیجئے۔ اگر بغیر وزنی شیشے کے استعمال کے کانٹا پھینکا جائے تو سوائے پرکلی کے کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔ شاید ہی اس کے سوا کوئی مچھلی ملے"

"تم پھر وہی پرکلی کی بحث کر رہے ہو" ——— یہاں مجسٹریٹ مسکرانے لگا۔

"ہماری ندی میں پرکلی کا نام نہیں ہے ——— اگر ہم بغیر وزنی چیز کے کانٹے کو سطح آب ہی پر رہنے دیں تو بعض اوقات کوئی جھینگا مل جاتا ہے وہ بھی کبھی کبھی ———"

"بس اپنی چیخ بند کرو۔"

ہر طرف سکوت چھا گیا۔ ڈینیس نے ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر اپنے جسم کا بوجھ بدل دیا اور مجسٹریٹ کے میز کی طرف آنکھیں گاڑ دیں ——— مجسٹریٹ تیزی سے لکھ رہا تھا۔

"تمہیں گرفتار کر کے حوالات میں بند کیا جاتا ہے۔"

ڈنیس نے اپنا ذرنی سر بلند کیا اور مستفسرانہ انداز میں مجسٹریٹ کی جانب دیکھنے لگا۔
"حوالات ؟" اس نے حیرت سے کہنا شروع کیا "حضور مجھے تو فرصت ہی نہیں۔ اس وقت تو مجھے گریگوری سے جانوروں کے کرائے کے تین روبل وصول کرنے ہیں۔!"
"بس خاموش رہو ــــ گڑبڑ نہ کرو"
"حوالات جانے کی معقول وجہ پر حوالات نہ جانا سخت ناانصافی ہے ــــ لیکن میں نے کوئی قصور ہی نہیں کیا؟ ــــ نہ میں نے سرقہ ہی کیا ہے اور نہ کسی سے لڑائی ــــ اگر میرے ٹیکس ادا کرنے میں دیر ہوتی ہے تو کچھ خیال نہ کیجئے ــــ یہ سب بیلف کی شرارت ہے کسی شریف آدمی سے دریافت کر لیجئے۔ حضور بیلف تو چور ہے !"
"بکواس ختم کرو!"
"میں خاموش رہوں گا . . . لیکن" ڈنیس نے پھر کہنا شروع کیا "آخر وہی معاملہ درپیش ہوا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بیلف نے رسائد کی کتابوں میں غلطی کی ہے۔ ہمارے خاندان میں تین بھائی ہیں۔ کزما، گریگری اور میں"
"تم پھر اپنی ہی رٹ لگائے ہو ــــ سائمن!" مجسٹریٹ نے سپاہی کو آواز دی اور کہا۔ "اس آدمی کو لیجاؤ۔"
جونہی دو سپاہیوں نے پکڑ کر اس کو کمرے سے باہر نکالنا شروع کیا اس نے واقعات کو توضیحاً اس طرح سمجھانا شروع کیا۔
"ہمارے خاندان میں تین بھائی ہیں . . . . میرے بھائی کی غلطی کا میں ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ کزما اپنا بقایا ادا نہیں کیا کرتا اور اس کا بار مجھ پر پڑتا ہے۔ تم اپنے آپ کو منصف کہتے ہو اگر ہمارا بوڑھا سپہ سالار ہوتا تو دکھلاتا کہ انصاف کسے کہتے ہیں۔ تمہیں عقل سے کام لینا چاہئے۔ یوں انصاف کا خون نہیں کیا جاتا ــــ اگر . . . . . . کسی نے . . . . . گناہ . . . . کیا . . . . ہو تو . . . اسے بید . . . لگانے . . . . چا . . . ہیئیں . . . . . . "

(چیخوف)

"لنگڑی صابیت"

(جناب مرزا عبدالحمید بیگ صاحب بی۔اے۔ بی ٹی (علیگ)

کسی قوم کی ذہنیت کے مطالعہ سے اس کے موجودہ عروج یا زوال کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیونکہ عروج واقبال کے زمانہ میں قوم کی ذہنیت بلندی کی طرف پرواز کرتی ہے اور نحوست وادبار کے زمانہ میں اوس کا رجحان پستی کی طرف ہوتا ہے اور یہی فرق زندہ اور مردہ قوم کا ہے۔ زندہ قوم میں قومیت کا جذبہ ابھرا ہوا ہوتا ہے اور وہ اپنے ملک کی ہر شئے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے لیکن مردہ قوم میں یہ جذبہ مفقود ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے ملک کی اچھی چیز بھی مبتذل اور غیر مہذب معلوم ہونے لگتی ہے سچ تو یہ ہے کہ خدا کسی قوم کو مفتوح نہ کرے مفتوح ہونے کے بعد ذہنیت بالکل پست ہو جاتی ہے اور قوم اپنی قومیت اور شخصیت ہی کو گنوا بیٹھتی ہے معلوم نہیں قدرت نے فاتح قوم میں کونسا مقناطیسی اثر ودیعت کیا ہے کہ مفتوح قوم اوس کی طرف لوہے کی طرح کھسٹی چلی جاتی ہے۔ فاتح قوم کی ہر آن اس کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور اس کی کورانہ تقلید کو وہ اپنے لئے باعث فخر ومباہات سمجھتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ انگلستان مفتوح ملک تھا اور اہل انگلستان پر رومن اثر اس بری طرح مسلط تھا کہ اون کی قومیت ہی رومن میں جذب ہو گئی تھی۔ اہل روما کی تقلید اون کا جزو ایمان تھا۔ اون کی وضع قطع۔ لباس۔ بول چال غرضیکہ ہر شئے کو اہل انگلستان اپنے لئے باعث فخر وناز سمجھتے تھے۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ انگلستان پر لاطینی اثر غالب آگیا حتیٰ کہ مذہب تعلیم اور ادب میں بھی لاطینی روح کارفرما ہو گئی۔ خیر یہ ایک تاریخی دور ہے اور کسی خاص قوم یا ملک سے مختص نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ آج کل کم وبیش اس قسم کی ذہنیت ہم پر بھی حکمراں ہے چنانچہ ہم انگریز نما بننے کو باعث فخر سمجھتے ہیں اور سوٹ پہن کر اس ٹھاٹھ سے نکلتے ہیں گویا کہ ولایت کے تازہ وارد ہیں۔ واضح رہے کہ ہم کو لباس سے کوئی بحث نہیں۔ اس معاملہ میں ہم نہایت آزاد خیال ہیں ہماری رائے میں ہر شخص کو اپنے چہرہ کے خد وخال اور بدن کی موزونیت کے اعتبار سے لباس اختیار کرنا چاہئے۔ سوال صرف ذہنیت کا ہے لباس دیسی ہو یا بدیسی مگر اوس کی وجہ سے ذہنیت کسی طرح متاثر نہ ہونی چاہئے۔ مگر ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر بدیسی لباس موزوں خیال کیا جائے تو اوس کے جملہ لوازمات سے بخوبی واقفیت حاصل کر لینی چاہئے ورنہ

صابیت لنگڑی ہی رہیگی اور ہر وقت معرضِ خطر میں بھی یعنی اگر صاحب تو آپ بنگئے اور "جو" باندھنی آگئی نہ اور خدانخواستہ کسی وقت بھرے مجمع میں آپ کو اس عقدہ لاینحل سے دوچار ہونا پڑگیا تو بس سوچ لیجیے کہ آ لنگڑی صابیت کی بدولت کیا گذریگی "من نہ کردم شما حذر بکنید" والا مضمون ہے۔ ہم پر اس ضمن میں ایک ذرا سا واقعہ گذر چکا ہے وہ آپ کی ضیافت طبع کے لیے پیش ہے تاکہ آپ سنبھل جائیں ورنہ ہماری طرح آپ کو ایک روز پچھتانا ہی پڑیگا۔

واقعہ یہ ہے کہ اساتذہ کی تقلید اور ماحول کے اثر سے صابیت کی روح ہم میں پوری طرح سرایت کر گئی اور ہم بظاہر خاصے اچھے "اپ ٹوڈیٹ" صاحب بن گئے تھے لیکن بدقسمتی سے صابیت کے ایک نہایت اہم ... سے بالکل بے بہرہ تھے یعنی چھری کانٹے سے کھانا نہیں سیکھا تھا۔ کالج کے زمانہ میں "ڈنر" ضرور کھائے تھے مگر اپنے دیسی وضع کے "ڈنر" ہوتے تھے یعنی کھاتے تو تھے میز کرسی پر مگر ہاتھ سے۔ کبھی کبھی یہ بات کھٹکتی ضرور کہ یہ خامی ایک نہ ایک روز رنگ لائیگی اور بالآخر ہوا بھی ایسا ہی۔ یعنی کالج چھوڑنے کے تھوڑے ہی دن ... ہم کو ایک لمبے سفر پر جانیکا اتفاق ہوا۔ صابیت کی روح ابھی تازہ تھی۔ شان برقرار رکھنے کے لیے درجہ دوم میں کیا۔ اور راستے کے لیے ٹفن باسکٹ میں تھوڑا سا کھانا بھی ساتھ رکھ لیا۔ اتفاق دیکھیے راستہ میں ہمارے ایک ملاقاتی بھی اوسی درجہ میں آ دھمکے۔ وہ ہم سے بھی زیادہ "اپ ٹوڈیٹ" تھے یعنی ا... ساتھ کھانا بھی نہیں تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک مرتبہ جب کھانے کا ذکر آیا تو ہم نے ذرا فوقیت کے لہجہ ... کہا کہ کھانا ہمارے ساتھ بہت ہے۔ ساتھ ہی کھالینا۔ لیکن وہ حضرت بھی عجیب دماغ کے آدمی تھے ہماری نوازش کو ٹھکرا کر بے پروائی کیساتھ فرمانے لگے "ارے میاں ٹھنڈا کھانا کیا خاک مزہ دیگا فلاں اسٹیشن پر ... کھائینگے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی کھائیگا"

لنچ کا نام سن کر بھئی ایمان کی بات یہ ہے کہ ہم سٹ پٹاگئے کیونکہ اس لفظ کے ساتھ ہی میز کرسی ... کا نقشہ ... ہاتھ میں لیے بیٹھے ہوئے اپنی مجبوری کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی مگر فوراً ہی دماغ کو قابو میں ... ہم نے بھی پینترا بدل دیا۔ اور نہایت سنجیدگی سے کہا کہ بھئی میرا تو ارادہ کھانے ہی کا نہیں ہے اور ... میں بھوک لگتی ہی کب ہے دوسرے گھر والوں کے اصرار پر ناشتہ اتنا ڈٹ کر کر لیا تھا کہ شاید رات ...

بھی بھوک نہ لگے صرف احتیاطاً کھانا ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک اون کی طرف سے تکلفاً اصرار اور ہماری طرف سے مجبوراً انکار ہوتا رہا۔ بالآخر بڑی مشکل سے ہم نے اپنی عدم اشتہا کا یقین دلایا اور لنچ کی مصیبت سے نجات پائی۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر درحقیقت معاملہ اس کے برعکس تھا یعنی ہم نے چلنے کی گو بڑ میں ناشتہ بالکل واجبی ہی کیا تھا اور اب بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ دل ہی دل میں یہ ڈر ہو رہا تھا کہ اگر راستہ میں کہیں کھانے کا موقع نہ ملا تو بس ساری قلعی کھل جائیگی۔ خیر صاحب ادھر ادھر کی باتوں میں سفر کٹنے لگا حتیٰ کہ وہ لنچ والا اسٹیشن بھی آ گیا۔ ہمارے دوست نے پھر ایک مرتبہ ہماری صلاح کی اور ہم نے پھر اوسی بے رخی سے انکار کیا۔ اور وہ بیچارے تنہا ہی لنچ کھانے چلے گئے۔ ڈبہ میں اور جو دو صاحب تھے وہ بھی اتر کر باہر ٹہلنے گئے ہم نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ فوراً ٹفن باسکٹ کھولا۔ اوپر تلے دو چار نوالے مارے۔ تھوڑا سا قلاقند منہ میں بھرا اور ٹفن باسکٹ بند کر دیا۔ منہ صاف کیا۔ اور اطمینان کے ساتھ نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے اور اپنے دوست کو یقین دلانے کی غرض سے سوڈے کا گلاس منگا کر آہستہ آہستہ پینا شروع کر دیا۔ اس عرصہ میں ہمارے دوست بھی واپس آ گئے سوڈا پیتے ہوئے دیکھکر غالباً ان کو اطمینان ہو گیا ہوگا۔ کہ واقعی ہم کو بھوک نہیں قصہ مختصر یہ کہ سفر بخیر و خوبی ختم ہوا۔ اور ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس لنچ کی مصیبت سے بچے۔ مگر کس کو خبر تھی کہ لنچ کے بھائی ڈنر ہمارے لئے موت کا پیغام بنکر آنیوالے ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد ہم کو مجبوراً کلب کی جانب سے ڈنر کی دعوت قبول کرنی پڑی۔ جب بری گھڑی آ ہی پڑتی ہے تو پھر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی دعوت قبول کرنے کو تو قبول کرلی مگر سنئے یہ ہے کہ فوراً دھڑکن شروع ہو گئی اور دل کے اندر "ہاں" اور "نہیں" کا ایک مدوجزر ہونے لگا۔ کبھی ڈنر کے کانٹے جا کر کلیجے میں چبھتے اور بھری محفل میں رسوائی کا خیال آتا اور سوچتے کہ کسی نہ کسی بہانے سے انکار کر دیں۔ بیمار پڑ جائیں یا کسی ضروری کام پر کہیں چلے جائیں مگر پھر دل نہیں مانتا اور خیال آتا کہ ہمارا یہ فعل گویا کہ اپنے میزبانوں کی مہمان نوازی کو ٹھکرانا ہے اور آئندہ کے لئے اپنے سماجی تعلقات کو ضعیف کرنا ہے۔ رات تک اس قسم کی ذہنی کشمکش جاری رہی۔ کبھی کبھی اس خیال سے دل کو ذرا تسکین ہو جاتی تھی کہ شاید ڈنر اپنی دیسی وضع کا ہو اور چھری کانٹے سے دو چار ہونا پڑے ہی نہیں۔ بالآخر ڈنر کا وقت آ پہنچا اور ہم بھی ڈنر کے کمرے میں پہنچ گئے اپنی جگہ پر بیٹھنے سے

قبل ہم نے ڈنر ٹیبل پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور فوراً ہی دل کی دھڑکن دوگنی ہوگئی کیونکہ ہم نے دیکھا کہ ہر کرسی کے سامنے میز پر ایک ایک "نیپ کن" اس طرح لپٹا ہوا رکھا ہے جیسے صندوقچہ کی برف لپٹی رہتی ہے اور اوس کے بازو میں چھری کانٹے رکھے ہیں اب تو شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور یقین ہوگیا کہ ڈنر بدیسی ہے۔ ذہن میں فوراً اپنی مجبوری اور بے بسی کا نقشہ کھنچ گیا اور ہم کو اپنی صاحبیت کی شان برقرار رکھنے کی فکر لاحق ہوگئی اور اسی فکر میں ہم اس طرح کھو گئے کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا حتیٰ کہ ایک صاحب نے ہم کو مخاطب کرکے کہا۔ "کیوں صاحب کیا بات ہے مزاج کیسا ہے" ہم نے حواس درست کرکے فوراً بات بنائی کہ "رات کو سونا نہیں ہوا طبیعت پر گرانی ہے" یہ کہکر ہم ذرا سنبھلے اور حواس درست کرنیکی کوشش کر رہی رہے تھے کہ اتنے میں میز پہ ہاتھوں کی ایک جنبش ہوئی اور ہر شخص نے "نیپ کن" اٹھاکر اپنے دامن پر ڈال لیا۔ یہ گویا سگنل تھا کہ تیار ہو جاؤ۔ تباہی آنیوالی ہے۔ بٹلر نے ہر شخص کے سامنے ایک ایک رکابی میں سوپ لاکر رکھدیا اور ڈنر شروع ہوگیا۔ سوپ پینے میں تو کوئی خاص بات پیش نہیں آئی مگر ادھر تو سوپ نے اشتہا میں تیزی پیدا کی اور ادھر چھری کانٹے جاکر دل میں چبھنے لگی اور دل کی وہ کیفیت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے بس ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ ہم وہاں تھے ہی نہیں۔ بالآخر پوری قوت سے دل کو قابو میں لانے کی کوشش کی اور اپنی نگاہوں سے دوسروں کے افعال کی تقلید اس طرح کرنی شروع کی جیسے عیدین کی نماز میں تکبیر کے وقت نگاہ اِدھر اُدھر جاتی ہے۔ ہمارے لئے ڈنر کی سب سے کٹھن منزل مرغی کا کورس تھا۔ ہم نے دوسروں کو دیکھ کر یہ تو معلوم کرہی لیا تھا کہ مرغی چھری اور کانٹے سے کھائی جائیگی چنانچہ جس وقت بٹلر مرغی لیکر ہمارے پاس آیا تو ہم نے بھی اوس کی ڈش میں سے ایک ٹانگ لیکر اپنی رکابی میں رکھی لیکن جس مصیبت اور مشکل سے وہ ٹانگ اٹھی ہے بس ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ رکابی میں رکھنے کے بعد بسم اللہ کہکر ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے میں کانٹا سنبھالا اور دوسروں کی دیکھا دیکھی لگے اناڑی تیراک کی طرح ہاتھ مارنے۔ کبھی چھری چلاتے اور کبھی کانٹا چبھوتے۔ مگر ہڈی سے گوشت جدا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ پوزیشن کا معاملہ تھا۔ دل میں رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ یہ سب لوگ کیا خیال کریں گے آج تم نے دعوت قبول کرکے کیسی بھد اڑوائی اسی خیال نے کوشش میں اور بھی اضافہ کردیا اور ہم بالآخر فنا فی الڈنر ہوگئے۔ مرغی کی ٹانگ کے ساتھ بہتری کشتم کشتا کی مگر

کامیابی نہ ہوتی۔ آخر جب اس انہماک میں آواز آئی کہ "جناب چھری سیدھے ہاتھ میں لیجئے" آپ جو ہاتھوں کی تنقید کی تو معلوم ہوا کہ بدحواسی میں چھری الٹے ہاتھ میں اور کانٹا سیدھے ہاتھ میں آگیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ گوشت ہڈی سے جدا نہیں ہو رہا تھا۔ لاحول پڑھکر چھری کانٹے کا پینترا بدلا اور ندامت میں ڈوبی ہوئی نظروں کو ذرا اٹھا کر حاضرین کو دیکھا عجب روح فرسا منظر نظر آیا۔ یعنی ہر شخص کھانے سے زیادہ ہماری اس معصوم حماقت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بس کلیجہ پر ایک تیر سا چل گیا۔ بقول شخصے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کسی اور پر تو بس چلا نہیں دل ہی دل میں اساتذہ کو برا بھلا کہنے لگے کہ اگر یہ لوگ ہم کو کالج کے زمانہ میں عملی طور پر چھری کانٹے سے کھانا سکھا دیتے تو آج یہ روز بد کیوں دیکھنا پڑتا۔ بہت سے بہت یہ کرتے کہ جس طرح گیمس فیس اور میگزین فیس لیجاتی ہے اسی طرح "ڈنر فیس" بھی لے لیتے تاکہ ہم کو اس کی تھوڑی بہت مشق تو ہو جاتی اس پیچ و تاب میں گردن نیچے کر کے اب پھر مرغی کھانیکی کوشش کی۔ معلوم نہیں ہماری کوشش سے یا محض اتفاق سے اس مرتبہ گوشت کاٹنے میں کامیابی ہو گئی اور ہم نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اب جو اس علیحدہ شدہ گوشت کو کانٹے کے ذریعہ اٹھانا چاہا تو وہ بھی الٹ گیا۔ بہتیرا کانٹے کو گوشت میں چبھویا۔ چھری کی امداد بھی شامل کی مگر گوشت کسی طرح اٹھا ہی نہیں۔ آخر ویسے ہی چھری کے ذریعہ اس کو کانٹے کے اوپر رکھا اور بہت احتیاط کے ساتھ منہ میں لے گئے۔ اس نوبت پر کانٹے کو بھی مذاق سوجھا جا کر سیدھا تالو میں چبھ گیا مگر ہماری شرافت دیکھو اف تک نہ کی۔ بڑا اطمینان تو یہ ہوا کہ کامیابی تو ہوئی اب تو معاملہ ذرا صاف ہو گیا اور ہم نے دو چار مرتبہ یہی عمل کیا اب ہم کو آداب ڈنر کا خیال آیا یعنی اس عرصہ میں ہم نے یہ نوٹ کر لیا تھا کہ لوگ تھم تھم کر کھا رہے ہیں یعنی کچھ کھا لیا اور پھر چھری کانٹا رکھکر ذرا باتیں کر لیں۔ ہم نے بھی اس کی تتبع میں کھاتے کھاتے ایک مرتبہ چھری اور کانٹا ملا کر رکابی میں رکھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بٹلر کی حماقت دیکھئے معلوم نہیں اس کو کیا سوجھی آیا اور ہماری رکابی اٹھا کر چلتا بنا۔ اس کی اس بیہودہ حرکت پر ہم کو بہت غصہ آیا مگر غصہ کے اظہار کا وہ موقع نہیں تھا اس لئے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ برابر والے صاحب بولے "کیوں صاحب پسند نہیں آئی" موقع کی نزاکت کو پہچان کر ہم نے ذرا اہمیت کے لہجہ میں کہا "کچھ پھیکی سی تھی" وہ بولے "جی ہاں جبھی تو آپ نے بھی اسی واسطے چھوڑ دی" ایمان کی تو یہ ہے کہ ہم نے یہ دیکھا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے مرغی چھوڑی

تھی یا اوس کی ہڈیاں لیکن پھر بھی اون کے اس بیان سے ہماری ذرا ڈھارس بندھی - اور خیال ہوا کہ شاید ان سب کو یہ یقین آگیا ہوگا کہ ہم کو مرغی پسند ہی نہیں آئی - اس لئے ہم نے نہیں کھائی - مگر دیگر حاضرین ڈنر کے لبوں پر تبسم ہے اور وہ کبھی ان کو اور کبھی ہم کو دیکھ رہے ہیں - ان لوگوں کے اس طرز عمل سے ہم کو اپنے مخاطب صاحب کی دیانتداری پر شبہ ہوا مگر وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ کسی طرح اوس کا اظہار کیا جاتا لہذا خموشی کے ساتھ صبر کر کے بیٹھ رہے - اس عرصہ میں مرغی کا کورس ختم ہو چکا تھا اب دوسرا کورس شروع ہوا - اس میں آلو - مٹر اور پھلیاں تھیں - یہ دیکھ کر ہم کو قدرے اطمینان ہوا کہ چلو یہ مرحلہ تو اس قدر دشوار نہ ہوگا - لیکن کس کو خبر تھی کہ یہی سیدھا سادھا کورس ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دیگا - ہوا یہ کہ ہم نے کھانا شروع کیا اور آلو کو کانٹے سے دبا کر بسم اللہ کہکر پوری قوت کے ساتھ چھری چلائی - معلوم نہیں کیا ہوا اور کیونکر ہوا - چھری پھسل کر کھٹ سے رکابی پر پڑی اور آلو مرغ بسمل کی طرح تڑپ کر ہماری رکابی سے اڑا اور پڑوس کے دامن پر جا پڑا - سچ ہے برے وقت سے خدا بچائے - معمولی سے معمولی چیز بھی ناک چنے چبوا دیتی ہے ہماری یہ بُری گھڑی تھی - چھری اور رکابی کے تصادم نے سب کی نگاہیں ہماری طرف پھیر دیں - موقع نازک تھا ہم نے کسی سے آنکھیں ملانی تو مناسب نہیں سمجھیں البتہ ہمدردانہ لہجہ میں اپنے پڑوسی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو یقین دلانیکی پوری کوشش کی کہ اس میں ہمارا ذرا بھی تصور نہیں - آلو سخت تھا - کمبخت پکانے والوں نے اوس کو گلانے کی بھی فکر نہیں کی - مگر ہماری ان باتوں کا اون پر کبھی بھی اثر نہ ہوا - کیونکہ ہم نے یہ دیکھا کہ اونہوں نے تیور پر بل ڈال کر حقارت آمیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا اور پھر گردن موڑ کر اپنا کوٹ صاف کرنے لگے جس کے معنی صاف طور پر یہ تھے کہ آلو کی اس حرکت سے ان کو بہت صدمہ پہنچا تھا -

اول تو سوٹ خراب ہونے کا رنج اوس پر یار لوگوں کے فقرے - بس یوں سمجھو کہ زخم پر نمک چھڑک رہے تھے - اچھا بھلا ہم کو چھوڑا اون کو بنانا شروع کر دیا - کوئی کہتا کہ "میاں کبھی ڈنر کھایا بھی تھا" کوئی کہتا کہ "بھیا چھری کانٹا بالکل ابتدا ہی سے شروع کر دو - مسلمان کیلئے چھری کانٹے سے کھانا حرام ہے" اور کسی نے بیچارے کو سوٹ ہی کا طعنہ دینا شروع کیا کہ "سوٹ کی بڑی فکر ہے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قیمتی ہے" غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں - آدمی تھے شریف اول تو چپکے سنتے رہے - آخر جل کر بس اتنا بولے "ارے بھائی! کسی نے سچ

ہے کہ خدا بروں کی صحبت سے بچائے " غرضیکہ اسی طرح تھوڑی دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا اور ڈنر میں چہل پہل
ئی۔ جب جوش ذرا ٹھنڈا ہوا تو پھر سب لوگ ڈنر میں مصروف ہو گئے گو اس آلو کا ذکر خیر برابر چلتا رہا۔
بھی ڈنر کی طرف از سر نو متوجہ ہوئے اس مرتبہ ڈر کے مارے ہم نے آلو کو چھیڑا ہی نہیں مگر بقیہ چیزیں یعنی
اور پھلیاں آلو سے بھی زیادہ ٹیڑھی کھیر ہو گئیں۔ مٹر کے دانوں کو اٹھایا تو وہ مچل کر نکل گئے۔ پھلیاں اٹھانے
وشش کی تو وہ پھسل گئیں۔ عجب مشکل میں جان پھنس گئی ڈنر تو ہمارے لئے مصیبت بن گیا۔ آلو کی
دہ حرکت کی وجہ سے ہم جاذب توجہ تو پہلے ہی سے بنے ہوئے تھے۔ اب ان مٹر کے دانوں اور پھلیوں
ند نے لوگوں کو ہنسی کا اور بھی موقع دیا۔ لیکن ہم کر ہی کیا سکتے تھے۔ قہر درویش بر جان درویش۔ صبر و
شی کے ساتھ سب کچھ سہا۔ اور جوں توں کر کے ڈنر کی سب منازل طے کیں۔ آخر میں اپنے خیالات میں
قدر محو ہو گئے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی حتیٰ کہ بٹلر کے "سر" نے ہم کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔
سکرا اٹھے دیکھا کہ بٹلر شیشے کے پیالہ میں پانی لئے کھڑا ہے۔ خیالات میں کھوئے ہوئے تو تھے ہی۔ سوچا
ھا۔ پیالہ اوس کے ہاتھ سے لیا اور لگے منہ کو لگانے ابھی پیالہ ہونٹوں تک بھی نہ گیا تھا کہ میز کے ایک سرے
ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اس قہقہہ نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم کو اپنی حماقت کا فوراً احساس
یا۔ اب جب کبھی ڈنر کا ذکر ہوتا ہے تو بس یہی نقشہ ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور ہم اپنی لنگڑی
یت پر نادم نظر آتے ہیں۔

پھُول

(جناب محمد غوث الدین صاحب ایم۔ ایس سی علیگ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ)

تمام جانداروں کا مقصد حیات تولید مثلی یا افزائش نسل ہوتا ہے۔ پودے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ آبی خوردبینی پودے جن میں سے بعض کی زندگی چند گھنٹوں کی مہمان ہوتی ہے اس تھوڑے سے عرصہ میں نہ صرف پوری نشو ونما کو پہنچ جاتے ہیں بلکہ اپنی نسل کو برقرار رکھنے کا بھی پورا پورا اطمینان کر لیتے ہیں۔ ناموافق موسمی حالات اس میں اور سرعت پیدا کر دیتے ہیں لاکھوں کی تعداد میں نر اور مادہ حیوان بذرے پیدا کئے جاتے ہیں اور ان کے ملاپ سے "جگتا" بنتا ہے۔ اس میں موسمی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بیرونی دیوار اور اپنے تک زندہ رہنے کیلئے غذا کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ یہ جگتا اپج کر دوسرا پودا ہو جاتا ہے۔

زندگی کا آغاز پانی سے ہوتا ہے اس زمانہ کے تمام جاندار۔ پودے اور جانور۔ پانی میں رہتے ہیں اس نظریہ کو اس سے اور بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ اب بھی بعض پودے جو ہزاروں سال سے خشکی پر رہتے چلے آئے ہیں اپنے طریقہ تولید میں آبی پودوں کی خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح جانوروں کے جنینے نشو ونما میں آبی جانوروں کے نشو ونما کی مدارج پائے جاتے ہیں۔ زمانہ گذرتا گیا۔ دنیا دلدل اور پھر خشکی میں تبدیل ہوتی گئی پودے بھی ان تبدیلیوں کا نہ صرف ساتھ دیتے رہے بلکہ اپنے کو ماحول کے موافق بنانے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔ وہ پودے جو صرف پانی اور دلدل ہی میں پنپ سکتے ہیں آہستہ آہستہ نابود ہونے لگے اب صرف وہ باقی رہ گئے جو اپنے کو آہستہ مگر اٹل تبدیلی کے اہل بنا چکے تھے۔ پھول والے درخت دنیا میں بہت بعد رونما ہوئے ہیں اور پودوں کی جماعت بندی کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ ممتاز اور بلند پایہ پودے مانے جاتے ہیں۔

اس جگہ پھول کی مختصر سی تشریح بیجا نہ ہوگی۔ پھول ایک مخصوص ٹہنی ہے جو تولیدی افعال انجام دینے کیلئے پیدا کی جاتی ہے اور بعض کے خیال میں پھول چند پتوں کا مجموعہ ہے پنکھڑیاں اور برگے جو اپنی رنگینیوں کے باعث زیادہ نمایاں اور جاذب نظر ہیں۔ نباتاتی نقطۂ نظر سے ایک سیدھا اوڑھے سے زیادہ اہمیت

رکھنے۔ پھولوں کی خوشبو میں شہد کی مکھیوں، تتلیوں اور بھونروں کیلئے دام [illegible] ہے۔ پھول کے
اعضاء زرد ریشے اور بیضدان ہیں اول الذکر زیرہ گل ہوتا ہے اور آخر الذکر بیضہ جن کے ملنے
اور تخم کی داغ بیل پڑتی ہے جو پودے کے آئندہ بقائے نسل اور اضافہ کا ذریعہ ہوتے ہیں
دوں میں نر اور مادہ اعضاء ساتھ ساتھ ہوتے ہیں مگر بعض پھولوں میں (مثلاً) یا تو صرف نر
ہوتے ہیں یا محض مادہ۔ یہ بات تجربوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ ایک ہی پھول کے نر اور مادہ اعضاء
تندرست پھل نہیں بنا سکتے بلکہ کامیاب باروری کیلئے دوسرے درخت یا کم از کم دوسرے پھول کے
ضروری ہوتے ہیں۔ قدرت نے اس کا انتظام اس طرح کر دیا ہے کہ ایک ہی پھول کے نر اور مادہ اعضاء
وقت میں پختہ نہیں ہوتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پودے کی زندگی میں باروری کا مسئلہ کتنی اہمیت
ہے۔

قدرت نے سینکڑوں صدیوں کی کاوشوں کے بعد پھولوں کی سب سے زیادہ اہم ضرورت کا اس قدر
کیا ہے کہ اب شاذ و نادر ہی کوئی بدنصیب پھول باروری سے محروم [illegible] پودوں کی باروری
ہر زمانے میں رہا۔ اس وقت بھی جب کہ پودوں کی دنیا پانی میں تھی۔ خوردبینی نر اور مادہ حیوان
مل کر دوسرا پودا پیدا کر لیتے تھے اور اب بھی آبی پودوں خصوصاً الجی اور [illegible] میں
پانی ہی کے ذریعہ باروری عمل میں آتی ہے۔ آہستہ آہستہ ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد پھول
لگنے ہیں۔ پانی کا واسطہ اٹھ جانے کے بعد زیرگی ہوا کے ذریعہ عمل میں آنے لگی ہے اور اب بھی [illegible]
ایسے ہیں جن میں زیرگی صرف ہوا کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ اس ہوائی [illegible] پیدا کرنے
بار بار آزمانا پڑتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر بیضدان کا بالائی حصہ [illegible] اور پانچ
اور دو پھول پانچ فیٹ سے زیادہ فاصلہ پر نہ ہوں تب بھی [illegible] ۱۴۴۰۰ [illegible] کنگنی تک
ہے اور باقی تمام بیکار جاتے ہیں۔ اس پر بھی اگر پودا ہوا کے رخ پر نہ [illegible] امکان اور
جاتا ہے جو اسے ہی پودا فائدہ اٹھانے کے لئے درختوں کی پھول دار [illegible] تبدیلیاں ہوتی
ایسے درختوں میں زردان جس میں زرگل ہوتا ہے ایک نہایت [illegible] سے باقی ہوتے ہیں

جو ہوا کے خفیف جھونکے سے زرزان ہو جاتے ہیں۔ زر پختہ ہونے کے بعد زردان شق ہو جاتا ہے اور ہوا اون کو مادہ پھول تک اڑا لیجاتی ہے اس کے علاوہ زر بہت سبک ہوتا ہے۔ چلغوزہ کے زر کے دونوں جانب ہوائی تھیلیاں ہوتی ہیں جو اوس کو دور تک اڑنے میں مدد دیتی ہیں۔ ہوا سے بارآور ہونے والے درختوں کو کثیر تعداد میں زر پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے بعض حصوں میں فر کے زر کے بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں ایسے درختوں میں جن میں ہوا کے ذریعہ زیرگی عمل میں نہیں آتی ہے اکثر اون کے پھول ظاہری نام و نمود سے عاری ہوتے ہیں۔ نہ اون میں رنگ برنگ کی پنکھڑیاں ہوتی ہیں اور نہ خوشبو۔ اون کی کل کائنات صرف زررشتیوں یا مادہ اعضا پر مشتمل ہوتی ہے جو چند بے رنگ چھلکوں میں لپٹے رہتے ہیں۔ مکائی۔ گیہوں۔ چاول۔ وغیرہ کے پودے جن میں ہوائی ثمرہ ہوتا ہے ایسے پودوں کی زندہ مثالیں ہیں۔ انہیں رنگ و بو کی اس وجہ سے بھی ضرورت نہیں کہ اون کا پھول زیادہ عرصہ تک نہیں رہتا۔ زر پختہ ہونے کے بعد یہ چند گھنٹوں میں اپنی جیب خالی کر دیتے ہیں۔

زر کی یہ بربادی شاید قدرت سے دیکھی نہ گئی۔ پھول والے درختوں نے ہوا کو چھوڑ کر شہد کی مکھیوں تتلیوں اور بھونروں کو بارآوری کے پورا کرنے کی دعوت دینی شروع کی۔ پتنگوں وغیرہ کو متوجہ کرنے کے لئے رنگ و بو ضروری ہوتے ہیں۔ یہ پودے کے اندر کیمیائی تعاملات سے حاصل کئے گئے۔ اس کے علاوہ بیضدان کے قریب شہددان کے وجود نے جانوروں کو بہت جلد پھول کے قریب کھینچ لایا۔ یہ روز کا مشاہدہ ہے کہ بیشتر پھول زرد۔ سرخ۔ نیلے۔ یا سفید ہوتے ہیں جو پودوں کے پتوں کی سبزی کے مناسبت سے بہت شوخ یا ہلکے ہوتے ہیں۔ سفید پھول عموماً رات کو کھلتے ہیں تاکہ رات کو نکلنے والے کیڑے اندھیرے میں جلد امتیاز کر سکیں۔ ایسے پھولوں میں رات کے وقت خوشبو بھی تیز ہو جاتی ہے شہد کی مکھیاں وغیرہ شہد کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ پھول کی رنگ و بو اون کو اپنے طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ شہددان پھول کے نچلے حصہ میں ہوتا ہے اوس تک پہنچنے کیلئے مکھی کو زررشتیوں اور کلغی کو چھوتے ہوئے گذرنا پڑتا ہے اس طرح کچھ زر اون کے پیر اور پروں سے چمٹ جاتا ہے کلغی کی سطح چپچپی ہوتی ہے جب وہ دوسرے پھول پر پہنچتے ہیں تو زر کا کچھ حصہ ضرور چھوڑ جاتے ہیں اس عمل کو اور کامیاب بنانے کے لئے پھولوں کے زیادہ ترقی یافتہ خاندانوں میں اہم تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں بعض

لے ان کا شمار پھول والے درختوں میں نہیں ہے۔ زیرگی کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

پھول قیف نما ہوتے ہیں ایسے پھول سے شہد حاصل کرنے کے لئے مکھی کو پھول کے اندر کافی دور تک جانا پڑتا ہے۔ اس عمل میں زیرہ دان سے اون کا تماس ضروری ہوتا ہے۔ پھلی والے درخت خصوصاً مٹر، سیم، وغیرہ میں پھول کی ساخت اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے ایسے پھولوں کے تولیدی اعضاء پنکھڑیوں میں چھپے رہتے ہیں۔ جب مکھی یا بھونرا پھول پر بیٹھتا ہے تو اون کے وزن سے یہ یکایک باہر نکل پڑتے ہیں۔ اس عمل سے زر کی تقسیم کامیابی سے ہو جاتی ہے۔ پھولوں میں نہایت ترقی یافتہ شکل اوس چھتری نما پھولداری کا ہے جو گاجر۔ دھنیاں۔ زیرہ۔ وغیرہ کے پودوں میں ہوتی ہے۔ پھول بہت تعداد میں نزدیک نزدیک ہوتے ہیں آنیوالے باریک زبان والے کیڑے مکوڑے وغیرہ کے لئے چبوترہ کا کام دیتے ہیں۔ کیڑے ان پر گھوم کر تھوڑے سے عرصہ میں کئی پھولوں کو بارور کر دیتے ہیں سورج مکھی کا پھول بھی دراصل ہزاروں پھولوں کا مجموعہ ہوتا ہے اطراف کی خوشنما پنکھڑیاں۔ بانجھ پھول ہیں جو صرف ظاہرداری کیلئے ہوتے ہیں۔ بیچ کا قرص پھولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایسے پھولوں میں بھی زیرگی نہایت کامیابی سے ہو جاتی ہے۔ بعض پھولوں کے پنکھڑیوں پر باریک امتیازی لکیریں ہوتی ہیں۔ جو شہد دان کی طرف رہنمائی کرتی ہیں بعض پھول ایسے بھی ہیں جو زبردستی زیرگی کروا لیتے ہیں یہ ایک دفعہ کیڑا داخل ہونے کے بعد بند ہو جاتے ہیں اور جب تک زیرہ اُن پر اچھی طرح نہ لگ جائے نہیں کھلتے۔ بعض اپنے میں تھوڑا سا پانی جمع کر رکھتے ہیں تاکہ کیڑے کا جسم تر ہو جائے اور زر چمٹ جائے۔ آکھ کے خاندان والے پھولوں میں ہک نما زیرہ دان ہوتے ہیں جو مکھی وغیرہ کے پیر میں پھنس جاتے ہیں اس کشمکش میں بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ بجائے زر لیجانیکے ٹانگ ہی چھوڑ جانا پڑتا ہے۔ اون پھولوں میں جن کی زیرگی معمولی مکھیوں سے ہوتی ہے سڑتے ہوئے گوشت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ زیرگی میں بعض چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھی مدد دیتی ہیں۔

پھول کی زندگی بھی زیرگی کے مناسبت سے ہوتی ہے ایسے پھول جن میں ہوائی ثمرہ ہوتا ہے جلد مرجھا جاتے ہیں برخلاف اس کے جس میں پتنگوں کے ذریعہ زیرگی ہوتی ہے عرصہ تک تر و تازہ رہتے ہیں اس لحاظ سے پھول چند منٹ سے لیکر اسّی دن تر و تازہ رہتا ہے پھول میں یہ تمام تبدیلیاں صرف زر کی بچت اور زیرگی کو کامیاب بنانے کیلئے ہوتی گئی ہیں اور اب ہزاروں صدیوں کی آہستہ آہستہ ترقی کے بعد پھولوں کی اکثریت میں زیرگی پتنگوں کے ہی ذریعہ ہوتی ہے اس طرح پودے قدرت کا منشاء کہ پیدا کی ہوئی چیزوں کی نسل دنیا میں باقی رہے اچھی طرح پورا کر دیتے ہیں۔

فیشن پرستی

(جناب صفیہ صدیق حسین صاحبہ)

(۱)

سیاہ اور دراز بال، گلابی ہونٹ اور پھول سے رخسار چمکیلی آنکھیں بلند پیشانی۔ اگر حسن و خوب رُوئی میں داخل ہیں تو بلا شبہ "رضیہ" کو ان انعامات سے قدرت نے مالا مال کر دیا تھا۔ یہ شانہ اور آئینہ کی محتاج تھی نہ تزئین و آرائش کی ممنون۔ اگرچہ ایک اوسط گھرانے میں اپنی زندگی کے ابتدائی سال بسر کئے لیکن ایک امیر گھرانہ میں بیاہ دی گئی۔ مگر کیا محال جو غرور و تمکنت، حکومت و ثروت سے متاثر ہوئی ہو۔ اس کی محبت کا مرکز اس کی خدمت گزاریوں کا ملجا شوہر اور شوہر کی آرام و آسائش تھی۔ باوجود بیسیوں ملازمین کے وہ اپنے ہاتھ سے اپنے شریک حیات کی معمولی خدمت بھی انجام دینے کو فخر سمجھتی تھی۔ پھر اس کا اوڑھنا تھا تو وہ، اور اس کا بچھونا۔ اس کا دل شوہر کی پرستاری سے معمور تھا۔ آٹھ پہر اوس کو اس کی رٹ لگی رہتی تھی۔

(۲)

احمد شکیل اور وجیہ نوجوان تھا محمود حسین اگر قبل از وقت داعی اجل کو لبیک نہ کہتے تو وہ اور کچھ عرصہ یورپ میں تعلیم کے نذر کر دیتا۔ مگر زمانہ نے وفا نہ کی اس نے تعلیم سے پہلے والدہ کے تقاضوں پر گھر کے کاروبار سنبھالنے کیلئے ہندوستان واپس آنا پڑا۔ اور جب واپس آچکا تھا تو بیوہ ماں کی یہ تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں بچے کا سہرہ دیکھ لے۔ فرماں بردار احمد نے والدہ کے حکم کے آگے گردن اطاعت خم کر دی۔ اور رضیہ کو اپنا مونس تنہائی بنا لیا۔ ممکن تھا کہ روشن خیال باپ زندہ ہوتے تو شاید وہ اپنے مذاق کی طرح احمد کیلئے بھی کوئی روشن خیال اور آزاد گھرانہ پسند کرتے۔ کیونکہ جہاں دولت ہو وہاں مغربی معاشرت کا بھوت منڈلانے لگتا ہے یہی وہ ماحول تھا جس میں احمد نے پرورش پائی تھی اوس کا مطمح نظر بھی یہی تھا کہ کسی تعلیم یافتہ فیشن ایبل کو ہم سفر حیات بنائے اگرچہ کہ وہ جانتا تھا کہ یہ بے جوڑ میل خطرناک۔ اور تباہیوں کا پیش خیمہ۔ دولت اور ثروت کیسا سرافت کا دیباچہ ہوتا۔

مگر دل کی خلش کا کوئی علاج نہ تھا اوس کا تخیل بی بی کیلئے نہایت پر لطف تھا۔ گورے گال پوڈر کی بھینی خوشبو سے معطر ہیں۔ رخسار اور زلفوں کے ساتھ دوشیزگی کا نیم برہنہ لباس سڈول پنڈلیوں کے عریاں نظارے کی دعوت چشم تماشا کو دیتے ہوئی پائیں باغ میں مصروف خرام ناز ہو۔ یا صدا نلے میں آرام کرسی کی زینت آغوش ہو۔ سبک اور مرمریں انگلیوں میں کوئی حسین سی کتاب دبی ہوتی ہو۔ انگلیاں حنائی رنگ اور چھلوں سے بے نیاز۔ کلائیاں طلائی چوڑیوں کی قید سے آزاد۔ شام کو دلفریب نظارہ کا لطف اٹھانے کے لئے سکندر آباد بند پر مشغول تفریح ہو جب کہ ہوا سے اوس کے کھلے ہوئے بال رخساروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہوں اور آسمان پر تاریکی چھا جائے تو کمرہ سے پیانو کی دلکش صدائیں روح کو وجد میں لانے والی ہوں۔

جب اس تخیل کا موجودہ صحبت سے تقابل کرتا تو دل پر ایک چوٹ لگتی کہ نیم برہنگی کے بجائے جسم نازنین لباس میں ملفوف ہے۔ آزادی اور شوخی یہاں حجاب میں مستور تھی گل چینی کے بدلے گھر کے کام کاج ہیں۔ صدائے پیانو کے عوض آواز اذان اور تلاوت قرآن۔ اس اختلاف مذاق سے وہ چیں بچیں اوٹھتا تھا کہ اس بے رنگ زندگی سے کیونکر رنگینی نصیب ہوگی۔ عقد ثانی کا جو کبھی ارادہ کرتا تو "مس مارٹن" دیدہ تصور میں موجود ہوتی جن کے والد نے اپنے پرانے اور بوسیدہ نام "مظفر حسین" کے الفاظ م۔ ر۔ ف۔ ح اور ی۔ کو نکال کر الف اور ٹ کے اضافے سے "مارٹن" بنا لیا تھا۔ اور ان کی صاحبزادی بے جھنگ اور بیشکری کے مس مارٹن بنگئیں تھیں۔ احمد سوسائٹی کے میل جول کے صدقہ میں اپنا نام مس مارٹن کے حلقہ ارادت میں کبھی کے لکھوا چکے تھے۔ مگر رضیہ کی شرکت جائز دل کا کانٹا بن کر کھٹکا کرتی تھی ورنہ مس مارٹن کبھی کے مسز احمد بن چکی ہوتیں۔

(۲)

ایک دن جب کہ موسم نہایت خوشگوار تھا آسمان پر لکہ ہائے ابر پراں تھے گھر میں بیٹھے ہوئے طبیعت گھبرا رہی تھی ارادہ کیا کہ کم از کم سکندر آباد بند ہی کا ایک چکر لگا آئیں مگر سوال یہ تھا کہ تنہا نہ رونا بہلا نہ ہنسا بہلا۔ ڈرتے ڈرتے زنانہ میں تشریف لائے معلوم ہوا کہ رضیہ بالاخانہ پر ہے کمرہ میں دیکھا تو فرماں بردار محبت کیش بیوی پلنگ پر لیٹی ہوئی ہے شوہر کی آہٹ سنتے ہی پذیرائی کیلئے کھڑی ہوگئی۔

احمد۔ رضیہ دیکھتی ہو موسم کس قدر خوشگوار ہے!

رضیہ مسکراتے ہوئے۔ جی ہاں

احمد۔ اس وقت چاہتا ہوں کہ باہر جا کر ان کا لطف اٹھاؤں۔

رضیہ۔ بسم اللہ ارادہ فرمائیے!

احمد۔ مگر تنہا کیا لطف آئیگا۔

رضیہ۔ پھر کیا ارشاد ہوتا ہے؟

احمد۔ اگر تم بھی چلنا پسند کرو تو . . . . . . —

رضیہ۔ لیکن میں کیونکر چل سکوں گی۔ پھر اماں جان بھی تو اس کو پسند نہیں کرتیں۔

احمد۔ اماں جان کی چھوڑ دو وہ بوڑھی ہو چکی ہیں دنیا کی دلچسپیاں تو نوجوانوں کیساتھ وابستہ ہیں!

رضیہ۔ یہ سب کچھ سہی۔ مگر مجھ سے تو یہ ناممکن ہے کہ غیر محرم سے آنکھیں چار کروں۔

احمد۔ ڈیر رضیہ میں تمہیں اتنا کنسرویٹو سمجھا نہ تھا تمہیں تو اپنے شوہر کا حکم ہر حال میں ماننا چاہئے۔

رضیہ۔ میں اپنے سرتاج کے ہر حکم کیلئے آمادہ ہوں مگر جس میں ننگ و ناموس پر حرف آئے مجبور ہوں

احمد آزردہ اور اداس وہاں سے اٹھ آیا۔ کہ قال اللہ اور قال الرسول والی سے کون حجت کرے۔ مگر رہ رہ کے یہی سوال کہ آخر یہ کٹھن زندگی جس کی ابتدائی منزلوں میں یہ حال ہے کیونکر کٹے گی؟ دماغ پر عقد ثانی کی پھر یورش ہونے لگی اور تو کچھ سوجھا نہیں۔ فوراً رسیو اٹھا کر مسٹر مارٹن کے دولت سرا سے ملا دیا۔

احمد۔ ہلو۔

آواز۔ ہاں فرمائیے۔

احمد۔ کیا مس مارٹن گھر ہی میں ہیں؟

آواز۔ ہیں تو ضرور مگر اس وقت کسی اور سے باتیں کر رہی ہیں۔

احمد۔ ذرا میری اطلاع کر دینا کہ میں بات کرنا چاہتا ہوں!

آواز۔ معاف کیجئے۔ بیم صاحب نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ جب کبھی تعلقدار صاحب سے مصروف تکلم ہوں تو اون کے کمرے میں کوئی قدم دھرنے نہ پائے۔

یہاں سے بھی ناکام ہوکر مجنونانہ حالت میں ڈرائینگ روم میں پہنچتا ہے۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچتا ہے۔ کرسی پر بیٹھتا ہے۔ کتاب اوٹھاتا ہے۔ چلتا ہے۔ ٹھیرتا ہے۔ مگر دل کی خلش یہاں بھی دور نہیں ہوتی۔ وہ نا امید ہوکر کرسی پر گر پڑتا ہے لیکن بہت جلد نیند کا فرشتہ اوس پر غالب آجاتا ہے اور یہ اس کش مکش سے آزاد ہو جاتا ہے۔

(۴)

ابتداءً مسٹر مارٹن کو اپنی نورِ نظر احمد کے نذر کرنے میں کچھ تامل ہوا مگر جب یہ شرائط طے ہوگئے کہ:-

۱۔ پہلی بیوی نکال دیجائیگی۔

۲۔ پچاس ہزار مہر معجل ادا کیا جائے گا۔

۳۔ جیب خرچ کے لئے ماہانہ ہزار روپیہ دیا جائے گا۔

۴۔ مس مارٹن۔ رقیہ۔ ہمیشہ والدین کے گھر میں رہا کریگی۔

چونکہ محبت اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر چکی تھی اس لئے ان کڑی شرطوں کو منظور کر لینا پڑا اور اپنی دولت اور ثروت رقیہ کیلئے وقف کردی۔ اس کو مطلق احساس نہ رہا کہ آئندہ کیا افتاد پیش آئے وہ تو موجودہ مسرتوں کو تلخ بنانا چاہتا نہ تھا اس لئے اس سودے کو نہایت گران قیمت پر خرید کر چکا تھا اور بلا کسی کھٹکے دادِ عیش دے رہا تھا۔

شادی ہوکر دو مہینے بھی ہوئے نہ تھے کہ بقیہ جائداد بھی رقیہ کے فرمائشوں کی تکمیل میں بیچ دیگئی کیونکہ اس کی فیشن پرست بیوی دیسی شاپوں میں حسن پولش۔ ٹھنڈی بادام ؟ کو پسند نہ کرتی تھی بلکہ بمبئی اور مدراس کے انگلش فرم اس کے آرڈر کے منتظر رہا کرتے تھے۔ پیرس کے زنانہ کارخانے بہترین ملبوس اس کے لئے فراہم کرتے تھے۔ انگلستان کی واشنگ کمپنیوں کو اس کے ملبوس دھونے کا فخر حاصل تھا۔

حریت کا دلدادہ آزادی نسواں کا فریفتہ احمد باوجود یورپ کے معاشرت میں غرق ہونے کے یہ پسند کرتا نہ تھا کہ اس کی بیوی غیر مردوں سے بلا تکلف ملا کرے وہ چاہتا تھا کہ اوس کی بیوی بنی رہے۔ سوسائٹی کے میل جول سے احمد کا ڈرائینگ روم احباب کے قہقہوں کیلئے وقف رہنے لگا۔ اور رقیہ اس بزم کی انجمن آراء تھی شاید ہی کوئی وقت ایسا رہتا ہو کہ احمد کو تنہائی میں اپنی مہ پارہ سے گفتگو کا موقع ملا ہو۔

(۵)

رقیہ نے ایک باضابطہ پروگرام تیار کر لیا تھا جس پر نہایت پابندی سے عمل کرتی تھی۔ اسی اوقات میں احمد کیلئے بھی وقت مقرر کیا گیا تھا۔

ایک دن خلاف معمول احمد رقیہ سے ملنے کیلئے اس کے کمرہ میں جانا چاہا تو خادمہ نے نہایت ادب سے عرض کیا۔ حضور۔ میم صاحبہ ابھی وقت آرام فرما رہی ہیں کسی اور کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔

احمد۔ تو خیر اون کے بیدار ہونے تک میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔

چنانچہ وہ ایک متصلہ کمرہ میں بیٹھ گیا اور موجودہ حالات پر غور کر رہا تھا کہ کیا یہ بیل منڈھے چڑھے گی اور وہ اپنے مقصد حیات میں کامیاب کہلا سکتا ہے؟ کہ اس کو رقیہ کے باتوں کی آواز سنائی دی پہلے تو یقین نہ آیا۔ مگر بہ دیوار۔ کو کان لگا کر سننے لگا۔

——— پیاری رقیہ کب تک اس قفس میں اسیر رہو گی نہ خدا کی خدائی کا تماشا دیکھا نہ دنیا کا لطف اٹھایا ایک مرغی خانہ میں پیدا ہوئیں۔ بڑھیں۔ رہیں۔ کم از کم ہفتہ عشرہ کیلئے بمبئی میں چلیں اور ہندوستان کے اس لنڈن کی زیارت بھی ہو جاتی اور طبیعت بھی بہل جاتی۔

رقیہ۔ ارادہ تو میرا بھی ہے مگر ان بیڑیوں کو کس طرح دور کروں۔ احمد تو اس مذاق کے ہیں ہی نہیں کہ مجھے تنہا جانے کی اجازت دیں ان کی بدگمانی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

جعفر۔ بہانا تنا نا کون سا اہم کام ہے کہدینا کہ بمبئی میں ایک جرمن ڈاکٹر آیا ہوا ہے اوس سے طبی مشورہ لینا ہے چونکہ آپ مصروف زیادہ ہیں اس لئے میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ وہ بیوقوف ان چالبازیوں کو کیا سمجھے گا۔

اسقدر سننے کے بعد احمد کو تاب نہ رہی کہ وہ منھ پر بیوقوف کہا جا رہا ہے چنانچہ غصہ کی حالت میں کمرے کے دروازہ پر لاتیں مارنا شروع کر دیں اور اندر جب پہنچا تو دیکھا کہ جعفر اور رقیہ حیران کھڑے ہوئے ہیں غصہ کی حالت میں جعفر کو دو چار گھونسے رسید کئے اور دو چار ٹھوکریں لگائیں۔ نکل بدمعاش۔ بیہودہ۔ جب رقیہ کی جانب پلٹا تو وہ کانپ اوٹھی لیکن جعفر نے آگے بڑھکر کہا:۔

تہذیب اور شائستگی کے دلدادہ تو یوں آپ سے باہر نہیں ہوا کرتے۔ کیا یہی ایٹی کیٹ ہے کیا یہی تعلیم کا مقصد ہے آپ نے سوسائٹی کے قوانین کو توڑ دیا ہے اس کی جواب دہی آپ کے دوش پر ہے۔

احمد۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ ٹھنڈے ٹھنڈے سدھاریئے ورنہ اور بری گت بن جائے گی۔

(۶)

ان واقعات کے بعد احمد ایسا برخواستہ خاطر ہوا کہ اوس کو رقیہ کے نام سے نفرت اور اس کی صورت سے وحشت ہونے لگی اور یہ شیریں رشتہ کچھ ایسی تلخی سے ٹوٹا کہ رقیہ کے والدین نے زر مہر کی نالش داغ دی اور جو کچھ کہ رقیہ کے فیشن سے بچ گیا تھا وہ بھی ڈگری کے نذر ہو چکا اب اس کی آنکھیں کھلیں اور اس کے سر سے فیشن کا بھوت اترا جب کہ سب کچھ کھو چکا تھا۔ اب عقل آئی کہ کملی میں کملی کا پیوند ہی زیب دیتا ہے ٹینس اور سنیپر بڑھی ہوئی حریت پسندی بی کیسی ہوتی ہے چنانچہ اس صدمہ سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ شدید بخار میں مبتلا ہو گیا اور ہذیان بکنے لگا۔ عزیز و اقارب کو اس کی صحت سے ناامیدی ہو چکی اور کئی دنوں کی بیہوشی کے بعد جب آنکھ کھولی تو دیکھتا ہے کہ رضیہ اس کے پلنگ سے لگی بیٹھی ہے اور انتہائی آرام و راحت کے سامان بہم پہنچا رہی ہے اور اس کی صحت کیلئے اپنی صحت قربان کر چکی ہے اور اوس کی آنکھیں اوس کے چہرے پر لگی ہوئی ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کڑیوں کو جوڑ کر نتیجہ پر پہنچا تو اس بھیانک خواب اور اس کی المناک تعبیر سے چیخ اٹھا! اف! یہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

بے اختیار زار زار رو رہا ہوا گذشتہ لاپرواہی کی تلافی میں رضیہ کے قدموں پر جھکنا چاہتا تھا کہ کسی کی محبت سے سرشار نرگسی آنکھوں سلائک فریب خوبصورت چہرہ حسین اور پیار سے ہاتھوں نے اس کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

(۷)

عین اسی وقت ملازم نے آکر عرض کیا: حضور کوئی مس مارٹن فون پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔

جاؤ! جاؤ! ان سے کہہ دو ٹیلیفون کے تار کاٹ دو رسیور پھینک دو۔ میں آئندہ اپنے یہاں فون رکھنا نہیں چاہتا۔

نقد و تبصرہ

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس نے ملک کے گوشہ گوشہ کو علمی کرنوں سے ضیا بار کردیا ہے آج سے پہلے تعلیم یافتہ کا شمار انگلیوں پر ہوتا تھا اور ان میں بھی بہت کم ایسے تھے جنھیں تالیف اور تصنیف کا ذوق ہو لیکن عہد عثمانی نے علمی بیداریوں کا جو مستقبل پیش کیا ہے اور اردو ادب کی جو فضا پیدا کردی ہے وہ ملک کیلئے فال نیک ہے اور ہر ایک اس میدان میں مسابقت کیلئے آمادہ ہے اور اس جدید بیداری میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ نمایاں امتیاز رکھتے ہیں آپ کی بہت سی کتابوں نے ملک سے خراج تحسین حاصل کیا ہے

زیر تبصرہ کتاب آپ کی نئی کاوش ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ پچیس سال سے حیدرآباد میں اردو زبان اور ادب کی کیا کچھ ترقی ہوئی ہے۔

حصہ اول میں اردو شاعروں اور انشاء پردازوں کی قدردانی اور ان انشاء پردازوں کا ذکر خیر ہے جو عہد عثمانی میں مصروف علم و عمل ہیں حصہ دوم میں انفرادی کوششیں جامعہ عثمانیہ سے باہر اور جامعہ عثمانیہ کے سپوت کا تذکرہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ممکنہ طور پر ان لوگوں تک کا ذکر فرمایا ہے جنھوں نے سال چھ مہینے میں ایک دو مرتبہ کوئی نظم کہی ہے تاکہ ایسے خدمت گذاروں کی حوصلہ افزائی ہوسکے مگر یہ ضرور قابل حیرت ہے کہ بعض ہونہار انشاء پردازوں کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ وہ گلستان جامعہ عثمانیہ ہی سے گلچینی کر رہے ہیں۔ یادش بخیر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش جن کے بیشتر مضامین نظم و نثر ملک کے اخبارات اور رسائل میں نظر سے گذرتے رہے ہیں اور ایسے ہی جامعہ عثمانیہ سے باہر سید محمد ہادی جعفری (نظام کالج) ہیں۔ کہنہ حضرات میں احمد اللہ خاں صاحب منصور تحصیلدار جگتیال جن کی تصانیف کچھ قدر سے اونچی ہی ہونگی جن میں "سوانح اکبری" اور "ترکی خاتون کا احسان عظیم" مشہور ہیں کسی قسم کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اگر آئندہ حصہ میں اس کمی کو رفع کردیا جائے تو مناسب ہے۔ نیز کتاب زیر تبصرہ میں مضمون کے لکھنے والوں کا علیحدہ حصہ ہوتا تو اچھا تھا۔ مختصر یہ کہ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔

لکھوائی چھپوائی۔ کاغذ نفیس قیمت ۱۲؍ مصنف رفعت منزل سوماجی گوڑہ حیدرآباد دکن یا اعظم اسٹیم پریس چار مینار سے طلب فرمایئے۔

ہوش کے ناخن: مصنفہ حسن صاحب اور مخدوم محی الدین صاحب سلسلہ ادبیات کی یہ دوسری کڑی ہے جو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کے زیر نگرانی معروف خدمت گزاری ہے جس کا مقصد ملک میں اردو کا احیاء ذوق پیدا کرنا ہے یہ ایک چھوٹا سا ڈراما ہے جو ایک انگریزی ڈراما کا آزاد ترجمہ ہے۔ یہ ڈراما یوم کلیہ کے وقت تمثیل کیا گیا تھا جس کو مہاراجہ صدر اعظم بہادر اور ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی ملاحظہ کیا تھا۔ اس کے بعد ایکسلسیر تھیٹر میں بھی تمثیل کیا گیا اور کامیاب ثابت ہوا جس میں ہماری معاشرت کا حصہ نمایاں ہے جس طرح اس چھوٹے سے ڈراما میں دو دماغ صرف ہوئے ہیں اس کی طباعت میں بھی دو پریس مصروف رہے ہیں ملک میں ایسے ڈراموں کی ضرورت ہے تاکہ موجودہ پامال ڈراموں کی بجائے ہم آئندہ دن سینما کی بدولت ہمارا ذوق سنبھال کر ہم راہ سے بہکنے نہ سکیں۔ قیمت ۱۰؍ رفاہ عام سلسلہ ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتا ہے۔

سالنامہ بزم اردو۔ بابتہ ۱۳۴۲ف مرتبہ میر سعادت علی صاحب رضوی بی اے۔ یہ بھی عثمانیہ کے ہونہار سپوتوں کے ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے تاکہ ملک کا ہر فرد اس سے واقف ہو اور باہمی ربط و تعلق رہے۔ جتنے بھی مضامین اس میں شائع ہوئے ہیں وہ طلباء ہی کے دماغ سوزیوں کے نتائج ہیں نثر و نظم کا حصہ بھی اچھا ہے لیکن ایک ہی شاعر کی دو دو نظمیں کچھ ضروری نہیں معلوم ہوتیں۔ آخر میں بزم اردو کی ادبی جدوجہد اور خطبہ صدارت اور رپورٹ ۱۳۴۲ف موجود ہے تاکہ باہر والوں کو ادبی جدوجہد کا بھی علم ہو جائے ممبران اور اراکین بزم کا ایک بلاک بھی دیا گیا ہے قیمت کا کہیں اندراج نہیں ہے۔

محترم قارئین کی خدمت میں ختم سال کی اطلاع ایک مہینہ پہلے سرخ چٹھی کے ذریعہ دی جاتی ہے کہ آئندہ اعانت منظور نہ ہو تو خود یا کارڈ سے مطلع فرمائیں۔ ورنہ پرچہ وی پی کیا جائے گا جب کہیں سے اطلاع نہیں ملتی تو یہ سمجھ کر کہ آئندہ اعانت منظور ہے پرچہ وی پی کیا جاتا ہے مگر واپس کر کے دفتر کو مصارف وی پی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ براہ کرم ایسا نہ کیجئے ایک کارڈ آپ کے عدم ادائے اطلاع دے سکتا ہے۔

تحقیق سن فصلی

(مولانا عبد الواسع صاحب مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

—— بسلسلۂ گذشتہ ——

یہ دونوں دائرے ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہیں بلکہ دائرۃ البروج معدل النہار سے تقریباً ۲۳° ۲۷′ مائل ہے۔ اس لئے دائرۃ البروج معدل النہار سے دو متقابل نقطوں پر تقاطع کرتا ہے اور اس کے دو متقابل نقطے معدل النہار سے شمالاً و جنوباً انتہائی فاصلہ پر واقع ہیں اس سبب سے دائرۃ البروج میں چار خاص نقطے معین ہو گئے ہیں جن سے وہ چار برابر حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ (۱) اعتدال ربیعی یعنی وہ نقطہ تقاطع جس پر پہنچنے کے بعد آفتاب معدل النہار سے شمالی ہو جاتا ہے (۲) انقلاب صیفی یعنی وہ نقطہ جس پر پہنچ کر آفتاب معدل النہار سے بجانب شمال انتہائی فاصلہ پر ہوتا ہے۔ (۳) اعتدال خریفی یعنی وہ نقطہ تقاطع جس پر پہنچنے کے بعد آفتاب معدل النہار سے جنوبی ہو جاتا ہے۔ (۴) انقلاب شتوی یعنی وہ نقطہ جس پر پہنچ کر آفتاب معدل النہار سے جنوب کی طرف انتہائی دوری پر ہوتا ہے۔ اور چونکہ زمین کا مدار بیضوی ہے اور آفتاب اس کے ایک فوکس پر ہے جس کی وجہ سے آفتاب و زمین کا درمیانی فاصلہ یکساں نہیں رہتا بلکہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے اس لئے علاوہ سابقہ چار نقطوں کے دو اور نقطے بھی دائرۃ البروج پر معین ہو گئے ہیں

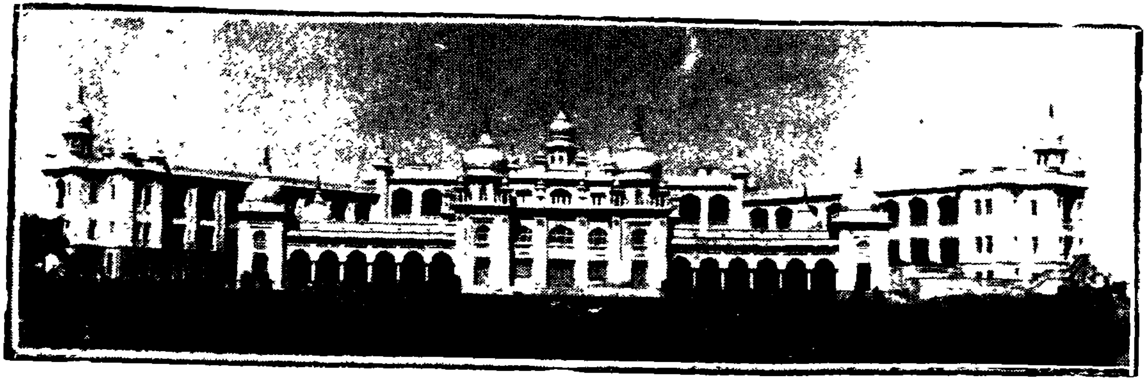
(۱) نقطہ راس جس پر پہنچنے کے وقت زمین آفتاب سے قریب تر ہوتی ہے اس کو اوج و ذنب شمسی بھی کہتے ہیں کیونکہ جب آفتاب اس پر نظر آتا ہے تو زمین سے بعید تر فاصلہ پر ہوتا ہے۔

(۲) نقطہ ذنب جس پر پہنچ کر زمین آفتاب سے بعید تر ہوتی ہے اس کو حضیض و راس شمسی بھی کہتے ہیں اس لئے کہ آفتاب اس نقطہ پر دکھائی دینے کے وقت زمین سے قریب تر ہوتا ہے۔

اس بیان سے دو امر معلوم ہوتے ہیں:-

۱۔ آفتاب و زمین کا درمیانی فاصلہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا بلکہ اس میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔

(باقی آئندہ)



جاگیردار کالج

شہاب

جلد (۳) خورداد ۱۳۴۴ف م اپریل ۱۹۳۵ء نمبر ۷

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) — گورنمنٹ سے (عہ۵)

(برقی پریس میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد شائع ہوا)

رُباعیات

مولٰنا امجدؔ

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

(دینِ اسلام مقبول الٰہی ہے)

مشکل ہے بہت صاحبِ ایمان ہونا | کچھ کھیل نہیں ہے حق پہ قربان ہونا
یاں مثلِ حسینؓ سر قلم ہوتا ہے | امجدؔ آسان نہیں مسلمان ہونا

"صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً"

(ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا ہے اور اللہ سے بہتر رنگنے والا کون ہے؟)

دیکھو علیؓ و فاطمہؓ کے ماہ کا رنگ | دیکھو شہِ لولاکؐ کے نوشاہ کا رنگ
ڈوبے ہوئے ہیں خونِ شہادت میں حسینؓ | ہے جامۂ عبدیت میں اللہ کا رنگ

یورپ کی دلچسپ ڈاک

(جناب نواب شہید یار جنگ بہادر)

NEUES　　　　　　　　　　　　　　۲۰ ذیحجہ شب جمعہ شب قدر

EXCELSIOR HOTEL　　　　　　　　　۱۲ بجے۔

AROSA

حضرت بسمل۔ سلام مسنون اسلام :۔ عدن سے میں نے داستان محبت کا پہلا باب روانہ خدمت کیا تھا۔ غالباً کیا یقیناً اب تک وصول ہوچکا ہوگا۔ وہاں سے چلنے کے روز آپ کی پہلی حرکت مذبوحی یعنی پہلا خط ملا جس میں آپ نے وہی پرانا دکھڑا رویا ہے کہ خط لکھو، وہاں کے حالات لکھو، تصاویر بھیجو وغیرہ وغیرہ۔ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ "وہ سودا جس میں رہتا تھا کہاں باقی ہے اب وہ سر" وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی۔ بھائی صاحب! اب وہ مضمون بجھانے والی بات یعنی فراغت کہاں زندگی ہماری ہی مگر ہے دوسرے کے ہاتھ میں۔ نہ سونا اختیاری نہ اوٹھنا اختیاری، نہ کھانا اپنے بس کا نہ پینا اپنے ارادہ پر۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ پھر افکارات جدا مارے ڈالتے ہیں۔ طبیعت بجھی بجھی سی رہتی ہے نہ وہ بشاشت ہے نہ وہ زور طبیعت۔ پھر بہلا خاک مضمون سوجھے۔ یہ پہلا خط جہاز پر قلم برداشتہ لکھدیا اور خدا ہی جانے کیا لکھا۔ کس قابل ہو اقتباس کرلو ورنہ پڑھکر چاک کردو۔ "این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ"۔ اچھا صاحب سنئے۔ اگر حافظہ ساتھ دے تو عدن کے بعد کے حالات! ہمارا جہاز بہشت شداد سے نکل کر بندر سوڈان پہنچا یہ شاید اس جہاز کی سوانح عمری میں پہلا مرتبہ ہے کہ آپ سوڈان تشریف لیگئے ہوں۔ لارڈ اور لیڈی سدرلینڈ جو انگلستان کے امرائے عظام سے ہیں اس جہاز پر سوار تھے اور اونھیں بندر سوڈان پر اترنا تھا جس کیلئے شاید نہیں یقیناً دوسو پونڈ دینے پڑے کہ جہاز راستہ سے کسی قدر ہٹکر کنارے تک پہنچے اور وہاں دو گھنٹے کیلئے لنگر انداز ہو چلئے۔ اس بہانے "مہدی مرحوم" کے مرز بوم پر "مہدی شہید" نے بھی قدم رنجہ فرمادیا۔ عمارات ریل وغیرہ خود زبان حال سے گویا ہیں کہ انگریزی راج ہے گھنٹہ بھر موٹر کرایہ کیا اور گھوم آئے کوئی خاص بات نہیں۔ یہاں ہاتھی دانت اور گینڈے کی کھال وغیرہ کا سامان بکثرت فروخت

ہوتا ہے۔ یہاں سے چل کر دوسرے روز سویز کینال پر چار پانچ گھنٹے قیام رہا۔ یہاں چیچک کے ٹیکوں کے سرٹیفکیٹ کی جانچ کیگئی۔ یہاں سے اکثر حضرات ذریعہ موٹر قاہرہ روانہ ہوئے چونکہ میں پہلے سفر میں قاہرہ جاچکا ہوں اس لئے اس دفعہ جانا بیکار سمجھا صبح میں چھ بجے ذریعہ موٹر قاہرہ روانہ ہوتے ہیں۔ تھامس کک کے ذریعہ ایک روز قبل جہاز پر سے انتظام ہوسکتا ہے فی شخص شاید آٹھ پونڈ ہوتے ہیں چار گھنٹے ریگستان میں موٹر دوانی کے بعد ہلیو پلس کا شہر ملتا ہے جو قاہرہ جدیدہ ہے یہاں بالکل ماڈرن ڈزائین کی عمارات ہیں نہایت خوبصورت شہر ہے اور تمام شہر مسٹر جاسپر کا ڈزین کیا ہوا ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈزینر ہیں اور جو حیدرآباد دو مرتبہ اس سلسلہ میں آچکے ہیں اس کے بعد قاہرہ کی عظیم الشان بستی ہے قدیم مساجد اور عمارات قابل دید ہیں واپسی پر میں یہاں کے تصاویر آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں۔ اہرام مصر اور ابوالہول کے متعلق مرا بیان کچھ نامناسب سا ہی معلوم ہوتا ہے آپ کسی تاریخ سے اس حصہ کا اضافہ فرمالیں۔ میری طرف سے صرف اتنا بیان شریک فرمالیں کہ واقعی حضرت اونٹ کے متعلق پروردگار عالم نے خوب فرمایا ہے کہ ” والی الدبل کیف خلقت “ عجب سواری ہے۔ خدا ہر شخص کو نصیب کرے اگر جنت میں بھی یہی سواری ہے تو بھائی پھر تو ہم پیدل ہی پھرا کرینگے چڑھاؤ پر مصیبت تو تھی ہی مگر اپر آتار پر تو قیامت ہی تھی۔ خدا جانے لیلی کا ساربان ہی اشتر غمزے کیا کرتا تھا یا دنیا جہان کے ساربان سب اوسی خلقت کے واقع ہوئے ہیں لاکھ کہتے ہیں بھائی صاحب خدا کیلئے رسول کیلئے اسلام کی غیرت کا واسطہ عرب کی حمیت کا واسطہ دھیرے دھیرے چلئے ابوالہول صاحب بھاگ نہیں جارہے ہیں اگر ہماری ٹرین چھوٹ جائے تو آپ کی بلا سے تکلیف اٹھائینگے مرتو نہ جائینگے یا نہیں سنتے تو بھائی ہمیں اتار دو ہم اس سواری سے درگذرے۔ مگر صاحب وہ ساربان کا بچہ کس کی سنتا ہے لیجا کر ہی چھوڑا۔ واپسی پر ہم نے اوسی خر مشکیں کو ترجیح دی اگرچہ یہاں خر کی سواری مفت نہ تھی۔ پھر بھی یہ ”بچہ شتر“ اپنے مادر محترمہ سے کہیں بہتر تھا۔ خیر بھائی صاحب شام کے چھ بجے قاہرہ سے ریل پر سوار ہوئے اور دس بجے رات کے پورٹ سعید پر پہنچگئے جہاں ہمارا جہاز انتظار میں چپکا کھڑا ہوا آہیں بھر رہا تھا۔ پورٹ سعید خاصہ شہر ہے یہاں سامان بہ نسبت اور مقامات کے ارزاں ملتا ہے اس لئے کہ یہ بندرگاہ بین الملی ہونے کی وجہ سے یہاں دیوٹی یعنی کروڑگیری نہیں لیجاتی۔ یہاں ہر قوم ہر مذہب و ملت کے لوگ بستے ہیں یہ شہر اگر یورپ کے مشہور شہروں پیاریس وغیرہ سے

کسی اور چیز میں مقابلہ نہ کرسکے تو مضائقہ نہیں۔ مگر وہاں جس قسم کی شبانہ زندگی ہے اوس میں یہ اون شہروں سے کسی صورت میں کم نہیں ہے۔ غرض بارہ بجے رات کے جہاز نے لنگر اٹھایا اور ہم تیسرے روز نیپلز پہنچگئے یہاں جہاز چھ گھنٹہ ٹہیرتا ہے یہ سرزمین یورپ میں داخل ہے اور اٹلی کی حکومت ہے یہاں سیاح کیلئے دو مقام خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہیں ایک تو وہ دنیا کا عظیم الشان کوہ آتش فشاں وسوویس اور دوسری اس کی تباہ کاریوں کی مثال شہر پمپئی کے کھنڈر۔ کوہ آتش فشان کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا۔ دہانے کے قریب قریب تک موٹر جاسکتاہے۔ تھوڑا حصہ پیدل چلنا پڑتاہے گرمی اور حرارت اس غضب کی ہے کہ کیا بیان کیا جائے جن حضرات کو دوزخ پر اعتقاد نہ ہو اونہیں کم سے کم ایکمرتبہ وسوویس کے دہانہ کا نظارہ ضروری ہے۔ اگر وہ چاہیں اور اُن کا ایمان۔ یہاں سے چلئے شہر پمپئی کے کھنڈر کی جانب۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانہ میں قبل مسیح یہ دنیا کا عظیم الشان شہر تھا اور صاحب اگر کوئی نہ مانے تو بھی کھنڈر زبان حال سے منوا کر چھوڑینگے۔ تمام راستے سنگ بستہ ہیں۔ تماشہ گاہ عام دیکھنے کی عمارت ہوگی جس کے در و دیوار شکستہ اپنی عظمت کی داستان اب بھی سنا رہے ہیں۔ دفاتر سرکاری خصوصاً عدالت کا مکان بھی قابل دید ہے۔ مکانوں کے فرش پچی کاری کے نایاب نمونہ ہیں۔ ہر مکان میں مردانہ حصہ جدا ہے۔ زنانہ حصہ جدا۔ ہر صحن میں حوض بھی ہیں جن میں طرح طرح کے فوارے ہیں۔ راستوں پر صفائی کا انتظام اس سے ظاہر ہے کہ خس و خاشاک کیلئے سنگ بستہ چوبچہ بنے ہوئے ہیں اور ہر گلی کوچہ میں نک آب نوشی کیلئے حوض بنے ہوئے ہیں جانوروں کو پانی پلانے کے حوض جدا ہیں۔ مگر یار جیسر یہ تو کہو کہ آخر اس غضب الٰہی کے نزول کا سبب کیا ہوا یہ بسا بسایا ہوا شہر بہ حیثیت ارضی بیک گردش چشم ایسی تباہ ہوئی کہ ہزاروں برس تک کسی کو یہ بھی نہ معلوم ہوسکا کہ اس نام کی کوئی بستی بھی یہاں بستی تھی۔ دو سو برس قبل کسی شخص کو اس ٹیلہ پر چلتے ہوئے ایک غار میں کچھ عمارت کا حصہ نظر آیا جس کی اطلاع پر اس کی کھدائی شروع ہوئی تب کہیں جا کر یہ شہر برآمد ہوا۔ کوئی شخص ساری بستی میں زندہ نہ بچا جو اس کی داستان سنا سکتا۔ بھائی صاحب غضب الٰہی کا سبب تلاش کرنے کے لئے زحمت کرنیکی ضرورت نہیں۔ ہر گلی ہر کوچہ وجہ بیان کر رہا ہے ہر گلی میں متعدد قحبہ خانجات ہیں دروازوں پر بجائے کتبہ جات یا سین بورڈ کے وہ جدت آفرینی کیگئی ہے کہ آپ بھی دیکھ لیں تو عش عش کریں۔ سننا چاہتے ہو تو سنو۔ علامت جنسی پتھر کی بنی

ہوئی عین دروازہ کے اوپر جاذب نظر ہیں اندر تشریف فرما ہوجئے تو علیحدہ علیحدہ حجرے ہیں جہاں چارپائیوں کے عوض چبوترے بنے ہوئے ہیں جس کے مقابل کی دیوار پر خاص وضع کی تصویریں مختلف رنگوں میں موجود ہیں جہاں پر اوسی طرح کا عمل ہوا کرتا تھا جس طرح کی ہم آغوشی کی شکل دیوار پر موجود ہے۔ آپ کا جی چاہے تو اسی صورت میں یہاں عمل فرمائیے یہ صورت پسند نہ ہو تو دوسرے حجرے کی سیر فرمائیے غرض جو صورت پسند ہو اور آپ جس طرح اپنی خواہش کی تکمیل چاہتے ہوں تو اوسی حجرے میں تشریف لیجائیے جہاں آپ کی خواہش کا نقشہ دیوار پر موجود ہو۔ رنگ کہاں اچھی خاصی مینا کاری ہے جو آج تک بھی اپنی داستان سنا رہی ہے۔ کہئے آج بھی یورپ نے باوجود اپنی عیاشی کی ترقی کے کہیں ایسی جدت آفرینی کا نمونہ پیش کیا ہے؟ بھائی صاحب لاشیں اب بھی موجود ہیں ایک مکان میں کھانا کھایا جارہا تھا میز پڑی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے اہل خاندان چار پانچ افراد بیٹھے ہوئے ہیں کچھ برتن بھی ٹوٹے ہوئے ابھی موجود ہیں مگر معلوم نہیں کھانا کھانا نصیب بھی ہوا یا نہیں۔ لاشوں پر سیال مادہ چڑھ گیا ہے جو اب مثل پتھر کے منجمد ہوگیا ہے۔ حمام بھی بہت بہتر ہیں اور بعض ترکی حمام کے نمونے ہیں مگر یہاں بھی وہی جدت ہے کہ مردوں کے نہانے کیلئے علیحدہ مقام اور عورتوں کے علیحدہ تو سنے ہی ہوں گے یہاں مشترک حمام بھی ہیں اور اجتماع جنسی کی بہتر اٹی ہوئی مثالیں آج بھی موجود ہیں۔ یہاں سے واپسی میں راستہ میں ایک کارخانہ ملتا ہے جہاں گونگنا اور سیپ کا کام نہایت اعلیٰ ہوتا ہے اور جہاں دنیا میں سب سے بہتر مرجان ملتا ہے یہاں سے واپس ہوکر پھر جہاز پر سوار ہوگئے اور دس بارہ گھنٹے بعد جنیوا کے بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ فبروری کی ۲۲ تاریخ تھی جمعہ کا روز تھا صبح کا وقت تھا کہ سمندر کا سفر تمام ہوا۔ اور یہاں ہم ہوٹل مارابیری میں مقیم ہوئے۔ دو روز یہاں قیام کا ارادہ ہے اس کے بعد ویانا روانہ ہونگے اگر اسی طرح کی فرصت کسی اور شب میں ملگئی تو جنیوا ویانا اور (ارنزوا سوئٹیزرلینڈ) کے حالات بھی ضرور لکھوں گا۔ ایک بجے رات کا وقت ہے کل نویں ذیحجہ ہے عرفہ کا روز ہے پرسوں عید ہے مسلمان ہوں۔ جانتا ہوں قربانی کرنی ہوگی۔ نماز پڑھنی ہوگی عید کا دن ہے۔ یقیناً ہے مگر کیا عید کے یہی معنی ہیں یا اس کے سوا عید میں اور بھی کچھ ہوتا ہے۔ اگر عید محض قربانی اور نماز کا نام ہے تو بیشک ہماری بھی عید ہے۔ اگر عید قلبی انبساط کا نام ہے تو بھائی ہماری عید کہاں؟

مبارک باد عید آن دردمند بےکس و کورا ÷ ÷ ÷ کہ نے کس را مبارکباد گوید نے کسے اُو را

خدا تم سب کو عید مبارک کرے۔ ہمارے لئے تو محرم ہے۔

برسوں کے بعد لکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بھی حافظ کے بھروسہ پر اور پریشان دل و دماغ کے ساتھ۔ خدا جانے کیا لکھا ہے اور تم کیا کہو۔ تمہارے اصرار سے مجبور ہو گیا۔ فرصت ملگئی چلو گھنٹہ دو گھنٹہ اسی شغل میں گزار دئے۔ باقی داستان فردائے شب راشتاق دید۔ "شہید"

نقد و تبصرہ

تاریخ دکن اور اُس کی اہمیت:۔ مصنفہ جناب عبد المجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی عثمانیہ۔ اگرچہ یہ مضمون کانفرنس طلیسانین کے موقع پر پڑھا گیا تھا اور مخاطب بھی انہیں کو کیا تھا جس میں تاریخ اور اس کی اہمیت اور مطالعہ کی نسبت زور دیا گیا ہے۔ طرز بیان نہایت دلچسپ ہے اور اس انداز سے تاریخ دکن کا خاکہ کھینچا ہے گویا واقعات ہمارے آنکھوں کے سامنے گذر رہے ہیں۔ آپ کو تاریخ پر نہایت عبور ہے اور اکثر دفتر مقامی رسائل کی نہایت سیر چشمی سے علمی اعانت فرماتے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ اس میں اور وسعت پیدا ہو اور یہی ملک کی اصل خدمت ہوگی۔ لکھوائی چھپوائی دیدہ زیب ہے۔

شگاگو کی صد سالہ نمائش:۔ مصنفہ نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب بی۔ اے خلف جناب نواب معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ۔ نام ہی اعلان کر رہا ہے کہ اس میں کیا ہوگا یہ وہ نمائش ہے جو ۱۹۳۳ء میں منعقد ہوئی تھی۔ حیدرآبادیوں میں آپ ہی ایک ہیں جنھوں نے اس میں شرکت کی ہے اور دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ اگرچہ یہ اس سے پہلے مجلہ عثمانیہ میں شایع ہو چکا ہے لیکن اب کتابی صورت میں چھپوایا گیا ہے مصنف اور صدر نمائش کا ایک بلاک بھی ہے۔ امرائے ملک میں نواب صاحب کا یہ ادبی ذوق لائق ستائش ہے قیمت کا کہیں اندراج نہیں۔

غزل

جناب حکیم محبوب علی صاحب صفی

ہوگئی ہیں کسی آنکھوں کی گرفتار آنکھیں
سب کی دو دو ہیں تو اپنی ہیں صفی چار آنکھیں

کالی آنکھوں پہ تیری ناز ہے تجھ کو اتنا!
تو نے دیکھی ہی کہاں نرگس بیمار آنکھیں

ہائے ان حسن فروشوں کو کہوں کیا یارب
ہوگئیں دیدہ و دانستہ گرفتار آنکھیں

آ بیٹے صلح بھی کرلیں گے لڑائی کیسی؟
صبح کو اٹھ کے ہوا کرتی ہیں جب چار آنکھیں

کیا خبر تھی کہ اوسے دیکھ کے دل آئے گا؟
اور بھی مانگتے اللہ سے دو چار آنکھیں

آگیا اگلے زمانے کی محبت کا خیال!
ہائے کیوں ہوگئیں آج ان سے میری چار آنکھیں

خواہش وصل ہے اب ہم کو نہ شوق دیدار
دل کا مختار ہے دل، آنکھوں کی مختار آنکھیں

ہوگیا کال حسینوں کا دکھائی دینا
رہ گئیں اب تو صفی نام کو دو چار آنکھیں

غزل

جناب فنا من صاحب کنتوری

حقیقت غم کی ہے کچھ اور نہ قیمت شادمانی کی
یہ دو موہوم موجیں ہیں سراب زندگانی کی

خدا جانے وہ کیا جلوہ تھا جو دیکھا تھا موسیٰ نے
صدا عالم میں اب تک گونجتی ہے لن ترانی کی

نزاکت پردہ سنگیں دلی میں کیا چھپے آخر
نگاہ یاس نے بسمل کی قاتل پر گرانی کی

فریب رنگ پاکر اس بہارستان ہستی کو
بھرے دامن میں برسوں اشک خوں نے گلفشانی کی

ہمیں تو چار دن کی زندگی بھی ہوگئی دوبھر
خضر سے پوچھئے لذت حیات جاودانی کی

اگر میں ہول بھی ہوں رنگ پریدہ ہستی کا
ہوئی مرہون منت کب میری تصویر فانی کی

حریف سعی بیجا کب ہوئی روشن دلی فنا من
کہ موج آب گوہر کو نہیں فرصت روانی کی

مکتوبات جمیل

خفا نہ ہو جانا ایسی بھی خفگی کس کام کی۔ کسی نے دو چار مہینے خط نہ لکھا تو اس درجہ خفا نہیں ہوا کرتے۔ میں نے اپنی ایک سہیلی کو مکمل مکمل ایک سال خط نہ لکھا۔ یقین مانو اس دوران میں سات تار اٹھارہ خطوط آئے مگر میں نے توجہ نہ کی۔ پھر میں خود ان کے ہاں چلی گئی مگر وہ خفا نہ ہوئیں۔ میری یہ عادت ہے اور کچھ نہیں۔

جھوٹوں کو بھی سچا بننا پڑتا ہے۔ میں جھوٹی سہی مگر اس معاملہ میں نہیں۔ سبب بھی بتلا دوں گی کہ میں نے خط کیوں نہ لکھا۔ الجھنوں میں تھی اسی کو لوگ زندگی کہتے ہیں۔ خدا کا لاکھ شکر ہے کہ اب پھر سلامتی میں ہوں۔ اس کش مکش نے مجھے پھر ناتوان بنا دیا ہے حتی الامکان میں زندگی کے شورش انگیز اعمالوں سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ مگر اس کی دلچسپیوں کی منکر بھی نہیں ہوں۔ اس لئے دور دور رہتے ان کو دیکھا کروں گی مگر بخدا ان میں شریک نہ ہوں گی۔

ہاں میں اپنی تمام سہیلیوں میں "شوخ سہیلی" سے بہت بے تکلف ہوں محبت ہے نفرت ہے بس سب کچھ انہیں کے ساتھ ہے اور اس محبت مردانہ کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ ہم دونوں اکثر آپس میں لڑتی رہتی ہیں۔

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے — کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

اب ان کی شادی ہو گئی ہے جس کا مجھے بے انتہا رنج بلکہ صدمہ ہے۔ کیونکہ میرا اپنا خیال ہے کہ شادی کے بعد شاعرانہ زندگی کی موت ہو جاتی ہے اور نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اس پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا کلیہ ہے۔ اپنا اپنا خیال!!

بہت دنوں سے کوئی طویل شاعرانہ خط تم نے نہیں لکھا۔ خط لکھئے۔ طویل مزہ دار — اور دلچسپ پھر میں سلسلہ قائم کر دوں گی۔

اچھا اب جاؤں؟

آرفیس کے نغمے

(حجاب حجاب)

وہ بھی ایک چاندنی رات تھی! . . . . . . میرے تخیل کے دنیا کی! آرفیس چاند کے ایک ٹیلہ پر بیٹھا اپنے نغموں سے ساری دنیا کو مدہوش کرچکا تھا . . . سب محوخواب تھے مگر میں اور تم محو نغمہ . . . آرفیس ہر شب اپنی موسیقی کے تانوں کو الاپتا رہتا تھا . . . . اس کی انگلیاں اسرار کے تاروں پر اس طرح چلتی تھیں جیسے بیقرار موجیں ساحل سے سر ٹکرا دیں . یوں . . . . وہ روز نت نئے گیت نکالتا اور ہماری دنیا میں حشر برپا کرتا رہتا . . . تمہیں شاید یاد ہوگا کہ ایکبار جب میں تمہارے شانے پر اپنے سر کو رکھے ہوئے تھی —— اور تم میرا ہاتھ پکڑے میری سرخ نگ والی انگوٹھی دیکھ رہے تھے میں نے تم سے کہا تھا "ہماری دنیا کیسی بہترین ہے یہاں رومانیت پروان چڑھتی ہے —— شعریت پلتی ہے —— اور محبت تڑپتی ہے —— کیوں تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ اچانک میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا "آرفیس کے نغمے دائمی ہوتے ہیں میرے دوست" . . . . تم نے کہا ہاں میرا تو یہی خیال ہے بلکہ مجھے تو یقین ہے . . . . . . تم اب کچھ سن رہے ہو ؟ اے بھول جانے والے دوست! دیکھو میں اسی کنج گلاب میں کھڑی ہوں —— پر نہ جانے کیوں اب آرفیس کے ساز خموش ہیں . . . نغموں کا تار ٹوٹ چکا —— شاید وہ اپنے گیت بھول گیا —— یا یوں سمجھو کہ چونکہ تم میرے پاس نہیں ہو میرا ساز ہستی خاموش ہے . . . . اور میرے لئے ساری دنیا خموش ہے —— !

آہ وہ حسین صبح —— اور پیاری راتیں . اکثر شب تنہائی میں . کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں بیتے ہوئے دن عشق کے . بنتے ہیں شمع زندگی —— اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر !

نواب محمد کاظم علیخاں صاحب بی اے دوم تعلقدار شہاب کے ساتھ جن ہمدردیوں کا اظہار کررہے ہیں وہ تشکر سے بے نیاز ہے۔

پہیلی

(جناب سید ابو الفضل صاحب عثمانیہ)

ریل کے اول درجہ میں قرمزی رنگ کی نشست پر ایک مہ جبین کچھ جھکی ہوئی بیٹھی تھی اس کے نازک انگلیوں کی گرفت میں ایک قیمتی پنکھا تھا۔اس کی ناک میں ایک سنہرا پھول تھا۔ سینہ کے مد و جزر سے اس پر کا خوشنما پن ہچکولے کہا رہا تھا جس طرح کشتی سمندر کی موجوں پر کھیلتی رہتی ہے۔ وہ بہت مضطرب تھی۔

اس کی مقابل والی نشست پر کمیشن کا سکرٹری بیٹھا ہوا تھا وہ ایک ہو نہار مشہور ادیب بھی تھا جس نے وقتاً فوقتاً ملک کے ممتاز رسائل میں ناول کے نام سے طویل افسانے لکھکر بیحد شہرت حاصل کی تھی وہ حسینہ کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان واقعات کو معلوم کرنا چاہتا ہے جو عورت کے دل میں موجزن ہیں۔ وہ مسلسل دیکھ رہا تھا کہ اس متجسس اور مضطرب عورت کے سارے حالات معلوم کرلے بالآخر اس کے چہرے سے فتحمندی کے آثار نمودار ہونے لگے گویا اس نے سب کچھ پا لیا ہے۔ اس کے انتہائی پوشیدہ واقعات اس کی سوچ اور اس کے دل و دماغ کا پوشیدہ خزانہ گویا ملکۂ نفسیات کے آگے خود پکار پکار کر کہہ رہا تھا

"میں سمجھ گیا! میں سمجھ گیا —— تمہارے دل کی اتھاہ گہرائیوں کے واقعات مجھ پر منکشف ہو چکے ہیں"۔ سکرٹری نے اس کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہوئے کہا "تمہارے حساس اور غمگین روح کسی کے چنگل سے نکل بھاگنا چاہتی ہے —— ہاں! لیکن کشمکش بہت خوفناک اور وحشت انگیز ہے —— تاہم تمہیں ہمت نہ ہارنا چاہئے کامیابی تمہاری ہے۔ —— یقینی!!"

"والڈیمر! میرے واقعات کو شایع کردو" خوبصورت عورت نے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ کھیل رہی تھی وہ کہنے لگی "میری زندگی بھی عجیب پر اسرار اور غیر مربوط واقعات کی ایک طویل کہانی ہے سب سے بڑھکر یہ کہ میں بیحد پیچیدہ ہوں —— میں کسی افسانے کی غمزدہ اور دکھیاری ہیروان ہوں۔ والڈیمر! میری دلی کیفیات کو عوام پر ظاہر کردو۔ مصیبت زدہ روح کی جیتا جاگتا کھلم کھلا لکھ دو۔ تم ماہر نفسیات ہو۔ ریل میں ملے ہوئے

ہمیں ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا لیکن تم نے سب کچھ معلوم کرلیا ہے"

"مجھ سے کہو؟ واقعات مجھ سے کہو!" والڈیمر نے کہا

سنو! میرا باپ ایک غریب منشی تھا وہ زندہ دل اور چالاک تھا لیکن ہر انسان میں برائیاں بھی تو ہوتی ہیں میں اسے ملعون کرنا نہیں چاہتی ——— وہ پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا ——— رشوت لیتا تھا۔ میری ماں! لیکن تفصیل کیوں؟ غرض افلاس، روزی کے مصائب، بدنامیاں ——— ہاں ——— ان چیزوں کو یاد کرنے سے میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ خیر تو میں مجبور تھی کہ اپنی روزی آپ تلاش کروں۔

تم بورڈنگ ہوس کی بدترین زندگی سے تو واقف ہو۔ جہاں مخرب اخلاق ناول ہوتے ہیں۔ ابتدائے شباب کی سراب آسا سحر آفرینیاں ہوتی ہیں اور محبت کی ہلکی اولین تحریک ہوتی ہے!

وہی وقت انتہائی آزمائش کا ہوتا ہے جہاں آدمی کے دل سے زندگی کے فرائض اور اس کی اہمیت کا پردہ اوٹھ جاتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جب وہ سب کچھ بھلا بیٹھتا ہے ——— اور تم مصنف ہو! عورتوں کی فطرت سے تم بخوبی واقف ہو!

بدقسمتی سے میرے دل میں ہر چیز کا ایک ٹھوس جذبہ موجود ہے ——— میں صرف خوشی چاہتی تھی اور میرا عین خوشی اسی میں مضمر تھی کہ بے انتہا آزاد ہو جاؤں ——— ہاں! میں نے اسی میں مسرت کو مستتر سمجھا۔ "عجب شخصیت ہے"! مصنف بڑبڑایا اور اس کے ہاتھ کو چوڑیوں کے قریب بوسہ دیا اور کہا "میں تمہیں پیار نہیں کر رہا ہوں بلکہ انسانی مصائب کو چوم رہا ہوں"

او والڈیمر! میں شہرت، رفعت اور کامیابی کی خواہشمند تھی جس طرح ——— بہانہ کیوں ڈھونڈوں؟ جس طرح ہر بنی آدم چاہتا ہے ——— میں عام عورتوں سے مختلف کسی بلند شے کی آرزومند تھی۔ اور پھر ——— اور پھر میرے راستہ میں ایک بوڑھا جنرل حائل ہوگیا ——— خیر!!

"سنا آپ نے ——— یہ قربانی تھی۔ بس اپنے نفس کو دوسرے کی ہوس کی بھینٹ چڑھانا تھا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتی تھی ۔ اس سے میں نے ایک دولتمند خاندان ضرور پایا اور اس قابل ہوئی کہ سفر کروں اپنی ہر خواہش کو پورا کرسکوں مثلاً لباس آرائش وغیرہ میں اس کے علاوہ یہ کہ نیک کاموں میں روپیہ

صرف کر سکتی تھی۔

لیکن میں اس کی وجہ سے کس قدر مصیبت میں مبتلا تھی۔ اس سے مجھے کتنی نفرت اور وحشت ہوتی تھی اس کا میرے گلے لگنا کس قدر برا معلوم ہوتا تھا۔ تاہم میں اس کی برائی کرنا نہیں چاہتی۔ اس نے اپنے زمانے کی قدیم لڑائیوں میں بے انتہا شہرت حاصل کی تھی۔

بعض اوقات میرے خیالات اپنے لئے سوہان روح کا باعث بنتے تھے لیکن پھر میں غور کر لیتی کہ بوڑھا روز بروز موت سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے بس اس کے مرتے ہی میں اپنے محبوب سے آزادانہ مل سکتی ہوں وہ جو میری ارمانوں کا بادشاہ ہے۔ سنتے ہو۔ والڈیمر میرا ایک پیار ابھی موجود ہے !!

اس نے اپنا پنکھا زور سے جھلانا شروع کیا۔ اس کا چہرہ بہت مغموم ہو گیا۔ وہ پھر کہنے لگی:

"آخر کار بوڑھا مر گیا۔ اس نے میرے لئے جائداد بھی چھوڑی۔ اب میں فضاء آسمانی میں تیرنے والے پرندے کی مانند آزاد تھی۔ والڈیمر میری حقیقی مسرتوں کا یہی زمانہ ہے نا؟ مسرت اب چھلنی مانند میرے روشندانوں سے ٹکرا رہی ہے مجھے صرف اس کو اپنے کمرہ میں داخل کر لینا ہے لیکن والڈیمر سنو!

تم میری باتوں سے اکتا گئے ہوگے۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ مجھے اپنے آپ کو اپنے محبوب کے حوالے کر دینا چاہئے اس کی رفیقہ حیات ہو کر اس کی مدد کرنا چاہئے۔ اس کے خیالات کی ہم آہنگ ہونا ہے۔ سے لئے انتہا مسرور ہونا چاہئے۔ بہت آرام لینا چاہئے لیکن ہماری زندگی بھی کس قدر گمراہ کن۔ قابل نفرت اور فضول ہے۔ یہ سب کس قدر بیکار خیالات ہیں۔ والڈیمر۔

میں بدبخت ہوں کم نصیب ہوں انتہائی بھاگوں پھوٹی !! ---- میرے راستہ میں ابھی ایک گہری خلیج حائل ہے۔ میں پھر محسوس کر رہی ہوں کہ مسرت یہاں نہیں بلکہ بہت دور دنیا کے کسی اور گوشہ میں ہے۔ آہ کتنی تکلیف !! کس قدر عذاب !!!"

"لیکن ---- کیا . . . میں پوچھتا ہوں تمہارے راستہ میں کون حائل ہے۔ میں پوچھتا ہوں وہ کون ہے؟!"

"ایک . . . : دوسرا . . . بوڑھا . . . جنرل ---- خیر!"

اس نے پنکھے کے پیچھے اپنا خوبصورت چہرہ چھپالیا۔ مصنف نے اپنی بھنویں سیکڑ کر معاملہ پر از سرِ نو غور کرنا شروع کیا۔ گویا کوئی ماہرِ نفسیات کسی اہم گتھی کے سلجھانے میں مصروف ہے۔

انجن کے سیٹی کی اور چھبیں چھبیں چلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ غروب آفتاب کی وجہ سے سرخ شفق نکل آئی جس کا عنابی رنگ ڈبے کے پردوں پر پڑ کر عجیب کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

سلام

جناب نواب کاظم علی خاں صاحب بی۔اے۔ دوم تعلقدار

سرِ شاہ تن سے جدا ہو رہا ہے
یہ بارِ امانت ادا ہو رہا ہے

چلی ہے کھلے سر شہ دیں کی عترت
تماشائے آلِ عبا ہو رہا ہے

لٹاتا ہے گھر صبح سے ابن حیدر
یہ طفلی کا وعدہ وفا ہو رہا ہے

ہیں آمادہ اکبر نوشہ رو رہے ہیں
برابر کا بیٹا جدا ہو رہا ہے

علیؑ کو نصیری خدا کہہ رہے ہیں
خدایا یہ بندہ خدا ہو رہا ہے

ریحان شہ کو ہے مرنے میں جلدی
کہ آج امتحان وفا ہو رہا ہے

تیری شان رحمت کے قربان کاظم
برا کر رہا ہوں بھلا ہو رہا ہے

سلام

جناب قاضی محمد زین العابدین صاحب عابد سیوہلین

غم شہ میں دل اپنا شق ہو رہا ہے
یہ غنچۂ گل صد ورق ہو رہا ہے

رخ شاہ مہر افق ہے سراپا
ستم گر کا چہرہ بھی فق ہو رہا ہے

یہ میدان بھی کربلا کا عجب ہے
صداقت کا جس میں سبق ہو رہا ہے

سر عرش اک دھوم ہے مرحبا کی
کہ شیدائے حق جان بحق ہو رہا ہے

مٹا ہے نہ دل سے مٹے گا یہ ہرگز
محرم میں تازہ قلق ہو رہا ہے

زمیں پر جو گرتا ہے خون شہیدان
فلک پر یہ رنگ شفق ہو رہا ہے

غم شاہ کھا کھا کے جیتا ہوں عابد
یہی میرا سد رمق ہو رہا ہے

دریائے نیل

(جناب ابوالحسنات محمد حبیب الدین خاں صاحب)

اگرچہ تاریخ وسیر کے مطالعہ کرنے والے اصحاب مصر کے مشہور دریائے نیل کے حالات سے واقف ہیں لیکن میں عام افادہ کے خاطر اس کے کچھ حالات پیش کرتا ہوں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

ملک مصر کی زرخیزی سرسبزی اور شادابی کا اصل باعث اور مصریوں کی زندگی کو پرلطف اور دلچسپ بنانے کا بڑا ذریعہ یہی دریائے نیل ہے سال بسال موسم گرما میں جب اس کا پانی طغیانی پر آتا ہے تو مصری لوگ بڑی خوشیاں مناتے ہیں اوس دن ایک عظیم الشان میلہ ہوتا ہے جس میں ہر قوم وملت کے لوگ شریک ہوتے ہیں یہ طغیانی قدرت کے دلفریب نظاروں کا ایک کرشمہ ہے ہر سال ایک وقت مقررہ پر اس کا شفاف اور ستھرا پانی گدلا ہونا شروع ہوجاتا ہے طغیانی آتے ہی پانی بڑھتا ہے اور اطراف کی زمینات سیراب ہوجاتی ہیں پھر اپنے وقت مقررہ پر دریا گھٹ کر جہاں کا تہاں آجاتا ہے اس اتار چڑھاؤ میں لطف یہ ہے کہ جن دنوں اور دریا طغیانی پر ہوتے ہیں نیل کمی پر ہوتا ہے اور جن دنوں اور ندیاں کمی پر ہوتی ہیں نیل کو جوش ہوتا ہے اس کمی وبیشی کے جانچنے کے لئے دریا کے ساحل پر متعدد مقیاس الماء بنائے گئے ہیں جب کبھی دریا میں غیر معمولی زیادتی معلوم ہو تو قبل از وقت مصر کو غرقابی سے محفوظ رکھنے کے تدابیر سوچ لئے جاتے ہیں حالت طغیانی میں جہاں جہاں پانی جاتا ہے اپنی تہ کی چکنی مٹی کو چاروں طرف پھیلا دیتا ہے اس چکنی مٹی کو خدا نے کچھ ایسی تاثیر دی ہے کہ جہاں جہاں یہ پانی پہنچتا ہے زرخیزی اور سرسبزی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور جو زمین کسی وجہ سے محروم رہ جائے وہ خشک رہتی اور ناقابل زراعت ثابت ہوتی ہے قدیم مصری اس دریا کو دیوتا خیال کرتے تھے اور ہر سال ایک نہایت خوبصورت کنواری لڑکی بھینٹ چڑھاتے تھے تاکہ طغیانی حسب معمول آئے قحط اور ویرانی سے محفوظ رہے دریائے نیل کی طغیانی سے متعلق تاریخ الخلفاء میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ جب مصر فتح ہوا۔ اور عمرو بن عاص وہاں کے حاکم ہوئے تو اتفاق سے اوس دن مصریوں کا ایک تہوار تھا لوگوں نے کہا حضور ہمارے دریائے نیل کا ایک دستور ہے اور جب تک وہ پورا نہ کیا جائے دریا نہیں بہتا دستور یہ ہے کہ

جب مقررہ تاریخ آتی ہے تو ہم ایک کنواری لڑکی اس کے والدین کو رضامند کرکے لاتے ہیں اور اسے عمدہ قسم کا لباس اور زیور پہنا کر دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ اسلامی حکومت میں یہ نہ ہوگا وہ خاموش ہوگئے۔ نیل بہنے سے بالکل رُک گیا یہاں تک کہ لوگ ترک وطن پر آمادہ ہوئے یہ حال دیکھ کر خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کی خدمت میں عریضہ لکھا آپ نے ان کی رائے کو پسند کیا اور ساتھ ہی ایک پرچہ لکھکر بھیجا کہ اس کو دریا میں ڈالدیا جائے۔ اس عربی عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

"خدا کے بندے اورامیر المومنین عمرؓ کی طرف سے دریائے نیل کے نام۔ اگر تو اپنی مرضی سے
"بہتا ہے تو رک جا اور اگر خدا تجھ کو بہاتا ہے تو میں خدائے واحد سے درخواست کروں گا کہ
"تجھ کو بہائے"

یہ پرچہ آپ کے حکم سے دریا میں ڈال دیا گیا اس سال دریا کی طغیانی اپنے پوری مقدار سے آئی اور سنین مابعد میں حسب معمول طغیانی آتی رہی خلیفہ اسلام کی دینی حمیت اور رائے صائب سے یہ ظالمانہ او وحشیانہ رسم ہمیشہ کے واسطے مسدود ہوگئی۔

نقش نگار

(جناب روپ رانی صاحبہ نگار)

اب نہیں تیرا حسن و خو باقی
پھول تو ہے نہیں ہے بو باقی

دل نہیں ہے مگر جہاں دل تھا
نہیں ہے ایک فتنہ خو باقی

مہر و الطاف کے وہ دن نہ رہے
یاد ہے اُن کی مو بہ مو۔ باقی

میں تو محشر میں چپ لگا جاتا
تیرے دامن پہ ہے لہو باقی

آج وہ دن نہیں۔ نہیں نہ سہی
یاد اب بھی ہے ہو بہو باقی

آرزو تجھ سے تھی وفا کی کبھی
اب کہاں کوئی آرزو باقی

نہیں مایوس لطف تجھ سے نگار
دل میں اب تک ہے آرزو باقی

حضرت فیض حیدرآبادی

(جناب تمکین صاحب کاظمی)

شمس الدین نام تھا آپ کے جدِ بزرگوار رحمت اللہ خاں دہلی کے شرفاء اور اہل علم حضرات سے تھے جو نواب غفران مآب آصفجاہ بہادر کے عہد میں دلی سے دکن تشریف لائے اور منصب سے سرفراز ہوئے حضرت فیض کے والد بزرگوار امیر الدین خاں حیدرآباد ہی میں تولد ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی اور کسی عہدے سے سرفراز ہو کر ۱۱۹۰ھ میں برار تشریف لیگئے۔

حضرت فیض ۱۱۹۵ھ میں ایلچپور (برار) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی صغیر سنی ہی میں آپ کے والد برار سے حیدرآباد آگئے اور آپ کی تعلیم و تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی۔ بارہ برس کے سن میں قرآن حفظ کیا اور عنفوان شباب میں علوم متداولہ کی تحصیل کرلی۔ کمسنی ہی سے شعر کہنا شروع کیا۔ اور فیض تخلص اختیار کرکے خواجہ میر درد کے شاگرد حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔

چونکہ موروثی منصب سے سرفراز تھے اس لئے فکر معاش سے آزاد تھے۔ حافظ محمد علی صاحب خیرآبادی سے بیعت کی اور فقر اختیار کرکے بوریا نشیں ہوگئے۔

آپ نہایت خوش اخلاق ملنسار صوفی المشرب بزرگ تھے آپ کی زندگی ہی میں آپ کی شاعری کی خاصی شہرت ہوگئی تھی اور ایک کثیر تعداد آپ کے شاگردوں کی تھی۔

ذیل کی تصانیف آپ کی کاوش علمی کا نتیجہ ہیں جن میں سے اکثر کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی میں موجود ہیں۔ ۱۔ طریق فیض (شرح عوامل) ۲۔ شمس النحو، ۳۔ شمس الصرف۔ ۴۔ شمع منظومہ صرف۔ ۵۔ رسالہ ناسخ و منسوخ، ۶۔ شرح کلمہ حق، ۷۔ شرح شمس الدین (عروض و قافیہ) ۸۔ مفید الاحکام (فقہ) ۹۔ خزینۃ الامثال (لغات اردو) ۱۰۔ جدول نصف النہار۔ ۱۱۔ فیض جاری، ۱۲۔ دیوان۔

آپ کے دو دیوان طبع ہو چکے ہیں حکیم مظفر الدین معراج نے ایک دیوان ۱۳۱۲ھ میں مطبع اسلامیہ حیدرآباد دکن میں رائل سائز پر چھپوایا اور اسی سال خواجہ جمال الدین مطلب اور شجاعت جاہ جری نے نواب معز یار جنگ بہادر اور خواجہ عالم علی خاں جمعدار کی مالی امانت سے مطبع احمدی حیدرآباد میں فلسکیپ سائز پر ایک

دیوان چھپوایا۔ دونوں میں غزلیں مشترک ہیں۔

۱۴؍ رجب ۱۲۸۳ھ کو حضرت فیض نے انتقال کیا۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے جن میں سے ایک لاولد فوت ہوئے اور ایک کی اولاد شاید اب تک باقی ہے۔ قاضی غلام نبی صدیقی القادری کو آپ نے خرقۂ خلافت دیا تھا۔ جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

آپ نہایت ہی بذلہ سنج اور پاکیزہ مذاق تھے۔ تاریخ گوئی سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی اور تاریخ بڑی اچھی کہتے تھے۔ تعجب ہے کہ آپ نے ولی اللہ کے شاگرد ہونے اور دلی سے تعلق رکھنے کے باوجود لکھنو کے رنگ میں شعر کہے ہیں چنانچہ آپ کے کلام میں خاصی لکھنوئیت ہے مگر زبان پر دلی کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

زبان نہایت صاف شستہ تھی چنانچہ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا۔

نقدِ دل و جاں نذر کروں مفت ہی لیکن
مجھ کو میرے ڈھب کا کوئی دلبر نہیں ملتا

غم کے ہاتھوں سے ہمارا حال پتلا ہوگیا
یاں تلک سوکھا تن لاغر کہ کانٹا ہوگیا

کیا کہیں تم سے شب غم ہم پہ کیا کیا ہوگیا
دل پگھل کر بہ گیا پانی کلیجہ ہوگیا

میں نے ابرو کی طرف دیکھا اٹھائی تم نے تیغ
بیٹھ جاؤ کیوں خفا ہوتے ہو بدلا ہوگیا

ان پری زادوں کے کوچہ میں تماشہ کی ہے بات
جو تماشا دیکھنے آیا تماشا ہوگیا

اونے پونے لو یہ ہے عصیں کا مال
بیچتے ہیں دل سر بازار ہم

مست مئے الست نہیں آجکل سے ہم
صدر الصدور بزم مغاں ہیں ازل سے ہم

کہوں قبلہ و کعبہ کیا آپ کو
سلامت ہی رکھے خدا آپ کو

بھول جائے گا جو وہ رشک گلستان مجھ کو — بوستاں یاد رہے گی نہ گلستان مجھ کو

لڑ رہی ہے آنکھ میری ایک بہشتی حور سے — دیکھتا رہتا ہوں جنت کا تماشہ دور سے

نظر میں اک بت کافر ادا ہے — نماز اپنی لگی ہونے قضا ہے
بگاڑیں ان بتوں سے کس طرح ہم — تلے پتھر کے ہاتھ اب آ گیا ہے
میری آنکھوں میں آ بیٹھو کوئی پل — تماشہ تپلیوں کا ہو رہا ہے

ظلم مجھ پر ہو رہا ہے دن دیئے — زلف کی سرکار میں اندھیر ہے

بوٹی بوٹی میں اس کی چپل بل ہے — ابھی اٹھتی ہوئی وہ کونپل ہے

زبان کے شعر آپ نے دیکھے جن سے روزمرہ اور سلاست کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح محاورہ پر بھی حضرت فیض کو کامل عبور تھا اور محاورے بڑے مزے سے باندھ جاتے تھے چنانچہ ذیل کے شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں۔

کون سی بات کا دھوکا نہ دیا — تم نے کب مجھکو بنو لا نہ دیا
قطع امید آرزوئے وصل ہو چکی — زچ ہو رہے ہیں آپ کی لیت و لعل سے ہم
غم شیریں میں جو جو کوہ کن نے رنج جھیلے ہیں — بہت سے پاپڑ ایسے عاشقی میں ہم نے بیلے ہیں

رخ پہ کٹ اوڑا رہے ہو! — نخرے سے تلے دکھا رہے ہو
چھیڑا نہ چھوا ابھی کسی نے — پھر کس لئے کسمسا رہے ہو

کیا چشم کرم ان سے رکھوں عمر ہی گزری — عرضی پہ میری آج تلک صاد نہیں ہے

رخصت اے صبح وطن وحشت ہوئی! — شام سے پھر تلوے کھجلانے لگے

نقش حب کا تیرے ہوتا نہ اگر میرے پاس — چشم جادو نے ابھی موٹ چلائی ہوتی

پڑے ہیں تین کانے ہم نے جب پھینکا ہی پوبارا — کیا ہے تین تیرا تم نے جب چوسر بچھائی ہے

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت فیض نے کس عمدگی سے محاورات نظم کئے ہیں اسی کیساتھ ساتھ روزمرہ بھی ایسا صاف ہے کہ شعر پڑھکر جی پھڑک جاتا ہے۔

کہتے ہیں عکس رخ وہ گرا کر شراب میں — اک آفتاب اور بھی ہے آفتاب میں

ندیاں پھر لہو کی بہتی ہیں! — ٹانکے زخموں کے پھر ادھڑتے ہیں

جب سے وہ یار اپنے پاس نہیں — دل ٹھکانے نہیں حواس نہیں

نچلے بیٹھو کہیں تو پیارے — اودھم کیسی مچا رہے ہو
چھینٹے دیتے تو بیٹھے بیٹھے — کیسے طوفان اٹھا رہے ہو

انوکھی وضع ہے اس نوجواں کی — چلن ٹکسال باہر چال بانکی

چونکہ فقیر منش اور صاحب دل تھے اس لئے کلام میں تصوف کا رنگ بھی بہت ہے۔

کشف کیونکر ہو نہ جائے حال فرش و عرش کا — فیض ابراہیم کے ہم کفش برداروں میں ہیں

کیا پتہ اپنا بتاؤں نشیعض میں ہوں سپرن بر داد ابراہیم کا

مشرب مغ ہوں مجھے کیف و کم سے کام نہیں میرا کلام ہے یہ فلسفی کلام نہیں
کلام ہے تو وجود و عدم کے باب میں ہے الٰہیات میں اصلا مجھے کلام نہیں

کام کیا پاس ہو یا ہو کئی منزل کعبہ دل بھی اک کعبہ ہے اے قبلہ رب الکعبہ

کیا دیکھتا ہے نقش نگار حریر کو مضمون کچھ اور سطر خط بوریا میں ہے
سوتا ہے ایک دن تجھے آغوش گور میں اے مشت خاک کیا ہوس کیمیا

نہ حقارت سے دیکھ انساں کو جلوہ گاہ صفات و ذات ہے یہ

گو نہیں مطلق و ناطق سے خبر تک لیکن پاس بیٹھے میرے حیوان تو انسان ہو جائے

گر بزرگی کی ہوس ہے کر نہ منت خلق کی موجب عزت جہاں میں ترک حرص و آز ہے

ہے بحر معرفت میں رواں ایک چال پر محتاج ناخدا نہیں کشتی فقیر کی
کیجئے بغور قبلہ عالم مطالعہ معنی ہے کائنات کے صورت فقیر کی
یا ایہا المرید ادب سے نگاہ کر صورت ہر ایک شئے میں نمایاں ہے پیر کی

کون ہوں کیا ہوں مجھے آپنے سمجھا کیا ہے کہئے اس خاک کے پتلہ میں بھلا کیا کیا ہے

تم ہو مختار جو کچھ چاہتے ہو کرتے ہو　　میں ہوں مجبور میرے ہاتھ سے ہوتا کیا ہے

چونکہ سلسلے کی وجہ سے فقیری کا بھی واسطہ تھا اس لئے آزادوں کے محاورے اور قلندروں کی زبان بھی نظم ہوگئی ہے۔

دکھایا ہے کبھی تو صاف چہرہ تم نے یا مولا　　ہر اک آزاد نے لی چار ابرو کی صفائی ہے

اب ہم حضرت فیض کے چند شعر جو سرسری نظر میں انتخاب کئے گئے ہیں نقل کرتے ہیں۔

حرم میں دیر میں جب کوئی روبرو آیا　　مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تو آیا

کرتا میں علاج سر شوریدہ ولیکن　　میداں ہے پٹیلا کہیں پتھر نہیں ملتا

مسیحائی سے وہ خالی نہ لبریز مسیحائی　　لبوں سے برگ گل کا استعارا ہو نہیں سکتا

اس گھر سے پڑا کام ہے اللہ بچائے　　جس گھر میں فرشتہ کا گزر ہو نہیں سکتا
مشکل نہیں بوسہ لب جاں بخش کا لینا　　ہے کام بہت سہل مگر ہو نہیں سکتا

کیسی دوا مجھکو مسیحا نے دی　　درد محبت کا سوا ہو گیا

خط سبزہ دہن غنچہ ہے قد سرو ہے رخ گل　　عالم ہے سراپا میں تیرے چار چمن کا
تلوار ہی چلتی نظر آتی ہے مجھے واں　　آتا ہے جہاں ذکر تیرے چال چلن کا

دو آبہ کا مضمون حضرت فیض کے زمانہ میں بہت پامال ہوگیا تھا تقریباً سب استادوں نے اسے باندھا ہے

مگر حضرت فیض نے عجیب بات پیدا کی ہے۔

حشر تک بھی نظر آتا نہیں ان کا تمنا   دو نوں آنکھیں ہیں میری ہجر میں گنگا جمنا

گل کو دیکھا تو رخ رشک چمن یاد پڑا   کی جو غنچہ پہ نظر تنگ دہن یاد پڑا

برسوں ہی دیر و کعبہ میں کہنے کو ہم رہے   بت مہرباں ہوئے نہ خدا مہرباں ہوا

انگلیوں سے ہمیں دکھلاتے لوگ   وہ جو نوچندی میں آیا ہوتا!

دل نہ جاگیسوئے رسا کے پاس   کوئی جاتا ہے اژدہا کے پاس
کس لئے جائے بادشاہ کے پاس   کیا نہیں ہے تیرے گدا کے پاس

جو ان کو مہرباں پائیں کسی دن   لکھیں اسے نامہ بر ہم ہاتھ بھر خط

ساتھ ہی گور میں ہے وحشت عشق   بو کہلائے سے کفن میں ہیں ہم

گوڑہ دیئے سے جو کوئی مرتا ہے   کس لئے زہر کہلاتے ہو تم

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم   صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم
در و دیوار ہے نظروں میں اپنی آئینہ خانہ   کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہوئے اپنا ہی درشن ہم
کب اٹھتے ہیں اٹھائے سے کسی شیخ و برہمن کے   در دلبر پہ اپنے مار کر بیٹھے ہیں آسن ہم

رہا کرتے ہیں پہروں محو نظارے میں ہم اپنے
سراپا ہو رہے ہیں اب تو اپنا آپ درپن ہم
ہوا اے فیض معلوم ایک مدت سے ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

دیر سے اٹھ چلئے کعبہ میں ا
بہت خفا ہیں خدا خفا تو نہیں

مجھ سے کہتے ہیں لپٹ کر شب وصل
جی میں کچھ اور تمنا تو نہیں

طرفین کو طاقت شرح بیاں نہیں
ان کو دہاں نہیں میرے منہ میں زباں نہیں

تم سا جہاں میں سچ ہے کوئی نازنیں نہیں
لیکن نیاز مند بھی مجھ سا کہیں نہیں

کہیں تم سے کیا ہم زمانے کی باتیں
کرے ہے ٹھکانے لگانے کی باتیں
مجھے آپ کے لوگوں میں آتا ہے رونا
جو سنتا ہوں اگلے زمانے کی باتیں

اس بت کے نہیں خوف سے قرآن بغل میں
پھرتا ہوں دبائے ہوئے ایمان بغل میں

سنیں پند گویوں کی کیا واہیا تیں
نہیں یاد ان کو ٹھکانے کی باتیں
کبھی ذکر کوثر کبھی ذکر جنت
کیا کرتے ہیں پینے کھانے کی باتیں

مردود خلائق ہیں کہ مقبول خدا ہیں
اب تک نہیں معلوم ہمیں کون ہیں کیا ہیں
اک ہیچ ددو گوش نہیں معنی انسان
انسان جسے کہتے ہیں وہ لوگ جدا ہیں

لیکے جان و دل مکرتے ہیں مکرنے دو اُنہیں
مجھ پہ وہ جو جو ستم کرتے ہیں کرنے دو اُنہیں

کہتے ہیں جنھیں فیض انہیں جانتے ہیں ہم
درویش کی صورت میں محب فقرا ہیں

کیا ہی آرام کی جگہ ہے گور
پاؤں پھیلائے یار سوتے ہیں

ارادہ ہے کثرت میں وحدت کو دیکھیں
ہم آئینہ خانہ میں گھر باندھتے ہیں

ہے مجرب یاد ہم کو بھی علاج درد سر
کیا کریں تدبیر پاس اپنے کوئی پتھر نہیں

مے کو جی میں بچارتے ہیں
ہم گھر میں شراب اتارتے ہیں

سچ تو یہ ہے جناب واعظ
جھوٹی شیخی بگھارتے ہیں

اک نہ اک دن زہر ہی کھانا پڑیگا آپ کو
یاد رکھو عشق سبزان دکن اچھا نہیں

دیکھتا ہی نہیں اون کو کوئی
سب کو تو ڈ دیکھ لیا کرتے ہیں

آپ ادہر دیکھیں دکھاتا ہوں میں
یہ مری آنکھوں میں رہا کرتے ہیں

ضعیفی نے کیا ڈرپوک ہم کو ای بتو ورنہ
خدا کا خوف کس کافر کو تھا عہد جوانی میں

کرنا حرکت نہیں مکان سے
ہوں قطب مگر چھپا ہوا ہوں

موقوف نہیں ہے آپ پر ہی
ہوتا ہے عدو جسے میں چاہتا ہوں

گیسوئے عارض دلکھا رہے ہو   کافر کو مومن بنا رہے ہو

شت میں بھی ہے خیالِ تعظیم   سجدے ہم کرتے ہیں کلواروں کو

مرض ہو گیا عشق کا آپ کو   اثر کیا کرے گی دوا آپ کو

کب کیا میں نے ترکِ عشقِ بتاں   صرف تہمت ہے افترا ہے یہ

باغ بھولا ہے زمانے کی ہوا بدلی ہے   تو بھی پوشاک بدل گل نے قبا بدلی ہے
یار نے ہم سے رہ و رسم وفا بدلی ہے   اُس پہ کیا گردشِ زمانے کی ہوا بدلی ہے
کوئی صورت نظر آتی نہیں بچنے کی مجھے   وہ بھی بدلے ہیں نظر ان کی جدا بدلی ہے

خلعت بادشہی خلعتِ عریانی ہے   سر و ساماں میرا بے سر و سامانی ہے
خاکساری کسے کہتے ہیں کوئی کیا جانے   مٹی ہم نے تیرے کوچہ کی بہت چھانی ہے
منہ لگاتے ہی نہیں ہائے حسینان جوال   زندگی موسمِ پیری میں پشیمانی ہے

خط کے آتے ہی مکدر نہ ہوا ہے غیرت باغ   کام کی بات ہے گر شرحِ گلستاں ہو جائے

بت غنچہ لب پھر ہنسا چاہتا ہے   خدا جانے کیا گل کھلا چاہتا ہے
نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں   جو بت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے
گلستاں ہے داغوں کا جس کے میرا دل   وہ مجھ سے گلستاں پڑھا چاہتا ہے

لگا دل میں رہے بتوں کا تصور — یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے

ہو رہے ہیں بتوں کے دیوانے — کیا ہمیں ہو گیا خدا جانے

ہوش کی باتیں نہ کر مجنوں سے گر بیانہ ہے — ذکر فرزانہ غبار خاطر دیوانہ ہے

فوارہ کا مضمون سبھوں نے باندھا ہے مگر حضرت فیض نے اسے نہایت بلند کر دیا ہے۔

مبتلا لرزہ کی بیماری میں ہر فوارہ ہے — کس قدر آب دہوا اس لنج کی ناکارہ ہے

درویش گوشۂ عشق کو چھیڑا نہ کیجئے — نام خدا جوان ہو دعا لو فقیر کی

جب وہ مست شراب ہوتا ہے — اک زمانہ خراب ہوتا ہے

گھر سہانا نظر آتا ہے مجھے — برکت یہ قدم یار کی ہے

یہ ٹھنڈے میرے دست و پا ہو گئے — حواس مسیحا ہوا ہو گئے
نمازیں پڑھیں ہم نے بیجا نہیں — مگر چند روزے قضا ہو گئے

لحاظ گردش تقدیر ہے عالی دماغوں کو — خیال بندش دستار ہے جب تک میرا سر ہے

کہدو یہ زاہدانِ شریعت پناہ سے — اک دن تماشا خانۂ الفت میں آیئے

جلوے وہ ہم دکھائیں مقیمِ کعبتین کے جھوٹے بھی قبلہ پھر کبھی کعبہ نہ جائیے

لباسِ مغفرت سے دور ہی رکھتا ہے انساں کو جہاں میں بدترین شغل شغل بن ہی گیا ہے

کچھ نہ پوچھو سبب فقیری کا عاشقوں میں ہوں ایک تونگر کے

دیکھئے وحشت کدھر لیجائے ہے آج پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

یہ عمامہ والوں کی میخانہ میں قضا را سواری اگر جائے گی
کرامت سے رندانِ بیباک کی گناہوں کی گٹھری اتر جائے گی

صدقے ہم اس کلام کے اس بول چال کے لیکن حضور بات کریں منہ سنبھال کے

جو تمہارا بتو کہا نہ کرے کبھی اس کا خدا بھلا نہ کرے
اے بتو آن بان والا ہوں میں خوشامد کروں خدا نہ کرے

معلوم علم غیب ہے اللہ کو حضور ہم عاشقوں کے سامنے گپ شپ نہ ماریئے
چاٹ احمقوں کو دیجئے حور و قصور کی شیخی ہمارے آگے نہ جھوٹی بگھاریئے

دھن گیسو کا اور کیا کیجئے دام انعام لکھا لیجئے

کعبہ میں یاد آئے جو صہبائے ناب کی ۔ لوں زمزمی کو بیچ کے بوتل شراب کی

پھر یار کے ذکر قد و قامت کے دن آئے ۔ اللہ کرے خیر قیامت کے دن آئے

جانتے ہیں مجھے سب آپ کی محفل والے ۔ اچھے اچھے جو سپاہی ہیں بڑے دل والے

سناتے کیا ہو مجنوں کی کہانی ۔ یہ قصہ ہے ہمارے روبرو کا

باہم ارباب تمنا کو جدا کرتا ہے ۔ فلک تفرقہ انداز یہ کیا کرتا ہے

اوپر کے اشعار سے حضرت فیض کی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے طبیعت نہایت موزوں تھی کلام میں روانی بھی کافی تھی اور غزل کا رنگ اچھا تھا مگر باوجود دھلوی استاد کے شاگرد اور دہلوی الاصل ہونے کے لکھنو کا رنگ بہت چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ ذیل کے شعر آپ کے لکھنوی رنگ کے شاہد ہیں۔

سمجھتا ہوں عصا پیری میں اسکے قد موزوں کو ۔ ضعیفی میں گزارا بے سہارا ہو نہیں سکتا
برآمد بام پر وہ ماہ پارا ہو نہیں سکتا ۔ ہمارے بخت کا اونچا ستارا ہو نہیں سکتا

فقط گھر نہیں روتا ہے آٹھ آٹھ آنسو ۔ جو ان کے کان لگا کہو کے آبرو آیا
رہا ہے پھر دل میں جبرئیل کا تصور فیض ۔ جب اسکے پاس سے پیک فرشتہ جو آیا

عہد پیری میں نہیں داغ جوانی کام کا ۔ صبح کو بے نور ہے جلوہ چراغ شام کا

عہد پیری میں ہوئی زائل حرارت عشق کی ۔ دن نکل آیا چراغ اس گھر کا ٹھنڈا ہو گیا

موجب خفت ہے عالم میں تجرد پیشگی
میں سبک سار محبت ہو کے ہلکا ہو گیا

پیری میں عشق زلف سیہ کار ہے ہمیں
برسوں میں نسخہ ہاتھ لگا ہے خضاب کا

حسرت سے کتنے ڈھیلے رقیبوں کے ہو گئے
کنکا ہمارا جب آپ کے تکل سے لڑ گیا

نامہ اُس طفل برہمن کو رقم میں بھی کروں
ہاتھ آجائے اگر کوئی کبوتر بمبا

کشتۂ قامت سبزان دکن ہوں بخدا
سبزۂ گور ہمارا ہم قد آدم ہو گا

لکھنؤ دوزخ سے بدتر ہے خیال یار میں
زہر پانی مجھ کو موتی جھیل کا ہو جائیگا

روز و شب لطف طفلان دکن میں محو ہوں
میں نے اپنے کام شیریں کو نمکدان کر دیا

مجھے لینے تو دو بوسے لبوں کے
دھواں کیا کیا اڑاتا ہوں مسی کا

کونچے جاسوس کے اس نے کاٹے
اپنے کوچہ میں جو آتا دیکھا

ان بتوں نے جب کبھی خیرات اک بوسہ کیا
میں نے یہ جانا خدا کی راہ کا سودا کیا

میرے اُن کے پتنگ لڑتے ہیں
دم رقیبوں کے صاف اکھڑتے ہیں

کوپنچے کٹتے ہیں ضعف کے ہاتھوں   ہم جو اس کوچہ سے گزرتے ہیں

کہیں گے ہم بھی پہنی گیسوں پر مار آبی کی   نہا دھو کر وہ بیٹھے ہیں ابھی بال انکے گیلے ہیں

کیا ہوا میں نے جو محرم کو چھوا   اس میں کچھ سونے کی چڑیا تو نہیں

ایک ایک گھاٹ پر کٹی برسوں رہا ہوں   تحرم سے کچھ کچھ آپ کی محرم ہوا ہوں میں

نیم کے تنکے بہلار کہتے ہو کیوں کانوں میں   تن میرا سوکھ کے ہو جائیگا کانٹا دیکھو

جب سے ہم مکتب خیاط بہر ہوائے عشق   خامہ صیاط ہے جزدان تلے دانی ہے

جس نے حمام میں دیکھا تجھے مارا ہی گیا   تیغ عریاں سے نہیں کم تیری عریانی ہے

پھر چڑی مار کر دیا اے فیقن   کسی محرم کی مجھکو چڑیا نے

ابھی ہو جاؤں گا جامہ سے باہر   نہ پہنو تم قبا آب رواں کی

رہا گر ہم سبق چندے وہ خیاط   تلے دانی بنیگی جزدان کی

یار گندم گوں نظر آتے نہیں   کیا حسینوں کا دکن میں کال ہے

سوتے ہیں وہ کوٹھے پر لپٹ کر کئی دن سے   ہیں اوج پر اپنے بھی مقدر کئی دن سے

قیمت بوسہ تم ہی ٹھیرا دو   نرخ معلوم ہے نہ بھاؤ مجھے

او جانے والے سینہ کو اپنے ابھار کر!   محرم کی خبر کچھ تو ہمیں بھی دلا یئے؟

اس محاسب پیمبر پہ کیا ہے دوش   ضرب کہائی ہے میں نے قسمت سے

کس نے باندھا ہے کھینچ کر جوڑا   درد میرے تمام سر میں ہے

کون سا آبلہ پا دشت سے گزرا ہے کہ آج   نظر آتا ہے مجھے حد نظر تک پانی

حمام میں نہائے جو غیر دل کیا تھا آب   پانی کے سینکڑوں ہی گھڑے ہم پہ پڑ گئے

حضرت فیض میں وطنیت بھی خاصی تھی اور انہیں حیدرآباد اور دکن سے بڑی محبت تھی

شعرا ہند کے سب فیض جنھیں کہتے ہیں   حیدرآباد دکن خاص وطن ہے اُن کا

رشک فردوس چمن ہے اپنا   حیدرآباد وطن ہے اپنا

حیدرآباد دکن میں ہیں ہم   چین سے اپنے وطن میں ہیں ہم

(باقی وارد)

اُس سے

(جناب اسمٰعیل احمد صاحب مینائی تسنیم)

(۱)

چشمہ کی انتہا ہے کہ دریا کے ساتھ ہو | دریا کا اتصال سمندر سے لازمی
پھولوں کی نکہتوں سے معطر نسیم صبح | آغوش میں زمین کے سورج کی روشنی

قدرت کی بھی نظر میں دوئی جب ضرور ہے
پھر میں جو تجھکو چاہوں مرا کیا قصور ہے

یوں ہیں بلند تاکہ فلک بوس ہوں جبال | باہوں میں باہیں ڈالے ہیں موجیں بحار[1] کی
گلہائے باغ ایک کا ہمدرد دوسرا | مہتاب کی شعاعیں سمندر کو چومتی

ان مظہراتِ عشق کا پھر کیا حصول ہے
گر تو نہ مجھ کو چاہے تو یہ سب فضول ہے

(۲)

جب دیکھتا ہوں محفلِ ماضی کی داستاں | نظروں میں میری پھرتی ہیں تصویرہائے حسن
سنتا ہوں شاعرانِ گذشتہ کا جب کلام | کانوں میں آنے لگتی ہیں بھولی صدائے حسن

جو جو کمال اُن کے قلم نے دکھائے ہیں
وہ سب تیرے جمال کے صدقے میں آئے ہیں

جو کچھ بھی لکھ گئے ہیں وہ اربابِ چشم و دل | پیشین گوئیاں ہیں وہ تیرے جمال کی
جو خامیاں تھیں اُن میں وہی آج ہم میں ہیں | تصویر پوری کھینچ نہیں سکتی خیال کی

آنکھیں تو ہیں کہ جلووں کا دیدار کر سکیں
لیکن زباں نہیں ہے کہ اظہار کر سکیں

[1] بحار، جمع بحر کی بمعنی سمندر۔

(۳)

تشبیہ دوں اگر تجھے فصل بہار سے
تو اوس سے بیشتر ہے جمال و صفات میں
باد سموم چلتی ہے اکثر صبا کے ساتھ
کانٹا ہے جو گلاب کے نظم حیات میں

کیا موسم بہار کہ دم میں گذر گیا
"جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا"

دوزخ سے گرم تر ہے کبھی آسماں کی آنکھ
زریں قبائے مہ پہ کبھی گرد کا نشاں
برسوں سے ہے یہ رنگ تماشائے بزم دہر
ہر حسن کو زوال ہے ہر باغ کو خزاں

قدرت کی رسم کہنہ بدلتی نہیں کبھی
ساعت قضا کی آئے تو ٹلتی نہیں کبھی

لیکن تیری بہار کے ایام دائمی
ایک خط منتقش صفِ دل پر تیرا جمال
نے موت کر سکیگی تیری ذات سے فریب
نے وقت لا سکیگا تیرے حُسن پر زوال

جب تک وجود روح ہے خاکی مکان میں
اس نظم سے رہیگا تیرا غل جہان میں

(ماخوذ)

غزل

جناب لیلیٰ بیگم صاحب لیلیٰ

دل کی خاطر نہ کروں دل کی مُروّت نہ کروں
مجھ سے تو ہو نہیں سکتا ہے محبت نہ کروں
جان دینا میرا کچھ ایسی بڑی بات نہیں
کیا کہو گے تم اگر شکر عنایت نہ کروں
نیچی نظروں کی ادا دیکھنے کی حسرت ہے
کیا کروں کیسے تمنائے قیامت نہ کروں
بڑھ گئے میرے گنہ تیرا کرم بڑھنے سے
شکر کے ساتھ میں کیوں شکوۂ رحمت نہ کروں
میں تو مولائے نجف پر ہوں فدا اے لیلیٰ
ہوں گنہگار اگر عرض حقیقت نہ کروں

دریچہ

(جناب ہادی جعفری صاحب)

اف معبود!! وہ بھی کیا پریشان دن تھے کہ اب ان کی یاد سے وحشت اور جسم میں سنسنی ہونے لگتی ہے۔ یوں تو مجھے بچپن سے سیر و سیاحت کا بیحد شوق تھا اور پھر لطف یہ کہ خوفناک واقعات اور ڈراؤنی باتوں سے دلچسپی تھی۔ بھوت اور پریت کی وحشتناک داستانوں سے عموماً جن کو سن کر ڈر لگتا تھا مجھے اس میں لطف ملتا اور میں گھنٹوں ایسی داستانیں سن کر قہقہہ لگایا کرتی تھی۔

میں ایک عرصہ سے بیمار چلی آتی تھی بیماری کوئی ایسی مہلک نہ تھی ڈاکٹروں نے تبدیل آب وہوا کا مشورہ دیا کہ اس سے اختلاج دور ہو جائے گا۔ نئے مقام اور نئے مناظر اس مرض کے ازالہ کا بہترین علاج ہے۔

مدتوں سے میں خود بھی تبدیل مقام کیلئے بیتاب تھی چنانچہ ایک دن اپنی خالہ جان کے پاس حیدرآباد دکن چلی گئی۔ حیدرآباد نہایت خوشنما اور شاندار شہر ہے۔ سڑکیں بہت کشادہ اور وسیع ہیں۔ میلوں سمنٹ اور ڈامر کی سڑکیں ہیں جن پر صدہا موٹریں رات دن گذرتی رہتی ہیں اور عمارتیں ہوادار اور روشن ہیں۔ تہذیب جدید اور تہذیب قدیم کی یہاں زندہ یادگاریں نظروں کے آگے رہتی ہیں۔ میری خالہ جان "حویلی قدیم" میں حکیم باقر علی خاں کی دیوڑھی میں رہتی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد میرا اکثر وقت دلچسپ مشاغل اور زیادہ تر مطالعہ میں گذرتا تھا۔ میرا کمرہ سڑک کی جانب تھا۔ کمرہ نہایت ہی ہوادار کشادہ اور وسیع تھا جس میں آرائش کی ممکنہ اشیاء فراہم تھیں۔ میں تمام روز دریچہ میں کرسی ڈال کر پڑھا کرتی تھی۔ خالہ جان بازو کے کمرہ میں بیٹھی کپڑے سیا کرتیں۔ روزآنہ محلہ کی عورتیں ان سے ملنے آتیں ایک روز حسب معمول جب کہ ان کی سب دوست احباب جمع تھیں وہ آپس میں کسی خاص بات پر مصروف بحث تھے مگر میں مطالعہ میں اس قدر منہمک تھی کہ ان کی باتیں سننے کا موقع ہی نہ ملا۔ یکایک وہ سب میرے کمرہ میں آگئے اور سڑک کی اس جانب بغور دیکھنے لگے۔ جمیلہ خانم جو ہماری خالہ جان کی نہایت گہری دوست تھیں کہنے لگیں۔ بہن۔ میں تو سچ کہتی ہوں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اسے ویسا ہی پند پاتی ہوں۔ مجھے نہ جانے کیوں جمیلہ خانم کے فیروزی انگوٹھیوں اور سنہری

بالوں اور رعب مادی آبات وحشت تھی۔

قمر النساء نے کہا۔ کل میں نے بھی زہرا کے ابا سے پوچھا تھا وہ کہنے لگے کہ اس کے متعلق عجیب و غریب روایات ہیں۔ خالہ جان نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ "بہن مجھے تو ڈر لگتا ہے یہاں آئے ہوئے اگرچہ بائیس سال گذر چکے ہیں مگر میں نے ہمیشہ سے اس "دریچہ" کو بند ہی پایا ہے۔ نہ جانے کب کھلتا اور بند ہوتا ہے۔

اب میں نے اس طویل گفتگو کا مطلب سمجھ لیا کہ یہ لوگ ہمارے مکان کے سامنے والی عمارت کے دریچہ سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس عمارت میں ایک کتب خانہ تھا صبح و شام ہر روز لوگ یہاں مطالعہ وغیرہ کیلئے آتے رہتے ہیں مگر میری سمجھ میں خاک نہ آیا کہ اس دریچہ میں ایسا کیا "ہوا" ہے جس سے یہ لوگ اس قدر مرعوب و پریشان ہیں کہ اس پر بحث مباحثہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہ بھی عام دریچوں کی طرح ایک معمولی سادریچہ تھا جس میں نہ کوئی نقش و نگار نہ کوئی خوبصورتی لیکن فرق اتنا تھا کہ وہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ بند رہتا ہوگا۔ میں نے بھی کئی مرتبہ اس کو بند ہی دیکھا۔ مشہدی خانم جو ایک کونہ میں دبکی دبکائی بھیگی بلی بنی خاموش کھڑی تھیں ہمک کر کہنے لگیں "ہاں بی بی جب آپ نے مجھ سے کہا تھا میں اسی دن یہاں سے چلی گئی یہاں تک کہ شاہ زمانی کو بھی میں نے ادھر کا رخ کرنے نہ دیا۔" اب وہ میری طرف مڑیں اور بولیں۔ دیکھئے بی بی آپ ابھی بچہ ہیں۔ للہ یہاں نہ بیٹھئے مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" مجھے ان لوگوں کی یہ بے سروپا باتیں سُن کر ہنسی آرہی تھی اور غصہ بھی کہ خواہ مخواہ میرے مطالعہ کا ہرج ہو رہا ہے نہ جانے میں ابتک کس قدر پڑھ چکی ہوتی۔ چونکہ میری طبیعت لڑکپن سے ہٹیلی اور ضدی واقع ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے جواب دیا۔ "نہیں۔ میں تو یہیں بیٹھوں گی۔ دیکھوں کون مجھے یہاں سے نکالتا ہے"

خالہ جان نے کہا۔ دیکھو شہزادی ہم ٹھیرے تمہارے بزرگ۔ یہ ضد اچھی نہیں۔ کل کو خدانخواستہ کچھ ہو ہوا جائے تو لوگ کیا کہیں گے وہ تو بچہ ہی تھی مگر ان بڑوں کو کیا سوجھی۔ بہتر ہے تم اپنا کمرہ بدل لو۔ تمہارے بھائی جان مہدی دانش گاہ سدھارے ہیں تم اون کے کمرہ میں اوٹھ آؤ وہ اس سے کہیں ہوادار اور کشادہ ہے۔ خالہ جان مجھے شہزادی کہا کرتی تھیں، حالانکہ میرا نام ثریا ہے۔

میں نے جواب دیا۔ خالہ جان اس کمرہ میں آخر کون ایسا بھوت ہے جو مجھے کہا جائیگا اس لئے اوس کمرہ کو چھوڑ دوں۔ میں تو ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔" قمر النساء نے کہا " فاطمہ تم انہیں کچھ نہ کہو یہ بڑی ضدن ہے

ان کو سمجھانا فضول ہے۔ یہ کہکر وہ سب خالہ جان کے کمرہ میں اولٹے پاؤں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی اس واقعہ کو بالکل بھول بھال گئی کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ رات کہانے کے بعد خالہ جان "رہبر دکن" پڑہنے لگیں اور میں ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہوگئی۔ اتفاقاً میری نظر کتبخانہ کے دریچہ پر پڑی۔ دریچہ سے ایک خفیف سی روشنی دکہائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ روشنی غائب ہوگئی اور میں نے بازو کی میز سے رسالہ شہاب اوٹھالیا۔ پرچہ کہولتے ہی بہن ر ج ' نقوی کے افسانہ "غلط فہمی" پر نظر پڑی۔ مجھے ان کے افسانوں سے خاص انس تھا۔ اور میں انہیں نہایت ہی دلچسپی سے پڑہا کرتی تھی۔ بلکہ ایک علیحدہ کاپی میں بعض بعض دلچسپ جملے لکھ لیا کرتی تھی اکثر تو مجھے حفظ تھے یہ افسانہ نہایت دلچسپ تھا۔ میں پڑھ کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ غالباً میری ہنسی خالہ جان کیلئے ناقابل برداشت تھی کیونکہ وہ اخبار پڑھ رہی تھیں۔ دوڑتی ہوئی اخبار ہاتھ میں لئے میرے کمرہ میں آئیں اور کہنے لگیں "بیٹی! ذرا ہوش کی دوا کرو۔ بہلا یہ بھی کوئی ہنسنے کا موقع ہے "

میں نے بغیر کچھ کہے اون کے ہاتھ میں پرچہ تھما دیا اور کہا۔ خالہ جان دیکھئے نا۔ اس میں بہن ر ج ' نقوی نے کس قدر دلچسپ افسانہ لکھا ہے۔ دو دوست ریل میں ہم سفر ہیں اور بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اور ایک بڑی بی بھی واوسی ڈبہ میں بیٹھی ہیں ان کی باتیں سن کر خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں" پھر میں زور زور سے ہنسنے لگی۔ خالہ جان نہ برداشت کر کہا شہزادی خاموش رہو۔ اگر ج نقوی کا افسانہ دلچسپ ہے تو میں کیا کروں "

میں نے بھی بگڑ کر کہا۔ خالہ جان۔ آپ تو ناحق خفا ہوتی ہیں۔ یہ تو ہمارے لئے فخر کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ایک ایسی لکھنے والی اچھی انشار پرداز ہیں۔ ہم کو تو ان پر ناز کرنا چاہئے " خالہ جان سمجھ گئیں کہ مجھ سے بحث کرنا آسان نہیں ہے وہ خاموش اولٹے پیروں اپنے کمرہ میں چلی گئیں۔ میں نے وہ افسانہ ایکمرتبہ اور پڑہا اور خوب زور زور سے پھر ہنسنے لگی۔ صرف خالہ جان کو ستانے کیلئے۔

(۲)

دوسرے دن شام کا وقت تھا اور میں کمرے میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ میری نظر پھر اوس دریچہ پر پڑی۔ سورج کی آخری شعاعیں کمرے کے اندر کی ہر چیز کو نمایاں کر رہی تھیں دریچہ کے مقابل ایک بڑی تصویر آویزاں تھی۔ درمیان ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ میز کے بازو چند موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ معلوم تو یہ ہوتا تھا

کمرہ مہتمم کتب خانہ کا ہے۔ میں اوس کو دیکھنے میں محو تھی کہ خالہ جان نے پکار کر کہا "شہزادی ذرا حمیدہ کو آواز دینا کہ چراغ روشن کر جائے" اس آواز کیساتھ وہ تمام نظارہ غائب تھا اور اب صرف دریچہ ہی تھا اور کچھ نہ تھا۔ حمیدہ چراغ لئے آئی اور میں پھر دریچہ کو دیکھنے لگی۔ میں اس قدر بے خبر اور منہمک تھی کہ مجھے اس کا احساس ہی نہ تھا کہ میرے اطراف واکناف کمرہ میں کون کھڑا ہے۔ پھر وہی تصویر۔ میز۔ کتابیں۔ میرے سامنے تھیں۔ کسی نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ اور میں چونک پڑی۔ مڑکر دیکھا تو خالہ جان کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں۔ بیٹی کیا دیکھ رہی ہو میں نے جواب دیا۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی دیکھ رہی تھی۔ خالہ جان کو یقین نہ آیا وہ میرے پیچھے آئیں اور آپ خود بھی دیکھنے لگیں "شہزادی سچ بتاؤ کہ تم کس کو دیکھ رہی تھیں" اس کے ساتھ پھر وہ سماں غائب تھا۔ میں نے بگڑ کر جواب دیا۔ "آپ کو شاید مجھ پر بھروسہ نہیں۔ جب ہی تو میرے کہنے کا یقین نہیں آتا۔ یہ سن کر خالہ جان کمرہ سے باہر چلی گئیں۔

اسی طرح دنوں میں اوس کمرے کو دیکھتی رہی مگر کسی سے اس کی نسبت ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اور دل میں خیال کرتی تھی کہ لوگ بھی کیسے بیوقوف ہیں کہ بات کا تبنگڑ بنا دیتے ہیں اور وہ کسی چیز کی ماہیت پر غور کرنے کی ذرا سی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ایک روز میں اسی طرح دریچہ میں بیٹھی ہوئی کشیدہ کاڑھ رہی تھی کہ میری نظر پھر کے دریچہ پر گئی۔ خداوندا! وہی تصویر۔ میز اور کتابیں۔ اب تو یہ بھی دیکھا کہ وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ پیٹھ دیوار کی جانب تھی اور وہ لکھنے میں اس قدر مصروف تھا کہ ایکبار تب بھی سر اوٹھا کر نہیں دیکھا۔ غالباً وہ کوئی مصنف ہوگا۔ لیکن میں نے آج تک ایسا مصنف نہیں دیکھا۔ آخر بھائی جان بھی تو مصنف ہیں۔ اکثر افسانے وغیرہ لکھتے ہیں مگر اس طرح نہیں کہ دوران تحریر میں ایک دفعہ بھی سر اوٹھا کر نہ دیکھیں بلکہ جب وہ ایک آدھ صفحہ لکھ لیتے تو ضرور کمرہ میں ٹہلنے لگتے تھے۔ غالب اور اقبال کے اشعار گنگنانے لگتے تھے اگر کبھی اتفاقاً میں سامنے ہوتی تو مجھے جو کچھ لکھا ہے پڑھکر سناتے اور کہتے "ثریا! دیکھو اس میں کیا مزید حک و اضافہ کی ضرورت ہے۔ میں کبھی کوئی رائے دیتی تو ہنسکر کہتے ابھی تم ناسمجھ ہو۔ ادبی نزاکتوں کو کیا جانو۔ پھر وہ لکھنے میں مشغول ہوجاتے۔ مگر یہ تو عجیب قسم کا مصنف تھا کہ برابر لکھے جارہا ہے۔ سانس تک لینے کی قسم کھائی ہے۔ میں آپ سمجھتی ہوں کہ وہ کوئی شاعر ہوگا۔ لیکن یہ بھی درست نہیں کہ بیک نشست یوں شعر

کہہ سکیں یہ آخر میں بھی تو شاعرہ ہوں مجھے یاد نہیں پڑتا کہ یوں لگاتار میں نے اشعار کہے ہوں۔ یہ میری عادت سی ہے کہ عموماً ایک مصرعہ موزوں کر لیتی ہوں اور دوسرا مصرعہ بھائی جان یا چچا میاں لگا دیتے تھے اس طرح میرا شعر مکمل ہو جاتا تھا۔ اندھیرا ہو رہا تھا شاید کمرہ میں روشنی کافی نہ تھی اوس نے اودھر اپنا سر ہلایا اور ادھر میرا دل دہلنے لگا۔ اوس نے آہستہ سے اپنی کرسی ہٹائی اور دریچہ کے مقابل لاکر رکھدی اور بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا یہاں بھی اوس کے مطالعہ کا وہی عالم تھا کہ حس نہ حرکت۔ تھوڑی دیر بعد کسی کے پکارنے کی آواز آئی اور میں چونک پڑی۔ خالہ جان کہہ رہی تھیں میں کب سے تمہیں پکار رہی ہوں جواب تک نہیں دیتیں۔ تمہیں کونسی فکر ہے کہ جس سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ آخر اتنی کیوں کھو گئی ہو۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر تو مجھے الجھن سی ہونے لگی ہے۔ للّٰہ کچھ تو کہو کہ ماجرا کیا ہے۔ اب میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے کمرہ میں خالہ جان اور اون کی تمام دوست جمع ہیں۔

قمر النساء کہنے لگیں: بیٹی کچھ تو بتاؤ ہم پھر ہیں کس دن کیلئے اور اس سوچ کا مدعا کیا ہے۔" میں نے جوابدیا کوئی بات ہو تو بتاؤں نا۔ یہ آپ حضرات میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔

مشہدی خانم نے کہا۔ بی بی ہم سے تو کچھ نہ چھپا ئیے۔ یقیناً کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" ورنہ اتنی محویت کے کیا معنی۔ اب میں پھر دریچہ کی طرف پہلے کی طرح دیکھنے لگی اور وہ سمان غائب تھا۔ مجھے بے اختیار رونا آیا کہ ان لوگوں نے میرا مزہ کرکرا کر دیا۔ اسی طرح میں ہر روز اسے دیکھا کرتی تھی میرے خیال میں وہ ضرور کتبخانہ کا مہتمم تھا۔ شاید لوگ چلے جانے کے بعد وہ وہاں آکر نہایت اطمینان سے مطالعہ کرتا ہوگا۔ مگر مجھے کبھی اوس کی صورت واضح طور پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ کیونکہ دریچہ کے شیشوں پر بہت گرد جمی ہوئی تھی۔ میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ کسی روز کتب خانہ چل کر دیکھنا چاہئے مگر دقت یہ تھی کہ جائیں تو کیونکر۔ میں نے خالہ جان سے کہا کہ کسی روز کتب خانہ چل کر دیکھنا چاہئے وہ سن کر خاموش ہو گئیں مگر مشہدی خانم ٹپک پڑیں۔ "ماشاء اللہ بی بی آپ کو تو روز ایک نئی سوجھتی ہے۔ بھلا وہاں کون جائیگا"

دوسرے دن خالہ جان نے خود ہی کہا" میرا دل بھی بہت دنوں سے چاہ رہا ہے کہ وہاں جاؤں۔ مگر تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کل اچانک خیال آیا کہ کتب خانہ کے منتظم کی بی بی میری دوست ہیں ان سے کہا جائے۔

اس کے معائنہ کا انتظام کردینگی۔ غرض کتب خانہ کے منتظم کی بی بی کو ایک روز چار پر مدعو کیا گیا اور میں نے
ں میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ خالہ میں چند دنوں میں اپنے وطن واپس چلی جانیوالی ہوں۔ کیا آپ مجھے
خانہ نہیں دکھلائینگی؟
منتظم کی بی بی نے ہنس کر کہا "میری ننھی سی گڑیا اتنی رنجیدہ کیوں ہوتی ہو۔ کل ہی چلی چلو تعطیل بھی
لعہ کیلئے لوگ نہیں آئینگے اور کتب خانہ بند رہیگا اور تم نہایت اطمینان سے دیکھ سکوگی"
غرض دوسرے روز ہم سب مل کر کتب خانہ گئے۔ کتب خانہ کوٹھے پر تھا۔ نیچے ملازمین کے رہائش کے کمرے
سیڑھیوں سے اوپر گئے منتظم کی بی بی نے سارا کتب خانہ دکھلایا۔ یہاں قدیم قلمی کتابوں کا ذخیرہ تھا موجودہ
میں بہت کم تھیں۔ موجودہ کتب خانہ گذشتہ تین صدیوں کے لوگوں کیلئے زیادہ موزوں تھا۔ مگر میرا تو تمام
اس کمرہ کی طرف تھا جس میں روزآنہ وہ بیٹھا ہوا لکھا کرتا تھا۔ میں نے منتظم کی بی بی سے پوچھا یہاں کوئی
کمرہ ہے اونہوں نے کہا ہاں! ادھر آؤ میں تمھیں لیچلوں" جوں جوں میں کمرہ سے قریب ہوتی جاتی تھی
زور زور سے گھڑی کی پنڈولم کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی میری نظر تصویر پر گئی
میں روزآنہ دیکھا کرتی تھی۔ اس کے بعد میں نے کمرہ کا معائنہ کیا۔ میز اور کتابیں اوسی طرح تھیں۔ میں نے
دریچہ کی تلاش کی۔ مگر وہاں دریچہ کا پتہ نہ تھا۔ میرا سر چکرانے لگا کہ الہٰی یہ کیا ماجرا ہے۔ کمرہ کی ہر شئے بدستور
ہے۔ مگر نہیں ہے تو وہی دریچہ۔ مجھے اچنبھا ہوا۔ اور میں لڑکھڑاتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ منتظم کی بی بی
ہو کر کہنے لگیں "کیوں بیٹی شہزادی خیریت تو ہے" میں نے ان سے دریچہ کی نسبت سوال کیا ہنستی
نہیں "میری اچھی بچی وہ تو نمائش کے لئے صرف ایک کیس ہے جو دیوار میں نصب کر دیا گیا ہے تاکہ موزونیت
جائے اور بادی النظر میں کوئی عیب نہ معلوم ہو حقیقت میں وہ دریچہ نہیں ہے چونکہ دیوار کی ایک جانب
گیا تھا۔ اس لئے جواب کیلئے یہ دریچہ نصب کیا گیا ہے وہ تو باہر کی جانب ہے۔
اب آپ ہی فرمایئے میری حیرت کا کیا عالم رہا ہوگا۔ کیا میں ان گذشتہ مشاہدات کو نظر انداز کرسکتی
میری پریشانی اور بڑھگئی مجھے اب وہاں ایک منٹ بھی ٹھیرنا دوبھر تھا۔ میں نے کہا "چلیئے خالہ جان اب
ہے۔ مجھے یہاں زیادہ ٹھیرنا منظور نہیں" منتظم کی بی بی مصر ہی رہیں کہ آخر اتنی بھی جلدی کس کام کی جب

تکلیف ہی کی گئی ہے تو چار پی کر چلی جاتیں۔ مگر مجھے تو واپسی کی تلووں سے لگی ہوئی تھی۔ فوراً گھر لوٹ آئی اور خالہ جان سے وہ سارے واقعات بیان کر دیے کہ جن کو میری آنکھوں نے روزانہ مشاہدہ کیا تھا۔

مشہدی خانم اپنی لڑکی شاہ زمانی کو سینہ سے چپٹائی کانپ رہی تھیں۔ کہنے لگیں "بی بی اب تو مجھ سے یہاں ایک لحظہ کو بھی ٹھیرا نہ جائیگا" خالہ جان نے کہا "شہزادی یہ تمہارا محض وہم ہی وہم ہے ورنہ وہاں دریچہ کی کوئی حقیقت ہی نہیں تم کس طرح دیواروں سے کمرہ کے اندر کی چیزیں دیکھ سکتی ہو۔ ان خیالات کو دل سے نکال باہر پھینکو۔ چلو آج میں تمہیں لیڈیز کلب لے چلوں کہ وہاں ایک شاندار جلسہ ہے۔ اس طرح تمہارا دل بھی بہل جائیگا اور یہ توہم بھی رفع دفع ہو جائیگا۔

خالہ جان کے ساتھ میں کلب تو چلی گئی مگر میرا تمام دھیان اوس شخص اور اوس دریچہ ہی کیطرف تھا میں اس واقعہ کو کوشش کرتی تھی کہ بھلا دوں۔ مگر آنکھوں کے سامنے جلسہ میں بھی دریچہ ہی دریچہ تھا۔ بلند معبود۔ کس قدر خوفناک ا۔

دوسرے دن شاہ زمانی کہیلتی ہوئی میرے کمرہ کی طرف آگئی میں اسے سنا رہی تھی کیونکہ اوس کو سنانے میں خاص لطف آتا تھا۔ یکایک میری نظر دریچہ کی جانب بے اختیار اوٹھی۔ اب یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ کمرہ میں کوئی ٹہل رہا ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں میری آنکھیں اس وقت دھوکہ تو نہیں کہا رہی ہیں آنکھوں کو مل کے دیکھا ـــــ خداوندا تیری پناہ! کہ حقیقت میں ایک شخص کمرہ میں ٹہل رہا ہے پھر وہ دریچہ کی جانب بڑھا اور دریچہ کہول دیا۔ سڑک کے آنے جانے والے دریچہ کو دیکھنے لگے۔ اس نے پہلے مجھے دیکھا اور سلام کیا۔ اور پھر سڑک کی جانب دیکھنے لگا اس کی نگاہ نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ اور میں کانپ اوٹھی۔ پھر اوس نے مجھے ایکبار دیکھ کر دریچہ بند کر لیا۔ میرے منھ سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی خالہ جان افتاں و خیزاں پہنچیں۔ میرا سانس پھولا تھا۔ ہوش بجا نہ تھے چہرہ زرد ہاتھوں میں رعشہ تھا خالہ جان نے آتے ہی کہا "ہیں بیٹی کیا ہوا" میں نے کہا اللہ! خالہ جان آپنے مجھسے دنوں چھپایا۔ مگر دیکھیے اب تو انکار کی گنجائش نہیں کہ آج وہ دریچہ کھل گیا اور ایک شخص نے مجھے سلام کیا۔ اس پر تمام راستہ والے گواہ ہیں "بیٹی میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ یہ سب تمہارا توہم ہے کہ نت نئی صورتیں تمہاری نظروں میں گھومتی رہتی ہیں۔ وہ دریچہ کہل ہی کب سکتا ہے جب کہ وہاں کوئی

دریچے ہی نہیں محض ایک کیس ہے۔ میں نے اپنی بات کے ثبوت میں شاہ زمانی کو پیش کیا کیونکہ وہ بھی میرے ساتھ کھڑی دیکھ رہی تھی۔ شاہ زمانی نے کہا "ہاں ہاں بیگم صاحب' میں نے بھی دیکھا ہے۔ نہ جانے مشہدی خانم کس کونے میں کھڑی تھیں یہ سن کر لگیں چیخنے اور اپنی لڑکی کو لے کر باہر چلی گئیں۔

خالہ جان میرے پاس بیٹھ گئیں اور کہا دیکھو شہزادی ڈرنا نہیں۔ میں تم سے سارے واقعات کہہ دیتی ہوں سچ سے چند سال قبل یہاں ایک عورت کا افسوس ناک قتل ہوا تھا۔ مقتولہ کے بھائیوں نے قاتل کو بھی مار ڈالا اور اس قتل کا راز جمیلہ خانم کی فیروزہ کی انگوٹھیوں میں پوشیدہ ہے جس کو انہوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ مقامات مقدسہ سے لے آئی ہیں۔ خدا جانے اس کا کیا مطلب ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مکان والوں نے یہ مکان خالی کر دیا۔ اور اب اس میں کتب خانہ موجود ہے۔

یہ سن کر مجھے وحشت ہونے لگی یہاں اور مزید ٹھہرنا میرے لئے دوبھر ہو گیا۔ تیسرے دن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بھائی جان آ گئے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لیتے گئے۔ گھر پہنچنے کے کچھ عرصہ تک میں پریشان پریشان رہا کرتی تھی بعد میں میری شادی ہو گئی۔

دو سال بعد جب میں خالہ جان کے بلاوے پر ان سے ملنے گئی تو اس وقت خدیجہ میرے گود میں تھی۔ اتفاقاً خالہ جان کو اسٹیشن آنے میں دیر ہو گئی اور خدیجہ کے ابا پریشان تھے کہ سواری کا کیا انتظام کیا جائے۔ اچانک وہی شخص میرے مقابل کھڑا ہوا ہے جس کو میں نے بارہا دریچہ میں دیکھا تھا۔ گذشتہ واقعات پھر نظر کے سامنے آ گئے اُس نے پھر مجھے سلام کیا۔ اور میں نے مارے خوف کے خدیجہ کو اپنے سینہ سے چمٹا لیا کہ کوئی اس کو مجھ سے چھین نہ لے۔ میں خدیجہ کے ابا سے کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔ پھر کہیں نظر نہ آیا۔ اس اثناء میں خالہ جان بھی اسٹیشن پہنچ گئیں اور میں خوف و رجا کی حالت میں گھر پہنچی اسی شام کو باتوں باتوں میں جمیلہ خانم کا ذکر آ گیا تو خالہ جان کہنے لگیں "بیٹی ان کا تو انتقال ہو گیا اور ہاں مجھے خوب یاد آیا انہوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ ان کے فیروزہ کی انگوٹھیاں تمہیں پہنچا دی جائیں۔

میں اس وصیت کو سن کر کانپ ہی تو گئی مگر میں نے انہیں اب تک ہاتھ نہیں لگایا۔ نہ معلوم ان میں کیا بلا ہو۔ اگر کوئی ان کو چرا لے تو میں اس کی شکر گزار رہوں گی۔

ان واقعات کے بعد مجھے پھر کبھی اتنی جرأت نہ ہوئی کہ دریچہ کے جانب بھولے سے بھی جاؤں ۔ نہ آج تک یہ معمہ حل ہوا کہ وہ شخص جس نے مجھے دریچہ اور اسٹیشن پر سلام کیا تھا۔ اوس کا اس کتب خانہ سے کیا تعلق ہے ۔ جمیلہ خانم نے کیوں میرے حق میں انگوٹھیوں کی وصیت کی تھی۔

وہ انگوٹھیاں جوں کی توں خالہ جان کے پاس محفوظ ہیں اگر آپ کا جی چاہے تو بلا تکلف منگوالیں۔

غزل

جناب نواب میر عباس حسین خاں صاحب ناظم عدالت

جو نظر آ نہیں سکتا نظر آتا کیوں کر
دیکھئے طور پہ پھر حضرت موسیٰ کیوں کر

سر بھی قدموں پہ رکھیں ہم تو نہیں سنتے بات
مان لیتے ہیں رقیبوں کا وہ کہنا کیوں کر

اچھی صورت تو حقیقت میں غضب ہوتی ہے
دیکھ کر یہ دل شیدا نہ مچلتا کیوں کر

دل تو اتنا سا ہے اور بار محبت ہے پہاڑ
مجھ کو ہوتی ہے یہ حیرت کہ اٹھایا کیوں کر

بات پردہ کی ہے کہتے ہوئے آتا ہے حجاب
سامنے اون کے ہو اظہار تمنا کیوں کر

نہ ہوئی کچھ بھی خبر کب یہ کہاں سے آیا
دل کو تیر ستم آرا سے بچاتا کیوں کر

دل میں کس طرح سے ہے لاکھ خیالوں کا ہجوم
ایک کوزہ میں سما جاتا ہے دریا کیوں کر

لیکے دل خوش تو بہت کچھ ہو مگر یہ تو کہو
نہ ہوا میرا تو ہوگا یہ تمہارا کیوں کر

دل پہ وہ داغ وہ صدمے ہیں کہ خالق کی پناہ
بزم کے منھ کو نہ آئیگا کلیجہ کیوں کر

"پھولوں بھری پژمردہ شاخ کو دیکھ کر"

(جناب سید محمد قاسم صاحب رضوی بی اے ال ال بی علیگ)

حیات چند روزہ لے کے تو گلشن میں آئی تھی
دکہانے کیلئے دنیا کو شاید راز ہستی کا　　بتانے کے لئے میکش کو انجام اس کی مستی کا
عروس موسم گل بن کے تو مدفن میں آئی تھی

تیرا ہر غنچہ تھا اک راز سر بستہ تباہی کا
تیرے ہر پھول میں پنہاں تھی عالم کی پریشانی　　لباس رنگ و بو میں بھی تیرے مضمر تھی عریانی
تیرا ہر پتہ اک دفتر تھا قسمت کی سیاہی کا

کبھی تو زینت و زیبائش دستار شاہاں تھی
کبھی تو دولوں کی لہر تھی نوشہ کے سہرے میں　　کبھی عاشق کا تحفہ تھی کسی مہوش کے جوڑے میں
کبھی تو پردہ پوش حالت گور غریباں تھی

حیات مختصر تیری ہے اک تاریخ عالم کی
کہیں عزت کا زینہ ہے کہیں نغمہ ذلت ہے　　کہیں رنگ عداوت ہے کہیں بوئے محبت ہے
کبھی ہے مژدہ شادی کبھی ہے داستاں غم کی

براہ کرم پتہ لازم کوتا کید کیجئے کہ پرچہ آپ کو حفاظت سے پہنچا دیا کرے۔ کیونکہ لاپروائی سے ہم اپ کو دفتر سے شکایت ہوتی ہے۔

افسانہ نویس

(جناب سکین صاحب عابدی)

سعید افسانہ نویس اور کامیاب افسانہ نویس تھا۔ ملک کے تمام علمی ادبی رسائل اس کے افسانوں کو شائع کرنا اپنے لئے موجب عزت سمجھتے تھے سعید کا دماغ افسانوں کیلئے خاص طور پر بنایا گیا تھا اسے ہروقت نیا خیال سوجھتا۔ ہر گھڑی نئی بات اس کے ذہن میں آتی تھی۔ روزمرہ کے واقعات کو گرد وپیش کے حالات سے مطابق کرکے اپنے الفاظ میں وہ ایسی افسانوی روح پھونک دیتا تھا جو اسی کا اور صرف اسی کا حصہ تھا۔ امرا کے عیش ونوش کے جلسوں غربا کی جھونپڑیوں متوسط الحال گھروں کا نقشہ اس مزے سے کھینچتا تھا۔ گویا اس کی عمر اسی طبقہ میں بسر ہوئی ہے اس کے افسانوں میں نفسیاتی جزو ہمیشہ غالب رہتا اور صنف نازک کا احترام ہرحالت میں کیا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے افسانے مردوں سے زیادہ عورتوں کو پسند تھے اور عورتیں اس کی بہت مداح تھیں۔

اس افسانہ نویسی کے سلسلہ میں اس کے پاس رسائل کے اڈیٹروں اور اس کے افسانوں کو پسند کرنیوالوں کے علاوہ خواتین کی بھی بہت بڑی چھٹیاں روزآنہ آتی تھیں۔ بعض خواتین اس کے پلاٹ اور کیرکٹر کی داد دیتی تھیں۔ بعض اس کے طرز تحریر کی دلدادہ تھیں بعض اس کے خیالات کو سراہتی تھیں اور بعض خواتین ایسی بھی تھیں جو اپنے افسانے اس کے پاس اصلاح کیلئے بھیجا کرتی تھیں۔

رشیدہ نامی خاتون نے پہلے پہل چھٹیاں لکھ کر اس کی افسانہ نگاری کی داد دینی شروع کی اس کے بعد اپنے افسانے اصلاح کیلئے اس کے پاس بھیجنے لگی۔ چند روز تک بالکل رواداری سے خط وکتابت ہوتی رہی مگر رشیدہ ہی نے بے تکلفی اختیار کی اور اس کے پاس بے تکلف چھٹیاں آنے لگیں۔

سعید کی بیوی پڑھی لکھی تھی اور اس کے ادبی مشاغل میں اس کا ساتھ بھی دیتی تھی مگر سعید کی ڈاک سے اسے سروکار نہ تھا وہ یہ جانتی تھی کہ سعید کی خط وکتابت بعض خواتین سے بھی ہے مگر سعید کی ذات پر اسے کامل بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اس کی ایک سہیلی زبیدہ نہایت شوخ اور چلبلے درجہ کی شریر تھی وہ ہمیشہ اسے ڈرایا کرتی تھی کہ سعید کا اس طرح غیر عورتوں سے خط وکتابت کرنا ٹھیک نہیں ہے مگر سعید کی بیوی ہمیشہ اپنے

با اعتماد کا اظہار کر کے اس گفتگو کو ختم کر دیتی تھی۔

رشیدہ کی چٹھیوں نے ابتداً تو سعید کو متاثر نہیں کیا مگر آہستہ آہستہ اس کے دل میں بھی چہل پیدا ہو گیا۔ اور اس نے
تا بے تکلفانہ جواب لکھنے شروع کئے۔ اس طرح دونوں میں بے تکلفی بڑھتی گئی چونکہ اس کی ابتدا مذاق سے ہوئی تھی
ہ سعید نے کبھی اپنی بیوی سے تذکرہ بھی نہیں کیا اور رشیدہ سے مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی انتہا یہ کہ ایک روز رشیدہ
ایک تصویر بھیجی اور سعید کی تصویر کا مطالبہ کیا۔ فل سائز کی پورے قد کی تصویر جس میں ایک پیکر حسن و جمال پنکھا
ہاتھ میں پنکھا لئے ہوئے صوفہ کے قریب کھڑی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ بوٹا سا قد۔ ابھرا ابھرا جسم متناسب اعضاء اور
ں میں چکا چوند پیدا کر دینے والا چہرہ دیکھ کر میاں سعید کے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ خود اس نے ایک تصویر اتروائی
رہ کو بھیجدی مگر رشیدہ کی تصویر نے اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ بے تکلفی جو مذاق اور دل لگی سمجھ کر اختیار کی گئی
ادل کی لگی بن گئی اور میاں سعید واقعی دل کھو بیٹھے۔ رشیدہ کے افسانے نہایت ہی محنت سے بنائے جانے بلکہ
بعض وقت تو اس کے پلاٹ اور کیریکٹر میں معمولی تبدیلی کر کے سعید خود افسانہ لکھ کر بھیجدیا کرتا تھا۔ تقریباً تین
احالت میں گزر گئے۔ تصویر کا تصور دو بھر ہو گیا اور نقل کو اصل کے مطابق کر کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔
ا خط میں سعید نے رشیدہ سے ملنے کی درخواست کی۔

پہلے تو رشیدہ نے اپنی بعض مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے ملنے سے انکار کیا مگر میاں سعید کے پے در پے تقاضوں
آ کر وعدہ کیا گیا اور ملاقات کیلئے ایک دن مقرر ہوا۔
سعید کو اس ملاقات کے وعدے سے بے انتہا خوشی ہوئی کئی روز تک سعید نے ملاقات کے موقع پر گفتگو کیلئے
الفاظ سوچے اور طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکاتا رہا۔ خاص طور پر اس ملاقات کیلئے ایک سوٹ سلوایا گیا۔ ٹوپی
خریدا گیا اور اپنے چند افسانوں کے مجموعہ کی ایک جلد نہایت نفیس بنوائی گئی اور اس پر سنہری حرفوں سے
م لکھوایا گیا۔ اس طرح سعید نے ساری تیاریاں مکمل کر لیں اور ملاقات کے روز کا انتظار کرنے لگا۔

سعید کی بیوی کی سہیلی زبیدہ یکایک پہنچ گئی اور اس نے سعید کی بیوی کو دوسرے دن دوپہر کا کھانا اور رات
سینما دیکھنے کی دعوت دی۔ سعید کی بیوی نے سعید سے اجازت لیکر دعوت منظور کرلی اور دوسرے دن زبیدہ کے
ں جانا طے ہوگیا۔ زبیدہ نے شام تک ٹہیر کر اِدہر اُدہر کی باتوں کے بعد میاں سعید کی دوسری عورتوں سے خط و
ابت کے متعلق اس کی بیوی سے گفتگو کی مگر اس بیچاری نے اسی قدیم اعتماد کا اظہار کیا اور گفتگو ختم کردیگئی۔

حسب وعدہ سعید کی بیوی زبیدہ کے گھر پہنچ گئی اور اس نے دوپہر کا کھانا بھی وہیں کہا لیا۔ پانچ بجے زبیدہ نے
سے ایک دلچسپ قصہ سنایا کہ ایک مدت کے بچھڑے ہوئے عاشق اور معشوق آج ملنے والے ہیں چنانچہ اس نے اسے بھی
اتھ چلنے کی دعوت دی اور سعید کی بیوی بھی اس تماشہ کو دیکھنے کیلئے تیار ہو گئی۔ مگر اسے یہ نہ معلوم تھا کہ یہ عاشق
معشوق کون ہیں۔

ساڑھے پانچ بجے زبیدہ سعید کی بیوی کو ساتھ لیکر موٹر پر سوار ہوئی اور دونوں باغ عام جا پہنچیں۔ ایک جگہ
ں سعید نیا سوٹ پہنے نئی ٹوپی اوڑہے۔ نیا شوز ڈانٹے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار اور ایک کتاب لئے بےچینی
ٹہل رہے تھے۔ زبیدہ نے موٹر میں سے جہانک کر انہیں دیکھا اور موٹر کھڑا کرنیکا حکم دیا گیا۔ زبیدہ نے اپنے ساتھ
ب برقعہ بھی رکھا تھا جسے زبیدہ کے کہنے پر سعید کی بیوی نے پہن لیا اور وہ موٹر میں ایک کونہ کی طرف سمٹ کر
بیٹھ گئی۔ زبیدہ یوں ہی بیٹھی رہی اور اس نے شوفر سے سعید کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ اُن صاحب کو یہ کہہ کر
لاؤ کہ رشیدہ انتظار کر رہی ہیں۔ شوفر سعید کو بلانے کے لئے چلا گیا تو زبیدہ نے سعید کی بیوی سے خواہش کی
، وہ خاموش بیٹھے ہوئے اس معاملہ کو دیکھتی رہے۔

سعید نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے موٹر کا دروازہ کہولا اور جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ رشیدہ جس کی تصویر آنکھوں
ں پھر رہی تھی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی سعید نے مرتعش آواز میں رشیدہ کا شکریہ ادا کیا اور اپنی بےچینی و بیقراری
داستان شروع کی مگر داستان ختم نہ ہوئی تھی کہ رشیدہ نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا اور سعید کی بیوی برقعہ کا
نقاب الٹ کر غصہ سے سعید کی طرف دیکھنے لگی۔ . . . . . . میاں سعید حواس باختہ تھے۔

"طمطم بابا"

جناب شمیم صاحبہ (ایران)

ہمیں نیلگری گئے دو مہینے ہو چکے تھے اس دوران میں اکثر صبح کے وقت میں "بوڑھے طمطم" کو پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے دو ڈرم کندھوں پر اٹھائے ہوئے پہاڑ کی بلندی پر آسانی سے چڑھتے دیکھا کرتی تھی۔ بوڑھا طمطم کم از کم زندگی کی ستر اسی منزلیں طے کر چکا تھا۔ مگر اس کا جھریاں پڑا ہوا جسم ابھی تک کافی طاقتور تھا۔ وہ بہت ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا کرتا۔ ایک قدیم وضع کی بھدی سی چپلی ٹخنوں سے ذرا اونچی گھیردار شلوار۔ کھلی آستینوں کا ڈھیلا سا کرتا۔ جو کبھی نہ دھلنے کی وجہ سے خاکستری مائل ہو گیا تھا۔ اس پر سیاہ رنگ کی گرم صدری۔ اور ان سب پر نمدے کا ایک لمبا سا چوغہ، سر پر نمدے کی ٹوپی اور کبھی کبھی اس کے اوپر ہی چند پیچ کی پگڑی بھی پہنا کیا کرتا۔ یہ تھا بوڑھے طمطم کا مخصوص لباس۔ جو کہ اس کے فربہ جسم اور بلند و بالا قامت پر موزوں بھی خوب ہوتا۔ ضعیفی کے باوجود اس کے سرخی مائل چہرے پر دہکتی ہوئی آنکھیں انگاروں کی طرح شعلہ بار۔ گھنی داڑھی اور بھویں تک برف کی طرح بالکل سفید تھیں۔

بوڑھا طمطم خاموش طبیعت اور بہت محنتی انسان تھا۔ کم و بیش ۲۰ بنگلوں میں وہ صبح و شام دونوں وقت پانی دیا کرتا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں پانی دینے کا کام بہت سخت اور محنت طلب ہوتا ہے۔ اسی لئے جوان مرد بھی کچھ دنوں بعد ہمت ہار دیا کرتے ہیں لیکن "بوڑھا طمطم" بہت مستقل مزاج تھا۔ اور پانی بھی اس افراط سے دیتا کہ کبھی کسی کو شکایت نہ ہوتی۔ ہمارے سامنے ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اس کی جھونپڑی تھی اس لئے اکثر رات کو آگ لینے، یا کبھی کبھی "راشد" کے ساتھ حقہ پینے آ جایا کرتا تھا۔

ایک دن "اکرم صاحب" اپنے دوستوں کی طرف سے پکنک پارٹی پر مدعو تھے وہاں جاتے وقت میری تنہائی کے خیال سے بوڑھے طمطم کو بھی اس رات "راشد" کے ساتھ برآمدے میں سو رہنے کیلئے کہہ گئے۔ "راشد" نے سرِ شام ہی سے کھانا تیار کر لیا تھا۔ اس لئے میں نے معمول سے کچھ جلدی ہی کھا کر کمرے کے دروازے بند کر لئے ذرا ذرا تاریکی پھیلنے پر بوڑھا طمطم پیوند لگی ہوئی گودڑی اور ایک بوسیدہ کمبل کندھے پر ڈالے، ہاتھ میں ایک

موٹا سا بدوضع لٹھ لیکر آگیا۔ میں تنہائی کے باعث وحشت سی محسوس کر رہی تھی۔ اس لئے برآمدے کی کھڑکی کھول دی اور اس کے قریب ہی ایک آرام کرسی پر لیٹ کر مطالعہ کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد راشد بھی اپنے کام سے فراغت حاصل کرکے حقہ لیکر بوڑھے طمطم کے پاس آبیٹھا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر کی طرف دیکھا۔ رات بالکل تاریک اور اس قدر سنسان ہو چکی تھی کہ خوف کے مارے آنکھیں بند ہوگئیں۔ اور میری طبیعت میں انتشار سا پیدا ہونے لگا۔ لیکن میں نے اپنے منتشر خیالات کو درست کرنے کے لئے بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بابا طمطم" ! !——— آج تو بہت ہی اندھیری رات ہے۔ کیا یہاں بھی چوریاں ہوا کرتی ہیں ؟؟

خاتون ! ! ! جہاں چند معقول گھر ہوں وہاں چوریاں بھی ضرور ہوتی ہیں لیکن طمطم کی موجودگی میں کوئی اس قسم کی بیہودہ حرکت نہیں کرسکتا۔ بوڑھے نے نہایت استقلال آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

تو گویا ایسی وارداتیں ہوتی ضرور ہیں"۔ بابا" ! میں نے شیشم کے گھنے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُف!! اس وقت یہ جنگل کس قدر بھیانک معلوم ہو رہا ہے۔

خاتون ! ڈرو نہیں۔ ایسے واقعات شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ میں تو یہاں کے ذرا ذرا حالات اور چپے چپے سے واقف ہوں۔ بوڑھے طمطم نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے جواب دیا۔

"راشد" نے خود ایک لمبا کش لگا کر حقے کا رُخ بوڑھے طمطم کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

"بھئی طمطم" ! تب تو تمہیں یہاں رہتے بہت عرصہ ہوگیا ہوگا ؟؟

ہاں ! ! بہت عرصہ ! بوڑھے طمطم نے ایک لمبی اور سرد آہ بھر کر کہا۔

لیکن وطن میں تمہارے بال بچے اور رشتہ دار بھی تو ہوں گے ؟؟ راشد نے جھٹ سے پھر ایک اور سوال کر دیا

سوائے ایک ہمشیرہ زاد کے میرا دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ اور وہ بھی خدا جانے اب کہاں ؟ اور کس حال میں ہوگا۔ بوڑھے طمطم نے دکھ محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

اُئے۔ . . وائے . . . بیچارا ! !——— راشد نے ہمدردی کے طریق پر دلسوز آواز میں کہا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بوڑھے طمطم نے سر اٹھایا۔ لیلیٰ شب کی پرسکون ادا اور شیشم کے گھنے جنگل کی سرگوشیوں پر ایک نظر غلط انداز ڈال کر حقہ کے پے در پے دو چار کش لگا ئے۔ پھر اس آواز میں جیسے کوئی نیند سے بیدار ہوا ہو

کہنے لگا۔

"راشد ! ابھی تم کیا پوچھ رہے تھے ؟؟

یہی وطن اور بال بچوں کے متعلق !! راشد نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

ہاں ہاں !! بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔ کیا تم میری روداد سنا چاہتے ہو ؟ کیا نہیں اس سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے ؟

ضرور !! ــــ مطلع ! مجھے تمہارے حال سے بہت ہمدردی ہے۔ اگر واضح کرو تو میں ہمہ تن متوجہ ہوں۔ راشد نے کسی قدر مضطرب ہو کر جواب دیا۔

اچھا ! ــــ تو سنو !! ــــ بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

سرحدی علاقہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں میرا اصلی وطن ہے۔ میرا باپ گاؤں میں سب سے بڑا زمیندار تھا۔ اور دنیوی شان و شوکت کے علاوہ انتہائی شریف النفس ہونیکی وجہ سے گاؤں کے سب چھوٹے بڑے اس کی بہت عزت کرتے تھے لیکن اولاد کے معاملہ میں وہ کچھ زیادہ خوش نصیب نہیں تھا۔ پندرہ بچوں میں سے میں اور ایک میری ہمشیرہ دونوں زندہ بچے۔ میری ماں بھی ایک رئیس زادی تھی۔ لیکن اکثر اولاد کے غم میں بہت پریشان رہا کرتی تھی جب میں اور میری ہمشیرہ سن شعور کو پہنچے تو ایک ہی وقت میں ہم دونوں کی شادیاں بہت دھوم دھام سے کی گئیں۔ ــــ ہمشیرہ ایک دوسرے گاؤں کے رئیس ہی سے بیاہی گئی اور میری بیوی بے انتہا حسین اور بہت خوش مزاج تھی۔ اس لئے ہم اپنی اپنی جگہ بہت مسرور تھے۔ وقت اسی طرح بتدریج گذرتا رہا ــــ رفتہ رفتہ کئی سال گذر گئے۔ لیکن اولاد کے معاملہ میں میں اپنے والدین سے بھی زیادہ بدنصیب نکلا۔ آخر کار جب ایک طویل زمانہ گذر گیا تو میرے والدین اور عزیز و اقارب نے ایک اور جگہ میری شادی کر دی۔ لیکن خدا کی مرضی۔ اولاد پھر بھی نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ مجھ پر اولاد کا جنون اس قدر مسلّط ہوا کہ میں نے پے درپے کئی شادیاں کر ڈالیں۔ مگر سیاہ بختی کی انتہا تھی۔ میری تشنہ تکمیل آرزوں کو باران رحمت کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوا ــــ یہاں پہنچ کر بوڑھے نے ایک پرسوز آہ ــــ کھینچی۔ اور ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پھر کہنے لگا۔

میری ہمشیرہ کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ بچے اکثر میرے ہی پاس رہا کرتے تھے اور مجھے بھی ان بچوں سے عشق تھا۔ ایک دفعہ موسم گرما کے آغاز پر گاؤں میں زبردست وبا پھیلی۔ خاندانوں کے خاندان ختم

ز لمحوں میں تباہ ہوگئے۔ میری ہمشیرہ اور اس کے چار بچے علاوہ ازیں خاندان کے اور کئی فرد دو ہی دن میں وبا کا
کار ہوگئے۔ میرے والدین ضعیف اور بہت بوڑھے تھے اس صدمہ کی تاب نہ لاسکے ہمشیرہ کے چند ہی روز بعد
ہ بھی مجھے دنیا میں یکّا و تنہا چھوڑ کر خدا کے گھر چلے گئے۔ ہجوم یاس اور رنج و الم نے میرا دماغ معطل کردیا۔ صرف
رم“ —— میرا ہمشیرہ زادہ آٹھ نو سال کا ایک ہی بچہ جو وبا کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ رہ گیا۔ فقط میری زندگی کا
ہارا تھا۔ میں اسے لمحہ کیلئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ کرتا۔ آخر ہوتے ہوتے کچھ عرصہ بعد صدمات کا اثر
ائل ہونے لگا اور ”ارم“ کی بدولت میری طبیعت بہل گئی۔ میں ہمیشہ اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا اور اسی
رح میری بیویاں بھی اس کی خاطر ہر بات پر مقدم رکھتیں۔ لیکن ”ارم“ لاڈ سے بچوں کی طرح ہر وقت ہی ناز
یا کرتا۔ اور اس کی طبیعت میں ضد کا عنصر بھی بہت غالب آگیا تھا۔ مگر میری مفتون حالت نے کبھی اس کے عیوب
ی اصلاح پر توجہ نہ دی۔ بلکہ اکثر خامیوں پر چشم پوشی کرتے ہوئے میری اندھی محبت اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو
یر قیل قعال کے فوراً پورا کردیتی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کے آزاد لڑکوں کی بیہودہ صحبت نے ”ارم“ کے اخلاق پر بہت
ا اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ وہ اکثر سارا سارا دن گھر سے غیر حاضر رہتا چونکہ دولت بے اندازہ تھی اس کو بیجا اصراف پر
ھی کسی نے منع نہیں کیا تھا۔ اور کوئی بھی پابندی نہ ہونے کے باعث آہستہ آہستہ وہ بھی اپنے نامعقول
وستوں کے ساتھ قمار بازی اور نشہ کا عادی ہوگیا۔ پھر اکثر راتوں کو بھی غائب رہنے لگا۔ اس کے اس رویہ
پر ایک دن میں نے نرمی اور بہت شفقت کے ساتھ اس کو بدی کی طرف سے متنفر کرنا چاہا۔ لیکن وہ میری باتوں
ہ کچھ آزردہ سا ہوگیا جس سے مجھے بھی صدمہ تو بہت ہوا۔ لیکن میں نے اس پر ظاہر ہونے نہ دیا۔

اس واقعہ کے کئی دنوں بعد جب کہ فصل پکی ہوئی تھی۔ میں زراعتی کاروبار میں بیحد مصروف تھا۔ گاؤں
ے ایک معتبر آدمی نے آکر یکایک مجھے اطلاع دی کہ ”ارم“ کسی دور دراز سفر کے ارادہ پر اپنے ایک دوست کے
ہمراہ وطن سے ہجرت کر گیا ہے۔ یہ سن کر میرے خرمن دل پر بجلی گری۔ آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں حواس باختہ
و پریشان حال گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ ”ارم“ تین یوم سے گھر میں بالکل نہیں آیا۔

موسم خراب —— اور بیحد خراب تھا۔ لیکن میری آنکھوں میں دنیا تاریک ہوچکی تھی مجھے کچھ نہ سوجھا۔ اس
وقت ”ارم“ کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔ صرف مختلف قسم کے خشک میوے اور تھوڑے سے سیب زاد راہ کے لئے ساتھ

ساتھ لئے اور میں دیوانہ وار ایک کی جگہ تین تین منزلیں طے کرنے لگا۔ گرد و نواح کا پتہ پتہ اور ذرہ ذرہ چھان مارا۔ لیکن ارم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بہت دنوں کے بعد ایک دن میں دریا کے کنارے کنارے بغیر کسی منزل کو مدّ نظر رکھے ہوئے تیز رفتاری سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک میں نے ارمؔ کے دوستوں میں سے ایک کو دیکھا جو ایک متین راہگیر کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ میں نے بے تکلف اس کا دامن پکڑ کر ارمؔ کا پتہ پوچھا۔ اس نے جواب میں ایک ناگوار سکوت کے بعد کہا۔

"ارمؔ اب کبھی بھی وطن واپس آنے کی نیت سے نہیں نکلا۔ وہ یہاں سے بہت دور چین کے ایک وسیع جنگل میں تنہا رہنے کیلئے چلا گیا ہے۔ ہیں !! چین ؟ ؟ — میں نے بےچین ہو کر کہا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟؟ تم ارم کے دوست ہو۔ خدا کیلئے بتاؤ کہ وہ وطن سے چوروں کی طرح کیوں بھاگ نکلا ؟ رنج، افسوس، اور غصہ کے مارے میرا بدن کانپ رہا تھا۔

وجہ ؟ ؟ — اس کا علم آپ کو مجھ سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ اس نے متین لہجہ میں کہا۔ انتہائی شفقت اور عیش و آرام کی فراوانی نے اسے اس آوارگی کے جنون میں مبتلا کیا۔ آپ کو یقین رکھنا چاہئے میں نے ارمؔ کو اس خام خیال سے باز رہنے کی بیحد کوشش کی۔ مگر ظالم نے مجھے دھوکا دیا۔ گذشتہ ہفتہ تک ہم اکھٹے ہی تھے لیکن یکایک ایک رات وہ مجھے خواب کی حالت میں چھوڑ کر خدا جانے کس طرف کو چل دیا۔ میں اس روز سے تلاش میں سرگرداں ہوں مگر اس کی گرد تک نہ پا سکا۔

یہ سن کر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ لیکن میں نے اپنا ارادہ نہ بدلا۔ ارمؔ کے دوست کو وطن کی طرف بھیج کر خود پھر آگے بڑھنے لگا۔ سنسان اور ہیبت ناک جنگل، بہت سے آباد و پر رونق ملک طے کرنے میں بادوباراں کے بے پناہ طوفان۔ موسم گرما کی شدت۔ گرم لوؤں کے جھکڑ، تپتے ہوئے صحرا۔ یخ پوش پہاڑوں کی ناقابل برداشت سردی کا مردانہ وار مقابلہ کر کے بہت سے دریا و سمندر عبور کرتا ہوا مسلسل ایک طویل عرصہ تک سفر کرتا رہا۔ ایک دن جب کہ میں چین کے نزدیک تر ایک ہولناک کوہستانی جنگل میں سے گذر رہا تھا میں نے ایک بڑے خونخوار شیر ببر کو بالکل اپنے قریب ہی پایا۔ طویل عرصہ تک جنگلوں میں تن تنہا سفر کرنے کے باعث درندوں اور بڑے بڑے اژدھوں سے مجھے بالکل خوف نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی اس قد آور شیر ببر کو دیکھ کر میں نے ایک عجیب قسم کی وحشت محسوس کی پاؤں بھاری ہو گئے۔ سوائے اس لٹھ کے جو تم دیکھ رہے ہو۔ اس وقت

میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ شیر ببر میرے بالمقابل خاموش کھڑا رہا اور مجھے کوئی ایذا نہ دی۔ چند سیکنڈ بعد میرے حواس بجا ہوئے تو میں جرأت کرکے قدم بڑھایا۔ شیر بھی تین گز کے فاصلہ پر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور برابر چلتا گیا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ میں نے کمر کھولی اور ایک غار میں اطمینان سے جا بیٹھا۔ شیر باہر بیٹھ گیا۔ میرے دل میں اس جانور کے اس طرح تعاقب کرنیکی وجہ سے ایک الجھن پیدا ہو رہی تھی اس پریشانی میں مجھے مطلق نیند نہ آئی۔ دوسرے دن جبکہ صبح ہی صبح میں غار سے باہر نکلا تو شیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کل کی طرح آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ ہم سارا دن چلتے رہے جہاں میں دم لینے کے لئے ٹھہرتا۔ شیر بھی وہیں ٹھہر جاتا۔ شام کے قریب میں ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر سے خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر پیٹھ کے بل ایسا لڑھکا کہ پہاڑ کے دامن میں ایک گہرے خلا کے اندر جا پڑا۔ دایاں بازو شل۔ اور ٹانگ کی ہڈی بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ خون اس کثرت سے بہا کہ میں بالکل بیہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا شیر بھی میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ مجھ سے ہلا تک نہیں جاتا تھا۔ شیر نے چاٹ کر میرے زخموں کا خون صاف کردیا چند دنوں کے بعد زخموں کے دہانے خود ہی خشک ہونے لگے۔ خدا جانے میں کتنا عرصہ اس خلا میں پڑا رہا۔ رفتہ رفتہ پھر مجھ میں طاقت آنے لگی۔ کھاری چشمے کا پانی۔ درختوں کے پتے۔ کبھی کبھی شیر کا شکار کردہ گوشت میری خوراک تھی۔ آخر جب چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو پھر اس جنگل کو طے کرنا شروع کیا۔ کئی دنوں کے بعد میں نے آبادی کے آثار پائے۔ لیکن یہاں پہنچ کر شیر نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور واپس جنگل کی طرف لوٹ گیا۔ لیکن اس خونخوار درندے کا محافظوں کی طرح اتنا عرصہ میرے ساتھ رہنا ایک ایسا معمہ ہے جسے میں آج تک حل نہ کرسکا۔ کرشمۂ قدرت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ —— ہاں تو دوسرے دن میں چین کی حدود میں پہنچ گیا۔ کئی ہفتوں کی پیہم کوشش کے باوجود "ارم" کا کوئی نشان تک نہ ملا —— آبادیوں اور صحراؤں میں تلاش کرتا رہا۔ لیکن بے سود۔ آخر میں مایوس ہوکر پھر ایک طرف کو چل نکلا۔ چند ہفتوں کے بعد مجھے ایک وسیع ریگستان ملا۔ میں اس میں بھی برابر چلتا رہا۔ مگر وہاں پانی کی بہت قلت تھی۔ جہاں کہیں سے بھی پانی ملتا۔ میں اپنا مشکیزہ بھر لیتا تھا۔ ایک دن پانی ختم ہوگیا۔ اور مجھے میلوں تک ایک بوند بھی نہ ملی۔ مارے پیاس کے بیتاب ہوکر میں ایک اونچے سے ٹیلہ پر چڑھ گیا۔ پانی کی جستجو میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مگر جہاں تک بھی دیکھ سکا سوائے تمتماتے ہوئے ریگستان کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ آخر میں

ناامید ہو کر ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ اچانک میں نے اپنے سامنے مگر بہت دور ایک انسانی شکل کو دیکھا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا۔ مگر پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے لیکن میں نے پھر چلنا شروع کیا۔ جوں جوں میں نزدیک جا رہا تھا مجھے وہ شکل کچھ پہچانی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ میں نے تیزی سے بھاگنا شروع کیا۔ مگر تھوڑی دور جا کر پیاس کی شدت سے بیدم ہو کر گر پڑا۔ ذرا دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ تو کوئی مجھے پانی پلا رہا تھا پانی کے چند گھونٹ حلق سے اترنے ہی میرے ہوش بجا ہو گئے۔ "ارم" نے مجھے اور پانی دیا اسے دیکھ کر میں جوش مسرت سے اٹھ بیٹھا۔ اور فرط محبت سے بیقرار ہو کر "ارم" کو گلے سے لگا لیا۔ مسرت کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے دنیا اور دنیا کا عیش و غم مجھے سب کچھ بھول گیا۔ میری تمام محنت کا معاوضہ وصول ہو گیا۔ "ارم" کو پا کر میں جامہ سے باہر ہوا جاتا تھا۔ صحرا کے انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ذرّوں اور سورج کے آتشیں تیروں میں اس وقت میں نے جنت کی سی لطافت محسوس کی ——— یہاں پہنچ کر بوڑھا ملطم کچھ دیر کیلئے رکا۔ اور حقہ کا ایک لمبا کش لیکر اس نے اپنے بوسیدہ سے اونی لبادہ کو اچھی طرح جسم پر لپیٹ لیا۔ پھر کہنے لگا۔

"ارم" مجھے تھوڑی دور ایک پھونس کی جھونپڑی میں لے گیا۔ اس نے خود ہی جنگلی پرندوں کا گوشت بھون لیا۔ میں نے وہ جھولی بھر خشک میوہ جو وطن سے ساتھ لیکر نکلا تھا۔ اس کو دیا۔ پھر ہم طویل عرصہ تک باتیں کرتے رہے۔ رات کو مجھے اس خوشی میں نیند نہ آئی لیکن "ارم" کچھ دیر کے لئے سو گیا۔ دوسرے دن میں نے وطن سے اس طرح بھاگنے کی وجہ دریافت کرنی چاہی لیکن ارم اس گفتگو کو ٹالتے ہوئے اپنا ترکش اور کمان لے کر شکار کی تلاش میں باہر نکل گیا۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ کہ ارم کی حالت میں یک بیک اس قدر تبدیلی کس طرح پیدا ہو گئی۔ نرم بستر پر سونے والا ارم اس وقت چھال کا مختصر سا لباس پہنے ہوئے تھا کچھ دیر بعد میں بھی ارم کے تعاقب میں نکلا۔ ہم سارا دن صحرا میں سرگرداں پھرتے رہے۔ شام کے وقت ارم نے دو چار پرند شکار کئے اور پانی کا مشکیزہ بھر کر ہم واپس جھونپڑی میں آگئے۔ پھر رات کے ایک طویل حصہ تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن ارم نے وطن سے بھاگنے کی وجہ دریافت کرنے پر ہمیشہ بات کا رخ بدلا۔ اور اس راز سے آگاہ نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ارم سو گیا۔ پھر مجھے بھی نیند محسوس ہونے لگی۔ میں بھی ارم کے پاس ہی لیٹ گیا علی الصبح جب آنکھ کھلی تو "ارم" جھونپڑی میں موجود نہ تھا۔ باہر نکلا۔ دور دور تک نظر دوڑائی۔ لیکن نظر نہ آیا۔

پھر میں جھونپڑی کے اندر آیا۔ دیکھا ترکش اور اس کی کمان بھی نہ تھی۔ میں نے خیال کیا وہ شکار کیلئے صبح ہی صبح نکل گیا ہوگا۔ پھر بھی میں مضطرب ہوکر اِدھر اُدھر ڈھونڈا کیا اسی طرح دن ختم ہوکر رفتہ رفتہ آفتاب ڈھلنا شروع ہو گیا۔ لیکن "ارم" واپس نہ آیا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ آہ . . . . ———

رُوئے گل سیر نہ دیدیم بہار آخر شد۔

میں نے اس وقت "ارم" کی جھونپڑی کو خیر باد کہتے ہوئے پھر "ارم" کی تلاش میں صحرا نوردی شروع کردی۔ گھنٹوں سے دن۔ دنوں سے ہفتے۔ ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے پھر کئی سال تمام ہوگئے نہ تو ارم کا سراغ ملا۔ اور نہ میری جستجو کم ہوئی۔ اس اثناء میں میں نے دنیا کے بہت سے عجائبات دیکھے۔ مگر مجھے کسی چیز سے دلچسپی اور کسی شئے سے دلبستگی پیدا نہ ہوئی۔ "ارم" کے فراق کی آگ نے میری روح تک جھلس دی تھی۔ اور میرا تمام وقت "ارم" کی یاد اور اس کی جستجو میں صرف ہورہا تھا۔ ایک دن معمول کے مطابق میں ایک جگہ دریا عبور کرنے کے لئے پانی میں گھسا۔ دریا زوروں پر اور مجھے اس کی گہرائی کا بالکل علم نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دور جاکر منجدھار میں پھنس گیا۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ کوئی اختیار نہ چلا۔ آخرکار بیدم ہوکر خود کو موجوں کے حوالہ کردیا۔ دریا کی رَو بہانے لگی۔ بیہوش تو ہو ہی چکا تھا۔ کئی گھنٹے بہتے رہنے کے بعد ایک جگہ ماہی گیروں نے مجھے بمشکل تمام پانی سے باہر نکالا قسمت میں ابھی ٹھوکریں تھیں۔ اس لئے میں موت سے ہمکنار ہونے کے قریب ہوکر بھی سخت جانی کے باعث بچ گیا۔ کئی دنوں کے بعد طاقت پھر عود کر آئی۔ اس حالت میں مجھے قرار کہاں تھا؟ میرے پائے استقلال کو ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔ آخر ہمت کرکے پھر چل کھڑا ہوا۔ بیشمار دشت و بیابان جنگل و کوہسار طے کرتا رہا۔ اور پھر خدا جانے کتنی مدت کے بعد ایک دن "یوگنڈا" کے قریب افریکہ کے پہونچ لیکن سرسبز جنگل میں چلتے چلتے تھک کر ایک بڑی جھیل کے کنارے ذرا دم لینے کو ٹھیرا۔ پانی پی کر جھاڑیوں کی اوٹ میں سستانے کے لئے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے انسانی قدموں کی آہٹ اپنے قریب ہی سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا ایک وحشی انسان شیر کی کھال جسم پر لپیٹے ہوئے شترمرغ کے انڈے کے خول میں جھیل سے پانی بھر رہا ہے میں اس کو مطلق پہچان نہ سکا۔ لیکن دلی جذبہ اور ایک غیبی کشش نے مجھے اس کا تعاقب کرنے کے لئے مجبور کرنا شروع کیا۔ پھر جبکہ وہ جھیل سے پانی لیکر واپس جارہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا اس کی شکل اور چال "ارم" سے بہت مشابہ تھی۔

میں دیوانہ وار اٹھا۔ اور اوس کا راستہ روک کر بے اختیار چلا یا۔

"ارم" !۔۔۔۔۔ "ارم" !۔۔۔۔۔

اس نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بھاگنا چاہا تھا لیکن از خود رفتہ ہو کر کہا:۔

"بابا" !!۔۔۔۔۔

یہ سنتے ہی میں دوڑ کر ارم سے چمٹ گیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "ارم" کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا ایک سیلاب رواں تھا جب ذرا سکون ہوا تو میں نے کہا:۔

"بیٹا ارم" !! یہ تمہاری کیا حالت ہے ؟ ؟ خدا کیلئے اپنے حال پر رحم کرو !!

"بابا" !! اب تمہیں میری حالت پر افسوس کئے بغیر وطن کو واپس چلے جانا چاہئے۔ کیونکہ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آسکتا"۔ ارم" نے نہایت متانت کے ساتھ آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں اس حالت میں بہت خوش ہوں۔

سنو تو سہی' بیٹا !! تمہارے بغیر میرا وطن میں اور ہے کون؟ جس کیلئے میں واپس چلا جاؤں میں نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ اگر تم وطن میں واپس نہیں جانا چاہتے تو خدا را جس حال میں تم رہتے ہو مجھے بھی اپنے ساتھ ہی رہنے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری آزادی میں مخل نہیں ہونگا۔

یوں نہیں ہوسکتا بابا! ہاں !! زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک میں آپ کو ساتھ رکھ سکتا ہوں اس کے بعد نہیں۔ اور بالکل نہیں۔ "ارم" نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ کہ اگر آپ نے زیادہ مجبور کیا تو میں خود کشی کرلوں گا۔ تاکہ آپ اطمینان سے وطن کو واپس جائیں۔ ارم نے فیصلہ کن الفاظ میں ہاتھوں کو جھٹک کر کہا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

"جان بابا" !۔۔۔۔ آخر اس کی وجہ ؟ ؟ میں نے پیار کے انداز میں پوچھا۔ تمہیں اس میں کیا تکلیف ہے بتاؤ تو سہی۔

اس کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن میں نہیں بتا سکتا" بابا" !! بہتر ہے کہ آپ مجھے حد سے زیادہ اصرار کرکے تنگ نہ کریں۔" ارم" نے بچپن کی سی کج روی سے جواب دیا۔ مجھے کچھ بھی تکلیف نہیں۔ لیکن میں آپ سے

پسند نہیں کرتا۔ کہ ہمیشہ آپ میرے ساتھ رہیں۔ اب میرے لئے خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ "ارم" نے پانی سے بھرا ہوا انڈے کا خول اٹھالیا اور کہا۔

اچھا۔ پھر چلو بابا! اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ ایک مہینہ رہ سکتے ہیں یہ سن کر میں چپ چاپ ارم کے ساتھ ہولیا۔ ہم بہت سی گھنی جھاڑیوں اور بڑے بڑے درختوں کی آپس میں الجھے ہوئے جھنڈ کے درمیان پرپیچ راستوں سے گزر کر ایک بہت ہی گنجان اور گھنے جنگل میں پہنچے۔ وہاں جنگلی درختوں اور بیلوں سے مخلوط ایک قدرتی جھونپڑی سی بنی ہوئی تھی۔ ارم نے پانی وہاں رکھ دیا اور جلدی واپس آنیکا وعدہ کرکے خود باہر نکلا۔ لیکن مجھے اطمینان نہ ہوا۔ اس لئے میں اس کے ساتھ ہی گیا۔ "ارم" درختوں کی گھنی شاخوں میں گھسا اور چشم زدن میں کیلا سنترے۔ اور بہت سے جنگلی پھل کھال کے دامن میں بھر لایا۔ پھر ہم اس قدرتی جھونپڑی میں چلے گئے۔ جنگلی پھل شکار اور جھیل سے پانی لے آنا "ارم" کا روزانہ معمول تھا۔ "ارم" اکثر بہت خاموش کسی گہرے خیالات میں پہروں غرق رہتا اور ہمیشہ مجھے وطن میں واپس چلے جانیکی تاکید کیا کرتا تھا۔ اب اس کے چہرے پر بچپنی کی معصومیت نہیں تھی۔ بلکہ اس کا رخ وسفید رنگ حبشیوں کی طرح بالکل سیاہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں سے ایک خاص قسم کی وحشت برسا کرتی۔ پچکے ہوئے گالوں پر گھنی داڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے مضبوط ہڈیوں کے لاغر جسم پر جانوروں کی کھالیں لپیٹے رہتا تھا۔ مجھے اس کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوتا اور میں اسے بہلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے فائدہ۔ آخر کار مجھے "ارم" کے ساتھ رہتے رہتے ایک مہینہ ختم ہوگیا۔ ایک دن دوپہر کے وقت ارم نے کہا۔

"بابا"! اب آپ کا وعدہ پورا ہو چکا بہتر ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور وطن کی طرف چلے جائیں۔

میں نے دنیا کے نشیب وفراز سمجھانے کی لاکھ کوشش کی۔ لیکن "ارم" نے کسی بات پر بھی کان نہ دھرا۔ اور وہ اپنے وحشی پن پر ہٹ دھرمی سے قایم رہا۔ اس طرح رات ہوگئی۔ "ارم" نے پھر کہا۔

"بابا"! اگر آپ مجھے میرے حال پر چھوڑنا نہیں چاہتے تو میں خودکشی کرلوں گا۔

"بیٹا"! خودکشی تو بزدلوں کا کام ہے میں نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا یہ کوئی بہادری نہیں۔

میں بزدل نہیں ہوں بابا! لیکن مجبور ہوں۔ کیوں کہ اس میں مصلحت ہے۔ ارم مجھے سنجیدگی کے ساتھ جواب دے کر خاموش ہوگیا رات نصف سے زیادہ اپنی منزل طے کر چکی تھی۔ فضائے عالم پر ایک ہولناک سکون طاری تھا۔

آسمان پر ابر کی وجہ سے جنگل کی تاریکی اور بھی ہیبت ناک ہوگئی تھی۔ ارم مجھ سے دو قدم کے فاصلہ پر سرنگوں اور بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ لیکن میرے حواس اس کی نقل وحرکت کی طرف ہمہ تن متوجہ تھے یہاں پر بوڑھے طملم نے پھر ایک لمبی اور پرسوز آہ بھری اور ذرا دیر خاموش رہ کر پھر کہنے لگا۔

یکایک "ارم" اپنی جگہ سے اٹھا اور زور سے چلایا۔

"بابا" !!! اگر اب بھی آپ نے میرا تعاقب جاری رکھا تو جہاں کہیں بھی اور جب کبھی مجھے دیکھو گے میں خودکشی کرکے اپنے اس آخری قول کو پورا کردوں گا۔ یہ کہتے ہوئے بغیر جواب کا انتظار کئے "ارم" جھونپڑی سے باہر نکلا اور گھنے جنگل میں روپوش ہوگیا۔ لیکن ارم کی بلند آواز خاموشی کے طلسم کو توڑ کر فضا کو چیرتی ہوئی دور تک نکل گئی۔ میں بھی ارم کے ساتھ ہی جھپٹ کر باہر نکلا۔ مگر وہ خدا جانے کس طرف کو غائب ہوچکا تھا۔ میں تمام رات گنجان جنگل میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ مگر بے سود۔ پھر میں نے افریقہ کے لق ودق صحراؤں کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن ارم کے آخری الفاظ یعنی اس کی خودکشی کی دھمکی اکثر میرے لئے پابہ زنجیر ثابت ہوتی رہی۔ ایک دن انہیں خیالات میں غلطاں وپیچاں امید وبیم کی حالت میں خاموشی سے چلا جارہا تھا۔ میں نے برگد کے سایہ میں ایک پاکیزہ صورت بزرگ کو دیکھا۔ جو تسبیح کے دانوں کو آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے گرا رہا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اور اس کی روحانی قوت نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور مجھے اپنے دل میں ایک خاص قسم کا اطمینان سا محسوس ہوا۔ میں خاموش اس کے پشت کی طرف کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد پھر اس نے سر اٹھایا اور بہت بے تکلفی سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

طملم !! ــــ مجھے تمہارے حال سے بہت ہمدردی ہے لیکن "ارم" کی تلاش میں اب خواہ مخواہ جگہ جگہ کی خاک نہ چھانو وہ تمہاری نامکمل تربیت اور بے اعتدالیوں کے باعث آوارگی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے اب اس کے ساتھ تمہاری امیدیں فضول ہیں یہاں سے صرف چند فرسنگ کے فاصلہ پر "ارم" موجود ہے۔ لیکن میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اب تم اسے دیکھنے کی جد وجہد نہ کرنا۔ ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ جاؤ ــــ سیدھے وطن کی طرف چلے جاؤ۔ ــــ اور "ارم" کو بھول جانے کی کوشش کرنا۔ ــــ

میرے مشفق بابا !! "ارم" کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں نے اس کے لئے سب کچھ لٹادیا اور پھر

اس کی تلاش میں اک عالم بھر کی گشت لگائی۔ اب اس کو بھول جاؤں — آہ — یہ نا ممکن ہے — میں نے بہت ہی عاجزی سے التجا کی کہ میں اس غربت میں وطن سے زیادہ مطمئن ہوں۔

"ارم" کی بجائے اس کو یاد کرو جس نے مجھے، تمہیں، ارم اور سارے جہان کو بنایا بس اسی کی تعریف کیا کرو۔ طلسم! یاتم اس وقت تک اپنے مقصود کو نہیں پا سکتے جب تک قادر مطلق کو منظور نہ ہو۔ وطن میں جاؤ۔ تم نے کسی کی حق تلفی کی ہے اس کی تلافی کرو۔ اس نیک انسان نے مجھے لکڑی کے دانوں کی ایک تسبیح دیتے ہوئے کہا۔

یہ فقیرانہ تحفہ لو — اور جاؤ — خدا حافظ!!

میں نے سر جھکا کر تسبیح لے لی اور ایک رسمی شکریہ ادا کرکے ایک طرف کو چل دیا۔ کچھ دنوں بعد میں نے "ارم" کی جستجو چھوڑ دی اور وطن کا رخ کیا ایک طویل مدت کے بعد وطن پہنچا۔ لیکن دل بیقرار اور طبیعت کو سکون نصیب نہ ہوا میں نے اپنی تمام ملک ارم کے نام۔ اور باقی ساری دولت سب بیویوں میں تقسیم کر دی اور خود پھر وطن کو خیر باد کہکر نکل کھڑا ہوا۔ بہت دنوں تک بغیر کسی مقصد کے ادھر ادھر آوارہ گرد پھرنے کے بعد اس کٹیا میں جسے تم اب بھی دیکھ رہے ہو۔ مجھے کسی قدر آرام نصیب ہوا۔ یہاں پہنچکر بوڑھے طلسم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے گلوگیر اور بہت غمگین آواز میں کہا۔

یوں تو اب میں اپنی زندگی پر مطمئن ہوگیا ہوں۔ لیکن آہ — "ارم" کا خیال نہ بھول سکا۔ وہ اب بھی میرے ہر سانس میں موجود ہے۔

یہ فقرہ ختم کیے بوڑھے طلسم نے یاس آمیز طریق پر اپنا سر جھکا لیا۔

خدا انہیں "ارم" سے ملادے۔ راشد نے ہمدردی کے طور پر آہ بھری۔ اور سر ہلا کر کہا یہ قدرت کی بے نیازیاں ہیں۔

بوڑھے طلسم نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک لمبی اور گہری سانس لیکر بالکل خاموش ہوگیا دنیا پر مکمل سکوت طاری تھا۔ اور فضا میں غضب کا سناٹا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی دو بج چکے تھے۔ کھڑکی بند کرکے بستر پر لیٹ گیا لیکن "طلسم بابا" کی المناک اور حیرت خیز داستان کے افسوس ناک تصور نے مجھے لمحہ بھر کے لئے بھی سونے نہ دیا۔

تحقیق سن فصلی

(مولانا عبد الواسع صاحب مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

(بسلسلۂ گذشتہ)

۲- آفتاب کبھی خط استوار پر اور کبھی خط استواء سے بجانب شمال اور کبھی خط استواء سے جنوب کی طرف رہتا ہے انہیں دونوں باتوں پر موسموں کے تغیر کا مدار ہے۔ آفتاب کے اعتدال ربیعی سے انقلاب صیفی تک ¼ دائرۃ البروج کے قطع کرنے کا زمانہ ممالک شمالی میں موسم بہار اور ممالک جنوبی میں موسم خزاں ہے اور انقلاب صیفی سے اعتدال خریفی تک ¼ دائرہ کے قطع کرنے کی مدت ممالک شمالی میں موسم گرما اور ممالک جنوبی میں فصل سرما ہے اور اعتدال خریفی سے انقلاب شتوی تک ¼ دائرہ طے کرنے کے ایام اقالیم شمالی میں فصل خزاں اور اقالیم جنوبی میں فصل بہار ہیں اور انقلاب شتوی سے اعتدال ربیعی تک ¼ دائرہ پر سیر کرنے کی مدت ولایات شمالی میں جاڑوں کا زمانہ اور ولایات جنوبی میں گرمیوں کا زمانہ ہے اور چونکہ جب ممالک شمالی میں موسم گرما ہوتا ہے تو آفتاب ذنب شمسی کے قریب ہوتا ہے اور زمین سے بعید اور جب ممالک جنوبی میں فصل گرما ہوتی ہے تو آفتاب راس شمسی کے قریب اور زمین سے نزدیک ہوتا ہے اس لئے ممالک جنوبی میں گرمی ممالک شمالی سے ¼ زیادہ ہوتی ہے۔ نیز جب ممالک شمالی میں جاڑوں کا زمانہ ہوتا ہے تو آفتاب اس کے قریب اور جب ممالک جنوبی میں سرما کا موسم ہوتا ہے تو آفتاب ذنب کے نزدیک ہوتا ہے اس لئے ممالک شمالی میں سردی ممالک جنوبی سے ¼ کم ہوتی ہے۔ آفتاب ۲۱ مارچ مطابق ۱۷ اردی بہشت کو اعتدال ربیعی پر پہنچتا ہے اور اسی تاریخ سے ممالک شمالی میں موسم ربیع اور ممالک جنوبی میں فصل خریف شروع ہوتی ہے پھر تقریباً تین ماہ کے بعد ۲۲ جون مطابق ۱۷ امرداد کو انقلاب صیفی پر پہنچتا ہے اور اس تاریخ سے ممالک شمالی میں بہار ختم ہو کر گرمیوں کا اور ممالک جنوبی میں خزاں ختم ہو کر جاڑوں کا آغاز ہوتا ہے پھر اس کے دسویں دن یکم جولائی مطابق ۲۶ امرداد کو آفتاب نقطہ ذنب شمسی پر آتا ہے اور زمین و آفتاب میں زیادہ سے زیادہ دوری ہوتی ہے پھر انقلاب صیفی پر پہنچنے کے تقریباً تین مہینے بعد ۲۳ ستمبر مطابق ۱۰ آبان کو آفتاب اعتدال خریفی پر پہنچتا ہے اور اس وقت سے

ممالک شمالی میں گرمیاں ختم ہو کر فصل خزاں اور ممالک جنوبی میں جاڑے ختم ہو کر فصل بہار شروع ہوتی ہے پھر اس کے تین مہینہ بعد ۲۲ دسمبر مطابق ۱۹ بہمن کو آفتاب انقلاب شتوی پر پہنچتا ہے اور ممالک شمالی میں خزاں ختم ہو کر جاڑوں کا اور ممالک جنوبی میں بہار ختم ہو کر گرمیوں کا آغاز ہوتا ہے اس کے گیارھویں دن یکم جنوری مطابق ۲۹ بہمن کو آفتاب راس شمستی ہوتا ہے پھر ۲۱ مارچ مطابق ۱۷ اردی بہشت کو آفتاب اعتدال ربیعی پر واپس آجاتا ہے اور ممالک شمالی میں موسم سرما اور ممالک جنوبی میں فصل گرما ختم ہو جاتی ہے اور دوبارہ بہار و خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔

اختلاف زمانہ فصول | اگر زمین کا مدار دائرہ تامہ ہوتا اور آفتاب اس کے مرکز پر ہوتا تو مرکز آفتاب و مرکز زمین کا فاصلہ ہمیشہ یکساں رہتا۔ اور آفتاب کی کشش کا اثر زمین پر ہر زمانہ میں یکساں پڑتا جس کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا کہ زمین اپنے مدار کے ہر ربع حصہ کو برابر مدت میں طے کرتی اور چاروں فصلوں کا زمانہ باہم مساوی ہوتا۔ مگر زمین کا مدار بیضوی ہے اور آفتاب اس کے ایک فوکس پر ہے اور زمین و آفتاب کے مرکزوں کا درمیانی فاصلہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے اور قانون کشش یہ ہے کہ فاصلوں کے مربعوں کے بالعکس اثر کشش میں تغیر ہوتا ہے اس لئے زمین آفتاب سے جس قدر قریب ہوتی جاتی ہے آفتاب کا اثر کشش زیادہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور جتنی وہ آفتاب سے دور ہوتی جاتی ہے اثر کشش کم ہوتا جاتا ہے اور اس کی چال سست ہوتی جاتی ہے یعنی جب زمین نقطہ ذنب سے نقطہ راس کی طرف رواں ہوتی ہے تو اس کی رفتار میں دمبدم تیزی بڑھتی جاتی ہے حتّٰی کہ نقطہ راس پر پہنچ کر اس کی رفتار میں انتہائی تیزی ہوتی ہے اور جب وہ نقطہ راس سے نقطہ ذنب کی طرف چلتی ہے تو اس کی رفتار میں لحظہ بہ لحظہ سستی آتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ نقطہ ذنب پر پہنچ کر زائد سے زائد سست رو ہوتی ہے لیکن اس کے نقطہ ذنب سے نقطہ راس تک آنے کا زمانہ اور نقطہ راس سے نقطہ ذنب تک جانے کی مدت دونوں برابر ہوتے ہیں اور اگر ان دونوں قوسوں میں دو نقطے بعد اوسط کے فرض کر لئے جائیں تو ان دونوں نقطوں سے یہ دونوں قوسیں دو دو برابر برابر حصوں میں تقسیم ہو جائینگی اور مدار زمین کے چار برابر حصے ہو جائیں گے۔ (۱) نقطہ راس سے بعد اوسط تک۔ (۲) بعد اوسط سے نقطہ ذنب تک۔ (۳) نقطہ ذنب سے دوسرے بعد اوسط تک (۴) دوسرے بعد اوسط سے

نقطہ راس تک اور ظاہر ہے کہ زمین پہلے حصہ میں آفتاب سے قریب ہونے کی وجہ سے تیز رو ہوگی اور اس کو کم مدت میں قطع کریگی اور دوسرے حصے میں آفتاب سے بعید ہونے کے باعث سست رفتار اور اس کو زیادہ زمانہ میں قطع کریگی اسی طرح تیسرے حصہ کو زیادہ زمانہ میں اور چوتھے حصہ کو کم زمانہ میں طے کریگی بلیکن پہلے اور چوتھے حصوں میں زمین اور آفتاب کے درمیانی فاصلے یکساں رہیں گے لہذا ان دونوں حصوں کے طے کرنے کے زمانے باہم برابر ہونگے۔ اور بقیہ دو حصوں کے طے کرنے کے زمانوں سے کم۔ نیز اسی وجہ سے دوسرے اور تیسرے حصوں کے قطع کرنے کے زمانے باہم برابر ہوں گے اور پہلے دونوں حصوں کے قطع کرنے کے زمانوں سے زائد۔ اس لئے اگر انقلاب صیفی نقطہ راس پر اور انقلاب شتوی نقطہ ذنب پر اور دونوں اعتدال دونوں بعد اوسط پر منطبق ہوتے یعنی نقطۂ راس کا طول ۹۰ ہوتا تو موسم بہار اور فصل گرما کے ایام باہم برابر ہوتے اور یہ دونوں موسم خزاں و سرما سے بڑے ہوتے اور فصل خزاں و موسم سرما کے دن باہم برابر ہوتے اور یہ دونوں فصلیں بہار اور گرمیوں سے چھوٹی ہوتیں۔ لیکن نقطہ راس کا طول سماوی تقریباً ۱۰۰ ہے اس سبب سے آفتاب انقلاب شتوی سے چل کر گیارہویں دن رأس شمسی پر پہنچتا ہے لہذا جب آفتاب دائرۃ البروج کے حصہ سرمائی میں ہوتا ہے تو زمین اس سے قریب ہوتی ہے اور جب خریفی حصہ میں ہوتا ہے تو زمین اس سے بہ نسبت حصہ سرمائی بعید ہوتی ہے اور جس زمانہ میں وہ حصہ ربیعی میں ہوتا ہے تو زمین اس سے بہ نسبت حصہ خریفی کے اور دور ہوتی ہے اور جب حصہ گرمائی میں ہوتا ہے تو زمین اس سے بعید تر ہوتی ہے اس لئے جاڑوں کا زمانہ تمام فصلوں سے چھوٹا اور گرمیوں کا موسم تمام موسموں سے بڑا اور فصل خریف جاڑوں سے بڑی اور ربیع سے چھوٹی اور موسم بہار خزاں سے بڑا اور گرمیوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ ان چاروں فصلوں کے دنوں کا شمار بیسویں صدی عیسوی میں حسب ذیل ہے:-

موسم گرما - ۹۳٫۶ دن تقریباً — فصل ربیع - ۹۲٫۹ دن تقریباً

فصل خریف - ۸۹٫۷ دن تقریباً — موسم سرما - ۸۹٫۰ دن تقریباً

سنہ اور اس کا مبدأ | واقعات اور حالات کے مسلسل منضبط کرنے کے لئے برسوں کا سلسلہ وار نظام قائم کیا جاتا ہے جس کی ابتدا کسی عظیم الشان واقعہ سے ہوتی ہے اس سلسلہ وار نظام کو نظام سنوی یا سنہ کہتے ہیں اور وہ عظیم الشان واقعہ سنہ کا مبدا کہلاتا ہے۔ سینکڑوں نظام سنوی دنیا میں قائم ہوئے اور معدوم ہوگئے۔

مگران میں سے بعض ابتک رائج ہیں سنہ موسوی کا مبدا حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے تاریخ ولادت ہے۔ سنہ عیسوی کی ابتدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تاریخ پیدائش سے ہے۔ سنہ ہجری کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ہجرت سے ہے۔ سنہ رومی سمبت سنہ یزدجردی اسکندر فیلقوس و ملک روائے روم بکرماجیت مہاراجہ ہند یزدجبرد شاہ ایران کے جلوسوں کی تاریخوں سے شروع ہوتے ہیں۔ ساسانیوں میں تو سنہ جلوس رواج ہوگیا تھا کہ ہر فرماں روا اپنی اورنگ نشینی سے ایک نئے سنہ کی بنا ڈالتا تھا اسی کا یہ اثر تھا کہ اسلام تا ایں ایران وتوران وہندوستان نے بھی اپنے اپنے سنہ جلوس رائج کئے ان میں سے چند سنوں کے سوا تمام سنوں کے عمر ان کے رائج کرنیوالوں کے زمانہ اورنگ آرائی سے زاید نہ ہوسکی۔

سنہ کے اقسام | نظام سنوی کے تین قسمیں ہیں سنہ شمسی۔ سنہ قمری۔ سنہ شمسی قمری۔

۱۔ سنہ شمسی وہ نظام سنوی ہے جو شمسی سالوں سے مرکب ہو جیسے سنہ عیسوی سنہ رومی سنہ یزدجردی۔

۲۔ سنہ قمری وہ نظام سنوی ہے جو قمری سالوں سے مرکب مرکب ہو بارہ دورہ قمر کا ایک سال قمری ہوتا ہے جیسے سنہ ہجری۔

۳۔ سنہ قمری شمسی وہ نظام سنوی ہے جو قمری سالوں سے مرکب ہو مگر چند سالوں میں اس پر ایک یا چند مہینوں کا کبیسہ کرکے سال شمسی کے مطابق کرلیا جایا کرے جیسے سمبت بکرمی۔

سال شمسی کا روز نو | یہ بات بیان ہوچکی ہے کہ دائرۃ البروج میں چھ نقطے معین ہیں۔ (۱) اعتدال ربیعی۔ (۲) اعتدال خریفی (۳) انقلاب صیفی (۴) انقلاب سنوی (۵) راس شمسی (۶) ذنب شمسی جب آفتاب اپنی ظاہری حرکت سے ان میں سے کسی نقطہ پر پہنچتا ہے تو سال شمسی کا آغاز ہوتا ہے اور وہ دن سال شمسی کا روز نو قرار دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر سنہ شمسی کی ابتدا ایک ہی روز سے نہیں ہوتی بلکہ مختلف سنین کے ابتداء کے ایام مختلف ہوتے ہیں چنانچہ سال سنہ عیسوی کی ابتدا یکم جنوری سے ہوتی ہے جب آفتاب راس شمسی پر پہنچتا ہے اور سنہ محمدی کی ابتدا یکم حمل سے ہوتی ہے جب آفتاب اعتدال ربیعی پر آتا ہے۔ کیانی اور ساسانی حکمرانوں کے یہاں نوروز جب آفتاب اعتدال ربیعی پر پہنچتا ہے نہایت بڑا دن خیال کیا جاتا تھا اس روز وہ بڑا جشن کرتے تھے اس لئے جمشید نے سال جمشیدی کی ابتدا اس روز یعنی یکم فروری سے قرار دی۔ جمشید کے بعد یہ عام دستور ہوگیا۔ (باقی دارد)

اردو کی بہترین کتابیں

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ مصنفہ ڈاکٹر سید غلام محی الدین صاحب زور۔ جس میں عہد عثمانی کے ادن انشاء پردازوں کا تذکرہ ہے جنھوں جو اردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ لکھوائی چھپوائی اعلی قیمت عہ

اردو میں ڈراما نگاری۔ مصنفہ سید بادشاہ حسین صاحب۔ مدت سے اردو میں اس کمی کو محسوس کیا جارہا تھا جس کی تکمیل آج منظر عام پر جلوہ افروز ہے سینما اور ناٹک کمپنیوں اور ڈراما نگاری کا ذوق رکھنے والوں کیلئے مفید ہے۔ قیمت (عاں)

تذکرۂ جمیل۔ باتصویر مصنفہ محمد عبد الرزاق صاحب بسمل جس میں عہد حاضرہ کے تمام انشاء پرداز خواتین کے حالات مع تصاویر نظم اور نثر کا پاکیزہ مجموعہ ہے۔ قیمت (عاں)

طفل اشک۔ مصنفہ محمد محسن صاحب بی۔ اے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک بے یار و مددگار عورت کیونکر اپنے لڑکوں کو مستقبل میں شاندار خدمت کے اہل بناتی ہے اور کس طرح جہد للحیات میں کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ لڑکیوں اور خواتین کے پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت سے

محصول ڈاک ذمہ خریدار۔ دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد دکن

شہاب

جلد (۳) امرداد سنہ ۱۳۴۴ف م جون سنہ ۱۹۳۵ء نمبر ۵

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (للعہ)

گورنمنٹ سے (عہ)

(برقی پریس میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد شائع ہوا)

ذرات

(براہ کرم ان امور کو نوٹ فرمالیں پھر آپ کو ہم سے کبھی شکایت پیدا نہ ہوگی)

۱- شہاب ہمیشہ نہایت پابندی کیساتھ ہر مہینہ کی ۵ کو شائع ہوتا ہے۔ ۱۰ تاریخ تک تمام خریداروں کی خدمت میں پہنچ جاتا ہے اس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی اگر ڈاک خانہ کی غلطی سے وقت پر پرچہ نہ ملے تو ۱۰ کے بعد ۲۰ تک پرچہ مکرر طلب کرلیں ورنہ اس کے بعد قیمتاً ملیگا۔

۲- ایک مقام سے دوسرے مقام تبادلہ ہو تو فوراً دفتر کو اطلاع دیجئے کئی ماہ بعد تبدیل پتہ کی اطلاع دینا دفتر کو سخت نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ صحیح پتہ نہ ہونے کی وجہ سے پرچہ تلف ہوجاتا ہے اور آپ کو شکایت کا موقع ملتا ہے اور یہ عذر ہوتا ہے کہ پرچہ نہیں بھیجا گیا۔ حالانکہ پرچہ کی اشاعت کا مقصد ہی یہی ہے کہ آپ کی نظر سے گذرے۔

۳- براہ کرم اپنے ملازمین کو سخت تاکید فرمادیجئے کہ آپ کی عدم موجودگی میں پرچہ آئے تو نہایت حفاظت سے آپ کو پہنچادیں۔ کیونکہ ملازمین کی غفلت بھی پرچہ کیلئے نقصان رساں ثابت ہوئی ہے۔

۴- خریداروں کو چندہ کی میعاد یا اختتام سال کی اطلاع ایک مہینہ پہلے دیدی جاتی ہے اگر آئندہ خریداری منظور نہ ہو تو دفتر کو مطلع فرمادیں اور پرچہ بدستور جاری رکھنا ہو تو چندہ منی آرڈر کے ذریعہ ارسال کردیں یا چندہ نہ آنیکی صورت میں وی۔پی بھیجا جاتا ہے۔ وی۔پی واپس کرکے شہاب کو شدید نقصان پہنچانا تعلیم یافتہ حضرات کے لئے موزوں نہیں۔

۵- دریافت طلب امور کیلئے ٹکٹ آنا چاہئے خط بھیجنے سے پہلے اندازہ کرلیجئے کہ کس قدر ٹکٹ لگنے ہونگے کیونکہ بیرنگ خط عموماً واپس کردئے جاتے ہیں۔

۶- مضامین ہر مہینہ کی پانچ تاریخ تک دفتر میں وصول ہونا چاہئے بعض حضرات مضامین ایسے تنگ وقت میں بھیجتے ہیں کہ مجبوراً آئندہ مہینہ اون کی اشاعت ہوتی ہے۔

براہ کرم مضامین صاف اور واضح خط میں لکھیں بعض مضامین کے پڑھنے کیلئے موسیٰ کی تلاش ہوتی ہے اور پھر غلطیوں کا بہت کچھ امکان رہجاتا ہے۔

یورپ کی دلچسپ ڈاک

(جناب نواب شہید یار جنگ بہادر)

۲ محرم روز شنبہ پیالس ہوٹل۔ مانترو۔ سوئیٹزرلینڈ

شہید نواز! سلام مسنون الاسلام۔ فرمائیے اب تک کئے خط وصول ہوئے۔ غالبًا اب تو آپ کو شکایت نہ ہوگی کہ شہید خط بھی نہیں لکھا۔ بھائی صاحب یہاں روز آنہ نیا دانہ نیا پانی ہے۔ اب ہم ارو زا سے نکل کر مانترو میں آچکے ہیں مگر خیر اب سلسلہ وار سنئے! باب سوم میں وینس کا حال ختم ہو چکا تھا اور داستان ویانا پہنچ کر ختم ہوگئی تھی اچھا تو پھر یہ یوں بیان کرتے ہیں راویان خوش بیان کہ ویانا جنگ کے قبل سلطنت اسٹریا کا پایہ تخت تھا اور لندن کے بعد دوسرا شہر شمار کیا جاتا تھا۔ سے

بہ یک گردش چرخ نیلوفری نہ نادر بجا ماند نے نادری

اب نہ وہ شہنشاہی ہے نہ وہ سلطنت حصے بخرے ہوگئے۔ ہنگری خود مختار زیکوسلوویکا برسر اقتدار۔ اصل پایہ تخت اور اطراف کا حصہ رہگیا ہے گویا ویانا ہی اب ایک ملک شمار کیا جا سکتا ہے۔ شہر زبان حال سے اپنی داستان عبرت سنا رہا ہے۔ مکانات نہایت عالیشان۔ راستے نہایت کشادہ۔ بازار نہایت وسیع۔ شاہی محلات دیکھنے کے قابل ہیں اور اون شاہی آرام گاہوں میں جہاں بڑی بڑی ہستیوں کو بار نہ تھا اب ہر کس و ناکس شلنگ دو شلنگ دیکر تھوڑی سی دیر کیلئے اپنی تفریح گاہ بنا سکتا ہے۔ شاہان سابق کے حجرے اون کے خوابگاہیں اوسی طرح آراستہ ہیں البتہ جواہرات وغیرہ قیمتی اشیاء موجود نہیں ہیں۔ محل ہی کے ایک بازو کا ایک حصہ شاہی عجائب خانہ کا کام دے رہا ہے سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام کی ہڈیوں کی خوب افراط ہے۔ نہایت پرتکلف شیشے کے گھروں میں جواہرات سے مزین صندوقچوں میں یا حضرت مسیح کی ہڈیاں نظر آئینگے یا خاص صلیب کی لکڑی کا ٹکڑا اور ہر ایک کے ساتھ ایک تصدیقی سند موجود ہے۔ یہاں کتب خانہ میں فارسی اور عربی کے قدیم نسخے بھی بہت سے ملتے ہیں۔ ہمارے دانا رصاحب نے کہا تھا کہ عمر خیام کا ایک نسخہ ویانا لائبریری میں ہے آپ اوس کی تو ٹولادیں میں نے اوس کا فوٹو تیار کرالیا ہے نسخہ اچھا خوش خط نہیں ہے مگر ہے قدیم یہاں خط کوفی کے بعض

نسخے بھی موجود ہیں۔ روشن حروف کے قطعات کا کیا پوچھنا۔ باریک چھال پر قطعات ہیں جنہیں دو جانب آئینوں پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ یہاں ایک بہت بڑے آئینہ کے صندوق میں ایک سفید ریشمی صافہ خاص طور پر نمایاں رکھا گیا ہے جس پر جرمن زبان میں یہ کتبہ لگایا گیا ہے کہ "یہ شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کیلئے کشمیر میں تیار کیا گیا تھا" شروع حصہ پر خط نسخ میں انا فتحنا کا سورہ ہے اور تمام صافہ پر مکمل کلام مجید ہے تعجب ہوتا ہے کہ کجا ہندوستان کجا ویانا یہ آخر یہاں کیسے پہنچ گیا۔ ویانا موسیقی کیلئے مشہور ہے یہاں کا اوپرا دیکھنے کے قابل ہے۔ سردی کی وہ شدت ہے کہ الہی تیری پناہ! تقریباً دو ہفتہ یہاں گرانڈ ہوٹل میں قیام رہا۔ ہوٹل کا نعمت خانہ یعنی ڈائننگ روم ایسا عالیشان ہے کہ کسی بڑے سے بڑے محل میں بھی نہ ہوگا۔ غرض وقت واحد میں چار سو آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ تقریباً روزانہ برف باری کا سلسلہ جاری تھا بعض وقت تو تمام تمام دن برف کے جالے روئی کے گالوں کی مثل برستے رہتے تھے سڑکوں پر برف جم جاتی تھی جو روزانہ صاف کی جاتی تھی۔ بتی اٹک اور ہیٹنگ اطراف میں جاری تھے۔ سلطنت جانے سے ویانا کے باشندے مفلس ہو گئے ہیں اور افلاس کا اثر یورپ سب سے بڑھکر اسی شہر پر نمایاں ہے۔ روزانہ شام کے ۵ بجے سے رات کے نو بجے تک پیدل راستوں پر راستہ چلنا مشکل ہے بقول شخصے کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ حسن رہگذر جس قدر میں نے ویانا میں عام دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔ حسن کی جس قدر بے قدری ویانا میں دیکھی روئے زمین پر نظر نہ آئیگی۔ شمع کی لو خود پروانہ کی جانب جھک جاتی ہے مگر پروانہ بے خبر رہتا ہے۔ عورتوں کی کثرت افلاس کی شدت۔ حیا اور عصمت شاید کہیں اور ہو تو ہو۔ ویانا میں تو اس کا وجود نہیں۔ ہر عورت شام ہوتے ہی اپنے روزگار کی تلاش میں نکل جاتی ہے قیمت کا سوال ہی نہیں ہے آپ کا جی چاہے ساتھ لیجائیے شام کا کھانا کسی ہوٹل میں ساتھ کھلا دیجئے۔ جب تک جی میں آئے تفریح کیجئے چلتے ہوئے جو آپ کے جی میں آئے دے دیجئے کہئے آپ کے خیال میں ان داموں مہنگی تو نہیں ہوگی۔ او عورتوں کی آزادی کا ترانہ گانیوالے انسان باہر نکل اور عورتوں کی آزادی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ۔ ہندوستان کی ذلیل سے ذلیل طبقہ کی عورت بھی شاہ راہ عام پر غیروں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتی ہے۔ اور تہذیب یافتہ یورپ میں ان جہاں سوز مناظر کا مشاہدہ کر اور اگر تیرے پہلو میں واقعی دل ہے اور دل میں احساس ہو تو پھر کبھی آزادی نسواں کی خواہش نہ کر۔

افلاس کا یہ حال ہے کہ گو اسباب عیش کی کمی نہیں بے روزگاری اور فاقہ کشی کی داستانوں کے ساتھ ساتھ

سینما وآپرا ہوس، نیٹ کلب کی رونق میں کمی نظر نہیں آتی۔ ساری ایجادی توتیں نیٹ کلب کی زینتوں پر صرف کی جاتی ہیں۔ ایک نیٹ کلب ہے جس کا نام چڑیا کا گھونسلا ہے (Bird's Nest) ہر ایسے مقام پر جوڑوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مقام بنے ہوئے ہیں یہاں یہ جدت کیگئی ہے کہ ہر جوڑے کیلئے ایک گھونسلا بنا دیا گیا ہے درخت بنے ہوئے ہیں جن پر یہ گھونسلے ہیں لکڑی کی سیڑھی بنی ہوئی ہے جس پر چڑھکر ان گھونسلوں میں داخل ہوجایئے آگے کا حال چڑیا چڑا ہی جان سکتے ہیں۔ ایک جوڑے کو دوسرے کی خبر نہیں نیچے اسٹیج پر بیانڈ سامعہ نواز ہے اور کچھ چڑیوں کے جوڑے پھدک رہے ہیں آپ کا جی چاہے آپ بھی اپنے جوڑے کے ساتھ جاکر پھدکیئے یا کسی دوسری چڑیا پر بھی اپنے پر پھیلا لیجئے۔ اور پھر اپنے گھونسلہ میں داخل ہو جایئے صیاد بندہ بے دام ہے آپ چاہیں تو آپ کیلئے دانہ پانی آپ کے گھونسلہ میں پہنچا دیا جائیگا۔ اس سے بھی بہتر ایک دوسرا نیٹ کلب ہے جس کا نام کشتی نوح (Noahs Arch) ہے یہاں بجائے گھونسلوں کے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنی ہوئی ہیں بیچ میں ایک بہت بڑی کشتی ہے جو اسٹیج کا کام دیتی ہے جس پر ایک سمت بیانڈ کی سریلی صدائیں بلند ہیں دوسری طرف شناوران محبت دریائے عشق میں لطف ہم آغوشی حاصل کر رہے ہیں آپ چاہیں اپنی کشتی سے ان مناظر سے لطف اندوز ہوں خود بھی ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیں۔ اگر بدقسمتی سے آپ مثل حضرت اسمٰعیل بے جوڑے کے واقع ہوئے ہوں تو اس کا بھی علاج ممکن ہے کہ خاص اس خیال سے ہر مقام پر پانچ چھ خوبصورت مجسمے موجود ہیں انہیں اپنی کشتی میں بلا لیجئے۔ دینا دلانا کچھ نہیں جیسا آپ کو اپنے جوڑے کی خورونوش کی سربراہی لازمی تھی اوسی طرح انہی کھلا پلا لیجئے اور پار اتر جایئے۔ غرض مسئلہ کہاں تک بیان کروں نتیجہ تو یہ ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ جب تک خود آنکھ سے نہ دیکھ لو نہ میں بیان کر سکتا ہوں نہ تم لطف اندوز ہو سکتے ہو۔ یورپ کے سارے شہروں میں میرے خیال میں ویانا سب سے اخراجات میں کم خرچ شہر ہے اور سوئٹزرلینڈ سب سے گراں ہے۔ ویانا اور برلن میں دنیا کے مشہور ترین ڈاکٹر فرد کش ہیں مگر ویانا میں بلا استثناء ہر شخص جس سے اصلاح طلب واقع ہوا ہے یا اس کا اصل سبب وہی افلاس ہو۔ ہندوستان کے دکانوں پر جو مول تول کا طریقہ ہے وہی ویانا میں بھی رائج ہے۔ لڑئے جھگڑئے چکائیے تو دس کی چیز دو میں بھی ملسکتی ہے۔ یہاں کی صنعت کاریوں میں لکڑی کا کام اور شیشے کا کام (　　　) بہترا شیو جر مے پر نقاشی مینا کاری اور شیشہ

اور چینی پر مینا کاری بہت مشہور ہیں۔
دیا تا تک اسلامی فاتحوں کا قدم پہنچ چکا ہے اور ہنگری تو ایک مدت تک سلطنت ترکی میں شریک تھا۔ ویانا میں دو ہفتہ
تک قیام رہا یہاں سے ہم آروزا روانہ ہوئے یہ سوئیٹزرلینڈ کا ایک مقام ہے۔ یہ سطح سمندر سے (۵۸۰۰) فٹ بلند ہے
چھوٹی سی بستی ہے اصلی باشندوں کے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے مکانات کچھ اسپورٹس کے سامان کی دکانیں کچھ فوٹوگرافوں
کی دکانیں دو چار کلنگ (دواخانہ جہاں مریض مقیم ہوں) اور باقی ہوٹل ہی ہوٹل ہیں یہاں صرف دو قسم کے مسافر
آتے ہیں کچھ تو وہ جو امراض سینہ کے مریض ہوں کہ یہ ان امراض کیلئے بہترین مقام ہے۔ دوسری بڑی تعداد ان
لوگوں کی ہوتی ہے جو محض شی انگ کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ "شی انگ" پیروں کے نیچے دو تختے باندھ کر برف پر سے پھسلنے
کو کہتے ہیں۔ لباس خاص قسم کا گرم ہوتا ہے ہاتھوں میں دو لکڑیاں ہوتی ہیں جن کے آخر میں ایک پہیہ ہوتا ہے اور
اس کے آخر میں ایک نوکدار کیلا ہوتا ہے ان لکڑیوں کی مدد سے جھونک سنبھالا جاتا ہے یہ گرنے میں روک تھام بھی کرتی
ہے۔ ہمارے قیام اروزا کے زمانہ میں ہم نے دیکھا کہ ہر شخص بلا استثنا اسی مرض میں مبتلا ہے صبح ہوئی کھانا سا تھ
لے لیا اور چلے پہاڑوں پر اور وہاں جا کر تمام دن شی انگ کی چار پانچ بجے واپس ہو گئے۔ دھوپ انتہا درجہ
سخت ہوتی ہے رنگ جل کر مثل ہندوستان کے سیاہ ہو جاتے ہیں مگر یہ اللہ کے بندے اس فرض کی ادائی
میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ گرتے ہیں۔ مرتے ہیں۔ ہاتھ پیر سے ہاتھ دھوتے ہیں مگر باز نہیں آتے۔ دھوپ اگر
نکلے تو سبحان اللہ وہ بھی اتنی تیز ہوگی کہ برداشت مشکل۔ دوسرے سوائے برف کے اور کوئی شئے نظر نہیں آتی اور
اس سفیدی سے آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں رنگین عینک لازمۂ زندگی ہے اور اگر دھوپ نہ ہو تو برف باری لازمی ہے دن بھر
رات بھر برف برستی رہتی ہے روئی کے پھالے ہیں جو اُڑتے پھرتے ہیں یا چھوٹی چھوٹی تیتریاں ہیں جو ہوا میں لاکھوں کی تعداد
میں منتشر ہیں۔ زمین برف ہے۔ آسمان برف ہے۔ درخت برف کے ہیں اور مکانات برف کے ہیں راستہ برف کاٹ کر بنایا گیا
ہے موٹر چل نہیں سکتی۔ خاص قسم کی گاڑیاں ہوتی ہیں جنھیں "سلیج" کہتے ہیں جن میں بجائے پہیوں کے دو چھی
لوہے کی پٹیاں لگا دی جاتی ہیں اور جنھیں ایک یا دو گھوڑے کھینچتے ہیں جو برف پر سے پھسلتی ہوئی جاتی ہیں۔
پیدل راستہ بھی نہیں چل سکتے برف پر قدم ٹک نہیں سکتا اس لئے خاص قسم کے کیلوں والے جوتے پہنے
ہوتے ہیں یا اپنے جوتوں پر ایک ربڑ کا جوتا پہن لیتے ہیں جنھیں گلوش کہتے ہیں۔ آئندہ خط سے ہماری "شی انگ"

کی داستان سناؤں گا کہ وہ ہماری زندگی کا ایک کارنامہ ہے بہت ممکن تھا کہ یہ سلسلہ یہاں تک پہنچ کر ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتا اور ہم خود داستان ہو جاتے اور یہ بہ قبرستان ہمارے بعض ساتھیوں کا قبرستان ہو جاتا باقی داستان ہفتۂ آئندہ را بنا تمہارا شہید)

ذکا

ہر شخص کی زبان پر ذکا کا نام تو ضرور ہے لیکن ایسے کتنے ہیں جنھیں مرحوم کے اشعار یاد ہوں آپ کا کلام کبھی اکٹھا نہ ہو سکا۔ ابتدا ہی سے ہماری یہ کوشش رہی تھی کہ برا بھلا جو کچھ کہ سرمایہ فراہم ہے۔ وہ زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رہجائے تو "آیں ہم غنیمت است" اس لئے مرحوم کے اصناف شاعری سے غزل۔ ہجو۔ ہزل۔ تاریخ۔ قصیدہ شہاب میں پابندی سے شائع کردیں۔ اس طرح جو کچھ کلام ہے محفوظ رہجائیگا۔ چنانچہ اس مہینہ کی ابتدا ایک غزل سے کیجاتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ حضرات جنھیں روایتاً ہی مرحوم کا کلام پہنچا ہو۔ اشاعت کیلئے بھیجنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

سب کہے جائیں کہ موت آنے میں اب دیر نہیں — اس سے بہتر میرے بہلانے کی تدبیر نہیں
یہ بھی آپ کا ترکش میرا سینہ ہی سہی — رہنے دو کچھ سبب کشمکش تیر نہیں
تجھ سے دیکھا نہ گیا عشق میں یہ بھی اے ضعف — زہ ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے یہ اکسیر نہیں
نسبت خاص بس اتنی بھی بہت ہے یعنی — مجھ سا لاغر تیری فتراک میں نخچیر نہیں
دمبدم مجھ پہ عنایات یہ کیسے ساقی! — میں فرومایہ نہیں تو فلک پیر نہیں
شہر اجڑ جائے گا اصلاح جنوں تک میرے — آج باقی کسی دروازے میں زنجیر نہیں
سن بھی لیتے کہ گلہ تم سے نہ رہتا مجھکو — جانتے ہو میری فریاد میں تاثیر نہیں
امتحان ہو تو کہیں بوالہوسوں کے جوہر — سر بکف ہیں یہ جو تو رست شمشیر نہیں
کٹ گئی یوں ہی شب وعدہ ذکا کون ہے صبح — کچھ میرے درد کی دارو یہ تباشیر نہیں

رُباعیات

مولٰنا امجد

آزاد کہاں؟ اسیر بھی تو نہ ہوئے
عنبر نہ سہی، عبیر بھی تو نہ ہوئے
امجد صاحب! امیر تو کیا ہوتے
لیکن سچ مچ فقیر بھی تو نہ ہوئے

کامل نہ جہالت ہے نہ آگاہی ہے
حاصل نہ فقیری نہ شہنشاہی ہے
سر ڈھانکتا ہوں تو پاؤں کھل جاتے ہیں
کیا جامۂ زندگی کی کوتاہی ہے

مکتوباتِ جمیل

یا خود مجھی کو اب نہیں احساسِ سوزِ دل   یا تمہارے درد ہے درماں لئے ہوئے

سلمیٰ! ——

تمہارا نام میں بھولی نہیں ہوں —— مجھے اچھی طرح یاد ہے —— بھلا اس کو بھول سکتی ہوں۔ ہاں تم کو ضرور بھول گئی ہوں —— اور خدا کرے کہ بھول جاؤں —— تم نے کہا تھا کہ "اگر میں تم سے بدل جاؤں تو تم میرا نام بدل دینا" —— پس میں نے تمہارا نام ہی بدل دیا —— اور آج سے تم سلمیٰ ہو —— نہیں ہے —— !!

تمہارا ایک خط دیکھا —— اب تو مجھے تمہارا یہ فلسفہ نہایت فرسودہ نظر آتا ہے تم یہ خیال کی ہوئیں کہ شادی کوئی نبوت تو نہ تھی جو کبھی بر ختم ہو جاتی —— تم ... کب تک خیر منائیں —— ؟ آخر یہ طوق تمہارے خوبصورت سنہری گردن میں" —— یہ ہتکڑیاں تمہارے "نازک صندلی کلائیوں" میں حمائل ہو ہی گئیں —— شادی تمہارے فلسفہ حیات کی روسے نظریے "شاعرانہ زندگی کی موت تھی" —— تو تم نے کیوں اس کا خیر مقدم کیا؟ "نجات" کی شاید تم کو بھی کوئی صورت نظر نہ آئی —— ! "تم کو" مجھ سے کسی زمانہ میں محبت بھی تھی، نفرت بھی تھی —— اور جانے کیا کیا جذبات سب کبھی پر ختم تھے —— تم تہر تھے، یا بلا تھے، جو بھی تھے، صرف میرے ہی لئے تھے، مگر اب؟ تمہارے اس رنگین خواب کی تعبیریں دیکھیں؟ خدا کیلئے ذرا تو ہوش میں آؤ —— محبت، تم کیا جانو —— یہ ایک بیکاری کا مشغلہ تھا۔ تمہاری نوعمری اور کمسنی کے کھیل کا یہ ایک جھٹر کیلا۔ مگر بہت جلد چھٹ جانیوالا اشتہار تھا . . . . جس کو افسوس تم نباہ نہ سکیں —— اب بھی یہ بہکی بہکی باتیں چھوڑ دو۔ محبت کا راگ اب الاپنا بعد از وقت ہے اس لفظ کو استعمال کرتے وقت ذرا کوئی مستند لغت اٹھا کر دیکھ لیا کرو۔ ورنہ محبت کا صحیح مفہوم سمجھنے والے تم کو یہی سمجھیں گے کہ تم نے کسی سادھو سے "پرستان" کی کوئی جڑی بوٹی لیکر گھول لی ہے۔ جو ایسی واہی تباہی

بکا کرتی ہو۔

ابھی تم کیا جانو محبت ——— !

سقراط نے یہ کہا، ارسطو نے یہ بکا، ڈارون کی لن ترانیاں یوں تھیں ——— اب اس سے فائدہ؟ تم محبت جیسے مقدس رشتہ کو نباہ ہی کیونکر سکتی تھیں ——— عمر میں کبھی آنکھیں بھی تو چار نہ ہونے پائیں ——— تم میرے ایک "قلمی دوست" تھیں ——— اب ——— اس زمانہ میں ——— جبکہ کوئی شخص اپنے فن میں کامل نہیں۔ یہاں تک کہ کافر بھی اپنے کفر میں پورا نہیں ——— تم اس قلمی موانست کو کیونکر نباہتیں ——— !

میرا سب سے پہلا مکتوب تمہارے نام شہاب کے فبروری ۴۲ء نمبر میں چھپا تھا۔ دوسرا شہاب مارچ ۴۲ء میں ——— تیسرا خط جنوری ۴۵ء میں شائع ہوا ——— اور یہ چوتھا آج چھپ رہا ہے ——— ہجوم جذبات زبان کو ناکارہ کر دیتے ہیں ——— ان کی یورش کے سلسلہ میں قلم کا سر قلم ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد سکوت بہتر معلوم ہوتا ہے۔

ہاں تو ان اونچی اونچی پہاڑیوں پر آ کر بھی کیا کر لیتی ——— جہاں تم گرمی گذارنے چلی جاتی ہو ——— شاید مری چھوڑنا مقصود ہوتا تو وہاں چلی آتی ——— نہیں ذوناش ہی مبارک ——— کم از کم اسی سے وفا کرو جب تک اس کی عارضی زندگی وفا کرے ——— !!

کالج بند ہو گیا۔ وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ تنہائی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ ہیں اگر کوئی شاعرہ ہوتی تو نظم کے ذریعہ ہی اپنے دل کا بخار تم پر نکالتی۔ یوں ہی خط تمہارے نام لکھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتی ہوں ——

بس اب اس پہ ختم۔ تم سے جواب کی امید تو کیا رکھوں ——— مگر پھر بھی یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا ؎

چھیڑا ت لے تصور مژگاں یار بس
کافی ہے خار خار غم روزگار بس

وہی تمہاری ازلی دشمن،

———(ش)———

کیا؟ آپ شہاب کیلئے کچھ خریدار بہم نہیں پہنچائیں گے؟؟

غزل

جناب سید شرف الدین احمد صاحب ساقی

وہ مسجودِ ملائک ہوں کہ قائم ہے وقار ابتک
باین کوتاہیاں باقی ہے میرا اعتبار ابتک

چھپیگا کس جگہ حسنِ تماشا دوست تو ہم سے
ہماری بیخودی ہے لامکاں کی پردہ دار ابتک

ہوئیں ہم چشمِ سخن گو سے ازل میں دل سے جو باتیں
اونہیں سرگوشیوں نے مجھکو رکھا بیقرار ابتک

گرا دیتیں مجھے خود کامیاں قعرِ مذلت میں
مگر تھامے ہوئے ہے رحمتِ پروردگار ابتک

میں ہوں وہ یادگارِ رفتگاں جس کے مٹانیکو
ازل سے گھات میں ہے انقلابِ روزگار ابتک

قرین ہے موت پھر بھی خواہشاتِ نفس غالب میں
کہ باقی ہے فریبِ ہستیِ ناپایدار ابتک

خدا رکھتا ہے میری لاج گو ہوں بے ہنر ساقی
نہیں ہونے دیا خالق نے مجھکو شرمسار ابتک

نپولین کی وصیت

جناب ہادی جعفری

جب نپولین کی حالت روز بہ روز خراب ہوتی گئی اور حالت بد سے بدتر ہونے لگی تو آخر ۱۷ اپریل کو شہنشاہ نے کاونٹ مانٹ ہالن (Count Mont Holon) کو بلوا کر کہنے لگا کہ میں آج تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں جب میں جنرل برٹرینڈ (General Bertrand) سے باتیں کر رہا تھا تو یکا یک خیال ہوا کہ مرنے کے بعد دنیا میرے بیٹے کو کیا کہے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے کچھ وصیت کروں اور تم اس کو میرے بیٹے تک پہنچا دو۔ یہ کہکر نپولین نے لکھوانا شروع کیا۔

"میرے بیٹے تو میری موت کے بدلہ کا خیال دل سے نکال دے بلکہ میری موت سے فائدہ اٹھا۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اس کو بھول نہ جانا اور ہمیشہ ایک سچے فرانسیسی کی طرح بسر کرنا۔ تمہارا تنہا مقصد زندگی یہ ہونا چاہئے کہ تم امن امان سے حکومت کرو۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے جنگ کروگے یا میرے قدم بقدم چلنا چاہو گے تو تمہاری حالت مثل اس بندر کے ہوگی جو بغیر کچھ سمجھے ہر چیز کی نقل کرتا ہے۔ میرے کاموں کو پھر از سر نو کرنے کا مطلب یہی ہوگا کہ میں نے کچھ نہیں کیا بلکہ اگر تم اس کو اختتام پر پہنچاؤگے تو لوگوں پر واضح ہوگا کہ میں نے جو ایک خاک تیار کیا تھا اوس پر تم نے ایک عالیشان عمارت کھڑا کی۔ ایک ہی کام ایک صدی میں دو مرتبہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے جنگ اور ہتھیار سے یورپ والوں کو پریشان کیا۔ موجودہ زمانہ میں جنگ کی ضرورت نہیں بلکہ نرمی اور صلاحیت سے کام لینا چاہئے۔ میں نے انقلاب فرانس میں ایک نئی روح پھونکی جب وہ نیست نابود ہو جا رہا تھا۔ میں نے اسے درجہ کمال پر پہنچایا۔ میں نے فرانس اور یورپ میں نئے خیالات پیدا کئے۔ وہ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتے۔ جس چیز کا میں نے بیج بویا تھا تمہیں چاہئے کہ اس کی آبیاری کریں۔ فرانس میں فلاح و بہبودی کے جو خزانے پوشیدہ ہیں انہیں نمایاں کریں اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے تم ایک شہنشاہ بن سکتے ہو۔

خاندان بوربنس (Bour Bons) میری موت کے بعد اپنا وقار کھو بیٹھے گا۔ انگلستان کے

بانسد نے تک میری طرفداری کرنے لگے ہیں غداری سے تمہیں فائدہ اٹھانا چاہئے ممکن ہے کہ انگلستان اپنے ظلم و ستم کو لوگوں کے دل سے محو کرنے کیلئے تمہیں فرانس واپس ہونے میں مدد دے انگلستان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کیلئے لازمی ہے کہ تم تجارت کی طرف متوجہ ہو اس کا نتیجہ یہ ہوگا یا تو انگلستان سے جنگ ہوگی یا دونوں ملک دوش بدوش تجارت کرینگے میرے خیال میں موجودہ حالت کے اعتبار سے آخر الذکر یقینی ہے

دنیا میں تمہاری حالت بہت نازک ہے کیا آسٹریا بغیر کسی معاہدہ کے تمہیں آزاد کر دیگا۔ فرانس اول اس سے زیادہ خطرناک اور نازک حالت میں تھا مگر اس کا کوئی اثر حکومت فرانس پر نہ پڑ سکا میرے بیٹے کو چاہئے کہ کبھی بیرونی مدد سے سلطنت حاصل نہ کرے کبھی حکومت کی خواہش نہ کرے بلکہ عوام کی پسندیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کرے جب وہ ترقی کرے تو میرے خاندان کا خیال رکھے میری ماں پرانی وضع کی ایک نیک عورت ہے جوزف اور آئیوجین اس کو نیک مشورہ دینگے۔ ہارٹینس اور کیرولین اعلیٰ دماغ کی عورتیں ہیں اگر تم فرانس واپس نہ ہو تو میری کسی ایک بھانجی سے شادی کر لو اگر فرانس جاؤ تو شہزادی روس سے شادی کرنا۔ کیونکہ اس سے فرانس کے بیرونی اثرات بڑھینگے مگر کبھی بھول کر بھی غیروں کو اپنی حکومت میں شریک نہ کرنا

تم فرانس کو ایسے وقت پہنچو گے جب خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ مگر تمہیں صرف ایک پارٹی سے ڈرنا چاہئے۔ وہ ڈیوک آف آرلینس کی پارٹی ہے دوسری پارٹیوں سے تمہیں پریشان ہونیکی ضرورت نہیں۔ شہرت مند و قابل لوگوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کرو۔ اگرچہ شاٹیو برینڈ[1] (Chateaur Riand) کسی قسم کے جھوٹے الزام لوگوں پر نہ لگائے تو ایک اچھا فرانسیسی ہے۔ فرانس ایک ایسا ملک ہے جہاں پارٹیوں کے سرگروہ کا کوئی اثر نہیں ہے ان پر بھروسہ کرنا ایسا ہے جیسے دریا کے کنارے ریت پر مکان بنانا۔ اگر عوام تمہارا ساتھ دیں تو تم فرانس میں بہت بڑے بڑے کام کر سکتے ہو۔ علاوہ اس کے حکومت کو چاہئے کہ جہاں سے اچھی مدد ملے وہیں کا رخ کرے

خاندان بوربن صرف امرا اور پادریوں پر بھروسہ کرتا ہے چاہے نظام حکومت کیسا ہی ہو۔ پانی چاہے لاکھ مشین سے اوپر چڑھایا جائے مگر پھر وہ اپنی سطح پر آجائیگا اس کے خلاف میں نے عوام پر بھروسہ کیا اور میں نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس میں سب شریک تھے میں نے محض امرا یا تاجروں کیلئے حکومت نہیں کی۔ بلکہ

---

[1] یہی شخص ہمیشہ نپولین کا دشمن رہا نپولین کے اعلیٰ اخلاق کی کوئی اور مثال نہیں ہو سکتی کہ اس نے اپنے ایسے دشمن کو بھی ایسے الفاظ سے یاد کیا۔

میری حکومت تمام قوم کیلئے تھی میرے امرا نہیں کسی قسم کی مدد نہیں دینگے میں نے ایک طویل مدت انہیں اپنے رنگ میں رنگنے کیلئے
صرف کی ہے ۱۸۱۵ء کے بعد میرے امرا نے میری مخالفت کی اور میری مخالف پارٹی کا ساتھ دیا۔ تمہارے اقتدار اور اختیارات
پر لوگ معترض ہونگے معمولی وقتوں میں لوگوں کے مشورہ سے حکومت کرنے میں آسانی ہے۔ اسمبلی تمہیں بہت سارے
ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیتی ہے بادشاہ کا کام صرف حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ نیک اخلاق اور راستبازی کو لوگوں
میں پھیلانا ہے۔

میں نے بھی اپنی جوانی میں بعض دھوکے کھائے ہیں مگر بعد میں ہوشیار ہو گیا۔ بڑے بڑے مقرر جو صرف الفاظ اور
لفاظی سے اسمبلی کو تہ و بالا کرتے ہیں اوسط درجہ کی قابلیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں سوائے الفاظ کے سرمایہ کے
اور کچھ نہیں ہوتا ان کے الفاظ کو چاہئے کہ منطقی دلیلوں سے توڑا جائے لوگوں کو اصل مطلب اور واقعہ کی طرف متوجہ
کیا جائے۔ کونسل میں مجھ سے زیادہ مقرر موجود تھے مگر میں نے ہمیشہ سیدھے سادے اور منطقی دلیلوں سے انہیں شکست دی۔
مثلاً دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

فرانس میں بعض اعلیٰ دماغ انسان موجود ہیں صرف ضرورت اس کی ہے کہ انہیں تلاش کیا جائے اور ان کی مدد کیجائے۔
بعض ایسے ہیں جو ہل چلا رہے ہیں حالانکہ انہیں کونسل میں بیٹھنا چاہئے تھا اور بعض وزرا ایسے ہیں جنھیں کھیت باڑی
کرنا چاہئے تھا۔ لوگوں کی باتیں سن کر حیرت نہ کرو۔ اکثر دفعہ ایسا ہوگا کہ جنھیں تم قابل اور اعلیٰ دماغ سمجھتے ہو تمہیں نہایت
ہی فضول اور بیکار مشورہ دینگے۔ قانون آراضی سے لیکر ترکوں کی جابرانہ حکومت تک جتنے بھی طریقے ہو سکتے ہیں فرانس
کسی کیلئے بھی تیار نہیں ہے تمہیں چاہئے کہ اپنے دربار میں قابل لوگوں کو جمع رکھیں۔ فرانس والوں میں صرف دو جذبات
ہیں ایک حریت و آزادی کا دوسرے سوسائٹی کی تفریق۔ حکومت صرف انصاف برتنے سے یہ دونوں خواہشات پوری
کر سکتی ہے حکومت کے قوانین ہر کس و ناکس کیلئے یکساں ہونے چاہئیں۔

میرے بیٹے کو چاہئے کہ پریس کو کامل آزادی دے آج کل اس کی سخت ضرورت ہے۔ پریس کی مدد سے تمام قصبوں اور
قریوں میں حکومت کے نیک اور اچھے اصول پھیلائے جائیں اس سے غفلت برتنا ایسا ہی ہے جیسے خطرہ کے موقع پر
کوئی سو جائے جب ملک میں ہر طرف امن ہو تو پریس کی ایک کمیٹی قائم کیجائے جس میں ملک کے تمام اعلیٰ دماغ اشخاص
شریک ہوں۔ تمہیں چاہئے کہ فرانس اور یورپ میں نئے خیالات پھیلائیں۔ قانون جاگیرات کو نیست و نابود کرنے کیلئے

نئے ادارے قائم کرے جنگلی اور غیر مہذب اقوام تک تمدن اور پیغام عیسائیت کو پہنچاؤ۔ تمہاری زندگی کا نصب العین یہی ہونا چاہئے اور میرا بھی یہی تھا۔

میرے دشمن بنی نوع انسان کے دشمن ہیں کیونکہ وہ لوگوں کو مقید کرنا چاہتے ہیں انہیں مثل ایک بکریوں کے گلہ کے سمجھتے ہیں ان کی آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں وہ فرانس کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ندی اپنا رخ بدل دے اور پھر منبع کی طرف واپس ہو جائے مگر انہیں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موج کنارہ توڑ کر نکل جائے۔

اگر میرے بعد لوگوں نے کورانہ طریقہ سے بادشاہوں کو قتل کیا اور ان کے ساتھ برا سلوک کیا تو میں سمجھونگا کہ میرا بدلہ لیا گیا مگر صحیح طور پر نہیں۔ تمدن پر اس کا گہرا اثر پڑیگا۔ تمام یورپ میں خون کی ندیاں بہینگی۔ خانہ جنگیوں اور بیرونی جنگوں کی وجہ سے سائنس علوم وفنون کی شمع خاموش ہو جائیگی۔ یورپ بادشاہوں کے اختیارات کو بالکل ملیا میٹ کرنے کیلئے ابھی تین سو سال درکار ہونگے۔

جنھوں نے میرا ساتھ دیا ہے تم ان کی مدد کرو ممکن ہے کہ میرے بادفاسپاہی اس وقت روٹی کو محتاج ہوں۔ یورپ اس وقت ایک خاص راستہ کی طرف ترقی کر رہا ہے اس کے مزاحم ہونا گویا اپنی قوت کو کھونا ہے اور اس کا ساتھ دینا اپنی طاقت کو بڑھانا۔ اور عوام کی خواہشات کو مکمل کرنا ہے لوگوں میں قومیت کا خیال پیدا ہوتا جا رہا ہے تمہیں چاہئے کہ اس خیال کو تقویت دیں۔ کام کرنے سے پہلے تم اچھی طرح سونچ لو۔ میری طرح خودمختار بننے کی کوشش نہ کرو۔ وہ ایک موقع تھا جو مجھے مل گیا۔ اور میں نے فوج کی مدد سے کام انجام دئے جب ۱۸۱۲ء میں روس پر غضباب ہوا تو میں نے سو سالہ امن اور صلح کا مسئلہ حل کر دیا میں نے قوموں کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اب وقت ہے کہ انھیں پھر یکجا کیا جائے۔ ۱۸۱۵ء میں میں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ وہ شہنشاہ اور بادشاہ کے خطاب کو بھول جائیں اور صرف حاکم فرانس کے خطاب کو قبول کریں۔ لوگوں نے میری مخالفت کی۔ تمہیں اس کو پیش نظر رکھنا چاہئے جس کے خلاف کرنے میں مشکل کا سامنا ہوگا۔

اب شمال یورپ کی طرف سے نہیں بلکہ بحر اوقیانوس سے بڑے بڑے سوالات اٹھیں گے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے یورپ اپنی فلاح اور بہبودی حاصل کر سکتا ہے تجارت کے نئے نئے راستے کھل رہے ہیں اب یہ کسی خاص قوم یا ملک کی ملک نہیں ہیں اگر ملک میں جرائم زیادہ ہوں اور لوگ ادائی فرائض میں کوتاہی کریں تو

سمجھو کہ تمہاری حکومت کمزور ہے سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہے اگر اس کے برخلاف ہے تو حکومت طاقتور اور سوسائٹی اچھی ہونے کی دلیل ہے۔

مذہبی اثرات ابتک یورپ میں موجود ہیں۔ دنیا کو اس سے بہت فائدہ بہم پہنچا سکتے ہیں اگر اسقف اعظم پیس ہفتم (PIUS VII) سے تمہارا تعلقات اچھے ہوں تو گویا ایک کروڑ آدمی تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمیں ... ساتھ دیگا۔ وہ بہت ہی نیک اور روشن خیال ہے۔ کارڈینل فش (FESCH) نے مجھے بچانا نہیں اس نے الٹرا مانٹینیں (ULTRAMONTANES) جو مذہب کے مخالف تھے اُن کا ساتھ دیا۔ اگر تم فرانس کو واپس ہوں تو تمہیں بعض ایسے لوگ ملیں گے جو ابتک میری عزت کرتے ہیں بہترین کام جو وہ میرے لئے کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ میرے پیش کردہ قوانین حکومت جو میں نے فرانس اور اٹلی میں پھیلائے تھے اور جو میں نے اپنے وزراء کو قلمبند کرائے تھے انہیں یکجا جمع کئے جائیں اور ان کی پیروی کی جائے۔

تمہیں چاہئے کہ تاریخ کا گہری نظروں سے مطالعہ کرو۔ بڑے بڑے کپتانوں اور جرنلوں کی لڑائیوں کو غائر نظر سے دیکھیں جنگ کے حالات پڑھیں اور سوچیں اسی سے جنگ کا ہنر اور کمال حاصل ہو سکتا ہے جو کچھ تم سیکھو گے وہ سب فضول ہے جب تک تمہارے دل میں سچائی اور ایمانداری کا جذبہ نہ ہو اور نیک و بد کی تمیز نہ ہو امید ہے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگے اور میرا نام ہمیشہ قائم رکھو گے۔

سوئی کا کام :—

اس نام سے فاطمہ بیگم صاحبہ لکھم پور کھیری نے سوزن کاری سے متعلق ایک مفید کتاب نقشوں کے نہایت واضح ترتیب دی ہے! اور ہر ایک کام کو نہایت نمایاں کرکے دکھایا گیا ہے اس طرح ایک ناواقف لڑکی بھی اس کے مطالعہ سے بہت کچھ مستفید ہو سکتی ہے۔ تمام ضروری چیزوں کا سینا۔ سلانا تراش وغیرہ کو آسان طریقوں پر سمجھایا ہے لڑکیوں اور عورتوں کیلئے بیحد مفید کتاب ہے لکھوائی چھپائی نہایت خوشنما رنگین ٹائیٹل ہے قیمت (عہ)

بادۂ تلخ

(جناب ت۔ح۔ نقوی صاحب)

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

بوڑھی ماپاکر، ہر سہ شنبہ کو اس نوجوان طالبعلم کے کمرہ کی صفائی کرتی جو اس کے پاس بحیثیت بورڈر کے مقیم تھا۔ وہ جب کبھی باہر سے واپس آتا یہ اس کی پیشوائی کیلئے بڑی مستعدی سے دروازہ پر موجود رہتی۔ اس کیلئے دروازہ کھولتی۔ اسی طرح حسب معمول ایک دن جب وہ اپنا فرض انجام دے رہی تھی اس نوجوان نے اس کے نواسہ کے متعلق سوال کیا۔ مصیبت زدہ ماپاکر نے ایک آہ سرد بھری۔ اور نہایت تھکے ہوئے جواب دیا "ہم نے کل اس کو دفن کر دیا ——"

اُف! مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہوا۔ اس نے ایک اچنبھے سے کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ کھانے کی میز کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ایک نہایت ہی فرسودہ لباس پہن رکھا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک شکن آلودہ اخبار تھا لیکن وہ نہایت مضطرب دکھائی دیتا تھا وہ نشست کے کمرہ میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا دل کھانا کھانیکو بھی نہ چاہتا تھا نہ اخبار میں اس کا دل لگتا تھا۔

چونکہ یہ لوگ جنازہ کے رسومات کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس لئے اس نے پوچھا "مجھے امید ہے کہ رسم جنازہ اچھی طرح انجام پائے"

بوڑھی ماپاکر، ایک گہری سوچ میں تھی۔ اس نے پوچھا "آپ نے کیا کہا؟ میں نہیں سُنی ——"

"یہی کہ جنازہ کی رسم خاطر خواہ رہی؟"

ماپاکر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ سر جھکائے ہوئے باورچی خانہ کی طرف چلدی۔ اور وہاں زبردستی خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگی ——!

طالبعلم نے اس کی بیرخی کو کثرت افکار پر محمول کیا اور کھانے میں مشغول ہو گیا۔ "آپ ہی آپ —
بیچاری غریب مصیبت زدہ!"

ماپا کر اپنی ٹوپی اتار کر کھونٹی پر لگا دیتی اور ایک سفید کپڑا جو ملگجا سا ہوگیا ہے وہ کمر سے باندھ لیتی ہے پھر کرسی پر بیٹھ کر اپنی جوتیاں اتارتی ہے۔ جوتوں کا اتارنا اور پہننا اس کیلئے ایک دردسر تھا۔ ایک مصیبت تھی ایک تکلیف تھی۔ لیکن یہ کچھ آج کل کی بات نہ تھی عرصہ دراز سے اس کو یہ شکایت تھی۔ جوتے اتارنے کے بعد وہ ایک آہ سرد بھرتی اور کرسی پر دراز ہو جاتی ——— جس طرح کوئی کف افسوس ملتا ہے ——— وہ اپنے گھٹنوں کو ملتی جاتی اور آبدیدہ ہوتی ——— اس کو قسم قسم کے خیالات آکر پراگندہ خاطر کرتے ——!

نانا" "نانا" کہتا ہوا اس کا ننھا نواسہ کیچڑ بھرے جوتوں سے اس کی گود میں آجاتا۔ وہ ابھی باہر گلیوں کی خاک چھانتا ہوا آیا ہے۔

دیکھا لعینی شریر لڑکے تو نے بوڑھی نانی کے کپڑوں کی کیا گت بنادی ہے ہانٹ کھٹ کہیں کا ——— سوائے تکلیف دینے اور ستانے کے دوسرا کام نہیں"!

لیکن وہ اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے۔ اس کے منہ پر منہ رکھ دیتا ہے "نانا ایک آنہ دو نہیں تو میں تمہاری گود سے اتروں گا نہیں؟ ——"

"چل نکل یہاں سے نانا کے پاس کہاں سے آئے جو تجھے دے؟"

"ہے تمہارے پاس۔ دو اب اس وقت دو؟"

آخر ضد اور ہٹ غالب آئی اس نے ایک سیاہ بوسیدہ بٹوہ نکالا اس میں سے اس کو ایک آنہ دیا بچہ خوش ہو کر بوڑھی نانی کو لپٹ گیا۔ اپنی جیت پر بڑی شان کرتے ہوئے "آنہ نہیں تھا نا؟ اب کہاں سے آیا؟"۔

بوڑھی ماں پاکر کے اس خوشگوار تخیل کو کتیلی کی سریلی آواز نے چونکا دیا۔ اس کے نغموں نے اس کے خیالات کی دنیا میں ایک ہلچل ڈال دی۔ اس کو فوراً اس نوجوان کی چاء کا خیال آیا۔ جو چاء کا قریب قریب دیوانہ تھا۔ اس نے چاء بنائی۔ اس کو دی۔ اور خود بھی خون جگر کی طرح پیا ——— پھر وہی باورچیخانہ کے کبھی نہ ختم ہونے والے دھندوں میں مصروف ہوگئی۔

باورچیخانہ کی سرگذشت اگر لکھی جائے تو ایک دفتر ہو جائے۔

چاء کے ابلے ہوئے پتے۔ ترکاری کے چھلکے ہاتھ دھونے کے بیسن کو گھیر لیتے ہیں۔ سگریٹ کے جلے ہوئے

ٹکڑوں نے چوطرف اپنا سکہ جما لیا ہے۔ غرض باورچیخانہ کا ہر کونہ نوجوان طالبعلم کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

پھر یہ حضرت سوچتے بھی تھے کہ آخر یہ لوگ کیوں خانہ داری کے بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ ہم کو اگر پڑھنا لکھنا ہے امتحان کی فکریں ہیں۔ دماغی مصروفیت ہے تو انہیں بھی خانہ داری کا دھندا ہے۔ یہ بھی نہ کریں گے تو پھر کرینگے کیا آخر؟ بیکار زندگی تو بسر ہونے سے رہی۔ انسان وہی ہے جو کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔ پھر وہ ماپاکر سے کہتا "تم ہفتہ میں اگر ایک بار بھی کسی بوڑھی کو مقرر کردو تو وہ باورچی خانہ صاف کردے۔ صرف غلیظ کرنا ہی جانتی ہو"!

حالانکہ اس کی غلاظت و کثافت کا سبب یہی نوجوان تھا۔ وہ جہاں ٹھہرتا وہاں ایک خرافات کا ڈھیر لگ جاتا جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے تو تعداد میں کوئی ٹھکانہ نہیں رکھتے۔ دیا سلائی کی بجھی ہوئی کاڑیاں استعمال شدہ لفافے۔ ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ماپاکر نہ اس کی اس حرکت سے ناراض ہوتی۔ نہ اس کے بیجا الزام سے آزردہ۔ بلکہ وہ الٹے اس پر ترس کھاتی تھی کہ بیچارا تنہا ہے کوئی اس کا عزیز نہیں جو اس کی دیکھ بھال کرے وہ اکثر اس طالبعلم کی زندگی اور اس کے مستقبل پر غور کرنے لگتی اور اثنائے خیالات میں اس کی نگاہ اس گندے چھوٹے سے دریچہ پر جاتی۔ جہاں سے آسمان کی وسعت اس کو نہایت غمگین معلوم ہوتی جب کبھی اس پر بادل کے ٹکڑے کھیلتے رہتے تو ان کے کنارے اس کو پھٹے چیتھڑے اور کسی شکستہ قسمت کی طرح پریشان نظر آتے پرانے دھرانے کپڑوں کی طرح بوسیدہ دکھائی دیتے!

عموماً چاء کا پانی گرم ہوتے تک یہ جھاڑو دیا کرتی اور جھاڑو دیتے وقت وہ اپنی زندگی پر غور کرتی ــــ کہ "افسوس میری زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ ایک مصائب کا سلسلہ ہے کہ چلا ہے۔ کبھی ایک مصیبت ٹلی کہ دوسری نے سر اٹھایا۔ کبھی وہ دبی کہ تیسری نمودار ہوئی" یہاں تک کہ اس کے ہمسایہ والے بھی اس پر رحم کھاتے کہ واقعی یہ کس قدر بدنصیب ہے جب کبھی وہ سودا سلف کیلئے بازار جاتی اور وہاں سے لڑکھڑاتی ہوئی گھر لوٹتی۔ یہ لوگ اپنے گھر کی منڈیروں پر سے اس کو دیکھا کرتے اور ایک ہمدردی کا طوفان ان کے دل میں اٹھتا۔ لیکن غریب ماپاکر مصائب کی عادی ہو چلی تھی۔ ــــ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا۔

اس نے کبھی مقدر کا گلہ نہ کیا۔ کبھی کاتب قسمت کی شاکی نظر نہ آئی اس کیلئے زندگی ایک معمہ تھی۔ مگر اس نے بڑی بہادری سے ہر مصیبت کا مقابلہ کیا

(۲)

نہ کرے یاس یوں برباد میرے خانہ دل کو اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

جب وہ سولہ برس کی تھی۔ اس نے اسٹراڈ فورڈ چھوڑا۔ اور ایک ملازمہ کی حیثیت سے لندن آئی۔ وہ اسٹراڈ فورڈ میں پیدا ہوئی جو شیکسپیر کا مقام مولد ہے۔ اکثر لوگ اس سے شیکسپیر کے متعلق سوالات کرتے لیکن وہ یہی کہتی کہ میں نے اس کو تھیٹر میں ضرور دیکھا ہے۔

اسٹراڈ کے متعلق بھی اس کو اور کچھ یاد نہ تھا سوائے آتشدان کے قریب بیٹھکر روشندان سے تاروں بھرے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کرنا یا ان دھندلی گلاب کی جنگلی جھاڑیوں کی طرف گھورنا جس کی بھینی بھینی خوشبو اس کے دماغ کو معطر اس کی روح کو مانوس کر چکی تھی۔ —— یا اس کو کبھی اپنی بیماری کا زمانہ یاد آتا جب کہ وہ ہاسپٹل میں تھی اور بہت سخت بیمار تھی وہ بھی ایک عجیب جگہ تھی۔ ایک آفت کی جگہ جہاں سے باہر نکلنے کی سخت ممانعت تھی۔ اوپر کی منزل پر بھی صرف دن میں دو مرتبہ جانے کی اجازت تھی صبح اور شام نماز کیلئے ——! وہاں کا باورچی خانہ بہت ستھرا تھا لیکن باورچن بڑی سنگدل عورت تھی اس کے جتنے خط اس کے گھر سے آتے اور جن کے لئے بیچاری ماپا کر نعل در آتش رہتی وہ کمبخت باورچن انہیں آتش دان کے نذر کر دیتی۔ کیونکہ اس کا اپنا یہ خیال تھا کہ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد ماپا کر خوابوں کی دنیا میں گم ہو جاتی ہے اور اوس کے حق میں وہ خط اذر مصیبت کا سبب بن جاتے ہیں۔

— — — — — —

زمانہ گذرتا گیا وہ صحت پا کر ہسپتال سے نکلی۔ اتفاق سے کسی ڈاکٹر کے یہاں اوس کو ایک مددگار کی حیثیت سے دو سال گذارنے پڑے۔ پھر اس کی شادی ایک نان بائی سے ہوگئی۔ جب یہ اپنا قصہ اس نوجوان طالبعلم سے بیان کرتی وہ متعجب ہو جاتا۔ اور کہتا - نان بائی ماپا کر ——؟

اکثر اوقات نوجوان طالبعلم کو اس گتھی کے سلجھانے اور اس پر غور و خوض کرنے میں ایک خاص دلچسپی سی ہوتی جس کو "زندگی" کہتے ہیں۔ وہ اپنی کتابیں بالائے طاق رکھکر اس فلسفہ پر گھنٹوں سر دھنتا —— کہ واقعی زندگی کیا ہے !! "ایک نان بائی سے شادی کرنا واقعی کتنا اچھا ہے"

ماپاکر خاموشی سے اس کے فقروں کو سنتی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا کہ وہ اس کے خیالات سے مطمئن نہیں ہوتی۔

"کتنی صاف ستھری تجارت ہے !!" وہ کہتا

مگر ماپاکر بالکل اس سے متاثر نہ ہوتی ——

"اور کیا تمہیں روٹی کے صاف ستھرے ٹکڑے خریداروں کو دینے میں مسرت نہ ہوتی تھی ؟" "ہاں صاحب —— ہوتی ہوگی —— لیکن میں ہمیشہ دکان پر تھوڑی ہی رہتی تھی ؟ مجھ کو تیرہ [13] بچے تھے جن میں سے سات تو اللہ کے حوالہ ہوئے ہمیشہ مجھے بچوں کے دھندوں میں مصروف رہنا پڑتا۔ کبھی گھر کا گھر ہسپتال ہو جاتا۔ سب کی تیمارداری مجھے کرنی پڑتی۔ کبھی ایک اچھا ہوتا دوسرا پڑتا۔ غرض میری یونہیں گذر جاتی۔ ان کے دیکھ بھال سے فرصت ہوتی تو میں بھی روٹی فروخت کرتی ——"

"واقعی ماپاکر —— واقعی ——" طالبعلم نے شانے جھٹک کر کہا۔ اور پھر قلم اٹھا کر لکھنے میں مشغول ہوگیا —— !

(۳)

ہاں —— سات بچے اس بدنصیب کے مرچکے تھے اور جبکہ وہ باقی چھ بچے ابھی ذرے ذرے سے ہی ننھے کہ اس کے شوہر کو تپ دق نے گھیرا۔ اس کے پھیپھڑے دق کے تاثرات سے بالکل ریزہ ریزہ ہوکر رہ گئے تھے جیسا کہ اس سے ڈاکٹر نے کہا تھا —— اس کی زندگی کی ناؤ منجدھار میں جھکولے کھا رہی تھی۔ دق کا مریض بھی کہیں بچا ہے !!

ایکبر تبہ ڈاکٹر نے اس کے شوہر کی قمیص الٹ کر اور ایک حلقہ اس کی پشت پر بنا کر کہا تھا: ——

"ماپاکر —— اگر تم اس کے پھیپھڑوں کو یہاں دیکھنا چاہو تو تم دیکھوگی کہ یہاں صرف آنا ہی آنا ہے" ——

پھر اس کے بعد ڈاکٹر اس کو سانس اچھی طرح لینے کیلئے کہا —— اور ماپاکر آبدیدہ ہو جاتی اور کہتی تھی کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا —— کیونکہ ایک سفید دھوئیں کی قسم کی کوئی چیز اس کے منہ سے نکل گئی ! بس —— —— پھر شاید میں بیہوش ہوگئی۔ مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہوا۔ کیونکر ہوا ؟

— — — — — —

اس کے شوہر کی موت کے بعد جو جد وجہد کہ اس کو کرنی پڑی جن افکارات و مصائب سے اس کو مقابلہ ہوا۔ جو کڑیاں اس نے جھیلیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ بچوں کی نگہداشت، اپنے رکھ رکھاؤ کا خیال۔ واقعی یہ آفت نصیب زندگی اس نے بسر کی ——— دن گذرتے گئے ہفتے اور مہینے برسوں میں تبدیل ہو گئے۔
بچے جب اس قابل ہوئے کہ اسکول بھیجے جائیں اس کی نند بھی اس کی زندگی کے مصائب میں حصہ لینے آ موجود ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ مسز باپر کا وہ ہاتھ بٹائیگی۔ بچوں کو سنبھالیگی۔ لیکن مصیبتیں کبھی تنہا نہیں آتیں۔ اتفاق کی بات کہ وہ سیڑھیوں پر سے گر کے بہت سخت بیمار ہوگئی۔ اور پانچ سال کیلئے ماپاکر اس کی پرداخت ایک بچی کی طرح کرنے لگی اس کا رونا اور درد سے کراہنا الگ۔ اس کی دوا درمن تیمار داری علیحدہ ——— !
نوجوان ماڈی بری صحبتوں میں پڑکر فرار ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی بہن ایلیس کو بھی لیکر چلتی بنی۔ دو لڑکیوں نے ہوش سنبھالتے ہی ترک وطن کر دیا۔ نوجوان ملبیس فوج میں بھرتی ہوکر ہندوستان چل دیا۔ ایتھل جو سب سے چھوٹی لڑکی تھی اس نے ایک بیکار محض آدمی سے شادی کرلی جس کا جسم زخموں اور پھوڑوں سے چور چور تھا جس سال لیتی پیدا ہوا اس کے شوہر نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اب میرا چھوٹا خوبصورت لیتی ہے"۔
یہ کہتے کہتے وہ بے اختیارانہ اٹھی ——— چھوٹی رکابیوں اور پیالیوں کو دھو کر سکھا لیا۔ چھریوں کو جن کا رنگ سیاہی مائل تھا آلو کے چھلکوں سے صاف کیا۔ اس پر سفید چادر بچھائی اور پھر ہاتھ دھونے کے بیسن کو جس میں سارڈین (ڈبہ کی انگریزی مچھلی) کے ٹکڑے پڑے بتر رہے تھے اس کو دھویا۔ اور پھر نوجوان سے مخاطب ہوئی۔
لیتی روز ازل سے ایک کمزور بچہ تھا۔ وہ لڑکی کی طرح نازک اور ذکی الحس تھا اس کی جسمانی ساخت اور کمزور اعضا کی وجہ سے بادی النظر میں اس پر لڑکی کا ہی گمان ہوتا۔ اس کے سفید پیچیدہ بال۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں۔ اور ایک سفید سا نشان الماس کے ٹکڑے کی طرح اس کی ناک کے ایک طرف چمکتا تھا۔ اس بچہ کی سنبھال بہت مشکل تھی مجھے اور ایتھل کو اس کی وجہ سے خوب ہی پاپڑ بیلنے پڑے۔ کوئی اشتہار دواؤں کا ہماری نظر سے اوجھل نہ ہونے پاتا۔ سارے جتن کئے گئے۔ کوئی نسخہ نظر انداز نہ کیا جاتا۔ ہر اتوار کی صبح جب کہ میں دیگر خانگی مصروفیات میں حسب عادت منہمک رہتی ایتھل اخبار دیکھ کر اشتہارات کا کالم ٹٹولتی۔ اور ہر اس اشتہار پر اچھل پڑتی جہاں کسی بچہ کی صحت کا مژدہ رہتا۔ ایسی کسی دوا کی تعریف دیکھ کر فوراً خط لکھا جاتا۔ دوا آتی۔ استعمال ہوتی

لیکن (ع) مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ سب بےسود غرض کوئی دوا لیفی کے حق میں تریاق ثابت نہ ہوئی۔ باغ کی اس کو صبح وشام سیر کرائی جاتی کہ آب وہوا کی تاثیر سے ہی شاید اس کے چہرے پر سرخی آئیگی۔ لیس میں بٹھا کر باہر لیجاتے۔ دور دور کی سیر کراتے کہ اس کی ہلچل اور جھٹکوں سے اس کی بھوک کھلے گی۔ لیکن اس کا درد کبھی منت کش دوا نہ ہوا۔ ایک پھول تھا کہ کملاتا چلا تھا ـــ ـــ ـــ ـــ !

کچھ بھی تھا۔ ظاہراً صورت شکل صحت مندوں کی نہ سہی۔ وہ دائم المریض سہی۔ سب بدتر ہی تھا۔ لیکن وہ میرا پیارا میرا اچھا لیفی تھا۔ میں اس کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتی تھی۔ وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز و پیارا تھا۔ میں اسی کو دیکھ کر جیتی تھی ـــــ !

"تم کس کے بچے ہو لیفی؟" اور ایک دھیمی کمزور ناتواں آواز میں جواب ملتا۔

"میں نانا کا لیفی ہوں"!

اکثر وہ اسی قسم کے خیالات میں گھری ہوئی تھی۔ پھر دل اس کا سرگھومتا ضعیفی میں اس کے لئے کتنے داغ تھے جس کو وہ برداشت کر رہی تھی ـــــ !

ایک دن وہ اسی جھمیلے میں تھی کہ طالبعلم کے جوتوں کی آواز نے اس کے تسلسل کو توڑ دیا۔ وہ لباس تبدیل کرکے چہلقدمی کی غرض سے باہر جا رہا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ باہر جاتے وقت اس سے ضرور رخصت ہوتا۔ چنانچہ اس نے کہا "ماپا کر میں باہر جاؤں ـــــ میں نے تمہارے لئے کچھ رقم گلدان کے نیچے رکھدی ہے"

"شکریہ تمہارا"

"اچھا ہاں کیا تمہیں کچھ کو کو پھینکی تھی جب کہ تم یہاں تھیں؟"

"نہیں تو ـــــ !"

بڑے تعجب کی بات ہے میں قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایک چیچہ کو کوٹن میں رکھی تھی اور وہ اب ندارد۔ جب کبھی تم نے کوئی چیز ردی میں بیکار سمجھ کر پھینکی ہے۔ تم مجھ سے پوچھ لیا کرتی تھیں۔ کیوں ہے نا ٹھیک؟"

اور وہ جانے لگا۔ اپنے دانست میں بہت مطمئن ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ ہاں مسز پاکر بھی سمجھ گئی ہوگی۔

کہ یہ بظاہر بہت لاپرواہ ہے لیکن درحقیقت ایک عورت کی طرح باسلیقہ اور محتاط طبیعت کا مالک ہے!"

دروازہ کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور وہ اپنا لباس کنگھی برش وغیرہ لیکر بیڈ روم میں چلی آئی لیکن پھر جس وقت وہ بستر صاف کر رہی تھی اس کو معصوم لینی کا خیال ستا رہا تھا۔ ہر لمحہ ہر لحظہ اس کو اس کا تصور لگا رہتا۔ اس کو دنیا کی ہر چیز میں لینی نظر آتا۔ "آخر قدرت اتنی ظالم کیوں ہے کہ وہ اتنے ذرا سے بچہ کو اتنی تکلیف میں رکھے۔ اتنی سی جان آخر کس گناہ کی پاداش میں اتنی ساری سختیاں جھیلے"؟ یہ وہ نکتہ تھا جو اس کے لئے ایک عقدہ لاینحل بن کر رہ گیا تھا ——— !

غریب لینی کے ننھے سے سینہ میں سے کسی چیز کے پکنے یا اُبلنے کی سی آواز آتی تھی کوئی سخت چیز اس کے سینہ میں گھومتی تھی اور اس طرح سے کہ جیسے ایک ابلتا ہوا آلو گرم گرم پانی میں دیگچہ سے ٹکراتا ہے لیکن اس کی بیماری کی علامتوں سے زیادہ تکلیف اس کی وہ حرکت تھی جب وہ خاموش تکیہ کے سہارے بیٹھ جاتا تھا۔ نہ کسی سے بات نہ چیت۔ گویا وہ اپنی بدقسمت نانی سے خفا ہے۔ اور ہاں جیسے یہ سب اسی کا قصور ہے اس کی بیماری کا واحد سبب یہی غریب حرماں نصیب بڑھیا ہے۔

"میری جان یہ میرا قصور نہیں ہے کہ تو بیمار ہے میرے بچے!" وہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ سہلاتے ہوئے انتہائے محبت سے اس کے سفید نرم بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کہتی! لیکن لینی اتنا خفا ہے کہ وہ اس کی اس پرخلوص حرکت سے اور ناخوش ہو جاتا ہے اپنا سر زور سے جھٹک لیتا ہے دراصل وہ اپنی بیماری کا سبب اپنی نانی کو سمجھتا ہے۔ عشق است و ہزار بدگمانی ——— الغرض ——— خیال ہی خیال میں ——— اس کی ایک ایک بات کو یاد کرکے بے چین ہو جاتی تھی جس کام میں مصروف رہتی لینی اس کے پیش نظر رہتا اس نے زندگی کی کوئی خوشی نہ دیکھی۔ اس نے کتنی زحمتیں اٹھا کر عالم بیوگی میں اپنے ننھے ننھے بچوں کی پرورش کی۔ مگر ایک بھی اس قابل نہ ہوا کہ اس کی زندگی کا سہارا بنے۔ اس کی ضعیفی میں اس کا پشت پناہ ہو۔ یہ لینی کو ان سب کا نعم البدل سمجھی تھی۔ اس کی زیست کا دار و مدار اسی پر تھا۔ لینی کا ایک شاندار مستقبل اس کے پیش نظر تھا۔ اسی سے اس کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر پھوٹی ہوئی قسمت نے اس رشتہ کو بھی منقطع کر دیا لینی بیماری جھیل جھیل کر گور کنارے ہو گیا۔ اس کا چہکتا ہوا بلبل ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا تھا ——— !

اس میں شک نہیں اُس نے زندگی میں بہت سے مصائب جھیلے لیکن برداشت کا مادہ بھی قدرت کی طرف سے اس کو وافر ملا تھا کبھی اپنے غم والم کی داستان دوسروں کو سنا کر وہ برگشتہ خاطر کرتی تھی بلکہ اپنا رنج چھپانے میں اس کو خاص ملکہ تھا۔ بڑے حوصلہ کی عورت تھی وہ ہمیشہ تنہائی میں آپ ہی آپ رولیا کرتی لیکن معاً کسی سے ملنا ہوتا یا کوئی اس سے بات کرنے یا مخاطب ہونیکی کوشش کرتا تو وہ بڑی خوبی سے آنسوؤں کو پی جاتی اور مسکراتی ہوئی مخاطب سے ہمکلام ہوتی۔ گویا ؎

اس بہانے سے بہائے سر محفل آنسو کہدیا ان سے کہ آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے

یہاں تک کہ اس کے بچوں میں بھی کسی نے اس کو کبھی آبدیدہ نہ دیکھا۔ وہ ایک معزز لنبترہ کی مالک تھی لیکن اب؟ جب کہ اس کا پیارا للیتی مر چکا تھا۔ اب وہ کس پر غرور کر سکتی ہے؟ وہ ایک تہیدست ہے۔ اس کی کمائی لٹ چکی۔ اس کی زیست کا ماحصل للیتی تھا۔ یہ سب آخر مجھے کیوں جھیلنا پڑا۔ آخر خداوندا یہ سب کس گناہ کے پاداش میں؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ آخر مالک یکس کی مجھے بددعا لگی؟

اسی طرح آپ ہی آپ ہذیان سرائے کرتی اور رویا کرتی ——— !!

ایکدن ——— اس ناقابل برداشت صدمہ کو سہنے سے مجبور ہو کر وہ ایک دیوانہ کی طرح کمرہ سے نکلی ٹوپی پہنی اور چلی ——— جس طرح انسان عالم رویا میں چلتا ہے۔ وہ جا رہی تھی۔ اس کو خود اس کا علم نہ تھا وہ کہاں جا رہی ہے۔ اس کا دنیا میں اب کوئی منزل مقصود نہ تھا۔

راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہوا میں غضب کی سردی تھی۔ فضا میں موت کا سا سناٹا تھا۔ رہگیروں کی تیز رفتاری بتا رہی تھی ؎ کسے را با کسے کارے نباشد۔ راستہ پر بھلا کسی کو کسی کی کیا خبر ہو سکتی ہے۔ وہ بھی دلی جذبات واحساس کا علم۔ کہ کوئی کس غرض کیلئے گھر سے نکلا ہے۔ وہ کن جذبات کا حامل ہے۔ اس کو کس مجبوری نے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ دنیا میں دلچسپیوں کیلئے بہت کم لوگ گھر سے نکلتے ہونگے۔ ورنہ ضروریات ہی صرف ایسی بلائیں ہیں جو انسان کو گھر سے نکالتی ہیں۔ وہ روتی جاتی تھی۔ اس کے ذہن میں ایام گذشتہ کے واقعات سلسلہ وار آتے۔ للیتی کا خیال تو سب سے مقدم تھا۔ اس کا بیتیا بانہ اس کی گود میں کچھ بھرے پاؤں سے آنا۔ پھر اس باورچن کا خیال جو اس کے خطوط چاک کر دیا کرتی تھی۔ پھر اس ڈاکٹر کا خیال جس کے زیر نگرانی اس نے دو سال گذارے تھے اپنے ان سات بچوں کا تصور جو مر چکے تھے وہ سوچتی تھی کہ اگر ان بقیہ چھ کی قسمت میں ایسی ہی خانہ بدوشی

لکھی تھی تو کاش ان ساتوں کے ساتھ یہ بھی مرجاتے۔ رونا اس کا رہتا کہ جس نے دیا تھا اور لے بھی لیا۔ شکر اس کا ہے لیکن اب تو زندوں کو رونا لگ گیا

پھر اس معصوم کی بیماری کا اس کو خیال آیا اور وہ اپنا سر پیٹ لیتی وہ چاہتی تھی کہ کہیں بیٹھ کر خوب سا رو لے۔ کسی طرح دل کی بھڑاس نکل جائیگی وہ کسی ایسے موقع کی متلاشی تھی لینی کی موت نے اس پھوڑے کو بھر دیا۔ وہ گھر میں رو نہیں سکتی تھی وہاں انیقل موجود تھی۔ انیقل کے غم کو ایک چھیڑ ہوتی ہے اس کے صبر میں تلاطم اٹھتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی عالم شباب میں زندگی سے یوں بیزار ہوجائے بلکہ جب کبھی وہ انیقل کے ساتھ ہوتی دنیا کی ادھر باتیں کرکے اس کا دل بہلاتی۔ انیقل اس کے دل سے لینی کا غم غلط کرتی اور وہ انیقل کے قلب سے اس زخم کو دھونے کی کوشش۔ لیکن دونوں جب ایکدوسرے سے علیحدہ ہوتے ان کے دلوں کی حالت ایک سیماب سے بدتر ہوتی۔ ایک مذبوح جانور سے زیادہ ان میں تڑپ ہوتی وہ سوچتی تھی کہ میں کہاں جاکر روؤں؟ اگر نہ روؤں گی تو دیوانی ہوجاؤں گی۔ اور دیوانی ہوکر زندہ رہوں گی تو اور بھی لوگ میری زندگی سے بیزار ہوجائیں گے۔ اب تک تو صرف میں ہی اپنی زندگی سے بیزار رہوں۔ اگر کسی بنچ پر بیٹھ کر روئے تو لوگ مجھ سے مسلسل سوالات کرنے لگ جائینگے رونے کا سبب پوچھیں گے۔

وہ اس طالبعلم کے گھر جاکر بھی نہیں رو سکتی تھی اس کو کیا حق تھا کہ وہ پرائے گھر میں روئے اور ان کی زندگی تلخ کرے اگر وہ راستہ کی کسی عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر روتی تو پولیس کیوں اس کو رونے دیتی۔

ارے تو کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ اب اس کے لئے باقی ہی نہ رہی؟ جہاں بیٹھکر وہ اپنے دل کی آگ آنسوؤں سے بجھا سکے وہ راستہ پر کھڑی آسمان اور زمین کو تک رہی تھی۔ ہوا بہت زوروں سے چل رہی تھی۔ طوفان نے آسمان و زمین کے قلابے ملادئے تھے پس چشم زدن میں وہ کہیں نہ تھی۔

گل ہوا غنچہ تو آواز یہ اس سے آئی! جمع پھر دل نہیں ہوتا ہے پریشاں ہوکر

شکریہ محترمہ حسینہ ج نقوی صاحبہ کا جنھوں نے اس مہینہ "شہاب" کیلئے خریدار بہم پہنچائے ہیں۔

تاروں کی چھاؤں میں

جناب صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب (عثمانیہ)

کنواری لڑکیاں جنگل میں رنگ رلیاں مناتی ہیں
شعاعیں جذب ہیں رنگینیوں میں جسم نوریں کی
ڈھلک کر سر سے آنچل چومتا ہے پائے رنگین کو
تبسم۔ قہقہے۔ عشوے۔ نزاکت فتنہ انگیزی
نظر کی میکدہ ریزی۔ ادا کی کیف افزائی
اگر وہ گلبدن جائیں تو جنت بھی مہک جائے
جو زاہد دیکھ لے ان کو تو مستی میں بہک جائے
مرے تخیل کی رنگینیوں میں جگمگاتی ہیں
شباب شعر کی پریاں ہیں شعرستان ہستی میں

کنارے تال کے بیٹھی سریلے گیت گاتی ہیں
سکوت شب میں ہیں موسیقیاں آواز شیریں کی
ہوا کے مست جھونکے چھیڑتے ہیں زلف مشکیں کو
شرارت۔ سادگی۔ الھڑپنا۔ شوخی۔ دل آویزی
تکلم کی قیامت خیزیاں پیکر کی رعنائی
فرشتہ بھی انہیں دیکھے تو حیرت سے بھڑک جائے
جو پڑ جائے نظر ان کی تو ذرہ بھی چمک جائے
مرے اشعار کی موسیقیوں میں گنگناتی ہیں
مری وارفتگی کی دیویاں ہیں دل کی بستی میں

ستاروں میں چمکتی ہیں گلوں میں مسکراتی ہیں
کنواری لڑکیاں جنگل میں رنگ رلیاں مناتی ہیں

موت

(جناب مرزا حمید بیگ صاحب بی اے بی ٹی علیگ)

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

حضرت ملک الموت کو ہمارے خاندان سے کچھ ایسا انس ہو گیا ہے کہ ہمیشہ دستِ شفقت پھیرتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ایک کر کے سارے خاندان کو صاف کر دیا مگر دنیا کی ناپائیداری کا [illegible] ہے کہ اب بھی جب کبھی خیال آ جاتا ہے ایک چہرہ و رنگ اڑنے لگتا ہے۔ خیر اب تو ہم زیادہ فکر نہیں کرتے کیونکہ ہماری ہمت و استقلال پسند نے اس مشکل کو بھی آسان کر لیا ہے۔ مگر ہاں ناسمجھی کے زمانہ میں ان کی [illegible] بہت شاق گزرتی تھی اور اس خیال سے دل پر سخت چوٹ لگتی تھی کہ نہ تو ہماری یتیمی پر ان کو کبھی رحم آیا اور نہ ہماری [illegible] ان کو اپنے فرائض کی انجام دہی سے باز رکھ سکی۔ ہم ہزار بلبلائے، عورتوں نے بہتیرا واویلا مچایا اور سخت شور و غل [illegible] واویلا کی مگر واہ رے مستقل مزاجی کیا مجال کہ کبھی پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش آئی ہو۔ ادھر وہ اپنا کام کرتے رہے ادھر ہم بیچارے ناچار اپنے عزیزوں کو ان کی خوشگوار آرامگاہ میں اتارتے رہے۔ مرنیوالے مر گئے اور زمانہ کی دست برد سے ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو کر آرام کی نیند سو گئے مگر ہم چونکہ بچہ ہی تو تھے۔ سمجھ آتی نہیں تھی اس لئے موت کے ان پے در پے حملوں سے بیحد خائف ہو گئے اور دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ موت بڑی خطرناک شے ہے اور اگر ذرا غور سے دیکھا جائے ہمارا خوف بیجا بھی نہ تھا۔ بھلا کس طرح ممکن ہے کہ ایک کمسن بچہ اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ والدین جدا ہوئے، عزیز و اقارب رخصت ہوئے، کوئی دوست غمگسار باقی نہ رہا، چین و راحت کی گھڑیاں ختم ہوئیں، خوش نصیبوں نے ساتھ چھوڑا، زندگی کا سارا طلسم ٹوٹ گیا، مختصر یہ کہ ان اموات کی بدولت دنیا اندھیر ہو گئی۔ اور پھر بھی وہ موت سے خائف نہ ہو۔ اچھا آنکھوں نے تو یہ تماشا دیکھا اور کانوں نے اس سے زیادہ

عہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ مضمون شروع کرتے وقت ہم نے یوں لکھا تھا کہ "اب بہت دنوں سے ان کی طرف سے ذرا امن ہے" لیکن اس کے چند روز بعد ہی ایک عزیز کا انتقال ہوا اور اس مضمون کے اختتام پر ایک دوسرے صاحب کا خاتمہ ہو گیا۔ مضمون طبع ہونے کے بعد معلوم نہیں کس کی باری ہے۔

ہوش رُبا قصے اور واقعات سنتے۔ بچپن میں بڑی بوڑھیوں کی زبانی کہانیوں میں سنا تھا کہ فلاں بادشاہ نے فلاں خاندان کو چن چن کے بچہ کو لھو پلوا دیا۔ فلاں کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔ فلاں کی کھال کھچوا دی اور فلاں کو شکنجہ میں کھچوا دیا۔ جب ذرا بڑے ہوئے اور مدرسہ جانے لگے تو وہاں تاریخی واقعات سے ان قصوں کی تائید ہوئی۔ کہیں پڑھا کہ فلاں بادشاہ نے شہر کا شہر جلا کر خاکستر کر دیا۔ عورتوں اور بچوں کو بیرحمی سے تلوار کے گھاٹ اتارا۔ سینکڑوں نفوس کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ٹھونس دیا۔ اور دشمن کا سر تن سے جدا کر کے رقص کا تماشا دیکھا۔ اس پر شعراء نے اور بھی غضب ڈھایا کہ موت کے ظلم و ستم کی تصویر ایسے دلخراش پیرایہ میں کھینچی کہ اس کے نام سے رونگٹے کھڑے ہونے لگے اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض من چلے لوگ انسان جیسی اشرف ہستی کو موت کی دیوی کے بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اس کے لیے بڑی بڑی تیاریاں کرتے ہیں کہیں ناچ و رنگ ہوتے ہیں اور خوب جشن منائے جاتے ہیں اور اس طرح پر موت کی دیوی کو انسانی قربانی دی جاتی ہے کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ مرنیوالے کے لئے سنگین مقبرے تیار ہوتے ہیں ان کو نہایت پُرتکلف طریقہ پر آراستہ کیا جاتا ہے۔ ان میں سونے چاندی کے ظروف اور ہر قسم کی ضرورت کا سامان جمع کیا جاتا ہے اور اس طرح موت کی آؤ بھگت کی جاتی ہے غرضیکہ ان سب چیزوں کے سننے اور دیکھنے کے بعد بحیثیت مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ ہم موت کے نام سے بالکل اسی طرح لرزنے لگے جیسے زلزلہ سے زمین لرزتی ہے۔ ہماری عقل نارسا نے بہتیری کوشش کی کہ اس عقدہ کو حل کر سکیں کہ آخر یہ موت ہے کیا۔ از کہ اس کا مشاہدہ ہم روز آنہ کرتے ہیں مگر اس کی ماہیت سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر ساری کوشش بے سود ثابت ہوئی موت کا راز راز ہی رہا تا آنکہ ہمارے "عقل" داڑھ نکل آئی اس داڑھ کا نکلنا تھا کہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ سمجھ کے دروازے کھل گئے اب جوان دروازوں میں سے عقل کی کوٹھری میں روشنی پہنچی تو موت کا مسئلہ بالکل صاف ہو گیا۔ اور ہم کو اپنی حماقت پر بہت ہنسی آئی کہ اتنی سی معمولی بات نے ہم کو اس قدر پریشان کر رکھا تھا۔ بات یہ ہے کہ عقل تو تھی نہیں اس لئے ناسمجھی سے نتیجہ کو سبب اور سایہ کو اصل سمجھ بیٹھے یعنی لوازمات موت کی بھول بھلیاں میں اصل موت کو ہی بہلا دیا۔ یعنی یوں سمجھئے کہ مرنیوالے کے کرب و بے چینی، پسماندگان کی وائے وبلا۔ اور عزیز و اقارب کے گریہ و ماتم کو ہم نے غلطی سے موت سمجھ لیا تھا حالانکہ موت ایک بالکل جداگانہ شئے ہے تو بھئی سچ یہ ہے کہ اس کو سمجھنے کا دار و مدار آپ کی عقل داڑھ

پر ہے اگر آپ کی یہ دالرھ نکل آئی ہے تو آپ سمجھ جائینگے ورنہ یہ مسئلہ ٹیڑھی کھیر ہی رہیگا۔ بیان کرنے میں ہم کو کوئی عذر نہیں۔ اس کی تشریح ایک قصہ سے بخوبی ہوجاتی ہے۔ لیجئے سنئے ... ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم حسب معمول شام کو کھیل کود کر گھر واپس آئے اور سیدھا اپنے کمرہ کا رخ کیا۔ دروازہ پر قدم رکھا بھی نہ تھا کہ ایک مہیب آواز نے کلیجہ ہلا دیا۔ بڑی مشکل سے حواس درست رکھکر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر جو دیکھا تو بس پیر تلے کی زمین نکل گئی۔ سامنے ایک نہایت ڈراؤنی اور بھیانک شکل نظر آئی جس کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا۔ جسم پر کمبل لپٹا ہوا۔ سر پر لمبے اور پریشان بال اور چہرے پر لمبی سفید داڑھی لٹکی ہوئی تھی خدا ہی بہتر جانتا کہ اگر یہ اوسان خطا کر دینے والا منظر اور تھوڑی دیر قائم رہتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ مگر غنیمت یہ ہوا کہ اس بھیانک صورت نے ایک فرمائشی قہقہہ کے ساتھ اپنے جسم اور چہرے پر سے وہ سب مصنوعی چیزیں اتار کر زمین پر پھینکدیں اور طعن آمیز لہجہ میں ہم سے یوں گویا ہوئی کہ "واہ بھائی صاحب کیا بہادری ہے" کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری چھوٹی بہن صاحبہ کھڑی ہم پر ہنس رہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم شرم سے پانی پانی ہوگئے تھے مگر بات بنانے کے لئے ہم نے کہا کہ تو ہم کوئی ڈرے تھوڑی" بات تو یہ بالکل معمولی سی تھی اور اوس وقت یہ قصہ بھی آیا گیا ہوگیا لیکن آگے چل کر یہی چیز ہمارے لئے بہت سبق آموز ثابت ہوئی کیونکہ اس نے موت کے سارے راز کو ہم پر کھول دیا۔ یعنی یوں سمجھئے کہ جس طرح ایک بھولی بھولی صورت موٹا سا کمبل۔ لمبے لمبے پریشان بال اور لمبی سی داڑھی لگا لینے سے ہیبتناک شکل ہوجاتی ہے اوسی طرح موت جیسی بھولی بھالی۔ نرم اور نازک شیشے پر گریہ و ماتم اور واویلا کا خوفناک نقاب پڑجانے سے وہ ڈراؤنی اور خطرناک شے معلوم ہونے لگتی ہے۔ ورنہ فی الحقیقت وہ کوئی خوفناک چیز نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو معاملہ بالکل برعکس ہے یعنی موت ایک نہایت نازک ہلکی پھلکی لطیف اور شکین وہ شیشہ ہے وہ ایک ننھی سی جان ہے پھول کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک۔ خیال سے زیادہ تیز اور حباب سے زیادہ ناثبات۔ بس ایک چھوئی موئی کا درخت ہے۔ ادھر ہاتھ لگا ادھر مرجھایا۔ اگر اب بھی سمجھ میں نہ آیا ہو تو یوں سمجھئے کہ آپ شمع ہیں اور موت پروانہ۔ آپ کے گرد وہ گھومتی رہتی ہے اور آپ کے شعلہ زندگی سے مس ہوتے ہی آپ پر اپنی جان نثار کر دیتی ہے اور خود جل کر خاک ہوجاتی ہے پھر اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا وہ خود ہمیشہ کیلئے فنا ہوجاتی ہے مگر تم کو غیر فانی بنا جاتی ہے اس غریب کی بیچارگی دیکھیے

کا تو یہ عالم ہے کہ ہمارا ہر تار نفس اوس کی جان کا لیوا ہے اور ہمارا ہر جذبہ اوس کے خون کا پیاسا۔ وہ بیچاری ان سب کے ظلم و ستم سہتی ہے مگر دم نہیں مار سکتی۔ یقین نہ آئے تو سنئے۔ ہمارا جذبۂ انتقام غالب آکر اوس کی ہستی فنا کر دیتا ہے۔ جذبۂ محبت انتظار سے تنگ آکر اوس کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے اور بالآخر اوس سے مل کر اوس کا خاتمہ کر دیتا ہے جذبۂ رقابت اوس پر حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے اور اوس کو پامال کر دیتا ہے۔ ننگ دناموس اوس کو اپنی آغوش میں لیکر اس طرح بھینچتی ہے کہ بیچاری کا دم نکل جاتا ہے۔ رنج و ملال اس کو لٹیتا ہے اور خاتمہ کر کے چھوڑتا ہے خوف و ہراس اس سے بغلگیر ہوتا ہے اور ہمیشہ کیلئے اس کو سلا دیتا ہے کیا اب بھی آپ کو موت کی بے بسی میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے مگر یہاں تو وہ مضمون ہے کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ہم خود موت کے شعلۂ زندگی کو ٹھنڈا کریں اور خود ہی شور مچائیں کہ موت نے ہم کو ختم کر دیا اور پھر لطف یہ کہ اوس کے نام سے ڈرتے بھی اس طرح ہیں جیسے ننھے ننھے بچے بیجا کے نام سے لرزتے ہیں بات یہ ہے کہ ہم نے اپنی ہمت اور جوانمردی کو کھو دیا ہے ہم اس پر غرور و فخر و ناز کرتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ایسے جوانمرد تھے کہ موت سے اس طرح کھیلتے تھے جیسے بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں لیکن سچ پوچھو تو ہم میں سے اپنے اسلاف کا وہ جوہر مفقود ہو گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری ہمتیں پست ہو گئی ہیں لیکن اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو خود تم کو اس بات پر تعجب بھی ہوگا اور ہنسی بھی آئیگی کہ انسان اور موت سے ڈرے۔ دراں حالیکہ وہ روزمرہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ موت یقینی اور اٹل شئے ہے کسی نہ کسی وقت اوس کا آنا ضرور ہے۔ دیر ہو یا سویر۔ پھر آخر اوس سے ڈرنے اور بچنے کی فکر کیوں کی جائے۔

ہم کو یاد ہے کہ ایکمرتبہ ہمارے ماسٹر صاحب ہم کو [illegible] پڑھا رہے تھے اور موت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے تھے مگر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ موت فی نفسہ چیز کیا ہے آخر ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے کھڑے ہوکر ماسٹر صاحب سے پوچھا۔

ہم۔ ماسٹر صاحب آخر موت ہے کیا چیز۔

ماسٹر صاحب۔ انتقال مکانی۔

ہم۔ انتقال مکانی کے کیا معنی؟

ماسٹر صاحب ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانا۔

ہم ۔ صاحب موت کو اس سے کیا تعلق ۔

ماسٹر صاحب ۔ وہی تعلق ہے جو تم کو اپنے گھر اور مدرسہ سے ہے۔

ہم ۔ سمجھ میں نہیں آیا صاحب ۔

ماسٹر صاحب ۔ بھئی یعنی جس طرح تم صبح کو اٹھکر اپنا گھر چھوڑ کر مدرسہ آجاتے ہو اور شام کو واپس گھر چلے جاتے ہو یا جس طرح ایک ملازم سرکار کا تبادلہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں ہو جاتا ہے اوسی طرح تم اس دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں چلے جاتے ہو بس اسی کا نام انتقال یا موت ہے

ہم ۔ صاحب اگر موت ایسی ہی سیدھی سادھی اور بے ضرر شئے کا نام ہے تو پھر انسان اس سے ڈرتا کیوں ہے ۔

ماسٹر صاحب ۔ سوال تمہارا نہایت دلچسپ ہے۔ مگر پہلے اسی سوال کا جواب تم خود دو ۔ تم میں سے ہر لڑکا جو جواب چاہے دیسکتا ہے۔

ایک لڑکا ۔ صاحب ہم موت سے اس وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ہم کو اپنے مال و دولت اور املاک سب سے جدا ہونا پڑتا ہے ۔

ماسٹر صاحب ۔ سچ ہے ۔ مگر ذرا مہربانی کرکے یہ تو بتاؤ کہ یہ چیزیں تمہاری ہوئیں کیونکر ۔ ذرا غور تو کرو کہ ہم تم کو مدرسہ میں کھیلنے کیلئے کرکٹ وغیرہ کا سامان دیتے ہیں یا سائینس کے تجربہ کرنے کے لئے اور بہت سی قیمتی چیزیں دیتے ہیں ۔ تم اون کو استعمال کرتے ہو ۔ توڑتے پھوڑتے بھی ہو ۔ مگر کیا وہ چیزیں تمہاری ملکیت ہو جائینگی یہ دوسری بات ہے کہ تم صرف پہچان کیلئے ان پر اپنا اپنا نام بھی لکھ لو مگر درحقیقت نام لکھ لینے سے وہ تمہاری نہیں ہو جائینگی سرکاری رقم سے جو چیز خریدی جائیگی وہ سرکاری ہی رہیگی اور بالفرض اگر وہ تمہاری ملکیت بھی ہیں تو مرنے کے بعد تم کو اون سے کیا تعلق اور فائدہ ۔ دنیا میں تم جس طرح خالی ہاتھ آئے تھے اوسی طرح خالی ہاتھ جاؤ گے اور یہ چیز تم روزآنہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہو مگر تعجب ہے پھر بھی اس سے سبق نہیں لیتے میاں بڑے بڑے بادشاہ بھی اسی طرح خالی ہاتھ چلے گئے جیسے کہ غریب اور فقیر لوگ ۔ دنیا کا نظام ہی یہ ہے ۔ دنیا میں انسان پیدا ہوتا ہی ہے مرنے کے لئے اس مرنے اور جینے کا نام دنیا ہے۔ اگر موت نہ ہو تو پھر زندگی کا لطف ہی کیا رہے ۔ صحت کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ ہم بیمار پڑتے ہیں ۔ سورج کی روشنی کے ہم مشکور

ادمی وقت ہوتے ہیں جب اندھیرے میں ٹھوکر کہاتے ہیں۔ یہی حال موت کا ہے۔ اسلیے یوں سمجھو کہ موت بھی بالکل ایسا ہی ایک قدرتی امر ہے جیسے پیدائش پھر آخر اس سے کیوں ڈرتے ہیں؟ موت سے ڈرنے کی تم نے جو وجہہ بیان کی وہ تو بہت کمزور بلکہ بالکل ناقص ہے۔ اس کے علاوہ کوئی وجہہ بتاسکتے ہو؟

ایک اور لڑکا۔ صاحب۔ بعض اوقات ہم کو یہ خیال آتا ہے کہ اگر ہمارے والدین یا سرپرست مرگئے تو ہم بے سہارا ہوجائینگے اور اب جس طرح آرام وچین سے زندگی بسر کرتے ہیں وہ بات نہ رہیگی۔

ماسٹر صاحب۔ یہ تو تم نے خالص مذہبی مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس کا جواب تو تمہارے دینیات کے مولوی صاحب اچھی طرح دےسکتے ہیں۔ ہماری رائے میں تو تمہارا یہ سوال عقائد کی کمزوری پر مبنی ہے اس لیے کہ خود قرآن شریف میں اللہ میاں نے والدین کو اولاد کے قتل سے باز رہنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم کو بھی ہم ہی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ تو جب رزق مقسوم ہے اور خدا مسبب الاسباب تو وہ اس کو پہنچانے کے لئے کوئی کوئی سبب بھی پیدا کرلیگا۔ مگر کہیں اس کے یہ معنی نہ لے لینا کہ ہم کو اس وجہ سے والدین کی تعظیم وتکریم ہی کرنے کی ضرورت نہیں سوہ تو ہمارا فرض ہے اور نہ اس کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ ہم روزی پیدا کرنے کیلئے کوشش ہی نہ کریں۔ اور غلطی سے یہ باور کرلیں کہ اللہ میاں چھپر پھاڑ کر دیدیگا۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اللہ میاں مسبب الاسباب ہیں۔ ہم کو رزق پہنچانے کے لئے کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیں گے۔ ہاں ہمارا فرض یہ ہے کہ محنت ومشقت سے روزی پیدا کریں۔ عزت کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ مگر یہ خیال کرنا کہ والدین کے بعد ہم کو روزی کون دیگا۔ رزاق حقیقی کی شان میں سوءظن ہے۔ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے اور اس کی تکمیل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بس اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ اگر اس چیز کو تم نے سمجھہ لیا تو گو یا تمہارے سوال کا جواب ملیگا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم میں سے ایسا بھی کوئی لڑکا ہے جس کے والدین بچپن ہی میں مرگئے ہوں اور وہ بقول تمہارے بے سہارا ہوگیا ہو۔

ہم۔ جی ہاں صاحب میں ہوں!

ماسٹر صاحب۔ اچھا تو تم یہ بتاؤ کہ تمہارا گذر کیسے ہوا۔

ہم۔ صاحب یقین کے ساتھ تو کچھہ نہیں کہہ سکتا مگر خود بخود کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ

گذر ہی گئی مگر سچ یہ ہے کہ تکلیف سے بسر ہوئی۔

ماسٹر صاحب۔ اچھا ذرا سوچ کر یہ بتاؤ کہ اس تکلیف سے تم کو کسی قسم کا فائدہ بھی ہوا۔

ہم۔ ہاں صاحب۔ بہت۔

ماسٹر صاحب۔ وہ کیا؟

ہم۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ ہم خود اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھ گئے جس کی وجہ سے خود اعتمادی کا مادہ پیدا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے نشیب و فراز سے واقف ہو گئے۔

ماسٹر صاحب۔ بہت خوب۔ بس یہی چیز ہے جو میں تم کو سمجھانا چاہتا تھا۔ یعنی بات یہ ہے کہ آجکل موجودہ زمانہ کی روش ایسی ہے کہ والدین اور استاد بچوں کی مذہبی تعلیم کی طرف کما حقہ متوجہ نہیں ہوتے اور مذہبی تعلیم ناقص رہنے کی وجہ سے ہمارے عقائد خراب ہو جاتے ہیں اب دیکھو کہ یہ کتنی کھلی ہوئی بات ہے کہ بعض اوقات تم ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہو مگر وہ تمہارے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے اور بعض اوقات ایک چیز کو تم خراب سمجھتے ہو مگر وہی تمہارے لئے باعث برکت ہو جاتی ہے اپنے ساتھی پر ذرا غور کرو بچپن میں مصیبتیں جھیلنے سے کس قدر فائدہ حاصل ہوا۔ بظاہر یہ خراب چیز معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت وہی چیز ان کے حق میں سبق آموز ہو گئی اس کے برعکس ان دولتمندوں کی حالت پر غور کرو جو صبح سے شام تک دولت میں رولتے ہیں اور بالآخر شراب و کباب کی بدولت اپنی ساری عمر برباد کر لیتے ہیں تو شاید اب تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی اور وجہ بتا سکتے ہو؟

ایک اور لڑکا۔ صاحب مرنے کے بعد ہمارے ماں۔ باپ۔ بھائی بہن اور دوسرے عزیز و اقارب جن کے ساتھ ہم ہمیشہ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور جن سے ہم کو محبت ہو جاتی ہے ان سب سے ہم جدا ہو جاتے ہیں۔

ماسٹر صاحب۔ دیکھو تمہارا یہ خیال ایک اصولی غلطی کا نتیجہ ہے۔ یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ دنیا کا نظام تمہاری مرضی کے موافق چلے۔ اس کے برعکس اگر تم خود اپنی مرضی کو نظام عالم کے تابع کر دو تو کچھ جھگڑا ہی نہیں ہے یعنی جس طرح دنیا میں واقعات رونما ہوتے جائیں تم ان کو تسلیم کرتے رہو۔ اب دیکھو دنیا کا نظام ہی یہ ہے کہ انسان کا مرنا بھی اتنا ہی برحق ہے جتنا کہ خود اوس کا وجود۔ اس میں شک نہیں کہ عزیز و اقارب کی

جدائی سے ہم کو رنج ضرور ہوتا ہے مگر ڈر کی تو کوئی وجہ نہیں جب ایک چیز لازمی طور پر واقع ہونیوالی ہے تو تم کو ہر وقت اس کا منتظر اور اس کے سننے کیلئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے اس کے علاوہ یہاں بھی عقیدہ کی تھوڑی سی بحث آجاتی ہے یعنی اگر تم کو خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے اور تمہارا ایمان ہے کہ مرنے کے بعد خالق کا دیدار نصیب ہوگا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ خدا اور رسولؐ کی محبت دنیا والوں کی محبت پر غالب آجائیگی اور تم کو مرنے میں بھی ایک قسم کی راحت محسوس ہوگی۔ موت سے ڈرنیکی کوئی اور وجہ بتا سکتے ہو ؟

ہم ۔ ہم موت سے اس خیال سے ڈرتے ہیں کہ معلوم نہیں مرنے کے بعد ہمارا کیا حشر ہو ؟

ماسٹر صاحب ۔ بھئی واہ کیا مضحکہ خیز بات ہے ذرا سوچا بھی کہ کیا کہہ رہے ہو ؟

ہم ۔ کیوں صاحب اس میں کیا بات ہے ؟

ماسٹر صاحب ۔ میاں بات یہ ہے کہ تم نے ذرا غور سے کام نہیں لیا ! اصل اور سایہ میں فرق نہیں کر سکے اچھا ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ فرض کرو بادشاہ سلامت تم کو یاد فرماتے ہیں اور چوبدار تم کو بلانے آتا ہے تم کو یہ نہیں معلوم کہ بادشاہ سلامت نے کیوں یاد فرمایا ہے ایسی صورت میں یہ بتاؤ کہ تم کس سے ڈروگے ؟

ہم ۔ صاحب اوّل تو ہم چوبدار کی شکل ہی سے ڈر جائیں گے !

ماسٹر صاحب ۔ سچ ہے مگر سوال یہ ہے کہ تم کو دراصل ڈرنا کس سے چاہئے ۔ بادشاہ سے یا چوبدار سے !

ہم ۔ دراصل تو ہمیں بادشاہ سے ڈرنا چاہئے کہ معلوم نہیں کیوں یاد فرمایا ہے ۔ چوبدار سے تو ڈرنیکی کوئی وجہ نہیں ۔

ماسٹر صاحب ۔ بالکل ٹھیک ! اب ذرا سوچو تو سہی کہ تم نے کیا جواب دیا تھا ۔ موت کو تو یوں سمجھو کہ وہ ایک چوبدار ہے جو تم کو مالک دوعالم کے دربار میں لیجاکر پیش کرتا ہے تو یہاں تک معاملہ صاف ہے یعنی یہ کہ موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ۔ البتہ تمہارا ڈر یہ ہے کہ معلوم نہیں تمہارا کیا حشر ہو ۔ اس کی نسبت یہ فرض کرو کہ کل ہم نے تم کو گھر سے لکھکر لانے کے لئے ایک مضمون دیا تھا ۔ تم میں سے بعض تو لکھکر لے آئے ۔ بعض لکھنا بھول گئے ۔ اور بعض نے اپنی غفلت و لاپرواہی کی وجہ سے لکھنے کی پرواہ

ہی نہیں کا، تو یہ بتاؤ اب جو تم ہمارے سامنے آؤ گے تو کس طرح آؤ گے ؟

ہم۔ صاحب جنھوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے وہ تو خوشی خوشی آپ کے سامنے آئینگے بلکہ قریب پہنچنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرینگے۔ جو لکھنا بھول گئے وہ آپ کے سامنے آتے ہوئے شرمائینگے۔ اور جنھوں نے کاہلی کی وجہ سے عمداً حکم کی تعمیل نہیں کی ہے وہ خوف زدہ ہوں گے اور یہی چاہینگے کہ سامنا ہو ہی نہیں۔

ماسٹر صاحب۔ شاباش۔ تو گویا اس کے یہ معنی ہوئے نا کہ وہ ہمارے سامنے آنے سے اس وجہ سے ڈرتے ہیں کہ اونھوں نے ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی اگر وہ اپنا مفوضہ کام انجام دے لیتے تو پھر ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

ہم۔ جی ہاں صاحب یہی وجہ ہے

ماسٹر صاحب۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر ہم خاطیوں کو سزا دیں تو اوس کی نسبت تمہاری کیا رائے ہوگی۔

ہم۔ صاحب وہ سزا بالکل حق بجانب ہوگی!

ماسٹر صاحب۔ اور اگر ہم اون کی خطا معاف کردیں ؟

ہم۔ تو یہ آپ کی رحمدلی ہوگی!

ماسٹر صاحب۔ اس کا اثر کیا ہوگا ؟

ہم۔ جو شریف طبیعتیں ہیں اون پر بہت اچھا اثر ہوگا۔ اور وہ شرمندہ ہوکر آئندہ احتیاط کرینگے مگر جو خراب لوگ ہیں وہ اس رحمدلی سے بیجا فائدہ اٹھائینگے اور بالآخر سزا پاکر راہ راست پر آئینگے۔

ماسٹر صاحب بالکل ٹھیک۔ اب ذرا ان باتوں کو پیش نظر رکھکر اپنے ابتدائی سوال پر غور کرو کہ موت سے ڈرنا چاہئے ؟!

ہم۔ نہیں صاحب۔ البتہ خدا سے ڈرنیکی ضرورت ہے مگر۔ یہی اوس صورت میں جب کہ ہم اوس کے حکم کی تعمیل نہ کریں۔

ماسٹر صاحب۔ تو میاں جب تم کو یہ معلوم ہے کہ عدول حکمی کی صورت میں سزا دی جائیگی اور اوسی کے

تم ڈرتے ہو تو پھر ایسی صورت ہی کیوں پیش آنے دیتے ہو؟ اسی کو تو کہتے ہیں کہ "چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"۔

ہم۔ جی ہاں صاحب۔ اب تو یہ مسئلہ بالکل صاف ہو گیا!

ماسٹر صاحب۔ ہاں صاف تو ہو گیا مگر آؤ ذرا اس کو کسی قدر شاعرانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں۔ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ بلحاظ ادائی فرائض تم میں اور موت میں کون افضل ہے۔ ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ تم میں اور موت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پس اپنے آپ کو عبد کہتے ہو مگر معبود کے حکم کی کماحقہٗ تعمیل نہیں کرتے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس پر نادم بھی نہیں ہوتے۔ دنیا والوں سے ڈرتے ہو۔ دولتمند اور با اثر لوگوں کی رعائیت کرتے ہو غریب اور بیکس لوگوں کے حقوق پامال کرتے ہو۔ بڑے لوگوں کے آگے عجز کرتے ہو۔ چھوٹے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ مگر اس کے برعکس موت کو دیکھو کس قدر استقلال اور مستعدی سے اپنا کام کرتی ہے۔ حکم کی تعمیل میں ذرا بھی چوں و چرا نہیں۔ امیر و غریب گورے کالے اور جوان بوڑھے کسی میں بھی امتیاز نہیں کرتی۔ ہر ایک کے پاس مساویانہ طور پر جاتی ہے۔ بڑے بڑے سرکش اور مطلق العنان بادشاہوں اور غریب سے غریب لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔ نہ کسی کے رعب میں آتی ہے اور نہ کسی کی رو رعائیت کرتی ہے۔ اوس کے عزم و استقلال کا یہ حال ہے کہ کوئی چیز اوس کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔ پہاڑ ہو یا سمندر۔ ہوا ہو یا زمین قلعہ ہو یا جھونپڑی وہ سب مشکلات پر حاوی ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اوس کو اوس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ تم اس سے بچنے کیلئے جنگل میں جا کر چھپو یا غاروں میں۔ مستحکم قلعہ میں پناہ گزیں ہو یا جھونپڑی میں۔ ہوا میں اڑ جاؤ یا زمین میں دھنس جاؤ۔ موت اپنا فرض انجام دئے بغیر نہیں رہتی اور اوس کا فرض کیا ہے؟ بس یہی کہ اللہ میاں کی ایک امانت کو تم سے لیکر مالک حقیقی کے سامنے پیش کرنا۔ اسی امانت کو حاصل کرنے کے لئے وہ اللہ میاں کی طرف سے بھیجی جاتی ہے اور تمہاری نیت کی یہ حالت ہے کہ دنیا والے تو ایک طرف خود اللہ میاں کی امانت کو بھی جدا کرنا گوارا نہیں کرتے خیر اوس کو بھی جانے دو۔ یہ تو بتاؤ کہ جس وقت موت مالک حقیقی کے سامنے تم پر خود غرضی اور احسان فراموشی کا الزام لگائیگی تو تم کیا جواب دوگے۔ موت واقعی ایثار و قربانی کی دیوی ہے اور تم محسن کش ہو۔ اوس کا ایثار فی الحقیقت قابل تعریف ہے وہ اپنی ہستی کو فنا کر کے تم کو تمہارے رب کے سامنے پہنچا دیتی ہے اور تم الٹا اس کو برا کہتے ہو۔ یہ تمہاری نادانی ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ

موت منتقم کو فنا کردیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ تم کو ہمیشہ کے لئے زندہ کردیتی ہے۔ غیر فانی بنا دیتی ہے اور خود فنا ہوجاتی ہے مگر تم اس قدر احسان فراموش ہوکہ اوس کی اس قربانی کی قدر نہیں کرتے۔ واقعی بڑے افسوس کی بات ہے کہ انسان نے موت کی قدر و قیمت اور اس کے احسانات کو نہیں سمجھا اگر سمجھ لیتا تو اوس کے آگے ہمیشہ سرنگوں ہی رہتا۔ اور اس کے بار احسان سے کبھی سکلدوشی نہ ہوتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ سچ پوچھو تو موت دار البقا کا دروازہ ہے کہ ادھر تم نے اس میں قدم رکھا اور ادھر حیات ابدی میں داخل ہوئے یا یوں سمجھو کہ وہ ایسی بندرگاہ ہے جہاں زندگی کے طوفان میں ہماری حیات کی شکستہ کشتی کو پناہ ملتی ہے وہ ایسی پگڈنڈی ہے جو راہ بھٹکے مسافروں کو منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ غرضیکہ موت مصیبت زدوں کا آرام و چین بے یار و مددگار کی مونس و غمخوار تھکے ماندوں کا آرام اور بیکس و لاچاروں کی غمگسار ہے۔ وہ اس شخص کی نجات دہندہ ہے جس کو خود آزادی بھی آزاد نہیں کرسکتی وہ اون مریضوں کی طبیب ہے جن کے درد و دکھ کو درد سے شفا نہیں ہوسکتی وہ اون لوگوں کی تسکین ہے جن کو زمانہ آرام و چین سے نہیں بیٹھنے دیتا اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے رات بھر سونے کے بعد صبح کو بیدار ہونا۔ یا صبح کو طلوع ہونے کیلئے شام کو آفتاب کا غروب ہونا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سے نکل کر خیرہ کن روشنی میں پہنچ جانا۔ اور یا سورج کی روشنی میں ستاروں کا اوجھل ہوجانا۔ قصہ مختصر یہ کہ جسم کے زندان سے روح کے آزاد ہونے کا نام موت ہے تو کیا آزادی کے دلدادہ انسان کو روح کی اس آزادی سے ڈرنے یا خائف ہونیکی کوئی وجہ ہے نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ انسان اپنے کردار کو ٹھیک کرے کیونکہ جب کردار ٹھیک ہوگیا تو گویا حساب صاف ہوگیا اور "آں راکہ حساب پاک است محاسب را چہ باک"۔ ایسی حالت میں انسان کو موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ ملک الموت صاحب جس وقت چاہیں تشریف لے آویں وہ ایسے شخص کو ہمیشہ تیار پائیں گے۔

اگر کسی عنایت کا بدل اعتراف شکر ہے تو ہم ممنون ہیں نواب ناظم علی خاں صاحب سوم تعلقدار ورنگل اور نواب جعفر علی خاں صاحب نائب مددگار کروڑگیری اورنگ آباد کے جنھوں نے خریداروں کی فراہمی سے اعانت کی ہے۔

غزل

جناب ضامنؔ صاحب کنتوری

ہیں جو آج نفسِ خدا ہونیوالے
خدا جانے وہ کل ہیں کیا ہونیوالے

ہیں راہِ رضا میں فنا ہونیوالے
بہارِ ریاضِ بقا ہونیوالے

قتیلِ محبت نہ کیوں کر ہو عاشق!
ہیں وہ آپ جب خوں بہا ہونیوالے

ہے کافی ہمیں بس کفایت انہیں کا
جو ہیں مقصدِ قُل کفیٰ ہونیوالے

کسی کے کرم نے روا کر دئے سب
مرے کام تھے نا روا ہونیوالے

ہے بے بُود ساری نمود اضافے
خدا سے ڈریں خود نما ہونیوالے

ہے وہمِ نظر اتحادِ حلولی
جدا ہی رہینگے جدا ہونیوالے

دیا جو اُسے لے لیا شکر کر کے
ترے دین ہیں کب ادا ہونیوالے

خطا کار تھے اک زمانہ کے ضامنؔ
وہی ہیں رہینِ عطا ہونیوالے

ضبطِ اولاد

جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب ایچ سی ایس ۔ ناظم عدالت

کچھ زمانہ پہلے ناجائز تعلقات کے نتائج کو پوشیدہ رکھنے میں چند در چند مشکلات کا سامنا ہوتا تھا ۔ جسمانی آثار اور وضع حمل کے خوف سے اکثر عورتیں جنسی بدعنوانیوں سے پرہیز کرتی تھیں جن عورتوں نے جذبات سے مغلوب ہوکر احتیاط کو ہاتھ سے کھودیا ان کو انواع و اقسام کے مصائب برداشت کرنے پڑے استقرار حمل کی موثر تدبیر اختیار کرنے کیلئے کسی ماہرفن سے مشورہ کی ضرورت پڑتی تھی ۔ عورت کی فطری شرم اس راز کو دوسرے پر ظاہر کرنے میں حائل ہوتی تھی ایسا بھی ہوا ہے کہ حمل گرانے کی خاطر بعض عورتوں نے عطائی ادویات کا استعمال کیا اور بیمار ہوکر جان دیدی یا افشائے راز اور بدنامی کے خوف سے خودکشی کرلی ۔ یا کوئی تدبیر اختیار نہیں کی اور جب راز آشکار ہوا تو سوسائٹی میں رسوائی اور ذلت اٹھانی پڑی ۔ ایسے واقعات بھی سماعت میں آئے ہیں کہ مرد نے ذمہ داریوں سے بچنے کیلئے عورت اور بچے کو مار ڈالا الغرض اخفائے راز آسان بات نہ تھی ۔ غیر متمدن اقوام میں اب بھی عورتیں خانگی علاج کرواکر اپنی زندگی خدشہ میں ڈال دیتی ہیں ۔ لیکن شائستہ ممالک میں سائنس کی ترقی نے ضبط حمل کی ایسی بیشمار چیزیں ایجاد کردی ہیں ۔ جو سستے داموں پر بے روک ٹوک بازاروں میں فروخت ہوتی ہیں ۔ ہم چند واقعات ایسے بیان کرینگے جن سے معلوم ہوگا کہ جس زمانہ میں ضبط حمل کی موثر تدابیر عام نہ تھیں اخفاء راز کیلئے کیسے کیسے جرائم سرزد ہوتے تھے ۔ اب یورپ و امریکہ میں ایسی صورتیں بہت کم پیش آتی ہیں ۔ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ایک شخص انڈریو میکرے اپنی معشوقہ کے قتل کی علت میں پھانسی چڑھایا گیا ۔ واقعات یہ ثابت ہوئے کہ وہ برمنگھم میں مع بیوی بچوں کے رہا کرتا تھا ۔ شامت اعمال سے ایک ہمسایہ لڑکی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے ۔ لڑکی کے بھائی کو علم ہوا تو اس نے دونوں کو لعنت ملامت کی علاوہ بریں بیوی کو بھی ان باتوں کی خبر لگ گئی ۔ عشق کی آگ کچھ ایسی بھڑک چکی تھی کہ دونوں نے ترک وطن کا قصد کرلیا ۔ اور بہانہ کرکے ایک دوسرے شہر میں چلے گئے ۔ وہاں فرضی نام کے ساتھ رہنے لگے عورت حمل سے

ہوگئی میکرے نے اس کو ایک مقامی زچگی خانہ میں بھجوا دیا۔ زچگی سے فارغ ہو کر جب معشوقہ بچے کو ساتھ لیکر نکلی تو میکرے کو انجام کا خیال دامنگیر ہوا۔ اس نے سوچا کہ اول تو بیوی کو طلاق کیلئے ثبوت ملیگا دوسرے معشوقہ بچہ کی پرورش کیلئے اخراجات کی طلبگار ہوگی بہتر یہی ہے کہ دونوں کا خاتمہ کردو چنانچہ اسی دن ظالم نے ماں اور بچہ کو ہلاک کر دیا۔

تقریباً اسی زمانہ میں ایک شخص جان ریڈ اپنی معشوقہ کے قتل کی علت میں سزایاب ہوا۔ شادی شدہ اور آٹھ بچوں کا باپ تھا محلہ میں ایک عورت مسز آئرس رہا کرتی تھی اگرچہ شوہر والی تھی لیکن جان ریڈ کے عشق میں مبتلا ہوگئی اس سے حمل ہوا۔ مگر منکوحہ ہونیکی وجہ سے کسی نے شبہ نہیں کیا۔ مسز آئرس زچگی کے سلسلہ میں بیمار بھی پڑگئی۔ جان ریڈ عاشق مزاج تھا۔ مسز آئرس سے فرصت ملی تو اس کی نوعمر اور ناکتخدا بہن سے عشق شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد اس سے بھی جی بھر گیا تو ایک اور لڑکی سے تعلق کر لیا۔ اس سے ایک بچہ ہوا۔ ریڈ کو پرورش کا بار اٹھانا پڑا۔ سارا عشق کافور ہوگیا اس مصیبت سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ مسز آئرس کی بہن بھی حمل سے ہوگئی۔ اس نے پریشان ہو کر رازداری کے ساتھ ریڈ کو اطلاع دی کہ زچگی اور بعد کے اخراجات کا بندوبست کرو۔ اس خبر سے ریڈ کے ہوش جاتے رہے۔ جانتا تھا کہ زچگی کے بعد قانونی اور اخلاقی ذمہ داریاں عاید ہونگی۔ بالآخر سنگدل نے اس لڑکی کا خاتمہ کر دیا۔

ایک تعلیم یافتہ اور شریف خاندان کا شخص جان بولٹن اپنی بیوی اور چھ بچوں کے ساتھ چین کی زندگی بسر کرتا تھا۔ بدقسمتی سے ایک خوبصورت دس سالہ لڑکی کی پرورش اپنے ذمہ لیلی۔ یہ لڑکی جوان ہوئی تو اس سے تعلق ہوگیا۔ حمل کے آثار نمودار ہونے پر پریشانی لاحق ہوئی۔ اسقاط حمل کیلئے کچھ دوا دی۔ مگر کارگر ثابت نہ ہوئی آخر کار بدنامی سے نجات پانیکی خاطر ایک دن اس لڑکی کو ہلاک کر دیا۔ مقدمہ ثابت ہونے پر پھانسی کی سزا ہوئی تعمیل سزا کے قبل خودکشی کرکے محبس ہی میں مرگیا۔

راقم کے اجلاس پر پولس نے ایک مقدمہ پیش کیا تھا۔ واقعات یہ ظاہر ہوئے کہ ملزمہ غیر شادی شدہ تھی کسی کے ساتھ ناجائز تعلق ہو جانے کی وجہ سے حمل ٹھیر گیا۔ اس کا ٹنگ سے لبکہ کو وہ آخر وقت تک چھپاتی رہی۔ وضع حمل ہوتے ہی نوزائیدہ کا گلا گھونٹ کر اپنے پلنگ کے نیچے دفن کر دیا۔ بعض حالات کی بناء پر قریب کی عورتوں کو شبہ ہوا۔ رفتہ رفتہ بات پھیلی۔ پولس نے لاش برآمد کر لی عورت نے جرم سے اقبال کیا۔

ایک نوجوان عورت ایلیزبیتھ شیوانا ایک بیرسٹر مسٹر وارڈ کے پاس ملازم تھی۔ بیرسٹر صاحب اپنی بیوی کی

چوری سے عشق بازی کے مزے لوٹتے رہے۔ ایلیز بیتھ پیٹ سے ہوئی تو اس کیلئے علیحدہ مکان کا بندوبست کیا گیا زچگی کے تین مہینے بعد تک بیرسٹر صاحب ماں اور بچہ کی پرورش کرتے رہے۔ شدہ شدہ یہ خبر بیوی کے کانوں تک پہنچی تو اس نے ایلیز بیتھ کو بدنام کرنا شروع کیا۔ ایلیز بیتھ نے جب دیکھا کہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے تو اپنی رسوائی کا خیال اس قدر غالب ہوا کہ شیر خوار بچہ کو مار ڈالا۔ بعد میں خود ماخوذ ہو کر پھانسی چڑھائی گئی۔

آج کل ترقی یافتہ ممالک میں ضبط حمل کی مدبیر عام طور پر سب کو معلوم ہے اس ایجاد اور سہولت نے سیہ کاری کا دروازہ پہلے سے زیادہ کھول دیا۔ استقرار حمل کا جو خوف اس گناہ سے باز رکھتا تھا اب باقی نہیں رہا۔ فی زمانہ عورتیں بظاہر پاکدامن بنی رہتی ہیں لیکن در پردہ زندگی کا لطف دل بھر کے اٹھاتی ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ لندن میں ایک پر لطف واقعہ پیش آیا۔ ایک نو عمر عورت موٹر سے اتر کر کسی مکان کی طرف عجلت کے ساتھ جا رہی تھی۔ اتفاق سے ہینڈ بیگ ہاتھ سے گر کر کھل گیا۔ سب چیزیں زمین پر بکھر گئیں۔ راستہ چلنے والوں نے ہمدردی کے خیال سے ان کو اٹھانا شروع کیا۔ ان میں ضبط حمل کی اشیاء بھی تھیں۔ مخرز عورت ایسی شرمندہ ہوئی کہ ہینڈ بیگ چھوڑ موٹر میں بیٹھ کر غائب ہو گئی پتہ نہ چلا کہ یہ عورت کون تھی۔ لندن کی ایک بڑی دکان میں کچھ زیور چوری گیا۔ مالک دکان نے اچانک طور پر ملازمین دکان کی تلاشی لی۔ متعدد نوجوان لڑکیاں اس دکان میں کام کرتی تھیں جب ان کے بٹوے کھولے گئے تو اکثر کے پاس سے اسی قسم کی چیزیں برآمد ہوئیں۔ ہندوستان میں راولپنڈی ایک ممتاز فوجی مرکز ہے راقم کے ایک دوست انگریزی ادویات کی تجارت کرتے تھے۔ یوروپین فوجی ملازمین سے ان کے تعلقات خاص تھے۔ زمانہ جنگ میں راقم کو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ اکثر یوروپین مرد اور عورتیں ان سے بھی چیزیں خریدا کرتے تھے خریداروں میں بعض عورتیں ایسی تھیں کہ ان کے شوہر میدان جنگ میں مصروف تھے ان عورتوں کی پاکدامنی کے متعلق کبھی کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا تھا۔ یہی دوست کہتے تھے کہ جب سے جنگ شروع ہوئی حمل روکنے کی چیزیں کثرت سے فروخت ہونے لگیں۔ جج لنڈسے لکھتے ہیں کہ امریکہ میں سالانہ تین کروڑ پچاس لاکھ واقعات ناجائز تعلقات کے شمار کئے گئے ہیں ان میں صرف دس فیصدی ایسے ہوتے ہونگے کہ حمل قرار پانے کی نوبت آئے پھر بھی سالانہ دس لاکھ پچاس ہزار حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں نیز موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہائی اسکول کی ان (۴۹۵) لڑکیوں کے منجملہ جنھوں نے ان کے سامنے

جنسی تعلقات کا اعتراف کیا۔ صرف پچیس ۲۵ کے قریب حاملہ ہوئیں۔ بقیہ اپنی بدعنوانیوں کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب رہیں۔ کیونکہ ان کو ضبط حمل کی تدابیر سے کافی واقفیت تھی۔

ہماری رائے میں ضبط ولادت کی تدبیر کو اگر مناسب موقع پر اختیار کیا جائے تو قابل اعتراض نہیں ہے۔ مثلاً اولاد کی کثرت ہے اور آمدنی اس قدر نہیں کہ زیادہ بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام معقول طریقہ پر کیا جاسکے۔ بیوی دائم المریض ہے۔ زچگی کے متواتر حملوں کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کی زندگی کا خطرہ ہے ایسی صورتوں میں حمل کی انسدادی تدابیر مفید ہوتی ہیں۔

اکثر اوقات ضبط ولادت کا مسئلہ سیاسی اور اقتصادی حالات پر موثر ہوتا ہے کبھی مردم شماری کو بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی افزائش نسل خرابیاں پیدا کرتی ہیں آبادی اور پیداوار میں تناسب کا قایم رکھنا بھی ایک ضروری چیز ہے کسی زمانہ میں بز ان کی ابادی بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ ذرایع آمدنی کم ہونیکی وجہ سے افلاس ترقی پر تھا مجبور ہو کر حکومت نے افزائش نسل کی روک تھام کیواسطے تدابیر اختیار کیں کہتے ہیں کہ اس پالسی کا نتیجہ اخلاق کیلئے اچھا نہیں ہوا۔ فاحشہ عورتوں کی گرم بازاری ہوگئی۔ خلاف وضع فطری عمل فیشن میں داخل ہوگیا۔ لیکن یہ ذکر اس وقت کا ہے جبکہ ضبط حمل کی تدابیر سے لوگ واقف نہ تھے۔ جنگ عظیم کے بعد سے فرانس نے افزائش نسل کی ضرورت کو محسوس کیا۔ مانع حمل تدابیر کو اختیار کرنا جرم قرار دیا۔ ولادت کی تعداد میں اضافہ کرنے کیلئے ترغیبی قواعد مرتب کئے۔ انگلستان میں صورت اس کے برعکس ہے۔ تحریک ضبط حمل کی تائید میں عورتیں باضابطہ طریقہ پر کام کررہی ہیں۔

ہندوستان کی مجلس وضع قوانین کے ایک ممبر مسٹر جاد ہو نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہندوستان کی عورتیں غیر معتبر ذرائع سے حمل ساقط کرواکر اپنی جان خدشہ میں ڈال دیا کرتی ہیں اس لئے مناسب ہوگا کہ ڈاکٹروں کو ناجائز حمل ساقط کرنے کا اختیار دیا جائے دیکھنا چاہئے کہ اس تجویز کا خیر مقدم کس طرح کیا جاتا ہے۔

ضبط ولادت کے متعلق ہندوستان کی عورتوں کے خیالات میں بھی انقلاب پیدا ہوتا جارہا ہے اس کا اندازہ اس تحریک سے بخوبی ہوتا ہے جو آل انڈیا نسوانی کانفرنس کراچی کے اجلاس میں بغلبۂ آرا منظور ہوئی۔

پچاس رائیں تحریک کی تائید میں اور بیس مخالف تھیں۔ تحریک کا مضمون یہ تھا کہ کانفرنس کو پورا اطمینان ہے کہ اس ملک کی عورتوں کے کمزور قوی شیرخوار بچوں کی اموات میں زیادتی۔ اور عام افلاس کے مدنظر اس امر کی ضرورت ہے کہ مصدقہ ماہرین فن کے ذریعہ عورتوں کو ضبط حمل کی تدابیر سے آگاہ کیا جائے۔ تحریک پیش کرتے وقت مسز ہرد جتی مہتا نے اپنی تقریر کے سلسلہ میں کہا۔ "ضبط ولادت کے خلاف ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بدچلنی میں اضافہ ہو جائیگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاشرت کی ہر رسم مفید اور مضر نتائج پیدا کر سکتی ہے جیسے کہ دولت اور تعلیم کا استعمال بھی اچھے اور برے طریقہ پر ہو سکتا ہے" حاملہ عورت کی کمزور صحت اور بچوں کی پرورش کے اخراجات وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد محرک نے کہا" بہت سے آدمیوں نے ضبط ولادت کے اصول کو صحیح تسلیم کر لیا ہے لیکن کہتے ہیں کہ خارجی ذرائع استعمال کرنیکی نسبت بہتر یہ ہے کہ مقاربت سے پرہیز اختیار کیا جائے بہ نظر مثال کے طور پر مہاتما گاندھی کا حوالہ دیتے ہیں لیکن اگر ہر شخص اس عمل میں کامیاب ہو جائے جو مہاتما گاندھی نے اختیار کیا ہے تو ہندوستان زمین پر بہشت کا نمونہ ہو جائیگا۔

اگر تم مہاتما کی سوانحعمری پڑھو تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ بھی بڑی کوشش اور تیئیس سال کی متاہل زندگی کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہندو مذہب زمانہ قدیم سے برہما چاریہ زندگی کی تلقین کر رہا ہے مگر کتنے آدمیوں نے آج تک اس پر عمل کیا۔ ضبط حمل کے مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ کنواری لڑکیاں اور بیوہ عورتیں جب تمام عمر صبر سے کام لیتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ شادی شدہ عورتیں چند سال کا وقفہ برداشت نہ کریں۔ لیکن شادی شدہ عورت کو شوہر کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جس کے ساتھ اس کو زندگی بسر کرنی ہے علمائے نفسیات سے تم کو معلوم ہو جائیگا کہ میاں بیوی کے جسمانی تعلقات میں رکاوٹ پیدا کرنے سے بے لطفی کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ . . . ضبط حمل کے مخالفین کو میں آگاہ کئے دیتی ہوں کہ مجھ کو ایسی عورتوں کا علم ہے جو زچگی کے تواتر سے پریشان ہو کر اناڑیوں سے مشورہ لیتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ سوسائٹی کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہیں اگر ضبط حمل کے شفاخانے قائم ہوں تو یہ قابل اعتراض طریقہ جاری رہیگا۔

مسز سرونا متو (ممبر کونسل آف اسٹیٹ منجانب مستورات سیلون) ضبط حمل کی مخالف ہیں۔

اس مسئلہ پر اظہار رائے زنی کرتے ہوئے ایک نامہ نگار سے انہوں نے کہا کہ یہ تحریک مذہبی اصول کے خلاف ہے۔ اور انسان کو غیر ذمہ دار بنا دیتی ہے۔

ضبط حمل کی تحریک کے متعلق لندن میں ایک بین الاقوامی انجمن قائم ہے جس کی ڈائرکٹر آج کل مسز ہو مارٹن ہیں جنوری ۱۹۳۶ء میں انھوں نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اور مختلف مقامات پر تحریک کی تائید میں تقاریر کیں۔ بہرحال یہ مسئلہ ہندوستان میں بھی غور طلب ہو گیا ہے۔

غزل

نواب میر حسن علی خان صاحب یمینؔ حیدرآبادی

تہ و بالا ہوئی ہے زندگانی دیکھتے جاؤ
نہیں تھمتی ہے اشکوں کی روانی دیکھتے جاؤ

شب وعدہ دم رخصت میں رہ رہ کر یہ کہتا ہوں
یہ داغ دل تمہاری ہے نشانی دیکھتے جاؤ

میرے دل ہی کو تم کیا دیکھتے ہو رنج فرقت سے
جگر تک ہو گیا ہے پانی پانی دیکھتے جاؤ

ادھر دامن کے پرزے ہیں ادھر پرزے گریباں کے
ذرا جوش جنوں کی مہربانی دیکھتے جاؤ

تمہارے آستاں سے ہم اٹھا سکتے نہیں سر بھی
بڑھی جاتی ہے حد سے ناتوانی دیکھتے جاؤ

نہ وہ اب بھولی باتیں ہیں نہ وہ دن ہیں نہ وہ سن ہے
ترقی پر کسی کی ہے جوانی دیکھتے جاؤ

نہ اتراؤ نہ اتراؤ تم اپنے حسن پر اتنا!
کہ دو دن کی ہے یہ دنیائے فانی دیکھتے جاؤ

گلستان محبت میں صبا کہتی ہے پھولوں سے
ہے دو دن کی بہار زندگانی دیکھتے جاؤ

یمینؔ ہرگز نہ ہوگا وہ بت بدظن کبھی راضی!
رہے گی عمر بھر یہ بدگمانی دیکھتے جاؤ!

کائنات

جناب ایس. ایس. احمد حسن صاحب

خود بخود بجنے لگے تار رباب کائنات ہوگیا حل عقدۂ باب کتاب کائنات

بلاشبہ دنیا ایک معمہ اور کائنات کی ہر شئے ایک راز سربستہ ہے مگر انسان کس قدر غیر مطمئن ہے کہ کائنات کی تمام تمناؤں کو اپنے آغوش شوق میں لینا چاہتا ہے لیکن جو گوشہ نشین اور تنہائی پسند ہیں ہمیشہ ان کی دلفریبیوں سے دور رہتے ہیں کیونکہ فانی دنیا اور اس کی دلفریبیاں چاندنی سے زیادہ ناپائیدار ہوتی ہیں۔

آفتاب بھی چاند کی طرح ستم ظریف اور دنیا کو اپنی ضیا پاشیوں سے فریب دینا چاہتا ہے۔

چاند بھولے بھالے مسافر کو صبح صادق کی جھلک دکھا کر آمادہ کوچ کر دیتا ہے اور پُرخطر راستہ پر گامزن ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سورج اپنی چمکیلی شعاعوں کا جال ریگستان میں پھیلا کر گرم اور خشک ریت کے ذرات کو تشنہ مسافر کیلئے سمندر ظاہر کرتا ہے درماندہ مسافر تلاش آب میں منزلوں پریشان پھرتا ہے اور اس کی تشنگی ہلاکت مزید ہو جاتی ہے اور جب یہ سراب کو پانی سمجھ کر مایوس ہو جاتا ہے تو اس کی تشنگی پر ہنسنے لگتا ہے۔

لیکن ——— اے کائنات، پھر بھی تو مجسمہ اعتبارات اور مرکز دلفریبی ہے۔ تیری دلکشی دلوں کو الجھاتی ہے۔ تیرا پیکر نورانی ہے۔ ہاں تو آئینہ حسیات بھی ہے اور ہنگامۂ جذبات بھی۔

کہتی ہے کائنات کی ہر شئے خاکدان حیات کی ہر شئے
آ چلیں وادیٔ محبت میں سورش آباد حسن و الفت میں

کائنات کی پیچیدہ گتھیوں میں الجھنے والے متخیل پہلے یہ تو بتا کہ میں خود کیا ہوں؟ مایہ حیات؟ رازدار کیفیات! مجسمہ تصورات۔ سرمشق الزامات؟ ——— آخر کیا ہوں۔

موتیا کی نیم شگفتہ کلیوں نے قہقہہ لگا کر کہا کہ یہ کائنات ہے۔ اور تو اس گلشن کائنات کی راز جو۔ مگر یاد رکھ تیری جستجو بیکار ہے اس راز کو آج تک کسی نے بھی دریافت نہیں کیا۔ اس لئے پڑھ اس نغمۂ شیراز کو اور خاموش ہو جا۔

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمارا۔

تحقیق سنہ فصلی

مولانا عبدالواسع مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(بسلسلہ گذشتہ)

(۲) اکبر کے عہد میں سنہ فصلی کی بنیاد راجہ ٹوڈرمل نے قایم کی تھی اور چونکہ وہ ہندو تھا اس لئے اس نے سنہ فصلی کے مہینے ہندی رکھے تھے۔ لہذا اگر امر اول سے قطع نظر کرکے یہ مان لیا جائے کہ یہ سنہ بھی اکبر اعظم کے عہد میں رائج ہوا تھا تو ضرور سالانہ حسابات کے اغراض کیلئے راجہ ٹوڈرمل وزیر مالگذاری و فینانس کے منشا سے اور سلطنت کے عام جمع وخرچ وحسابات کی تاریخوں اور سنوں میں اتحاد پیدا کرنے کیلئے رائج کیا گیا ہوگا اس لئے اس کے مہینے بھی بجائے فارسی کے ہندی ہونا چاہئے تھا اور اس کی ابتدا بھی اکبر اعظم کی تخت نشینی کے زمانہ یعنی سنہ ۹۶۳ھ سے ہونا چاہئے تھی نہ سنہ ۹۷۱ھ سے۔

(۳) اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس سنہ کا رواج سنہ ۹۷۱ھ میں ہوا ہے تو اس کے فارسی مہینوں کے ایام کا شمار وہی ہونا چاہئے تھا جو سنہ یزدجردی یا سنہ جلالی کے مہینوں کے ایام کا شمار تھا کیونکہ فارسی مہینوں کے شمار ایام میں تغیر بحکم اکبر اعظم سنہ الٰہی کیلئے سنہ ۹۹۲ھ میں ہوا ہے۔ نہ کہ سنہ ۹۷۱ھ سے پہلے۔

(۴) اگر ان سب باتوں سے قطع نظر کرکے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ سنہ فصلی شمالی ہند کے سنہ فصلی کی طرح سنہ ۹۷۱ھ مطابق سنہ ۱۵۶۳ء سے رائج ہوا تو اس وقت سے سنہ ۱۳۳۶ھ مطابق سنہ ۱۹۱۷ء تک بحساب قمری ۳۶۴ سال اور بحساب شمسی ۳۵۴ سال تقریباً ہوتے ہیں لہذا سنہ ۱۹۱۷ء میں سنہ فصلی ۹۷۱+۳۵۴=۱۳۲۵ سنہ ہونا چاہئے تھا نہ سنہ ۱۳۲۶ و ۱۳۲۷۔

قول سوم کی تنقید قول سوم دو یورپین محققوں کے زور قلم کا نتیجہ ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ مولف تاریخ سنین کی تحقیق ہے اور صاحب جنتری نے اسی سے نقل کیا ہے لہذا باعتبار قواعد حسابی صحیح ہے کیونکہ سنہ ۱۶۳۶ء میں سنہ ۱۰۴۶ھ تھا جس کو سنہ ۱۹۱۷ء مطابق سنہ ۱۳۳۵ھ تک بحساب سال قمری ۲۸۹ برس اور بحساب سال شمسی ۲۸۱ برس ہوتے ہیں اس وجہ سے سنہ ۱۳۳۵ھ میں یہ سنہ ۱۰۴۶+۲۸۱ = ۱۳۲۷ ہونا چاہئے تھا اور سنہ ۱۳۳۶ھ کے آخر میں

سنہ ۱۳۲ف شروع بھی ہوگیا ہے مگر مولف تاریخ سنین نے اس کی توثیق نہ کسی تاریخی حوالہ سے کی ہے اور نہ اس کی وجود پر تاریخی واقعات سے کوئی قیاس قائم کیا ہے بلکہ اس نے اپنے فطری مساحت کے بنا بر عام یورپین محققوں کے طرح سطحی طور پر صرف دو باتیں پیش نظر رکھی ہیں۔

(۱) اگر اس سنہ فصلی کے ابتدا ۱۶۳۶ء مطابق ۱۰۴۶ھ سے کی جائے تو بلحاظ اعداد سنہ تطابق ہوجاتا ہے

(۲) ۱۶۳۶ء میں ممالک دکن کا اکثر حصہ سلاطین تیموریہ کے زیر نگین آچکا تھا۔

انہیں دو امور سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سنہ فصلی بھی شمالی ہند کے سنہ فصلی کی طرح ۱۶۳۶ء سے رائج کیا گیا ہے اگرچہ ان دونوں یوروپین مصنفین نے نظر عائر اور فکر صائب سے کام نہیں لیا تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے سطحیانہ اصول کے بنا پر ایک حد تک جانچ پڑتال کرکے رائے قائم کی ہے اور اسی وجہ سے ہم کو اس قول کی تنقید کیلئے واقعات تاریخی پر ہم کو نہایت احتیاط سے غور کرنا چاہئے کہ ان سے اس قول کی تائید ہوتی ہے یا تردید۔ تاریخوں کے مطالعہ سے حسب ذیل واقعات معلوم ہوتے ہیں جن پر اس قول کی تنقید کا مدار ہے۔

(۱) ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں محمد شہاب الدین شاہجہاں سریر آرائے سلطنت ہوا۔

(۲) شاہجہاں نے اپنے پہلے ہی سال جلوس میں سنہ الٰہی کو دفاتر سرکاری سے خارج کر دیا جو اکبر اعظم اور جہانگیر کے عہد کارروائی میں سرکاری سنہ تھا اور جس کا مبدا اس کے دادا اکبر اعظم کی تخت نشینی کا سال تھا۔ اور سنہ الٰہی کے بجائے سنہ ہجری کو دوبارہ دفاتر سرکاری میں جاری کیا اس واقعہ کو خافی خاں نے منتخب اللباب واقعات سنہ جلوس شاہجہانی میں لکھا ہے۔

(۳) شاہجہاں پابند مذہب بادشاہ تھا اسی وجہ سے اس نے تخت نشین ہوتے ہی پابوسی کی رقم موقوف کرکے اپنے دربار میں تسلیم بجالانے کا طریقہ مقرر کیا تھا جیسا کہ منتخب اللباب اور شاہجہاں نامہ وغیرہ میں مرقوم ہے۔

(۴) شاہجہاں نے ۱۰۳۶ھ میں تسخیر صوبہ جات دکن کے لئے فوجیں روانہ کی تھیں اور ممالک دکن کی فتوحات کا سلسلہ اسی سال سے شروع ہو گیا تھا جو اس کے آخر دور حکومت یعنی ۱۰۶۸ھ تک برابر جاری رہا اور ان

ممالک کی کامل تسخیر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ اورنگ آرائی ہوئی۔

(۵) ممالک دکن کی تسخیر کیلئے جو لشکر روانہ کئے گئے تھے ان کے سپہ سالار اعظم شاہجہاں کے دو فرزند شہزادہ اورنگ زیب اور شہزادہ مراد تھے۔

(۶) ممالک آصفیہ کا اکثر حصہ شہزادہ اورنگ زیب کی زیر کمان فوجوں نے فتح کیا اور یہ شہزادہ پکا دین دار و پابند مذہب تھا۔

(۷) شاہجہاں کے عہد حکمرانی میں راجہ جے سنگ سوائی والی جے پور نے ہندوستان کے رصد کر کے ایک زیچ مرتب کی جس کا نام زیچ شاہجہانی ہے اس میں سنون کا ایک مستقل باب ہے۔

(۸) شاہجہاں کے عہد فرماں روائی تک شمالی ہند کے سنہ فصلی اور سنہ ہجری میں دو سال کا فرق پڑ گیا تھا جس سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ سنہ قمری کو سنہ شمسی قرار دینا اصولی غلطی ہے۔

(۹) سنہ ۱۰۴۳ھ میں کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہوا جس کے بناء پر جنوبی ہند کے سنہ فصلی کے بنیاد اس وقت سے شمار کی جائے۔

دوسرے اور تیسرے واقعہ کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اسلام کی مخالفت کی وجہ سے شاہجہاں نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے دادا کے جاری کردہ سنہ الہی کے رواج کو موقوف کر کے سنہ ہجری کے رواج کو تازہ کیا تھا حالانکہ سنہ الہی کی بنیاد صحیح ترین اصول ریاضی پر تھی لہذا کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ اس نے خود اپنے دور حکمرانی میں ایک ایسا نیا شمسی سنہ جاری کیا ہو جس کی بنیاد ایسے غلط اصول پر ہو کہ کچھ صدیاں گذرنے کے بعد اس کے مبداء کا صحیح نشان ملنا دشوار ہو جائے اور جس کی غلطی کا ادراک خود اس کے دادا نے کر کے سنہ الہی کی بنیاد رکھی ہو۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس نے اپنے دادا کے وزیر اعظم بیرم خاں خانخاناں یا وزیر مال ٹوڈر مل کی تقلید میں ایسا کیا بھی ہو تو اس سنہ کے ابتداء شاہجہاں کے سال جلوس یعنی سنہ ۱۰۳۷ھ سے ہونا چاہئے تھی نہ سنہ ۱۰۴۳ھ سے اور یہ سنہ تمام صوبجات ہند میں رائج ہونا چاہئے تھا نہ صرف صوبجات جنوبی ہند میں۔ اور اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ یہ سنہ صرف ممالک دکن کیلئے ایجاد ہوا تھا تو واقعہ پنجم و ششم کی بناء پر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ شہزادہ اورنگ زیب کی تحریک پر جاری ہوا ہوگا۔ مگر اورنگ زیب کا مذہبی تقدس ہم کو کسی طرح اس بات کے باور کرنے کی اجازت نہیں دیتا

کہ اس نے سنہ ہجری میں اس قسم کی تحریف کرنیکی استدعا کی ہو اگر بفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ اورنگ زیب نے ایسی استدعا کی اور اس کو شرف منظوری حاصل ہوا تو اس سنہ کی ابتدا فتوحات دکن کی ابتدا سنہ ۱۰۴۲ھ سے ہونا چاہیے تھی نہ ۱۰۴۴ سنہ سے جیسا کہ واقعہ چہارم سے ظاہر ہے۔ اگر ان سب باتوں سے قطع نظر کرکے یہ باور کرلیا جائے کہ یہ سنہ صوبجات دکن میں سرکاری حسابات کے لئے شاہجہاں کے زمانہ میں جاری کیا گیا تھا تو یہ ناممکن ہے کہ اس کا تذکرہ عہد شاہجہانی کے واقعات کے ضمن نہیں سلاطین تیموریہ کے تاریخوں میں نہ ہو خافی خاں نے منتخب اللباب میں سنہ جلوس شاہجہانی کے واقعات میں لکھا ہے کہ اسی سال شاہجہاں نے دفاتر سرکاری میں سنہ الٰہی کا رواج موقوف کرکے سنہ ہجری کو رائج کیا پھر یہ کیونکر ہوسکتا تھا وہ ۹ سنہ جلوس شاہجہانی کے واقعات کے ضمن میں اس سنہ کے رائج کئے جانے کے واقعات نہ لکھتا حالانکہ عہد شاہجہانی کے کسی سنہ کے واقعات کے ضمن میں اس سنہ کے رائج کئے جانے کا ذکر منتخب اللباب میں نہیں ہے اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ خافی خاں نے اس تذکرہ کو ایک معمولی واقعہ سمجھکر چھوڑ دیا اور اپنی تاریخ میں ذکر نہیں کیا تو زیج شاہجہانی میں ضرور اس سنہ کو مندرج ہونا چاہئے تھا۔ زیج شاہجہانی حیدرآباد دکن کے کتبخانہ آصفیہ میں موجود ہے ہم نے خود اس میں سنوں کا باب پڑھا جس میں اس نے بعض ایسے سنوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا اب صرف نام ہی نام باقی ہے اور دنیا میں کہیں رائج نہیں۔ مگر اس سنہ فصلی کا اس میں کہیں تذکرہ نہیں حالانکہ صاحب زیج کا فرض تھا کہ وہ اپنے دربار کے جاری کردہ سنہ کو ضرور لکھتا۔ ان وجوہ سے صاف ظاہر ہے کہ تیسرا قول بھی بالکل لغو اور ایک تخمینی نشانہ اندازی ہے ان تینوں قولوں کے تردید کے بعد جنوبی ہند کے سنہ فصلی کی اصلیت دریافت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی نقلی مواد نہیں باقی رہا لہٰذا ہماری آئندہ تحقیقات قیاسات پر مبنی ہوگی

سنہ فصلی کی تحقیق | سنہ فصلی کی اصلیت دریافت کرنے کیلئے جن قیاسوں سے کام لیا جائیگا وہ واقعات مذکورہ واقعات ذیل سے مستنبط ہوں گے۔

۱۔ سنہ فصلی کے مہینے فارسی میں جو ساسانیوں کے سنوں میں بھی مستعمل تھے۔

۲۔ سنہ فصلی کے مہینوں کے ایام کی تعداد وہی ہے جو اکبر اعظم کے عہد میں سنہ الٰہی کے مہینوں کی مقرر کی گئی تھی۔

(باقی دارد)

غزل

جناب امین الحسن صاحب بسمل ناظم عدالت گلبرگہ

عشق جب کا حباب ہوتا ہے
کسی کمسن کا خواب ہوتا ہے

شرم بن جاتی ہے ہر ایک شوخی
اصل خود ایک حجاب ہوتا ہے

خود بخود کیوں خمار ہے شاید
کہیں ذکر شراب ہوتا ہے

یہ زمین آسمان ہوتی ہے
جب کوئی بے نقاب ہوتا ہے

نامہ بر کی جھکی ہوئی آنکھیں
میرے خط کا جواب ہوتا ہے

دل کی بدمستیاں معاذ اللہ
مفت رسوا شباب ہوتا ہے

سنتے ہیں بزم عشق میں بسمل
آپ کا انتخاب ہوتا ہے

غزل

جناب سید علی محمد صاحب اجلال زیدی

کچھ قابل قدر اب بھی وفا ہو گی نظر میں
اک لاش ہے افتادہ تیری راہ گذر میں

کچھ سنگ در دوست پہ سجدہ کے نشاں ہیں
طغرائے محبت نظر آتا ہے حجر میں

یوں سمجھے تیری دشت نوردی کی حقیقت
اک منزل الفت کا مسافر ہے سفر میں

در دیدہ نظر نے جو تیری تیر لگائے
وہ سب ہیں امانت کی طرح قلب و جگر میں

اجلال گناہوں کا کوئی عذر نہیں ہے
ہاں اشک ندامت ہے فقط دیدۂ تر میں!

چاہ کن را چاہ درپیش

جناب شیخ حسین صاحب بی۔اے

مسٹر جلکس نلی کے نیچے منسنی مشعل سلگا یا بس یہ کافی تھا۔ اس کے لبوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ نمایاں تھی صرف اس ذرا مایہ سے ایک شخص ہزار ہا جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

اب نلی کا مایہ اُبل رہا تھا۔ اس نے اس میں دو کیمیائی قلمیں ملائیں۔ اس کی نظریں مایہ کے گہرے رنگ پر گڑی ہوئی تھیں دوبارہ اس نے اور کیمیائی اجزاء ملائے۔ پیمانے سے اس کے چند قطرے ناپے۔

مسٹر جلکس ایک پیشہ ور جعل ساز تھا۔ اب چند دنوں سے وہ اور بھی دوسرے مجرمانہ کاموں کا ارتکاب کرنے لگا تھا جیسے بوڑھے گرمشاہ کے ہبہ نامہ کے معاملہ میں جس میں قتل بھی شامل تھا۔ اگرچہ یہ کام مسٹر جلکس سے تعلق نہ رکھتا تھا ہبہ لکھے جانے کے بعد گرمشاہ مار ڈالا جائیگا لیکن جلکس اس وقت وہاں موجود نہ ہوگا اس طرح اس پر گمان بھی نہ ہو سکیگا۔ وہ خود اس قول کے مخالفت کا ایک زندہ نمونہ تھا کہ "مجرم کبھی پھل نہیں پاتے" واقعی جرم نے اوس کو بہت نفع پہنچایا تھا۔ اس کو چاہئے تھا کہ وہ ان گناہوں سے باز آجاتا اور اس کا یہ آخری ناجائز کام ہونا چاہئے تھا

جلکس نے اپنے میز میں سے ایک سیاہ قلم نکالا اور مسکرانے لگا اس قلم کے استعمال سے گرمشاہ کے خونی بھتیجے کو اپنے چچا کی جائداد حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ مانع نہ ہوگی جلکس نے اب قلم میں اپنی بنائی ہوئی روشنائی نہایت ہی احتیاط سے بھر دی اور قلم کو میز پر رکھ دیا نصف شب گذر چکی تھی اب اوس کے ذمہ اور کوئی کام باقی نہ تھا سوائے اس کے کہ آرام کرنے۔ اس کو دوسرے دن دوپہر میں گرمشاہ کے خونی بھتیجے کو قلم حوالہ کرنا تھا۔ یکایک دروازہ پر دستک کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑا۔ فوراً کنجی گھمائی۔ دروازہ کھل گیا۔

ایک لڑکی . . . . . "کیوں . . . کیا . . . بھائی . . اندر چلی آؤ"!

وہ کمرہ میں بیٹھ گئی۔ گردن جھکائے ہوئی تھی۔ سینہ ابھر رہا تھا اور اس کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت

ہوتی نہ تھی۔

"میں صرف نہیں دیکھنا چاہتی ہوں پیٹر . . . میں بہت خوش ہوں کہ تم موجود ہو" "ہاں میں موجود ہوں" پیٹر نے آہستہ سے کہا "کیا بات ہے"

اس تین سال کے عرصہ میں وہ بالکل بدل گئی تھی۔ جب کہ اس نے اس کو آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ عزنزویل میں صرف اس کی بڑی بہن تھی ——— ایک بھوری چڑیا۔ نازک اندام پہلے سے کہیں ناتوان علیل نظر آتی تھی۔ گھبرائی ہوئی تھی۔

جلکس ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا اور اپنے اس طرز پر متحیر بھی تھا وہ یہ سمجھا ہوا تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ یہی بہن جو اس کو تین سال قبل یہ معلوم کرکے کہ وہ ایک مجرم ہے چھوڑ چکی تھی۔ اس نے جد کوشش کی تھی کہ وہ ان مجرمانہ حرکات سے باز آجائے لیکن جب وہ اس پر ہنسا تو وہ مکان سے چلی گئی تھی اور کہیں ملازمت اختیار کرلی تھی اس وقت سے جلکس نے اس کو نہیں دیکھا تھا۔

اس نے سرد لہجے میں کہا "تم کو کیا ہوگیا ہے۔ تم ان تین سال سے کیا کر رہی ہو" شادی کی وہ ہچکیاں لیکر رونے لگی۔ شادی ہوئے ایکسال ہوا۔ اس کا نوجوان شوہر بنک کا خازن تھا مگر خائن۔ حساب میں کمی آنے لگی اور یہ بات فیانی کو آج ہی معلوم ہوئی۔

جلکس اس کو دیکھتا رہا اور اس کے چہرہ پر ایک طنز آمیز مسرت تھی وہ اپنے بھائی سے متنفر تھی کہ وہ ایک بدچلن ہے لیکن اب اس نے خود ایک بدچلن کو اپنا رفیق حیات بنایا ہے۔

"نہیں مجھ کو ان نظروں سے نہ دیکھو" فیانی نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔ "وہ آج قید ہو جائیگا" "ممتحن بنک . . . کل ہی . . . وہ کہتا ہے کہ کل ہی۔ سب ظاہر ہو جائیگا۔ وہ قید کر دیا جائیگا"

جلکس نے کہا "اس نے ان روپیوں کو کیا کیا؟"

"جوا کھیلا۔ اور اب وہ سزا پائیگا"

"تم میرے پاس آئی ہو" اس کی پژمردہ نگاہوں نے اس کو موم بنا دیا تھا

فیانی! تسلیاں رکھو! روو نہیں۔ تم میرے پاس آئیں بہت اچھا ہوا۔

تم کچھ روپیہ مانگنا چاہتی ہو۔ ہاں میں اب متمول ہوں۔ یہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ تم کو کتنا روپیہ چاہیئے؟

"بھائی صرف دو ہزار!"

وہ اٹھکر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "یہ تو بہت ہے فیاالی۔ لیکن خوش قسمتی سے اتنا روپیہ اب میرے پاس موجود ہے۔"

"مبشر! تم اتنا احسان کرو!"

"بیشک میں کروں گا۔ تمہیں ایک چک دونگا۔" وہ اپنے میز کے قریب گیا اور ایک چک کی کتاب لے آیا۔

تنہائی۔ زندگی میں کتنا نمایاں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ فیاالی سے ملاپ۔ اس کا کم عمر شوہر ایک اچھا شخص ہوگا لیکن ایک چور۔ خود بھی اوائل عمر میں ایک۔

وہ کھڑا ہوا۔ "یہ لو!"

فیاالی نے چک لے لیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ "مبشر۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ یہ کہ۔ . . کہ . . . ." وہ پھر رو رہی تھی۔

"یہ الفاظ زبان سے نہ نکالو۔" مبشر نے دبی ہوئی آواز میں کہا اور خوش ہو رہا تھا۔ "اطمینان رکھو میں اپنے بنک کو علی الصباح فون کر دونگا کہ تم آ رہی ہو۔" مبشر نے بہت ہی سنجیدگی سے بہن کے ہاتھ چومے۔ "تم فرصت کو کسی وقت میرے پاس بیٹی آؤ۔ فیاالی تم کو دوبارہ دیکھنے کی مجھے پھر بھی آرزو رہیگی!"

"ہاں ہاں میں ضرور آؤں گی!"

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی۔ دروازہ بند کر لیا گیا۔

فون نے صبح آٹھ بجے جلکس کو جگایا۔ گرشاہ کے بھتیجے نے فون کیا ہوگا۔ جلکس خوابیدہ آنکھوں سے فون کے قریب پہنچا اور یکبارگی چونک پڑا۔ وہ گرشاہ کا بھتیجہ نہ تھا۔ بلکہ ایک ڈاکٹر بلا رہا تھا۔

فیاالی کا شوہر صبح میں حمام کے صحن میں مردہ پڑا دیکھا۔

زہر۔ بدبو کو دور کرنیوالا رقیق جو ہمیشہ حمامخانہ میں رکھا جاتا تھا۔ "اور آ رہی تھی" اس نے خود ہی پیا ہے۔ زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ واقعی کسی خاص قسم کے دلی صدمہ سے یہ کام ہوا ہے۔ عارضی دماغی ابتری

ایک بہت ہی نازک کمزور عورت کے ساتھ"۔ جلکس نے فون کے کھمبے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ وہ ایک وحشیانہ ہنسی ہنسا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔

آواز جاری تھی" ایک عجیب طرفہ تماشا ہے۔ ایک مل گچا کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک چک کا غذ۔ کورا چک۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کیا معاملہ ہے؟"

جلکس تاڑ گیا کہ فیاتی نے خیال کیا کہ اس کے ساتھ چال چلی گئی ہے اور اس کی التجا کا جواب اس چال سے دیا گیا ہے۔

آواز آئی "کیوں جلکس ایک کاغذ کا ٹکڑا جس پر کچھ لکھا ہوا نہ ہو اس طرح اس کو صدمہ پہنچا سے گا"

جلکس کا دماغ واقعات ماضی کی طرف عود کر آیا۔ گذشتہ شب میں اپنے میز کے پاس اس کے کمینے خیالات نے اس کو بد حواس کر دیا تھا۔ اس نے چک تو لکھا مگر صبح ہوتے ہی وہ کورا ہو گیا۔

یقیناً چک کورا تھا اس نے گرمشاہ کے ہبہ نامہ کیلئے جو سیاہی تیار کی تھی اسی سے چک کو لکھدیا تھا۔

مقصد حیات

زندگی اپنی ہے مانند سپند جبکہ یہاں | آ۔ کہ اس عالم اسباب سے جلد ہیں اڑ کے

اس سے پہلے کہ اجل آئے صفا ہے یہی | آنیوالوں کیلئے بزم کو خالی کر کے

سپہرِ شاعری کا اخترِ تاباں

جناب آنسہ فاطمہ جعفر منشی فاضل۔ کہیری

سپہرِ شاعری کے اخترِ درخشاں عمر خیام نے نیشاپور پر تاباں ہو کر ارضِ ایران کو اپنی ضیاریز شاعری کی جلوہ طرازی سے جگمگا دیا۔ اس کا نام غیاث الدین ابو الفتح عمر بن ابراہیم ہے۔ باپ اور بیٹے کی مناسبت سے عمر خیام تخلص کیا اصل نام تخلص کے آگے ماند پڑ گیا۔ یہ شاعر شیریں بیان عزیز الشان حکما و جلیل القدر فضلا میں سے تھا۔ عمر خیام نہ صرف کشورِ شاعری کا بادشاہ تھا بلکہ علم ریاضیات کا بھی اس کو اس قدر ملکہ تھا کہ اس کے معاصرین اس سے راہیں لیتے اور لوگ اس کی شاگردی تہ کرتے۔ چنانچہ اب بھی اس کی ایک کتاب ریاضی پر لندن کی لائبریری میں موجود ہے۔ صاحب "نشترِ عشق"، مولف "مراۃ آفتاب نما" و دیگر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ اسلام کے جلیل القدر حکما و علما میں سے تھا۔ یہاں تک کہ بعض اُسے نظیر بو علی سینا سمجھتے ہیں۔ اس شاعرِ رفیع القدر حکیم فلاطون منش کو سلطان سنجر سلجوقی بہت عزیز رکھتا تھا اور اس کے کمالات کا یوں اعتراف کیا ہے کہ اس کو اپنے برابر اورنگ شہی پر بٹھلا کر اس کی عزت دوبالا کر دی۔ نظام الملک وزیر الپ ارسلان نے اس کے فن و کمال کے سبب نیشاپور میں بارہ سو اشرفیاں سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ دیگر علما و فضلا کی طرح عمر خیام بھی سیر چشم مال دنیا کی خواہش سے مستغنی تھا۔ تحصیل علم اس کی زندگی کا مقصد اولین تھا اور دامن علم و ادب کو اپنی زریں گلکاریوں سے باغ بے خزاں بنانا اس کا دلچسپ ترین شغل ——— مولانا امداد امام صاحب اپنی کتاب "بہارستان سخن" میں لکھتے ہیں کہ نظام الملک نے اپنی کتاب "وصایا" میں عمر خیام کے ذوق علم و بے نیازی مال دنیا کا ایک واقعہ یوں لکھا ہے "ہم اور عمر خیام طالب العلمی میں ہم سبق اور ہم استاد تھے بعد اختتام تعلیم ہم سیر و سفر کو چلے گئے اور بعد معاودت وزیر ہوئے اسی اثنا میں عمر خیام ہمارے پاس آئے ہم نے ان کی تعظیم کر کے کہا کہ ویسی قابلیت کے آدمی کو خدمت سلطانی میں در آنا چاہئے مگر انہوں نے پسند نہ کیا اور کہا مجھے علم اندوزی کیلئے چھوڑ دو۔ مجھے گوشہ عافیت درکار ہے۔ شہرستانی اور ابو الفدا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الافلاک اور

فلسفہ میں بھی وہ بے نظیر تھا چنانچہ ابوالفدا نے لکھا ہے کہ الپ ارسلان سلجوقی کے جانشیں جلال الدین ملک شاہ کے اس فاضل جید کی خدمات حاصل کر لی تھیں اور اس کو علم الافلاک کے شاہی سررشتہ کی افسری تفویض کی اس نے بہت سی تقویم تیار کی جس میں "تقویم جلدی" مشہور ہے۔ تذکرہ مرآۃ آفتاب نما میں ہے کہ عمر خیام ابوالحسن اشعری کا شاگرد تھا اپنے عہد کا مشہور ریاضی داں اور حکیم تھا۔ یہ جامع کمالات شاعر عالم لغات و مورخ تاریخ بھی تھا ابن خلدون کی رائے ہے کہ "اس کو جبر و مقابلہ میں بڑا دخل تھا" اس کی تصانیف میں سے بہت سے رسالے کتابیں عربی و فارسی میں اقلیدس جبر و مقابلہ حکمت و شاعری پر ہیں جس طرح عمر خیام ہے عدیل شاعر تھا اسی قدر عدیم المثال نثار بھی وہ ان دونوں گلشن شاعری میں گل افشانی کیا کرتا۔ عربی میں تو اب اس کا کلام صرف قطعوں کی صورت میں باقی رہ گیا ہے لیکن فارسی میں جس قدر رباعیات ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

صاحب نشتر عشق اس کے حالات میں تحریر کرتے ہیں کہ جس قدر اوائل عمر میں خیام زہد و پرہیزگاری میں مشہور تھا آخر عمر میں دائم الخمری و بید ینی میں مطعون ہوا۔ اس کی دلچسپ وجہ وہ خود یہ بیان کرتا ہے۔

مے خوردن من نہ از برائے طرب است — نے بہر فساد و ترک دین و ادب است
خواہم کہ بہ بیخودی برآرم نفسے — مے خوردن و مست بودنم زین سبب است

یا بقول شخصے:۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

تذکرۂ مذکورۂ بالا میں ہے کہ آخر عمر ۵۱۷ھ میں جبکہ یہ آفتاب شاعری لب بام ہوا اپنے معائب و عصیاں کا خیال کر کے اثبات تسکین روح و سکون قلب حاصل کرنا چاہی چنانچہ جب وہ شناخت و معرفت جناب باریتعالیٰ مقام پر پہنچا تو وضو کیا۔ نماز پڑھی اور سر ندامت بارگاہ صمدیت میں جھکا کر اپنی خطاکاری و عصیاں پر اشک انفعال بہائے اور عفو و مغفرت کی دعا کی۔ ارحم الراحمین نے اس طرح اپنی خوشنودی و عفو کی سند عطا فرمائی کہ اس شاعر بے مثال کو پھر سجدۂ رحمانی سے سر نہ اٹھانا پڑا۔ اس کی روح اس معصیت کدہ دنیا سے تلاش مغفرت میں بارگاہ یزداں تک پہنچ گئی لوگوں نے تاریخ وفات کہی۔ بقول صاحب نشتر عشق شیفتہ کی تاریخ یہ ہے۔

دریغا کہ خیام صوفی مذاق! — چو پوشید بر تن صمات لباس

شبے با ہزاران رنج و تعب　　　رقم کرد تاریخ دل حق شناس

افسوس ہے کہ میں باوجود کوشش کے عمر خیام کا سن پیدائش معلوم نہ کر سکی۔ قدر شناس فریفتۂ علم و ادب مغربی اقوام نے اس شاعر خوش نوا کی جس قدر قدر کی اور اس کے کلام سے جس قدر لطف حاصل کیا یقیناً وہ اس کا مستحق ہے اس کے جواہر پارے ایسے ہی ہیں جو اہل نظر کی چشم بصیرت خیرہ [illegible] کرتے رہیں۔

خیام نے اگر کسی جگہ یوں لب کشائی کی ہے۔

خواہی رسانی در جنان وادمرا　　　خداہی روح [illegible] شاد [illegible] دار مرا
من با تو نگویم کہ جنان [illegible] دار مرا　　　ز انسان کہ دولت خداست جنان دار مرا

تو کسی مقام پر تخلیق عالم کے متعلق متحیر ہو کر خلاق عالم سے یوں دریافت کرتے ہیں :—

ہرچند کہ رنگ و بو زیباست مرا　　　چوں لالہ رخ و چوں سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طربخانہ خاک　　　نقاش من از بہر چہ آراست مرا

تماشا گاہ عالم میں انسانی آمد و رفت کے مسئلہ لاینحل کو پریشان ہو کر یوں بیان کرتے ہیں :—

آورد باضطرارم اول بوجود　　　جز حیرتم از حیات چیزے نہ فزود
رفتیم باکراہ و ندانیم چہ بود　　　زین آمدن و بودن و رفتن مقصود

پریشان اور مجروح عصیاں بندہ دل کو لاتقنطو من رحمت اللہ . . . . کے مطابق یوں تسلی دیتے ہیں :—

خیام ز بہر گنہ ایں ماتم چیست　　　در خوردن غم فائدہ بیش و کم چیست
آں را کہ گنہ نکرد غفران نبود　　　غفران برائے گنہ آمد غم چیست

رحیم معبود سے ناز کر کے بحر عفو و کرم کو جوش میں لاتے ہیں :—

ناکردہ گنہ در جہاں کیست بگو　　　آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی　　　پس فرق میان من و تو چیست بگو

تو کبھی اہل دنیا سے امید احسان و تمتع نہ رکھنے اور خود اعتمادی کا سبق یوں ملتا ہے :—

اے دل ز زمانہ رسم احسان مطلب — از گردش دوراں سر ساماں مطلب
درماں طلبی درد تو افزوں گردد — با درد بساز و ہیچ درماں مطلب

خواہش سکون اور دنیا کی ہنگامہ آرائی لوگوں کی حکومت سے پوشیدہ ہو کر آزادی سے گوشہ عافیت میں قدرت کے روح افزا اور معصوم عطایا سے مسرور ہونیکی تمنا ہر دل میں پیدا ہونی ضرور ہے۔ اردو، فارسی، انگریزی کے ہر شاعر نے اس کی خواہش ظاہر کی ہے الکزنڈر پوپ ریبی دلکش نظم Ode on Solitude میں اس حسرت کا اظہار کرتا ہے ابن یمین کی خواہش ہے:—

اگر دو گاو بدست آوری و مزرعہ — یکے امیر و یکے را وزیر نام کنی
ہزار بار ازاں بہ کہ از پئے خدمت — کمر بہ بندی و مرد کے سلام کنی
دو قرص نان اگر از گندم است یا از جو — دو تا یہ جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بچار گوشہ دلوا بخود بہ خاطر جمع — کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر ز نزد ابن یمین — ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

اسی آزادی قناعت و گوشہ عافیت کی تمنا عمر خیام کی بھی ہے :—

یک نان بہ دو روز اگر شود حاصل مرد — وز کوزہ شکستہ دمے آب سرد
مامور دگر کسے چرا باید بود — یا خدمت چوں خودی چرا باید کرد

تسلیم و رضا صبر و شکر کی تعلیم کس لطیف پیرایے میں دی ہے :—

گر کار تو نیک است بہ تدبیر تو نیست — ور سر بد بہ تقصیر تو نیست
تسلیم و رضا پیشہ کن و شاد بزی — چوں نیک و بد جہاں بہ تدبیر تو نیست

بلا قید ملت و مذہب محبت حقیقی میں فنا ہونیکا صلہ یہ ہے :—

ہر دل کہ در و مہر و محبت بسرشت — گر ساکن مسجد است و اہل کنشت
در دفتر عشق نام ہر کس کہ نوشت — آزاد ز دوزخ است و فارغ ز بہشت

رموز قدرت اسرار فطرت کا انکشاف ناممکن ہے سائنس داں اپنے ایڑی کا چوٹی کا زور صرف کر دینے پر

بھی آخر راز حقیقت تک نہ پہنچنے سے اپنے عجز کو تسلیم کرتے ہیں خیام نے اس کی پیشین گوئی یوں کی ہے :-

در پردۂ اسرار کسے را رہ نیست — زین تعبیہ جان ہیچکس آگہ نیست
جز در دل خاک ہیچ منزل گہ نیست — افسوس کہ این فسانہا کوتاہ نیست

آنہا کہ بفکر در معنی سُفتند — در ذات خدا اوند سخنہا گفتند
سر رشتۂ اسرار ندانست کسے — اول سخنے زدند آخر خفتند

خیام اگر کہیں ناصح مشفق زاہد شب زندہ دار بن کر دنیا کی فنا و عدم کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :-

دنیا دیدی و ہر چہ دیدی ہیچ است — واں نیز کہ گفتی و شنیدی ہیچ است
سرتاسر آفاق دویدی ہیچ است — واں نیز کہ در خانہ خزیدی ہیچ است

تو کبھی اپنے زمانہ کی "زر پرستی" کا حال یوں دکھلا کر ظرافت پاش ہوتے ہیں :-

گویند کہ مرد را ہنر می باید — یا نسبت عالی پدر می باید
امروز چنان شدہ است در نوبت ما — کین ہا ہمہ ہیچ است "زر می باید"

"نامعلوم رب"

(بیاری مین کا ایک افسانہ)

جناب سید ابوالفضل صاحب (عثمانیہ)

اس قدیم اور دور افتادہ جزیرے کی ہوا لطیف اور سست کن تھی۔ جزیرے کی کل آبادی صرف ایک مرد اور ایک عورت پر مشتمل تھی جن کا رنگ سرخ تھا یہ تعلیم اور مذہب سے بالکل بے بہرہ تھے اوس دوپہر کو یہ آبادی نہانے کے بعد ساحل کی ریت پر دھوپ میں اپنے جسموں کو سینک رہی تھی

"ہاں" مرد نے کہا "ہوا سے بہکر ساحل پر آئی ہوئی کشتی کو ہم دیکھینگے"

"ہاں" عورت نے کہا "وہ ایک عمدہ کشتی ہے"

"بہت عمدہ کشتی" مرد چلایا "وہ ہمارے لئے نہایت کارآمد ہوگی" اس کے بعد وہ فوراً سو گیا تھوڑی دیر کے بعد عورت نے اسے جگایا۔ وہ بالکل فلسفی معلوم ہو رہی تھی۔

"کیا تم خوش ہو؟" اس نے مرد سے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا" مرد نے جواب دیا "میں نے اس کے متعلق کبھی غور ہی نہیں کیا"

"تب تو تم خوش ہو" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا "جو لوگ اس کے متعلق غور کرتے ہیں وہ کبھی خوش نہیں رہتے مثلاً میں خوش نہیں ہوں"

"اگر اب ہم اٹھکر کچھ مچھلیاں پکڑیں تو ——— ؟"

"نہیں" عورت نے کہا "میرا دل گفتگو کی طرف ہے" مرد نے ایک ہلکی آہ کھینچی۔

"کیا تمہارے دل میں یہ خواہش نہیں کہ تم میں سے کوئی چیز نکال لیجائے اور تمہاری حالت ہی بدل دیجائے رموز الہی سے ہم بالکل واقف ہو جائیں۔ یہ ہمیشہ کے رات دن سے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ میں کچھ عرصہ کیلئے بالکل تبدیل ہونا چاہتی ہوں"

"یہ ممکن نہیں" مرد نے کہا "خداؤں کا وجود بیشک ہے۔ ہمارے باپ دادا بھی خداؤں کے وجود کے

اور اسی طرح آدمی قایل تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ بنی نوع انسان کے جھگڑوں میں وہ ہرگز دخل نہیں دیتے ان کے جھگڑوں میں نہیں جا سکتے "

عورت کا چہرہ بجد ا داس ہوگیا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں اس کے آنسو گالوں پر بہنگے۔ اس نے کہا کہ اسے مچھلیوں سے نفرت ہے جزیرہ سے نفرت ہے حتیٰ کہ اسے اپنی ذات سے بھی نفرت ہے۔

" میری خواہش ہے کہ کسی خدا سے ملوں "۔ اس نے کہا " اور اس ہستی سے بات چیت کروں جو ہر فانی چیز سے اعلیٰ ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ وہ کس شکل کے ہوتے ہیں ؟"

" اس کے متعلق " مرد نے کہنا شروع کیا۔ متعدد خیالات ظاہر کئے گئے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کھجور کے درخت سے بھی زیادہ طایل اور بے انتہا قوی ہوتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ جو قوتیں ہم میں پوشیدہ ہیں ان کے ذریعہ ہم انہیں پا سکتے ہیں جو چیزیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں ان کے متعلق گفتگو کرنا احمقانہ فعل ہے۔ اچھا اگر تم مچھلی پکڑنے سے ناراض ہو تو آؤ چل کر کشتی ہی کو دیکھیں گے !"

عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

کشتی میں انہیں ایک بسکٹ کا ڈبہ ملا۔ اس کے پہلے انہوں نے کبھی بسکٹ نہ دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد وہ اس کے استعمال سے واقف ہو گئے۔ انہوں نے اس کے ہار بنا کر اپنی گردنوں کے گرد باندھ لیا۔

اس کے علاوہ انہوں نے ایک بڑی شیشی پائی جس میں پانی کے رنگ کا کوئی عرق تھا عورت نے اس کا کاگ کھولا اور اس میں اپنی انگلی ڈال دی۔ اس کو اس نے چکھ کر دیکھا۔

" اس کا مزا کیسا ہے ؟" مرد نے سوال کیا۔

" اس میں آگ نیند اور گناہ کی لذت شامل ہے "۔ عورت نے جواب دیا۔

" اس صورت میں ہمیں اپنے پیالے لے آنے چاہئیں "۔ مرد نے کہا۔

ان کے پیالے ناریل کے دو خول تھے جو کثرت استعمال سے صاف ہو گئے تھے۔ مرد نے عرق سے ان کو بھر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سے پینے لگے۔ کیونکہ جس شیشے میں گناہ، نیند اور آتش کی لذت شامل ہو وہ جلدی نہیں پی جاتی۔ جب دوسری مرتبہ اس عورت نے پیالوں میں عرق کو بھر دیا تو اسے یقین ہوگیا کہ اس شیشی میں خدا موجود ہے۔

دوسری صبح جب عورت بیدار ہوئی تو اپنگرے ہوئے مقام سے وہ لڑکھڑاتی ہوئی سمندر کی جانب چلنے لگی۔ وہ اپنے سر کو پانی میں اس وقت تک ڈبوئے رکھی جتنی دیر وہ برداشت کر سکتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سطح آب پر ساحل کی جانب تیرنے لگی۔ یکایک اس کے بازو سے مرد کا سر بھی نمودار ہوا جو اب تک پانی میں تھا۔

"اس کے متعلق اب کوئی شبہ باقی ہی نہیں" عورت نے کہا "کہ ہم نے نامعلوم رب کو پالیا ہے اور ہم میں اس کا جو اثر اب موجود ہے اس کے ذریعہ ہم اسے پا سکتے ہیں"

"آج صبح سے میری طبیعت ٹھیک نہیں" مرد نے کہا

"اور میری بھی" عورت نے کہا "لیکن کل کی شب نہایت شاندار تھی میں نے اتنی دیر تک اور اس قدر وحشیانہ انداز میں اس سے پہلے کبھی رقص نہ کیا تھا اور نہ میں نے کبھی اتنا ہنسا تھا"

"مجھے یوں محسوس ہوا" اس نے عورت کے پہلو بہ پہلو تیرتے ہوئے کہا "کہ میں بیحد ظریف اور نکتہ رس ہوگیا ہوں"

"نہیں یہ نہیں تھا" اس نے کہا "ہر چیز بیحد دلکش ہوگئی تھی۔ سمندر، کشتی، درخت غرض ہر چیز کو دیکھکر میں ہنستی رہی اور تم بھی ہنستے رہے"

"ہاں مجھے یاد ہے" مرد نے کہا "ساری فضا اور کائنات نشاط و طرب کی رنگینیوں سے بھر گئی تھی لیکن آج میری حالت کچھ ٹھیک نہیں"

اس نے پانی میں غوطہ لگایا۔ عورت نے بھی اس کا ساتھ دیا اور تھوڑی دیر میں وہ ساحل کی ریت پر پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔

"ہم روزانہ اپنے ناشتہ کیلئے اسی وقت مچھلیاں پکڑا کرتے ہیں" عورت نے ابتدا کی "لیکن آج میں ناشتے کیلئے کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی ہوں اور میرا خیال ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں کچھ بھی نہ کھاؤں"

"یہی میرا بھی ارادہ ہے" مرد نے کہا "لیکن اس بات کا انکشاف کس طرح ہو کہ شیشی میں خدا ہی تھا"

"اسی طرح" عورت نے فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا "جس طرح کہ درخت کی ایک لمبی ڈالی کو ایک سمت میں کھینچ کر چھوڑنے سے وہ اسی قوت اور تیزی سے مخالف سمت کو چلی جاتی ہے۔ یونہی۔ جس طرح کل شب اپنی بلند پروازی سے عرش اعلیٰ کے قریب پہنچ گئے تھے اسی طرح آج اسفل السافلین میں گھسٹے جارہے ہیں۔

اس ترد عمل سے میں راضی ہوں تم کیوں اُٹھ رہے ہو؟ کہاں چلے؟

"میں اس شیشی کو دیکھنے جا رہا ہوں" مرد نے کہا "شاید اس میں اس چیز کا کچھ حصہ باقی ہو جس میں آتش،
نیند اور گناہ کی لذت شامل ہے"

"لیٹ جاؤ" لڑکی نے کہا "اس میں کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ میں نے خود اچھی طرح دیکھ لیا ہے"

× × × × × × × × × ×

دو دن کے بعد مرد اور عورت نے ساحل پر نمبر پتھروں سے ایک کچا لیکن بلند مینار تعمیر کیا جس کی چوٹی
پر اس شیشی کو رکھدیا گیا جس میں خدا رہتا تھا۔ اس کی خوشبو ابھی وہاں باقی تھی۔
مرد کا خیال ہے کہ عورت اس کے متعلق بہت غور و فکر میں مصروف رہتی ہے۔ اگر تبلیغی جماعت کا گذر وہاں
ہو جائے تو کیا صورت پیش آئیگی؟ . . . .

حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی گذشتہ ربع صدی میں:-

جامعہ عثمانیہ نے ملک میں جو ذوقِ ادب کے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ وہ امید افزا ہے۔ اور جو افراد پیدا کئے ہیں اور یہ
جس طرح ملک کو علم و ادب سے مالا مال کر رہے ہیں ان میں عبدالقادر صاحب سروری ایم۔اے۔ال۔ال۔بی کی نمایاں شخصیت ہے
اس سے پہلے آپ کی کتاب "دنیائے افسانہ" نے کافی قبولیت حاصل کی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب آپ کی نئی کاوش ہے۔
جو نہایت تلاش و جستجو سے لکھی گئی ہے۔ ربع صدی کی تعلیمی ترقی کا دلکش انداز میں خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اور اعداد
و شمار سے بھی ثابت کیا ہے کہ کس قدر تعلیمی انقلاب ہوا ہے۔ ایسی ہی کتابیں ہیں جو پڑھنے والے کیلئے کافی فائدہ بخش
ہو سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپکی یہ کاوش لائقِ ستائش ہے۔ لکھوائی چھپوائی۔ کاغذ۔ نہایت اچھا ہے۔
مکتبہ ابراہیمیہ محی الدین بلڈنگ حیدرآباد دکن سے (عہ) میں ملسکتی ہے۔

شہاب

جلد (۳) شہریور ۱۳۴۴ف م جولائی ۱۹۳۵ع نمبر ۹

عوام سے (للعہ) مرتبہ گورنمنٹ سے (عـہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

برقی پریس میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد شایع ہوا۔

ذرّات

گلپوشی۔ نواب کاظم علی خاں صاحب بی اے ردم تعلقدار نے ذیل کی نظم اپنے گرامی قدر والد نواب ..کت جنگ حسام الدولہ بہادر کی صحت کے موقع پر پڑھی تھی جبکہ احباب کو ایک پرتکلف ضیافت دی گئی تھی۔

ابر بھی ہے۔ یار بھی ہے شغل مے نوشی بھی ہے | انتہائے عیش بھی ہے وقت خاموشی بھی ہے
کثرت ناز و ادا پر ہے ہجوم بیخودی ! | جان ستانی کا چلن بھی خود فراموشی بھی ہے
سر اٹھے راہ محبت میں تمنا ہے یہی ! | سرفروشی کیا ہے گویا یہ سبکدوشی بھی ہے
عالم مستی میں تو یہ یاد آتی ہے نہیں !! | بندگی بھی ہے عبادت بھی ہے مے نوشی بھی ہے
آج سے بہتر نہیں ہے وقت کاظم عیش کا | جشن میلاد نبیؐ بھی جشن گل پوشی بھی ہے

محترمہ ق نقوی صاحبہ مشہور انشا پرداز حیدرآباد دکن کی خدمت میں بی اے کی کامیابی پر ہدیہ تبریک پیش کیا جاتا ہے یقین ہے کہ آپ اپنے طبقہ کی اصلاح میں آئندہ اور دلچسپی لیں گی۔

عزیزی ہادی جعفری کے عقد پر مسرور تہنیت پیش کیجاتی ہے۔ اسکرد ائیلڈ کہتا ہے "کسی سے محبت کرنا شاعرانہ تخیل کی حسن آرائی ہے مگر تحریک مناکحت شعریت جذبات کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ خواہ اس کا جواب اثبات ہی میں کیوں نہ ہو" ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس حد تک صحیح ہے مگر یہ ضرور ہے کہ یہ قران السعدین بلقیس و سلیمان آسا ثابت ہوگا شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کے جعفری بزم شہاب میں غیر حاضر ہیں لیکن :———— ذکر میرا اس سے بہتر ہے کہ اوس محفل میں ہے۔

بزم کہکشاں کے عنوان سے آئندہ مہینہ ایک صفحہ رہیگا جس میں دلچسپ متفرق اشعار۔ پر لطف ادبی ترکیبیں۔ مشہور اقوال اور کارآمد باتیں ہونگی دیکھیں آپ کا ذوق ادب کس حد تک ہماری قلمی اعانت کرتا ہے آخر آپ کو بھی تو اچھے اچھے اشعار یاد ہوں گے۔ پھر بھیجد یجئے تا اونہیں لکھکر ہمارے پاس۔

رُباعیاتِ امجدؔ

ہم مورد الطاف و کرم کس کے ہیں؟
ہر دم ہدف تیر ستم کس کے ہیں؟
ہر چیز جہاں میں ہے، اس کی، اُس کی
لیکن، نہیں معلوم، کہ ہم کس کے ہیں؟

اُس سے خواہش کروں، کہ اس سے مانگوں
کچھ بھی حاصل نہیں ہے جس سے مانگوں
پہلے، مجھے حق کیا ہے؟ اگر کچھ ہے بھی
حق اپنا، سوائے حق کے کس سے مانگوں

یورپ کی دلچسپ ڈاک

(جناب نواب شہید یار جنگ بہادر)

(۵)

آج جبکہ یہ خط شائع ہو رہا ہے ناظرین ست ۲۰ جون کو حضرت والا شان نواب اعظم جاہ بہادر عزیمت دربائے حیدرآباد ہو چکے ہیں جن کی معیت کا شرف شہید کو حاصل ہے اس لئے قارئین کو یہ خیال ہوگا کہ ارض حسن و عشق شعر و موسیقی کا سلسلہ جو سونے کے تار کی طرح جاری تھا وہ شاید ناشنیدہ منقطع ہو جائے مگر آپ اطمینان رکھیں کہ زلف یار کمر سے بھی گذر جائیگی اور یہ حکایت ایک عرصہ اور دراز رہیگی۔

اگر شہید فراوانی حسن اور مصائب رنگین کے حالات ہر ہفتہ نہایت پابندی سے ایر میل سے بھیجا کریں تو شکریہ کے متمنی ہیں تو البتہ انہیں مایوسی ہوگی کہ اپنے ایک دیرینہ بسمل کیلئے چند تحریری نقوش بھیج کر کام ہی ایسا کیا گیا ہے جو کسی ستایش کے آرزومند ہوں مگر شہاب کا ممنون ہونا چاہئے شہید کو جس نے انہیں برسوں کا بھولا ہوا سبق (مضمون نگاری) پھر یاد دلا دیا ہے۔

ہاں ہمارے لئے البتہ یہ مشکل دکھائی دے رہا ہے کہ وہ آئندہ بھی آمادہ نگارش رہیں اگر شہاب نے شہید کو اپنا بسمل بنا لیا تو کہہ سکتے ہیں کہ کارے کردی" چھوڑئیے یہ تو مستقبل کا سوال ہے لیکن کائنات کے ہر ذرہ کو دیکھئے جو حسن سے لبریز ہے موسیقی کے اس نغمہ کو سنئے جس کے دیکھنے اور سننے کیلئے ہر نوجوان اپنے پہلو میں ایک بیقرار تمنا اور ایک آرزوئے مضطرب رکھتا ہے۔

بسمل

۲ر صفر روز سہ شنبہ ۷ رتی ۳۵ف

مانٹرو سوٹیزرلینڈ

شہید نواز۔ سلام مسنون اسلام محبت نامہ مورخہ ۱۲ رمحرم اور شہاب کے دو نمبر پہنچے۔ شکریہ۔ اس خط نے شورد یہ ستان یاد دہانیدن کا کام کیا۔ کچھ تو ناسازی مزاج اور کچھ عدیم الفرصتی نے لکھنے کی مہلت ہی نہ دی۔ مانٹرو کی آب و ہوا نے آخر اپنا اثر دکھلایا دس بارہ روز سے "دھو مشک میں" بانی کے درد میں مبتلا ہوں خیر!

تم کو یورپ کی داستان سے غرض۔ سے

سرگذشت بلاکشاں نہ سنو!!   نہ سنو میری داستاں نہ سنو!

اچھا تو آپ سے گذشتہ خط میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہماری "اسکینگ" یا بقول یہاں کے حضرات کے "شی انگ" کی داستان سنائینگے۔ اب سماعت فرمائیے کہ حضرت والاشان دام اقبالہ نے یہ ارادہ فرمایا کہ ازدواج سے روانگی کے قبل پوری پارٹی شی انگ کے لطف سے بہرہ اندوز ہو۔

روانگی سے ایک روز قبل ہمارا قافلہ (لیکن اس لفظ کے ساتھ ہی آپ کو گلستان کا پڑھا ہوا سبق نہ یاد آجائے) پورے ساز و سامان سے تیار ہوگیا یعنی شی انگ کا خاص لباس (سر سے لیکر پیر تک) خرید لیا گیا جس کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے ہمارے قافلہ کی روح رواں نواب رستم یار جنگ بہادر نے "گفتمش چیست اس کی انگ بگفت . ساختی جنبش بقصہ سالی چند" غرض ہمارا قافلہ پورے ساز و سامان اور تزک احتشام سے ہوٹل سے سیلیج میں سوار ہوکر روانہ ہوا۔ بظاہر دیکھنے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب اس کام میں بڑے مشاق ہیں اور گویا عمر بھر یہی کام کرتے رہے ہیں۔ ہمارے ہمراہ جنس لطیف کے دو نمونے بھی تھے جنھیں اس کی انگ میں ید طولی حاصل تھا۔ بھائی صاحب اب آگے کچھ نہ پوچھئے ہمارا یہ اپنے ساز و سامان و دعوئی مردی بار بار برف پر فلا بازیاں کھاتا اور ان دو تو ستم ظریفوں کے قہقہے عمر بھر تو بھولینگے نہیں۔ یوں تو وہ کون تھا جو نہ گرا ہو اور سچ پوچھو تو ہماری سمجھ میں تو شی انگ کے معنی ہی برف پر گرنے کے ہیں اس سے زیادہ نہ ہم نے کچھ کیا نہ ایک روز میں اس سے بڑھکر توقع بھی کیجا سکتی ہے جب ہم لوگ ٹوبا گننگ کیلئے چلے ہیں (ٹوباگننگ ایک چھوٹی سی بلندیوں کی گاڑی ہوتی ہے جس پر دو تین شخص بیٹھکر برف پر بلندی سے نیچے کی جانب پھسلتے ہوئے جاتے ہیں) ڈاکٹر صاحب موصوف سب سے آگے بیٹھ گئے اور ہمیں سب سے آخر میں تیسرے نمبر پر جگہ ملی اب یہ نہ پوچھئے کہ دوسرے نمبر پر کون تھا عین اس وقت جب کہ ہمارا شیطانی چرخہ بیچ راہ میں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیر اٹھا کر اوپر رکھ لئے چاہے یہ فعل گھبراہٹ ہی میں سرزد ہوا ہو مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی جانب جو پہلے ہی سے نمبر ۲ کی خاطر سے اوس چرخہ میں صرف دو انچ کے حصہ دار باقی رہگئے تھے اب اس سے بالکل ہی محروم کردئے گئے اور اگر خود بخود ہاتھ نہ چھوٹ جاتے تو یقیناً ہمارا جسم بھی اسی چرخہ کا ایک حصہ جز نظر آتا جو اوسی طرح گھسٹتا ہوا چلا جاتا۔ مگر ہاتھوں کے چھوٹ جانے کے بعد ہمیں تو کچھ نہیں معلوم البتہ ہم نے دیکھا کہ لوگ ہماری طرف دیکھکر قہقہہ لگا رہے ہیں تو ہم نے بھی بے اختیار (تو کیپ کمپنی) یعنی "خواہی نہ شوی رسوا ہمرنگ جماعت شو" قہقہہ بازی شروع کردی

خیال ہوا کہ ضرور پنج عیب شرعی میں سے کم سے کم کسی ایک عیب کے حصہ دار ہو جائینگے مگر جب جہاڑ پہونچ کر کھڑے ہوئے تو یہ معلوم ہوتا تھا گرنے والا کوئی دوسرا ہی تھا حضرت والا شان کے ساتھ تو دو خاص ماہران فن موجود تھے جو اونہیں سنبھالے ہوئے تھے ڈاکٹر کلارک صاحب کا گرنا بھی اون کے بس کی بات نہ تھی جب کوئی چلیگا تو گریگا "وہ طفل کیا گریگا جو گھٹنوں کے بل چلے" اب رہ گئے میاں محبوب علی طاہر بہ لحاظ سن و سال گرتے بھی تھے دوڑتے بھی تھے مجھے صرف ان کے کمر کی فکر رہتی تھی کہ گرنے میں بل نہ کہا جائے باقی ہمارے قافلہ میں ہم دونوں (ایں جانب و نواب صاحب موصوف) ہر خرد و کلاں کے جاذب نظر تھے وہ اون کا مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرنا اور وہ میرا بہرحال اپنے کو اون تک پہنچانا وہ اون کا کڑی تیوریوں سے مجھے گھورنا۔ ہر شخص کیلئے کافی دلچسپی کا سامان مہیا کر رہا تھا اس کے بعد چاء نوشی کا خوب لطف اٹھا چلئے زخموں کا اندمال ہو گیا شام میں واپس ہوئے سمجھے تھے کہ تھک کر چور ہو جائینگے مگر عجب حال ہے کہ یہاں کی آب و ہوا کا یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کوئی غیر معمولی کام کیا گیا۔ یہ تھی ہماری اس کی انگ یا شی انگ کی داستان دوسرا روز اروزا سے ہماری روانگی کا تھا سیلیج میں سوار ہو کر اسٹیشن پہنچے یہاں سے میٹر گیج کو رجنکشن تک جاتی ہے اروزا سطح سمندر سے ۲۰ ۱۵ فٹ بلند ہے اور ریل کی راہ معشوق کے گھونگر والے بالوں کی طرح پیچ و خم لئے ہوئے ہے آتے جاتے چڑھاؤ اور اتار کے لحاظ دو دو انجن لگانے ہوتے ہیں۔ ۲ بجے دن کے کور پہنچے یہاں سے براڈ گیج میں سوار ہونا ہے ایک پوری بوگی ریزرو تھی مگر اب تک جہاں تک ہم نے سفر کیا ہے ریل کا ڈبہ اس قدر آرام دہ ہم نے نہیں دیکھا۔ تعجب ہے کہ یورپ میں جب اس قدر اچھے ریل کے ڈبے موجود ہوں تو پھر اون کبوتر نکی کا بکوں میں کیوں سفر کیا جاتا ہے۔ پوری بوگی دو حصوں پر منقسم ہے بس یہ سمجھ لیجئے کہ دو مختصر سے سٹنگ روم ہیں ایک کا رنگ سرخ ایک کا نیلا۔

سرخ حصہ میں پورے فرنیچر ہر شے سرخ مخمل کی ہے اور نیلے حصہ میں اسی طرح نیلی۔ کسی قسم کی بنچین وغیرہ نہیں ہیں صرف ہر دو طرف آخر میں دو صوفے چھوٹے چھوٹے رکھے ہوئے ہیں جن کے سامنے دو میزیں ہیں جو گھوم سکتی ہیں باقی سیلون میں بارہ چودہ کرسیاں پڑی ہوئی ہیں جو جہاں چاہے رکھ لی جا سکتی ہیں کناروں پر فولڈنگ تختے لگے ہوئے ہیں جو وقت پر چھوٹی چھوٹی میزوں کا کام دے سکتے ہیں غرض دن کے سفر کیلئے آرام دہ ہے۔ یہ سفر آرام دہ رہا۔ ایک تو سوئٹزرلینڈ اپنے سینری کیلئے مشہور ہے دوسرے ہم خاص

لیک جنیوا کے کنارے کنارے جا رہے تھے نہایت ہی خوشنما نظارا تھا۔ یہاں ایک جملہ معترضہ یہ بھی سن لیجئے اس ریل کو دیکھکر
ایک اور ریل کا سفر یاد آگیا جنگ عظیم کے ختم کے ساتھ ہی مجھے سفر عراق درپیش ہوا۔ بغداد شریف سے سامرہ مقدسہ تک
جرمنیوں کی ڈالی ہوئی ریل تھی جاتے جاتے انہوں نے اسباب منقولہ سب منتقل کر لیا ریل کی پٹریاں ٹوٹے پھوٹے واگن
وغیرہ کچھ ناکارہ سامان جلدی میں چھوڑ گئے گورنمنٹ عراق نے ایک دو انجن ٹھیک ٹھاک کر لئے اور کچھ چوپایوں کے
واگن لگاکر ریل دوڑانی شروع کردی اور مصیبت کے مارے مسافروں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ بدقسمتی اور خوش قسمتی
دونوں کا ساتھ تھا یعنی سفر عین جاڑوں کے موسم میں جسے وہاں کی اصطلاح میں "چلۂ کبیر" کہتے ہیں درپیش تھا اور
رفیق سفر اور ایک تھے۔ سردی اس شدت کی تھی کہ دانت بجنا بھی بند ہو گیا تھا یعنی شاید وہ بھی مثل پانی کے جم
گئے تھے۔ مغرب کو بغداد شریف سے روانہ ہوئے بارہ بجے رات میں سامرہ مقدسہ کے اسٹیشن پر پہنچے۔ ڈبہ میں سیٹ
ندارد۔ فرش ڈالکر اطمینان سے بیٹھے رہے ظاہر ہے کہ لوہا سرد ہو گیا اور ایک چھوٹی سی شطرنجی کیسے گرم رکھ سکتی۔
صبح میں چھ بجے ارتغانہ سے نہر تک ایک گھنٹہ کا راستہ طے کرنا وہاں سے کشتی میں اوس کنارہ پر سامرہ مقدسہ تک جانا
تھا۔ اس بلا کی سردی میں کیسے گذری ہوگی اور کہاں بسر ہوگی اسٹیشن کا وجود نہیں ایک حجرہ بنا ہوا تھا اور دو چار
ڈیرے لگے ہوئے تھے جس میں اسٹیشن کا آفس اور عملہ رہتا تھا وہاں سے بالکل قریب برٹش فوج کا ہیڈکوارٹر تھا۔
اور دور سے اون کے ڈیرے بھی نظر آرہے تھے خوش قسمتی سے ایک صاحب اوورکوٹ پہنے ہوئے اسٹیشن روم سے
نکلے۔ ہم نے ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ چاندنی رات تھی خط وخال سے معلوم کیا کہ ہو نہ ہو کوئی ہندوستانی ہیں ہم نے ان
کی جانب قدم بڑھائے اور کشش وطن نے اونہیں ہماری طرف ڈھکیلا۔ ملاقات ہوئی۔ اونہوں نے کہا آپ یہاں کیسے
آئے ہیں ہم نے وجہ سفر بیان کی اور اپنی مصیبت کی داستان سناتے گئے اونہوں نے ہمیں ٹھیرایا خود اسٹیشن روم میں
واپس گئے اپنے ہمراہ دوسرے ہندوستانی صاحب کو لیتے ہوئے آئے اور ہم سے یہ کہا کہ آپ ڈبہ سے نہ اتریئے۔
اسٹیشن ماسٹر صاحب اس کا انتظام کر دینگے کہ ڈبہ کاٹ کر پلیٹ فارم پر ایک بازو کھڑا کر دیا جائے آپ آرام سے
اوسی میں ٹھیر سکتے ہیں اس کے بعد اونہوں نے اخلاقاً دریافت کیا کہ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو فرمایئے ہمارے
رفیق سفر نے جھٹ سے اس خیال سے کہ بھاگتے ہوئے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ کچھ آگ تاپنے کے سامان کی خواہش
کردی اور دبی زبان میں یہ بھی فرما دیا کہ کاش اس وقت چاء ملجاتی۔ دیکھئے اتفاق کی بات جو صاحب ہم سے مخاطب

تھے وہ فوجی کمشریٹ افسر تھے اور وہ اس وقت اسٹیشن پر محض اس وقت اسی لئے آئے ہوئے تھے کہ ریل سے اونہیں
راشن وغیرہ کا سامان اتروانا تھا اگرچہ ”خرچ چو از کیسہ مہمان بود۔ حاتم طائی شدن آسان بود! پھر بھی اوس
بیچارے کیلئے کانپتے ہوئے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ اوس نے ایک لکڑی کا گٹھا جو اس زمانہ میں بھی عراق میں
کم سے کم دس روپیہ کی مالیت کا ہوگا ہمارے ڈبہ میں رکھوا دیا اور آگ سلگا دی لیجئے جینے کا سامان ہوگیا
اور وہ بیچارا چاء اور شکر لانے چلا گیا اب جو لکڑیوں کو آگ دیگئی تو موسم کے لحاظ سے لکڑیاں نم ہوگئیں تھیں دہواں
دینے لگیں اس پر ہمارے رفیق صاحب کا اوس بیچارے محسن کو روتے ہوئے کو سنا کہ ظالم بدمعاش کچی لکڑیاں دیگیا
(گویا آپ نے خریدی تھیں) پنجابی ہے ناقابل اعتبار۔ غرض وہ بیچارا اوس کڑاکے کے جاڑے میں شکر اور چاء لیتا
آیا۔ ہمارے بھائی صاحب نے محض تجاہل عارفانہ سے استفسار فرمایا کہ کیا یہاں دودھ نہیں ملتا؟ وہ بیچارہ اپنے
پنجابی لہجہ میں ”ہاں ملجائیگا“ کہتا ہوا پھر دوڑا گیا اور چاء دم دینے کی خدمت ہمارے سپرد ہوئی کیونکہ وہ
ہیزم بیت الحرام صرف ”نہ مال فروختنی نہ مال سوختنی“ ہی نہیں۔ نہ مال منتقل شدنی بھی تھے۔ القصہ چاء دم ہوئی۔
(سامان چاء نوشی وہ مسافر نواز دے ہی گیا تھا اتنے میں وہ شخص دودھ کا ڈبہ لیتے ہوئے موجود ہوگیا اور مکرر
ہم سے کسی اور شئے کی ضرورت کا سوال کرنے کے بعد یہ کہکر روانہ ہوگیا کہ آپ اطمینان سے آرام کریں یہاں آپکو
کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے میں نے پہرے کے سپاہی سے کہدیا ہے کہ وہ اس طرف بھی نظر رکھے۔ میں صبح میں چھ بجے
آکر سامان چاء نوشی لے لوں گا اور آپ کو ارتعانہ میں سوار کرا دوں گا۔ ادہر ہمارے نازک مزاج ہمسفر نے چاء
پینے کے لئے حرکت مذبوحی کی اور اپنی دولائی سے منہ نکالا اور بمشکل اوٹھ بیٹھے۔ چاء کی پیالی اٹھائی منہ تک لیگئے
اور لگے چابیوں کی شان میں قصیدہ سرائی فرمانے۔ میں حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ ہیں کہ سلسلہ بھی
نہیں ٹوٹنے پاتا آخر بہ مشکل یہ عقدہ لاینحل حل ہوا کہ دودھ کا ڈبہ پرانا ہے اور بو ہوگئی ہے۔ اب تک یاد آتا
ہے اون کا وہ خاص انداز سے فرمانا کہ دیکھتے ہو سڑے ہوئے دودھ کا ڈبہ دیکر مفت کرم داشتن کیا۔ کہیں اور نہ
پھینکا ہمارے سر مار گیا۔ بدمعاش کہیں کا۔ خیر صاحب بدقسمتی سے سڑے ہوئے دودھ کا ڈبہ اور خوش قسمتی سے
ان کا ساتھ ہوا دونوں باتیں تا دم زیست یاد رہینگے۔ دیکھئے بھائی صاحب کیا اس واقعہ کے یاد آجانے کے
بعد آپ کو اس کے لطف میں شریک نہ کرنا ناانصافی نہ تھی۔ غرض ایک وہ سفر تھا ایک یہ سفر اور یہ مصیبت میں بھی

آرام تھا اور اوس تکلیف میں بھی لطف تھا۔ آج دنیا کی ہر طرح کی راحتیں اور آرام حاصل ہے۔ خیر آپ پھر کہیں گے کہ ہمیں حالات سفر سننے ہیں فلسفہ خوشی اور غم بیان کرنے کا کون موقع ہے۔ اچھا تو سمجھ لیجئے کہ رات کے آٹھ بجے مانٹرو پہنچ گئے۔ اب رات کا وقت میں یہ تو بیان نہیں کرسکتا کہ مانٹرو شہر ہے یا گاؤں خوشنما ہے یا نہیں۔ سردی شدت سے ہو رہی ہے مینھ کی پھوار پڑ رہی ہے اسٹیشن سے پالس ہوٹل میں جہاں ہمارے شہزادہ والا شان کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے۔ کچھ دور نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ پانچ منٹ میں ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ تمام ہوٹل کا عملہ استقبال کیلئے موجود تھا۔ دوسری منزل پر ہمارے حجرے تھے تقریباً پوری ایک منزل ہمارے لئے مخصوص کردی گئی تھی۔ ہمارے حجرہ کا نمبر (۱۰۵) ہے۔ اب معاف فرمائیے۔ سفر کے تھکے ماندے ہیں منھ ہاتھ دھوئینگے کچھ مالک حقیقی کو سمجھائینگے کچھ مالک مجازی کی خدمت کرینگے آخر میں زندگی کی سب سے بڑی دو ضروریات بھی ہیں کھانا اور سونا۔ جیتے رہے تو باقی حالات پھر سنائیں گے۔ ورنہ آخر میں آپ ہمارا شہادت نامہ تحریر فرماکر ختم فرمادیں۔

دیکھو بھائی بسمل میں مضمون نگار نہیں اور نہ میں ایسی بیوقوفی کا مرتکب ہوتا۔ رشتہ درگردنم افگندہ دوست۔ تم نے مجبور کیا تعمیل حکم کردی۔ اب چاہے تمہیں پسند آئے یا نہ آئے۔ مگر یار میرے پورے دو گھنٹہ اس میں صرف ہوگئے ایک تو فرصت ملنی مشکل اوس پر اس غنیمت وقت کا اس طرح ضائع ہونا۔ خدا جانے تمہیں اس میں کیا لطف آتا ہے۔ خدا کرے یہ تمہیں پسند نہ آئے اور مجھے آئندہ کیلئے فرصت ہوجائے۔ خدا حافظ و ناصر۔

(تمہارا شہید)

وجدانیات

(جناب سکندر علی صاحب وجدؔ بی۔اے عثمانیہ)

اے دردِ عشق کے قابل بنا دیا تُو نے
روِش روِش کو مرے دل بنا دیا تو نے

سفینہ ڈوب چکا، اب کون ہے اے طوفاں!
بھنور کو دامنِ ساحل بنا دیا تو نے

ہر ایک کامل ناقص کو رشک ہے مجھ پہ
خوشا! کہ ناقص کامل بنا دیا تو نے

یہ سب قصور ہے انھیں کم نگاہی کا
نظر کو پردۂ محمل بنا دیا تو نے

اے وجدؔ میں تری مشکل پسندیوں کے نثار
ہر ایک سہل کو مشکل بنا دیا تو نے

اعترافِ شکست

(جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآباد)

(۱)

یوں بھی سینی ٹوریم کوئی تفریح گاہ نہیں ہوسکتا کیونکہ جہاں موت آنکھوں میں پھر رہی ہو وہاں تفریح کا کیا ٹھکانا؟ جہاں موت کا فرشتہ پر کھولے ہوئے منڈلا رہا ہو کبھی اس کی تاک میں ہو کبھی اس کی گھات میں وہاں اطمینان قلب کیا امکان؟ جہاں کرب بے چینی اور آہ و زاری کا تسلط ہو وہاں سکون کا کیسا گذر؟ کسی کی چیخ دل ہلا رہی ہو اور کسی کا سکوت موت کا پتہ دے رہا ہو تو وہاں بےفکری کا کیا وجود۔

یہی فضا کیا کم جان لیوا تھی کہ رات کا سایہ سینی ٹوریم پر پڑنے لگا۔ تاریک۔ خوفناک اور وحشت انگیز سایہ ہر چہار جانب پھیلنے لگا تاریکی بڑھتی گئی خوف و وحشت میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ نصف شب گذر گئی اور وہ وقت آیا جب کہ عاشق نامراد کی آنکھیں انتظار دوست میں راہ دیکھتے دیکھتے پتھرا جاتی ہیں حرماں نصیب فراق کی کڑیاں جھیلتے جھیلتے زندہ درگور ہو جاتا ہے اور مریض ناتواں پر جان لیوا دورہ پڑتا ہے۔

روم نمبر ۹ میں ایک مریض کی حالت تشویش کن نظر آتی ہے وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہا ہے لیکن کسی پہلو چین نہیں ملتا۔ اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہے۔ لبوں کو جنبش ہوتی ہے اور منہ کھلتا ہے لیکن آواز نہیں آتی۔ شاید وہ کچھ کہہ رہا ہے لیکن طاقت گویائی نہیں۔ کوشش کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے آخر "حمیدہ" "حمیدہ" کی صدا آہستہ آہستہ سنائی دیتی ہے۔ نرس جو ہمہ تن گوش ہے ان الفاظ کو دیر سے سننے کی سعی کر رہی تھی دفعتاً چونک پڑتی ہے۔ "وحید! وحید! تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟" وہ کہتی ہے "کیا پانی پیوگے؟ پانی۔ دیکھو! ادھر۔ کیا پیاس لگی ہے؟" یہ کہکر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ فوراً پانی سے بھرا ہوا فیڈنگ کپ اس کے منہ سے لگا دیتی ہے۔

دو چار گھونٹ پی کر وحید اپنے ہوش و حواس جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ صرف اپنی نیم وا آنکھوں کو اس کی طرف پھیرنے پر ہی اکتفا کر سکتا ہے۔

"کون؟ حمیدہ؟ پیاری حمیدہ۔ میرے دل کی مالک حمیدہ! ——

"نہیں۔ ایک نرس" نرس نے بات کاٹ کر کہا۔

کون کہتا ہے کہ یہ آواز حمیدہ کی نہیں ہے؟ میں نے بارہا سرو پر قمری کی "یا ہو" سنی ہے۔ بہت دور آم کے درخت پر کوئل کی کوکو سنی ہے۔ ہاں برگد کی اونچی شاخ پر پپیہے کی "پی کہاں" بھی سنی ہے ——— مگر حمیدہ کی میٹھی۔ سریلی اور ترنم ریز صدا گلاب کی نرم اور نازک پنکھڑیوں پر جیسے شبنم کے قطروں کے ٹپکنے کی صدا۔ پچھلے پہر نسیم سحری کے پیغام سے جیسے غنچے کے چٹکنے کی آواز کیا کہوں کچھ چیز ہی اور ہے۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ میں فرق کر سکتا ہوں۔ زمین و آسمان میں۔ ذرہ اور آفتاب میں ———

——(۲)——

ڈاکٹر دوسرے مریضوں کو دیکھتے ہوئے روم نمبر ۸ میں داخل ہوتا ہے اور وحید کو بڑبڑاتا دیکھ کر کہتا ہے:-

"کیا مریض کو بخار زیادہ معلوم ہوتا ہے؟ کیا وہ اسی طرح بڑبڑاتا رہا ہے؟ دفعتاً وحید سے مخاطب ہو کر "وحید! دیکھو تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے اس طرح اپنے آپ کو خطرہ میں نہ ڈالو تھوڑی دیر آرام سے سو رہو" نرس سے "جہاں تک ہوسکے ان کو سلانے کی فکر کرو۔ ذرا سا بھی آرام ان کے لئے نعمت ہے۔ اچھا ایسا کرو۔ یہ قرص (شیشی میں سے دو نکال کر) آدھا کھلاؤ۔ ابھی ابھی شاید نیند آجائے۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ نرس نے آدھا قرص وحید کو کھلایا اور کہا "لو اب سو رہو۔"

"یہ نرم یہ نازک یہ بلورین ہاتھ یقیناً حمیدہ کا ہے۔" نرس کا ہاتھ پکڑ کر وحید کہنے لگتا ہے "یہ جسم (گرفت کو مضبوط کر کے) سوائے حمیدہ کے کسی اور کا ہو نہیں سکتا۔ میرا احساس کہتا ہے کہ میں نے اس جسم کو بارہا مس کیا ہے اور اس کی روح سے بارہا ہم آغوش ہوا ہوں ———

"ہش۔ چپ رہو۔ ڈاکٹر صاحب نے بات کرنے سے منع کیا ہے؟" نرس نے بات کاٹ کر کہا

"مجھے یاد ہے خوب یاد ہے اس نے سنی ان سنی کر دی "جب میں ایک دفعہ بیمار ہوا تھا تو اسی ہاتھ نے مجھے دوائی پلائی تھی یہی آنکھیں میری خبر گیری کر رہی تھیں ——— تم انکار کرنا چاہتی ہو؟ مگر نہیں دنیا کی کوئی طاقت مجھے جھٹلا نہیں سکتی۔"

"دیکھئے دیکھئے آپ کی طاقت جواب دے رہی ہے۔ آپ بے وجہ تھک رہے ہیں۔ خدا کیلئے نیند کا خیال کیجئے۔"

نرس نے سلسلہ کلام منقطع کیا۔

"حمیدہ ۔ پیاری حمیدہ ۔ میں خطاکار سہی ۔ گناہگار سہی پھر بھی تمہارا ہوں ۔ تم ہی اگر بے اعتنائی کروگی تو کل کا مرتا آج ہی مرجاؤں گا ۔ ہاں آج ہی ۔ ابھی ۔ ابھی ۔ تمہاری آنکھوں کے آگے ———"

" نرس پہلو بدلنے لگی گو کہ لاکھ چھپانا چاہتی تھی لیکن صبر کا پیمانہ چھلک ہی پڑا ۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اور بے اختیار رونے لگی ۔

" تم رو رہی ہو ۔ کیوں ؟ اسی وجہ سے کہ تمہارے پہلو میں حمیدہ کا نرم دل ہے ۔ میری بے مزا داستان سے متاثر ہونا خود ہی بتا رہی ہے کہ تم حمیدہ ہو ۔ کیا اب بھی تم انکار کی جرأت کر سکتی ہو ۔ دیکھو ! ادھر میری طرف دیکھو چپ ہو ۔ وہی مہر خاموشی میری جان پر لگی اور تم خاموش ہو ۔ شاید تمہاری خاموشی سے مطلب نیم رضامندی ہے ۔

" آپ خواہ مخواہ اصرار کرتے ہیں "

" ہاں صرف اس لئے کہ تم اقرار کر لو "

" کیا اقرار کر لوں ؟ "

" یہی کہ تم حمیدہ ہو ؟ "

" ہو سکتا ہے کہ میری آواز آپ کی حمیدہ کی سی ہو "

" اور تمہارا جسم "

" ہو سکتا ہے کہ میرا جسم بھی حمیدہ کے جسم کے جیسا ہو "

" اور تمہاری روح "

" ہو سکتا ہے کہ میری روح بھی حمیدہ کے روح کی سی ہو "

" اے حمیدہ کی سی آواز ، حمیدہ کا سا جسم اور حمیدہ کی سی روح رکھنے والی ہستی سن کہ میری آرزو تھی کہ مرنے سے پہلے میں حمیدہ کو اپنی داستان غم پوری طرح سناؤں غلط فہمی کا ازالہ کروں ۔ اپنے کئے پر نادم ہوں اور اس سے رحم و کرم کی درخواست کروں "

" مگر ——— مگر وحید صاحب " نرس نے کہا " میں تو حمیدہ نہیں ہوں پھر مجھے داستان سنانے اور رحم و کرم کی درخواست کرنے سے فائدہ ؟

" مگر میرے نزدیک تو تم حمیدہ ہو اور میں یہی سمجھ کر تمہیں سارے واقعات بتاؤں گا "

" لیکن آپ بہت تھک گئے ہیں کچھ دیر آرام کر لیجئے "

" نہیں میں تھکا نہیں ہوں بلکہ اپنی ساری قوت اپنی غم انگیز داستان بیان کرنے کیلئے اٹھا رکھا ہوں کیا آپ نہیں دیکھتیں کہ نیند کا قرض مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتا میں کہوں گا اور ضرور کہوں گا۔ آپ کو سننا ہوگا اور ضرور سننا ہوگا "

" مگر مختصراً کہئے ایسا نہ ہو ڈاکٹر صاحب آ جائیں ——— "

——— (۳) ———

میں اپنی رام کہانی اس وقت سے شروع کروں گا جبکہ مجھے پہلی دفعہ شادی کرنے کا خیال ہوا۔ حالانکہ میں خوشحال تھا۔ نوکر بھی تھا اور وہ بھی گزیٹیڈ آفیسر لیکن نہ معلوم کیوں مجھے دولتمند گھرانہ میں شادی کرنے کا خیال ہوا۔ میرے خاندان والے بھی یہی چاہتے تھے البتہ میرا ایک ماہر معاشیات دوست ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ مجھے غریب گھرانے میں شادی کرنی چاہئے تاکہ دولت کی تقسیم میں توازن قائم رہے نہ صرف وہ مجھ کو یہی نصیحت کرتا تھا بلکہ سارے دوستوں اور ملاقاتیوں سے اسی نظریہ پر تبادلہ خیال کرتا تھا گو کہ ہم سے کوئی اس کی تردید کہ غریب لڑکے کو امیر لڑکی سے اور امیر لڑکے کو غریب لڑکی سے شادی کرنی چاہئے واجبی طور پر نہ کر سکتا تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے ہٹ دھرمی اور ضد کا کہ ہم برابر مرغ کی ایک ٹانگ کہا کرتے تھے ——— مختصر یہ کہ میں نے تم سے شادی کی اس امید پر کہ کثیر دولت ہاتھ آئیگی مگر تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے والد کے بخل کی وجہ سے مجھے مایوس ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ توقع کے بعد مایوسی بری بلا ہوتی ہے۔ امید ہی نہ ہو تو رنج کیسا یا بقول غالب ؎ " امیدیں جس کی کم ہونگی اسے صدمے بھی کم ہونگے " اس کے فوراً ہی بعد میرے دل میں آتش انتقام بھڑک اٹھی اور اُف گو کہ میں غلطی پر تھا لیکن قبضہ و اختیار سے باہر تھا جو کچھ کر گذرا آنکھیں بند کر کے بدلہ لینے کی فکر میں ——— آہ! حمیدہ میں کس منہ سے ان بدتمیزیوں کا ذکر کروں جن کی مدد سے میں نے تمہارے شیشۂ دل کو چور چور کیا۔ مگر نہیں! اپنی گناہوں کے اعتراف سے تو مجھے سکون ہوگا۔ میں نے لاپروائی شروع کی۔ رُوگردانی اختیار کی۔ بے توجہی برتی اور رفتہ رفتہ وہ سب کچھ کیا جس سے ایک شریک حیات کا دل زخموں سے چھلنی ہو سکتا ہے مگر تمہارا استقلال اور ضبط قابل تعریف تھا۔ مدت گذاری میں کوئی فرق نہ آیا۔ دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور میری بیجا سختیوں سے اپنے آپ کو متاثر نہ کرنے کی انتہائی کوشش کی ———

حمیدہ ! جان سے زیادہ عزیز حمیدہ میں اس وقت اندھا تھا۔ آنکھوں اور دل دونوں سے۔ نہ کچھ سجھائی دیتا تھا اور
نہ کچھ محسوس ہی ہوتا تھا۔ تمہارے استقلال کی وجہ سے آتش انتقام اور بھی تیز ہوتی گئی تا آنکہ شعلے بھڑک اٹھے۔
جب میں نے دیکھا کہ میرے حربے کارگر نہیں ہو رہے ہیں تو میں نے ایک قدم اور آگے بڑھانے کی ٹھانی اور دوسری
شادی کرلی —— ایک دولتمند لڑکی سے۔ تم سے علیٰحدہ ہو کر میں نے اپنے آپ کو اس کے سپرد کردیا۔ روپیہ کی ریل پیل
تو تھی اور ظاہرداری کے لحاظ سے سب ہی کچھ تھا لیکن حمیدہ میں سچ کہتا ہوں اور اس میں ظاہرداری کا کوئی دخل
نہیں کہ وہاں ایک بہت بڑی کمی تھی اور وہ کمی ایک شریک حیات کی ایک مونس و غمگسار کی اور ایک مشیر و معاون
کی وہ دولت کے نشہ میں چور اور میں اطاعت و فرمان برداری کا خواہاں۔ نبھنی تو کیسے۔ بہت جلد ہی جھگڑا
شروع ہوا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ ظاہر ہو گیا کہ نہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور نہ ساتھ رہ کر خوش
ہو سکتے ہیں۔ جب مجھے سعیدہ (یہ میری دوسری بیوی کا نام ہے) سے کوئی توقع نہ رہی تو بہ مجبوری میں تمہاری
طرف واپس ہوا۔ گو خودداری کا خیال تھا اور علاوہ اس کے طبیعت گوارا نہ کرتی تھی کہ میں نے جس قسم کا وحشیانہ سلوک
تمہارے ساتھ کیا تھا اس کی یاد لیکر میں دوبارہ تمہاری ہمدردی کا خواہاں ہوں لیکن سوا اس کے کوئی چارہ نہ
تھا مگر میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں تمہارا پتہ نہ لگا سکا۔ نہ میں سعیدہ کے ہاں ہی لوٹ سکتا اور نہ
تمہارا سراغ ہی لگانے میں کامیاب ہو سکتا تھا —— (وحید کی آواز خستہ ہو گئی۔ تازہ
دم ہونے کیلئے اس نے پانی کا اشارا کیا۔ دو چار گھونٹ پی کر اس نے سلسلہ جاری رکھا) ——
میرا دماغ متاثر ہو گیا۔ قویٰ مضمحل ہو گئے اور صحت جواب دینے لگی عزیز و اقارب نے مجھے دق کا شکار سمجھ کر میری
مرضی کے خلاف اس سینی ٹوریم میں شریک کردیا۔ میں چاہتا تھا کہ تمہاری تلاش آخری وقت تک جاری رکھوں
تا کہ مروں بھی اسی تگ و دو میں مگر مشکل یہ ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہ کر بھی نہیں سکتا ——
حسن اتفاق کہ تم مل گئیں۔ کسے امید تھی کہ تم یہاں میری تیمارداری کیلئے موجود ہو گی —— حمیدہ ! پیاری
حمیدہ —— اوہ ! تم رو رہی ہو۔ کیا واقعی میری داستان اس قدر غم انگیز ہے ؟ مگر خدارا کہیں یہ نہ
کہہ دینا کہ تم حمیدہ نہیں ہو۔ تم حمیدہ ہی ہو۔ اور ضرور حمیدہ ہی ہو۔ پھر چھپانے سے فائدہ۔ جھٹلانے کا سبب ؟
کیا میں ناقابل عفو گناہگار ہوں ؟ کیا تم میری خطا بخشنا نہیں چاہتیں۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہارا اعتراف

سنکر میں از سرِ نو زندہ ہو جاؤں آہ! ـــــــــ خدا کیلئے مجھے نئی زندگی شروع کرنے کا موقع دو۔ ایک بار صرف ایک بار۔ پچھلے گناہوں کو دھونے کا موقع دو۔ ایک دفعہ صرف ایک دفعہ! ـــــــــ

اس قدر لمبی اور جذباتی تقریر کی وجہ سے وحید حد درجہ تھک گیا تنفس بڑھ گیا۔ زبان لڑکھڑانے لگی اور اعضاء پر تشنجی کیفیت طاری ہو گئی۔ باوجود اس حالت کے وہ منتظر تھا اس اعتراف کا کہ نرس حمیدہ ہی ہے اور اس اقبال کا کہ وہی اس کی پہلی بیوی ہے۔ نرس نے دیکھا کہ اگر وہ انکار کرتی ہے تو وحید جان بر نہیں ہو سکتا اور فوراً اس کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔

"ہاں میں ہی تمہاری غم نصیب حمیدہ ہوں"۔ نرس نے وحید کی پیشانی چومتے ہوئے اقرار کر لیا۔

ـــــــ(۴)ـــــــ

توقع کے خلاف وحید کی حالت روز بروز بہتر ہوتی گئی حتیٰ کہ ڈاکٹر نے اسے گھر جانے کی اجازت دیدی۔ لیکن یہ دیکھ کر سنی ٹوریم والوں کو تعجب ہوا کہ وحید کے ساتھ نرس بھی جا رہی ہے۔ ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور اب تک وہاں کے قدیم ملازموں کو یہ واقعہ یاد ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر شخص اس کو اپنی سمجھ اور خیال کے مطابق بیان کرتا ہے اصلی واقعہ کی کسی کو خبر نہیں۔

یہ واقعہ مجھ سے اس ڈاکٹر نے کہا جو اس وقت سنی ٹوریم میں وحید کی نگرانی کر رہا تھا اس کا بیان ہے کہ اس نے اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا۔ مجھے اس کے بیان پر بھروسہ ہے۔ چاہے آپ اعتماد کریں یا نہ کریں۔

اپنی نازک خیالیوں سے

نہیں، اب میں تم کو اپنی روح کے نرم آغوش میں جگہ نہیں دونگی اور نہ کنول کے پتوں کی طرح اپنی زلف کی پیچدار شکنوں میں گوندھونگی۔ میرے خوشگوار خیالات جاؤ۔ آسمان کے نورانی بیابانوں میں چلے جاؤ۔

نہیں، اب تم اپنے ہنس مکھ چہرہ کے ساتھ اور زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔ اب میں زندگی کے بلند اور تنہا مقامات پر ایک فرسودہ خیال شاعر ہوں میرے خوش کن خیالات، غائب ہو جاؤ، جاؤ ہوا سے بنی ہوئی چمکدار فضا میں ـــــــ اڑ جاؤ۔ (سروجنی)

مکتوبات جمیل

تمہارے ۲۹ اور ۳۰ ڈسمبر کے عنایت ناموں کا کس لہجہ میں شکریہ ادا کروں؟ اور ان پیاری تصویروں کا!

گذشتہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بڑی شورش میں کٹا۔ مجھے تو اکثر گمان ہوا کہ اب قیامت آئی۔ اب حشر برپا ہوا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ میرا خیال ہی خیال تھا۔ پچھلے دنوں مہمان بھی آئے اور میرا مزاج جو ہمیشہ کا ضدی ہے: ناساز رہا۔ پھر غیر معمولی دعوتوں کی شراکت نے مجھے مضمحل کر دیا۔

واللہ! تم بہت یاد آئیں، جب "پارک فیر" صرف بہانہ تھا اور کسی سے ملنا تمہارا کرم ملتمس تھا تو یہ راز پہلے ہی کیوں نہ لکھدیا؟

حقیقتاً میں بھی کیسی دیوانی ہوں! ——— واللہ مجھے صدمہ ہوتا اگر تم یہاں آتیں اور غیروں کے پاس ٹھیرتیں! انشاءاللہ اور بھی موقعے ہیں۔

آخر، تصویر، نے حشر برپا کر ہی دیا۔ آخر اس کا کیا حشر ہوا؟ آپ نظم لکھنا نہ چھوڑیئے۔

شوخ سہیلی مجھے چھیڑتی ہیں کہ تم نے شاعر سے، کے جواب میں مجھے ایک حسین جواب دیا ہے۔ ان کے بعض خطوط بڑے شریر ہوتے ہیں۔ اگر بھیجوں تو ڈر ہے کہ تم مدت تک واپس نہیں کرینگی۔

ان دنوں 'عمر خیام' کی اک جلد زیر مطالعہ ہے مجھے آرزو ہے کہ میں خیام کی شاعری کو اردو یا فارسی میں پڑھوں۔ بدقسمتی سے اس کا موقع نہ ہوا۔ تم کسی کتاب کا پتہ بتائیں آج کیلئے اسی پر بس کرتی ہوں۔

۷۸۶

لمعات وجہک اشرقت و شعاع طلعتک اعتلا
ز چہ روالست و بربکم نہ زنی بزن کہ بلا بلا
ز چہ روالست ... [illegible]

لمعات وجہک اشرقت و شعاع طلعتک اعتلا | ز چہ روالست و بربکم نہ زنی بزن کہ بلا بلا
تو کہ فلس ماہی حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم | بنشیں چو طوطی در قفس بشنو خروش نہنگ لا

قرۃ العین۔ زرین تاج

دربار مغلیہ کے جاہ و جلال کی ایک تابناک جھلک

(ایک انگریز مضمون نگار کے قلم سے)

(۲)

سلاطین مغلیہ کے دورِ حکومت میں امراجدی اور آزاد رؤسا نہ تھے کوئی نواب یا امیر ترکہ میں زمین حاصل نہیں کرسکتا تھا اس لئے کہ تمام زمین بادشاہ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی نواب یا امیر مرنے کے بعد اپنے وارث کیلئے کوئی جائداد چھوڑ جائے اس زمانہ میں امارت کے حصول کا انحصار زیادہ تر قابلیت پر تھا۔ پھر قابلیت بھی ایسی جس کے جوہر اعلیٰ فوجی عہدوں پر رہ کر دکھانے پڑتے تھے۔

سرکاری عہدوں کی تنخواہیں غیر ممالک کے قابل ترین آدمیوں کے لئے جو ہندوستان میں اپنی قسمت آزمانے کی غرض سے ایک طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ مقناطیسی کشش کا حکم رکھتی تھیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ایران کے معزز گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے ایرانی دربار کے آداب و مراسم سے پورے طور پر آگاہ ہوتے تھے۔

بادشاہ کے غیر محدود اختیارات

اس طرح مغلیہ دور کے سرکاری عہدیداروں میں غیر ملکی عنصر غالب ہوگیا تھا لیکن ترکوں عربوں ایرانیوں افغانیوں اور ہندوستانیوں (ہندوؤں اور مسلمانوں) سب کو بام رفعت پر پہنچنے کیلئے یکساں مواقع حاصل تھے۔ ہندوؤں میں زیادہ تر راجپوت شہزادے اور راجے مہاراجے ہوتے تھے۔ ان مختلف النسل نوابوں سرداروں اور راجوں کے اجتماع کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ دربار مغلیہ اس وقت مشرقی تمدن کا بہترین نمونہ پیش کرتا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا وہ خود امراء اور رؤسا کی طاقت ایک خاص سطح پر قایم رہتی تھی۔

بادشاہ کو ظل اللہ ہونے کے علاوہ اپنی رعایا کے جان و مال پر پورا اختیار حاصل تھا۔ ماتحت نواب اور سردار ذیلی مناصب کے حصول کے معاملہ میں مراحم خسروانہ کے محتاج تھے اس لحاظ سے اگر ایک طرف مغلیہ دربار کے آداب و مراسم سے ذلت اور محکومیت کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی تھی تو دوسری طرف کبر و نخوت اپنی پوری شان کے ساتھ دکھائی دیتی تھی۔

درباری آداب

تمام رسمی اور سرکاری تقریبوں میں امرا اور عوام دونوں کو بادشاہ کے سامنے ایسے انداز سے کھڑا رہنا پڑتا تھا کہ وہ گویا محکومی اور غلامی کا ایک زندہ مجسمہ ہیں ان کے ہاتھ بندھے اور سر جھکے رہتے تھے۔ راجہ مان سنگھ جن کا شمار شہنشاہ اکبر کے بڑے بڑے جرنیلوں میں تھا ذرا لنگڑا کر چلتے تھے لیکن انہیں بھی دوسروں کی طرح ایک سنہری عصا کے سہارے جھک کر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ یہ عصا ریاست جے پور کے توشہ خانہ میں اب بھی بہ حفاظت رکھا ہوا ہے۔ جب شہزادہ خرم دکن میں ایک بہت بڑی مہم سر کر کے لوٹا تو شہنشاہ جہانگیر نے شہزادہ کو درباری مراسم کی بجا آوری سے مستثنیٰ قرار دیدیا تھا۔ فاتح شہزادہ کو شاہ جہاں کا خطاب عطا ہوا اور اسے دربار کے موقع پر تخت شاہی کے قریب طلائی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔

کورنش

سرکاری تقریبوں پر تعظیم و آداب کے خاص قواعد اور انداز مقرر تھے جب شہنشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا تھا تو حاضرین "کورنش" بجا لاتے تھے۔ "کورنش" بجا لانے کا طریقہ یہ تھا کہ حاضرین دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو ماتھے پر رکھتے تھے اور سر کو نیچے جھکاتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ کورنش بجا لانے والوں نے اپنی عقیدت اور خاکساری کا اظہار کیا ہے "تسلیم" بھی مراسم آداب میں شامل تھی اور اس کو اکبر نے خود ایجاد کیا تھا۔ "تسلیم" بجا لاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی پشت کو زمین پر ٹیکنا اور پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھانا پڑتا تھا تا آنکہ تسلیم بجا لانے والا آدمی سیدھا کھڑا ہو جائے اس کے بعد وہ اپنی ہتھیلی اپنی چندیا پر رکھتا تھا جس سے یہ مراد تھی کہ تسلیم بجا لانے والا قربانی کے لئے ہمہ تن تیار ہے جب کبھی عہدہ یا جاگیر یا خلعت یا خاص تحفہ عطا کرنے کے لئے شہنشاہ کے حضور پیش کیا جاتا تھا تو اس کیلئے لازم تھا کہ تین مرتبہ تسلیم بجا لائے لیکن دوسرے موقعوں پر صرف ایک مرتبہ تسلیم بجا لانے کا فرض ادا کرنا پڑتا تھا۔

دین الٰہی اور سجدہ

جب دین الٰہی کے اجرا کا اعلان کیا گیا تھا اکبر کے مداحوں اور ارادتمندوں نے تعظیم کا ایک اور طریقہ رائج کیا اس کو سجدہ کہتے تھے۔ سجدہ کرنیوالا زمین پر لیٹ جاتا تھا۔ یہ طریقہ تعظیم صرف دیوتاؤں کے لئے مخصوص ہے اس جدت سے مراد یہ تھی کہ "اگر تم نے اکبر کو دیکھ لیا تو خدا کو دیکھ لیا"۔ اکبر نے اس جدت کو پسند تو کیا لیکن

اس کی بجا آوری پر زیادہ زور نہیں دیا اور جب اس نے دیکھا کہ "سجدہ" سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو سخت رنج محسوس ہوتا ہے تو اس نے سرکاری تقریبوں میں اس کی ممانعت کردی لیکن اگر کوئی خلوت میں اس سے ملتا تو اس کو ضرور سجدہ کرنا پڑتا تھا یہ صورت اکبر اور جہانگیر کے عہد تک جاری رہی لیکن شاہجہان نے اس کو منسوخ کردیا۔

بادشاہ سے عرض معروض کا قاعدہ

شہنشاہ سے براہ راست گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ ایک خاص افسر کے ذریعہ جو تخت کے قریب کھڑا رہتا تھا عرض معروض کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ افسر پہلے درخواستیں اور چٹھیاں لیتا اور زبانی عرضداشتیں سنتا تھا اور پھر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرتا۔ شہنشاہ بھی اسی افسر کی معرفت جواب دیتا اگر کوئی بولتا تو نہایت دھیمی آواز میں۔ اگر بادشاہ کے منہ سے کوئی لفظ نکلتا خواہ وہ بے معنی ہو یا بامعنی تو تمام حاضرین امراء اور سردار وغیرہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاکر کرامت! کرامت! کا غل مچانے لگتے انکساری اور آداب و تعظیم میں اتنا غلو کیا گیا کہ یہ محض دکھاوا ہی دکھاوا رہ گیا۔ حد سے زیادہ خوشامد ہر درجہ اور مرتبہ کے لوگوں کا معمول ہوگیا۔ برنیئر نے ایک برہمن کو اپنے مربی دانش مند خان کے ہاں ملازم کرایا۔ ملازم ہونے کے بعد جب کبھی برہمن اپنے آقا کا ذکر کرتا تو اس کیلئے عجیب و غریب خطابات اور القابات استعمال کرتا۔

شاہانہ شوکت اور عظمت کا اظہار

مغل شہنشاہ اپنی عظمت اور شان و شوکت دکھانے کے لئے اجنبیوں، سفیروں اور ہزیمت خوردہ راجوں اور مہاراجوں سے درباری آداب و قواعد کی تعمیل کرانے میں خاص لطف محسوس کرتے تھے۔ ایک مسیحی مورخ نے دربار اکبری کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے لکھتا ہے کہ جب ایک راجے نے اکبر کی اطاعت قبول کی تو اکبر نے دربار منعقد کیا۔ جونہی وہ راجہ دربار کے کمرہ میں داخل ہوا وہ اتنا جھکا اتنا جھکا کہ سر اور ہاتھ زمین سے جالگے پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا اور جھک جھک کر تسلیم بجالاتا گیا۔ جب شہنشاہ اور اس کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تو اس کی جامہ تلاشی لی گئی کہ کہیں اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو۔ جامہ تلاشی کے بعد اس نے آگے بڑھ کر شہنشاہ کے پاؤں کو چھوا۔ شہنشاہ نے بطور اظہار خوشنودی راجے کی گردن پر اپنا ہاتھ رکھا۔

غیر ملکی حکومتوں کے نمایندوں کو ان مراسم کی تعمیل کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن ان سے معمولی

درباری آداب کی تعمیل کرائی جاتی تھی

ہر اجنبی کو خواہ وہ کتنا ہی معزز ہو دربار کے کمرہ سے باہر ایک چھوٹے سے مرمریں کٹہرے سے کچھ فاصلہ پر کھڑا رہنا پڑتا تھا وہ اہلکار اس کی آمد کا اعلان کرتے تھے اور شہنشاہ اپنے معتمد خاص کو حکم دیتا تھا کہ اس شخص کو طلب کیا جائے۔

شاہی آداب اور ایرانی سفرا!

لیکن ایرانی سفرا کو جو گاہے گاہے ہندوستان آتے تھے ہندوستان کے مراسم آداب بجا لانے کی پابندی سخت شاق گذرتی تھی وہ اس سے پہلو تہی کرنے کی کوشش کرتے تھے اور شہنشاہ انہیں مراسم آداب بجا لانے پر مجبور کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ایرانی سفیر ہندوستان آیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے صوبوں کے گورنروں کے نام احکام جاری کئے کہ سفیر کی خوب خاطر و مدارات کی جائے۔ ایک افسر نے سرحد پر سفیر کا خیر مقدم کیا اور اسے دربار کے آداب بتانے کے بعد ضروری مراسم بجا لانیکی فہمائش کی لیکن شہنشاہ کو ایرانیوں کی بیجا ضد کا علم تھا۔ اس لئے اس نے دربار میں سفیر کے استقبال کے لئے ایسا انتظام کیا کہ اگر وہ اپنے عہد کے مطابق مراسم آداب بجا لانے میں ذرا بھی پس و پیش کرے تو اس سے جبراً ان کی تعمیل کرائی جاتی۔

ایرانی سفیر دربار میں حاضر ہوا اور ایرانی طریقے سے آداب بجا لانے لگا قریب ہی چار جسیم اور تنومند چوبدار کھڑے تھے ان میں سے دو نے سفیر کا ہاتھ اور دو نے اس کی گردن پکڑ لی اور کسی تشدد اور جبر کے بغیر اس کے ہاتھوں کو نیچے لیجا کر اور اس کا سر جھکا کر بتایا کہ یہاں آداب بجا لانے کا یہی طریقہ ہے سفیر نے عقلمندی سے کام لیا اور باقی مراسم خوشی خوشی ادا کر دیئے۔ دربار مغلیہ کا سب سے پہلا برطانوی سفیر سر تامس رو واحد شخص ہے جو شہنشاہ کے دربار میں کبھی یہ مراسم آداب بجا نہ لایا۔

بڑے سے بڑے حادثہ کے ظہور پذیر ہونے پر بھی سنجیدہ رہنا اور کسی قسم کے خوف یا گھبراہٹ کا اظہار نہ کرنا بھی ظاہری آداب میں شامل تھا۔ صرف وہی شخص درباری آداب کا ماہر سمجھا جاتا تھا جس کے بشرے سے کسی قسم کی مایوسی یا مسرت ظاہر نہ ہو۔ اکثر لوگ شہزادہ خرم کو بہترین درباری سمجھتے تھے۔ تامس رو لکھتا ہے کہ میں نے کبھی ایسا آدمی نہیں دیکھا جس کا چہرہ خرم سے زیادہ متین ہو۔

اورنگ زیب دکن کے معرکوں میں کسی حادثے سے لنگڑا ہو گیا اور اس خیال سے کہ دربار میں لوگ اس کو لنگڑا کر چلتے اور تکلیف کے ساتھ تخت پر بیٹھتے نہ دیکھیں۔ تخت کے سامنے پردہ گرا دیا جاتا تھا اور جب وہ تخت پر بیٹھ جاتا تو پردہ اٹھا دیا جاتا تھا۔

سازشوں کی گرم بازاری

مغلیہ درباروں میں سازشی لوگ ہر وقت جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ شہزادے اپنے باپ کی حیات ہی میں تخت حاصل کرنے کے لئے سازشیں کرتے تھے اور تخت کی خاطر علم بغاوت بلند کرنے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا اور کئی بڑے بڑے عہدہ دار اور اہلکار بھی اس بغاوت میں حصہ لیتے تھے۔

مغل بادشاہوں کی معدلت گستری

مغل بادشاہ اپنی رعایا کو اس بات کا یقین دلانے میں بڑے سرگرم نظر آتے تھے کہ ان کے عہد میں ہر آدمی سے انصاف کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب اپنی انصاف پروری کا مظاہرہ کرنے کے لئے روز آنہ ایک شیر اور ایک بکری کو شہر میں بھیجا کرتا تھا۔ ان دونوں جانوروں کا شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں یکجا نظر آنا ایک دلچسپ اور دلنشیں منظر تھا۔

شہنشاہ اپنی سلطنت کا سب سے بڑا جج تھا۔ ہر بدھوار کو شاہی عدالت کا اجلاس ہوتا تھا۔ دادخواہوں کو ایک ایک کر کے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا۔ ایک افسر ان کی شکایات بیان کرتا جاتا اور شہنشاہ عالموں اور فقیہوں کی مدد سے فیصلہ سناتا جاتا۔ جو حکم صادر ہوتا تھا اس کی اسی وقت تعمیل کر دی جاتی تھی چونکہ ہر شخص شاہی عدالت میں آسانی کے ساتھ باریابی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے شہنشاہ ہر روز صبح سویرے جھروکہ میں بیٹھ کر غریب سے غریب شخص کی فریاد بھی خود سنتا۔

زنجیر عدل

جہانگیر نے انصاف کا ایک اور طریقہ جاری کیا۔ اس نے تیس گز لمبی سونے کی زنجیر بنائی جس میں ساٹھ گھنٹیاں لٹک رہی تھیں۔ اس زنجیر کا ایک سرا قلعہ آگرہ کے شاہ برج کے ساتھ اور دوسرا دریا کے کنارے ایک پتھر کے ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اگر کوئی شہنشاہ سے انصاف کا طالب ہوتا تو وہ اس زنجیر کو کھینچتا۔ لیکن اگر

کسی کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہوتا تو اسے اس کی سخت سزا برداشت کرنی پڑتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک گدھا دریا کے کنارے گھاس چر رہا تھا اور وہ زنجیرِ عدل ہلا کر شہنشاہ سے دادخواہ ہوا۔ شہنشاہ نے اس کے معاملہ کی تحقیقات کرائی تو معلوم ہوا کہ اس کا مالک بڑا ہی کنجوس ہے اور وہ اسے بہت کم چارہ دیتا ہے۔ شہنشاہ نے گدھے کے مالک کو طلب کیا اور تنبیہ کرکے چھوڑ دیا۔

دو دلچسپ فیصلے

شاہجہاں کے دو دلچسپ فیصلے بڑے مشہور ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ہندو متصدی کی لونڈی کو کوئی سپاہی لے اڑا۔ ہندو نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ دونوں کہتے تھے کہ یہ لونڈی میری ہے۔ جب قاضی جی سے فیصلہ نہ ہو سکا تو معاملہ شہنشاہ تک پہنچا۔ شہنشاہ نے مقدمہ کے واقعات سن کر حکم دیا کہ لونڈی کو حرم میں بھیج دیا جائے۔ اگلے دن شہنشاہ کچھ لکھنے بیٹھا اور اُس نے لونڈی سے کہا کہ دوات میں تھوڑا سا پانی ڈال لاؤ۔ لونڈی نے خاص سلیقہ سے پانی ڈال دیا۔ بادشاہ نے اس سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ لونڈی کسی متصدی ہی کی ہو سکتی ہے کوئی سپاہی اس کا مالک نہیں ہو سکتا چنانچہ اُس نے ہندو متصدی کو لونڈی دلا دی۔

دوسرے فیصلہ کی تفصیل اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک دکان کے چار حصہ دار تھے اور سرمایہ میں بھی برابر کے شریک تھے معاہدہ یہ تھا کہ چاروں باری باری دکان پر بیٹھا کریں اور جس روز جو حصہ دار دکان پر بیٹھے اس دن وہی چراغ کے لئے تیل اور بلی کیلئے جو دکان میں رہتی تھی خوراک مہیا کرے۔

ایک دن اتفاق سے بلی کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور ابھی اس کی زخمی ٹانگ پر پٹی باندھی ہوئی تھی کہ وہ گرتی پڑتی چراغ تک جا پہنچی اور اس کے قریب اپنا بدن چاٹنے لگی اتفاق سے اس کی پٹی کو آگ لگ گئی۔ بلی جان بچانے کی غرض سے روئی کے گٹھے کے نیچے چھپ گئی گٹھے کو آگ لگ گئی اور پھر دکان کا سارا سامان جل گیا۔

جو حصہ دار بلی کی ٹانگ کا علاج کر رہا تھا اسی کو قصور وار گردانا گیا اور باقی تین حصہ دار اس سے اپنے نقصان کا معاوضہ مانگنے لگے قاضی نے تینوں مدعیوں کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ لیکن مدعا علیہ نے شہنشاہ کے پاس اپیل کی شہنشاہ نے اس کی اپیل منظور کرتے ہوئے قاضی کے فیصلہ کو مسترد کر دیا۔ اور حکم دیا کہ تینوں مدعی ہرجانہ ادا کریں کیونکہ بلی نے تین تندرست ٹانگوں سے چل کر آگ لگائی تھی اور جو ٹانگ زیرِ علاج تھی

وہ چل نہیں سکتی تھی اس لئے بلّی کا علاج کرنے والا حصہ دار قصور وار نہیں گردانا جا سکتا۔ (ترجمہ)

کوئل

؟

کس کی تلاش میں ہے یہ کس کی جستجو ہے
للہ سچ بتا نا کیا تیری آرزو ہے

نغمہ ہے تیرا دلکش صورت ہے بھولی بھالی
قدرت کے گلستاں میں پھرتی ہے ڈالی ڈالی

کیوں سوز و ساز اتنا دل میں بھرا ہوا ہے
تو درد کی دوا ہے یا درد لا دوا ہے

ہے کوک تیری ایسی لگتی ہے چوٹ دل پر
آنسو میرے رواں ہیں حالت پہ تیری اکثر

تو ڈھونڈھتی ہے جس کو اوس کا پتہ بھی پایا؟
تیرے پیام کا کیا تجھ کو جواب آیا؟

کچھ مجھ کو بھی سنا دے اپنی ذرا کہانی
مشتاق ہوں میں اس کا سُن لوں تیری زبانی

آ۔ راز میں بتا دوں اپنے دل حزیں کا
اک بیوفا نے مجھ کو رکھا نہیں کہیں کا

تیری طرح سے میں بھی سرگشتہ ہوں جہاں میں
باقی نہیں رہا ہے کچھ بھی اثر فغاں میں

تو رستگار غم ہے۔ میں صیدِ ستم ہوں
وارفتہ تو ہے بیشک میں مورد الم ہوں

چل۔ آج چل کے دونوں ڈھونڈیں کوئی ٹھکانا
اس کشمکش سے چھوٹیں گاتے رہیں ترانہ

نغموں سے قلب محزون تیرے سکون پائے
نالوں سے میرے۔ کوئل تجھکو قرار آئے

خمسہ بر غزل مولوی سید علی حیدر صاحب مرحوم نظم طباطبائی

جناب میر باسط علی صاحب تمکین (حیدرآبادی)

نہ دکھلا اے اثر اپنا نگاہ عشوہ گر الٹ
بچا سکنے گا کیونکر چوٹ گر تیر نظر اولٹ
نہ پڑ جائے کہیں وار آپکا خود آپ پر الٹا
نگاہ ناز آئینہ میں رکھتی ہے اثر اولٹ
ادھر دیکھو قیامت ہوگی یہ جادو اگر اولٹا

رہینگی زندگی بھر یاد اون کی پیار کی باتیں
وہ اون کے ناز اور انداز دل لینے کی وہ گہاتیں
ہوئے یوں تو بہت جلسے رہیں اکثر ملاقاتیں
نہ بھولینگی کبھی وہ خلوتیں وہ وصل کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر اولٹ

محبت بے وفا سے میں نے کس امید پہ کی تھی
نہ لی میری خبر سفاک نے اللہ رے بے رحمی
انہیں باتوں سے ظالم کی یہی اب چاہتا ہے جی
گلی میں اس ستمگر کی نہ جائے لاش بھی میری
بہا دینا مجھے اے سیل اشک چشم تر اولٹ

نوا سنجی کا اپنی بلبل و قمری کو دعوا تھا
جب آیا امتحاں کا وقت سب کو آزما دیکھا
ہزاروں میں نہ نکلا ایک بھی تو نالہ کش مجھ سا
جواب آیا نہ مرغان چمن سے میرے نالوں کا
گلے کو کس قدر پھیرا زباں کو کس قدر اولٹ

کہلے شیشے لنڈہی مئے دور ہیں پھر آنے پیمانے
ہوا سنکی ہے رت بدلی ہوئے آباد میخانے
زبان خار پہ ہیں وحشت مجنوں کے افسانے
بہار آئی ادھٹے بادل چلے صحرا کو دیوانے
ہوئی اولجھن بڑھا آزار دل اولٹا جگر اولٹا

نہ آئے مفت کا بہتان مجھ پر اب تو مرتا ہوں
الہی خیر کرنا یہ دعائیں دل میں کرتا ہوں
کچھ اون کے دشمنوں کو ہو تو پھر ملزم ٹھہرتا ہوں
وہ بل کہا کر اوٹھے ہیں قتل کرنیکو میں ڈرتا ہوں

مجھے پر کچھ نہ کچھ الزام دھر دیگی مگر اولٹا

کٹی اپنی تڑپتے ہی تڑپتے ہجر کی شب میں | غضب تھی بیقراری اف رے صدمے ہجر کی شب میں
مگر اے بیکسی ہم تھے اکیلے ہجر کی شب میں | کسی نے آکے آنسو بھی نہ پونچھے ہجر کی شب میں
نسیم صبح نے منھ سے مرے داماں ترا اولٹا

سنبھلنے کو طبیعت تھی کہ پھر آئی نئی آفت | ہوئی پھر یاس غالب آس ٹوٹی بڑھ گئی وحشت
پریشانی پریشانی ہے یہ بھی میری قسمت | موذن نے اذاں مغرب کی دی صبح شب فرقت
بجائیں نوبتی نے وردیاں اولٹی گجر اولٹا

ابھی تو مسکراتے تھے ابھی ہنسنے لگے غنچے | بحالی آگئی کیا یک بیک چہرہ پہ بلبل کے
چمن کی سیر جس نے پہلے دیکھی ہو وہ اب دیکھے | بہار باغ دونی ہوگئی مینھ کے برسنے سے
نظر آنے لگا ہر ایک تھالے میں شجر اولٹا

کدھر ہو غافلو آنکھیں ذرا کھولو ذرا دیکھو | تامل سے دورنگی جہاں بے وفا دیکھو
کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے زمانہ کی ہوا دیکھو | لب دریا تماشا انقلاب دھر کا دیکھو
کہ پانی دوپہر بہتا ہے سیدھا دوپہر اولٹا

مجھے قسمیں ہزاروں دیں بڑی منت سے وہ نکلے | چھڑا کے اپنے آنچل کو کسی صورت سے وہ نکلے
پسینے میں نہائے کچھ عجب حالت سے وہ نکلے | جلے ہیں غیر کیا کیا جب میری خلوت سے وہ نکلے
پریشاں باندھکر جوڑا دوپٹہ اوڑھکر اولٹا

مرے احباب سن رکھیں نصیحت ہے یہی میری | رہے ورد زباں ہر دم نہ بھولے عمر بھر کوئی
مرے استاد کا یہ قول تمکینؔ یہ مثال ان کی | جو سچی بات ہے اے نظم دو پہلو نہیں کہتی
نظر آتا ہے یکساں ہوئے سیدھا یا گوہر اولٹا

براہ کرم چندہ کی جانب توجہ فرمائیے آخر ملازم کتنی مرتبہ حاضر ہوا کرے عطا کیجیے پہلے چندہ کا ادا کرنا تو انتہا کرم ہے

غزل

جناب حکیم بہبود علی صاحب صفیؔ

منظور مجھے آپ کی یہ چشم غضب بھی!
لیکن کوئی باعث بھی کوئی اس کا سبب بھی

ان نیچی نگاہوں نے لیا دل تیرے صدقے
شوخی کی یہ شوخی ہے ادب کا ہے ادب بھی

اب لے ستم ایجاد کوئی اور ستم ہو!
ارمان بڑھاتی ہے تیری چشم غضب بھی

پہلے تو کبھی آنکھ ملانا نہیں آیا!
اب خیر سے نکلی نگہ چشم غضب بھی

کیا خاک کہے حال کوئی سامنے ان کے
دشوار سے دشوار جو ہو جنبش لب بھی

بے مانگے کے دل اس نے لیا مانگ کے ہم سے
سنتے تھے کہ دنیا میں ہے کچھ حسن طلب بھی

مطلب کی ہے موقع کی ہے سب دیکھ چکے ہم!
یہ چشم عنایت بھی تیری چشم غضب بھی

ابتک تیری صورت کا گرفتار رہوں ابتک
اب بھی ہے میرے دل میں محبت تیری اب بھی

دنیا سے نرالے ہیں تیرے چاہنے والے
آداب سکھاتے ہیں تو کرتے ہیں ادب بھی

ممکن ہے کہ آنکھوں نے تیری دل کو لیا ہو
انداز تو ایسے ہیں نہیں کوئی عجب بھی

بیشک! نہیں آتا ہی نہیں رسم کسی پر
اب بھی یہی کہتا ہوں کہا تھا یہی جب بھی

تھے سینکڑوں سامان صفیؔ زندہ دلی کے
اعجاز کلب تھا کبھی اعجاز کلب بھی!

ارکاٹ کے دو صوفی دکہنی شاعر

جناب محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی

(۵)

دکہنی شعرا میں بیسیوں ایسے ہیں جو دربار شاہی کے امیر اور صاحب مال و دولت تھے۔ بیسیوں ایسے ملینگے جو صاحب حال وقال تھے۔ پیری مریدی ان کے گہرانے کی میراث تھی۔ کوئی رند نظر آئیگا تو کوئی صوفی وقت ہوگا۔ غرض ہر طبقہ نے میدان شعر وسخن میں جولانی دکہائی ہے۔

یہاں ہم ایسے دو شعرا کو پیش کرتے ہیں جن میں سے ایک مجذوب تھا اور دوسرا سالک۔ ایک نے اپنے بیخودی میں شعر کہے دوسرے نے اپنے حال وقال میں مثنوی ترتیب دی ہے ایک کا تخلص سرور ہے دوسرے غوثی اپنا تخلص قرار دیتے ہیں۔

سرور | شاہ عثمان ان کا نام تھا سرور تخلص کرتے تھے۔ محمد پور عرف ارکاٹ کے رہنے والے تھے انور الدین خاں صوبہ دار ارکاٹ (سنہ ۱۱۵۵ھ تا سنہ ۱۱۶۴ھ) کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجرد زندگی بسرکی۔ مجذوب تھے۔ اسی حالت جذب میں شعر کہا کرتے لوگوں نے اس کو جمع کر لیا اور ایک مختصر دیوان مرتب ہوا ہے ایک زمانہ میں ان کے کلام کی بڑی قدر تھی چنانچہ ان کا دیوان طبع بھی ہوا تھا۔ مگر اب نایاب ہے۔ میرے پاس ایک مخطوطہ موجود ہے۔

سرور کے سنہ انتقال سے ہم واقف نہیں ہیں۔ ارکاٹ کے محلہ نیلی واڑہ میں ان کا مزار ہے اور زیارتگاہ عام ہے رؤسا ارکاٹ کی جانب سے کچھ یومیہ مقرر تھا جو اب تک گورنمنٹ انگریزی کی وساطت سے درگاہ کے نام جاری ہے۔

کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے!

جز نام محمد کوئی ایسا نہ ہوا اظہر | تعریف کرے جسکی خداوند جہاں کا
آتی نہیں تقریر میں تجھ حسن کی خوبی | محتاج نہیں عشق میرے شرح وبیاں کا

آستین جسم سے کھینچو تو قیامت ہوئی — اب تلک نوح نے دیکھا نہیں طوفان میرا

شاخ بلند پر ثمر خام تھا میرا — اس نخپتگی نے خاک میں آخر ملا دیا

غیرت سے مل گیا تو میرا اشک خاص ہے — اس روئے نوبہار کا شبنم نہ ہو سکا

فاختہ کس طرح کرے فریاد — طوق الفت نے جب گلا گھونٹا!

جان و دل کو عشق نے تہ و زبر کے صد پارہ کیا — تو ہے کس امید پر اب اے گریباں الوداع۔

نسیم زلف سے باغ جمعیت کو پریشان کر — گل آشفتگی کا اب تو مجنون ہو رہا بلبل

کیا معجزہ ہے ابروئے شمشیر کا تیری — ہے دل کے وار پار بھی رستا زخم نہیں

جب میرے رخ پہ خجالت کی سیاہی نظر آئی — خود بخود میرے گناہوں کی گواہی نظر آئی

کس قدر شوق شہادت کا مجھے ہے قاتل — لاش دل دوش پہ آ ہوں کے دھری رہتی ہے

دہر صحبت سے رکھے اس کے خداوند کریم — ہو کہ تنہا جو کرے پھر گلہ تنہائی

بوئے وفا کو گل کی طرح اے صبا میری — ٹوٹے کبھو قفس بھی خدا نا جدا کرے

ہے شعر شاعروں کا گوہر بیش قیمت — سرور کے تم سخن کو سحر حلال دیکھو

سرور کا زمانہ آج تقریباً دوسو سال پہلے کا ہے - یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی میں شاعری کا نیا نیا آغاز ہوا تھا میر اور سودا کی شاعری چمک رہی تھی اگر ان لوگوں کے کلام سے سرور کے کلام کو ملایا جائے تو کچھ زیادہ فرق نظر نہ آئیگا اس سے قیاس کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں جو زبان دہلی میں بولی جاتی تھی اور نظم و نثر کیلئے تحریری صورت میں آئی تھی وہی زبان دکن میں بھی تحریر کیلئے کام آتی تھی -

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سرور اپنے حالت جذب میں شعر کہا کرتے اور ان کو لوگوں نے جمع کر لیا - اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں سرور فطری شاعر تھے قدرت نے ان کو شاعری کی تعلیم دی تھی -

غوثی | شاہ غوث جامی بھی ارکاٹ کے باشندے صوفی منش آدمی تھے افسوس ہے کہ کسی تذکرہ میں آپ کا کوئی ذکر نہیں ہے اس طرح آپ کے حالات پردہ اخفا میں ہیں آپ کی ایک تصنیف ریاض مسعود نام ہے - یہ دراصل فارسی قصص الانبیاء کا دکھنی ترجمہ ہے جو ۱۱۹۱ھ میں کیا گیا ہے اس مثنوی میں والاجاہ کی مدح بھی کیگئی ہے ممکن ہے والاجاہ ان کے معتقد بھی ہوں -

مثنوی کے آخر میں اونہوں نے اپنے نام اور وطن کی بھی وضاحت کی ہے چنانچہ کہتے ہیں :-

محمد پور کا غوثی رہنہار ! ! — کہتے ارکاٹ جس بلدے کو اظہار
تخلص سب جس کا غوثی ہے مذکور — وبے ہے غوث جامی نام مشہور
زبان دکہنی میں مروارید رولیا — عبارت فرس کی ہندی میں کہولیا

سبب تالیف کے متعلق صراحت کرتے ہیں :-

یو غوثی انبیا کا ذکر اکثر — محبان سات کرتا تھا مکرر
سبجہ مجہ سوں ہوئے اہل محفل — جو رہتے تھے محبت دل سوں کامل
زبان دکہنی میں اسکوں نظم کر بول — جو آئے فہم میں ہر یک کتیں کہول
مجھے تحریص سوں ان کے ہوا شوق — رہا نہیں چین یکتل لے ہوا ذوق

قصص جو انبیاء کا فارسی ہے | نص قرآن سوں جو آرسی ہے
سو اس کا ترجمہ کرتا ہوں میں اب | میری توں طبع کر جولان یا رب

والاجاہ کی مدح میں کہتے ہیں:۔

اتا کہتا ہوں وصف شاہ اعظم | ہمارے ملک کا سلطان مکرم!
ہے والاجاہ اب شاہ زمانہ! | جہاں میں اس کی ہمت کا فسانہ
او طالع میں ہے ثانی سکندر | شجاعت میں ہے رستم سوں بر تر

مثنوی کی ابتدا حسبِ قاعدہ حمد و نعت سے ہوتی ہے حمد کے بعض شعر یہ ہیں:۔

کروں حمد خدا اول بیاں میں | ثنا ہور وصف کوں اس کی عیاں میں
کیا ارض و فلک کوں جن نے پیدا | جو کچھ ما بین اس کے ہے ہویدا
دیا ہے روز کوں خورشید سوں نور | فلک شب کوں کیا تاریاں سوں معمور

سببِ تالیف کے بعد نور محمدی کا عنوان ہے اس کے بعد ولادت "عزازیل" کا عنوان آتا ہے اس کے بعد سلسلہ دار انبیاء کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ آدم۔ شیث۔ نوح۔ صالح۔ ابراہیم۔ لوط۔ یوسف۔ موسیٰ۔ عیسیٰ کے قصے بیان کرنے کے بعد آنحضرت (صلعم) کے حالات شروع کئے ہیں۔ شداد کی بہشت کا بھی ذکر ہے۔ بعض نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

حضرت شیث علیہ السلام:۔

اتھے آدم کے فرزنداں میں کامل | جو حضرت شیث اس وقت فاضل
لے بھایاں ساتھ دس کرنے زراعت | اتھے او ہور گذرتی تھی براحت
شریک ان کے اتھے دس بھائی مل کر | حکم کرنے اتھے شیث ان پو اکثر

سو اس بہایاں سوں لیتے شیث تھی کام　　اپے کرتے اتھے راحت سوں آرام

وہ بہایاں شیث کے کرتے تھے تکریم !　　برابر سب کے دیتے تھے وہ تقسیم

شداد کی بہشت کا ذکر :-

بنایا چار ندیاں پھر سر اسر　　بھریا شیر و شہد سے آب لاکر

لگیا ندیاں میں بہنے شہد ہوا شیر　　خمر یک میں دویم میں صاف تر بیز

بنے تب چار رخ پر چار میدان　　ہر یک میدان لعل و گوہر افشان

سنے روپے کے کرسی لاکھ لاکرا　　او میدان میں رکھا یا بے حیا خر

۔۔　　۔۔　　۔۔　　۔۔　　۔۔

برس تین سو میں وہ پائے اتمام　　وہ جنت کا تھا سبعہ سال لک کام

منگا یا دختران بیس خوبصورت　　وہ حوران کی جگا پر حور سورت

غلامان خوبرو بھی سے منگا یا !　　وہ غلمان کی جگا پو ان کو پایا

جنگ اُحد کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

مدینے پر او آیے پھر دگر بار　　احد کے کوہ کنے اترے بلا عار

نبیؐ نکلے مدینہ سوں ہوشیار　　نبیؐ کے سات پھر تھوڑے تھے یار

ہوا تب جنگ حضرت سوں احد پر　　بہوت کفار کے کٹ گئے وہاں سر

اتی یک کوہ کے درے منی راہ　　دغا کر کافران آئے دان سوں ناگاہ

کرے وہ مومناں پو تیر باران　　پراگندہ ہوئے تب چند یاران

علی مرتضیٰ شمشیر سے ہات　　قتل کرتے تھے کفاران کو ذات

کہ لیکر ذوالفقار وہ شیر یزدان　　کرے نابود اکثر مرد میدان

شجاعت کا علیؑ کے تب پکارا　　　ہوا دو نوں جہاں میں آشکارا

اس نمونہ سے عوثی کے کلام کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے ہمارے دکھنی شعرا اکثر مثنویون کے میدان میں ہی اپنی طبع کی جولانی دکہاتے تھے اور شاعری کے جوگل بوٹے کہلاتے تھے وہ درحقیقت زبان اردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی ہی کے ذریعہ رزم وبزم واقعہ نگاری وغیرہ کے جوہر تبلائے جاسکتے ہیں۔ عوثی کی یہ مثنوی بھی ایک بہترین مثنوی کہی جاسکتی ہے گو کہ آج کل کی زبان کے لحاظ سے متروک ہے ؛

—(؛)—

امریکی مخلوط تعلیم

جناب سید مہدی صاحب (عثمانیہ)

ممالک متحدہ امریکہ نے مخلوط تعلیم کی داغ بیل ڈالی اور اس کو کامیاب بنانیکی پیہم پُرخلوص کوششیں کیں۔ جس کو اب ملک کے طول و عرض میں غیر معمولی قبولیت حاصل ہے وہ تمام تعلیمی ادارے جہاں علحدہ علحدہ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام تھا مخلوط تعلیمی مدارس اور کالج بنادیئے گئے ہیں اس وقت ممالک متحدہ امریکہ کی تمام تحتانی، ثانوی اور جامعی جماعتوں میں یہی طریق تعلیم مروج ہے جس میں خانگی اور فرقہ واری مدرسوں کے علاوہ وہ درسگاہیں بھی شامل ہیں جو کلیسائے رومن کیتھولک کے قدامت پسندوں کے ہاتھ میں ہیں عموماً طور پر ان تعلیم گاہوں میں ۶۰ فی صد سے زائد متعلمین ہیں اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں قدامت پسند ثانوی تعلیم میں طلبا اور طالبات کی ہم جماعتی کو مضر خیال کرتے ہیں۔

مسٹر مائیکل ای سادلر کی رائے میں مخلوط تعلیم کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کیلئے مفید ہے مگر ۱۳ سال سے زیادہ عمر والوں کیلئے نامناسب ہے۔ انگلستان کا ایک آزاد خیال معلم نسوانی اور مردانی درسگاہوں کی تخصیص کو بدکرداری اور عصمت باختگی کی جولانگاہ سمجھتا ہے اس کے نزدیک امریکی مخلوط تعلیم جنسی جذبات اور ان کے نتائج کے سدباب کا واحد علاج ہے۔

ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ امریکہ کا خیال ہے "اکھٹی تعلیم پاکدامنی کا بیمہ ہے اس لئے کہ فطری حیا معتدل اور ناشائستہ مذاق سے بچائیگی مگر ایسے مدرسوں کے متعلق جہاں صرف لڑکیاں یا لڑکے تعلیم پاتے ہوں کسی قسم کی ذمہ داری نہیں لیجا سکتی" جامعہ ہارورڈ کے صدر ڈاکٹر چارلس ڈبلیو الیٹ فرماتے ہیں:—

"امریکی لڑکیاں اپنی آپ حفاظت کرسکتی ہیں"۔

ایک ہندوستانی پروفیسر کا جو کئی سال امریکہ کی ایک جامعہ میں فرائض معلمی ادا کرچکے ہیں۔ بیان ہے:—

"یہ ذہن نشین رہے کہ امریکی نوجوان اقطاع عالم کے اوسط نوجوانوں سے متمیّز نہیں ہیں۔ میں خود ایک مخلوط تعلیمی جامعہ میں ۲۰ سال سے زیادہ معلم رہا ہوں مجھے اس طریق تعلیم میں کوئی بات مضحکہ خیز نظر نہیں آئی دوران درس میں ہر دو صنف کے ہم جماعتی سے مجھے کسی قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ میری جماعت کے نوجوانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ بغیر جنسی تعلقات کے بھی ہر دو صنف میں دوستی ممکن ہے۔ وہاں لڑکے لڑکے رہتے ہیں اور لڑکیاں عصمت و عفت کی دیویاں اگرچہ انہوں نے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر جارج واشنگٹن کی شجاعت و سرفروشی اور کلائیو کے لرزہ بر اندام مظالم اور غارت گری کی داستانیں کیوں نہ سنی ہوں۔ امریکن سائیکلو پیڈیا آف ایجوکیشن رقمطراز ہے کہ ثانوی مدرسوں میں اکھٹی تعلیم ہر دو صنف میں جمہوریت اور مساوات پسندی کا مبارک جذبہ پیدا کرتی ہے اور کاروباریوں میں باہمی اتحاد و یگانگت کے تقویت کا باعث ہوتی ہے۔

ڈاکٹر جارج اے ڈورسی آف جیکا ہیگو اپنی مشہور کتاب (Why we behave like human being) کے اختتام پر لکھتے ہیں "مخلوط تعلیم، تعلیم حفظان صحت ہے۔

مخلوط تعلیم کی ترویج کیلئے ۱۸۳۷ء میں (Oberlin College) کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس کی تقلید میں ۱۸۸۰ء تک نصف سے زیادہ اور ۱۹۰۰ء تک تقریباً ⅘) کالجوں نے اس طریق تعلیم کو قبول کر لیا۔ ۱۹۱۵ء تک ممالک متحدہ کی گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ اناث مجموعی طور پر ۳۵ فیصد سے زیادہ نہ تھیں مگر مخلوط تعلیمی کالجوں میں اناث کی تعداد اس وقت نہ صرف ذکور کے مساوی ہے بلکہ روز افزوں ہے اور تحریک مساوات "کی ہمہ گیری کے باعث رہنمایان تعلیم سے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ شعبہ تعلیم میں صنف لطیف "کو صنف قوی" کے برابر حقوق اور سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

ربع مسکون میں ممالک متحدہ ہی ایسا شہر ہے جہاں اکھٹی تعلیم میں روڑے نہیں اٹکائے جاتے اس لئے ہزاروں عورتیں جامعی تعلیم سے بہرہ اندوز ہو رہی ہیں۔ اب فلوریڈا، گیورجیا اور برسٹن کے سوا تمام صوبوں کی جامعات میں مخلوط تعلیم ہی رائج ہے۔

کالج کوئی "تدریسی دکان" نہیں ہے بلکہ صحیح شہری بنانے کا میدان ہے جہاں عملی زندگی میں باہمی اتحاد اور اس کی اہمیت ہر دو صنف کے ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔ امرسن کہتا ہے کہ جامعہ کا اولین مقصد

یہ ہونا چاہئیے کہ ہر شعاع ذکاوت کو اپنے مہمان نواز کمروں میں جمع کرے اور ان کے متفقہ تاثرات سے ہونہار لڑکوں کے دل میں شمع عمل روشن کرے" جو بغیر مخلوط تعلیم ممکن نہیں۔

یہ دور اخلاقیین عہد کہنہ کا نہیں ہے جو مخلوط تعلیم کو خلاف اخلاق اور نا قابل تلافی گناہ خیال کرتے تھے۔ نشو و نمائے نوعیت شہوانی بالکل فطری ہے جوں جوں علیحدہ تعلیم کے حامی اس طریق تعلیم کو اختیار کرتے جائینگے اخلاق اور صحت عامہ ترقی پذیر ہوں گے۔ ذکور و اناث میں آزادانہ میل جول اور مساوی حقوق بیہودہ خیالات کو مٹا دیتے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیوانی جذبات کسی قسم کے اشتغال کا باعث نہ ہونگے اس لئے کہ کالج کی چار دیواری اور اکھٹی فضا چال چلن کیلیئے حفظ ما تقدم ہیں۔

(ماخوذ)

غزل

(حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم)

ترک الفت کا ارادہ قصد روپوشی بھی ہے — اور پھر دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی ہے

خود فروشی ہی نہیں خود فراموشی بھی ہے — آپ کی باتوں میں گویا لطف خاموشی بھی ہے

کان میں اک بات سن لو تا کہ دشمن تاڑ لیں — فاش گوئی بھی ہے یہ کہنے کو سرگوشی بھی ہے

شیخ صاحب پی بھی لو اک بار کہکر یا غفور — زہد کا یہ زہد مے نوشی کی مے نوشی بھی ہے

قیس کی خاطر سے ٹھیری ہے میری گردن زنی — یہ گراں جانی بھی ہے یا رب سبکدوشی بھی ہے

قلت و کثرت ہے کیفیؔ بات اپنے ہاتھ کی

مے نشاط افزا بھی ہے داروئے بیہوشی بھی ہے

غزل

جناب ضامن صاحب کنتوری

جنت جاناں تیرا پتہ کیا ہے — کعبہ پھر کیا ہے بتکدہ کیا ہے
تو سمایا ہوا ہے رگ رگ میں — پھر پکاریں کسے دعا کیا ہے
ہیں یہ سب واہمہ کے موہومات — ایک ہو کا ہے یاں ہرا کیا ہے
ہیں یہ سارے ہمارے مفروضات — کیف و کم کیا من اور ما کیا ہے
حسن ہے کچھ اور نہ کچھ ہیں محسوسات — دیکھئے دیکھنے کو کیا کیا ہے
ہو نہ ہو کچھ بہار باغ وجود — اک تماشا تو ہے برا کیا ہے
تو ہی اول ہے تو ہی آخر ہے — ابتدا کیا ہے انتہا کیا ہے
تو ہی ظاہر ہے تو ہی باطن ہے — یہ شہود اور یہ خفا کیا ہے

فرض کر لو کہ تم ہی ہو ضامن
اعتبارات کے سوا کیا ہے

عشق جہانگیر

(جناب سیّد باسط علی صاحب شاہجہانپوری)

... ہمارے پرائمری و انگریزی اسکولوں کی تاریخوں میں جتنی غلط بیانیاں ہیں وہ یا تو مورخین کی مذہبی تعصب کی وجہ سے ہے یا عوام الناس میں جوش و منافرت پھیلانے کیلئے تحریر کیگئی ہیں۔ کیونکہ ان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ از سرتا پا من گھڑت افسانے ہیں جس میں عام لوگ اور نادان طلبا صحیح خیال کرکے نہ معلوم کیا کیا نظریے قایم کرتے ہونگے کیونکہ انہیں حقیقی واقعات سے بہت کم دوچار ہونا پڑتا ہے۔ علاوہ ان غلط بیانیوں کے ہمارے ملک میں ایک عجیب و غریب تاریخی افسانہ "جہانگیر و نورجہاں" کے نام سے مشہور ہے اور اس کیلئے مورخوں نے جھوٹ و بہتان کا ؤ مستحکم قلعہ تیار کرنیکی کوشش کی ہے کہ کسی کو ان کی غلط بیانی پر وہم و گمان بھی نہ ہو جس طرح عرب میں لیلیٰ مجنوں فارس میں شیریں و فرہاد اور ہند میں نل دمنتی کے قصے رائج ہیں اسی طرح ان مورخوں کی وجہ سے ہندوستان میں نورجہاں و جہانگیر کا قصہ جڑ پکڑ گیا ہے اصل میں یہ لوگ جب سلطنت مغلیہ کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو تعصب پر نظر ہوتی ہے اور واقعات کو بالائے طاق رکھکر جو دل میں آتا ہے لکھ مارتے ہیں چاہے وہ سرحد ادراک سے کتنا ہی پرے کیوں نہ ہو اس وقت انہیں تاریخی نکات اور اصلی واقعات کا تو خیال رہتا نہیں بلکہ فرضی اور افسانوی رنگ میں جدھر قلم اٹھا ادھر ہی نکل بھاگتے ہیں۔ ویلیئر۔ سر ولیم ہنٹر۔ مارسڈن غرض جس کی تواریخ پر نظر ڈالئے انہیں مکروہات سے لبریز ہے گویا سب نے ایک ہی لاٹھی سے بھینس ہانکنے کی کوشش کی ہے حیرت و استعجاب کا مقام ہے کہ اسی مقام پر قابل اور پاک باطن مورخ سر راپر لیتھبرج کا بیان بھی درست نہیں ہے اس کی بیّن وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے دماغ کو ذرا بھی تحقیقات کی تکلیف نہ دی ورنہ یہ امر آئینہ کی طرح روشن تھا کہ نورجہاں جہانگیر کا فرضی بیان از ابتدا تا انتہا غلط غیر مکمل اور غیر درست ہے وہ لکھتا ہے :-

"... شاہزادہ سلیم پر بیچال نورجہاں کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے والد سے التجا کی کہ اس کی شادی نورجہاں سے کردی جائے منصف مزاج اکبر کو یہ بات خلاف اصول معلوم ہوئی اور سلیم کو سمجھایا کہ رعایا کی

بہو بیٹیوں پر بری نگاہ نہ ڈالنی چاہئے اس کے بعد اکبر نے نورجہاں کے والد کو راضی کرکے فوراً اس کی شادی ایک ایرانی نوجوان شیر افگن سے کردی اور اس کو بردوان کا صوبہ دار مقرر کردیا جب شہزادہ سلیم بہ لقب جہانگیر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا تو شعلہ عشق دوبارہ بھڑک اٹھا اور اس نے قطب الدین صوبہ دار بنگالہ کو ایک خط روانہ کیا کہ وہ ہر ممکن و ناممکن سعی سے شیر افگن کو نورجہاں کے طلاق دینے پر راضی کرے لیکن شیر افگن کو یہ بات پسند نہ آئی اور فرمان شاہی سے انحراف کیا یہاں تک کہ نوبت جنگ وجدل کی پہنچی۔ آخر ش دونوں صوبہ دار مقتول ہوئے نورجہاں بحکم شہنشاہی دہلی بلائی گئی اور اسے جہانگیر کی طرف سے پیغام شادی دیا گیا۔ شروع میں اس نے اس پیغام کو ٹھکرا دیا کیونکہ جہانگیر اس کے شوہر کا قاتل تھا اور نورجہاں کے دل میں اپنے شوہر کی محبت ابھی تک تازہ تھی مگر آہستہ آہستہ جہانگیر نے پھسلا لیا "

یہ اس مورخ کا بیان ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ آخر یہ بے بنیاد واقعات کہاں سے اقتباس کئے گئے ہیں یہ مسلمہ بات ہے اور اس پر تمام ہندوستانی و انگریزی مورخ بھی متفق الرائے ہیں کہ تزک جہانگیری اصلی اور صحیح واقعات کا سرچشمہ ہے تاہم اس پر کسی نے غور نہ کیا کہ جب جہانگیر نے اپنی زندگی کے کسی شعبہ کو خواہ وہ کتنا ہی مکروہ کیوں نہ ہو چھپانے کی کوشش نہ کی تو اس اہم باب کو کس طرح فروگذاشت کیا یا لکھنا بھول گیا۔ ایک مقام پر جہانگیر لکھتا ہے کہ:-

" تا سال حال کہ سنش بس وچہار سالگی رسیدہ گی غدا بیٹار کردہ وصاحب فرزندان شدہ اصلاً خود را بخوردن شراب آلودہ نہ ساختہ بود۔ ایں روز کہ مجلس ذرن اوبود گفتم کہ بابا صاحب فرزندان شدہ بادشاہان وشہزادگان شراب خوردہ اند امروز کہ جشن نست بہ تو شراب میخورانم درحصت می دہم کہ در روزہائے جشن و ایام نوروز مجلس ہائے بزرگ می خوردہ باش اما طریقہ اعتدال مرعی دادی "

اس طرح اس نے ابوالفضل کے قتل کی تمام سازشوں کو بھی بے نقاب کیا ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان واقعات کو اس نے کیوں نہیں لکھا۔ علاوہ ازیں اس زمانہ کے کسی مورخ نے بھی اس واقعہ کو نہیں تحریر کیا معتمد خان نے لکھا ہے۔ " تمام ملک کا کاروبار نورجہاں سنبھالتی ہے اور شہنشاہ ایک سیر گوشت اور آدھا سیر شراب میں مست پڑا رہتا ہے " حیرت ہے کہ جب اس نے اس قدر عیب جوئی کی ہے تو پھر شیر افگن کے واقعہ کو کیوں نہیں قلمبند کیا۔ مشہور و معروف مورخ فرشتہ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ سرراپر لیتھبرج لکھتے ہیں کہ ہندوستانی

مورخوں میں میر محمد عرف خافی خاں کی تاریخ منتخب اللباب نہایت مشہور اور مستند ہے۔ تاہم خافی خاں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ماثر جہانگیری کے مصنف مرزا کامگار المعروف عزت خاں مسٹر الفنسٹن (جن کی تاریخ بی اے کے کورس میں داخل ہے) مسٹر مارسمین، سرایچ۔ ایم الیٹ مسٹر چارلس اسٹوارٹ (جنھوں نے مغل ایمپائر کا پورا خاکہ کھینچا ہے) اور مس بیتھم نے بھی ان واقعات کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اب اکبری تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ولیعہدوں کو محل میں رنگ رلیاں منانے عیش وعشرت میں مشغول رہنے کا حکم نہ تھا بلکہ وہ کسی فوج کے سپہ سالار یا کسی جاگیر کے صوبہ دار بنا کر روانہ کرئے جاتے تھے۔ چنانچہ خود تزک جہانگیری سے عیاں ہے کہ اس نے صرف آٹھ سال کے سن سے منصب ہزاری کو حاصل کر لیا تھا اور جس وقت نورجہاں کی والدہ داخل حرم ہوئی اس وقت نورجہاں کی عمر تین یا چار سال کی تھی۔ اب انصاف کیجئے اور سوچئے کہ کیا محبت کے جذبات اسی وقت سے پیدا ہونے لگتے ہیں جب کہ عاشق صرف آٹھ سال کا اور محبوبہ چار سال کی ہو لیکن اس جگہ مورخین لکھتے ہیں کہ:

جہانگیر گھومتا گھومتا باغ میں جانکلا وہاں اتفاق سے ملکہ حسن نورجہاں موجود تھی نورجہاں سے آنکھیں چار ہوتے ہی جہانگیر کا دل جوش محبت سے لبریز ہوگیا اس نے از راہ محبت دو کبوتر جو وہ ہاتھ میں لئے ہوئے تھا، نورجہاں کے ہاتھ میں دیدئے۔ اس کے ہاتھ سے ایک کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑگیا۔ جہانگیر نے اپنی واپسی پر کبوتر اڑجانیکی وجہ دریافت کی اور پوچھا کہ کیسے اڑگیا؟ نورجہاں نے اپنے نازک ہاتھوں سے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا "ایسے!" یہ حاضر جوابی جہانگیر کے دل میں برق کی طرح دوڑگئی اور وہ اس پر جان و دل سے فریفتہ ہوگیا"۔

اوّل تو ان کا سن ہی ایسا نہ تھا جو ایسی باتیں کرتے اور اگر فرض کرلیا کہ وہ جوان بھی تھے اور شباب کی لہریں ان کے دل میں موجزن بھی تھیں تب بھی وہ اس آزادی و بے باکی سے ہرگز نہیں ملسکتے تھے۔ کیونکہ مشرقی تہذیب میں جائز نہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلیم نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس کی شادی نورجہاں سے کردی جائے لیکن ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ یہ باتیں مشرقی تہذیب کی شان کے خلاف ہیں مغربی ممالک اگران حسن وعشق کی رنگینیوں میں رنگے ہوئے ہوں تو ہوں۔ تاہم مشرق مشرق ہی رہیگا۔ علاوہ اس کے اکبر کو جہانگیر کی شادی کرنے میں کیا گریز تھا جب کہ وہ ایران کے شاہی خاندان سے تھی۔ کیا اکبر ہند کے امراء و رؤساء (جو اس کے تابعدار تھے) کی لڑکیوں سے شادی کرانا پسند کرتا تھا لیکن ایران کے عالی نصب،

ذی مرتبہ اور شاہی خاندان سے جہانگیر کی شادی ناپسند تھی؟ یہ بات بھی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کی دلشکنی کرکے نورجہاں کی شادی ایک غیر شخص سے کردی۔ علاوہ اس کے جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا اور پانچ سال بعد یعنی ۱۶۱۱ء میں نورجہاں سے شادی کی یہ بات بھی غیر ممکنات میں سے ہے کیونکہ اگر وہ عاشق تھا تو عشق کے ولولوں کو کس طرح پانچ سال دبائے بیٹھا رہا کیا وہ مصلحتاً خاموش رہا! اگر اسے شیر افگن کو قتل ہی کرانا مقصود تھا تو اس نے پس و پیش سے کیوں کام لیا۔ ان تمام اعتراضات کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ تمام واقعات غلط اور سراسر غلط ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ تو سنئے!!!

علی قلی بیگ | یہ شخص شاہ اسمٰعیل ثانی کا تربیت یافتہ نہایت عاقل و ہونہار تھا یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ انقلاب اکثر لوگوں کی تباہی کا باعث ہوتا ہے اور اکثر لوگوں کی بہتری کا ذریعہ بنتا ہے لیکن سب سے پہلے شاہی خاندان امراء اور رؤسا کی تباہی ہوتی ہے اسی مصیبت کا مارا ہوا یہ شخص خستہ حال مرزا عبد الرحیم خانخاناں کی خدمت میں آکر قدمبوس ہوا۔ اور اپنی علمی لیاقت بہادری اور خوش مزاجی کی وجہ سے شہنشاہ اکبر کے دربار میں باریاب ہوا۔ اور اپنی روزافزوں ترقی کے باعث جلد ہی بردوان کا صوبہ دار مقرر کردیا گیا اور نورجہاں سے شادی ہوگئی۔ ۱۶۰۵ء میں جب جہانگیر شہنشاہ ہوا تو اس نے علی قلی خاں کو اس کے تلوار سے شیر مارنے کے صلہ میں شیر افگن کے خطاب سے سرفراز کیا یہ قصہ ہائے پارینہ کہ جہانگیر نورجہاں پر پہلے ہی سے عاشق تھا۔ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔

شیر افگن کا قتل | جب شیر افگن کو پوری طور سے اپنی جاگیر پر تسلط حاصل ہوگیا تو اس نے رعایا پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کردیا۔ تمام صوبہ میں تہلکہ مچ گیا۔ شکایتی عرضیاں و خطوط دربار جہانگیری میں گذرنے لگے۔ فوراً سلطنت کی طرف سے قطب الدین خاں کو جو بنگالہ کا صوبہ دار تھا تحقیقات کا حکم ہوا شیر افگن یہ خبر پاکر کہ قطب الدین آرہا ہے بہت پریشان ہوا۔ کیونکہ رعایا اس کیخلاف تھی اس لئے اسے ایک نئی ترکیب سوجھی اور وہ یہ کہ قطب الدین کا پر اسرار خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے کرے چنانچہ ایسا ہی کیا نتیجہ یہ نکلا کہ شیر افگن نے موقع پاکر اس کے سینہ میں خنجر پیوست کردیا۔ لیکن پیر خاں جو قطب الدین کا مزنر تھا۔

فوراً لپکا۔ اور شیر افگن پر تلوار کا پُورا وار کیا جس سے وہ زخمی ہوگیا لیکن پھر موقع پاکر شیر افگن نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور ایک وار خنجر کا ایسا کیا کہ پیر خان بھی فوراً ہی راہی ملک عدم ہوا۔ اس شور و غوغہ کو سن کر قطب الدین کی فوج شیر افگن پر ٹوٹ پڑی اور چند ہی لمحات میں شیر افگن کا قصہ بھی تمام ہوگیا۔ چنانچہ تزک جہانگیری میں بادشاہ لکھتا ہے کہ:۔

"ازیں خبر ناخوش چہ نویسم کہ چقدر متالم و آزادہ گشتم قطب الدین کوکہ بمنزلہ فرزند عزیز و برادر مہربان و یار یکجہت من بود۔ تقدیرات الہی را چہ تواں کرد۔ رضا بہ قضا دادہ صبر را پیش نہادہ ہمت خود ساختم بعد از رحلت حضرت عرش آشیانی شنتعار شدہ مثل دو قضیہ کہ فوت مادر قطب الدین خاں کوکہ و شہادت او بود با شد برمن نگذاشت"

نورجہاں اس کے بعد حکم ہوا کہ شیر افگن کا تمام خاندان قید کرکے دار السلطنت پہنچا دیا جائے۔ اسی قانون کے بموجب نورجہاں بھی دہلی لائی گئی لیکن چونکہ جہانگیر کی سوتیلی ماں اسے پیشتر سے جانتی تھی اور اس کی خداداد ذہانت اور لیاقت سے واقف تھی اس لئے اسے کسی قسم کی تکلیف برداشت نہ کرنا پڑی۔ چار سال بعد نورجہاں نے بیٹھے بیٹھے ایک نئی ترکیب سوچی اور شہنشاہ کی خدمت میں ایک منظوم عرضی لکھی جس میں اس نے اپنی بے گناہی کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو بے قصور ٹھیرایا۔ بادشاہ اس خط کو پڑھکر فوراً محل سرا میں آیا۔ اس وقت نورجہاں اپنے کمرہ میں مغموم و شکستہ حال بیٹھی تھی۔ جہانگیر ایک شمع حسن کو جو زینت محفل کے قابل تھی غمگین و محزون دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ آخرش اسے ملکہ ہند بناکر نورمحل کے خطاب سے سرفراز کیا۔

یورپ میں ایک سو بیس (۱۲۰) زبانیں بولی جاتی ہیں جس میں جرمن زبان کی کثرت کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہوسکتا ہے:۔

جرمن ۸ کروڑ ۱۰ لاکھ - روسی ۷ کروڑ - انگریزی ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ - اطالوی ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ
فرانسیسی ۴ کروڑ - یوکرینیا ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ - پولستانی ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ - ہسپانوی ۱ کروڑ ۴۰ لاکھ -
رومانیائی ۱ کروڑ ۴۰ لاکھ -

لطائف الادب

(جناب قاضی محمد احسان اللہ صاحب بی اے)

طغا تیمور خان کے عہد حکومت میں رکن صائن ایک مشہور شاعر تھا اور پیش نمازی کا منصب اس سے متعلق تھا۔ اتفاقاً اس سے کوئی قصور سرزد ہوا جس کی پاداش میں اسے محبوس زندان کر دیا گیا۔ ایک دن بادشاہ جیل کے ملاحظہ کیلئے گیا۔ رکن صائن کو دیکھا کہ طوق و سلاسل کی گراں باری سے سخت تکلیف میں ہے کہا کہ کوئی شعر سناؤ۔ رکن نے فی البدیہہ کہا:-

در خدمت شاہ چوں قوی شد رایم ۔۔۔ گفتم کہ رکاب را از زر فرمایم

آہن چو شنید این سخن از دہنم ۔۔۔ در تاب فتاد حلقہ زد بر پایم

ترجمہ۔ جب بادشاہ کے نزدیک میری رائے کو وقعت حاصل ہوئی اور مقرب بارگاہ بن گیا تو میں نے چاہا کہ اپنی زین کی رکاب سونے کی بنوا دوں۔ لوہے کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے پیچ و تاب کھایا اور میرے پاؤں کے گرد (بیڑی کی صورت میں) حلقہ ڈال دیا۔

بادشاہ نہایت مسرور ہوا اور نہ صرف اس کا قصور معاف کر دیا بلکہ اس کو پہلے منصب پر بحال کر دیا۔

عرفی نے ایک مرتبہ حکیم ابو الفتح سے پوچھا کہ سعدی کے کلام میں سے آپ کو کونسی چیز پسند ہے۔ عرفی نے ذیل کی غزل پڑھی اور کہا کہ میرے خیال میں اس کا جواب فارسی کے کسی شاعر سے نہیں بن پڑا۔

بر بود دلم در چمنے سرو روانے ۔۔۔ زرّین کمرے سیم برے موئے میانے

خورشید وشے ماہ رخے زہرہ جبینے ۔۔۔ یاقوت لبے سنگ دلے تنگ دہانے

شنگے شکرینے چو شکر در دل خلقے ۔۔۔ شوخے نمکینے چو نمک شور جہانے

بیدادگرے کج کلہے عربدہ جوئے ۔۔۔ لشکر شکنے تیز قدے سخت کمانے

سید عضد تبریزی کا لڑکا سید جلال بہت چھوٹی عمر میں فارغ التحصیل ہوگیا تھا۔ شعر بہت اچھا کہتا تھا۔ نہایت خوشخط تھا ایک دن سلطان محمدؒ بن مظفر مکتب میں آیا اور معلم سے پوچھا یہ کون لڑکا ہے۔ معلم نے بتایا کہ یہ سید عضد کا صاحبزادہ ہے اور شعر خوب کہتا ہے۔ محمدؒ بن مظفر نے لڑکے سے کہا کہ کوئی شعر سناؤ۔ لڑکے نے کاغذ پر لکھکر پیش کیا۔ ؎

چار چیز است کہ در سنگ اگر جمع شود | لعل و یاقوت شود سنگ بداں خارائی
پاکئ طینت و اصل گہر و استعداد | تربیت کردن مہر فلک مینائی
در من ایں ہر سہ صفت ہست کنوں می باید | تربیت از تو کہ خورشید جہاں آرائی

سلطان محمدؒ بن مظفر اس بدیہہ گوئی سے بہت خوش ہوا۔ اور لڑکے کی تربیت اپنے ذمے لی۔ یہاں تک کہ اسے منصب وزارت تک پہنچا دیا۔

سراج الدین قمری ماوراء النہر کے مشہور شعراء میں سے تھا ایک دفعہ شاہی مجلس میں اس کا مقابلہ سلمان ساوجی سے ہوا اور کہا گیا کہ دونوں اس مشہور مصرعہ پر اپنی طرف سے مصرع لگائیں۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

سلمان نے لکھا۔ ؎

اے آب رواں سرو بر آوردۂ تست | وے خار درون غنچہ خون کردن تست
گل سرخوش و لالہ مست و نرگس مخمور | اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

قمری کی رباعی کے تین مصرعے ملتے ہیں۔ ؎

اے ابر بہار خار پروردۂ تست | اے غنچہ عروس باغ در پردۂ تست
اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

بادشاہ نے دونوں کے کلام کو بہت پسند کیا اور دونوں کو انعام یکساں ملا۔

کتاب جواہر الاسرار میں مرقوم ہے کہ صنعت مراعات النظیر میں مولانا لطف اللہ کی یہ رباعی لاجواب ہے۔

اور کوئی شاعر اس کا جواب نہیں لکھ سکا۔

گل داد بہ بیدریغ فیروزہ بباد — وی جوش لعل لالہ از خاک افتاد
داد آب سمن بخنجر مینا اسرور — یاقوت سنان آتش نیلوفر داد

اس رباعی میں چار دنوں کا۔ چار پھولوں کا اور چار عناصر کا ذکر ہے۔

مولانا جامی کا ایک ہمعصر ساغری تھا وہ کہا کرتا تھا کہ میرے تمام اچھے مضامین شعراء نے چرا لئے ہیں اس کا دیوان کہیں سے مولوی جامی کو بھی مل گیا۔ آپ نے اس پر یہ رباعی لکھ دی۔ ؎

ساغری می گفت دزدان معانی بردہ اند — ہر کجا در شعر من یک معنیٔ خوش دیدہ اند
دیدم اکثر شعر ہایش رایکے معنی نداشت — راست میگفت آنکہ معنی ہاش را دزدیدہ اند

یہ شعر ساغری تک بھی پہنچا وہ شکایت کیلئے مولانا جامی کے پاس آیا۔ آپ نے کہا کہ میں نے "ساغری می گفت" نہیں لکھا تھا بلکہ "شاعرے میگفت" لکھا تھا۔

غزل

جناب سید شمس الدین صاحب علم فرزند کیفی مرحوم حیدرآبادی

رخ پُر نور پر بکھری ہوئی زلف معنبر ہے — بچائے اب جو ایمان ہم بھی دیکھیں کون کافر ہے
کسی کی مست آنکھوں کا تصدق ہے مری مستی — صراحی ہے نہ شیشہ ہے پیالہ ہے نہ ساغر ہے
کروں کس منہ سے شکوہ اس کی میں نازک مزاجی کا — دل ناعاقبت اندیش بھی تو نازپرور ہے
سب اپنا حال دل کہدوں تمنائے دل مضطر — مگر تلقین خاموشی بہ رعب حسن کافر ہے

شراب آتشین کی علم کچھ پوچھو نہ کیفیت
نظر میں چار مینار ابھی اب تک برابر ہے

تجدید عشق

جناب مسیح الدین خاں صاحب جیب

پھر وفور شوق ہے ہنگامہ آرا وفا
پھر بھڑک اٹھے ہیں شعلے عشق کی تجدید کے

پھر ہے ہنگام تمنا طور دو آغوش آج
پھر نظر آتے ہیں جلوے حسن کی تمہید کے

پھر سکون انجام ہے بیتابی قلب حزین
پھر وہی ساماں نظر آتے ہیں روز عید کے

پھر تیری پرتو جمی علم ہے دیدہ جلوہ شناس
پھر مزے آتے ہیں مجھکو مہ رخوں کی دید کے

پھر ہے پرواز تخیل انتہائے آرزو
پھر فلک پیمائیاں ہیں ڈھنگ ذوق دید کے

پھر ہے ان کی برق پاشی اضطراب شوق میں
پھر نظر آتے ہیں دن پیکس تیری تجدید کے

غزل

جناب لیلیٰ بیگم صاحبہ لیلیٰ

[illegible] اثر آہ رسا کرتے ہیں
اون سے ملنے کی تمنائیں کیا کرتے ہیں

گاہے گاہے میری تقدیر چمک جاتی ہے
بھولے بھٹکے وہ سر راہ ملا کرتے ہیں

کوئی دیوانہ نہ سمجھے تیرے دیوانوں کو
عشق کا نام جو لیتے ہیں وفا کرتے ہیں

لیجیے دل کم نگہی ہائے غضب وائے ستم
اور کیا کرتے ہیں جو لوگ دغا کرتے ہیں

ایسی لذت ہے تڑپنے میں کہ تیرے بسمل
خنجر ناز کے مشتاق رہا کرتے ہیں

اون کو اندازہ محشر ہے انہیں خوف نہیں
چشم بد دور وہ خود حشر بپا کرتے ہیں

پہونچے گی لیلیٰ کی رسائی نجف اشرف تک
وہ یہ کہتے ہیں جو دن رات دعا کرتے ہیں

تحقیق سن فصلی

مولنا عبد الواسع مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(بسلسلۂ گذشتہ)

(۳) شاہجہاں کے عہد تک بادشاہوں کے سنہ جلوس میں ماہ الہٰی مستعمل تھے اورنگ زیب نے اپنے سنہ جلوس میں عربی ہلالی مہینے استعمال کئے۔

(۴) شاہجہاں تیمور نسل کا مسلمان فرمانروا تھا۔

(۵) دربار شاہجہانی کے اکثر امراء ایرانی اور تورانی تھے۔

(۶) ایران و توران میں اس زمانہ میں سنہ جلالی رائج تھا جس کے مہینے فارسی تھے۔

(۷) ایران کے مفتوح ہونے کے بعد ایرانی آتش پرست جنوبی ہند کے ساحلی شہروں میں آکر آباد ہو گئے تھے جو ان مقامات میں اب تک آباد ہیں۔

(۸) شاہجہاں و اورنگ زیب کے عہد کی معتبر تاریخوں میں جنوبی ہند کے سنہ فصلی کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ زیچ شاہجہانی میں اس کا ذکر ہے۔

ان واقعات میں جو ثبوت طلب ہیں ان کے صحت کے لئے شاہجہاں نامہ عالمگیر نامہ منتخب اللباب وغیرہ تاریخیں شاہد ہیں۔

واقعہ دوم کے معائنہ سے واضح ہے کہ جنوبی ہند کے سنہ فصلی کا رواج ۹۹۲ھ کے بعد ہوا ہے اس لئے کہ ان مہینوں کی جدید ترتیب ۹۹۲ھ میں بحکم اکبر اعظم ہوئی ہے اور چونکہ جہانگیر کے عہد فرمانروائی تک ممالک دکن سلاطین تیموریہ کے قلمرو سے خارج تھے اور ان مہینوں کے ترتیب جدید سلاطین تیموریہ کے دربار میں رہی ہے لہذا پتہ چلتا ہے کہ اس سنہ کا رواج شاہجہاں یا اورنگ زیب کے دور حکمرانی میں ہوا لیکن اورنگ زیب نے فارسی مہینے خود اپنے جلوس سے خارج کر دیئے تھے جیسا کہ واقعہ سوم سے ظاہر ہے اس لئے یہ باور نہیں کیا جا سکتا اس نے کسی مستقل سنہ میں خود یہ مہینے رائج کئے ہوں ان اسباب سے ہم قطعاً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ممالک دکن میں

اس سنہ کا رواج عہد شاہجہانی میں ہوا۔ اب رہی یہ بات کہ آیا یہ سنہ شاہجہاں کا مرتب سنہ ہے یا کوئی قدیم سنہ جس کو اس نے رائج کیا۔

واقعہ چہارم کے ملاحظہ سے ظاہر ہے کہ اگر یہ شاہجہاں کا مرتب کردہ سنہ شمسی ہوتا تو وہ ضرور اس کا مبداد اپنے مذہب کی بناد پر اسلام کے کسی اہم واقعہ کو قرار دیتا جس کو اب تک تیرہ صدیاں گذر چکی ہوں ایسے واقعات صرف دو ہیں:۔

۱۔ حضرت سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت جو ۲۰ راپریل ۵۷۱ء کو ہوئی اس واقعہ کو ۱۳۳۶ھ میں ۱۳۴۶ سال شمسی ہوئے۔

۲۔ آنحضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جو ۶۱۱ء میں ہوئی جس کو ۱۳۳۶ھ ہجری تک ۱۳۰۶ سال شمسی ہوئے۔

یا شاہجہاں اپنے خاندان کے لحاظ سے تیمور صاحبقراں کے جلوس کو اس کا مبداد قرار دیتا جو چودھویں صدی عیسوی کی آخر یعنی ۱۳۷۰ء میں ہوا ہے۔ مگر سنہ فصلی کے اعداد بتلاتے ہیں کہ ان مبارک واقعوں سے کوئی اس سنہ کا مبداء نہیں ہے نیز اگر اس سنہ کی ترتیب شاہجہاں کے دور حکمرانی میں ہوئی ہوتی تو عہد شاہجہانی کی تاریخوں اور زیچ شاہجہانی میں ضرور اس کا ذکر ہوتا۔ پس واقعہ چہارم و ششم کے معائنہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا سنہ فصلی نہ شاہجہاں کا مرتب سنہ ہے اور نہ شاہجہاں کے فرمان کے ذریعہ بطور سرکاری دفاتر شاہی میں اس کا رواج ہے ورنہ یہ سارے ہندوستان کا سرکاری سنہ ہوتا اور تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا بلکہ یہ کوئی قدیم شمسی سنہ ہے۔

اس حد تک پہنچنے کے بعد کہ جنوبی ہندوستان کا سنہ فصلی کوئی قدیم سنہ شمسی ہے یہ امر تحقیق طلب رہجاتا ہے کہ یہ سنہ کس قوم کا مقرر کردہ ہے اور اس کا مبداء کیا ہے اس کا سراغ ہم کو اس سنہ کے مہینوں سے ملتا ہے اس سنہ کے مہینے وہی فارسی مہینے ہیں جو ساسانیوں کے زمانہ حکمرانی سے ممالک ایران میں رائج تھے اور اسلامی حکومتوں کے زمانہ میں بھی ایران و توران میں برابر رائج رہے اس لئے یہ بات قطعی ہے کہ جب یہ کوئی اسلامی سنہ نہیں ہے تو ضرور ساسانیوں کا جاری کردہ سنہ ہے۔ ہم گذشتہ بیانات میں ظاہر کر چکے ہیں کہ ہر ساسانی بادشاہ اپنے

سال جلوس سے ایک نیا سنہ جاری کرتا تھا جو اس کے عہد حکمرانی کے ختم ہوتے ہی معدوم ہو جاتا تھا چنانچہ پارسیوں کا موجودہ سنہ یزدجردی ان کے آخر فرمانروا یزدجرد ساسانی کی یادگار ہے جو ابتک اس لئے زندہ ہے کہ یزدجرد کے بعد اس قوم کا کوئی فرماں روا نہیں ہوا۔

یہ منقح ہوجانے کے بعد ہمارا سال فصلی ساسانیوں کا جاری کردہ سنہ ہے جو ان کے کسی بادشاہ کے سال جلوس سے شروع ہوتا ہے تو یہ بات تحقیق طلب رہجاتی ہے کہ وہ بادشاہ کون ہے اس امر کے دریافت کرنے کے لئے ہمیں ایران کے قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۸۹ء میں ہرمز فرمانروائے ایران سے بہت سے امرائے دربار باغی ہو گئے تھے جن کا سرگروہ بہرام چوبین تھا۔ اس بغاوت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۵۹۰ء میں فوج نے ہرمز کو تخت سے اتار کر اس کے بجائے ہرمز کے فرزند خسرو پرویز کو تخت نشین کرلیا جس سے بغاوت کی آگ ایک حد تک بجھ گئی۔ مگر بہرام چوبین نے اس کے سامنے بھی سراطاعت نہیں جھکایا بلکہ خسرو پرویز سے لڑکر اس کو فاش شکست دی جس کے بعد خسرو پرویز قیصر روم کے پاس جاکر پناہ گزیں ہوا۔ اور بہرام چوبین سر پر تاج پہنکر شاہ ایران بن گیا مگر اس کو چند ماہ سے زیادہ سلطنت کرنا نصیب نہ ہوا تھا کہ خسرو پرویز ۵۹۱ء میں رومیوں کا امدادی لشکر لیکر ایران پر حملہ آور ہوا۔ نغام زاب میں عظیم الشان جنگ ہوئی جس میں بہرام چوبین کو کامل شکست ہو گئی اور خسرو پرویز دوبارہ اپنے موروثی تخت وتاج ایران کا مالک ہوگیا اسی سال خسرو پرویز نے اس فتح اور اپنے جلوس کا عظیم الشان جشن کیا جس میں ایرانی امراء کے علاوہ رومی عہدہ داران فوج بھی شریک تھے اس لئے ۵۹۱ء سے اس کا سنہ جلوس جاری ہوا ہوگا جس کو ۱۹۱۷ء تک ۱۳۲۶ سال شمسی ہوتے ہیں اور چونکہ ہمارا سنہ فصلی بھی اس سال ۱۳۲۶ ف ہے اس لئے قطعاً یہ سنہ پرویزی ہے ہماری اس رائے کی تائید مولف غیاث اللغات کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے اس کو فارسی سنہ قرار دیا ہے لیکن چونکہ اس کے زمانہ میں پارسیوں میں یزدجردی سال رائج تھا اس لئے اس نے اس کو سہواً یزدجردی سنہ لکھدیا ہے حالانکہ یہ سنہ یزدجردی نہیں بلکہ سنہ پرویزی ہے۔

مگر یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ساسانیوں کے سنہ عموماً نوروز یعنی یکم فروردین سے شروع ہوا کرتے تھے لہذا اگر جنوبی ہند کا سنہ فصلی سنہ پرویزی ہوتا تو اس کو بھی یکم فروردین سے شروع ہونا چاہئے تھا

نہ یکم آذر سے لیکن ان تغیرات کے معلوم ہوجانے کے بعد جو اس سنہ کے متعلق خود سلطنت آصفیہ میں ہوئے ہیں بآسانی اس کا جواب دیا جاسکتا ہے سلطنت آصفیہ میں سنہ فصلی کی ابتدا پہلے یکم امرداد سے تھی پھر یکم مہر سنہ فصلی کا روز اول قرار پایا پھر یکم آذر سال کا روز نو قرار دیا گیا اس وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ اسی قسم کے تغیرات اس سے پہلے بھی ہوئے ہونگے جن کی وجہ سے یکم فروردین سنہ فصلی کا روز اول نہیں باقی رہا۔

سنہ فصلی کے رواج کی ابتدا یہ تمام مراحل طے ہوجانے کے بعد یہ امر تحقیق طلب باقی رہجاتا ہے کہ جنوبی ہند میں اس سنہ کا رواج کب سے اور کن اسباب کی بناء پر ہوا۔ اس کے متعلق ہمارا یہ خیال ہے کہ شاہجہاں کے زمانہ میں جب صوبجات دکن فتح ہوئے تو افسران صوبہ کو تعیین فصول و اوقات مالگذاری کے لئے کسی سنہ شمسی کے اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی۔ سنہ الٰہی سے یہ کام اس لئے نہیں لیا جاسکتا تھا کہ اس سنہ کا رواج فرمان شاہی کے ذریعہ سے ممنوع قرار پاچکا تھا اور نگ زیب کے ہمراہی عہدہ داروں میں اکثر تورانی اور ایرانی امراء کی اولاد شریک تھی جو اکثر ممالک مفتوحہ کے صوبوں اور ضلعوں کے افسر مقرر ہوگئے تھے لہذا حب الوطن کی وجہ سے ان کا طبعی رجحان یہ تھا کہ جو سنہ شمسی یہاں جاری کیا جائے وہ ان کے وطن کا کوئی مروجہ سنہ شمسی ہو بلکہ ان کی دلی آرزو تو یہ تھی کہ اگر سنہ الٰہی خارج کردیا گیا ہے تو اس کی جگہ سنہ جلالی کو ملنا چاہئے مگر سنہ جلالی کے جاری کرنے میں اورنگ زیب کی مخالفت کا خوف تھا اس لئے کہ شہزادہ اورنگ زیب شاہان اسلام کے طرف سنین شمسی کا انتساب ناپسند کرتا تھا اور اسی بناء پر اس نے اپنے سنہ جلوس کے مہینے شمسی کے بجائے قمری کردیے تھے اس وجہ سے عہدہ داران مقامی نے ان پارسیوں سے مشورہ کیا ہوگا جو سلطنت ساسانی کی بربادی کے بعد ان مقامات پر آکر آباد ہوگئے تھے اور پارسیوں نے اس کام کیلئے ساسانیوں کے مختلف سنہ پیش کئے ہونگے حسن اتفاق سے اس زمانہ میں سنہ پرویزی اور سنہ ہجری کے اعداد قریب قریب تھے یہ ایسی قوی وجہ تھی جس نے سنہ پرویزی کو سنہ یزدجردی پر ترجیح دیدی اور تعیین اوقات وصول مالگذاری کیلئے ممالک دکن میں سنہ پرویزی رائج کردیا گیا۔ مگر اس کے مہینوں میں بین غلطی تھی اور کبیسہ کا طریقہ بھی جاری نہ تھا اس لئے مہینوں کے شمار ایام میں وہ تغیر کردیا گیا جو سنہ الٰہی کے مہینوں میں ہوا تھا یا یوں کہا جائے کہ اس سنہ میں اس کے مہینوں کے بجائے سنہ جلوس شاہجہانی یا سنہ الٰہی کے مہینے مستعمل کردیے گئے اسی وجہ سے یہ مہینے ماہ ہائے الٰہی کہلاتے ہیں ماہ ہائے سنہ فصلی۔

اور چونکہ اس سنہ کا رواج اغراض زراعتی و تعین اوقات فصول کیلئے ہوا تھا اور ممالک دکن میں زراعتی سال آفتاب کے نقطہ انقلاب صیفی پر پہنچنے سے شروع ہوتا تھا اس لئے اس سنہ کے برسوں کا روز نو بجائے یکم فروردین کے یکم تیر قرار دیدیا گیا اور اسی وجہ سے اس سنہ کا نام سنہ فصلی مشہور ہوگیا یہ وہ اسباب تھے جن کی بناد پر عہدہ داران دکن کی کوششوں سے سنہ پرویزی نے دوبارہ سنہ فصلی کے نام سے جنم لیا۔ اور چونکہ اس سنہ کے رائج کرنے میں عہدہ داران مقامی نے اپنے اختیارات ذاتی سے کام لیا تھا اور شاہی منظوری نہیں حاصل کئے تھے اس وجہ سے اس سنہ کا تذکرہ سلاطین تیموریہ کی تاریخوں اور زیچ شاہجہانی میں نہیں ہے اور نہ یہ سنہ تمام سلطنت ہند کے صوبوں میں رائج ہوا۔ ہماری یہ تحقیق اگرچہ قیاسی ہے مگر قیاسات صحیح تاریخی واقعات سے مستنبط ہیں اس لئے اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔

سنہ فصلی کے روز نو میں تبدیلیاں | اگر اس سنہ فصلی میں کبیسہ کا استعمال باقاعدہ طور پر برابر ہوتا رہتا تو آفتاب ہمیشہ انقلاب صیفی پر یکم تیر کو آیا کرتا جو سنہ فصلی کے سالوں کا روز نو قرار پایا تھا لیکن فلسفہ تمدن کا یہ عام اصول ہے کہ جب تک کوئی سلطنت اپنے عروج اور شباب کی حالت میں رہتی ہے اس وقت تک اس کے تمام انتظاموں میں باقاعدگی اور اصولی پابندی موجود رہتی ہے اور حکومت کے مشین کے تمام پرزے درست رہتے ہیں اور صحیح رفتار سے چلتے ہیں اور جب اس میں ضعف و زوال کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں تو اس کے انتظامات کا نظام مختل ہو جاتا ہے اور حکمرانی کی کل کے ہر پرزے میں کچھ نہ کچھ نقصان آجاتا ہے جو رفتہ رفتہ اس کو ساکن کردیتا ہے سلطنت تیموریہ بھی اس کلیہ کے اثر سے نہ محفوظ رہ سکی اور اس کا اثر سنہ فصلی پر بھی پڑا۔ جب سلطنت کے ضعف کا زمانہ آیا اور مرہٹوں کی بغاوت و خودسری کے باعث ممالک دکن میں طوائف الملوکی ہوگئی تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۰ سال تک سنہ فصلی میں کبیسہ نہیں کیا گیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ آج کل یکم تیر کے بجائے آفتاب نقطہ انقلاب صیفی پر ۱۷ امرداد کو آتا ہے اور بالکل قرین قیاس ہے کہ رفتہ رفتہ ۱۲۴ سال میں جب یہ نوبت پہنچی ہوگی کہ آفتاب بجائے یکم تیر کے یکم امرداد کو انقلاب صیفی پر آنے لگا ہو تو اس سنہ کی ابتدا زراعتی سنہ ہونیکی وجہ سے بجائے یکم تیر یکم امرداد سے کردی گئی ہو۔ اس کے بعد سنہ فصلی کے روز اول میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ سب سلطنت آصفیہ میں ہوئیں جو ممکن ہے کہ ملکی اغراض پر مبنی ہوں مگر حسابات فلکی پر یقیناً مبنی نہیں تھیں۔

سنہ فصلی کے نقائص | ہم ابتدا مضمون میں بیان کر چکے ہیں کہ فلک بروج کے چھ معین نقطوں سے جب آفتاب کسی ایک نقطہ پر پہنچتا ہے تو سنہ شمسی کی ابتدا کی جاتی ہے سنہ عیسوی کی ابتدا یکم جنوری سے ہوتی ہے جب آفتاب راس شمسی پر آتا ہے سنہ محمدی یکم حمل سے شروع ہوتا ہے جب آفتاب اعتدال ربیعی پر ہوتا ہے سنہ یزدجردی کے ابتدا بھی اسی وقت سے ہوتی ہے ہمارا سنہ فصلی بھی جو حقیقتاً سنہ یزدجردی ہے ابتداء نوروز یعنی آفتاب کے اعتدال ربیعی پر پہنچنے کے وقت سے شروع ہوتا تھا اور جب دوبارہ وہ رائج کیا گیا تو اس کی ابتدا یکم تیر سے قرار دی گئی جب آفتاب نقطہ انقلاب صیفی پر پہنچتا تھا لیکن کچھ روز تک اس میں عمل کبیسہ ہونے سے یہ خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ ابتدا سال میں تو درکنار کسی مہینہ کی پہلی تاریخ کو بھی آفتاب ان چند نقطوں میں سے کسی پر نہیں پہنچتا ہے بلکہ آفتاب انقلاب شتوی پر ۱۹ ربہمن کو راس شمسی پر ۹ ربہمن کو اعتدال ربیعی پر ۷ ار اردی بہشت کو انقلاب صیفی پر ۷ ار امرداد کو ذنب شمسی پر ۲۶ ر امرداد کو اعتدال خریفی پر ۱۸ ر آبان کو آتا ہے۔ یہ خرابی ایک ایسا بدنما دھبہ ہے جس کا محو کرنا ہر مہذب اور متمدن گورنمنٹ کا ضروری فریضہ ہے خصوصاً دولت آصفیہ کا جس کے فرمارو دولت علم و ہنر سے مالا مال اور قدردانی علما و فضلا میں عدیم المثال ہیں اور جن کا دربار دربار مجمع ارباب کمال ہے۔

یہ بھی ابتدا مضمون میں بتا دیا گیا ہے کہ آفتاب دائرۃ البروج کے چاروں برابر ٹکڑوں کو جو فصول اربعہ کے نام سے موسوم ہیں مختلف زمانوں میں قطع کرتا ہے اسی سے ہر فصل کے دنوں کی تعداد مختلف ہے یعنی فصل ربیع = ۹۲٫۹ دن۔ فصل گرما ۹۳٫۶ دن موسم خزان ۸۹٫۷ دن۔ موسم سرما ۸۹٫۰ دن۔ لہذا جس سال شمسی کی ابتداء اعتدالین یا انقلابین سے ہو اس کے مہینوں میں اس امر کا لحاظ رہنا چاہئے کہ اس کی ہر سہ ماہی کے ایام اس فصل کے ایام کے مساوی ہوں اسی بناء پر جب سنہ الہی کے مہینوں کی تعداد ایام کا تعین از سر نو کیا گیا تو اس میں اس بات کا بھی ایک حد تک لحاظ رکھا گیا تھا اور چونکہ ہمارے سال فصلی میں بھی ماہ ہائے سنہ الہی مستعمل ہیں اس لئے اس سنہ کی پہلے سہ ماہی یکم تیر سے آخر شہریور تک فصل گرما پر اور دوسری سہ ماہی یکم مہر سے آخر آذر تک موسم خزاں پر اور تیسری سہ ماہی یکم دے سے آخر اسفندار تک فصل سرما پر اور چوتھی سہ ماہی یکم فروردین سے آخر خورداد تک موسم بہار پر منطبق تھی۔ (باقی دارد)

موتیوں کا مالا

(جناب ابوالمکارم فیض محمدؐ صاحب صدیقی بی۔ اے)

زبیدہ حسن و نزاکت کی پتلی تھی۔ بدبختی نے اوسے ایک مزدور گھرانے میں پیدا کیا تھا۔ دولت وشہرت اس کی قسمت میں نہ تھی۔ پھر کیسے وہ مالدار اور مشہور گھرانے میں بیاہی جا سکتی! وہ ایک معمولی اہلکار کی بیوی تھی۔ یہ سادہ لباس پہنا کرتی تھی قیمتی لباس اور زیورات اس کے حصہ میں نہ تھے وہ اپنی غربت کو بھی محسوس کرتی تھی اور اپنے حسن کی سحر آفرینیوں سے بھی اچھی طرح واقف تھی لیکن قسمت نے ایسا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے حسن کی نمائش کر سکے وہ محسوس کرتی تھی کہ دنیا کا عیش و آرام اور دنیا کی ان گنت نعمتوں کی وہ بجا طور پر مستحق ہے اسے اپنے گھر کی غربت، دیواروں کی بوسیدگی، پھٹے پرانے فرش اور عام بے سلیقگی سے سخت نفرت تھی۔ بار بار انہی چیزوں کا خیال اس کے حساس و نازک دل پر چوٹیں لگاتا۔ لیکن کیا حاصل؟ وہ سوچتی تھی کہ اس کیلئے عالیشان محل ہو۔ برقی قمقموں کی روشنی ہو۔ دروازوں اور دریچوں پر ریشمی پردے پڑے ہوں۔ کمرے میز کرسی اور فرش سے آراستہ ہوں۔ گھر میں ہر چیز سلیقہ سے اپنی جگہ رکھی ہو۔ اور دو چار ملازم دست بستہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کیلئے کھڑے ہوتے ہوں!!

کھانے کے وقت جب وہ دسترخوان پر بیٹھتی تو اس کا شوہر بعض وقت بھنی ہوئی مچھلی کی خوشبو سونگھ کر بے اختیار کہہ اٹھتا "کتنی اچھی بو ہے!" اس وقت زبیدہ کا ذہن ان دسترخوانوں کی طرف منتقل ہو جاتا جن پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے ہوں۔ کانچ کے برتن ہوں پھولوں کے گلدستے ہوں۔ اور ملازم سربراہی کر رہے ہوں۔

زبیدہ کے پاس نہ تو زیورات تھے اور نہ قیمتی کپڑے۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ حالانکہ وہ انہی چیزوں کو پسند کرتی تھی اور سمجھتی تھی کہ وہ سب اسی کیلئے ہیں

زبیدہ کی ایک مالدار عورت سے دوستی تھی دونوں ایک ساتھ ایک ہی مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے۔ لیکن

اپنی غربت کے باعث وہ ایک دفعہ بھی اپنے پاس اسے بلا نہ سکی اور نہ ایک دفعہ بھی اس کے پاس جانیکی اسے ہمت ہوئی جب کبھی وہ یاد آتی، رو رو کر اس کا بڑا حال ہوتا لیکن افسوس غم اور نا امیدی کو اپنے نازک مگر کسی قدر مضبوط دل میں دفن کرکے خاموش ہو جاتی۔

ایک روز شام کے وقت اس کا شوہر خوشی سے پھولا ہوا، اچھلتا کودتا مکان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سفید لفافہ تھا۔

"زبیدہ میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں" اس نے کہا۔

زبیدہ نے بڑھکر اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔ اس میں ایک کارڈ تھا۔ یہ حامد اللہ چیف جسٹس (انور کا اعلیٰ عہدہ دار) کی نواسی کی سالگرہ کی تقریب میں ان کی اہلیہ کی طرف سے زبیدہ کے نام کا دعوت نامہ تھا۔

بجائے اس کے کہ خوشی سے پھول جاتی زبیدہ نے بڑی صورت بنا کر رقعہ کو دالان میں پھینک دیا اور کہنے لگی "مجھے اس سے کیا کام!"

"کیوں پیاری؟ میں تو سمجھتا تھا کہ تم اس دعوت نامہ سے خوش ہو جاؤ گی۔ تم تو ہمیشہ کہیں نہ کہیں باہر جانے کی آرزو مند رہتی ہو۔ بھلا اس سے بہتر اور کیا موقع مل سکتا ہے؟ وہاں تمہیں بڑے بڑے لوگوں کی بیویوں سے ملنے کا موقع ملیگا"؟

زبیدہ نے پر نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہنے لگی "جاؤں تو کیسے، میرے پاس پہننے کو کیا ہے؟"

انور نے تو یہ بات سوچی نہ تھی، پہلے تو وہ سٹ پٹایا لیکن پھر کہنے لگا:-

"کیوں کیا فکر ہے، وہ عید کا جوڑا تو تمہارے پاس ہے بس ٹھیک ہے۔ میں ...... "

یہ کہکر وہ رک گیا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی۔ اس کے رخسار پر آنسوؤں کے قطرے دو بڑے موتی معلوم ہو رہے تھے۔ انور گھبرا کر کہنے لگا۔

"کیوں کیا معاملہ ہے، کیا بات ہے؟"

بڑی کوشش سے ضبط کرکے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے زبیدہ نے جواب دیا:-

"میرے پاس کوئی ایسا لباس نہیں جسے پہنکر میں اتنی بڑی دعوت میں جاسکوں، جانا کون ضروری ہے، پھر نہ جانے سے کون پوچھیگا؟ ہم غریبوں کو تو بس اپنا گھر ہی بھلا"۔

انور بڑی الجھن میں پڑگیا۔ زبیدہ کی طعن نے اس کے دل پر ایک ضرب سی لگائی۔ یکایک وہ جوش مردانگی سے کہنے لگا "اچھی زبیدہ! آزردہ نہ ہو، بتلاؤ اس موقع کیلئے کتنے روپیہ کی ساڑی چاہیئے"!

زبیدہ کیلئے یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ کتنی رقم بتلائی جائے؟ اس کا شوہر کتنی رقم دےسکتا ہے؟ کیا اس کی خواہش رد تو نہ کردی جائیگی؟ کیا ایک معمولی اہلکار اس کی خواہش کو پورا کرسکتا ہے؟

زبیدہ نے ذرا تامل کرکے کہا "میں کوئی صحیح اندازہ تو بتلا نہیں سکتی۔ بس یہی سو روپیہ کافی ہوجائینگے"۔

انور کا چہرہ زرد پڑگیا۔ اس کے پاس کل سو روپیہ جمع تھے وہ اس پیسے سے بندوق خرید کر گرما کی تعطیلات میں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کو جانا چاہتا تھا۔ بہرحال اس نے کہا "اچھا میں تمہیں سو روپیہ دیتا ہوں مگر دیکھو ذرا اچھی ساڑی خریدنا ——— مضبوط"۔

دعوت کا دن آگیا۔ زبیدہ صبح سے بے چین، غیر مطمئن اور آزردہ تھی۔ اس کے شوہر نے پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟ ساڑی تو آگئی پھر تم آزردہ کیوں ہو"؟

زبیدہ نے کہا "میں کیا کروں اس فکر میں ہوں کہ پہننے کو تو خیر ساڑی ہے لیکن زیور میں ایک چیز بھی نہیں۔ بس فقیرنی دکھائی دوں گی۔ بہتر ہے کہ میں جانے کا ارادہ ہی سرے سے ترک کردوں"۔

انور نے جواب دیا "یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے۔ تمہارے خوبصورت چہرے کی سادگی ہزار زیور سے بہتر ہے"۔

زبیدہ مسکرائی مگر اس جواب سے وہ مطمئن نہ تھی۔

"کیا پڑی ہے جو میں وہاں جاؤں اور جاکر اپنی غربت کا اظہار کردوں"۔

انور نے کچھ سوچا۔ زبیدہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا "اچھا زیور بھی ملجائیگا۔ دیکھو تم کہتی تھیں ناکہ مرلتا بیگم سے تمہارا بڑا بہناپا تھا۔ ان کے پاس زیورات کی کیا کمی ہے تم جاکر اون سے ایک آدھ چیز مستعار لالو"۔

زبیدہ کی ناامیدی امید سے بدل گئی۔ وہ چلّا اٹھی:۔

" اہا۔ کاش یہ خیال مجھے پہلے ہی آتا۔ اتنی پریشانی بھی نہ ہوتی "

اسی وقت گاڑی منگاکر وہ مہ لقا کی ڈیوڑھی پر پہنچی اور ان سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ مہ لقا واقعی زبیدہ کو بہت چاہتی تھی کہنے لگی" اچھا کونسی چیز چاہئے' میں اپنے زیورات کی صندوقچی منگواتی ہوں اس میں سے جو جی چاہے لیلو" یہ کہکر مہ لقا نے اپنے ماما کے ذریعہ صندوقچی منگواکر زبیدہ کے آگے رکھدی۔

زبیدہ نے پہلے پہونچیوں کی ایک جوڑ نکالی۔ انہیں پہنا اور پھر اندر رکھدیا۔ اس کے بعد لچھا نکالا۔ وہ بھی پسند نہ آیا۔ پھر یکے بعد دیگرے سب زیور نکالے لیکن آخر میں اس کی نظر انتخاب موتیوں کے ایک مالے پر پڑی۔ مہ لقا کی طرف دیکھ کر وہ کہنے لگی۔

" کیا میں اسے لیسکتی ہوں؟"

" کیوں نہیں' شوق سے" مہ لقا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ زبیدہ کے چہرہ پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ سلام کرکے رخصت ہوگئی۔

زبیدہ گھر پہنچی۔ آج وہ ضرورت سے زیادہ خوش تھی۔ اس کے چہرہ پر مسرت و شادمانی کے جذبات موجیں مار رہے تھے۔ بن سنور کر وہ دعوت میں پہنچی۔ تمام عورتوں کی نظریں اسی کی طرف تھیں۔ ہر عورت اس کا نام پوچھتی تھی۔ میزبان نے بھی بڑی آؤ بھگت کی اپنے تئیں محسوس کررہی تھی کہ وہ ایک نئی دنیا میں ہے اور اس کی حیثیت ایک ملکہ کی ہے۔

رات کے چار بج گئے، تب کہیں زبیدہ کو چھٹی ملی۔ باہر اس کا شوہر منتظر کھڑا تھا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ سب مدعوئین اپنی اپنی سواریوں میں رخصت ہو رہے تھے اور زبیدہ کے لئے اس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ انور نے بڑی کوشش سے ایک ٹانگہ کرایہ کرلیا اور زبیدہ اوروں کی نظر بچاکر اس میں سوار ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں وہ گھر پہنچی۔

زبیدہ کے "بناؤ" کی یہ آخری بہار تھی۔ وہ ہر طرح سے مطمئن تھی اور ابھی تک گذشتہ کا خواب اس کی آنکھوں میں اصلیت کے رنگ میں موجود تھا۔ زبیدہ بالآخر آئینہ کے سامنے آئی تاکہ کپڑے اور زیور اتارنے سے پہلے ان پر ایک آخری نظر ڈال لے۔ یکایک اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ کیوں؟ مالا موجود نہ تھا!!

انور ابھی پوری طرح کپڑے بدلنے نہ پایا تھا کہ زبیدہ کی آواز سن کر مضطربانہ انداز میں پوچھنے لگا۔
"خیر تو ہے؟"

زبیدہ اس کی طرف پلٹی۔ اس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کہنے لگی "مال . . . . مالا . . مالا گم گیا"
انور بے تابی سے چلا اٹھا "کیا . . . . کیا . . . . ناممکن"

دونوں مل کر کپڑوں کی تلاشی لینے لگے اور ایک ایک کپڑا دیکھ ڈالا مگر مالا نہ ملنا تھا نہ ملا۔
"کیا تمہیں یقین ہے کہ گاڑی میں سوار ہوتے وقت مالا موجود تھا؟"
"ہاں! ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اسے سوار ہوتے وقت دیکھا تھا"
"تو پھر گاڑی میں ہونا چاہئے"
"بیشک، کیا تم کو گاڑی کا نمبر یاد ہے؟"
"نہیں، کیا تم نے بھی اسے نہیں دیکھا؟"
"نہیں!"

دونوں ایک دوسرے کو متجسسانہ انداز میں دیکھنے لگے، بالآخر انور نے کپڑے پہنے۔
"میں تمام راستہ دیکھ ڈالوں گا۔ اور جہاں تک ہو سکے اسے تلاش کر لاؤں گا؟"

وہ باہر چلا گیا۔ زبیدہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس میں ہاتھ ہلانے کی بھی سکت نہ تھی وہ اس وقت یاس و ناامیدی کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر صبح سات بجے واپس آیا لیکن خالی ہاتھ۔

انور نے پولس میں اطلاع دی۔ مقامی اخباروں میں لکھوایا۔ انعام مقرر کیا۔ گاڑی والوں سے مل کر پتہ چلانے کی کوشش کی۔ غرض جہاں جہاں اسے امید کی ایک جھلک بھی نظر آئی اس نے وہاں اس مالے کو تلاش کیا تمام دن اسی ادھیڑ بن میں رہا اور شام کو آزردہ اور افسردہ مکان واپس آیا۔ اور اپنی بیوی سے کہنے لگا۔

"تم اپنے دوست کو اطلاع دو کہ مالا ٹوٹ گیا ہے درست ہوتے ہی روانہ کر دوں گی۔ اس طرح ہمیں ڈھونڈھنے کیلئے کچھ وقت مل جائیگا۔"

زبیدہ نے ایسا ہی کیا۔

ایک ہفتہ گذر گیا اور مالا ملنے کی اب کوئی توقع نہ رہی۔ انور نے کہا "خیر جو کچھ ہوا، ہوا۔ اب ہمیں ویسا ہی مالا واپس کرنے کی فکر کرنی چاہیئے"

دوسرے دن مالے کے ڈبہ کو لیکر وہ اس دکان پر گئے جس دکان کا نام اس پر لکھا ہوا تھا۔ لیکن اس جوہری نے کہا "میں نے مالا نہیں بیچا۔ البتہ یہ ڈبہ میرے یہاں کا بنا ہوا ہے"

اب دونوں مل کر تمام جوہریوں کی دکانیں تلاش کرنے لگے تاکہ ویسا ہی مالا خریدیں۔ آخر کار بڑی چھان بین کے بعد ایک بڑے جوہری کے پاس بالکل ویسا ہی مالا مل گیا۔ لیکن اس کی قیمت دو ہزار تھی۔ دو ہزار کی رقم کہاں سے لائیں۔ انور کا مکان صرف ایک ہزار کی مالیت کا تھا اور اس عجلت میں فروخت کرنے سے اسے بہ مشکل آٹھ نو سو مل سکتے تھے۔ دل مضبوط کرکے انور نے پندرہ سو پر اس مالے کا تصفیہ کرلیا اور کہا کہ تین دن میں وہ مالا اس سے خرید لیگا۔

واپس آکر اس نے اپنا مکان آٹھ سو میں فروخت کردیا۔ مکان کی ہر چھوٹی بڑی چیز جو شدید ضرورت سے زیادہ تھی فروخت کردی گئی۔ اس طرح سے اب اس کے پاس گیارہ سو روپیہ ہوگئے۔ باقی چار سو اس نے چار روپیہ سینکڑے کے حساب سے محلہ کے مارواڑی سے قرض لئے اور اس طرح پندرہ سو کی تکمیل کردی۔

زبیدہ مالے کو اسی ڈبہ میں رکھکر جب مہ لقا کے پاس پہنچی تو اس نے کہا "بہت اچھا ہوا جو تم آگئیں' میں خود اب مالے کو منگوانے والی تھی"

زبیدہ کو خوف تھا کہ کہیں مہ لقا بیگم ڈبہ نہ کھولے کیونکہ اگر وہ اس مالے کو پہچان لے تو کیا کہے گی۔ چور سمجھے گی۔

اب اس کی زندگی کا نقشہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ ملازم کو نکال دیا گیا تھا۔ وہ اب ایک چھوٹے سے مکان میں کرایہ سے تھے۔ زبیدہ گھر کا تمام کام خود کرتی۔ اس کا شوہر دن میں نوکری کرتا اور اس کے بعد جو وقت بچ رہتا اس میں کچھ خانگی کاروبار کرکے پیسے پیدا کرتا۔ زبیدہ لوگوں کے کپڑے سیتی اور ہمسایہ کا کھانا پکا دیا کرتی تھی۔ اس طرح دس برس گذر گئے اور خدا خدا کرکے قرضہ کی پائی پائی ادا ہوگئی۔

زبیدہ اب بہت بوڑھی معلوم ہوتی تھی اس کے بازو مضبوط ہو گئے تھے اس کے نرم و نازک ہاتھوں میں سختی آگئی تھی۔ اس کا حسن رخصت ہو چکا تھا۔ اگر مالا نہ جاتا تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ زندگی کس قدر عجیب ہے اس میں کتنا جلد تغیر ہوتا ہے ایک ادنیٰ سی بات، زندگی کو تاریک یا درخشاں بنانے کے لئے کافی ہے!!

ان تمام باتوں سے فراغت پانے کے بعد زبیدہ ایک شام اپنے شوہر کے ساتھ سینما گئی وہاں اتفاق سے مہ لقا بیگم سے اس کی ملاقات ہوئی۔ زبیدہ کا دل تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگا۔ اور وہ شش و پنج کرنے لگی کہ ملوں یا نہ ملوں لیکن اس نے اپنے دل میں کہا کیوں نہ ملوں میں نے تو مالا واپس کر دیا ہے۔ وہ آگے بڑھی۔ اور مہ لقا سے مخاطب ہوئی۔

"بندگی بہن!"

مہ لقا بیگم نے اسے پہچانا نہیں۔ وہ حیران تھی کہ یہ اجنبی کون ہے جو مجھ سے اس طرح مخاطب ہے اس لئے رکتے رکتے کہنے لگی۔ "میں نے تم کو نہیں پہچانا"

"نہیں، میں زبیدہ ہوں"

"زبیدہ۔ تم اتنی کیسے بدل گئی۔ میں نے کتنی دفعہ تمہیں بلایا۔ مگر تم نہ آئیں۔ کوئی دس بارہ سال گزر گئے!"

"ہاں گذشتہ دفعہ جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد سے میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ اور اس اثنا میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے"

"میری وجہ سے! اس سے تمہارا کیا مطلب"

"آپ کو یاد ہے، اس روز دعوت میں جانے کے لئے میں نے آپ کا مالا مستعار لیا تھا"؟

"ہاں، ٹھیک ہے، پھر"؟

"تو میں نے اسے کھو دیا!"

"پھر تم نے اسے کیسے واپس لا دیا؟"

"میں نے بالکل اس جیسا ہی دوسرا مالا خرید لیا۔ ہم دونوں دس برس سے اس کی ادائگی میں مصروف تھے۔ آپ کو معلوم ہے ہم غریبوں کیلئے یہ کتنا دشوار تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب ہم کسی کے قرضدار نہیں۔

اس لئے اب مجھے آپ سے کہنے میں بھی کچھ تامل نہیں ہوتا"

مہ لقا بیگم ذرا رک گئی۔

" تو کیا تم نے میرے مالے کے عوض سا سچے موتیوں کا مالا خریدا تھا "

" ہاں، ہاں، آپ نے شاید غور نہیں کیا "

مہ لقا بیگم مسکرائی اور زبیدہ سے بغلگیر ہو کر کہنے لگی۔

"بھولی زبیدہ، میرا مالا تو جھوٹے موتیوں کا تھا اس کی قیمت بیس پچیس سے زائد نہ تھی "

طلبع

نیند جو ننھے کی آنکھوں پر تھپکیاں دیتی ہے۔ اسے جانتے ہو؟ یہ کہاں سے آتی ہے؟ ہاں ایک نوارہ ہے کہ جنگل کی چھاؤں میں ایک پریوں کا گاؤں ہے اس میں جگنوؤں کی دھندلی سی روشنی کے درمیان دلربائی کی دو شرمیلی کلیاں لٹک رہی ہیں۔ بس یہ نیند وہاں سے ننھے کی آنکھوں کو چومنے کیلئے آتی ہے۔

وہ مسکراہٹ جو سونے میں ننھے کے ہونٹوں پر چہکتی ہے کیا کوئی جانتا ہے یہ کہاں پیدا ہوتی تھی؟ ہاں اُڑتی ہی خبر ہے کہ ایک دفعہ پہلی رات کے چاند کی کمسن اور دھندلی سی کرن نے خزاں کے اڑتے ہوئے بادل کا کنارا چھولیا تھا۔ بس وہاں یہ مسکراہٹ ایک شبنم سے دُھلی ہوئی صبح کے خواب میں پہلے پہل پیدا ہوئی۔ وہی مسکراہٹ جو سونے میں ننھے کے ہونٹوں پر جھلکتی ہے۔

وہ شیریں اور نرم و نازک تازگی جو ننھے کے اعضا میں ٹمٹماہٹ پیدا کر رہی ہے۔ کیا کسی کو معلوم ہے کہ وہ اب تک کہاں چھپی رہی؟ ہاں جب اس کی ماں ایک نوجوان دوشیزہ تھی اس وقت یہ اس کے دل کے اندر محبت کے نازک اور خاموش راز کی صورت میں پیوست تھی۔ یہی شیریں اور نرم و نازک تازگی ہے جو ننھے کے ہاتھ پاؤں میں ٹمٹماہٹ پیدا کر رہی ہے ۞ (ٹیگور)

نیند اور خواب

(جناب محمد عبدالقیوم صاحب باقی ایم۔ اے)

سائنس نے خواب کو مشاہدات حیات کا عکس اور انتشار دماغ کی دلچسپ تصویریں قرار دیا ہے مذہبی نقطہ نظر سے خواب انسان کی روحانی زندگی اور بیداری باطن کا ایک نامکمل مظاہرہ ہے۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ انسان کا قلب ایک بجلی گھر ہے اس کے دو دروازے ہیں ایک دروازہ عالم ناسوت کی طرف کھلا ہوا ہے دوسرا عالم ملکوت کی طرف۔ رات کو سو جانے کے بعد جب عالم ناسوت کے اثرات مسدود ہو جاتے ہیں تو انسان کی ملکوتی زندگی بیدار ہو جاتی ہے۔

بادی النظر میں ان دو نظریوں کو ایک دوسرے کا متضاد سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خواب دیکھنے کی قوت روحانی ہے خواہ اس کے اسباب دنیا سے تعلق رکھتے ہوں یا روح سے۔ انسان کا قلب و دماغ ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے اور اس مسئلہ میں ابھی شک ہے کہ آیا موت کے بعد انسان کی تمام اندرونی قوتیں معطل ہو جائیںگی۔ مذہب کا ادعا ہے اور سائنس نے جدید انکشافات کے ذریعے اس کی ایک حد تک توثیق بھی کی ہے کہ انسان کی حیات بعد الموت میں روح بیدار رہیگی اور اس بیداری پر اس کی دنیوی زندگی کے اثرات مترتب ہوتے رہینگے جب موت کے بعد یہ حالت ہے تو کیا تعجب ہے کہ زندگی میں بھی واقعات حیات کا انعکاس کسی نہ کسی طرح اس کے قلب و دماغ پر ہوتا رہے۔

جیسا کہ میں نے اس سے قبل کہا خواب دیکھنے کی اہلیت خواہ وہ کسی علت کا نتیجہ ہو بجائے خود ایک چیز ہے انسان خواب میں بعض اوقات ایسے اچھوتے واقعات ایسی نادر تصویریں ایسی عجیب کیفیتیں مشاہدہ کرتا ہے جن کو سوانح حیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواب محض زندگی کی آواز بازگشت نہیں ہے اس میں مشاہدہ باطنی اور روحانی مظاہرے اور قدرت کی پر اسرار قوتوں کو بھی دخل ہے۔

خواب ہر فرد بشر اور ہر طبقہ نسوانی کیلئے ایک دلچسپ چیز ہے مدت دراز سے اس کے متعلق غلط خیالات

رائج ہیں اور آج بھی کئی متمدن اقوام میں خواب کو ایک پُراسرار ماہیت سمجھتے ہیں بعض اقوام میں خواب کو خدائی پیام اور توصل ایزدی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے شاعر کے لئے خواب لطافت کی دنیا اور فضائے جنت ہے عامل کیلئے خواب غیر مادی مخلوق کے اثرات کی جولانگاہ ہے ۔ زاہد کے نزدیک خواب بشارۃ اور الہام کا ذریعہ ہے ۔ وہم پرست کے نزدیک یہ مستقبل خاموش کی پیش گوئیاں ہیں اور ڈاکٹر کے پاس یہ صحت و تندرستی کی بیش بہا نعمت ہے لیکن اب تک کسی نے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا کہ مقصد حیات کیساتھ اس کا صحیح تعلق کیا ہے ۔

خواب کی تعبیر دینے اور اس کی صداقت پر اعتقاد رکھنے والے حضرات محسوس نہیں کر سکتے کہ وہ اس کو ایک زبردست تشبیہ یا استعارہ سمجھ رہے ہیں خواب ان کے نزدیک "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کی مصداق ہے تعبیر دینے کا فن زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے مذہب اسلام نے یوسفؑ کا معجزہ یہ بتایا ہے کہ وہ خوابوں کی صحیح تعبیر دیتے تھے اس سے یہ ثابت ہے کہ خواب جیسا کہ میں نے اس سے قبل کہا مستقبل خاموش کی پیش گوئیاں ہیں ۔ کوئی پُراسرار قوت ایسی ہے جو آئندہ ہونے والے واقعات کو کسی دوسرے لباس میں پیش کرتی ہے پہچاننے والے اس کو پہچاننے اور اس سے گوناگوں فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

تعبیر دینے کے چند مسلمہ اصول ہیں اور خاص خاص مشاہدوں کے خاص خاص مفہوم مقرر ہیں مثلاً سانپ دیکھنا دشمن سے دوچار ہونا ہے ۔ پانی دیکھنا دولت کی علامت ہے ۔ ہوا میں اڑنا ترقی جاہ و منصب کا پیش خیمہ ہے بادشاہ کی صحبت سے عزت و ناموس میں اضافہ ہوتا ہے ۔ کنوئیں میں گرنے سے انسان پستی اور ذلت کی طرف جاتا ہے وغیرہ ۔ میں ان واقعات پر غور کر کے حیران رہتا ہوں کہ قدرت کو ایسی شاعری کیوں سوجھتی ہے اور انسانوں کو متحیر کرنے سے اس کو کیا فائدہ ہے؟ بعض اوقات یہی خواب پیغمبروں کیلئے نبوت کی بشارت میں جاتا ہے کسی کیلئے سعادت ازلی کا باعث ہوتا ہے اور کسی کے لئے شقاوت دائمی ہو جاتا ہے ۔

خوابوں کے واقعات عجیب غریب اور بیحد دلچسپ ہوتے ہیں لیکن بسا اوقات ان کی بے اصلی دماغ کو منتشر کر دیتی ہے اگر دنیا میں خوابوں کے واقعات قلمبند کئے جائیں تو غالباً دنیا کا کوئی افسانہ ۔ کوئی داستان کوئی رومانس اس سے زیادہ تخیلی اور دلچسپ نہ ہوگی ۔

مجھے خوابوں سے بڑی دلچسپی ہے اور میں اکثر احباب سے اُن کے خاص خوابوں کو سنتا اور اُن کو تعبیر دینے کی

کوشش کرتا ہوں معلوم نہیں اس میں کچھ فائدہ بھی ہے یا نقصان۔ ایک صاحب نے مجھ سے ذکر کیا کہ انہوں نے ایک عجیب غریب خواب دیکھا ہے ان کی خواہش ہے کہ وہ کسی صاحب دل اور اچھے تعبیر دینے والے سے اس کی تعبیر پوچھیں۔ "میں نے کہا" میں بھی تو بڑا صاحب دل ہوں انہوں نے ہنس کر جواب دیا ممکن ہے لیکن اگر آپ کی رائے اور آپ کا احتساب غلط نکلے تو مجھے الٹا نقصان ہوگا۔ میں نے پوچھا کس طرح" انہوں نے کہا ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ مشرق اور ایک ٹانگ مغرب میں پھینکی گئی ہے علی الصباح اس کو خوف و ہراس محسوس ہونے لگا۔ اس نے فوراً ایک شخص سے اپنا خواب بیان کیا۔ اس نے کہا دعا مانگو بیشک یہ خواب ڈراؤنا ہے تم قتل ہوگے اور تمہاری ایک ٹانگ مشرق کی طرف دوسری مغرب کی طرف پھینکی جائیگی وہ حیران پریشان ایک بزرگ کے ہاں پہنچا اور اپنی ساری داستان بیان کی انہوں نے کہا اگر تو اس خواب کی غلط تعبیر لینے میں احتیاط کرتا تو تجھے مشرق سے مغرب تک کی بادشاہت ملتی جو اس کی صحیح تعبیر ہے"۔ میں نے جواب میں کہا۔ جناب میں نے پہلے ہی سے احتیاط کرلی ہے کہ خواب کی تعبیر ہمیشہ امید افزا بیان کروں اگر غلط تعبیر سے اکثر نقصان ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس سے فائدہ بھی ہونا چاہیئے الغرض خواب ہو یا خواب کی تعبیر۔ یہ ہے نہایت عجیب چیز۔ عام مشہور مثل ہے النوم اخت الموت لیکن ہم خواب کی تاثیر پر حیران ہیں کہ یہ نیند کو بھی بیداری سے بدل دیتا ہے۔ ڈراؤنا خواب دیکھ کر لوگ نیند ہی میں بڑبڑانے لگتے ہیں یا فوراً بیدار ہوجاتے ہیں۔ عموماً لفظ "خواب" کے ساتھ ایک پر اسرار کیف وابستہ ہے اور شاعر خصوصاً اس کے خوب مزے لیتا ہے "خواب محبت" "خواب زندگی" کتنے حسین لفظ ہیں۔ مگر حساس انسان زندگی کی نیند میں اگر ان خوابوں کی تعبیر پر غور کرے تو اس کو شکسپیر کے ان الفاظ پر بھی غور کرنا پڑیگا جو اس نے ہملٹ کی زبان سے ادا کیے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ میں مروں یا نہیں مروں موت۔ آہ۔ کہیں یہ خواب تو نہیں ہوگی۔ (منشور)

شعرائے جامعۂ عثمانیہ کا تذکرہ زیر ترتیب ہے ضرورت ہے کہ بہت جلد مختصر حالات امتیاز ذاتی اور کلام کا نمونہ ذیل کے پتہ پر بھیجدیں۔

سید مہدی حسین عثمانیہ نمبر مکان ۱۴۲ بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن

یادِ رفتگان

(ذکاؔ)

آج سے نصف صدی قبل حیدرآباد اور اُس کے مشاعروں میں ذکاؔ مرحوم کی جو کچھ شہرت تھی وہ محتاج اظہار نہیں۔ مرحوم کی برجستگی اور ظریفانہ طبیعت نے بہت سے حاسد پیدا کر دیئے تھے۔ ہر ایک کی یہی کوشش رہتی تھی کہ انہیں نیچا دکھائے مگر یہ عجیب بات تھی کہ جس محفل میں ذکاؔ پہنچ جائیں وہاں دوسروں کی طوطی مشکل ہی سے بولتی۔ انہیں مشاعروں میں ایک مشاعرہ ایسا بھی ہوا تھا جس میں مرزا قربان بیگ سالکؔ بھی شریک تھے جو غالبؔ کے تلامذہ سے تھے چونکہ ذکاؔ کی زبان میں لکنت تھی اس لئے مشاعروں میں آپ کی غزلیں مولوی عبد الحی وصفؔ برادر جناب ملّا عبد القیوم صاحب مرحوم اور مولوی غوث محی الدین صاحب (جنھوں نے گذشتہ مہینہ انتقال کیا ہے) پڑھا کرتے تھے۔ یوں تو ہر شاعر اپنی اپنی غزلیں سنا کر داد سخن لے رہا تھا جب ذکاؔ کے آگے شمع آئی محفل میں سکوت طاری تھا۔ بعضوں نے اشارہ ابرو سے یہ بھی کہا "ماشاء اللہ آپ بھی غزل پڑھینگے" جب غزل پڑھی گئی ہے پھر کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی غزل سنائیں حتٰی کہ سالکؔ نے وہیں اپنی غزل چاک کر دی۔ یہی غزل جب غالبؔ کے پاس بھیجی گئی تو دو تہائی شعر پر تین صاد کرکے واپس کر دیگئی:

اسی میں مار رکھا واہ رے شوخی ستمگر کی!
مرے ہی قتل کا وعدہ قسم بھی میرے ہی سر کی

نکل جانا نہیں اے جانِ تنہائی سے گھبرا کر
کہ ہے اک آرزوئے وصل بھی تیرے برابر کی

پڑھا مضمون شوق اس نے تو پھر جیتا نہ چھوڑیگا
سوادِ نامہ میں رکھا ہے شامت ہے کبوتر کی

عیادت کو مرے آتے ہیں وہ پر ہو نہیں سکتا
تمیز اتنا کہ یہ بیمار ہے یا چین بستر کی

یہ کجدارو مریز آخر کہاں تک ہے خدا جانے
سنی جاتی ہے کب سے آمد آمد روزِ محشر کی

نیازِ عاشقاں ہوتا ہے وجہ نازِ معشوقاں
مرا سر پاؤں پر رکھنا ہی تھا تعلیم ٹھوکر کی

صدا ہم ناتوانوں کی پہنچ سکتی نہیں ان تک
گدائی کو بھی مانع ہے بلندی اس کے منظر کی

ع۔ کجدارو مریز یعنی وہ حکم جس کا بجا لانا نہایت مشکل ہو بلکہ نہ ہو سکے۔

نہ ہو رحمت - بلا ہو کچھ تو ہو اے آسمان نازل | نہیں بارش تو بجلی بھی نہیں میرے مقدر کی

نہیں ہے ایک حالت پر زمانہ کی روش دیکھو
دکھا بیٹھے منائے جاؤ یوں ہی خیر ساغر کی

"صنف نازک"

عورت- مرد کے خواب زندگی کی ایک لطیف و جمیل تعبیر ہے۔

عورت - مخلوق نازک ترین عین منشا حسن و مقتضائے فطرت جمال ہے ۔

عورت - وہ جلوہ معصوم ہے جس کے بغیر کائنات تاریک رہتی۔

عورت - نہایت نازک تخیلات کی صرف تصویر مرئی ہے ۔جس کے پرشباب سینہ میں "وجدان روحانی" ایک وصف اضافی سے زاید حیثیت نہیں رکھتا۔

عورت - ایک ایسی دنیا پر بلا شرکت غیرے حکمراں ہے جہاں شرعی درے بے ضرورت اور سنبل کے تازیانے نرم و نازک ہاتھوں میں حفظ اخلاق کے ضامن ہیں۔

عورت ."کی غایت زندگی" اپنے چاہنے والے کے دل میں تھوڑی سی جگہ یعنی محبت ہے جس دنیا میں آپ اور ہم ہزاروں جا و بیجا خواہشوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں "وہ" صرف اسی کی طلب گار رہتی ہے۔

عورت "طلب محبت" میں کسی مخالف طاقت کی مطلق پرواہ نہیں رکھتی اور ایسے میں عزم صادق کی مجسم تصویر بن جاتی ہے۔

عورت ہفت اقلیم کی سلطنت کو بیدردانہ ٹھکرا دے گی اگر ایک سچے چاہنے والے پر اپنے آپ کو حکمراں نہ پائے اور شائبہ خلوص سے معرا دیکھ لے تو نور کی ہیکل کو بھی ایک مکروہ وجود تصور کرے۔

عورت - اپنے نشاط زندگی پر دوسرے کو قابو پاتے ہوئے دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے اور کسی قسم کے رقیبانہ جذبہ سے متاثر ہونا بالکل عار سمجھتی ہے۔

شہاب

جلد (۲) مہر ۱۳۴۴ف م اگست ۱۹۳۵ع نمبر (7)

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (عہ)

برقی پریس حیدرآباد میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد سے شایع ہوا۔

قطعات مولانا امجد

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی
میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لُطف خاکساری
تنزل میں ترقی کر رہا ہوں!

اندھیر کبھی ایسا تم نے نہ سُنا ہوگا
دولت مرے گھر میں ہے، پر ہاتھ نہیں آتی
وہ مجھ میں ہے، اس پر بھی میں اس کو نہیں پاتا
گو ہاتھ میں طاقت ہے، پر ہاتھ نہیں آتی!

یورپ کی دلچسپ ڈاک

جناب نواب شہید یار جنگ بہادر

مانٹرو ۲۵ مئی روز سہ شنبہ ۲۱ صفر ۱۳۴۵ھ

مولانا بسمل اسلام مسنون اسلام اچھا بھائی صاحب فرمائیے کہ ہم نے اپنی داستان کہاں چھوڑی تھی۔ غالباً مانٹرو پہنچنے کے بعد دن بھر کے تھکے ماندے ہم آرام کرنے چلے گئے تھے اور آپ شاید اسی انتظار میں ہونگے کہ ہم بیدار ہولیں تو آپ کو مانٹرو کے حالات سنائیں۔ کیوں ہے نہ یہی بات؟ اچھا صاحب تو متوجہ ہوجائیے مانٹرلیک جنیوا کے آخر کنارے پر واقع ہے نہایت خوبصورت اور پرفضا مقام ہے مگر سطح سمندر سے زیادہ بلند نہ ہونیکی وجہ سے ارورا کے مانند صحت بخش مقام نہیں سمجھا جاتا اطراف میں پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں سردی خاصی ہے بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں اکثر و بیشتر گٹھیا کی شکایت رہتی ہے۔ لیک جنیوا کے دوسرے کنارے پر جنیوا کا شہر ہے جو غالباً یہاں سے ۵۰-۵۵ میل ہوگا۔ اور درمیان میں سلوزان ہے جس کا فاصلہ ۱۸ یا ۲۰ میل ہے دونوں شہر بہ سبب لیگ آف نیشنز اور صلح نامہ کے مشہور ہیں نوران میں مدرسے بہت ہیں طلباء اکثر و بیشتر دنیا کے ہر حصہ سے یہاں بغرض تعلیم آیا کرتے ہیں خاصہ شہر ہے جنیوا لیگ کے قبل بھی اپنی گھڑیوں کی ساخت کیلئے مشہور تھا لیکن آپ یہ توقع نہ کریں کہ یہاں ہر آیندہ و روندہ کو تحفۃً گھڑی ملا کرتی ہے اور اس طرح شاید یہاں سے واپسی پر میں کوئی گھڑی آپ کی خدمت میں نمونۃً پیش کرسکوں (شہید کے وسیع اخلاق سے توقع تھی کہ وہ نمونۃً کوئی گھڑی ہمارے لئے لے آئینگے لیکن یہاں پہنچنے پر ان کے اخلاق کا پتہ چل گیا۔ بسمل)

اچھا بھائی صاحب! یہاں لیگ آف نیشن کیلئے خاص عمارت تیار ہو رہی ہے جسکی تعمیر میں ہر سلطنت نے چندہ دیا ہے اب سمجھ لیجئے کہ کیا عمارت ہوگی ”قیاس کن زگلستان من بہار مرا“ عمارت قریب الختم ہے ابھی کام جاری ہے آرایشی کام ابھی شروع نہیں ہوا پھر فرنیشنگ وغیرہ ہوگی غرض چھ آٹھ ماہ کا کام اور باقی ہے دیکھنے کے قابل عمارت ہے۔ کیا مزہ ساتھ نہ تھا افسوس رہگیا۔ تصویر بھی نہ ملسکی جنیوا کو لکھا ہوں اگر تصویر ملگئی تو لیتا آؤں گا۔ یہیں سے بہت قریب ”اے وبان“ ایک مقام ہے فرانس کا علاقہ ہے جہاں مشہور پانی کا چشمہ ہے اور اسی نام کی بوتلوں میں بند کرکے دنیا بھر میں بھیجا جاتا ہے ہم دیکھنے گئے تھے

کوئی خاص بات نہیں ایسے متعدد چشمے ہندوستان اور خود ہماری سلطنت میں ہونگے مگر کون پوچھتا ہے سوئٹزرلینڈ کے
باشندے اخلاق میں یورپ کے سارے باشندوں سے بہتر ہیں یہاں ہر دکان دار اپنی دکان کا سامان باہر راستوں پر سٹول پر
رکھدیتا ہے کوئی نہیں اٹھاتا اور کہیں چوری یا بدمعاشی سننے میں نہیں آتی البتہ بھائی صاحب سوئٹزرلینڈ گراں ترین ملک ہے
اور خصوصاً ایسے مقامات جیسے مانٹرو وغیرہ یہاں یعنی تفریح گاہیں یہ اور بھی زیادہ گرم گراں۔ چھپرہ کی ایک بیٹھی (جسے حیدرآباد
میں دودھیہ کا صندوق کہتے ہیں) اور جو وہاں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو روپیہ میں ملیگی۔ یہاں پچیس تیس فرانک سے کم
نہیں ملتی اور فرانک مماثل ہے کلدار روپیہ کے یعنی تیس روپیہ کو۔ بھائی فرانک قیمت میں تو ایک کلدار روپیہ کے مماثل ہے
مگر عزت و وقعت میں حیدرآباد کی یک آنی اوس سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک حجام صاحب کی اجرت چار پانچ فرانک سے کم نہیں
اوس کے بعد ٹپ تو سنت ہی نہیں واجب ہے اور ہم ہر بات میں ٹپ لازمہ زندگی ہے گاڑی کرایہ کی کرایہ دیا اگر ٹپ نہ
دیجائے تو وہ جاتا ہی نہیں اور ٹپ بھی فرانک دو فرانک تو اقلاً دینے ہونگی ہوٹل میں گئے اور کوٹ اور ٹوپی وہیں چھوڑنی
پڑتی ہے واپسی پر ایک دو فرانک ٹپ خیال کرو۔ ہم نے بمبئی سے چلتے ہوئے انگریزی ٹوپی پندرہ سترہ روپیہ میں خریدی
تھی اب اس کی کیا قیمت ہوگی روزآنہ اُن کی حفاظت کیلئے دو چار فرانک خرچ کرنے پڑتے ہیں اس حساب سے واپسی تک
تو سترہ پونڈ سے بھی زیادہ قیمتی ہوجائیگی اسی کے مارے ہم نے چاہا تھا کہ ٹوپی اپنی ہوٹل ہی پر چھوڑ جائیں مگر صاحب برا ہو
اس کفایت شعاری کے خیال کا چار روز نزلہ اور کھانسی نے ناک میں دم کردیا۔ بچانے گئے تھے دو چار فرانک دوا کے اخراجات
اوس سے کہیں زیادہ ہوگئے وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے ساتھ کے ڈاکٹروں کا کہ انہیں فیس دینے نہیں پڑتی ورنہ خدا جانے
کیا حشر ہوتا۔ دیانا سے نکلنے کے قبل ہم نے کہا کہ بھائی جب یہاں تک آگئے ہو تو اپنے معدہ کی شکایت کا علاج بھی کرہی لو
پھر ایسا موقع کہاں ملیگا اور دیانا معالج خصوصی کیلئے مشہور مقام ہے غرض ایک مخصوص معالج معدہ کی بارگاہ میں
پیش ہوئے کیفیت دریافت ہوئی تشخیص فرمائی گئی اور ہم سے کہا گیا کہ کل صبح میں آئے صبح پہنچے افسوس فرمایا کہ نسخہ
اور ہدایات نہیں لکھ سکے شام میں تشریف لائیے۔ چلئے صاحب گاڑی کا کرایہ بھگتنا پڑا پھر ڈاکٹر صاحب تیسری منزل
پر رونق بخش جب لفٹ پر آئے تو بغیر ایک سکہ لفٹ میں ڈالے لفٹ حرکت ہی نہیں کرتی غرض سنگ آمد سخت آمد تیسرے
مرتبہ کی حاضری پر نسخہ اور ہدایات ٹیپ شدہ مرحمت ہوئیں۔ دوسرے روز بل آیا سمجھے بھی کہ بل کی رقم کیا تھی مگر خدا
اس بدمعاش ڈاکٹر نے جتنے مرتبہ ہمیں بے نیل مرام واپس کیا تھا اون سب کا شمار "وزٹ" میں کیا گیا اور ہمیں

فی وزٹ پچاس شلنگ کے حساب سے دوسو شلنگ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ ہم نے ہمارے ڈاکٹر صاحب سے احتجاج کیا کہ حضرت آپ نے کہا تھا کہ پچاس شلنگ دینے ہونگے اس نئے تو دوسو شلنگ چارج کرلئے ہمارے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں اب جانے دیجئے دے بھی دیجئے آپ کو پہلے ہی اوس کو کہدینا چاہئے تھا کہ نسخہ ہوٹل پر بھیجدے۔ ہائے نہ ہوا ہمارا ہندوستان! تو یہاں کی کہ طرح ہوا کرتی ہے یورپ میں بسر۔ یورپ آنیوالے بالعموم خوش باش حضرات ہوتے ہیں اور پھر آتے اپنے خوشی سے ہیں تعجب نہیں ہے کہ مدرسہ کے لڑکے جن کے لئے کہا جاتا تھا کہ (طفل بہ مکتب نمی رود ولے برندش) یورپ اس طرح آتے ہیں جیسے پروانہ شمع پر آتا ہے یا نوذ اماد (حیدرآبادی) اپنے سسرال۔ ہاں صاحب کیوں نہ ہو :—

درس ادیب اگر بود زمزمہ محبتی! جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

تو پھر اگر وہ یورپ کی مدح سرائی فرمایا کرتے ہیں تو تعجب کی کونسی بات ہے ایک جملہ معترضہ سن لیجئے ملکہ وکٹوریہ کی عہد سلطنت میں ایک سفیر ایران نے یورپ سے واپسی پر جو تقریر کی ہے اوس کا ایک فقرہ یہ ہے "what strange these Feringee women are; would you believe it. they actually carry an open umbrella under there petticoats." یعنی یہ انگلستان کی عورتیں بھی عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ کیا آپ اسے باور کرینگے کہ وہ اپنے لہنگوں کے اندر کھلی چھتریاں لیجا سکتے ہیں یا تو وہ زمانہ تھا اور اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ :—

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا

یہی وہ جاذب نظر مناظر ہیں جس کی روشنی سارے عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے اور یہ حسن بے پردہ پر مرمٹنے والے ان رنگین شعاعوں میں جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ اچھا ہی نظر آتا ہے۔ بسمل صاحب کل ہی کا واقعہ ہے۔ مانٹرو سے چار میل پر ایک بستی ہے "وی وی" Vevey کل وہاں خاص تقریب تھی یعنی اب چونکہ بہار کا موسم شروع ہو چکا اور انگور کی بیلوں کے پتے نکل آئے ہیں گذشتہ فصل کی تیار کی ہوئی شراب اب پینے کے قابل ہو جاتی ہے اور یہ روز خاص اس کی افتتاح کا ہوتا ہے یعنی آج وہ سربمہر خم کھولے جاتے ہیں اور آنیوالے کیلئے صلائے عام ہے اس بستی کا ہر شخص جتنی چاہے مفت پی لے اور ہر وارد کو ایک بوتل جس شراب کی چاہے ملتی ہے۔ اب اس کی ضرورت تو غالباً نہ ہوگی کہ کل شام میں "وی وی" میں جو رنگ ریلیاں تھیں ان کا نقشہ کھینچا جائے مرد اور عورت ایک حال میں تھے

دکانیں آراستہ تھیں کمانیں بنائی گئی تھیں پھولوں سے "تمام بازار آراستہ کئے گئے تھے اور ان راستوں پر سواریاں روک دی گئی تھیں۔ ہر شخص مست تھا صاحب مغت کی تو قاضی کو بھی حلال ہے اور جب سب ایک رنگ میں ہوں اخلاقی مذہبی کوئی روک نہ ہو تو پھر کیا پوچھنا یوں بھی یہاں کسی کو روک نہیں رہتی پھر ایسے وقت میں تو جو نہ ہو وہ تھوڑا ہے۔ آپ نے کسی خرافات کا منظر بھی کبھی دیکھا ہے؟ ارے ہاں آپ تو دیر اورہ میں رہتے ہیں آپ کیلئے تو روزانہ نظرے خوش گذرے کا موقع مل ہی جاتا ہوگا (مدتیں گذریں کہ اس منظر سے آنکھیں دوچار نہ ہوئیں کیونکہ دیر اورہ سے یہ ہنگامہ آرائی برخاست کردی گئی ہے اس لئے آپ کا تازہ مشاہدہ ہی کافی روشنی ڈال سکتا ہے۔ مستقل) اب آپ ایک شہر کا خیال فرمائیں جو تمام و کمال خرافات ہو اور پھر لطف یہ کہ مفت کی بٹے مل رہی ہو پھر سوچئے کہ کیا سماں ہوگا۔ غرض کہاں تک یورپ کی زندگی کی داستان سناؤں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یورپ میں محض رنگ رلیاں ہوتی ہیں، یہاں ہر شعبہ علمی میں ترقی ہو رہی ہے یورپ کی دنیا اور ہے اور سب سے بڑی بات جو یورپ میں ہے وہ یہ کہ ہر شخص آزاد ہے مگر بھائی پھر ہمیں اس سے کیا مطلب ہمیں ترقی سمجھنے کی عقل تک نہیں یاد ہے مولانا اشرف حسینی قبلہ نے تمدن کے اجراکے وقت جو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچا تھا کہ "اللہ اللہ ایک وہ ملک ہے جہاں گراموفون ایجاد ہوا اور ایک ہندوستان ہے کہ جس محفل میں گراموفون بجایا جائے ہزاروں اطراف جمع ہو جائیںگے اور لاکھ ہٹائیے گھسے جائینگے کہ ممکن ہو تو گراموفون کے ڈبہ میں داخل ہو جائیں مگر اتنوں میں ایک بھی تو ایسا نہ ہوگا جو یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ آخر اس کا راز کیا ہے اس میں آواز کس طرح داخل ہوتی اور کیوں کر خارج ہو رہی ہے"۔ تو بھائی ہمیں اس ترقی سے کیا کام ہمیں تو محض عیش و عشرت سے غرض ہے زیادہ سے زیادہ کسی یونیورسٹی سے دو حرف کا دم چھلا ملجائے کہ روزگار کا سہارا ہو جائے اب رہی آزادی جو غلام ہو اور غلام کے گھر میں پیدا ہوا ہو وہ آزادی کے معنی ہی نہیں سمجھ سکتا لطف آزادی سے کیا واقف ہوگا ہم نے تو آزادی کے معنی یہ سمجھ رکھے ہیں کہ بلا قیود زندگی بسر ہو۔ نہ کھانے میں کسی قسم کی روک ہو نہ پینے میں کسی قسم کی ٹوک ہو مسز بی مسٹر اے سے راضی ہوں تو مسٹر بی کو روکنے کا حق نہ ہو اور مسز اے کو مسٹر سی کے ساتھ رہنے میں کسی کا ڈر نہ ہو یہ ہے وہ آزادی جس کے معنی ہندوستانی سمجھ رہے ہیں اور اس کے خواہاں ہیں جب ہم جنیوا پہنچے ہیں تو وہاں لیگ آف نیشن کے اجلاس ہو رہے تھے "ہم نے چاہا تھا کہ گھس جائیں سو یہ بھی نہ ہوا"۔ کوشش کی کہ کسی طرح داخلہ کی اجازت ملجائے مگر اس کیلئے پہلے سے درخواست دینی پڑتی ہے اور مقررہ تعداد تک تماش بین حضرات کو

بعد تحقیقات اجازت ملتی ہے پھر ہم کوئی ہٹلر تو نہ تھے کہ زبردستی گھس پڑتے اور سب خاموش رہجاتے غرض جہاں ہزارہا اشخاص اس بین الملی خم کدہ کے طوائف میں مصروف تھے ہم بھی تو کہتی کہ دراں قوم در شمار آئی ہو رہے تھے اور اپنی عدم رسائی کے متعلق یوں دل کو سمجھا رہے تھے کہ بھلا اجازت بھی ملجاتی تو کس کام کی تھی تقریریں سن بھی لیتے تو کیا سمجھتے۔ کیونکہ لیگ میں جتنی تقریریں ہوتی ہیں وہ فرانسیسی زبان میں ہوتی ہیں اور یورپ میں یہی زبان سب سے زیادہ بولی جاتی ہے میری اس ساری سمع خراشی کا مطلب یہ تھا کہ اس مجمع ناجائز (ناجائز جو کچھ بھی ہو) نے دو گھنٹہ کی سر پھٹولی کے بعد جرمنی کے حق میں ملامت کا ووٹ پاس کیا اور اس اجلاس کی صدارت کا سہرا بھائی صاحب میاں ترکی سلمہ اللہ کے سر تھا۔ چونکہ بھائی صاحب موصوف اور ان کے رفیق خاص حضرت روس جرمنی پر خار کہائے ہوئے ہیں مگر آخر اس سے ہوا کیا ہٹلر نے اس تمام کا جواب ایک خفیف سی مسکراہٹ سے دیا اور اس مجمع کے اکثر شرکا نے بھی اخلاقاً مسکراہٹ کا اظہار فرما دیا۔ بعضوں نے غصہ میں ہونٹ چبائے بعضوں نے ہم ہندوستانیوں کی طرح جرمن توپوں میں کیڑے پڑنے کی دعائیں مانگ لیں۔ اب سنا جارہا ہے کہ دو تین روز میں پھر اجلاس ہونیوالا ہے اور حقہ پانی بند کی سزا سنائی جانیوالی ہے۔ بھائی صاحب آزاد اقوام ایسی ہوتی ہیں ساری دنیا خلاف ہے ہر شخص بیزار ہے مگر جس سے سنئے یہی کہتا ہے کہ جرمنی کا مٹانا آسان نہیں۔ وہ نہایت بہادر اور جفاکش قوم ہے خیر اس آزادی کے ذکر نے میرے دماغ کو کہیں پابندیوں سے آزاد کر دیا تو مشکل ہو جائیگی اچھا آپ اور حالات سنئے۔ منٹرو میں ایک پرانا قلعہ ہے یہ ایک ایسے حصہ زمین پر واقع ہے جو کچھ دور تک لیک آف جنیوا میں چلی گئی ہے یعنی تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی سے آنے کا راستہ ہے جہاں ہر مقام پر کثرت سے پرانے عمارات قلعہ وغیرہ ہیں یہ بھی اوسی طرح کی ایک عمارت ہے کوئی خاص بات نہیں اسے قلعہ شیلان کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں طوائف الملوکی کا زمانہ تھا یہاں بھی ڈیوک آف سوائے حکمران ہوگیا تھا اور جس طرح اوس وقت کی داستانیں مظالم سے پر ہیں اسی طرح اس ڈیوک کی داستان بھی رنگین ہے قلعہ میں زیادہ حصہ قیدخانوں کا ہے طرح طرح کی سزائیں دیجاتی تھیں اور آخر میں لیک آف جنیوا پردہ پوشی کیا کرتا تھا۔ زمانہ بدل گیا انقلابات ہوئے۔ اب یہ سب مقامات مشترک ہوکر سوئٹزرلینڈ کی سلطنت قایم ہوگئی ہے جو یورپ میں سب سے پہلی جمہوری سلطنت ہے اور کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ شیلان کا قلعہ بھی کوئی خاص مقام ہے گذشتہ صدی میں غالباً ــــہ میں لارڈ بیرن خرابی صحت کے باعث مانٹرو میں ایک مدت تک مقیم رہا اور یہیں اوس نے اپنی وہ مشہور نظم لکھی جس میں اسی شیلان کے قیدی کا ذکر کیا ہے۔

کہ وہ کس طرح ایک تہ خانہ میں چھ سال تک زنجیر سے ایک ستون سے بندھا ہوا تھا جہاں اس کے ستون کے اطراف پھرنے سے اوس سنگی ستون میں زنجیر کے نشانات اور فرش سنگی پر اوس کے متواتر چلنے پھرنے سے گڑھے پڑ گئے ہیں آپ اس کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہوں تو لارڈ بیرن کی نظم ملاحظہ فرما سکتے ہیں اب مجھے معاف فرمائیے اس سے زیادہ مجھے اور کچھ لکھنا نہیں ہے۔ بھائی مارے باندھے کوئی کام بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی مضمون ہے اول تو مجھے مضمون نگاری سے کیا تعلق۔ دوسرے "دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے" خیر دو چار روز میں نیس۔ فرانس میں جا رہے ہیں وہاں اگر کچھ ایسے حالات دیکھنے میں آئیں کہ طبیعت میں جولانی پیدا ہو جائے تو انشاء اللہ ایک آخری قسط (آمین) کی وہاں سے بھی روانہ کر دی جائیگی ورنہ یہی "ولا الضالین" سمجھی جائے نیس کا پتہ ٹامس کک رکھئے۔ داشتہ آید بکار۔ ۲۷ جون کو وکٹوریا جہاز سے مراجعت ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ (تمہارا شہید)

غزل

جناب احمد خاں صاحب درویش

یاد کسی کا دفعتاً خندہ ناز آ گیا
لب پہ ہمارے نالۂ برق گداز آ گیا

بخت سیہ کی تیرگی آنکھوں میں میرے پھر گئی
جب شب غم تصور زلف دراز آ گیا

صبر و ثبات تا کجا ضبط کی بھی ہے انتہا
اس میں ہماری کیا خطا لب پہ جو راز آ گیا

آتش عشق نے مگر سنگ کو موم کر دیا
ورنہ کہاں سے اے خدا دل میں گداز آ گیا

جور بتاں سے ہو کے تنگ کرنے لگے خدا خدا
ہونے کو ختم دورۂ عشق مجاز آ گیا

بارہا عرض کیا گیا ہے کہ ختم چندہ کی اطلاع ایک "سرخ چھٹی" کے ذریعہ دیدی جاتی ہے کہ آئندہ پرچہ کی اعانت منظور نہ ہو تو ذریعہ کارڈ مطلع کردیں اور خموشی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "وی پی" کی اجازت ہے۔ مگر کس قدر ظلم اور حد درجہ ستم ہے کہ آپ کوئی اطلاع نہیں دیتے اور جب "وی پی" جاتا ہے تو واپس کر دیا جاتا ہے فرمائیے کہ آخر اس بے نیازی میں آپ کو کوئی لطف آتا ہے کہ شہاب مصارف وی پی برداشت کرے۔ للہ یہ سلوک تو نہایت تکلیف دہ ہے۔

مُجاہد شاہ بہمنی

جناب عبدُ المجید صاحب۔ ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ) لکچرار تاریخ

بہمنیوں کی ایک شاندار تاریخ ہے جس کے مطالعہ سے دکن کی بیشمار شخصیتیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں بعض شخصیتیں ایسی ہیں جو صحیح معنوں میں تاریخ ساز ہیں ان کی ہر اخلاقی اور ذہنی جنبش دکن کے تمدن میں بیش بہا اضافہ کردیتی تھی ان لوگوں کی حیات بذات خود ایک تاریخ ہے لیکن ان کے علاوہ چھوٹی شخصیتیں بھی ایسی ہیں جن کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں یہ بھی بڑی حقیقتوں کی حامل ہیں بات یہ ہے کہ جس زمانہ میں بہمنی سلطنت کا سکہ جاری تھا دکن کی تمام فضا اس عظیم الشان تمدن سے متاثر تھی اس کا یہ اثر تھا کہ مملکت کے چھوٹے بڑے تمام افراد اس تمدن میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کا کوئی قدم اس سے باہر نہیں پڑتا تھا سب پر تقریباً ایک ہی رنگ چڑھا ہوا تھا جو لوگ واقعی میں تاریخ ساز ہیں ان کے کارناموں کے اظہار کیلئے ضخیم جلدوں کی ضرورت ہے لیکن عام لوگ بھی اس تمدن سے صرف اخذ فیض کرتے تھے وہ بھی اپنے کو کارآمد ثابت کرتے تھے ان کا اخلاقی اور ذہنی اثر بھی برسوں تک چھوٹے بڑے حلقوں کو متاثر کرتا تھا کئی حلقے ان سے زندہ تھے چنانچہ سلطنت بہمنی کا یہی امتیاز ہے کہ اس میں چھوٹی بڑی شخصیتوں کا ایک بہت بڑا جمگھٹا ہے اور تمدن کے سرمایہ میں ہر شخص کا کچھ نہ کچھ اثر ہے اور یہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے آتے ہیں ان کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا تیسرا تاجدار ہے اس کی جگہ ایسی صف میں ہے جہاں بالعموم کسی کی نظر نہیں پڑتی لیکن اپنے درجہ میں بھی وہ مطالعہ کے قابل ہے اگرچیکہ مجاہد شاہ کی مختصر زندگی اتنی جاذب نظر نہیں ہے کہ اس پر کتاب لکھی جائے مگر اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جو نہ صرف دلچسپ بلکہ سبق آموز ہیں۔

مجاہد شاہ خاندان بہمنی کا تیسرا حکمران ہے یہ محمدؐ شاہ کا بیٹا اور علاؤ الدین حسن گنگو کا پوتا تھا اگرچہ اس کا عہد بہت مختصر ہے یعنی یہ ۱۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۸ء میں قتل کردیا گیا اور اس طرح اس نے صرف تین سال حکومت کی اس کے قتل کا باعث خود اس کے گھر کا اندرونی فساد تھا۔ یعنی اس کے چچا داؤد شاہ نے سلطنت کی لالچ میں اس غریب ہونہار حکمران کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا تھا اور قاتلوں کو اس خون ناحق کا دارالسلطنت سے بہت دور دریائے کرشنا کے کنارے موقع ملا تھا چونکہ سلطنت بہمنی اور سلطنت وجیانگر کے درمیان ہمیشہ

معرکے ہوتے تھے اور سرحدی نزاع کھڑی ہو جاتی تھی۔ مجاہد شاہ کے عہد میں بھی ایک بڑا معرکہ کھڑا ہو گیا۔ ویجیا نگر کا راجہ کشن رائے تھا۔ اس سے محمد شاہ کے عہد میں بھی لڑائیاں ہو چکی تھیں مجاہد شاہ نے اس سے ہمیشہ کیلئے سرحدی تصفیہ کرنا چاہا تاکہ ہمسایہ سلطنتوں میں لڑائی بھڑائی کا سلسلہ ہمیشہ کیلئے مسدود ہو جائے لیکن کشن رائے نے نہیں مانا۔ مجاہد شاہ نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ مجاہد شاہ کا یہ حملہ ویجیا نگر اس قدر عظیم الشان تھا کہ اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ مجاہد شاہ نے ویجیا نگر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ چنانچہ ویجیا نگر کو اس عظیم الشان فاتح کے سامنے بہت دب کر صلح کرنی پڑی۔ لیکن بدقسمت مجاہد شاہ اس فاتحانہ حملہ سے صحیح سلامت واپس نہیں آیا۔ اس کے دشمن گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اس کا چچا داؤد شاہ جو اس کے ساتھ ویجیا نگر گیا تھا موقع کی تاک میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب مجاہد شاہ اس مہم سے واپس ہو رہا تھا اور دریائے کرشنا کے کنارے آرام کیلئے ٹھیرا تھا کہ اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

اگرچہ مجاہد شاہ کا عہد حکومت بہت مختصر ہے اور یہ ان بدنصیب انسانوں میں سے ہے جن کو اپنی سیاسی اور تمدنی قابلیت ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا اور یہ اپنے وقت سے پہلے مر گئے تاہم اس کی زندگی کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اس کے مختصر واقعات زندگی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ایک بیدار مغز حکمران اور ایک نہایت اچھا سپاہی تھا۔ اگرچہ یہ اپنے عنفوان شباب میں تخت نشین ہوا تھا اور اس نوخیز عمر میں کسی حکمران سے سیاسی بیداری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مجاہد شاہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے چاروں طرف نظر ڈالی اور ان سمات کو بغور دیکھا جہاں سے حملے ہوتے تھے اگرچہ سلطنت بہمنی کو خاندیس۔ مالوہ اور گجرات کی شمالی سلطنتوں سے بھی ڈر تھا لیکن جنوبی سلطنت ویجیا نگر ایسا سخت جان ہمسایہ تھا کہ اس سے دامن چھڑانا مشکل تھا اور اس کو ہمیشہ کیلئے مغلوب کرنا بھی سلطنت بہمنی کے بس کی بات نہ تھی علاؤ الدین اور محمد شاہ کے عہد میں اس سلطنت سے لڑائیاں ہو چکی ہیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا کیونکہ سلطنت ویجیا نگر ایک ہمسایہ سلطنت تھی اس لئے مجاہد شاہ کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑی اور اس نے اس سلطنت سے اطمینان کرنے کے لئے بین سلطنتی سمجھوتہ کرنا چاہا تھا اس نے سلطنت ویجیا نگر کو لکھا کہ آئندہ نزاع کا سد باب اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان حدود کا تعین ہو جائے چنانچہ مجاہد شاہ نے اپنی طرف سے یہ تجویز کی تھی کہ دریائے

تنگبھدرا حد فاصل ہو اور چونکہ علاؤ الدین کے عہد سے رائچور اور مدگل کا دوآبہ سلطنت بہمنی کے اقتدار میں رہ چکا تھا اس لئے مجاہد شاہ کی تجویز نہایت مناسب تھی لیکن کشن رائے اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ رائچور اور مدگل کا دوآبہ اپنے زیرنگین رکھنا چاہتا تھا اور اس لئے وہ بجائے تنگبھدرا کے دریائے کرشنا کو حد فاصل بنانا چاہتا تھا مجاہد شاہ کی غیور طبیعت تو اس کو کبھی منظور نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اپنی تجویز منوانے کیلئے اس کو حملہ کرنا پڑا۔

اور کچھ نہیں تو مجاہد شاہ کے غیر معمولی قوائے جسمانی اور اس کے ساتھ اس کی شجاعت اور جوانمردی اس کی زندگی کا زور روشن پہلو تھا۔ یوں تو سلطنت بہمنی کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے شاہزادوں کو خاطر خواہ تعلیم و تربیت دیتے تھے درس و تدریس کیلئے لائق اساتذہ بہم پہنچاتے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام سلاطین بہمنی اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہوتے تھے بعض تو بہت اونچی قابلیت رکھتے تھے نیز ان کو جسمانی اور فوجی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے چنانچہ اس سلطنت کے سامنے جتنے معرکے ہوئے تھے ان میں سلاطین بذات خود حصہ لیتے تھے ایسے معرکے بہت کم ملتے ہیں جن میں سلاطین نے بذات خود حصہ نہیں لیا۔ اس ماحول میں مجاہد شاہ کی تعلیم و تربیت بھی ہوئی تھی چونکہ مجاہد شاہ کے قدرتی قوی بھی کافی اچھے تھے اس لئے اس پر تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ہوا تھا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ ورزش جسمانی میں اس کا یہ حال تھا کہ لوگ حیرت کرتے تھے اس کے قوی ہیکل ہونے کا کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ چودہ سال کی عمر میں اس نے مبارک نامی شاہی تنبول دار کو کشتی میں ایسا پچھاڑ دیا تھا کہ وہ مر گیا مبارک بھی بہت قوی ہیکل آدمی تھا اور اس کو اس قدر زعم تھا کہ لوگ اس کے منھ نہیں آتے تھے۔ مجاہد شاہ سے اس کی ان بن ہوگئی اور اس سے انتقام لینا چاہا کشتی کے بہانہ سے اس کو اس قدر زور سے دے پٹکا کہ مبارک نے جان دیدی اس کو بچپن سے تیر و کمان کا شوق تھا اور فرشتہ کے قول کے مطابق شمشیر۔ نیزہ۔ اور خنجر کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مجاہد شاہ کے اس شوق شمشیر آزمائی کے متعلق بہمن نامہ کے اشعار یہ ہیں:—

زگہوارہ چوں پائے بیروں نہاد ۔۔۔ بہ تیر و کماں دست و بازو کشاد
بسے تندگردن کفش بیل زور ۔۔۔ کہ نشنید گفت کسے وقت شور
چناں برسر کنگرہ می دوید ۔۔۔ کہ انگشت حیرت فلک می گزید

ظاہر ہے کہ ایسے قوی ہیکل شخص جس میں اس قدر دم خم ہو ملک کو کیا توقعات نہیں ہونگی۔ سچ تو یہ ہے کہ

مجاہد شاہ بہ این تنومندی اور فوراً بیت سلطنت بہمنی کا بہت بڑا سپہ سالار تھا اپنی سپہ سالاری کے حقیقی جوہر اس کو اس وقت ظاہر کرنے کا موقع ملا جب کہ سلطنت بیجانگر سے اس کی ان بن ہو گئی۔ بہمنی تاریخ جانتی ہے کہ کس طرح مجاہد شاہ نے وجیانگر پر یلغار کیا تھا! اور صرف ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور حملہ وجیانگر کے وقت اس کی عمر بمشکل ۲۲ سال ہو گی۔ اس نوخیز عمر میں اس کا دلیرانہ معرکہ اس کی زندگی کا اعجوبہ تھا۔ اصل لڑائی سے پہلے بھی اس نے مردانگی کے ایسے کرتب دکھائے کہ اس کو دیکھ کر لوگ حیرت کرتے تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب مجاہد شاہ نے تنگبھدرا عبور کر کے قلعہ ادھونی کا محاصرہ کیا اور کشن رائے کے مقابلہ کیلئے گنگا وتی کی طرف بڑھا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہاں ایک بہت بڑا آدم خوار شیر ہے جس سے وقتاً فوقتاً بہت نقصان ہوتا رہا ہے اور لوگ اس سے بہت ڈرتے ہیں یہ سنتے ہی مجاہد شاہ شیر کو مارنے کے درپے ہوا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ مجاہد شاہ پیادہ پا صرف سات آدمیوں کے ساتھ جنگل میں گھس گیا۔ اگرچہ سات آدمی اس کے ساتھ تھے لیکن ان کو اس نے آلات جارحہ استعمال کرنے سے روک دیا تھا۔ جب شیر نے آواز دی تو وہ اس کی طرف لپکا اور اپنی تیر سے اس کے پہلو پر ایسا مارا کہ شیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس سے اس کی نہ صرف اس کی غیر معمولی جراءت معلوم ہوتی ہے کہ وہ بالکل بے خوفی میں اکیلا خونخوار شیر کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس سے اس کی غیر معمولی قوت بازو کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تیر کی ایک زد سے ایک بہت بڑا شیر ہلاک ہو گیا۔ فرشتہ کا بیان یہ ہے کہ اگر تیر سے شیر نہیں مرتا تو اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ خنجر اور تلوار سے اس کو ہلاک کرتا۔ نشانہ بھی اس کا اس قدر عمدہ تھا کہ تیر برابر شیر کے دل پر بیٹھی تھی :—

کمان از کمین گاہ بازو کشید | بہ یک تیر پہلوش از ہم درید
سران سپاہ از یسار و یمین | زبان بر کشادند بر آفرین
کہ گیتی نہ دیدہ چو تو شہریار | پس از رستم و بعد اسفندیار

کہا جاتا ہے کہ مجاہد شاہ کی اس انتہائی جراءت کے ڈنکے بجنے لگے تھے اور سلطنت بیجانگر پر اتنا رعب پڑا تھا کہ کشن رائے اور اس کی فوج سہم کر رہ گئی تھی اور ظاہر ہے کہ ایسے شیر دکن کا مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

خود وجیانگر کی مہم ہی بڑی کٹھن تھی چونکہ راستہ گھنے جنگلوں میں سے پڑتا تھا اس میں ہزاروں درخت

کاٹے گئے اور سنگلاخ راستے عبور کئے گئے۔ مجاہد شاہ ہر زحمت کا دل کھول کر مقابلہ کرتا تھا کہا جاتا ہے کہ مرطوب جنگلوں کی زہریلی ہواؤں سے متعدد فوجیں بیمار ہوگئیں اور خود کشن رائے جو بہمنی فوج کے مقابلہ کیلئے پڑا تھا بیمار ہوگیا لیکن مجاہد شاہ کی صحت پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوا جس سے اس کی صحت اور اس کے قوائے جسمانی کا اندازہ ہوتا ہے کشن رائے کے عہد میں سلطنت وجیانگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ فوجی طاقت بیان سے باہر تھی۔ ایسے طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان کام نہیں تھا اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد شاہ نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا فرشتہ نے اس کا طویل بیان دیا ہے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مجاہد شاہ نے ایسی ہر قوم پر ایسی فراست کا اظہار کیا تھا کہ دوست دشمن دنگ ہو جاتے تھے۔ یہ وجیانگر تک پیش قدمی کیا اور وہاں سے کشن رائے کے تعاقب میں رامیشورم تک بڑھتا چلا گیا اگرچہ اس حملہ سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوسکا تھا لیکن اس حملہ میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہینگے۔ کوئی معرکہ ایسا نہیں تھا کہ اس میں اس نے حصہ نہیں لیا تھا۔ بیجانگر کی چڑھائی شہر رنگ کا حملہ۔ قلعہ ادھونی کا محاصرہ اور رامیشورم تک پیشقدمی اس کے مشہور کارنامے ہیں جو ہمیشہ یاد رہیں گے ان چڑھائیوں کا ایک اور طرہ امتیاز یہ ہے کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اس کو مارا جاتا تھا لیکن غیر مصافی رعایا پر دست درازی نہیں کیگئی اگرچہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کیگئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر شجیع سپہ سالار کے اوصاف میں داخل ہے۔

یہ مجاہد شاہ کے مختصر مگر عظیم الشان کارنامے ہیں اگر زندگی اس کو مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جب کہ اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تو اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت سے کام لیا تھا یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ اس وقت اس کی آنکھ میں تکلیف تھی اور صاف دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس کے باوجود بستر پر سے اس نے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تھا تو اس سے اس کی آنتیں نکل گئی تھیں لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ اپنی طرف پکڑ کر کھینچا تھا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا۔ لیکن داؤد کے ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طریقہ سے یہ ہونہار حکمران موت کی گھاٹ اتار دیا گیا۔

ایک نرس سے خطاب

جناب سکندر علی صاحب وجدؔ بی-اے (عثمانیہ)

شعرائے جامعہ عثمانیہ میں "وجدؔ" نمایاں امتیاز رکھتے ہیں جن کے اشعار میں ایک دلکش ترنم اور فطرت کی جھلک ہے!!

خدا کی رحمتوں کی بارشیں تیرے نشیمن پر
اٹھاتا ہے تن نازک ترا کیا سختیاں دن بھر

نسیم آتی ہے سب سے پیشتر تیرے جگانے کو
گلوں سے قبل اوس آتی ہے تیرا منھ دھلانے کو

سحر ملبوس نورانی قمر سے مانگ لاتی ہے
تجھے پہنا کے جوڑا کل جہاں پر پھیل جاتی ہے

ہوائیں مست عنبر بار تیرے ساتھ آتی ہیں
ترے آنے سے گل ہنستے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں

دل پژمردہ پاتے ہیں رہائی بیقراری سے
تری آمد نہیں کم آمد باد بہاری سے

بلا کی دلنشینی ہے تری گفتار نے پائی
تری رفتار میں ہے موجزن طوفان رعنائی

نہاں اخلاص کی دنیا ہے اک خدمتگزاری میں
اثر اکسیر کا پنہاں ہے تیری غمگساری میں

تبسم حسن کے آگے خندۂ گل زہر خندہ ہو!
تکلم وہ کہ بلبل گل کے بدلے تجھ پہ شیدا ہو

نظام دہر کو تھا ناز اپنی بے مثالی پر
عمل تیرا مگر ہے خندہ زن اس کج خیالی پر

مکتوبات جمیل

(۵)

پیاری حمیدہ!

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایمان ہونا آدمیت ہے یہی اور یہی انسان ہونا

مدت کے بعد تمہارا محبت نامہ جو بھول کر میرے نام لکھا گیا ہے پہنچا۔ آہ! کالج اور اس کی پر لطف زندگی چاندنی راتوں میں کالج کی چار دیواری میں حوض کے کنارے بیٹھ کر محبت کے دلکش گیت گانا یاد ہیں اور باہمی تبادلۂ خیالات کہ "ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے"۔ عمر بھر یاد رہینگے۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ ہماری تمنائیں کس قدر جلد نذرِ یاس ہوگیئں۔

تعلیم کا زمانہ کیا ختم ہوا کہ آرزؤں پر اوس پڑ گئی۔ وہ سرور ساعتیں اور پر لطف گھڑیاں زمانہ نے ہم سے چھین لیں۔ تمام خیالات ایک لال کی پرواز کی طرح غائب ہوگئے۔ کس قدر روح فرسا ہے یہ یاد کہ اب تو ہم دونوں کو ملے ہوئے "مدتیں گذریں زمانہ ہوگیا"۔ مگر تمہاری محبت کا وہ گہرا نقش دل پر اب بھی یوں ہی مرتسم ہے جس طرح زمانہ کالج میں تھا اچھی حمیدہ! تمہارا خط کیا تھا اچھا خاصا شکوہ کا دفتر۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمہاری قدر و منزلت میرے دل سے جاتی رہے؟ پھر یہاں امارت اور غربت کا سوال تکلیف دہ ہے۔ سچی محبت کی محفل میں مسندِ صدارت کہیں بچھی ہوئی نظر نہیں آتی یہاں شاہ و گدا پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ امتیاز سوسائٹی کا پیدا کیا ہوا ہے دنیا میں اگر دوستی وابستہ ہے محض دولت سے تو پھر "محبت" ایک بے معنی شئے ہو جائیگی۔ مانا کہ میں دولتمند سہی لیکن تمہاری محبت میں اپنے دولت کی بھی قربانی چڑھانے کیلئے آمادہ ہوں۔

حمیدہ! کاش میں "ہوا ہوتی"۔ صبح جب کہ تم تفریح کیلئے باغ میں محوِ خرام ہوتیں تو میں اپنے خواب آور ہلکے جھونکوں سے تمہارے زلف کو برہم کر کے اس کا تماشہ کرتی۔ اور تم بگڑ کر ڈوپٹہ کا آنچل اپنے چہرہ پر ڈال لیتیں۔ اور اچانک میں ہوا کا ایک تیز جھونکا بن کر آتشیں رخساروں سے مس کر جاتی اور تمہارے تیور سے غم و غصہ کا اظہار ہونا۔ حسن کی ادائیں تو کچھ بگڑنے ہی میں دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں۔

کیا اس وقت بھی تم کو مجھ سے گلہ ہوتا ؟

ایسا نہیں تو پھر میں پھول ہوتی۔

اور تم جب اپنی نازک خرامیوں سے سبزہ کو پامال کرتیں اور میرے رنگ و بو کو دیکھ کر مجھ سے آنکھیں چار کرتیں اور میری خوبصورتی پر للچاتیں اور اپنے دست سیمیں کو دراز کرکے مجھے شاخ کی آغوش سے جدا کرکے اپنے مشام دماغ کو معطر کرنے پر آمادہ ہوتیں تو میں ایک مشام روح پرور بن کر تمہارے نازک لبوں کا بوسہ لے لیتی۔

اگر میں درخت ہوتی اور تمہاری نزاکت رفتار دھوپ کی متحمل نہ ہوکر ستانے کیلئے میری ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ لیتی تو ہاں اس وقت میں کیا کرتی ؟

کائنات اور اس کے متحرک ذرے دیکھتے کہ میں اپنی پتیاں تم پر نثار کرتی اور میرے پھل تمہارے ذائقہ لب و دہن کے تواضع میں مصروف رہتے اور جب تم تازہ دم ہوکر وہاں سے چلی جاتیں تو میں اس جدائی میں سوکھ کر کانٹا بن جاتی۔

کیا اب بھی میری محبت پر اعتبار نہیں ؟

اس وقت جب کہ آفتاب آپ اپنے انتہائے شباب کی منزلیں طے کر رہا ہے اس کی ضیا پاشیوں میں تمہاری صورت ایک مجسمہ بن کر اپنے محبت کے جام پیش کر رہی ہے۔ گویا تم بازو ٹیکی ہوئی شکوہ سنج محبت ہے۔

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو　　آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا۔

تذکرۂ جمیل !! یہ وہ دلچسپ مجموعہ ہے جس سے موجودہ عہد کے تعلیم یافتہ خواتین کے علمی کارناموں اور ان کے ذوق ادب کا پتہ چلتا ہے کہ خدا کی یہ لطیف مخلوق بھی تعلیمی جدوجہد میں مردوں کے دوش بدوش ہے۔

تذکرۂ جمیل میں مختصر سوانح حیات نظم و نثر کے نمونے ہیں لکھوائی چھپوائی دیدہ زیب۔ تین سو صفحات با تصویر قیمت (عا) دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے۔ بہت کم نسخے باقی رہ گئے ہیں۔

مرصع اسلوب اور رجب علی بیگ سرورؔ

(جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم۔اے۔ال ال بی پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

(۱)

سرور کا نشو و نما ایسے ادبی ماحول میں ہوا تھا جس میں لفظی صناعی اظہار خیال کا سب سے زیادہ شائستہ ذریعہ
ہی جاتی تھی۔ اس سوسائٹی کے تصور میں ادبی حسن اور خوبی محض زبان اور الفاظ تک محدود تھی۔ یہ درحقیقت
ی انشاء پردازی کا اثر تھا جو فارسی کے توسط سے اردو انشا پردازوں تک پہنچا تھا۔ ان ہی نمونوں
دکن اور خصوصاً شمالی ہند میں اردو نثر کی پیدائش ہوئی۔ دکن کی مشہور ادبی تصنیف "سبرس" اور شمالی ہند
" دہ مجلس" فارسی کے اسی اسلوب میں لکھی گئی جس کو مرصع اور مسجع نثر کہتے ہیں۔ اس کے بعد کی ایک اور
نیف "نوطرز مرصع" نے اس طرح کے اسلوب کی اشاعت کے لئے بڑی گنجائش پیدا کردی۔ شمال میں اردو
ر کا ابتدائی حا کہ ادب کے نشو و نما کے لکھنوی دور میں تھا۔ اور نثر کی عموماً تمام کتابیں اسی اسلوب میں
ھی گئیں۔ اسی کا اثر اتنا زبردست تھا کہ لوگ آپس میں جب ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تو اسی طرح کے
صع اسلوب میں لکھا کرتے تھے۔

سرور لکھنؤ کے زوال کے قریب افق ادب پر نمودار ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے ہاتھوں میں مرصع
سلوب کافی ترقی یافتہ حالت میں پہنچا تھا۔ پھر اس میں خود سرور کی شاعرانہ ذہنیت اور زور قلم نے
ل جل کر ان کی تصانیف "فسانۂ عجائب" کو قدیم مرصع اسلوب کا ناقابل فراموش کارنامہ بنا دیا ہے۔ خود
رور کی تصانیف میں "فسانہ عجائب" کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

یہ اسلوب جس کو عام طور سے اختصار کی خاطر مرصع اسلوب کہتے ہیں۔ کئی خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے
سب سے زیادہ عام خصوصیت اس اسلوب کی یہ ہے کہ اس میں جملے جو استعمال ہوتے ہیں ان کے آخری
لفظ قافیہ دار اور بعض وقت ردیف اور قافیہ دار ہوتے ہیں لیکن وزن نہیں ہوتا جیسے :-

۱ - اس کی چوٹی بنفشہ کا جواب اس کی زلفوں میں عشق کا پیچ و تاب اس کی شمیم غالیہ بیز۔

۲۔ اس کی ہوا وحشت انگیز ———— وغیرہ

اس اسلوب کا اصطلاحی نام مقفیٰ نثر ہے مصنف کی طبیعت جب روز پر ہوتی ہے تو اس میں رجز اور مسجع[1] نمایاں ہو جاتے ہیں۔ نثر مرجزہ نثر ہے جس میں جملے متوازن ہوتے ہیں اور قافیہ نہیں ہوتا جیسے مطلعے کے ہیں دو مصرعے " ایک حمد الہٰی ہے ایک نعت پیمبر ہے" اس مطلع روشن کے دیوان حقیقت کے معنی منور سے ہر ذرہ بھی ہے۔ واقف سنتے ہیں ازل سے سب ——— وغیرہ

مسجع نثر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں دو جملوں یا جملے کے دو حصوں میں الفاظ ہموزن لائے جاتے ہیں۔ جیسے:-

کان ملاحت معدوم میاں معدن بے وفائی چالاک یگانہ، دلبر عیار کے شوق میں بیقرار ہوں۔
جان صباحت موہوم وہاں مخزن دلربائی سفاک زمانہ کا فرطرار کے ذوق میں اشکبار ہوں۔ وغیرہ

پھر اس کی ذیلی قسمیں بھی ہیں۔ مثلاً بعض وقت صرف جملے کے آخری دو یا تین لفظ ہموزن (نکہ ہم قافیہ) لائے جاتے ہیں۔ جیسے "لطیف۔ عزیز"۔ علم بدیع۔ یعنی معنوی اور لفظی صنعتوں جیسے تجنیس۔ لف و نشر ایہام وغیرہ کا بھی کبھی کبھی التزام کر لیا جاتا ہے اس طرح ظاہر ہے کہ یہ اسلوب ایک طرح کی دماغی کاوش (اور ذہنی صناعی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اردو کی حد تک وزن اور قافیہ کا التزام قایم رکھنے کیلئے اس میں عربی اور فارسی کے اجنبی الفاظ بھی بکثرت استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ اس اسلوب کی بہترین فارسی تصانیف جیسے "درۂ نادرہ" یا "سہ نثر ظہوری" اور اردو کتابیں جیسے نوطرز مرصع یا غلام امام شہید کی "انشائے بہار بے خزاں" وغیرہ اس خصوصیت کی وجہ سے لفظوں کا گورکھ دھندا بن کر رہ گئی ہیں۔

سرور کی عبارتیں بھی کہیں مرجز (مسجع اور کہیں مقفیٰ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ اس التزام کی مجبوریوں کے ہاتھ اس طرح نہیں بک جاتے کہ انہیں ہر جگہ معنی کو الفاظ پر قربان کرنے کی ضرورت پیش آ جائے وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہوئے اپنے وسیع ذخیرہ الفاظ سے مدد لیکر متوازن یا مقفیٰ جملے لکھتے ہیں۔ لیکن الفاظ یا ترکیبوں کو نامانوس بننے نہیں دیتے یا جملوں کی فطری ساخت کو تعبیرات لایعنی سے

[1] مسجع۔ وزن۔ ہموزن ہونا دو نوں لفظوں کا۔

معمہ بنا کر نہیں پیش کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں " نوطرز مرصع " اور " انشائے بہار بے خزاں " کے مقابلہ میں زیادہ آسان اور سریع الفہم ہیں۔ اور اسی لئے آج بھی پڑھی جاتی ہیں ان کے خیالات میں سلجھاؤ اور عبارتوں میں روانی زیادہ ہے۔

بعض انشا پرداز جیسے تصدق حسین صاحب داستان " امیر حمزہ " اپنے اس خاص اسلوب کی ضروریات کی نگہداشت اس سختی کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں کہ ابتدائی چند صفحات بلکہ بعض وقت چند جملوں کے بعد ہی ان کا کس بل جاتا رہتا ہے اور جیسا جیسا ان کا قلم آگے بڑھتے جاتا ہے وہ ٹھنڈے پڑے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے اسلوب کی بعض کتابوں میں آپ نے ابواب کی ابتدائی چند جملے ہمیشہ مرصع دیکھیں گے۔ آگے چل کر بے مزہ تک بندی شروع ہو جاتی ہے سرور اپنی سلامت روی کی بدولت اس افراط و تفریط سے بچ گئے ہیں۔ عموماً ان کی ہر تصنیف پوری کی پوری ایک ہی نہج پر لکھی گئی ہے۔

ایک چیز اور سرور کے ساتھ مخصوص ہے وہ ترصیع کے ساتھ ساتھ لطف محاورہ اور روزمرہ کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اس لئے ان کے اسلوب میں زیادہ حسن اور لچک پیدا ہو گئی ہے اس اعتبار سے سرور کی تصانیف ایک طرح پر اردو کی قدیم اور جدید اسلوب کے درمیان ارتقائی کڑی معلوم ہوتی ہیں۔

یہی امور تھے جن کی بدولت سرور اپنے زمانہ کے انشا پردازوں میں سب سے زیادہ مقبول اور نمایاں ہو گئے تھے۔ غالب جیسے نقاد نے ان کی کتاب " حدائق العشاق " کی تقریظ میں انہیں معاصر نثر نگاروں میں سب پر فوقیت دی ہے۔ اس وقت بھی جب کہ انشا پردازی کے نصب العین بدل چکے ہیں۔ قدیم اسلوب کے عظیم الشان مصنفین میں ان کا رتبہ ناقابل قیل و قال ہے۔ بہ حیثیت مجموعی سرور قدیم اردو نثر کے غیر فانی مصنفین میں سے ہیں۔ ان کی کتابیں کم سے کم " فسانہ عجائب " اس وقت تک پڑھی جائیگی جب تک ادب اور فسانہ خوانی کا ذوق دنیا میں زندہ ہے اور اس کا یقین ہے کہ اس ذوق کو کبھی زوال نہیں۔

نواب محمد کاظم علی خاں صاحب بی۔ اے دوم تعلقدار ورنگل کا توسیع اشاعت پر اس لئے شکریہ نہیں ادا کرتے کہ ہم نے کب اپنا شکریہ ادا کیا ہے؟ البتہ ابو صالح صاحب اورنگ آباد کے متشکر ہیں جنھوں نے خریدار دیے ہیں۔

"گالی"

؟

"گالی" ایک عام لفظ ہے لیکن کبھی آپ نے اس کے متعلق زحمت بھی کی ہے کہ یہ کب سے عالم وجود میں آئی؟ ہم تو یہی سمجھتے ہیں تخلیق آدم وحوا کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظہور میں آچکی تھی۔

حوا کی ترغیب پر آدم کا شجر ممنوعہ کو چکھنا ہی گویا گالی کا وجود میں آنا ہے۔ کیونکہ رخت بہشتی کا پارہ پارہ ہوکر فطری پیرہن میں ملبوس ہونا بھی ایک طرح کی معنوی گالی تھی۔

غالباً دنیا میں سب سے پہلی گالی ہابیل وقابیل کی ابتدائی جنگ سے شروع ہوئی ہوگی اور پھر نوح کے برخوردار نے تو "خاندان نبوتش گم کرد"۔

اب گالیوں کی باقاعدہ تنظیم اور اس کا تسلسل شروع ہونے لگا۔ ہر قوم اور ہر ملت میں گالی انسانی تکلم کا جزو لازمی ہوگئی یہتیں اور سنجیدہ ہستیاں بھی ان سے باز نہ رہ سکیں۔ اخلاقی جانچ کے لئے گالی کسوٹی کا کام دینے لگی یہی وجہ ہے کہ ہر سلف نے اپنے خلف کو تلقین کی ہے کہ صحبت بد سے پرہیز کریں کیونکہ یہی گالیوں کا سرچشمہ خیمہ، اور یہی اسی مکتب کا ابجد ہے۔ اب تو گالیوں کی جو نہا بد ہے اوس سے کسی کو انکار اور مضر نہیں ہوسکتا متمدن ملک ہو یا افریقہ سا جاہل اور تعلیم سے کورا۔ مگر آپ ہر جگہ گالیوں کا بول بالا ہی پائیں گے۔ ہر ملکے اور ہر رسمے گالیوں میں بھی فرق رہیگا اور یہ فرق مراتب ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک مقدس ہستی کا کسی کو کڑے تیور سے دیکھنا بھی ایک معنوی گالی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ وہ زبان سے اس کا اعادہ نہیں کرتا بلکہ تیور سے اس کو ادا کرتا ہے۔

ایک مہذب اور تعلیم یافتہ کا اپنے حریف مقابل کو گھورنا کیا گالی کے مماثل نہیں؟ گالیاں یوں تو عام طور پر رائج ہیں ممکن نہیں کہ زبردست طاقت، سنگین ضوابط۔ شدید احتساب اس سکہ رائج الوقت کو ممنوع قرار دے سکے اگرچہ ہر گورنمنٹ اس کے استیصال میں کوشاں ہے۔ سزائیں ہیں اور جزائیں۔ مگر پھر بھی یہ "زر ناقص" "کامل العیار" نہ بن سکا۔

البتہ گالیوں کے دینے میں فرق مراتب کا لحاظ ہونا چاہئے جیسا کہ غالب مرحوم کا قول ہے اگر بوڑھے کو گالی دیجائے تو اوس کے بیٹی کی دینا چاہئے۔ اگر بچہ کو گالی دی جائے تو اوس کے ماں کی۔ اگر ہم عمر کو گالی دی جائے تو اوس کے بہن کی۔ کسی جوان کو اوس کے بی بی کی گالیاں جہاں کبھی کبھی پُر لطف ہوتی ہیں وہاں تلخ اور رسوائن روح بھی ہیں۔ اگر گالیوں کا لطف ہی اٹھانا درکار ہے تو دو گنوار عورتوں کی گالیاں سنئے کہ وہ کس قدر باہمی جنگ و جدال کے وقت زبانی حربہ استعمال کرتی ہیں۔ پھر دو جاہل لڑکوں کی گالیوں پر بھی غور کیجئے کہ ان کے اندر کس قدر جدّتیں پنہاں ہیں۔

ایک دختِ رز کے فدائی عقل و ہوش سے بیگانہ شرابی کی گالیاں سنئے کہ وہ کس مزے سے دئیے جاتا ہے اور ایک مجذوب خبطی کو دیکھئے کہ وہ زمین و آسمان کے قلابے کیونکر ملا رہا ہے۔ مگر ان گالیوں کا اندازہ کیجئے کہ ایک محبت کی ماری ماں اپنے معصوم ننھے کو پیار کرتے ہوئے انتہائے محبت میں کہتی ہے "میرا چور میرا بدمعاش" حالانکہ وہ جانتی ہے کہ یہ چور نہیں ہے اور نہ بدمعاش۔

پھر میاں بی بی کے تلخ گفتار بھی سنئے کہ بی بی اشتر غمزے کئے ہوئے ہیں اور میاں منّتیں خوشامدیں کئے جارہے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ بس نہیں چلتا زبانی گفتگو پر اتر آتے ہیں۔

پھکڑ بازی سے تو خدا بچائے کہ جن میں نہ تال ہے نہ سر۔ دو انچ کی زبان اوٹھائی اور طارق کو لگادی کہ حیا بھی پانی پانی ہوکر بہہ جائے۔

مگر ہاں اون گالیوں کو دھیان سے نہ جانے دیجئے کہ دولہ میاں چاہے وہ کتنی ہی خوددار اور باحیا کیوں نہ ہو۔ جب سالے اور سالیوں کی صلواتیں سنتے ہیں تو بجائے اس کے کہ تلخ ہوں مسکرانے اور تبسم فرماتے رہتے ہیں کہ یہ سسرالی تحفہ ہے جو گرہ میں باندھنے کے قابل ہے۔ مگر کیا مجال جو تیور پر بل آئے بلکہ یہی تمنا رہتی ہے کہ اس کا سلسلہ دراز ہی ہوتا جائے کیونکہ جانتے ہیں "ساری خدائی ایک طرف ہے"؟

ایسے حضرات بھی ہیں جنھیں گالیوں کے تراشنے میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ زمانہ طالبعلمی میں اسکول آیا کرتے تھے جن میں سے تو ایک آجکل تحصیلدار ہیں اور دوسرے حکیم۔ یہ دونوں گالیوں کے ایسے مخترع تھے کہ "الغظمت وللہ" آج بھی وہ زمانہ یاد آتا ہے تو خود بخود ہنسی آہی جاتی ہے لیکن ان دونوں میں حکیم صاحب

ہی کا پلہ بلحاظ حکمت و دانائی زیادہ وزن دار رہتا تھا اور تحصیلدار صاحب کا جب بس چلتا ہوا نہیں دکہائی دیتا تو مرنے مارنے پر تیار ہوجاتے تھے اور یہ قضیۂ نامرضیہ اوس وقت تک طے نہ ہوتا تھا جب کہ استاد آکر دہ شکر ابزد کہ میاں من وتو صلح فتاد" نہ فرماتے تھے وہ گالیاں ہوتی تو نہیں پھر لطف لیکن ۔ اون کی گرانی اس قدر سنگین ہے کہ کاغذ اون کے بوجہ کا یہاں متحمل نہیں ورنہ دو چار سنا دئے جاتے ۔ اس لئے ان کا قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے ۔

گالی ہر قوم اور ملک کے لٹریچر میں بھی شامل ہے اور اکثر شعرا کا نظریہ بھی علیحدہ رہا ہے ایک کہنہ مشق بلبل شیراز بھی گالی کی نسبت یوں عرض کرتا ہے :-

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

ایک اور شاعر کا نظریہ ملاحظہ کیجئے :-

دہن خویش بدشنام میالا صائب کیں زر قلب بہ ہر کس کہ دہی باز آید

مگر غور کیجئے تو ان دونوں کے نظریوں میں بہت کچھ اختلاف دکہائی دیگا ۔ لیکن ہم سے پوچھئے تو ہم اون گالیوں کے قائل ضرور ہیں جن کی نسبت ایک بوڑھا فلسفی کس مزے سے کہتا ہے ۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کے رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا ۔

حالانکہ وہ جانتا ہے جن لبوں سے گالیاں نکل رہی ہیں وہ لب گوشت اور خون کے آمیزش سے بنے ہوئے ہیں جن میں بظاہر کوئی حلاوت اور چاشنی نہیں ہے لیکن لطف دیکھئے کہ باوجود گالیاں سننے کے وہ ان لبوں میں حلاوت اور شیرینی ہی محسوس کرتا ہے پھر طبیعت پر ناز بھی ہے کہ "بے مزہ نہ ہوا "

ہم کو ایسی گالیوں کے سننے کا اتفاق تو نہیں ۔ ہوا جو اپنا تجربہ پیش کر سکیں مگر اتنا ضرور عرض کرینگے کہ ایسی گالیاں دینے والے کے ہم ہونٹ ہی جھلس دیں کہ یہ کیا بدتمیزی اور خرافات ہے :-

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

چاہے آپ ہماری مخالفت ہی کیوں نہ کریں ۔

شادی

(جناب حکیم بہبود علی صاحب صفی)

(۱)

رسوم میں جو خدا کو بھولا | تو پھر ہو کیا خوش گوارا شادی
ہمیں نے دیکھا ہزار دولہا | ہمیں نے دیکھی ہزار شادی

(۲)

جو خرچے پیسا کھلے خزانے | کہ عقل دی ہی نہیں خدا نے
فضول خرچی ہوئی تو جانے | بڑی ہوئی زوردار شادی

(۳)

ہے مقنعہ منھ پہ جو سنہرا | چھپا لیا ہے اسی نے چہرا
پھر اور طرہ ہے اس پہ سہرا | ہے سر پہ گویا سوار شادی

(۴)

جو سر پرستوں کا حال دیکھا | یہی بس ان کا خیال دیکھا
کہیں جو مال و منال دیکھا | تو کر دی بے اختیار شادی

(۵)

ہوئے تو کیا دوست آشنا خوش | ہوا تو کیا خاک سب جہاں خوش
رہے میاں بیوی دونوں ناخوش | تو پھر رہی درکنار شادی

(۶)

نہ ہو اگر ہو تو قرض کم ہو! | اٹھاؤ بوجھ اس قدر کہ دم ہو
بجا ہے شادی ہمیشہ غم ہو | کرے اگر زیر بار شادی

(۷)

اسی سے دونی ہو گھر کی زینت | اسی سے ہو دور ساری کلفت
امیر کو وجہ عیش وعشرت | غریب کو پردہ دار شادی

(۹)

بہت سی بدکاریاں چھڑائے | بشر کو یہ آدمی بنا دے
یہ پردے آنکھوں سے سب اٹھائے | نہ رکھے غفلت شعار شادی

(۱۰)

کرائے کاہل سے یہ مشقت | سکھائے یہ نوکری تجارت
دکھائے مفلس کو راہ دولت | بنائے سب کاروبار شادی

(۱۱)

ٹلائے لاکھوں بلائیں سر سے | بچائے اسراف بد اثر سے
لگائے یہ بے گھرے کو گھر سے | جمائے جب اعتبار شادی

(۱۲)

درست ہے "ہر کہ زن ندارد" | بجا ہے آرام تن ندارد
ہو دل سے آوارہ پن ندارد | کرو اگر خوش گوار شادی

(۱۳)

یہی ہے دنیا کی زندگانی | یہی جوانی کی ہے نشانی
بہار ہے عمر کی جوانی | جوانی کی ہے بہار شادی

(۱۴)

نہ اس میں مہندی رکھو نہ ساچق | نہ اور بدعت ہو کوئی مطلق
جہاں ہو شادی کی شرع رونق | تو کیوں نہ ہو سازگار شادی

(۱۵)

ہماری اولاد اس سے قائم | ہماری اجداد اس سے قائم
ہماری بنیاد اس سے قائم | ہماری سر رشتہ دار شادی

(۱۶)

جہاں کی آن اس سے قائم | اس آن کی شان اس سے قائم
ہے نسل انسان اس سے قائم | ہے کس قدر ذی وقار شادی

(۱۷)

نہ ہے کوئی عیش اس سے بہتر | نہ دین و دنیا کا اس میں کچھ ڈر
جو سنت حضرت پیمبر ہو | تو حکم پروردگار شادی

(۱۸)

صفیؔ کی ہر بات ہے نرالی! | خیال اعلیٰ ہے فکر عالی
یہ نظم کب ہے اثر سے خالی | کہ خود ہے یہ مستعار شادی

"یادیں"

جناب محمد عبد الحفیظ صاحب صدیقی

تمہارا روئے منور جو یار دیکھا ہے | کسی کو ایسا نہ مستانہ وار دیکھا ہے
میرے خیال میں کھوئے ہوئے تمہیں اکثر | کسی نگہ سے تمہیں بار بار دیکھا ہے
نگاہ لطف و کرم مجھ کو جب ہے یاد آتی! | قرار پاتے دل بیقرار دیکھا ہے
نسیم آج چمن سے جو صبحدم آئی! | تو بوئے گل میں تمہیں ہمکنار دیکھا ہے
ہر ایک پتہ میں جلوہ تیرا نظر آتا! | اٹھیں جو نظریں تمہیں شاخسار دیکھا ہے
ہماری حالت دیوانگی نے بھی تم کو! | بنا کے خود کو بھی دیوانہ وار دیکھا ہے
مگر حفیظؔ کی حالت وہ دیکھکر بولے | اسے تو کھویا ہوا لاکھ بار دیکھا ہے

زخمِ پنہاں

(جناب ج نقوی صاحبہ بی-اے)

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

میری ماں ایک حسین عورت تھی اتنی حسین و خوبصورت کہ بعض وقت مجھے اس کو اپنی ماں سمجھنے میں بھی پس و پیش ہوتا۔ میری چھوٹی بہن فلورا اس کی تصویر تھی۔ مجھ سے تو ذرا شباہت نہ ملتی تھی۔ میں اپنے والد سے بہت مشابہ تھی۔ بلند قامت۔ سیاہ بال۔ سیاہ آنکھیں۔ سانولا رنگ۔ میری ماں کو گانے کا بہت شوق تھا۔ گہوارہ کی لوریوں سے لیکر جدید طرز کے ہر راگ و گانے وہ ہمیشہ گنگناتی رہتی۔ غرض اس کا کوئی فعل گانے سے خالی نہ ہوتا۔

دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا تھا وہ جب میری ماں کو مسرور دیکھتے۔ اس کو میرے والد جیسے خشک مزاج۔ خلوت پسند انسان کیساتھ اتنا خوش دیکھ کر ان کو حیرانی سی ہوتی۔ اکثر اوقات تو وہ اماں سے بات تک نہ کرتے بلکہ ہم بہنیں ان کے گفتگو کا ذریعہ بن جاتیں۔ تاہم۔ بظاہر اماں ان کے ان حرکات بیجا کو خاطر میں نہ لاتیں اور مسکرا کر اس کو پی جانیکی ناکام کوشش کرتیں۔

والد کا سن اس وقت ساٹھ کے لگ بھگ تھا۔ وہ دراز قد قوی الجثہ تھے۔ لیکن علالت کے پیہم حملوں نے ان کے جسم کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ بیماری نے انہیں اور زیادہ تنک مزاج۔ تلخ و ترشرو بنا دیا تھا اور وہ اپنے سن سے بہت زیادہ معلوم ہوتے تھے جس کے آثار ان کے چہرے سے ہویدا تھے۔

اماں اس وقت (۳۷) کی تھیں لیکن اب تک شباب کی جھلک ان کے خوبصورت نیلی آنکھوں میں نظر آتی وہ کبھی بہ آواز بلند بات نہ کرتیں بلکہ بہت آہستہ لہجہ میں جس کو شاید صرف فرشتے سن سکتے۔ جب بھی آواز موسیقی میں تبدیل ہوجاتی تو بس اس پر ایک فرشتہ ہی کی راگنیوں کا دھوکا ہوتا۔

وہ ایسی ہر دلعزیز تھیں کہ اکثر ان کے اطراف ہم جیسی کمسن لڑکیوں کا مجمع رہتا۔ ہم اپنے اپنے قصہ کہانیاں ان کے روبرو بیان کرتے۔ واقعی ہم سب لڑکیاں ان کی پرستش کرتی تھیں۔

کیا میری اماں کی میں نے کل حقیقت آپ پر منکشف کر دی؟ کیا میں نے آپ سے یہ نہیں بتایا کہ اس کی ہنسی ایک گریہ کی شدت کو اپنے میں پوشیدہ رکھتی تھی۔ کیا میں نے یہ نہیں کہا کہ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ایک سیلاب اشک پنہاں تھا؟

میں برمنگھم کے ایک چھوٹے سے مدرسہ میں معلمہ تھی جو ہمارے دیہات سے ۱۰ میل کی مسافت پر تھا اس جگہ کی چھ ماہی ملازمت میں میری ایک نوجوان انجینیر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنی اس دوستی کا حال اماں سے کہا۔ اماں کی اجازت سے اس کو مدعو کیا گیا۔ پس اسی طرح ہماری ہر شام ایک پرلطف شام ہوتی جب کبھی میرا قیام گھر میں ہفتہ عشرہ رہتا ہمارے ہمسن دوستوں کا ہجوم رہتا۔ ہماری صحبتوں سے اماں خاص لطف اٹھاتیں۔ والد کو ہماری کسی دلچسپی سے سروکار نہ تھا وہ کبھی کسی چیز میں بھی شریک نہ ہوتے۔ ہمارے ہر سوشیل صحبت ان سے معرا ہوتی۔ ان کا مشغلہ بس یہ تھا کہ تمام تمام دن اپنے کھیت کی رکھوالی کرتے۔ کہانے کے وقت آتے پھر دفعتاً غائب۔ یا ہمسایہ میں کسی کے یہاں چلے جاتے۔ وہاں بھی وہی کاروباری باتیں رہتیں۔ مویشیوں کے متعلق گفتگو رہتی۔ یا سیب کی کاشت کے سلسلہ میں سوالات حل ہوتے۔ زرعی مسائل سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ ہر قسم کے میوہ کی پیداوار۔ اس کے فصل کی تیاری کے اسباب۔ بھیڑیں پالنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ہمارا گھر ایک جزیرہ تھا۔ جس کے اطراف سیب۔ انگور۔ چیری وغیرہ کے درختوں کا جھنڈ لگا ہوا تھا۔ یا پھر وہ کہانے کے بعد کچھ دیر کے لئے سو جاتے ان کے اس نظام العمل میں شمہ برابر بھی فرق نہ آتا۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا انہیں انہیں چیزوں میں سرگرم دیکھا۔ گھر اور گھر والوں سے ان کو ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی۔ جب میں اماں کو دیکھتی مجھے ان پر بہت رحم آتا۔ وہ کس قدر واجب الرحم تھیں۔ انہیں کس قدر خشک مزاج۔ ناقدر شناس شوہر ملا تھا۔ دونوں میں کچھ تو مناسبت ہو؟ مجھے ان دونوں کی زندگی پر تعجب آمیز افسوس ہوتا۔ مجھے اپنی زندگی میں جس سے محبت ہوئی تھی میں اس کا تذکرہ بھلا والد سے کر بھی سکتی تھی۔ وہ اتنے سرد مہر تھے کہ مجھے ان کی صحبت سے ایک قسم کا خوف ہوتا تھا۔ انہوں نے کبھی ہم سے منہ لگا کر بات نہ کی وہ خود ہم سے گھبراتے تھے کتراکر نکل جاتے تھے نہ معلوم ایسی طبیعت والے انسان شادی ہی کیوں کرتے ہوں گے۔ ایسے لوگ تو سادھو یا رشی ہو جائیں تو بہتر۔ والد اور اماں؟ اوہ! یہ دو متضاد کیفیتیں میرے خیال میں انہیں دنیا میں کسی سے محبت ہوئی ہی نہیں؟

جس کو صرف مویشی کھیت اور دہندے سے سروکار ہو وہ بھلا محبت کیا جانے۔

اماں کی زندگی میں ہماری بڑی مداخلت تھی۔ وہ مجسمہ محبت تھیں۔

ایک شام جمیس کو چاء پر بلایا گیا جس کے ساتھ اس کا ایک خوبصورت وجیہہ دوست بھی تھا وہ جمیس سے بہت مختلف تھا۔ اس کے چہرہ سے شگفتہ خاطری ٹپکتی تھی اور شرارت پر گویا ہمیشہ تُلا ہوا معلوم ہوتا جمیس نے اس سے ہمارا تعارف کرایا کہ یہ "رالف کنیشن" ہیں اور یہ کہ مسٹر کنیشن نے اس کو میرے پاس بھیجا ہے کہ اس کو کالج سے نکال کر کچھ دہندا کراؤں۔ میں نے جمیس سے صاف کہدیا کہ "اب تمہارا فرض ہے کہ تم ان کی مدد کرو۔ اور ان کے والد کی خواہش کو ٹھکرانہ دو ـــــــ"

رالف کا فلورا سے تعارف کرایا گیا دونوں نے ایک دوسرے کی طبیعت کو بہت پسند کیا۔ رالف انتہا درجہ کا شریر اور شوخ تھا۔ ہر بات میں مذاق کا پہلو تراشنا اس کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ جمیس اس سے بالکل مختلف سنجیدہ۔ خاموش اور زود رنج ـــــــ!

نہ معلوم رالف کے چہرہ میں کیا جادو تھا کہ امّی اس کو دیکھ کر گم سُم ہو جاتیں۔ اور کچھ گہری سوچ انہیں لگجاتی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ باورچی خانہ سے کوئی چیز جو انہوں نے خود تیار کی تھی لیتی آرہی تھیں۔ معاً ان کی نظر رالف پر پڑی جو انہیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بس وہیں رکابی انہوں نے گرا دی اور وہ گر کے چکنا چور ہو گئی۔ اماں بہت خفیف ہوئیں۔ رالف جو شرارت پر ہمیشہ تلا رہتا تھا۔ وہیں اس نے ایک فقرہ کس دیا۔
"اگر تم فلورا کی امّی ہونے کے بجائے میری امّی ہوتیں تو میں تمہیں خوب ستاتا"

میں۔ خوب ہوا جو نہ ہوئیں ورنہ وہ تو آئے دن رکابیوں کا خاتمہ ہی ہوا کرتا۔ جب تم پر نظر پڑتی رکابیاں شہید ہوا کرتیں۔ گلاس کٹوروں کا خون ہوتا۔ شکر کرو جو اتنے نقصان سے بچے۔

اماں ہماری نوک جھونک پر مسکرادیں۔ لیکن ان کی آنکھوں میں غمگینی کی جھلک اور نمایاں ہو گئی۔
"ویرا میری پیاری لڑکی ہے رالف۔ لیکن تم بھی بہت اچھے لڑکے ثابت ہوتے"

بعد طعام ہم سب مل کر ٹہلنے چلے جاتے اور چاندنی رات میں درختوں کی جھنڈ میں سے ہوتے ہوئے بڑی دور دور نکل جاتے واپسی میں رات زیادہ ہو جاتی۔ ہم اپنے صحن باغ میں آبیٹھتے۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی

بکواس کرنے۔ ایک شب ایسی ہی باتیں کرتے ٹہل رہے تھے کہ جمیس نے کہا "میری خواہش ہے کہ میں اپنی زندگی کے دن یہیں گزار دوں۔ آہ کیا سہانا باغ ہے!"

رالف "ارے تمہاری تو خواہش ہے۔ میں نے تو یہیں رہنے کا ارادہ کر لیا ہے!"

امی نے خوش ہو کر کہا "تم سب میرے بچے ہو۔ یہی تمہارا گھر ہے"! ہم سب نے مل کر انہیں مجبور کیا کہ وہ کچھ گا کر ہمیں سنائیں۔ ان کی وہی پسندیدہ گیت وہ گانے لگیں جس کو گانے کے بعد ان پر ایک نیم بیہوشی کا دورہ طاری ہو جاتا تھا۔ آج تو ان کی آواز میں قیامت کا سوز تھا۔ ایک ایسا درد تھا جس نے میرے دل کے انتہائی پوشیدہ تاروں کو چھیڑ دیا اور میں مجبور ہو گئی کہ ان سے ان کی غمگینی و ملال کا سبب دریافت کروں وہ سسکیاں لیتی ہوئی دروازہ کی طرف لپکیں۔ میں ان کے اس حرکت سے بہت متاثر ہوئی اور بے تحاشہ ان کے پیچھے دوڑی ان کے گلے میں میں نے باہیں ڈال دیں اور مصر ہو گئی کہ آخر اس غم پنہاں کو آج ظاہر کر دیں۔ انہوں نے مجھے پیار کیا۔ شمع گل کرا دی۔ دریچہ میں سے گیارہویں رات کے چاند کی دھیمی دھیمی شعاعیں ان کے کمرہ کو منور کر رہی تھیں۔ پھولوں کے درختوں اور بیلوں کا جھنڈ معطر بنائے ہوئے تھا۔ غرض عجیب رات تھی جس کو میں کبھی نہ بھولوں گی انہوں نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور بڑی محبت سے میرے بال کی لٹوں کو ہٹاتے ہوئے کہنے لگیں۔ "آج میں تم کو ایک کہانی سناؤنگی میں نے بہت ضبط سے کام لیا۔ مگر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اب اس راز کو چھپائے رکھنا میرے لئے انتہائی کا باعث ہے اس غم نے میرے قلب حزین میں ناسور ڈال دئے ہیں! سنو میری پیاری بچی ہمارا خاندان بہت بڑا تھا۔ ہمارے فیملی کے بارہ ممبر تھے اور بہت غریب۔ افلاس نے گویا ہمیشہ کے لئے ہمارا گھر پسند کر لیا تھا۔ والد نے ایک پھولوں کی دکان لگائی تھی جس کی آمدنی بسر اوقات کیلئے بالکل ناکافی تھی۔ میری بڑی بہن جون اور میں ہم دونوں دکان پر والد کا ہاتھ بٹاتے۔ اماں دوسرے دس بچوں کی نگہداشت کرتیں۔ ان کو ان کی سنبھال بہت مشکل تھی لیکن جب شام میں میں گھر جاتی تو ان کی حتی الامکان مدد کرتی۔ جون بہت لاپرواہ تھی۔ وہ شام میں ہوا خوری کو نکل جاتی۔ خواہ کچھ ہو۔ اس کی تفریح کے اوقات میں فرق نہ آتا۔ میں اس وقت پندرہ برس کی تھی۔ میرا بھی دل تفریح کو تڑپتا لیکن اماں کے تکلیف کے خیال سے کہیں نہ جاتی۔ باقی سب بھائی بہن مجھ سے چھوٹے تھے۔ یہاں تک کہ سب سے چھوٹا سال بھر کا تھا۔ لندن کا شہر تم سمجھ نہیں سکتیں۔ زندگی

کس مشکل سے گذرتی تھی۔ ہزارہم کفایت شعاری سے رہتے تھے محتاط زندگی بسر کرتے تھے مگر پھر بھی بسر اوقات مشکل تر ہوتی جاتی تھی والد کا خیال تھا کہ ہم کو باہر کہیں بھیج کر تعلیم دلائیں لیکن یہاں تو روٹی کے ہی لالے پڑے تھے اور علاوہ ازیں ہمارا باہر کہیں جانا والد کیلئے ایک نئے اخراجات کا دروازہ کھٹکھٹانا تھا۔ تاہم جون کو ایک محل میں کسی رئیس کی بیگم کے ہاں خدمتی پہ رکھوا دیا گیا۔ لیکن افسوس وہاں سے وہ فرار ہوگئی اور اب تک لاپتہ ہے۔

اب میں والد کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی والد بہت سخت گیر اور تند مزاج تھے میں ان سے بہت خوفزدہ رہتی تھی لیکن اگر اماں کو یہ ذرا کچھ سخت سست کہتے تو پھر میں ان کی خوب ہی خبر لیتی۔ مجھے اماں سے محبت تھی۔ والد ذرا ذرا سی بات میں امی پر خفا ہوتے لیکن وہ بڑی ضابط و خود دار تھیں۔ انہوں نے کبھی ابا کا شکوہ نہ کیا۔ اف! اس زمانہ کی عورتوں کا موجودہ زمانہ والیوں سے بھلا کیا مقابلہ ہوسکتا ہے۔ ان کی سی برداشت ہم کہاں لاسکتی ہیں۔ دکان پر اب مجھے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ جب سے جون چلی گئی تھی مجھے دوپہر کے کام کیلئے بھی دکان پر جانا پڑتا تھا لیکن میں اس محنت سے بہت خوش تھی۔ پھولوں کی رعنائی خوبصورتی اور ان کی سہانی خوشبوئیں ہی میرا دل موہ لینے کیلئے کافی تھے اس میں مسرور و مگن تھی۔ بھلا اس سے بڑھکر بھی کوئی حسین مشغلہ ہوسکتا ہے؟ زندگی کو طرب آمیز بنانے کی میں انتہائی کوشش کرتی۔ لیکن میں ایک چیز کی اپنے میں کمی محسوس کرتی تھی۔ زندگی شباب اور محبت سے معمور ہے لیکن میں اس دوسری چیز سے محروم تھی۔ یعنی محبت!!

ایک دن والد نے اپنے دکان کی کسی دریچہ کو پھولوں سے آراستہ کرنے کے لئے کہا۔ میں اسی میں مصروف تھی کہ اس طرف سے ایک شخص گذرا جو مجھے گھور رہا تھا پھر وہ دریچہ میں کچھ دیکھتا ہوا دکان میں داخل ہوگیا یہ ایک اڑتیس[۳۸] برس کا اونچا پورا جوان تھا اس نے بہت جلد والد سے روابط بڑھائے اور میری نسبت سوالات کی بوچھار کردی۔ میری چونکہ ایک بیوپاری کی حیثیت تھی مجھے طوعاً خندہ پیشانی سے مخاطب ہونا پڑتا اس سے اس نے یہ فائدہ اٹھایا کہ والد سے زیادہ وہ میری طرف متوجہ ہوتا۔ والد سے جب اس نے سوال کیا کہ یہ کون لڑکی ہے؟ جو آپکے فرم میں کام کررہی ہے؟ والد نے مجھے بڑی حیرت ہوئی یہ کہتے ہوئے

ذرا پس وپیش نہ کیا۔" یہ میری حسین ترین لڑکی ہے۔ سارے لندن میں آج جس کے حسن کا جواب نہیں !" و یرا۔ تم باور نہ کرو گی کہ میں والد کی اس غیر معمولی تعریف سے متحیر ہو گئی وہ کبھی کسی کو سراہتے نہ تھے میں نے آج تک کبھی ان کی زبان سے کسی کی تعریف نہ سنی تھی اور وہ بھی اپنوں کو اتنا دوسروں کے سامنے سراہنا۔ میں مارے غیرت کے پسینہ پسینہ ہو گئی نہ معلوم والد کو آخر یہ کیا سوجھی تھی میں ایسی کیا خوبصورت تھی اور اگر تھی بھی کچھ تو ان کو اس طرح کہنے کی کیا ضرورت تھی ؟ مجھے ان کی اس گفتگو سے ایک ہیبت سی ہونے لگی تھی۔ زمانہ کو گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی ——— ہاں تو پیاری بچی۔ میرا اس شخص سے تعارف کرایا گیا جو تمہارا باپ ہے۔ بس وہ ہمیشہ آیا کرتا اور مجھ سے پھولوں کا ایک ڈھیر خریدتا۔ نہ معلوم وہ اس کے کس مرض کی دوا تھے۔ یہ صرف ایک بہانہ تھا مجھ سے روزانہ ملاقات کا۔ ایک دن اس نے خود ہی مجھ سے کہا کہ میں ان پھولوں کو ہسپتال کیلئے خریدتا ہوں۔ بیماروں کو ان سے کیسی فرحت ہوتی ہے جب وہ اطراف پھول دیکھتے ہیں ان کا جسم بیمار رہتا ہے لیکن روح کا چارہ پھول ہیں۔ دراصل ان سے پیارا اور عزیز کوئی تحفہ نہیں" حقیقت اگر پوچھو تو یہ سب زبانی جمع خرچ تھا۔ وہ پھول نہ معلوم کیسے ہوتے تھے۔ والد اس کے بڑے مداح تھے وہ بظاہر ایک ذی حیثیت آدمی تھا اس کے پاس ایک موٹر تھی تم جانتی ہو موٹر ایسی سواری اس زمانہ میں وہی شخص رکھ سکتا تھا جو کافی مالدار ہو۔ وہ تو لکھ پتی تھا۔ وہ والد کا بڑا گہرا دوست بن گیا۔ والد نے کئی بار اس کو اپنے اجاڑ اندھیرے چھوٹے سے گھر میں مدعو کیا۔ ہمارے اور اس کے حسب و نسب میں بھی بہت فرق تھا۔ ہم غریب تھے۔ مگر شرافت ہمارے خاندان کی لونڈی تھی مگر والد تو پیسے پر جھکے ہوئے تھے اس کی حیثیت نے ان کو مسخر کر لیا تھا۔ انہوں نے نہ خاندان دیکھا نہ ذات پوچھی بس مجھے دولت کے بھینٹ چڑھا دیا۔ وہ میرے لئے اتنے تحائف لاتا کہ میں بیزار ہو جاتی۔ کبھی کتابیں۔ کبھی چاکلیٹ۔ کبھی دستیاں بغرض کوئی ایسی چیز دنیا میں شاید باقی رہ گئی ہو گی جو اس نے مجھے تحفہ میں نہ دی ہو۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی وہ تنہا رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ میں بھی اس سے مانوس ہو گئی تھی۔ بحیثیت ایک دوست۔ ایک خریدار۔ ایک محسن کے ——— اس کی میری نظروں میں بہت وقعت تھی۔ خصوصاً اس کا غائبانہ اخلاص اماں کے ساتھ مجھے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اکثر وہ ہم لوگوں کو اپنی موٹر میں سیر و تفریح کو لیجاتا۔ لندن کے کئی ایسے مقامات جنھیں کبھی ہم نے خواب و خیال میں بھی نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی دیکھنے کی امید ہی تھی اس کے طفیل میں سب دیکھ لیا تھا۔ یہ اکثر میوہ مٹھائی وغیرہ بھیجتے رہتا۔

جس نے ہماری غلطی کی زندگی میں خوشحالی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔

لیکن آہ مجھے شادی کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ مجھ سے اس زمانہ میں اتنا مسّن معلوم ہوتا تھا۔ وہ والد سے کچھ ہی چھوٹا تھا۔ میں اس کی بیٹی کے سن کی تھی۔ اگر اس کے کوئی لڑکی ہوتی۔ لیکن والد کو تو کچھ اور ہی سودا سمایا تھا۔ وہ تو دولت کی دیوی کے پرستار تھے۔ ان کو تو الگ ہی دھن تھی۔ والد مجھ سے ہمیشہ کہتے رہتے تھے کہ میں اس کی عزت کروں۔ اس کا خیال رکھوں۔ وغیرہ۔ مجھے بھی ان کی نصیحتوں کو ماننا پڑتا۔ کیونکہ میں ان کی طبیعت کے رنگ سے بہت ڈرتی تھی وہ جب غصہ میں آجاتے تو بہت سخت سست کہنے لگجاتے تھے بالکل بے مروت تھے جب کہ وہ بیوی کو کچھ نہ سمجھتے تھے تو پھر میں کس شمار میں تھی۔

لیکن جب خود اس نے مجھ سے شادی کے متعلق سوال کیا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ سن کا تفاوت بتلاتے ہوئے میں نے کہا "میں کبھی آپ کے ساتھ خوش نہیں رہسکتی اور نہ مجھ سے آپ سے محبت ہوسکتی ہے میں آپ کو دھوکہ میں رکھنا نہیں چاہتی میں آپ کا احترام کرتی ہوں۔ آپ سے ایک دوست کی طرح محبت کر سکتی ہوں۔ لیکن شادی کر کے میں خوش نہیں رہسکتی" ــــــ وہ میری صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا۔ اور بہت آزردہ ہو کر چلا گیا۔ والد کو جب اس کی خبر ہوئی وہ بہت برافروختہ ہو گئے مجھے سزا دینے کی تجویزیں ہونے لگیں۔ اماں میری طرفدار بنگئیں۔ اور والد سے التجا کی کہ ابھی اس کا سن ہی کیا ہے اس کو ابھی میرے ساتھ ہی رہنے دو۔ لیکن والد تو ہمیشہ حکومت کرنا جانتے تھے اور اماں کو سب سہنے ہی بنتی تھی۔ خواہ کسی کا خرابہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ غرض والد خود ایک دن اس کے پاس گئے۔ جب دیکھا کہ وہ خفا ہے اور اس نے آمد و رفت چھوڑ دی ہے تو بھلا ایک سونے کی چڑیا کو ہاتھوں سے نکلتے وہ دیکھ سکتے تھے؟ اور منگھڑت ہی سہی۔ کہدیا کہ "میں نے ذبرا کو راضی کر لیا ہے وہ ابھی لڑکی ہے۔ اس کا سن ہی کیا ہے" وغیرہ۔ وغیرہ۔

بس۔ اس کے تین ہفتہ بعد ہماری شادی ہوگئی ــــــ اس نے مجھے اپنی دنیا دیدی۔ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ میرے قدموں پر ڈال دیا۔ مگر۔ مگر ــــ سوال تو محبت کا ہے۔ اس نے اپنی محبت کا زمانہ دوسرے کے ساتھ گذار دیا۔ اس کا اپنا رومانس رہچکا تھا۔ وہ مجھ پر ایک باپ کی طرح مہربان تھا۔ میرے راحت و آرام کی اس کو ہر طرح فکر رہتی۔ میرا خیال مجھے نہ تھا۔ سب باتوں کا وہی ذمہ دار تھا۔ زمانہ یوں ہی گذرتا رہا۔ بے مزہ

پہنچے ایام قسمت کی بات تھی کسی کا کیا قصور ـــــ رفتہ رفتہ اس کی صحت بگڑتی گئی۔ لندن کی آب و ہوا صحت کو ناموافق ہوئی اس نے اپنے وطن چلنے کا قصد ظاہر کیا مجھے اماں کو چھوڑنے سے جو روحانی تکلیف ہوئی اس کا اظہار ناقابل بیان ہے۔ اس نے بہت سے وعدہ وعید کئے کہ وہ مجھے ہمیشہ خوش رکھیگا۔ اور ماہانہ مالی امداد سے میرے کثیر العیال والدین کی پرورش کریگا۔ اماں میری جدائی پر بہت رنجیدہ ہوئیں۔ ان کے آنسوؤں کا سیلاب خشک نہ ہوتا تھا۔ لیکن میں نے ان کی تسکین کیلئے اپنے رنج کو بہت چھپایا۔ اور چہرہ کو انتہائی کوششوں سے متبسم بنایا تاکہ انہیں اطمینان قلب ملے۔ اگرچہ کہ دل کا حال صرف خدا پر روشن تھا۔ اف۔ ویرا۔ تم میری دلی حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ اماں سے دور۔ اجنبیوں کے جھرمٹ میں!

ہمارے محلہ میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ اس سے میری دوستی ہو گئی۔ اس کا بھائی بھی کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ ہم لوگ سب مل کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ جنسی عجیب چیز ہے۔ بھلا جوزف کا دل ہم میں کیوں بہلتا؟ میرے دوست اور اس کے بھائی کی روزانہ آمد و رفت نے جوزف کو خدا جانے کیوں مشکوک کر دیا۔ اور وہ ہماری صحبت پر رشک و حسد کرنے لگا۔ مجھے طعنے دیئے جاتے۔ وہ مجھے کسی سے بات کرتے ہنستے بولتے دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ اس نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا۔ جب اس نے یہ محسوس کیا مجھے اس سے محبت نہیں ہے میں صرف اس کا احترام کرتی ہوں تو میرے اس طرز عمل نے اس کو حد درجہ کا بدمزاج۔ سخت گیر۔ اور بدگمان کر دیا۔ وہ اپنی جاہل تقریر سے میرا دل دن میں سو وقت چھلنی کرتا۔ اس نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ گویا مجھے خرید لیا ہے میں اس رقم کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھی جو وہ میرے والدین کے نام منی آرڈر کیا کرتا تھا۔ اکثر مجھے اپنی موت کا خیال آتا کہ کاش میں مر جاتی۔ لیکن خودکشی کی مجھے کبھی ہمت نہ ہوئی جب مجھے اس کا احساس ہونے لگا کہ میں ایک جان کی پرورش کر رہی ہوں تو پھر دنیا میری نظروں میں رنگین و منور دکھائی دینے لگی اور مجھے زندہ رہنے کی از سر نو تمنا ہو گئی۔ مجھے زندگی پر پیار آنے لگا۔ بس تمہارا ہی خیال تھا جو مجھے مرنے سے بچا لیا ورنہ کسی روز ہمت کر کے اپنی جان پر کھیل ہی جاتی۔ خدا نے خودکشی کے سنگین جرم سے بچانے کے لئے تمہیں بھیجدیا۔ تم میرے حق میں نجات کی شکل اور سکون و راحت کا سبب بن کر پیدا ہوئیں۔ تمہاری پیدائش کے بعد میں مہینوں بیمار رہی۔ تم ایک نرس کے زیر نگرانی رہتیں۔ جوزف تمہاری طرف سے بہت لاپرواہ تھا۔ وہ بیٹے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ اس نے کہدیا تھا کہ میں تمہارا نام جوزفائین رکھوں کہ پھر شاید اس کا نام لیوا کوئی

نہ رہے لیکن میں نے تمہارا نام وبرا جوزف تجویز کیا۔

میری اس سے یوں ہی بے اتفاقی ۔اور پھر تم ایک لڑکی کا جنم لیکر پیدا ہوئیں وہ ہم دونوں سے بے رخ ہو گیا تھا اس کو اب نہ تمہاری پرواہ تھی نہ میری ۔ رفتہ رفتہ اس نے ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی ۔اب میری دنیا تو تم میں آباد تھی ۔میرا حسین مشغلہ تمہاری دیکھ بھال تھی تم میری زندگی کا کھلونہ تھیں جس سے میں آٹھوں پہر کھیلا کرتی ۔

میرے سنبھلنے اور صحتیاب ہونے کے جب کچھ آثار پیدا ہوئے اس نے مجھے جنوبی ساحل کے ایک ہوٹل میں بھیجدیا ۔ وہاں ایک ندی بہتی تھی جو بڑے پیچ وتاپ سے بہتی ۔ اس کے اطراف واکناف میں خوبصورت وخوشنما باغ تھے اس میں روشنیں بنی ہوئی تھیں ۔نہریں ان میں سے جا بجا تراشی گئی تھیں غرض کہ وہ ایسا پرکیف مقام تھا کہ طبیعت وہاں سے ہٹنے کے خیال سے چین نہ پاتی تھی جب میں وہاں پہنچی اور تمہارے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ مجھے دنیا میں ہی جنت مل گئی اس جگہ کی خوبصورتی ۔ دلاویزی میرے لئے سامان صد ارمان ومسرت لاتے ۔جوزف وہاں نہیں تھا ۔صرف میں اور تم ۔ اور وہ پرکیف دیہاتی زندگی —— وہ امواج سے متحرک ندی ہمارے پہلو میں بہتی چلی جاتی ۔ تمہارے والد نے میرا دل بہت توڑ دیا تھا ۔ انہوں نے صرف ایک اضطراری جذبہ کے تحت مجھ سے شادی کر لی تھی ۔اس کے بعد ان کی محبت کا پارہ ایسا نارمل ہوا کہ پیسے کی گرمی بھی جس کو نہ بڑھا سکی ۔ ایک شام میں کچھ ایسی ہی سوچ میں بیٹھی تھی کہ وہ آگئے اور مجھے صحت مند دیکھ کر بظاہر مسرت کا اظہار کیا ۔پیسہ خدا نے دیا تھا ۔ ہر طرح کا سامان عیش ومسرت وہ میرے لئے مہیا کرنے تیار تھے لیکن میرے دلی رنج کو وہ یا ان کی بے پناہ دولت کسی میں یہ قدرت نہ تھی کہ دور کر سکے ۔ رفتہ رفتہ وہ تم سے ہی مانوس ہونے لگے ۔ آخر تم ان کی اولاد تھیں ۔تم چار سال کی ہوئیں ۔تمہاری حرکتیں ۔ تمہاری باتیں میرا دل موہ لیتی تھیں اور میں سارا غم تم کو دیکھ کر بھول جاتی تھی ۔

پھر خدا نے مجھے ایک اور لڑکی دی ۔اب میں تم دونوں سے اپنا دل بہلاتی رہتی لیکن جوزف کے غصہ کا اب ٹھکانا نہیں رہا ۔ان کو لڑکے کی تمنا ہی رہ گئی تھی ۔انہوں نے شراب نوشی میں اپنا سارا پیسہ پھونکدیا ۔گویا لڑکے کے غم کو انہوں نے یوں بہلانیکی ترکیب نکالی ۔جب شراب کی گرم بازاری ہو تو کہاں کہاں کے لوگ دوست نہیں بن جاتے ؟ چنانچہ ان کے دوستوں کا جگھٹ کبھی ختم نہ ہوتا ۔ساری ساری رات یہ منحوس محفل گرم رہتی ۔اسی کی پھٹکار ہے کہ آج جبکہ تم دونوں اس قابل ہو کہ تم لوگوں کی شادی ہو جائے پیسہ نہ رہا ۔ اور کھیت باڑی کی نوبت آئی ہے ۔

وہی پیسہ اگر تم دونوں کی تعلیم میں کام آتا تو کتنا با موقع اس کا استعمال ہوتا لیکن ان کی طبیعت کا رنگ ہی ایسا تھا۔ قدرت نے گویا ان کو میری خرابی کا بانی بناکر پیدا کیا تھا تاہم میں خوش ہوں کہ وہ دولت جس کو زوال نہیں مجھے حاصل ہے یعنی میرا دل جو روز ازل سے غنی تھا مستغنی ہی رہا۔ مجھے کبھی روپیہ کی حرص وطمع نہ رہی۔ اور اس کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے اولاد دی اور کچھ دنوں کیلئے زندگی کو رنگین اور خوشگوار بنا دیا ـــــ اب خدا سے دعا ہے کہ وہ تم دونوں کی قسمت مجھ جیسی نہ بنائے۔ غریب ملے لیکن اس میں خدا محبت دے۔ دولت نے کسی کا ساتھ کب دیا ہے۔ روپیہ واقعی ہاتھ کا میل ہے۔ دنیا کے سارے جاہ وحشم نقش بر آب !!" (ترجمہ)

تنہائی میں

(جناب مس۔ایس۔ احمد حسن صاحبہ)

تنہائی سے اُکتا کر چار دیواری سے گھبرا کر دور سرسبز کھیتوں میں میلوں نکلجاتی ہوں تو رہ رہ کر یہ خیال ہوتا ہے معبود مجھ سے اور بھی تو ہیں اور وہ شادمان شادکام زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہنستی ہیں کھیلتی ہیں۔ لیکن میں کیوں اس سے محروم ہوں۔

ہوا کی آزادانہ بے تکلفی نے کھیتوں پر دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ پھولوں کی بھینی بھینی بو سے کسان اپنے شالیزار کو دیکھکر باغ باغ ہوجاتا ہے تو میں سوچتی ہوں اللہ میں بھی کیوں نہیں مسرور ہوتی ؟

پرند چہچہا رہے ہیں اور سریلی نغموں کا ترنم فضا کو مسحور کئے ہوئے ہے تو میں دل ہی دل میں کہنے لگتی ہوں کہ کیا کسی دن میں بھی آزادانہ دن بسر کروں گی ؟

جب میں اکتا کر خود بخود گانے لگتی ہوں تو دور سے ایک دوشیزہ کی رس بھری تانیں اور اس کی بیفکری مجھے محو حیرت کر دیتی ہے اور فکر میں کئی گھنٹے میرے صرف ہوجاتے ہیں کہ خداوندا میں کیوں نہیں ایسا گاتی ؟ چرواہا اپنے گلہ کو لئے ہوئے اپنی کٹیا کی جانب واپس آتا ہے تو میں آپ ہی آپ ہمہ تن سوال بنجاتی ہوں رحیم میں کیوں نہیں اسطرح اپنے مکان واپس آتی ؟

دن بھر کی کشاکش سے پریشان ہوکر جب شب کی پرسکوت ساعتوں میں اپنے بستر پہ دراز ہوتی ہوں تو رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ میرے کریم میں کیوں نہیں ایک معصوم بچہ کیطرح تیرے نغموں سے لذت یاب نہیں ہوتی ؟

اُف۔ میری افسانوی زندگی کیا یوں ہی گذرتی چلی جائیگی۔ یہ سوال ہے جو گھنٹوں مجھے پریشان کرتا ہے۔

تلنگن

جناب مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے۔ عثمانیہ

اگرچہ آپ نے حال ہی سے شاعری شروع کی ہے۔ مگر کلام درد اور تاثر سے لبریز رہتا ہے۔

(۱)

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

(۲)

ارض یکسر گوش ہے خاموش ہیں سب آسماں
راگ سننے رک گئے ہیں بادلوں کے کارواں
ہاں ترانہ چھیڑ جنگل کا ہیری غنچہ دہاں
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

(۳)

دیکھنے آئے ہیں تارے شب میں سن کر تیرا نام
جلوے صبح و شام کے ہوتے ہیں تجھ سے ہم کلام
دیکھ فطرت کر رہی ہے تجھ کو جھک جھک کر سلام
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

(۴)

دختر پاکیزگی نا آشنائے سیم و زر!

دشت کی خود رو کلی تہذیب نو سے بے خبر
تیری حُسن کی جھونپڑی پر ہوں تصدق بام و در
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

(۵)

لے چلا جاتا ہوں آنکھوں میں لیئے تصویر کو
لے چلا جاتا ہوں پہلو میں چھپائے تیر کو
لے چلا جاتا ہوں پھیلا راگ کی تنویر کو
اجنبی کو دیکھ کر شرمانے والی گائے جا ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

تعلیم کا مقصد

(مسز سیدا حسین صاحبہ بدی)

تعلیم کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ انسان میں نیک و بد کا امتیاز پیدا ہو۔ اور وہ اس کے ذریعہ دنیا کے مقصد حیات میں کامیابی ہو جس کے لئے ہماری تخلیق عمل میں آئی ہے۔

لیکن اس کے برعکس موجودہ تعلیم ہم کو سچی مسرت جائز ترقی اور اطمینان کی زندگی سے محروم بنا رہی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری تعلیم میں ایسی خامی ہے کہ وہ اپنے بہترین فوائد سے مستفید کرنے کی بجائے ہمارے لئے باعث مضرت ثابت ہو رہی ہے اور ہم میں خودداری ابنائے جنس سے ہمدردی خوش اخلاقی جیسے نیک صفات پیدا ہونیکی بجائے ہم تعلیم پانے کے بعد خود پسندی، تکبر، فیشن پرستی، ظاہر پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے نکلتے ہیں۔ اور ہماری ہمہ تن یہ سعی ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے اندر مغربیت پیدا کریں۔ ہماری رفتار ہماری گفتار ہماری معاشرت کی ہر چیز گویا مغربی سانچہ میں ڈھلی ہو۔ کیونکہ مغربیت کے زہریلے اثر نے ہم میں سے اس احساس کا مادہ ہی سلب کر لیا ہے کہ آیا یہ طرز معاشرت ہمارے لئے مفید ہے یا مضر۔

تعلیم یافتہ گروہ کا مقصد اعلیٰ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم پانے کے بعد قابل ہو جائیں کہ مغرب کی ایک ایک ادا ہم میں پائی جائے جس کا نتیجہ یہ ہے۔ نہ مغربی ہیں نہ مشرقی

ہم عورتوں میں ان خیالات کے پیدا کرنے والے اور آہستہ آہستہ مغرب کی طرف لیجانے والے کون ہیں؟ کس پر ہماری اس بے راہ روی کی ذمہ داری عائد ہونی چاہیئے؟ اس کا جواب صاف ہے یہ سب کچھ مردوں کی بدولت ہوا ہے اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہ روپ پہلے مردوں ہی نے بدلا۔ اپنی جائز آزادی راحت اطمینان قلب کو اس "فرزانہ" فرقہ نے ہی اپنے ہاتھوں ظاہری مسرت کے بھینٹ چڑھایا۔ وہ لاج وہ آن بان جس کو صدیوں سے ہمارے باپ دادا نباہ رہے تھے منٹوں میں انہوں نے برباد کر دیا۔

موجودہ تعلیم کے متعلق اکثر لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ مستورات پر اس کا ایسا اثر ہو رہا ہے جس نے انہیں نہ مشرق کا رکھا نہ مغرب کا۔ گویا ایک نئی نسل کی بنیاد قایم ہو رہی ہے۔

کیا کسی کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ مادر ہند کے سپوت کسب ہنر و علم کے لئے اپنے ملک کی بے حساب دولت مغرب میں لٹا رہے ہیں کیا ہندوستان کے لئے مالی نقصان ہی کافی نہ تھا جس پر ان لوگوں نے اکتفا نہ کیا اور دولت کے ساتھ خود کو بھی مغرب کے ہاتھوں فروخت کرنے لگے۔

جب ملک کی دولت اس طرح مغرب میں کھنچی جا رہی تھی اور اس سے زیادہ نقصان دہ چیز کہ تعلیم یافتہ نونہالان ہند جن پر ملک و قوم کی ترقی کا دار و مدار ہو سکتا تھا خود کو عشوہ و ناز فروشان مغرب کے حوالے کر رہا تھا تو کس طرح اس کو روا رکھا جا سکتا ہے ملک کے بہی خواہ یا لڑکیوں کے والدین اس کا علاج کس طرح کرتے۔ جب ان کی پاکباز لڑکیاں جو حسن صورت و سیرت میں روکھی پھیکی بازاری فرنگنوں سے ممتاز حیثیت رکھنے کے باوجود کامیابی کا سہرا بعثان فرنگ ہی کے سر ہوتا ہے۔

اب لوگوں نے دیکھ لیا کہ زہر کا اثر زہر سے ہی جاتا ہے اسی بنا پر لوگ اپنی لڑکیوں کی تعلیم تربیت کا رنگ بدلنے پر مجبور ہو گئے انہیں بھی مغربی رنگ کی تعلیم اور تربیت دینا شروع کیا۔ "خواہی نہ شوی رسوا ہمرنگ جماعت شو" کی مثل صادق آئی۔ اپنی اس تذلیل اور حق تلفی کی بنا پر لوگ آزادی کے بہی خواہ ہونے لگے تا کہ اس طرح اپنے جائز حقوق حاصل ہو جائیں۔

جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو مکمل العقل فرقہ کو احساس ہونے لگا فطرۃً اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔ مگر دوسرے کی آنکھ کا تنکا کھٹکتا رہتا ہے۔ اب جو لڑکیاں تعلیم اور تقلید میں منہمک ہو گئیں مشرق میں مغرب کی جھلک پیدا ہو گئی تو لوگوں کو اپنی غفلت کا کچھ احساس ہونے لگا لیکن ابھی یہ زبانی ہی جمع و خرچ ہے جب تک عملی جامہ نہ پہنایا جائے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستانی اپنی غلطی کا اعتراف کرنے لگے ہیں کیونکہ ابھی زیادہ حصہ مغربی تقلید کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اس طرز عمل کو بدلنے کے لئے بے چین ہیں۔ جب کثرت قلت پر حاوی ہے تو کس طرح کامیابی کی کوئی امید ہو سکتی اور کوشش کیجا سکتی ہے۔ آج کل زیادہ تر اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کا نصاب ایک ہے جس سے یہ نقصان ہو رہا ہے کیونکہ جو تعلیم لڑکوں کے لئے کار آمد ہے وہ لڑکیوں کے لئے تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے نصاب کا بدلنا ضروری ہے۔ الجبرا۔ جامیٹری۔ وغیرہ چیزوں کے عوض صحیح معاشرت۔ تدبیر منزل۔ اصول صحت۔ پرورش اطفال وغیرہ امور پر زیادہ توجہ دلائی جائے۔

تاکہ زندگی کامیاب ثابت ہوسکے۔

یہ وہ ضروری چیزیں ہیں جس سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے اور جو عورت کے فرائض میں داخل ہیں لیکن ان فرائض کو ادا کرنے میں مدد دینے والی چیز بلکہ دارین میں کامیاب بنانیوالی تعلیم دوسری ہے۔ جب تک اس کو تعلیم کا مقصد اعلیٰ نہ بنایا جائیگا تعلیم و تربیت کی تکمیل ناممکن ہے۔

وہ "مذہبی تعلیم" ہے۔ بغیر مذہبی تعلیم کے ہماری معاشرت کا رخ نہیں پھیرا جاسکتا اور اس کوشش میں کامیابی ناممکن ہے۔ کیونکہ ہمارا پاک اور سچا مذہب ہی وہ شمع ہدایت ہے جو اس گمراہی اور تاریکی میں ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔ مذہبی تعلیم سے وہ سب مدعا حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ مذہبی تعلیم سے ہی عورت مکمل عورت بن سکتی ہے حیا۔ شرم۔ شوہر کی اطاعت۔ خانہ داری۔ سب چیزوں میں ہم اسی سے بہترین سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

ہمارے پاک مذہب نے کونسی بات ہم کو نہیں سکھائی لیکن جب ہم مذہب ہی کو خیرباد کرنے لگے تو مذہب کیا کرے گا۔

جب مستورات وہ اعلیٰ تعلیم پائینگی جس کا سرچشمہ مذہب ہے تو وہ اپنی اولاد کو بھی اس سے مستفید کرینگی۔ ایسی ماں کی گود میں پلا ہوا سپوت مذہب کا پکا۔ قول کا سچا۔ قوم پرست وطن پرست۔ نیک خصلت اور ظاہری و باطنی جملہ نیک صفات سے متصف ہوگا۔ اور یورپ کی معاشرت سے اس میں نفرت پیدا ہوگی اور وہ ہرگز گوارا نہ کریگا کہ اس کی شریک حیات یورپ کی اندھا دھند تقلید میں یوں بے باک آزاد خیال ہوکر بیجا آزادی اختیار کرے اور بے حجاب بن جائے کس قدر افسوس کی بات ہے گذشتہ طریقہ تعلیم رفتہ رفتہ مفقود ہوگیا۔ کیا اسی تعلیم و تربیت کا اثر نہیں تھا کہ گذشتہ صدیوں میں اسی زمین پر اور اسی آسمان کے سایہ میں ایسے ایسے نامور ہستیاں پیدا ہوئیں جن کے کارنامے تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

کیسے اولوالعزم انسان تھے۔ کیسا جوش تھا کتنی حمیت تھی۔ ان لوگوں میں اور اسی زمانے کی عورتیں بھی کیا کچھ نہ کرگذریں سلطنت کی۔ حکومت کی۔ وطن اور قوم کی کیسی کیسی خدمتیں کیں اور ہر قسم کی معرکہ آرائیوں میں مردوں کے دوش بدوش رہیں۔ بیماروں کی تیمارداری۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ کیسی کیسی فاضل گذری ہیں تصنیف و تالیف غرضکہ کون سا ایسا کام تھا جو عورتوں نے حصہ نہ لیا۔

بتائیے کہ ان میں کتنی بی۔اے تھیں۔ اور کتنی ایم۔اے کتنوں نے ڈاکٹری کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بقول نذیر احمد صاحب کے ”ان کے نام کے ساتھ کوئی ایسا دم چھلا نہ تھا لیکن ان کی لیاقت قابلیت ایسی تھی۔ ان میں وہ جوہر پنہاں تھے جن کی چمک اب تک ان کے کارناموں سے ظاہر ہوتی ہے۔“

آج کل ایم۔اے اور بی۔اے بہت ہیں لیکن اس سے قوم کو کیا فایدہ ہو رہا ہے۔ ہماری معاشرت میں آئے کیا ترقی ہو رہی ہے۔ ہاں! یہ تو ہے آئے دن فیشن کے نئے نئے روپ بدل رہے ہیں جس کی تکمیل کے لئے بیچارے مردوں کی گاڑھی کمائی بے دردی سے بے دریغ لٹائی جاتی ہے۔

لیکن مرد باز پرس نہیں کر سکتے کیونکہ خود ان کی فیشن پرستی فضول خرچی ان سے بھی بڑھی چڑھی ہوتی ہے اعتراض کریں تو کس منہ سے۔

کیا مذہب اسراف کو منع نہیں کرتا۔ مذہب کی کن کن خوبیوں کو گنایا جائے۔ الغرض یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہر قسم کی تعلیم اسی سے مکمل ہو سکتی ہے لیکن اس کیلئے پہلے مردوں کو خود اپنی اصلاح کی ضرورت ہوگی انہیں اپنی معاشرت کو بدلنا پڑیگا کیونکہ پھر وہی سد سکندری حائل ہو جائیگی۔ یعنی مغربی شوہر مشرقی بیوی۔ پھر نہیں تو کس طرح۔ مغربی شوہر مشرقی بیوی کو خوش رکھ سکیگا نہ مشرقی بیوی مغربی شوہر کو۔

مرد پوڈر لگائینگے۔ کریم لگا کر چہرہ کو نرم و نازک بنانے کی کوشش کرینگے۔ ولایتی کپڑوں کا روز ایک نیا سوٹ پہنیں گے جس کی سلائی اپنے دیسی لباس سے چوگنی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ عمدہ عمدہ بیش قیمت بوٹ پہنیں گے۔ غرضکہ ہر طرح فیشن کا تقاضا پورا کرینگے۔ کلبوں کے ممبر بن کر بڑی بڑی فیس ادا کرینگے اور وہاں جا کر برج اور بلیرڈ کھیل کر روزآنہ ایک معقول رقم ہار دیا کرینگے یہ سب جایز اور عورت کی زیبایش آرائش کے اخراجات فضول! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

مردوں کے لئے تو ان کی بہادری۔ طاقت اور لیاقت قابل ناز چیزیں ہو سکتی ہیں نہ کہ عورت کی طرح ہر وقت بناؤ سنگار کا خیال۔

پہلے زمانہ کے لوگ بھی خود کو آراستہ کرتے تھے آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے جس سے بصارت کو فایدہ ہو۔ سر میں اپنا دیسی تیل ڈالتے تھے جو بے ضرر اور قوت دماغ و فرحت کا باعث ہوتا ہے۔ اپنی آمدنی کو

اس طرح صرف کرتے تھے کہ کچھ نہ کچھ پس انداز رہے۔ ان لوگوں کی جسمانی قوت کا یہ حال تھا کہ ایک آدمی آج کل کے کئی فیشن ایبل بہادروں کو نیچا دکھانے کے لئے کافی تھا۔

لیکن اس کے برخلاف آج کل ولایتی تیل کے کثرت استعمال سے قبل از وقت سر سفید ہو جاتا ہے۔ سرمہ کا استعمال ترک ہونے سے بینائی میں فرق آجاتا ہے اور چشموں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اخراجات کی زیادتی قرض خواہوں کے تقاضے صحت اور اطمینان میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ امیر لوگ کسی نہ کسی طرح اپنی خواہشات کی تکمیل کرنے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کرینگے یا کم از کم قرضہ سے سبکدوش رہینگے لیکن مٹی پلید ہے تو متوسط طبقہ کی۔

یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی تعلیم بھی مردوں کی طرح ذریعہ معاش ہوگئی ہے تاکہ اخراجات کی ایک حد تک تکمیل ہوسکے اور فیشن وغیرہ میں وہ دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔

عورتیں اس لئے پیدا کی گئی ہیں کہ وہ گھر میں رہ کر خانہ داری کے امور کو انجام دیں۔ بچوں کی پرورش کریں شوہر کی ہر طرح اطاعت کریں ان کی مونس و غمخوار ہوں۔ مرد جو کچھ کمائیں اس کو کفایت شعاری اور سلیقہ سے اٹھائیں۔ ماں کی گود جو بچہ کی تعلیم تربیت اور نشوونما کا بہترین گہوارہ ہے اس کو اس طرح آراستہ کریں کہ آنیوالی نسلوں کیلئے صحیح راستہ مل جائے۔ اگر ہم امور خانہ داری میں دلچسپی پیدا کریں اپنے فرائض منصبی کی ادائی میں ہمہ تن مصروف و منہمک ہو جائیں تو لحظہ بھر کی بھی فرصت ملنا دشوار ہو جائے اور ہمارے فرائض کی ادائی ہی ہماری زندگی کا بہترین مشغلہ بن جائے۔ سر سید احمد جیسے روشن دماغ ملک و قوم کے بہی خواہ تعلیم کے حامی النساء بھی مستورات کی اتنی آزادی ایسی بے سری تعلیم کے حامی نہیں تھے اپنی ایک اسپیچ میں انہوں نے اپنے خاندان کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا ہے "ہمارے خاندان کی چند لائق تجربہ کار بیبیاں مل کر خاندان کی لڑکیوں کو تربیت اور تعلیم دیا کرتی ہیں جس میں مسائل دینی عمدہ نصیحت آمیز کارآمد کتابیں جن سے مستورات کو ہر وقت سابقہ پڑنے والا ہوتا ہے اور جوان کی آئندہ زندگی میں رہبری کر سکیں پڑھاتی ہیں اس کے سوا ایک مقررہ روز لڑکیوں کو سینا پرونا سلائی وغیرہ کی مشق کرائی جاتی ہے اس کے علاوہ ان کو بیش قیمت نصائح سے آراستہ کیا جاتا ہے اور امور خانہ داری سکھلائے جاتے ہیں۔" کتنا اچھا طریقہ کتنے بہتر اصول زندگی تھے۔ وہ کیسی سادہ و پاکیزہ تعلیم تھی جو عورت کو

بیش بہا زیور نسوانی سے آراستہ و پیراستہ کرتی تھی جس کے برخلاف آج کل کی تعلیم ظاہری نمائش۔ بیجا خرافات سے پُر۔ نسوانی جواہرات کو برباد کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

گذشتہ تعلیم دنیاوی زندگی میں امن چین خوشحالی، اطمینان قلب روحانی مسرت کا باعث اور دین کی طرف لیجانے والی ہوتی تھی

زمانہ حال کی تعلیم ہم کو خرافات میں الجھا کر حقیقی اور دائمی مسرت سے دور کر رہی ہے۔ عاقبت کا تو حال ہی نہ پوچھئے۔

یہ ہماری غفلت نا عاقبت اندیشی نہیں تو پھر کیا ہے جو ہم خود کو یوں بے لگام ہنکائے چلے جا رہے ہیں دُور اندیشی تو یہی ہے کہ انسان زندگی کے دونوں پہلوؤں کا نظر غائر سے مطالعہ کرے تاکہ روشن اور تاریک دونوں پہلو نظر کے آگے رہیں۔ زمانہ نے ایسی کروٹ لی کہ طبقات ارض کے ورق ہی پلٹ گئے دنیا کا رنگ ہی بدل گیا۔ اب اگر یہی مدبران علم بہی خواہان قوم آجائیں تو دنگ رہجائیں۔ قوم کو اس طرح تنزل کے حضیض میں گرتے ہوئے دیکھیں تو ان کے دل سینوں میں خودداری حمیت کی آگ سے جل اٹھیں گے۔ ہمارے قیاس میں ہماری موجودہ طرز زندگی ترقی کی معراج ہے لیکن اگر ہماری مبتذل ترقی کا زینہ اسی طرح بلند ہوتا رہا تو وہ دن دُور نہیں کہ اس بلندی سے ہم ایسے گرینگے کہ پھر اٹھنا ہی محال ہوگا۔

دنیا اور اس کے نشیب و فراز تو اس کے متقاضی ہیں کہ انسان اگر امن و امان کی زندگی چاہتا ہو تو اس میں اس طرح غور و خوض کے ساتھ قدم رکھے کہ اس کی پرخطر وادی میں منھ کے بل گرنے نہ پائے۔

تہذیب کے اصلی معنی اصلاح کے ہیں یعنی انسان اپنے فہم و ادراک سے کام لیکر اپنے عیوب کو دُور کرے خامیوں کی اصلاح کرے۔ لیکن آج کل کی اصلاح میں تہذیب یا ننگی سے مراد نیم عریانی ہے۔

بارہا عرض کیا گیا ہے کہ چندہ کے عنایت کرنے میں ملازم کو گردش نہ دیجئے کہ اس غریب کو اور بھی بہت سے کام ہیں لیکن آپ حضرات توجہ نہیں فرماتے۔ اگر آئندہ شہاب کی اعانت منظور نہ ہو تو اپنے ارادہ سے مطلع فرمائیے۔ یوں بھی ہم آپکے متشکر ہیں کہ اس کو عزت مطالعہ دے رہے ہیں۔

خُدائی انتقام

جنگ عظیم کا ایک خوبصورت تخیل

(۴)

(جناب حسن محی الدین صاحب صدیقی بی۔ اے عثمانیہ)

ذیل کا افسانہ مصر کے مشہور افسانہ نگار علامہ مصطفی لطفی المنفلوطی کا ترجمہ ہے۔ جس میں جنگ عظیم کا تخیل ہے۔ جو بالکل حزنیہ ہے۔

گرما کی راتیں تھیں اور میں سو رہا تھا اور نیند میں میں گویا ایک خواب دیکھنے لگا کہ ایک بہت بڑے شہر میں پہنچ گیا ہوں جس کا میں نہ نام جانتا اور نہ یہ جانتا ہوں کہ وہ دنیا کے کس خطہ میں واقع ہے اور کس کا دور حکومت ہے میں چلنے لگا۔ جہاں قسم قسم کی نوجیں دکہائی دیتی تھیں اور مختلف زبانیں رائج تھیں مجھے خیال آیا کہ شاید دنیا کا اطلاق اس شہر پر ختم ہے اور جو شہر میں دیکھ رہا تھا وہ کرۂ ارض ہے میں حیرت کی حالت میں پھرتا ہوا ایک عظیم الشان محل کی طرف پہنچا کہ جس کے دیکھنے ہی سے دل پر ہیبت طاری تھی اس کے دروازہ پر ایک مجمع عظیم تھا۔ اور بہت سے فوجی ننگی تلواریں علم کئے انتظام کر رہے تھے میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے اور یہ سب لوگ کیوں جمع ہیں اس نے جواب میں کہا کہ یہ یہاں کے حاکم کا محل ہے اور آج انصاف کا دن ہے اور تمام مقدمات فیصل ہونگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص آکر پکارا کہ مجلس عدل جمع ہو چکی ہے سب لوگ اندر جانے لگے میں بھی ان کے پیچھے اندر آیا۔ مقام صدر کے وسط میں حاکم شہر ایک سنہری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے سیدھے طرف قاضی شہر اور بائیں جانب چرچ کا اسقف اعظم تھا۔ حاکم تھوڑی دیر تک ایک کاغذ دیکھتا رہا پھر اس نے مجرمین کے لانے کا حکم دیا۔ سپاہی گئے اور ایک بوڑھے کو لے آئے جس کے ہاتھ پاؤں بڑھاپے کی وجہ سے کانپ رہے تھے جسم پر جھریاں تھیں اسقف نے اٹھکر کہا کہ اس نے چرچ سے گیہوں کا ایک برتن چرایا ہے جو فقرا اور مساکین کے لئے وقف تھا۔ لوگ چیخنے لگے کہ کیا خبیث ہے کہ خدا کے گھر میں چوری۔ پادری نے شہادت پیش کی۔ تھوڑی دیر کے بعد حکم دیا گیا کہ مجرم کو ساحل موت پر پہنچایا جائے اور اس کے تمام اعضا یکے بعد دیگرے کاٹ دئے جائیں اور آخر میں اس کا سر

کاٹ دیا جائے۔ بوڑھا بڑھا کہ صفائی پیش کرے اور رحم کی درخواست کرے لیکن سپاہی بیرحمی سے پکڑے گئے۔ پھر دوسرے مجرم کی طلبی ہوئی۔ یہ سترہ اٹھارہ برس کا خوبصورت جوان تھا اس کا جرم یہ تھا کہ مالگذاری وصول کرنے والے کو اس نے قتل کر دیا تھا۔ لوگ چیخنے لگے کہ اُف کیا ظالم ہے کہ حاکم کے نائب کو اس نے قتل کیا گویا خود حاکم کو قتل کیا۔ حاکم نے سزا سنائی کہ اُسے ساحل موت کے درخت پر لٹکا یا جائے اور رگوں کی فصد کھول دی جائے کہ خون کا ایک قطرہ بھی جسم میں نہ رہے لوگ حاکم کے انصاف کی تعریفیں کرنے لگے مجرم نے صفائی کی درخواست پیش کی لیکن سُنی نہ گئی سپاہی اسے بھی پکڑ لیگئے اور پھر تیسرا مجرم حاضر لایا گیا۔ یہ انتہائی خوبصورت دوشیزہ تھی اس کے متعلق کہا گیا کہ اس نے اپنے منگیتر سے قبل ازدواج زن و شو کے تعلقات قایم کر لئے۔ لوگوں نے چیخنا شروع کیا کہ اسے سنگسار کرنا چاہئے قاضی نے حکم دیا کہ ساحل موت پر لیجاؤ اور ننگا کر کے سنگسار کرو۔ لوگ خوشی خوشی عدل انصاف کی داد دیتے ہوئے واپس ہو گئے۔

میں بھی نکلا دل پر رنج اور افسوس کا انتہائی بار تھا میرے دل نے کہا کہ ان لوگوں نے انصاف کیا کہ ظلم۔ ان کا یہ کیسا قانون ہے کہ ملزم سے صفائی کی درخواست بھی نہیں لی گئی اور سزا دیدی گئی بہت ممکن ہے کہ انہوں نے جرم کیا ہی نہ ہو۔ کیا یہ ظالم نہیں ہیں۔

ممکن ہے کہ اس بوڑھے نے مفلسی سے تنگ آ کر چوری کی ہو۔ اس لڑکے نے حفاظت خود اختیاری یا عزت کی نفس کے لئے قتل کیا ہو اور اس لڑکی پر غلط اتہام لگایا گیا ہو۔

میں افسردہ خاطر گھوم رہا تھا کہ شام ہو گئی۔ میں ساحل موت کی طرف چلا۔ بوڑھے کے اعضاء ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ لڑکا درخت پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ بھی درخت کی ایک شاخ ہے۔ برہنہ لڑکی بھی وہیں قریب تھی جہاں خون آلود پتھر بھی تھے۔

تینوں کے قریب ایک گڑھا تھا جس میں ان مظلومین کا خون جمع ہو گیا تھا میں ان لوگوں پر افسوس کر رہا تھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اس طرف آ رہا ہے ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ دیکھتا کیا ہوں ایک بوڑھی عورت نے بوڑھے کے اعضاء بریدہ جمع کئے درخت کے نیچے ایک گڑھا کھودا گیا اور دفن کر دیا۔ اور قبر پر کھڑے ہو کر کہنے لگی ۔۔ اے مظلوم شہید تو خدا کی راہ میں شہید ہوا ہے اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے تو قتل کیا گیا تو بہترین شوہر اور رحدل باپ تھا۔ پاک زبان اور پاک عمل تھا۔ پاک دل اور ستودہ صفات تھا۔ اپنے پروردگار سے اپنی

جز اطلب کر اور دنیا کیلئے رحمت مانگ۔ اپنے قاتلوں اور ظالموں کیلئے بھی بخشش کا طالب ہو۔ اب سوائے تجھ سے ملنے کے زندگی میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

مجھے اس کے بیان پر رونا آگیا۔ میں اس کے قریب آیا اور بچشم پرنم اس کا حال پوچھا۔ اس نے رو رو کر یوں بیان کیا:—

"میرا شوہر کبھی چور تھا نہ ڈاکو۔ بلکہ اس نے اپنی پوری زندگی شریفانہ طور سے گذاری۔ اور اپنی کوشش و محبت سے اپنے اہل و عیال کا کفیل رہا۔ اس کا ایک لوتا لڑکا بڑا ہوا اور باپ کے بڑھاپے کا کفیل ہوا۔ تھوڑے دن ہوئے کہ اس کا انتقال ہوگیا اس نے پانچ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے گھر کا اثاثہ فروخت کرکے گذر کرنے لگے یہاں تک کہ وہ ختم ہوگیا بوڑھے شوہر میں اتنی قوت نہ تھی کہ کمانے جاتا میں لوگوں سے بھیک مانگنے نکلی لیکن کسی نے توجہ نہ کی۔ میں گھر واپس ہوئی بچوں کو دیکھا کہ بھوک کے مارے تڑپ رہے تھے اور میرا خاوند چپ چاپ بیٹھے آنسو بہا رہا تھا۔ ہاتھ ملتے ہوئے یہ خیال کر رہا تھا کہ وہ کیا کرے اگر اس وقت موت مجسم ہوکر بھی نظر آجاتی تب بھی یہ منظر اس منظر سے زیادہ دل کو ٹکڑے کرنے والا تھا۔ بچے دوڑ دوڑ کر میرے قریب آنے لگے اور میرے اطراف پھرنے لگے اس خیال سے کہ شاید میں ان کے لئے کچھ لائی ہوں لیکن افسوس میرے پاس یاس و ناامیدی کے سوا کچھ نہ تھا لیکن پھر خیال آیا میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ شہر کے چرچ میں غریبوں کیلئے کچھ مال ہے تم جاؤ اور اسقف اعظم سے کچھ مانگ لاؤ تو شاید ان معصوم بچوں کی بھوک کا علاج ہو سکے۔ امید کی خوشی سے اس کا چہرہ ٹمٹما اٹھا۔ اس نے لکڑی ہاتھ میں لی اور اس کے سہارے چرچ کو پہنچ گیا۔ اسقف سے اس نے روتے ہوئے اپنے سارے واقعات بیان کئے اس کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ لیکن اس نے کہا کہ چرچ کا مال اس کو نہیں دیا جا سکتا اور کہا کہ دنیا میں زندگی کے بہت سے راستے کھلے ہوئے ہیں اگر وہ بند ہیں تو جرائم کے راستے تو انتہائی وسیع ہیں۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا جسم لرزنے لگا انتہائی رنج کی حالت میں وہ واپس ہونے لگا چرچ میں گیہوں کا برتن دکھائی دیا۔ لیکن حیا مانع ہوئی پھر خیال آیا کہ یہ مال فقرا کے لئے ہے اور مجھ سے زیادہ حاجتمند شاید ہی شہر میں ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ اسقف نے خود جرائم کے ارتکاب کی اجازت دیدی اس نے برتن لیلیا اور گھر چلا۔ چرچ سے باہر نکلا تھا کہ چرچ میں اس کی پکار ہوئی اور پولس نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد کا واقعہ تو

تم خود دیکھ چکے ہو۔ یہ شہید مظلوم مرا۔ اے خدا اس پر مجھ پر اور ان بدنصیب معصوم بچوں پر اپنی رحمت فرما"
پھر وہ اپنی جگہ سے میلی چادر سے آنسو پوچھتے قبر کی طرف ایک حسرت ناک نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگی :۔

"الوداع اے بچپن کے رفیق! بڑھاپے کے سہارے۔ اے بہترین شوہر! الوداع! قیامت میں ملاقات تک خدا حافظ"

پھر وہ جس راستے سے آئی تھی چلی گئی۔ اب ان باتوں پر میں پیچ و تاب کہا رہا تھا کہ پھر کسی کی چاپ سنائی دی۔ میں درخت کے پیچھے چھپ گیا کہ دیکھوں اب کون آرہا ہے۔ چاند نکل چکا تھا ایک خوبصورت لڑکی روتی ہوئی نظر آئی اور اس لٹکے ہوئے نوجوان کی طرف چلی گئی اس کو درخت سے اتارا اور پیارے بھائی کہکر بڑی دیر تک لپٹی رہی۔ مجھے خیال گذرا کہ کہیں فرط غم سے اس نے بھی جان نہ دیدی ہو۔ میں اس کے قریب گیا اور اس کا سر اپنی گود میں لے لیا اور اس کے لئے خدا سے دعا مانگنے لگا وہ ہشیار ہوگئی اور حیرت کی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں رو رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ میں کس کے لئے رو رہا ہوں میں نے کہا کہ اس کے مظلوم شہید بھائی کے لئے رو رہا ہوں لڑکی کہنے لگی کہ بیشک وہ شہید ہے۔ ظالموں نے اس پر ظلم کیا۔ وہ قاتل نہ تھا۔ بلکہ اس نے اپنی عزت کی حفاظت کیلئے تلوار اٹھائی تھی میں نے اس سے کہا کہ کیا وہ پورا قصہ سنا سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ ہاں سن لیجئے :۔

"ہمارے گاؤں میں حاکم کا مالگذاری وصول کرنیوالا افسر آیا اور لوگوں سے وصول کرنا شروع کیا میں اپنے گھر میں کھڑی ہوئی تھی وہ میری طرف آیا۔ اور ایسی نظر ڈالی کہ میرا دل لرزنے لگا۔ اس نے پوچھا کہ بھائی کہاں ہے؟ میں نے پتہ بتا دیا۔ بھائی کے پاس اس وقت پیسے نہ تھے اس نے چاہا کہ کچھ ایام کی مہلت ملے۔ افسر نے کہا کہ اس شرط پر مہلت دیجا سکتی ہے جب میں بطور ضمانت حاکم کے پاس رکھی جاؤں میں ان بدبخت لڑکیوں کا حال سُن چکی ہوں جو اس طرح قصر حاکم میں داخل ہوئیں اور وہاں سے اپنا در عصمت کھو کر نکلیں۔ میرے بھائی نے کہا کہ ٹکس کی ادائی اپنی ذات پر لازم ہے اور وہ بطور ضمانت رہ سکتا ہے لیکن افسر میرے لیجانے پر مصر ہوگیا۔ بھائی کو غصہ آگیا عزت و ناموس پر دھبہ آتے دیکھ کر تلوار کھینچ لی اور یہ کہتے ہوئے کہ میری زندگی میری آبرو پر قربان ہے۔ اس نے اس زبان دراز کا سر قلم کر دیا۔ ساتھ کے سپاہیوں نے اسے

گرفتار کرلیا اور حاکم نے اسے یہ سزا دی"۔
" لڑکی نے کہا کہ آپ نے جہاں یہ ہمدردی کی ہے کیا قبر کھودنے میں بھی مدد دے سکتے ہیں" میں نے اس کی خواہش روتی ہوئی آنکھوں سے قبول کی اور ہمیشہ کے لئے عزت کی قربان گاہ پر قربان ہونیوالے شہید کو زمین میں چھپا دیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور روتی ہوئی واپس ہوگئی۔

میں رنج کی حالت میں کھڑا ہوا تھا کہ سنگسار کی ہوئی مظلوم لڑکی کی برہنہ لاش کو بھی سپرد زمین کردوں میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا اور اپنا رومال مظلوم پر اڑا دیا۔ اور قبر میں لٹا دیا۔ چاہتا تھا کہ زمین برابر کردوں۔ ایک جوان لڑکا قریب آیا۔ اور کہنے لگا کہ "کیا آپ مجھے اجازت دینگے کہ میں اس لڑکی کا آخری دیدار کرلوں۔ اور اس کو الوداع کہہ لوں" میں نے اس کی کیفیت دریافت کی کہ ان دونوں میں کیا تعلق تھا۔ اس نے کہنا شروع کیا" میں ہی وہ شخص ہوں جس کے ساتھ اس لڑکی پر تہمت لگائی تھی۔ اس نے کہا کہ لڑکی سے کبھی لغزش نہیں ہوئی بلکہ وہ پاک اور صاف تھی۔ اور یہاں کے ظالم قاضی کے ظلم نے اسے دنیا سے ہمیشہ کیلئے مٹا دیا اس نے کہا کہ بچپن ہی سے ہم دونوں میں محبت تھی جوان ہوکر وہ محبت پھلی پھولی۔ میں نے منگنی کے لئے اس کے باپ سے درخواست کی اس نے خوشی خوشی قبول کرلیا۔ ہماری شادی ہونے ہی والی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ لڑکی کو اپنی میراث کیلئے قاضی کے ہاں جانا پڑا۔ اس نے اسے دیکھ کر اس کے چچا کو جو دولت کا لالچی تھا پیام نکاح دیا۔ جس کو اس نے بخوشی منظور کرلیا۔ لڑکی نے ہر چند انکار کیا۔ لیکن اس کی کوئی بات سنی نہ گئی اور عقد کا دن آگیا۔ وہ میرے پاس بھاگ آئی۔ میں نے اسے ایک کمرہ میں چھپا دیا۔ قاضی اور اس کا چچا اسے ڈھونڈنے کے لئے میرے مکان میں گھس آئے۔ میں نے قطعی لاعلمی ظاہر کی۔ سپاہیوں نے دروازے توڑنے شروع کئے اور اسے نکال لیا عدالت میں ناجائز تعلقات کا الزام لگا کر اسے پیش کیا گیا۔ جہاں بغیر کچھ سنے کہے اسے سنگسار کی سزا دیدی گئی۔ وہ دیر تک روتا رہا اور زمین برابر کرکے جدھر سے آیا تھا واپس ہوگیا۔

میں نے اب یقین کرلیا کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔ حاکم، قاضی، اسقف اعظم تینوں کے تینوں بھی ظالم ہیں۔ اور خدا کے سامنے انہیں اپنے جرائم کا جواب دینا ہوگا۔ ان تینوں شہیدوں کا خون ضرور رنگ لائیگا۔

رات دو تہائی گذر چکی تھی میں نے دیکھا کہ مریخ[1] زمین سے قریب ہو رہا ہے۔ اندھیاں چلنے لگیں۔ بادل گرجنے لگے

1. Mars, God of war in greek mythology

بجلیاں چمکنے لگیں قدرت کی خوفناک روز زردن نے قیامت کا یقین دلایا۔ مریخ زمین سے قریب تر ہو رہا تھا اس میں سے ایک ہیبت ناک فرشتہ نکلا۔ ہر قسم کے ہتھیار سے مکمل تھا۔ درخت کے قریب اترا اپنا نیزہ ان مظلومین کے خون میں ڈبو دیا۔ اور انتہائی غضب میں کہنے لگا "ہاں انسان اپنی پرانی عادتوں پر آگیا۔ دنیا شر و فساد سے پُر ہوگئی ایک چپہ بھی ایسا نہیں جہاں خدا کے پاک فرشتے اپنا قدم رکھیں۔

قوی اور قوی ہوتے جا رہے ہیں کمزوروں کی کمزوری روز بروز بڑھ رہی ہے فقرا کے خون سے سینچے ہوئے ثمرات امرا کے تصرف میں آرہے ہیں غریبوں کا کوئی سہارا نہیں۔ اکثر بھوکے مرتے ہیں اور ان کی عزت و حرمت امیروں کے چشم عنایت پر منحصر ہے۔

امرا نے اللہ تعالیٰ سے خیانت شروع کر دی۔ وہ تلوار جو خدا نے انہیں عدل و انصاف قائم رکھنے کیلئے دی تھی وہ قوت جو انہیں امن و امان پیدا کرنے کیلئے عطا کیگئی تھی۔ انہوں نے اپنی لذائذ زندگی کے کامیاب بنانیکا آلہ بنالیا۔

قاضیوں کی طمع اور ظلم حد سے بڑھ چکا وہ قانون سے جس کی چاہتے ہیں حمایت کرتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ مذہب کے علم بردار اب دنیوی لیڈر بننے کی کوشش کر رہے ہیں وہ مال جو غریبوں سے یہ کہکر حاصل کیا گیا تھا اس سے فقرا کی مدد کی جائیگی اسے اپنے پیٹ بھرنے میں صرف کر رہے ہیں۔

افسوس! لوگ امرا کے طرفدار ہوگئے ہیں ان کی خواہشات کے مہیا کرنے کے لئے ممد و معاون بن رہے ہیں قاضیوں کے ظلم پر خوش ہونے والے اور مذہبی لوگوں کی چوریوں میں مدد دینے والے ہوگئے ہیں۔ خدائی انتقام قریب ہے۔ معابد ڈھائے جائینگے۔ شہر برباد ہوجائینگے۔ دنیا خون کے سمندر میں ڈوب جائیگی۔ شر و فساد پھیل جائیگا بچے یتیم ہونگے۔ عورتیں بیوہ۔ خدائے تعالیٰ ظلم نہیں کر رہا ہے بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔"

اس نے اپنی تقریر ختم ہی کی تھی کہ خون کے گڑھے میں جوش ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کہ زمین سے خون کے چشمہ ابل رہے ہیں۔ میں ڈر کر چبوترے پر چڑھ گیا۔ قریب تھا کہ میں ڈوب جاؤں۔ میں نے چیخ ماری۔

میری آنکھ کھل گئی لوگوں میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ آج جولائی ۱۹۱۴ء کی ۲۸ تاریخ تھی جنگ عظیم کا اعلان ہوچکا تھا۔ (Proclamation of war) (ترجمہ)

سُلطان ابن سعُود

(جناب ابو المکارم فیض محمد صاحب صدیقی - بی - اے)

---(۲)---

عرب ایک ریگستانی ملک ہے نہ وہاں کافی بارش ہوتی ہے اور نہ دریا ہیں نہ جنگل ہے نہ مرغزار جس طرف نظر اٹھاؤ سوائے ریگستان اور ریتلے ٹیلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میلوں نہ کوئی درخت نظر آتا ہے اور نہ پانی پینے کیلئے کوئی چشمہ ملتا ہے۔

کئی صدیوں تک عرب کے سرحدی ممالک تمدن کے معراج پر پہنچے اور پھر انہیں زوال ہوا۔ بے شمار سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں۔ مشرق میں دجلہ اور فرات کے کناروں پر بابل اور نینوا کی شاندار حکومتیں۔ ایران کی عظیم الشان ترقی۔ مغرب میں فرعون مصر کی عدیم المثال اور خدایانہ حکومت۔ ان کا جلال اور شان وشوکت۔ شمال میں فونیقیہ اور رومی سلطنت کا عروج اور پھر ان سب کا زوال ہماری کامیابی کا کافی ثبوت ہے۔

غرض عرب کے اطراف واکناف میں تمدن نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں۔ لیکن خود عرب اس سے کچھ بھی متاثر نہ ہوا۔ اور وہ جیسا تھا ویسا ہی رہا اور بیرونی ممالک کے لوگ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ البتہ تاجران کے زبانی عرب اور بالخصوص وسط عرب کے کچھ کچھ حالات معلوم ہو جاتے تھے لیکن ان کے بیانات بھی دلچسپ افسانوں سے کچھ کم نہ تھے۔ یوں تو تاجر کہا کرتے تھے کہ عرب میں بہت سی متمدن اقوام آباد ہیں۔ بڑے بڑے شہر ہیں اور بہت سی عجیب وغریب چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے بیان کی تصدیق کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ البتہ حقیقت اس وقت آشکارا ہوئی جب حضرت مسیح کی پیدائش سے قبل شاہ آگسٹس نے مصری گورنر کو سرزمین عرب کی چھان بین کیلئے روانہ کیا۔ اس نے تحقیقات کے بعد بتلایا کہ عرب ایک ریگستانی ملک ہے اور یہاں وحشی قبائل آباد ہیں۔ کھانے کو کھانا ہے اور نہ پینے کو پانی۔ چنانچہ مصری گورنر کے اکثر ساتھی بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر راستہ ہی میں ختم ہو گئے۔

عرب میں سوائے جہالت اور مظالم کے اور کچھ نہ تھا۔ اس کے باشندے ایسے ہی وحشی تھے پر زمین

افتادہ اور بنجر ہے۔ چند چشموں اور نخلستانوں پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا اور اسی کیلئے وہ خون کی ندیاں بہاتے تھے بت پرستی۔ افلاس۔ ریاکاری اور بدمعاشی کا بازار گرم تھا۔ ہر قبیلہ اور ہر شخص آزادی کا طالب اور خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کا دعویدار تھا۔ ان منتشر اور سر پھرے قبائل کو رام کرنا۔ اس کو ایک دوری میں منسلک کرنے اور ان پر حکومت کرنا۔ ماحول کے لحاظ سے کسی کے بس کی بات نہ تھی اور اس لئے صدیوں سے یہ اسی حالت میں غلطاں و پیچاں رہے۔

ایسے تاریک وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ربانی مشعل ہدایت لیکر عرب کی سرزمین پر تشریف لائے آپ نے چند سال کے اندر اندر عربوں کے منتشر قبائل میں اتحاد پیدا کیا۔ ان کو گناہوں سے روکا۔ اور سب کو ایک کردیا۔ دس سال کے اندر سارا ملک عرب آپ کے ساتھ ہوگیا۔ آپ کی تعلیمی تجلیات نے نہ صرف ظلمت کدہ عرب کو بقعہ نور بنادیا بلکہ اس کی ضیاباری کا اثر ساری دنیا پر پھیل گیا۔ آپ کے تابعین اور تبع تابعین دریائے فرات سے گذر کر ایران تک پہنچے۔ اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ شمال میں شام سے ہوکر ایشائے کوچک تک جا پہنچے۔ مغرب میں افریقی ساحل سے ہوتے ہوئے بحیرۂ اٹلانٹک اور پھر اسپین۔ فرانس۔ اور یورپ کے وسط میں پہنچ گئے اور ایک سو سال کے اندر مسلمانوں کی حکومت آبنائے جبل الطارق سے دریائے انڈس تک اور ادھر وسط افریقہ سے لیکر ایران تک پھیل گئی۔

لیکن جیسے جیسے اسلامی حکومت ترقی کرتی گئی۔ عرب اس کا مرکز نہیں رہا۔ بلکہ یکے بعد دیگرے دمشق۔ بغداد۔ اور قاہرہ اسلامی تمدن کے گہوارے بنتے گئے۔ اگرچہ یہ چراغ عرب میں روشن ہوا۔ اس نے سارے عالم میں اجالا پھیلا دیا۔ لیکن ایک صدی کے اندر ہی خود پھر سے تاریکی میں آگیا۔ اس کے بعد سے دنیا نے کئی کروٹیں بدلیں۔ لیکن عرب ان سب سے الگ تھلگ اور بے تعلق رہا اور پھر سے ایک مرتبہ اس پر غفلت کا نشہ طاری ہوگیا۔ ایک ہزار سال تک اس کی یہ حالت رہی۔ لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں ایک شخص محمدؐ بن عبدالوہاب پیدا ہوا۔ اور پھر اس نے اسلام کے اس بکھرے شیرازہ کو ایک جگہ کرنیکی کوشش کی۔

ابن عبدالوہاب ایک سخت مذہبی جوش والا انسان تھا۔ اسلام میں اعتقادات اور تکلفات کی جو فراوانی ہوگئی تھی اسے دور کرکے وہ اسلام کو اسی سادہ لباس میں دنیا کے آگے پیش کرنا چاہتا تھا۔ جس طرح سرکار دو عالم (م) نے

تعلیم فرمائی تھی۔ اہل عرب کو اس نے اس طرف متوجہ کیا وہ اس پر بری طرح بگڑے اور اس کے سخت دشمن ہوگئے۔ ابن عبدالوہاب نے دارالخلافہ نجد میں پناہ لی۔ یہاں محمد ابن سعود کی حکومت تھی۔

نجد عرب کا وسطی علاقہ ہے۔ یہاں کے باشندے بڑے جفاکش ہیں اس کے تین طرف ریگستان ہے اور ایک طرف وادیاں۔ ایک سطح مرتفع پر واقع ہے اس میں کئی گاؤں اور نخلستان ہیں اس سطح مرتفع کے وسط میں ایک زرخیز وادی ہے اس میں کافی پانی ہے اور کئی نخلستان اور بڑے بڑے باغ ہیں اس وادی میں شہر ریاض واقع ہے ریاض نجد کا مرکز ہے اور نجد عرب کا مرکز اس طرح سے جس کی حکومت نجد پر ہوگی وہ عرب پر اچھی طرح حکمرانی کرسکتا ہے۔

سعود داریہ اور ریاض کا امیر تھا۔ یہ بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس نے ابن عبدالوہاب کی حقیقی قیمت کو تاڑ لیا۔ اور اس سے اس امر کا پیمان کیا کہ وہ اور یہ دونوں مل کر عرب کے باشندوں کو سچے اسلام کی تعلیم دینگے۔ انہیں کامیابی یقینی تھی۔ سعود ایک بڑا سپاہی اور تلوار کا دھنی تھا اور ابن عبدالوہاب زبردست عالم اور مبلغ۔ سعود لڑتا اور یہ تبلیغ کرتا۔ عرب کے باشندوں پر اس کی تبلیغ کا گہرا اثر ہوا۔ روزہ اور نماز اور قرآن کے دیگر احکامات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جانے لگی۔ شراب اور تمباکو کی سخت ممانعت کردیگئی۔ یکے بعد دیگرے قبائل نے اس کی حکومت تسلیم کی۔ ان کے دشمنوں نے انہیں وہابی کہکر پکارنا شروع کیا لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی اور سات سال کے اندر تمام عرب پر یعنی خلیج فارس سے لیکر مکہ اور مدینہ تک اور پھر بحر ہند سے لیکر شام کے کوہ لبنان تک ان کی حکومت کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اب وہ ریگستان کے بادشاہ تھے خلیفہ اور ترکی کو مانتے نہ تھے انہیں کسی کی پرواہ نہ تھی وہ بلاخوف و خطر چوطرف چھاپے مارتے رہتے تھے۔ میسوپوٹیمیا پر حملہ کرکے انہوں نے کربلائے معلی کو مسمار کردیا۔ علی پر حملہ کرکے اسے باجگزار بنالیا اور دمشق کی سرحد پر اور مصر میں بھی ایک ہنگامہ مچا دیا۔ ترکوں نے خطرہ کو پہچان کر اپنے مصری گورنر محمد علی کو وہابیوں کی شکست کیلئے روانہ کیا۔ اس نے انہیں شکست دی۔ اور وہابی سردار کو پابہ زنجیر کرکے قسطنطنیہ روانہ کردیا جہاں ایا صوفیہ کی مسجد کے سامنے ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے اس کی گردن اڑادیگئی۔

وہابیوں کی حکومت گویا ہوا کا ایک جھونکہ تھی۔ جو آن واحد میں آیا اور چل دیا۔ پھر سے نجد اپنی اصلی

حالت پر آگیا۔ کوئی حوصلہ مند ایسا نہ تھا جو اسے متحد رکھتا۔ قبائل میں پھر انتشار پیدا ہو گیا۔ پھر وہ انفرادی آزادی اور خود مختاری کے طالب ہو گئے۔ باہمی نزاعات شروع ہو گئے۔ لوٹ مار قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ عرب گویا قتل و خون اور فساد کا مرکز بن گیا کسی کی جان امن میں نہ تھی۔ ہر شخص غیر مطمئن اور اپنے حریف کی جان لینے کے لئے تیار تھا۔

اس پُر آشوب اور ناگفتہ بہ زمانہ میں نومبر ۱۸۸۰ء میں مسعودی خاندان کے ایک رکن عبد الرحمٰن کی بیوی سارا کے بطن سے ریاض کے محل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام عبد العزیز رکھا گیا جو آگے چل کر اپنے اجداد کے نام سے ابن سعود مشہور ہو گیا۔

یادِ رفتگاں

(ذکا)

قدرت کا نظام بھی عجیب ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہی نہیں ہوتا اور جو نہیں چاہتا وہی ہوتا ہے۔ غالب ذکا کے فریفتہ تھے اور ذکا غالب کیلئے دیوانہ مگر اتفاق دیکھئے کہ زندگی میں یہ تمنا پوری نہ ہوئی جب ذکا کو غالب کے انتقال کی اطلاع ملی تو ایک بجلی تھی جو خرمن ہوش و صبر پہ گری۔ دونوں متاثر رہے۔ اسی عالم میں ذیل کا قطعہ کہا تھا اس کے بعد ذکا کو شعر و سخن کی وہ دلچسپی نہ رہی جو غالب کے زندگی میں تھی۔

میرے استاد معنوی غالب | جس کا ہر لفظ معنئ اعجاز
وحدہ لاشریک لہ کی قسم! | ایک فن سخن میں بے انباز
ایسی قسمت کہاں جو میں کرتا | پردۂ چشم صرف پا انداز
ہاں سنا ہے کہ اس کے تھے کردار | جیسے گفتار حافظ شیراز
ہند کا انوری و سعدی تھا! | متفق اس پہ ہیں سخن پرداز
کیا عجب ہے جو حرمت مے سے | بخش بھی دے کریم نکتہ نواز
بارے فردوس میں گیا مر کر | در رحمت بروسے روش باز
خود ہی فرما گیا ہے یہ مقطع! | پیش بینی کا دیکھنا انداز
اسد اللہ خاں تمام ہوا | وادریغا وہ رند شاہد باز
پہلے مصرعہ سے تا بہ آخر شعر | سال تاریخ کا ہے جلوہ طراز
عیب دانی صفت خدا کی ہے | اک عدد کی کمی میں تھا یہ راز

تحقیق سن فصلی

(مولانا عبدالواسع مرحوم پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

(بسلسلۂ گذشتہ)

لیکن ۸۰ اسال تک سنہ فصلی میں عمل کبیسہ نہ ہونیکی وجہ سے یہ انطباق بھی مفقود ہوگیا اور شاید سلطنت آصفیہ کے ارباب حل و عقد نے فصول کے معنی جغرافیائی موسم جاڑے گرمیاں برسات سمجھ لئے اور حیدرآباد کے عرض البلد کے لحاظ سے مقامی موسموں کی ابتداء وانتہا موجودہ مہینوں کی ابتداء وانتہا کے مطابق تھے یعنی موسم سرما یکم آذر سے شروع ہوکر آخر اسفندار کو ختم ہوتا ہے اور موسم گرما یکم فروردین سے شروع ہوکر اخیر تیر تک رہتا ہے اور زمانہ بارش یکم امرداد سے آخر آبان تک ہے اس لئے اس خرابی کی طرف نہ توجہ ہوئی اور نہ اس کی اصلاح کی کوشش کیگئی حالانکہ اس نقص کا رفع کرنا بھی ضروری امر تھا۔

خرابیوں کی اصلاح ہماری رائے میں ان دونوں خرابیوں کی اصلاح اسی طریقہ سے ہوسکتی ہے جو سترہویں صدی عیسوی کے شروع میں پوپ گری گوری نے سنہ عیسوی کے نوروز کے درستی کے لئے اختیار کیا تھا اور دس روز کا فرق نکالنے کے لئے ۵/دسمبر کو ۱۵/دسمبر کردیا تھا۔ سنہ فصلی کے اصلاح میں یہ طریقہ دو طور پر برتا جاسکتا ہے

۱- ۱۸/آبان یکم آبان قرار دے دی جائے اور سنہ فصلی کی ابتداء بجائے یکم آذر یکم آبان سے ہو اور آبان۔ آذر۔ دے تیس ۳۰ تیس ۳۰ دن کے۔ بہمن انتیس دن کا۔ اسفندار۔ فروردین تیس ۳۰ تیس ۳۰ دن کے بقیہ چھ مہینے اکتیس ۳۱ اکتیس ۳۱ دن کے کردئے جائیں اور امرداد میں عمل کبیسہ ہو یعنی معمولی برسوں میں وہ اکتیس دن کا رکھا جائے اور سال کبیسہ میں ۳۲ دن کا اس اصلاح سے ہمیشہ آفتاب اعتدال خریفی پر یکم آبان کو انقلاب شتوی پر یکم بہمن کو اعتدال ربیعی پر یکم اردی بہشت کو انقلاب صیفی پر یکم امرداد کو آئیگا اور تقریباً ایک ایک مہینے میں ایک ایک برج کو قطع کرتا رہیگا۔

۲- سنہ فصلی کے ابتداء بدستور یکم آذر سے رہے اور ۱۸/آبان یکم آذر قرار دی جائے اور آذر۔ دے۔ بہمن تیس ۳۰ تیس ۳۰ دن کے اسفندار ۲۹ دن کا فروردین اردی بہشت تیس تیس روز کے اور بقیہ چھ مہینے اکتیس

اکتیس دن کے رہیں اور کبیسہ کا عمل شہریور میں ہو یعنی شہریور سال کبیسہ میں ۳۲ دن کا معمولی برسوں میں ۳۱ دن کا رہے۔ اصلاح کی اس صورت میں ہمیشہ آفتاب اعتدال خریفی پر یکم آذر کو انقلاب شتوی پر یکم اسفندار کو اعتدال ربیعی پر یکم خورداد کو انقلاب صیفی پر یکم شہریور کو آئیگا۔

ان دونوں ترمیموں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کبیسہ کا عمل امرداد یا شہریور میں کر کے مہینوں کے ایام کی تعداد ۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-کیوں کر دی گئی حالانکہ اگر امرداد کے بجائے بہمن یا شہریور کے بجائے اسفندار میں عمل کبیسہ کیا جائے تو مہینوں کے ایام میں ۲۹-۳۰-۳۱-کا تناسب قایم رہ سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ علم ہیاۃ کے دشوار گذار حسابی راستوں کو طے کر چکے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے اس لئے کہ نقطہ راس شمسی دائرۃ البروج کے حصہ شتوی میں اور ذنب شمسی حصہ صیفی میں واقع ہے لہذا جب آفتاب ماہ بہمن یا اسفندار میں نقطہ راس سے قریب برج جدی میں ہوگا تو اس کی رفتار بہت تیز نظر آئیگی اور وہ کبھی ۲۹ دن سے زیادہ عرصہ میں برج جدی کو قطع نہ کریگا اس لئے ماہ بہمن یا اسفندار ہمیشہ ۲۹ دن کا رہنا چاہئے اور جب آفتاب ماہ امرداد یا شہریور میں ذنب شمسی کے قریب ہوگا۔ تو وہ بہت سست رو دکہائی پڑیگا اور برج سرطان کو ۳۱ اور ۳۲ دن کے درمیانی زمانہ میں قطع کریگا اس وجہ ماہ امرداد یا شہریور کو کبھی ۳۱ اور کبھی ۳۲ دن کا ہونا چاہئے اور عمل کبیسہ اسی مہینہ میں ہونا چاہئے۔

ان دونوں ترمیموں میں اگر پہلی ترمیم عمل میں آئی تو سنہ فصلی کے مہینوں اور سنہ الہٰی جلالی کے مہینوں میں ایک مہینہ کا فرق رہیگا اور سنہ فصلی کے یکم اردی بہشت کو سنہ الہٰی وجلالی کی یکم فروردین یعنی نو روز ہوگا اور صرف ۱۷ روز کے زیادتی سے حساب سنوی درست ہو جائیگا۔ مگر سنہ کی ابتداء بجائے آذر آبان سے ہوگی۔ اور اگر دوسری ترمیم پر عمل ہوا تو وہ ماہ ہائے سنہ فصلی اور سنہ الہٰی وجلالی کے مہینوں میں دو مہینوں کا تفاوت ہو جائیگا اور یکم خورداد سنہ فصلی کو یکم فروردین سنہ الہی وجلالی یعنی نو روز ہوگا۔ اور تیرہ دن کی کمی سے حساب سنوی کی اصلاح ہو جائیگی لیکن سال کی ابتداء بدستور ماہ آذر سے رہیگی۔ ان وجوہ سے ان دونوں ترمیموں میں ترمیم اول ہماری رائے میں زیادہ مناسب ہے۔

سب سے بہتر اصلاح | سابقہ دونوں ترمیموں کو پیش کرتے ہوئے ترمیم اول کو صرف اس وجہ سے ترجیح دیگئی ہے کہ

ابتدا سال میں ایک مہینہ سے زیادہ کی کمی زیادتی نہ کرنا پڑے اگر اس بات سے قطع نظر کر لیجائے تو بہتر طریقہ اصلاح یہ ہے کہ ترمیم اول پر عمل کیا جائے مگر یکم آذر کے بجائے یکم امرداد سے جب آفتاب نقطہ انقلاب ستوی پر پہنچے سال کی ابتدا کی جائے اور سنہ فصلی کا مبدا وہی باقی رکھا جائے جو سنہ پروبری کے دوبارہ رائج کرنے کے وقت مقرر کیا گیا تھا اس صورت میں اس فائدہ کے علاوہ کہ سنہ اپنی اصلی سابقہ حالت پر آجائیگا بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ سلطنت آصفیہ کے زراعتی سال تعلیمی سال۔ دفتری سال تینوں کی ابتداء و انتہا سنہ فصلی کی ابتداء و انتہا پر منطبق ہوجائیگی۔ اور موجودہ اختلاف مٹ جائیگا۔

استدعا | ہم اس رسالہ کو ختم کرتے ہوئے عالیجناب معین المہام بہادر فینانس اور جناب صدر المہام بہادر پولٹیکل سے مستدعی ہیں کہ وہ اصلاحات مندرجہ کے طرف اپنی خاص توجہ مبذول فرمائینگے تاکہ سلطنت آصفیہ کے سرکاری سنہ میں جو آج نقائص ہیں وہ رفع ہوجائیں اور ہم ہر دم تہ دل سے یہ دعا کرتے ہیں کہ :—

روز افزوں ہو مرے شاہ کا جاہ و اقبال
دوست شاداں رہیں سرکار کے دشمن پامال

—— خادم قوم۔ محمد عبد الواسع صفا۔

"ابطال مادیت"۔ از ڈاکٹر ولی الدین ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر جامعہ عثمانیہ | اس مختصر سی کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے مادیت کیخلاف بحث کی ہے۔ مادیت ایک قدیم نظریہ ہے جو کئی سو سال قبل مسیح سے لیکر آج تک برابر چلا آرہا ہے۔ البتہ سائنس کے انکشافات نے وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلیاں کی ہیں جن کا اجمالی ذکر ڈاکٹر صاحب نے شروع میں کیا ہے پھر مادیت کے نظریہ کے لحاظ سے کائنات کی تصویر پیش کی ہے اس کے بعد تنقید شروع کی ہے جو در اصل کتاب کا موضوع ہے مادہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے صفات اور ذہن کی توجیہ مادیت کے نظریہ میں تلاش کی ہے لیکن مادیت تو انکی توجیہ کی بجائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاف کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتی ہے حالانکہ ان کے وجود سے انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔

واقعہ ہے کہ مادیت کائنات کی ہر شئے کو روحانیت سے علحدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی سائنس کی اس روز افزوں ترقی کے باوجود بھی فلسفے کے ہر سوال پر مادیت کا قائل دو اور دو چار کر چار نہیں بتلا سکتا بلکہ جدید ترین نظریات نے حقیقت شئے کو روحانیت پر مشتمل کیا۔ نہیں تو کم از کم اتنا کہنا پڑا کہ حقیقت مادی نہیں ہے۔ اس لئے توجیہ کے ناقابل۔ کتاب مفید اور دلچسپ ہے۔

نپولین کی شادی

جناب ہادی جعفری

شہاب کا بار کا شکر یہ! عقد کی وجہ شہاب کو گذشتہ مہینہ نہیں بھولا۔ بلکہ نپولین کی شادی میں کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ بزم شہاب سے غیر حاضر رہنا پڑا۔ میری آنکھوں نے وہاں جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اس کا قارئین شہاب تک نہ پہنچانا ظلم ہوگا۔

آپ تعجب کرینگے کہ چند روز قبل روزنامہ رہبر میں نپولین کا جنازہ شائع ہوا ہے۔ پہلے جنازہ اور بعد شادی! یہ کچھ اپنی آزمائی بات ہے کہ جب حسرتوں اور ارمانوں کا جنازہ نکلتا ہے تو تب کہیں اوسی دل میں آرزوئیں اور تمنائیں بستی ہیں!

نپولین کی دو شادیاں ہوئی تھیں حقیقی معنوں میں مریا لوئیس ملکہ سے۔ جوزیفین سے اس کی شادی محض ایک خوشگوار خواب تھا لیکن اسی شادی نے جو گہرے نقوش نپولین کے دل پر چھوڑے تھے وہ آخر تک مٹ نہ سکے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو آئندہ صحبت میں طلاق کے واقعات ارسال کئے جائیں۔

"ہادی"۔

ایک روز جب کہ نپولین بھوکا پیاسا میڈم پرمنس ہوٹل پر کھانا کھانے کیلئے گاڑی سے اتر رہا تھا کہ ایک عورت نے جس کے گود میں ایک مردہ بچہ تھا اس کو یوں مخاطب کیا "جناب اگر آپ میری مدد نہ کرینگے تو میں اپنے بچوں سمیت ڈوب جاؤں گی"۔ اس دلیرانہ گفتگو سے نپولین متعجب ہوا اور جب حالات دریافت کئے تو پتہ چلا کہ وہ بوہانے BEAUHARNIS کی بیوہ جوزیفین ہے جو انقلاب فرانس میں مارا گیا۔ اب حالت اس درجہ پہنچ گئی ہے کہ قوت بسری کا کوئی ذریعہ نہیں ہے افلاس نے یہاں تک ساتھ دیا کہ اس کا دودھ خشک ہو گیا ہے جس کی شہادت گود میں مردہ بچہ ہے دو اور چھوٹے بچے گھر میں گرسنگی کی وجہ سے نیم بیہوشی کی حالت میں ہیں وہ بھکارن نہیں بلکہ ایک امیر کی بیوہ ہے مگر زمانہ کے ہاتھوں تنگ آ گئی ہے۔ نپولین کو اس کی حالت پر ترس آیا۔ کچھ رقم دی اور آئندہ مدد دینے کا وعدہ کر کے ہوٹل میں چلا گیا۔ یہی جذبہ ہمدردی تھا جس نے نپولین کو فرانس میں ہردلعزیز بنا دیا۔

نپولین دوراندیشی کے تقاضہ پر کہ کہیں ملک میں پھر طوائف الملوکی نہ ہو جائے لوگوں کو بے ہتھیار کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں بوہانے کی بھی ایک تلوار آ گئی ایک روز یوژین EUGENE جو ایک نہایت ہی ذہین لڑکا تھا نپولین کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کچھ اس طرح اپنے باپ کی تلوار کیلئے درخواست کی کہ نپولین انکار نہ کر سکا۔ لڑکا جب مکان

لوٹا تو ساری داستان اپنی ماں کو سنائی۔ ماں کو نپولین کے اخلاق پر حیرت ہوئی اور شکر یہ ادا کرنے کیلئے ایک مرتبہ پھر نپولین کے پاس آئی جب کہ اس کا لباس بالکل سیاہ تھا۔ سارا جسم ڈھکا ہوا ہے البتہ صرف چہرہ کھلا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کالی گھٹاؤں سے چاند آہستہ آہستہ نکل رہا ہے۔ آواز میں موسیقیت چال میں لوچ تھا۔ نپولین نے بتدریج ان کی مدد کرنی شروع کی اور باہمی ارتباط بڑھتا گیا روزانہ کی آمد و رفت سے نپولین کے دل میں جوزفین کی محبت منتقل ہونے لگی۔

بیرس BARRAS جوزفین کا دوست اور ہمدرد تھا یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح نپولین اور جوزفین کی شادی ہوجائے کیونکہ یہ رشتہ نپولین کو سوسائٹی میں ممتاز کردیگا اور اس کی قوت بڑھجائیگی۔ آخر کار بیرس کی کوشش بارآور ہوئی اور ۹ مارچ ۱۷۹۶ء کو دونوں کی شادی ہوگئی۔ دونوں خوش تھے اور اتنے خوش کہ ایک دوسرے سے محبت کرنا ان کا ایمان تھا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ فرانس میں شادی کوئی مذہبی وقعت رکھتی نہ تھی یہ ایک کھلونہ تھا جب تک جی چاہا کھیلا اور جب جی چاہا توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ انقلاب فرانس نے گرجوں کو بند کردیا۔ پادریوں کو جلاوطن اور خدا کو تخت خدائی سے اتار دیا تھا۔ تکمیل شادی کیلئے اب صرف دو تین گواہ عدالت فرانس میں کافی تھے اسی معمولی سی رسم نے نپولین اور جوزفین کو ایک دوسرے کا شریک حیات بنادیا۔ مگر اس رسم سے دونوں کو اطمینان نہ ہوا۔

جب نپولین شہنشاہ فرانس ہوگیا تو اس کے قائم کردہ اصول کے مطابق کارڈنل فیش FESCH کا یہ خیال ہوا کہ دونوں کی پھر شاہانہ طریقہ پر از سرِ نو شادی ہوجائے چنانچہ پھر دونوں کی شادی ہوئی اور نپولین کے ساتھ جوزفین کو بھی تاج پہنایا گیا۔ اس روز تمام پیرس میں ایک جشن منایا گیا۔ ناٹری ڈیم کے گرجے کو نہایت ہی شاندار طریقہ سے آراستہ کیا گیا۔ شہنشاہ اور ملکہ دونوں خوش تھے اور سمجھتے تھے کہ دنیا کا حقیقی سرمایہ عیش و نشاط ان کے قبضہ و اقتدار میں ہے مگر چند روز بعد دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔ کیونکہ ہر کانے رالر دالے کچھ ایسی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں جس کے سلجھانے کے لئے نپولین کو جوزفین کے طلاق دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نپولین کو جوزفین سے کوئی اولاد نہ تھی چونکہ ایک دفعہ خود نپولین نے کہا "اگر مجھ کو جوزفین سے اولاد ہوتی تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت سمجھتا اور مجھے یقین ہو جاتا کہ میرے بعد دنیا میں میرا نام باقی رہیگا۔"

فرانس والے اس کو میرپالوئی کے لڑکے سے زیادہ محبت کرتے اور میں اپنا قدم کبھی اس غار پر نہ ڈالنا جو پھولوں سے

ڈھکا ہوا تھا۔ میری پیاری جوزیفین کو بھی اس کا سخت رنج ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ بغیر اولاد کے شادی حقیقی معنوں میں شادی نہیں ہوسکتی ہے" آخرکار ۱۵ ڈسمبر ۱۸۰۹ء کو نپولین نے جوزیفین کو طلاق دیدی جس کے حالات ہم کسی اور صحبت کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔

جوزیفین کے طلاق کے بعد یہ سوال درپیش ہوا کہ آئیندہ ملکہ فرانس کیلئے کس کو منتخب کیا جائے۔ بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد ۲۱ جنوری ۱۸۱۰ء کو ٹوئی لی ریز TuiLERIES میں ایک کانسل منعقد کیگئی مریالوئیس MARIA LOUISE شہزادی آسٹریا کو پسند کیا گیا دونوں طرف شادی کی وسیع پیمانہ پر تیاریاں شروع کیں۔ برتھی آے BERTHIER کو نپولین کی جانب سے پیغامبر بناکر بھیجا گیا۔ شہنشاہ نے آرک ڈیوک چارلس کو رسم شادی میں اپنا نمائیندہ بناکر روانہ کیا۔

۱۱ مئی ۱۸۱۰ء کو ویانا VIENNA. میں رسم شادی منائی گئی۔ ویانا نہایت ہی شاندار طریقہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ تمام شہر آئینہ بند کیا گیا جس سے آنکھیں چوندھیا جاتی تھیں۔ سڑکوں پر جہاں تک نظر کام کرتی تھی زربرق ملبوس میں لوگ دکھائی دیتے تھے جن کے چہرے مسرت سے شگفتہ تھے نازآفریں لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے لئے ہوئے شادمان پھر رہی تھیں۔ چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد میریالوئیس کو نہایت ہی تزک و احتشام سے فرانس میں لایا گیا اور یہ طے پایا تھا کہ شاہی محل کیامپین COMPIEGNE میں وہ نپولین سے ملاقات کرے۔ نپولین میورٹ MURAT. کو ساتھ لیکر راستہ ہی میں ملاقات کرنے چلا۔ دونوں نے ایکدوسرے کو ابتک نہ دیکھا تھا جب دونوں جلوس قریب پہنچے تو نپولین اپنی گاڑی سے کود کر دولہن کی گاڑی میں گیا۔ اور اس کو سینے سے لگالیا۔ ملکہ نے شہنشاہ کو دیکھ کر کہا "مصور نے آپ کے حق میں سخت ناانصافی کی ہے"

نپولین نے دوسرے تحائف کے علاوہ چھ ہزار لڑکیوں کو جو دولہن کے جلو میں آئی تھیں ہر ایک کو سات سو فرانک دے اور حکم دیا کہ شاہی فوج کے بہادر اور خوش خلق سپاہیوں سے ان کی شادیاں کردی جائیں۔ تاکہ اس رشتہ محبت کی گرہ اور استوار ہوجائے

تین روز تک یہ برات محل کیامپین میں رہی پہلی اپریل کو سینٹ کلاوڈ ST CLOUD. کے گرجے میں سیول میارج ہوئی۔ دوسرے دن یہ برات پریس میں داخل ہوئی یہ جلوس نہایت ہی اہتمام سے شانزالیزے

CHAMPELYSEES سے ہوتا ہوا محل ٹوی ای لیبز ہیں لایا گیا۔ ملکہ کا ہاتھ پکڑ کر نپولین گاڑی سے رانس کے امراء دو صفوں میں دست بستہ کھڑے تھے۔ رات میں اس قدر شاندار پیمانہ پر جشن منایا گیا کہ مدتوں تک سے تمام رنج و فکر کافور ہو گیا۔ چونکہ تلوار نیام میں تھی اور پھر ایک مرتبہ یورپ میں امن و امان تھا۔ شادی کی گھنٹوں ی کے نغموں نے جوزیفین کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا جب جشن شادی منایا جا رہا تھا۔ جوزیفین اپنے کمرہ میں بیٹھی اپنی ہی کا ماتم کر رہی تھی۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک تھی۔ نپولین کو بیوفا سمجھنا ایک فاش غلطی ہے ہمیں یہ خیال نہ کرنا لہ نپولین کو جوزیفین سے محبت نہ تھی نہیں بلکہ وہ اس کو دل سے چاہتا مگر طلاق دینے کے لئے وہ بے انتہا مجبوریوں بنا ہوا تھا۔ ایسے وقت بھی نپولین جوزیفین کو بھولا نہیں نپولین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی شادی سے جوزیفین صدمہ پہنچے گا۔ اس نے جوزیفین کو محل مال میںس MAL MAISON میں بھیج دیا۔ آخری عمر تک میریالوئیس کے ساتھ تھی جب زمانہ نے پلٹا کھایا اور نپولین سنٹ ہلینا بھیجدیا گیا تو مریالوئیس ساتھ نہ جا سکی لیکن باہمی محبت بدستور باقی تھی جب اس دنیا سے نپولین ہمیشہ کیلئے رخصت ہو رہا تھا اوس کے لبوں پر آخری یہ تھے "میرا دل تیزاب میں ڈال کر مریالوئی کو بھیجدینا کہ ایک سچے چاہنے والے کا آخری تحفہ محبت قبول کرے"۔

غزل

جناب امین الحسن صاحب بسمل ناظم عدالت گلبرگہ

وہ دکھا دیں جو کبھی روئے مصفا اپنا ، کچھ نہ سوجھے مہ کامل کو پرایا اپنا

خود پسندی کی ادا لائی ہے گلشن میں ادھیں ، دیکھتے ہیں وہ گل تر میں سراپا اپنا

اب زمانہ کو ہے پندار کی مجھ سے امید ، کر چکا جب کہ جنوں ہوش سے سودا اپنا

سارے عالم کی نگاہوں میں ہیں جلوے تیرے ، بس بس اے حسن ازل رہنے دے پردا اپنا

مجھ پہ الزام ہے خود محو ہوئے جاتے ہیں ، دیکھ پایا ہے جو مہتاب میں نفتا اپنا

مرض عشق سے خود ہی شفا آنے لگی ! ، کر چکا کام جو کرنا تھا مسیحا اپنا

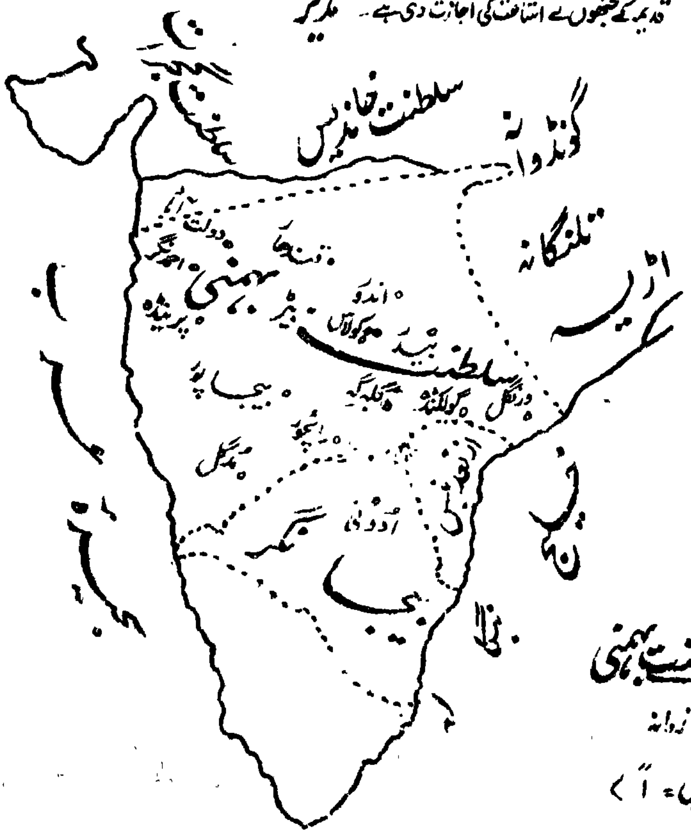
پھر ہو بسمل کو وہی کیفیت مہی مدہوشی ، ہاں دکھا شعبدہ اے نرگس شہلا اپنا

بیدر

(جناب محمد ناصر حسین صاحب صدیقی (عثمانیہ)

ذیل کا مضمون غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد دکن کی انگریزی کتاب THE ANTIQUITIES of BIDAR. کا ترجمہ ہے جو آج سے اٹھارا سال پیشتر لکھی گئی تھی اس عرصہ میں بیدر میں بہت سے اکتشافات عمل میں آچکے ہیں جن سے عمارات کی کیفیت جو مضمون میں درج ہے بعض بعض موقع پر بدل گئی ہے۔

چونکہ مضمون دلچسپ ہے اس لیے محمد ناصر الدین صاحب صدیقی نے ترجمہ کر کے بھجوایا ہے۔ ہم ممنون ہیں ناظم صاحب آثار قدیمہ کے جنھوں نے اشاعت کی اجازت دی ہے۔ "مدیر"



نقشہ سلطنت بہمنی

عروج کا زمانہ

(پیمانہ ۱۵۰ میل = ۱")

شہر بیدر خوبصورت سطح مرتفع پر واقع ہے یہ سطح سمندر سے ۲۳۳۰ ۲ بلند ہے۔ اس کا محل وقوع قابل تعریف اور آب و ہوا خوشگوار ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں عہد قدیم ہی سے اس کے متعلق افسانے لکھے گئے شعرانے اس کی مدح میں قصائد لکھے اور دنیائے قدیم میں اسے ممتاز جگہ حاصل تھی ہمیں اس واقعہ کا بھی علم ہے کہ کس طرح مالوہ کے ہمایہ عشق راجہ نل نے خوبصورت شہزادی دمینتی سے اپنے عشق کا اظہار کیا تھا اور اس کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی تھی " اس کا قدر کنول کا سا ہے اور اس کی آنکھیں رسیلی ہیں "۔ نل اور دمینتی کا یہ قصہ مہابھارت میں بھی محفوظ ہے اور اس کو فیضی نے لاثانی طور پر بڑے دلچسپ طریقے سے لکھا جس کی وجہ سے اس قصہ نے بڑی شہرت پائی۔ فیضی دربار اکبر کا ملک الشعرا تھا اور اسے دوہرے قافیے کے اشعار لکھنے میں بڑا ملکہ تھا۔ مہابھارت میں ایک اور جگہ کرشنا دیوتا کے محبت کی۔ رآ دکمن والی دربھا کی بہن سے عشق کا ذکر کیا گیا ہے جس نے دوسرے دیوتاؤں کے طنز سے تنگ آکر دنیا کو چھوڑ دیا اور بھگتی کے جنگلوں میں رہنے لگا کچھ عرصہ بعد اسی خطہ کے " شیریں آواز " اور " پری چہرہ " کے حالات کا علم ہوتا ہے جنھوں نے شہزادہ علاؤالدین کے نرم دل کو موہ لیا تھا مگر اس کی پہلی بیوی ملکہ جہاں کی طنز آمیز گفتگو بھی ہمارے کانوں میں گونجتی ہے۔

اس شہر کی ابتدائی حقیقت بالکل افسانوں میں چھپی ہوئی ہے جس کو بعد میں شاہان بہمنیہ اور بریدشاہیہ کا دارالخلافہ بنا تھا۔ اب یہاں بہت سے مقابر عبادت گاہیں جو اپنی عظمت و شوکت کے لحاظ سے غرناطہ اور کردوا Cordova کا مقابلہ کرتے ہیں یہاں کے مشہور یادگاروں کا تفصیلی حالات بیان کرنے سے قبل یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مختصر تاریخی حالات بیان کئے جائیں تاکہ ان بادشاہوں اور خاندانوں کا ذہن میں نقشہ کھینچ جائے جن کے قبضہ و تصرف میں بیدر تھا۔

تاریخ

موجودہ کتبات اور سکوں کے عمیق مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عہد عتیق میں وہاں ودربھا کی حکومت تھی جس کا سنسکرت ادب میں متعدد بار ذکر آیا ہے اور غالباً اس کی مملکت میں برار اور خاندیس شامل ہونگے لیکن بڑے تعجب خیز طریقہ سے بیدر جیسے اہم شہر کی بنا پڑی۔ فرشتہ اور محمد صالح کا بیان ہے کہ بیدر رایانان دکن کی راجدھانی تھا۔ مگر خود ان کے پاس کوئی مستند ثبوت نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد قصوں اور افسانوں پر ہے۔

غالباً مسلمانوں کا سب سے پہلا حملہ ۱۳۲۳ء[۳] میں ہوا جس کی قیادت محمد تغلق کر رہا تھا جو اس وقت شہزادہ الف خاں کے نام سے مشہور تھا اس زمانہ میں یہ صوبہ نہایت زرخیز تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بیدر کی تاریخ اسلامی فتوحات دکن کے بعد سے شروع ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ اورنگ زیب کے زمانہ ۱۶۸۶ء[۴] تک قایم رہتا ہے جس نے آخرکار فتح کرکے اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا۔

۱۳۳۹ء میں نصرت خاں جس نے بیدر کی مالگذاری کو ایک کروڑ سالانہ ظاہر کیا تھا مگر اس قدر خطیر رقم خزانہ میں داخل کرنے سے عاجز تھا اس لئے بغاوت شروع کی لیکن قتلغ خاں کو دولت آباد سے اس کے خلاف روانہ کیا گیا جس نے اسے عہدہ سے معزول کردیا۔ کچھ عرصہ بعد دولت آباد سے امیر صدہ میں سے ایک کو وصول مالگذاری کے لئے روانہ کیا گیا مگر اسے کوئی قانونی قوت ایسی دکھائی نہ دی جو اسے مغلوب کرسکے۔ اس نے گلبرگہ اور بیدر میں ایک لشکر فراہم کرنا شروع کیا یہ ۱۳۴۱ء[۵] کا واقعہ ہے۔ محمد تغلق نے اس موقع پر بھی قتلغ خان کو بغاوت کے فرو کرنے کیلئے روانہ کیا اور جب وہ نواح بیدر پہنچا تو امیر علی سے معرکہ آرائی ہوئی جس میں امیر علی کو شکست ہوئی اور دروازے بند کرکے محصور ہوجانا پڑا۔ بہت جلد امیر علی کو قلعہ قتلغ خاں کے حوالہ کردینا پڑا۔ اور اسے قیدی کی حیثیت سے شہنشاہی دربار کو روانہ کیا گیا

۱۳۴۷ء میں ظفر خاں جس نے بعد میں علاؤالدین شاہ بہمنی اول کے نام سے شہرت پائی۔ بیس ہزار سواروں کے ساتھ نواح بیدر میں نمودار ہوا۔ مگر اس وقت تک حملہ نہیں کیا جب تک کہ ایک بڑی فوج اس کی مدد کیلئے راجہ ورنگل[۶] کے پاس سے نہ آگئی اس کے بعد ایک لڑائی ہوئی جس میں شاہ پسندوں کو شکست ہوئی اور محمد تغلق کا داماد عماد الملک لڑائی میں کام آیا۔ بعد ازاں ظفر خاں کو ناصر الدین اسمٰعیل کی تحریک پر دکن کے عام باشندوں نے بھی بلا رد و قدح اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا اس نئے بادشاہ نے اپنی مملکت کے چار صوبے بنائے جن میں سے بیدر بھی ایک تھا اور یہاں کے گورنر کو اعظم ہمایوں[۷] کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

سلاطین بہمنیہ کی حکومت قائم ہوجانے کے بعد ۱۴۲۹ء تک تاریخ میں بیدر کا کوئی ذکر نہیں ہے اور اسی سنہ میں احمد شاہ ولی دسویں سلطان خاندان بہمنیہ نے اسے اپنا دار السلطنت بنایا اس موقع پر خافی خاں

---

۳ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ (۴۰۵) ۴ برگس تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ (۴۲۹)، ۵ خافی خان منتخب اللباب جلد سوم صفحہ (۱۲۰) ببلوگرافیکل انڈکس اور برگس فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۸۹ ۶ ایلیٹ اور ڈوسن کی تاریخ ہند جلد ۸ صفحہ ۱۲۶ - ۷ برگس فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۹۵-۹۶-

احمد شاہ کے اس انتخاب کے متعلق ایک دلچسپ قصہ بیان کرتا ہے گو موجودہ مورخین اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مشرق میں جہاں بادشاہوں کے شخصی خیالات کام کرتے ہوں ایسے قصہ کی بناد پر دار السلطنت کا تبدیل کرنا ناممکن نہیں ہے میں اس واقعہ کو بجنسہٖ نقل کرتا ہوں۔

جب کہ بادشاہ (احمد شاہ ولی) پرانڈہ کے نواح میں داخل ہوا۔ تو ایک شکاری کتے کو ایک لومڑی کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا ایک لومڑی دوڑ کے بعد جب کہ کتے کو اپنے شکار پر پورا قابو حاصل ہونیوالا تھا اور اس وقت لومڑی کی جان سخت خطرہ میں تھی مگر اس وقت غصہ ہوکر لومڑی نے کتے پر حملہ کردیا[1] بادشاہ اس سے بیحد متاثر ہوا اور لومڑی کی شیر جیسی بہادری دیکھ کر اور وہاں کی آب و ہوا کو پسند کر کے یہ فیصلہ کیا کہ وہاں عظیم الشان محلات کے ساتھ ساتھ ایک شہر کی تعمیر کیجانی چاہئے اس کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے اسے احمد آباد بیدر کا نام دیا اور اسے اپنا دار الخلافہ بنایا۔

میڈوز ٹیلر نے وہاں کی تعمیر اور محل وقوع کا بیان اس طرح کیا ہے "بیدر سے بڑھ کر کوئی شہر خوبصورتی اور صحت افزا نہیں ہے" اس کی وسطی حالت اور بلندی کی بدولت اسے بہت سے فوائد بہ نسبت قدیم دار السلطنت گلبرگہ حاصل تھے اور جب یہ ایک دفعہ دار السلطنت بنا تو مغلوں کے سلطنت میں داخل ہونے کے قبل تک ایک فیع المرتبت شہر بنا رہا ہمعصر مورخ اس کی بڑھتی ہوئی ترقی کے متعلق یوں رقمطراز ہے "آناً فاناً جادو کے شہر کی طرح گلبرگہ کے شمال میں عمارات کا بےنظیر سلسلہ قایم ہوگیا۔ احمد آباد بیدر سے جامع مسجد کی نظیر عرصہ دراز تک کہیں نہ تھی اور بڑا خوبصورتی ہاتھی دانت ( ) کی مسجد کی تھی جس کے مرصع نقش و نگار سے سیاحوں کو چھپا معلوم ہوتا تھا اور مشرقیوں کی عظمت کا سکہ بیٹھتا تھا سنہ ۸۳۲ھ (۱۴۳۲ء) میں اس قلعہ کی تکمیل ہوئی اور فرشتہ کے قول کے مطابق بادشاہ نے عام خوشی منانے کا حکم دیا۔

۸۳۹ھ احمد شاہ ولی کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا علاؤالدین شاہ بیدر میں تخت نشین ہوا اس بادشاہ نے شہر کو مزید آراستہ و پیراستہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ عالیشان محلات۔ پرفضا باغات بنوائے خیراتی مدارس کا اجرا کیا ان کے لئے زمینات اور انعامات وقف کئے (باقی دارد)

[1] منتخب اللباب جلد سوم صفحہ ۱۷۔

شہاب

جلد (۳) آبان ۱۳۴۴ف ستمبر ۱۹۳۵ع نمبر A

مرتبہ

عوام سے (للعہ) محمد عبدالرزاق بسمل گورنمنٹ سے (عنہ)

(برقی پریس رہبر میں چھپکر دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن شایع ہوا)

ھ

امانت

(مولٰنا امجد)

۲۷ر شہریور ۱۳۴۲ف کو بزم ادب نظام کالج کے افتتاحیہ جلسہ میں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کے ساتھ یہ موضعیف بھی پکڑا گیا۔ اس بزم ادب کیلئے ہم نے کوئی خاص نظم تو نہ لکھی تھی۔ اسلئے بزم حضرت "رب" میں جو نظم پڑھی گئی تھی۔ بزم ادب میں سنادی گئی جواب ہمارے دوست مولوی مستمل صاحب کے اصرار پر شہاب کیلئے بھیج رہا ہوں۔ وھوا ہذا۔ ۔امجد۔

انّا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال ۔ الخ

تو ہے مجھے بزم میں بلانے والا	میں ہوں تری بارگہ میں آنے والا
ظالم ہوں، جہول ہوں، سیہ کار ہوں میں	کس منہ سے کہوں ترا طلبگار ہوں میں
ہوں بحر عظیم میں، مثال خاشاک	اک قطرہ ہے میری ہستی، وہ بھی ناپاک
میں کیا ہوں، جبال و آسماں کے آگے	کیا گرد کا ذکر، کارروان کے آگے
اے لو وہ عرضنا کی صدا گونج اٹھی	انا کے جلال سے فضا گونج اٹھی
سب ہٹ گئے پیچھے، ڈر کے، آنے والے	کترا گئے صاف سر اٹھانے والے
اٹھی نہیں جب کہیں سے کوئی آواز	جب کوئی ہوا نہ اُس صدا کا دمساز
میری غیرت میں ایک طوفان اٹھا	یعنی لبیک کہہ کے انسان اٹھا

سر دیدیا میں نے آبرو کی خاطر
ٹھکرا دیا میں نے، میں کو، تو کی خاطر

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے	کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی	سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

یورپ کی دلچسپ ڈاک

(جناب نواب شہید یار جنگ بہادر)

Hotel Negresco
Nice.

۴ جون ۲ ربیع الاول روز سہ شنبہ

ضبط الفت کی قسم کھاتا ہوں لیکن کیا کروں　　جان کھاجاتے ہیں آرشد پوچھنے والے مرے

کرم فرمائے شہید ! سلام مسنون ۔ کہئے صاحب ہماری اس غلطی کا کہ ہم نے محض مروت سے مجبور ہوکر آپکے ارشاد کی تعمیل کر دی ۔کب تک خمیازہ بھگتنا پڑیگا ۔گاہے گاہے حالات لکھنے کا وعدہ تھا آپ نے مسلسل مضمون نگار قرار دے لیا ۔ صلہ نہ شد بلا شد ۔ بندہ خدا چھ خط روانہ کرچکا ہوں ۔خدا معلوم پہنچے ہیں یا نہیں ؟ اگر پہنچ گئے تو چلئے رفع شکایت ہوگئی نہ پہنچے تو "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ" خیال تھا کہ سفر کل پانچ مہینے کا ہے ۔پانچ مجلہ طبع ہونگے ۔ پانچ خط لکھنے پڑینگے ۔ چھٹے خط کو زائد از ضرورت سمجھ رکھا تھا ۔مگر آپ نے تو گویا گھر دیکھ لیا ۔ وقت روانگی گاہے گاہے کا ارشاد تھا اب فرمائش ہو رہی ہے کہ جس طرح بمبئی سے شروع کیا تھا بمبئی کی واپسی تک سلسلہ قایم رکھئے آنے کے بعد کہیں یہ حکم نہ ہو کہ ہم نے اپنے مجلہ کا نام بجائے "شہاب" کے 'یورپ کی دلچسپ ڈاک' رکھدیا ہے لہذا آپ چاہیں گھر سے باہر نہ نکلیں مگر یورپ سے ڈاک برابر وصول ہوتی ہے ۔ صاحب یہ "ڈاک" "دلچسپ" کب تک رہیگی ۔ (یہ دلچسپ ضرور رہیگی ۔ ہمارا اپنا خیال تو کچھ ایسا ہی ہے ۔کیا قباحت ہے جو آپ اس کے لئے آئندہ بھی آمادہ رہیں ۔بسمل) جنت کی حور ہوجائیگی ۔ یا کسی "ملا" صاحب کی مٹھنے کی مال ۔ مشکل تو یہ ہے لکھنے کی عادت نہیں اگر پڑھنے لکھنے کی عادت ہوتی تو اور بات تھی کم سے کم مسودہ ہی رہتا کہ جس سے معلوم ہوسکے کہ کہاں تک لکھا تھا ؟ کیا لکھا تھا ؟ کہاں سے شروع کریں اور کیا لکھیں ؟ اب آپ ہی فرمائیے کہ جب یہ یاد نہ ہو کہ سابقہ خط میں کہاں تک کے حالات لکھے گئے ہیں تو اب شروع کریں تو کہاں سے اور لکھیں تو کیا لکھیں ۔خیر آپ جانیں آپ کے مجلہ کے پڑھنے والے ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا   نہ سہی گر مرے مضمون میں تسلسل نہ سہی

دنیا جانتی ہے کہ میں مضمون نگار نہیں اور چاہے دنیا جانے نہ جانے کم از کم میں تو جانتا ہوں۔ یہ محض ایک دوست کے ارشاد کی تعمیل ہے۔

اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے   یورپ کی سرنوشت کی حاجت نہیں مجھے

سنو سنو! گھر سے نکلے ہوئے چار مہینے ہوگئے یوں ہی وطن کی یاد احباب کا خیال سوہان روح ہو رہے ہیں۔ اوس پر اس تمھارے تقاضہ سے تو جی چاہتا ہے کہ آج ہی واپس ہو جاؤں مگر کیا کریں اے میر صاحب بندگی بیچارگی" نہ واپس ہوتے بن پڑتی ہے نہ بغیر لکھے رہا جاتا ہے۔ خیر یوں ہی ہے تو سنئے! کامل دو مہینے منترو میں قیام کے بعد ۲۶ر صفر کو نیس روانہ ہوئے چار ساڑھے چار بجے شام کے ریل یہاں سے چھوٹتی ہے اور دوسرے روز صبح کے ساڑھے آٹھ بجے نیس پہنچ جاتی ہے۔ چونکہ جنیوا میں دو گھنٹہ ٹھیرنا پڑتا تھا۔ حضرت شاہزادہ والا شان دام اقبالہ نے موٹر سے جنیوا تک جانا پسند کیا جو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ سامان اور ہمراہی ریل سے روانہ ہوگئے اور ہم موٹر سے پانچ بجے روانہ ہوکر ساڑھے سات بجے جنیوا پہنچ گئے۔ یہاں اتنا بیان اور سن لیجئے کہ یہ جنیوا سوئٹزرلینڈ کا شہر ہے جہاں بین المللی کانفرنس ہوا کرتی ہے اور ایک جنیوا ہے جو اٹلی کا بندرگاہ ہے جہاں ہمارا سفر بحریا ختم ہوا تھا اور جہاں سے ہم پھر انشاء اللہ تعالیٰ ۲۷ر جون کو جہاز پر سوار ہوں گے۔ یہ محض اس لئے لکھدیا کہ ممکن ہے کہ آپ میری ہی سمجھ بوجھ کے ہوں تو کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں جہاں سے پہلے چل چکا تھا وہیں پھر پہنچ گیا۔ غرض ساڑھے آٹھ بجے شب کے ہم تھے اور نیس کی پہلی رات یعنی وہی شب خوابی کا ڈبہ یا کبوتروں کی کابک۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جاگتے رہے نہ یہ ماننے تیار ہیں کہ سو گئے تھے۔ ریل کی وہ خوش آئند صدا وہ اوس کی مستانہ روی وہ اوس کا ہر اسٹیشن پر دفعتاً رک جانا کہ کوئی لیٹا ہو تو جبراً کروٹ بدل لے بیٹھا ہو تو التزاماً سربسجود ہو جائے سوتا ہو تو جاگ اوٹھے۔ جاگتا ہو تو پریشان ہو جائے۔ عجب عالم تھا۔

حالتے بود کہ ناصح کسے خواب نہ کرد۔

نماز جماعت میں جس طرح شاہ وگدا میں امتیاز نہیں اسی طرح اس ریل کی رفتار نے یہ فرق مٹادیا تھا۔ کنٹرولر سے لے کر میاں محبوب علی باورچی تک اسی عالم گو مگو میں رات

گزاری (قارئین کرام بجائے میاں محبوب علی باورچی کے کوئی اور نام پڑھ لیں کیونکہ میرے ایک عزیز دوست اور ہمراہی کو اس نام سے مغالطہ کا احتمال ہے) مگر ہر کلیہ کا ایک استثناء ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایک اللہ کا بندہ ایسا ہے کہ "خوردن و خوابیدن" کے سوائے کوئی کام نہیں۔ جنیوا اسٹیشن پر کھانا کھاکر سوار ہونے تک تو اوس بیچارہ کو علم ہے اس کے بعد اوس کی بلا جانے صبح چھ بجے حسب معمول (جائے بستر) یعنی "بڈ ٹی" Bed Tea کیلئے آنکھ کھولی۔ ہاں یہ اون ہستیوں میں ہیں جن کا مقولہ ہے چاہے زلزلہ آجائے یا قیامت ہی کیوں نہ ہو جائے کم از کم مراتب پنجگانہ یعنی (بڈ ٹی Bed Tea سے لیکر ڈنر Dinner تک) ناغہ نہ ہونے پائیں۔ خیر جب سولی پر نیند آسکتی ہے تو اس غریب کو ریل میں اگر نیند آگئی تو کیا مضائقہ ہے صبح آٹھ بجے کانس پہنچے ناشتہ کیا اور تقریباً نو بجے صبح کے نیس پہنچ گئے۔ سنتے تھے کہ نیس میں خاصی گرمی پڑ رہی ہے مگر جب ہم پہنچے ہیں تو دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ اسٹیشن پر شاہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ اون کی والدہ محترمہ پرنسس عالیہ اور پرنس فاروق۔ پرنس فواد۔ پرنس عثمان بہت سے ترکی شاہزادے موجود تھے یہاں سے ہوٹل "نگرسکو" روانہ ہوئے جہاں تقریباً ایک ماہ قیام ہوگا۔ اب آپ کو اشتیاق ہوگا کہ نیس کا حال سنیں تو بھائی صاحب اگر آپ اس کے جغرافیہ سے واقف ہونا چاہتے ہوں تو ایک آدھ فرانس کا نقشہ خرید لیجئے (اور یہی مشورہ آپ اپنے مجلہ کے قارئین کو دے سکتے ہیں) مردم شماری اور بہائم شماری کے اعداد کی ضرورت ہو تو مولوی غلام احمد خان صاحب سابق ناظم مردم شماری حال اول تعلقدار اورنگ آباد سے رجوع فرمائیے اچھا خاصہ شہر ہے اور اپنے (بیچ) یعنی دریا کے کنارے کے لئے مشہور آفاق ہے اس کثرت سے راستے ہیں کہ موٹر رانی بیحد مشکل ہو جاتی ہے البتہ کنارہ دریا جو سڑک ہے اوس کا کیا کہنا اہل یورپ روپیہ کمانا اور روپیہ خرچ کرنا دونوں جانتے ہیں سڑکیں اتنی سیدھی۔ راستے اتنے صاف اور خوشنما فلڈ لیٹ (دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے رجوع فرمائیے) یا مجھے بھی یکے از اراکین شمار فرمالیجئے تاکہ میں بھی اوس نوعیت کا لفظ تراش کر پیش کر دوں یعنی طغیان ضیاء) اس قدر دیدہ زیب کہ جی چاہتا ہے دن رات اس سڑک پر ٹہلتے ہی رہئے مگر برا ہو اوس متحرک قوس قزح کے رنگوں کا اوس انسانی مدوجزر کا اون چلتے پھرتے مرمریں مجسموں کا ان حسن کے نیم برہنہ نمونوں کا کہ آنکھیں راستہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ نظریں ہٹائے نہیں ہٹتیں۔ دل بے قابو ہوجاتا ہے

سر گھومنے لگتا ہے۔ پیر سنگین ہوجاتے ہیں۔ راستہ سوجھائی نہیں دیتا وہ تو کہئے کہ نظریں ایک ہی طرف جم نہیں سکتیں خیال ایک ہی جانب قایم نہیں ہوسکتا زخم اگر ایک ہے تو انسان اوس کی تکلیف محسوس کرسکتا ہے مگر جب تواتر ہو زخم پر زخم پڑ رہے ہوں تو پچھلے زخم کی تکلیف کیسے محسوس ہوسکتی ہے۔ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست" احساس جاتا رہا۔ تمیز باقی نہیں رہتی۔ فرق محسوس نہیں ہوسکتا۔ کیا کریں۔ کس کو دیکھیں۔ کس کو نہ دیکھیں۔ ایک ہوں دو ہوں۔ صدہا ہیں۔ ہزارہا ہیں۔ سامنے دریا موجیں مار رہا ہے۔ اس طرف یہ طوفان ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے۔ رند ہو یا زاہد۔ فاسق ہو یا متقی۔ فاتر العقل نہ ہو اور پہلو میں دل کی جگہ سنگ خارا نہ ہو۔ پھر دیکھیں نظر کی معصومیت۔ کسی کو یقین ہو یا نہ ہو۔ ہم نے یہاں ایک نہیں صدہا۔ نمائش میں نہیں۔ کھلے دریا میں مرمیڈ (دریائی پریاں) دیکھی ہیں جس کسی نے یہ کہا ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ ناف تک انسان ہی انسان ہیں ناف سے نیچے کے حصہ کا علم نہ ہوسکا کہ مچھلی کی ساخت ہے یا انسانی جسم ہے کیونکہ وہ حصہ بالعموم پانی میں نہاں رہتا ہے۔ حسن وحیا دونوں توام نہیں تھیں۔ پیرس نے جمع بین الاختین سے بالکل انکار کردیا حسن کو تو گھر ڈال لیا اور حیا کو نکال باہر کردیا۔ موسم بدل رہا ہے۔ گرمی آغاز ہو رہی ہے۔ شناوران دریائے محبت کا ندر روز بہ روز بڑھ رہا ہے۔ کنار دریا ریت پر صدہا ہزارہا رنگ برنگ کی مچھلیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اکثر نے صرف ایک رنگین چھتری پر اکتفا کیا ہے۔ بعضوں نے پس گردن سے ایک ڈوری لیکر اوس کے دونوں سرے اس چڈی سے ملحق کر دیتے ہیں۔ آ۔ اے آزادی نسواں کے مدعی آ۔ یورپ کی سرزمین پر آ۔ پیارس کے بازاروں کی سیر کر۔ نیس کے دریا کا نظارہ کر۔ اور جس شئے کا متمنی ہے اس کے حصول کا ماحصل اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ اور ہندوستانی شوہروں کے مظالم لکھنے والو۔ خدا کیلئے یہاں کی سیر کرو اور یہاں کے شوہروں کی مظلومی کی داستان میں بھی کچھ زور قلم صرف کرو۔ خیر چھوڑیئے بھی اس ذکر کو معاف فرمائیے کہ میں نے آپ کے خیالات منتشر کردئے اور اس دلچسپ نظارہ سے جس کی سیر میں آپ مصروف تھے آپ کو محروم کردیا۔ سنبھل صاحب۔ نیس مقام ہے ان لوگوں کے رہنے کا جن کا مقصد زندگی صرف عیش ہی عیش ہو۔ ان حضرات کی سکونت کا جو جنت اور دوزخ کے فرسودہ خیالات سے کوسوں دور ہوں۔ یہاں وہ آتے ہیں جن کے پاس پیسہ ہو اور صرف نہ ہوسکتا ہو۔ یہاں وہ آتے ہیں جن کے یہاں دل ہو اور اوس کا کوئی گاہک نہ ہو۔ یہاں وہ آتے ہیں جو آنکھ رکھتے ہوں۔

اور تسکین کی تلاش میں ہوں یہاں وہ آتے ہیں جو سر رکھتے ہوں اور سودا چاہتے ہوں یہاں وہ کاروباری اشخاص آتے ہیں جو محنت شاقہ سے تھک کر کچھ دنوں آرام و لطف کے خواہاں رہتے ہیں تاکہ آئندہ اور محنت اور ترقی کر سکیں۔ یہاں وہ ہندوستانی بیفکرے تشریف لاتے ہیں جنھیں عیش و عشرت کے نت نئے طریقوں کی تلاش رہتی ہے تاکہ باپ دادا کی رہی سہی پونجی بھی گنوا دیں۔ یہاں سلطنت کے درخشندہ ستارے نیٹ کلبوں میں ٹمٹما رہے ہیں۔ مانٹی کارلو کے مشہور عالم قمار خانہ میں۔ آرمینیا کا ایک لکھ پتی جو پانچ سال قبل نیس آیا تھا اور جس کے یہاں دس بارہ بہترین موٹریں سواری کی تھیں ایک عورت کے پیچھے ساری دولت لٹا کر آج ٹرام کے کرایہ کو محتاج پھر رہا ہے نیس کی آبادی تین لاکھ بیان کی جاتی ہے مگر میں حیران ہوں کہ آخر یہاں کچھ کاروبار بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ دفاتر بھی ہیں یا نہیں؟ دنیا میں آخر یہاں کے باشندوں کو اور بھی کوئی کام ہے یا نہیں کہ دن اور رات جس وقت دیکھئے لب دریا میلہ لگا ہوا ہے ہزارہا اشخاص ہیں کہ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ پھر بار میں۔ ٹی روم میں۔ نیٹ کلب میں۔ خدا جانے کیا کیا مقام ہیں جو دن رات بھرے ہوئے ہیں۔ بیفکری کا یہ عالم ہے کہ جب بیٹھتے ہیں تو اوٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ غالباً یہ سب یہاں کے باشندے ہوں گے۔ تازہ واروں کے ساتھ یہاں کے بے فکری بھی شریک ہو جاتے ہوں گے۔ یہ تمام فرانس کا ساحلی علاقہ ریویرا کہلاتا ہے۔ نیس کے مغرب میں آٹھ دس میل پر Juan les Pins ژوان لاپان ہے۔ جہاں کے ساحل پر خاص کر نہانے کا لطف ہے اور جہاں ہر وقت شناوران محبت کا مجمع رہتا ہے اوس سے چار میل پر کان ہے یہ بھی بہت خوبصورت مقام ہے اور یہاں ایسے مشہور کسینو (یعنی وہی نیٹ کلب) ہیں کہ میں نے تو اپنی تمام عمر میں ایسی شان و شوکت کا محل بھی نہیں دیکھا۔ یہیں تمام دنیا کے افعال ہوتے ہیں۔ جوا بھی ہوتا ہے شراب بھی اڑتی ہے۔ ناچ بھی ہوتا ہے۔ غرض کیا ہے جو یہاں نہیں ہوتا۔ سہ پہر میں ہم بھی مجبوراً چلے گئے تھے دغا لیا آپ تو نہیں ہاں آپ کے مجلہ کے قارئین اسے مجبوراً پڑھیں گے منزہ) احباب نے "یکبار دیدم دو بارہ ہوس" کا وظیفہ پڑھا۔ اور دوسرے روز کا پروگرام اوسی دم تیار کرنا شروع کر دیا۔ اور ہم اگر ہوس است ہمی قدر بس است پر" عامل ہیں۔ وہ کچھ دیکھا ہے کہ سنا بھی نہیں سکتے۔!

خدا آباد رکھے ہماری سلطنت کو اور باقبال سلامت رہے ہمارا بادشاہ جس کے دور میں

سلطنت حیدرآباد میں قرون اولی کی سی شان پیدا ہوگئی ہے جہاں ایسے اعمال و افعال کا ذکر بھی جائز نہیں ہے۔ یہ تو سلطنت فرانس ہی ہے کہ یہاں جو کچھ ہورہا ہے آرٹ ہے۔ اس سے زیادہ اطمینان درکار ہے تو آگ لگا دو شہاب کو اور مرنے سے قبل ایک مرتبہ یہاں کی سیر کر لو آگے تم جانو اور تمہارا دین ایمان۔ دو باتوں سے ایک بات ضرور ہو کر رہیگی یا یہاں آنے کے بعد خدا ہی کو بھول جاؤ گے۔ یا پھر بھولے سے آزادی نسواں کا نام نہ لوگے۔ نیس کے مشرق میں ساحل کی ایک جزیرہ نما پہاڑی پر وہ مشہور عالم مقام ہے جہاں دنیا بھر کے وہ اشخاص جمع ہوتے ہیں

جو کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

عمارت کا ذکر ہی فضول ہے داخلہ کیلئے رقم داخلہ کے سوا بھی شروط ہیں۔ عمر کا خاص طور پر لحاظ کیا جاتا ہے نود سال کے بوڑھوں کی تو کثرت ہے مگر سترہ اٹھارہ سال کا جوان نظر نہیں آتا۔ غالباً اکیس سال سے تجاوز پر جانے کی اجازت ملتی ہے۔ اس کے سوا ہر شخص کو اپنا پاس پورٹ پیش کرنا پڑتا ہے تاکہ وہاں دفتر میں اوس کے اندراجات کی نقل لے لی جائے اور ایک نقل آپ کو دیدیجاتی ہے کہ آپ بھی اپنے ہمراہ رکھیں اور بروقت واپسی اوسی دفتر پر واپس کردیں۔ جانتے ہو یہ کیوں؟ تاکہ اگر آپ جوئے میں ساری دولت ہار کر اوس قمار خانہ عالم سے عالم بالا کی سیر کا قصد فرمالیں اور جناب کا جسد خاکی پولس والوں کے ہاتھ آئے تو آپ کا نام قومیت اور وطن کی تلاش میں زحمت نہ ہو۔ اور جس سلطنت کی آپ رعایا سے ہوں آپ کے دفن کفن کا بار اس سلطنت پر رہے۔ نیچے دریا بہہ رہا ہے جہاں کئی ایک کو توالی کی موٹر بوٹ کھڑی ہوتی ہیں کہ نعش کے جلد سے جلد نکالنے میں دقت نہ ہو اور قریب ہی میں دنیا کا سب سے عجیب قبرستان ہے۔ جہاں ہر مذہب ملت ہر قوم وسلطنت کا رکن پہلو بہ پہلو مصروف خواب ہے۔ اے ہندوستان کے بھکاریو! کب تک راجہ نل کا ذکر کرتے رہو گے۔ مانٹی کارلو میں ہر گوشہ قبرستان میں ایسی ہزاروں ہستیاں آرام کررہی ہیں جن کے ذکر سے راجہ نل کے ماتھے پر پسینہ آجاتے۔ ان قمار خانوں میں عورتیں اور بوڑھے زیادہ نظر آتے ہیں چہرے بالعموم ایسے ہیبت ناک اور بھیانک ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے سے وحشت سی معلوم ہوتی ہے شاذ و نادر ہی چہرہ بشاش نظر آتا ہے ہم نے تو تقریباً ہر چہرہ پر تکان اور اضمحلال رنج و غم ہی کے آثار دیکھے یہ زردان

و در دسر خریدن" کی بہترین مثالیں یہاں دیکھنے میں آئیں۔ اگر آپ کی خواہش ہو تو یہاں کے قمار خانوں کے تفصیلی حالات آئندہ خط میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ "زندگی در گرد نم افتاد بیدل چارہ نیست"۔
چار و ناچار ایک آدھ خط اور یورپ سے اور ایک جہاز سے لکھنا ہی پڑیگا۔ جب یہ ہے تو بھائی والسلام۔
(تمہارا اشہید)

مکتوبات جمیل

(۳)

ایسا بھی سکوت کہ تصویر بن گئے؟

سوچتی ہوں کہ آخر تمہارا خط نہ آنے کی وجہ کیا ہوگی؟ میرے خطوط مل چکے ہوں گے!
'شاعر کا خمیر' کے کیا کہنے! بڑا پیارا جواب ملا۔ اگر میرے ہر سوال کا ایسا ہی جواب ملتا ——— یا ملنے کی امید ہوتی ——— تو کیا میں ہر روز اک نیا سوال نہ کرتی؟ ———

'شوخ سہیلی' مجھے چھیڑا کرتی ہیں کہ تم نے شاعر کا خمیر میں دلچسپ جواب دیا۔
کوئی شک نہیں "بہار کی پری کے بازو" شاعر کے خیال سے "چھو" گئے ہیں۔ جب ہی تو اس کے "لوح دل" کو نیچر نے اپنی "نقاشی" کے لئے پسند کیا ہے!! قائل ہو گئی میں تمہاری شاعری کی۔
لو خیر سے وہ شعر بھی کرنے لگیں موذوں۔ اب ایک بھی ٹکڑا نہ بھیجیگا میرے دل کا سچ ہے نا! جلدی اپنی طویل خاموشی کو چھوڑ دیجئے۔

یورپ کی دلچسپ ڈاک ،جو نہایت دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے مستقبل قریب میں معقول اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں شایع ہوگی۔
صنف نازک ،بھی نقش ثانی بنظر اول۔ شایع ہونیوالی ہے براہ کرم دفتر شہاب میں اپنا نام رجسٹر کرالیا جائے کہ یہ کتابیں آپ کی خدمت میں بھیجی جاسکیں۔ ورنہ دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔

پریم پربت

جناب اللہ بخش صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی؛

"پریم پربت" دیکھنے کے بعد ممکن نہیں کہ عمارت کی دلکشی۔ فضا کی رنگینی۔ سید محمد مہدی صاحب معتمد باب حکومت کے ذوق تعمیر اور جمالیاتی مذاق کی نسبت لکھنے کو جی نہ چاہے ہمیں بھی اوس کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ چاہتے تھے کہ کچھ نہ کچھ لکھیں۔ خدا بھلا کرے اللہ بخش صاحب کا جنھوں نے یہ نظم بھیج کر بڑی حد تک ہمارے کام کو ہلکا کردیا۔

(بسمل)

تُو اے پریم پربت۔ کہسار کی پری ہے | پیارا ہے نام تیرا سندر ہے گن بھری ہے

ہے سر سے پاؤں تک اک تخیل شاعرانہ | یا ہے لطافتوں سے معمور اک خزانہ

تیری ادائیں پیاری چھب ہے تیری نرالی | گہوارہ زمین پر نازوں کی ہے تو پالی

کامل مصوری نے نقشہ تیرا بنایا | نازک ہنروری نے سانچہ میں تجھ کو ڈھالا

اک نکتہ سنج دل کی ہیں کیفیات تجھ میں | معمور شعریت سے ہر اک بات تجھ میں

فن لطیف کا ہے تو اک شاہ پارہ | یا ہے زمین پہ کوئی آکاش کا ستارہ

تجھ میں جھلک رہا ہے ذوق جمال بانی | اللہ رے دماغ جدّت طراز مہدی

تیری فضا میں ہے اک کیف نشاط آور | نغمے پریم کے ہیں سینے میں تیرے مضمر

جب تجھ کو دیکھتی ہیں کلیاں ہیں مسکراتی | اٹکھیلیاں دکھاتی باد صبا ہے آتی

شمس و قمر کی تجھ پر نظریں لگی ہوئی ہیں | دامن پہ تیرے کرنیں آ آکے کھیلتی ہیں

تو اے "پریم پربت" کیا کنج دل فزا ہے | گلدستہ لطافت اک سامنے دھرا ہے

ہے گرد و پیش تیرے اک دلفریب منظر | ذروں میں ہے یہاں کے تاثیر روح پرور

ہر ایک چپہ چپہ نزہت فزا ہے تیرا | آنکھوں کے روبرو اک فردوس کا ہے نقشہ

درگاہ ایزدی میں توحید کی دعا ہے | مقبولیت ہو حاصل یہ اس کا مدعا ہے۔

بیدر

جناب محمد ناصر حسین صاحب صدیقی (عثمانیہ)

(بسلسلہ گذشتہ):

ہمایوں کے عہد میں شہر تباہ و برباد تھا کیونکہ وہ رعایا کی خون کا پیاسا تھا اور غالباً اس ملک کے صفحات تاریخ ایسے ظالم واقعات سے معرا ہوں گے۔ ۱۴۵۹ء میں ظالم نے زمیندار تلنگانہ کے ملک پر چڑھائی کی اور اس کی عدم موجودگی میں بغاوت ہوئی جس کے سرگروہ شاہ حبیب اللہ اور شہزادہ حسن خاں تھے۔ اس بغاوت کا علم ہوتے ہی بادشاہ کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے سب سے پہلے شہر کے محافظین کو جو تعداد میں دو ہزار تھے بڑے مصائب دیکر قتل کرا دیا اس نے کوتوال کو ایک آہنی پنجہ میں مقید کر دیا اور اسے مجبور کیا گیا کہ اپنے جسم کے تراشیدہ گوشت کو نوش کرے اس زبردست تکلیف سے اس غریب کا انتقال چند ہی یوم میں ہو گیا۔ باغیوں کو تمام شاہی چوک میں لایا گیا جس کے اطراف وحشی اور خونخوار ہاتھی تھے بادشاہ خود ایک پالکی میں سوار ہو کر آیا تھا کہ اس سزا کا بچشم خود ملاحظہ کرے۔ سب سے پہلے اپنے بھائی حسن خاں کو ایک غصہ ور شیر کے آگے ڈال دیا گیا۔ جس نے چشم زدن میں شہزادے کی تکا بوٹی کر دی اور دوسرے باغیوں کو بھی بادشاہ کی موجودگی میں قتل کر دیا گیا اس تماشہ کو دیکھنے کے لئے بہت ساری عورتوں، معصوم لڑکوں اور بکیس و لاچار خاندان کو زبردستی اپنے اپنے گھروں سے نکالا گیا اور ان وحشیوں نے ان کے ساتھ بھی بہت برا سلوک اور نازیبا حرکتیں کیں جس کے تحریر سے قلم خود شرمندہ ہے"۔

۱۴۶۱ء میں اس ظالم بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور خافی خاں نے اپنی مشہور کتاب میں حسب ذیل تاریخی قطعہ لکھا:۔

ہمایوں شاہ مرد و دست عالم — تعالی اللہ زہے مرگ ہمایوں
جہاں پر ذوق شد تاریخ فوتش — ہم از ذوق جہاں آرید بیروں
آہ مظلوماں چراغ کشتہ روشن میکند — اشک خونی رخنہ در دیوار آہن

ہمایوں کا بڑا لڑکا نظام شاہ تخت پر بیٹھا جو صرف آٹھ سال کا تھا اس وقت امور سلطنت کا انصرام مخدومہ جہاں۔ خواجہ جہاں۔ خواجہ محمود گاواں کے مددسے کیا کرتی تھی بادشاہ کے ابتدائی عہد حکومت میں راے اڑیسہ زمیندار تلنگانہ کی مدد سے مملکت بہمنی پر حملہ آور ہوا۔ اور تاخت و تاراج کیولاس تک کی اور رائے اڑیسہ بیدر سے دس میل کے فاصلہ تک آگیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ ملک تلنگانہ کی واپسی کا مطالبہ کرے اور بادشاہ سے خراج وصول کرے لیکن حملہ آور بہت جلد پسپا کر دئے گئے اور صلح نامہ مدون ہوا جس کی رُو سے بہمنی بادشاہ کو ایک بھاری رقم ہاتھ آئی۔ اس معرکہ کے کچھ عرصہ بعد سلطان محمود خلجی والی مالوہ نے چڑھائی کی مگر بہمنی افواج نے اسے نہ صرف شکست دی بلکہ ان افواج کا تعاقب ان کے دار السلطنت تک کیا۔ قلعہ بیدر کے تمام انتظامات ملکہ نے ملوخاں دکھنی کے سپرد کر کے خود فیروز آباد روانہ ہوئی۔ سلطان محمود خلجی نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاکر شہر پر قبضہ کرلیا اور بادشاہ کی روانگی کے سترہ دن تک قابض رہا ملک کے ایک بڑے حصے نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا۔ اور لوگوں کا عام خیال ہوگیا تھا کہ اب سلطنت خاندان بہمنی کے ہاتھوں سے نکل جائیگی اور مالوہ کے خلجی بالکلیہ قابض ہوجائینگے اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ محمود شاہ والی گجرات اسی ہزار سپاہ کے ساتھ کمسن بادشاہ کی مدد کو آرہا ہے اس خبر کے ملتے ہی شاہ مالوہ کے چھکے چھوٹ گئے اور فوج کو واپس چلنے کا حکم دیا اور بہمنی افواج کے عقب پر حملہ کرنے سے والی مالوہ کا بیحد نقصان ہوا۔

۱۴۶۳ء میں بیدر کے شاہی محل میں نظام شاہ کے تقریب شادی کے سلسلہ میں ایک دعوت ترتیب دیگئی تھی اتفاقاً اسی دن نظام شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے متعلق فرشتہ یوں رقمطراز ہے "اسی رات جبکہ عیش و نشاط کی محفل گرم تھی یکایک شاہی محلات میں آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ جو نظام شاہ کے داعی اجل کو لبیک کہنے کا اعلان کررہی تھیں۔ اس کے بعد ہمایوں کا دوسرا لڑکا محمدؐ شاہ تخت پر بٹھایا گیا جو صرف نو سال کا تھا۔ انتظام سلطنت حسب سابق خواجہ جہاں اور محمود گاواں کے مشورہ سے ملکہ انجام دیا کرتی تھی۔

۱۴۶۹ء میں محمود گاواں کوکن کو ایک مہم لیکر گیا اور کئی شہروں اور قلعوں کو فتح کرتا ہوا گوا پر حملہ آور ہوا۔ اور بعد فتح اسے بھی مملکت بہمنیہ میں داخل کیا۔ اس سے قبل گوا راجہ وجیانگر کے قبضہ میں تھا۔ محمود گاوان تین برس کے بعد جب دوبارہ حدود سلطنت بہمنیہ میں داخل ہوا تو اس کا شایان شان استقبال کیا گیا۔

بادشاہ خود ایک ہفتہ تک اس کا مہمان رہا اور اسے سب سے اعلیٰ خطاب عطا کیا۔ بادشاہ نے اپنا خاص لباس فاخرہ اسے عطا کیا اور ملکہ نے اسے "اپنا بھائی" کہکر عزت افزائی کی۔

۸۸۶ھ میں بیدر میں ایسا جانگداز سانحہ پیش آیا جس نے سلطنت بہمنیہ کی چول چول ڈھیلی کر دی۔ اور یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ اس کے بعد ہی سے سلطنت میں وہ زوال شروع ہو گیا جس کے بعد پھر ابھرنے کی سکت نہ رہی۔ وہ دکھنی امرا نے جو محمود گاواں کی بڑھتی طاقت سے خائف اور حسد کرتے تھے اس کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اس کے خلاف سازش کا جال پھیلایا اور حسب ذیل فرضی خط رائے اڑیسہ کے نام محمود گاواں کی طرف سے تیار کیا گیا "میں محمد شاہ کے ظلم اور بدعنوانیوں سے تنگ آگیا ہوں۔ اور اب دکن تمہاری تھوڑی سی توجہ کا محتاج ہے۔ سرحد راجمندری پر زبردست چھاؤنی نہیں ہے اور ادھر سے حملہ کرنے میں تمہیں کوئی دقت نہ ہوگی بہت سارے عمائدین اور امرا میرے احکام کی تعمیل کے لئے تیار ہیں میں بھی اپنے زبردست اثر اور فوج کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا اور ملک فتح ہو جانے کے بعد آپس میں تقسیم کر لینگے"۔ یہ فرضی خط بادشاہ کے ملاحظہ عالی میں اس وقت پیش کیا گیا جب کہ وہ نشہ میں چور تھا۔ اس خط کو دیکھتے ہی برافروختہ ہو گیا اور اس کے امکان پر غور و خوض کئے بغیر خواجہ محمود کو بلوا بھیجا اور سختی سے سوال کیا۔ "اگر کوئی شخص بادشاہ سے غداری کرے اور اس کا جرم پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو ایسا پاپی کس سزا کا مستوجب ہوگا"۔ خواجہ نے بےباکانہ جواب دیا کہ "ایسے غدار کے ساتھ کسی قسم کا رحم و کرم نہ کیا جائے"۔ بادشاہ نے اسے وہ خط بتلایا جس کے دیکھتے ہی خواجہ نے قرآنی آیت ھذا البھتان عظیم کا اعادہ کیا۔ بادشاہ جو اپنی قوت ادراک و فہم کھو چکا تھا اس کا کچھ خیال نہ کیا اور اپنے حبشی غلام جوہر کو حکم دیا کہ خواجہ کو قتل کر دے۔ اس طرح سے خواجہ محمود گاواں اٹھتر سال کی عمر میں چار سلاطین بہمنیہ کی خدمت انجام دیتے ہوئے درجہ شہادت پر فائز ہوا۔ اپنی موت کے کچھ عرصہ قبل محمود گاواں نے محمد شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا پہلا شعر منتخب اللباب میں محفوظ ہے۔

اے شکل ضرب تیغت بر دوش جان حمائل ہیکل ز حرز سیفی وانگہ ہراس اے دل

ملا عبد الکریم ہمدانی مصنف تاریخ محمد شاہی نے خواجہ محمود گاواں کے حالات بڑے تفصیل سے لکھے ہیں

اور تاریخ فرشتہ میں اس کا اقتباس موجود ہے۔ محمود گاواں کی شہادت پر ملّا نے حسب ذیل قطعہ لکھا تھا۔

شہید بے گنہ مخدوم مطلق — کہ عالم را ز جودش بود رونق
اگر خواہی تاریخ وفاتش! — فرو خواں قصہ قتل نبا حق

ایک دوسرے میں مصنف نے "بے گنہ محمود گاواں شد شہید" سے تاریخ نکالی ہے۔

مرحوم وزیر کی موت سے "غیر ملکیوں" (ترکی۔ ایرانی اور مغل) کو بحد حزن و ملال ہوا۔ اور بادشاہ کے اظہار تاسف پر بھی انہیں یقین نہ آیا اور انہوں نے دربار میں مقیم رہنے سے انکار کرتے ہوئے اپنے اپنے صوبوں کے مستقر کی راہ لی۔

غیر منصفانہ طرز عمل سے بادشاہ کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا تھا اور اس واقعہ کے بعد زیادہ عرصہ تک بھی زندہ نہ رہا۔ یکم صفر ۸۸۷ھ (۲۴ مارچ ۱۴۸۲ء) کو جب بستر بیماری پر تمام دنیاوی مصائب و آلام سے نجات پانے کے لئے پڑا تھا اور آخری کلمہ جو اس کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ محمود گاواں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈال رہا ہے اس کے وفات کی تاریخ حسب ذیل قطعہ ہیں۔ ؎

شہنشاہ جہاں شاہ محمدؒ — کہ در بحر فنا ناگہ فرو شد
دکن شد چوں خراب از رفتن او — خرابی دکن تاریخ او شد

محمود شاہ دوم بارہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور اس کی تخت نشینی کا رسم بڑی شان و شوکت کے ساتھ ادا کیا گیا۔ فرشتہ نے اس تقریب کا نہایت واضح نقشہ کھینچا ہے مسلمان بادشاہوں کے رسوم بہت کم بیان کئے جاتے ہیں۔ اس لئے میں بغیر معافی چاہے بجنسہٖ درج کرتا ہوں۔

"تخت فیروزہ دار العوام کے وسط میں رکھا گیا اور اس کے ہر گوشہ پر چاندی کی ایک کرسی تھی۔ شاہ محب اللہ اور عبد اللہ حنیف جو اس زمانہ کے مشائخین عظام سے بادشاہ کی درازیٔ عمر و بقائے سلطنت کی دعا کی اس کے بعد تاج کو شاہ کے فرق مبارک پر رکھا۔ ہر ایک نے بادشاہ کا ہاتھ تھامے ہوئے تخت پر بٹھایا اس کے بعد یہ تقدس مآب ہستیوں نے چاندی کی کرسیوں کو اپنی نشست سے زینت بخشی۔ بعد ازاں نظام الملک بحری وزیر اور قاسم برید نے نذرانے پیش کرنے کا شرف حاصل کیا۔ بادشاہ نے مراحم خسروانہ

امراء کو خطابات سے سرفراز کیا اور ان کی حیثیتوں کے مطابق خلعتیں بھی عطا کیں۔

محمود شاہ دوم کا عہد حکومت طویل تھا مگر یہ مدت مصائب اور خانہ جنگیوں سے پُر ہے جس کا اختتام سلطنت بہمنیہ کے خاتمہ پر تھا۔ بادشاہ وزیر نظام الملک بحری کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے بیدر اور مضافات بیدر میں بدنظمی پھیل گئی تھی۔ بادشاہ کی عدم موجودگی میں جب کہ وہ ایک مہم پر تلنگانہ گیا ہوا تھا۔ نظام الملک بحری نے ارادہ کیا کہ شاہی خزانہ سے اس قدر رقم اپنے ساتھ لیجائے جس قدر کہ وہ لیجا سکتا تھا۔ تاکہ اپنے بیٹے گورنر جنیر سے جا کر مل جائے۔ مگر قبل از وقت گورنر بیدر کو اس کی اطلاع ہوگئی اس نے نظام الملک کو گرفتار کروا کر قتل کرا دیا۔ ۸۹۶ھ (۱۴۹۰ء) میں پھر دکھنیوں اور حبشیوں نے کوشش کی کہ بادشاہ پر سے غیر ملکی اثرات کو دور کر دیں۔ پسند خاں دکھنیوں سے مل کر اس بات پر آمادہ ہوگیا کہ محمود شاہ کو قتل کر دے اور اس کی جگہ شاہی خاندان کے ایک اور فرد کو تخت پر بٹھائے بادشاہ نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ مسلسل تین روز تک شاہی جان نثار سپاہیوں نے سازشوں اور ان کے ساتھیوں کو جو شہر میں تھے خوب لوٹا۔ محمود شاہ اپنی جان بچنے کی خوشی میں چالیس یوم تک ضیافتیں ترتیب دیتا رہا اور شہر میں متانت کے ساتھ ایک جلوس گذرا۔ اس وقت شہر خوب آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد بادشاہ نے امور سلطنت کی انجام دہی سے لاپروائی برتنی شروع کی اور تمام کاروبار کا انصرام اپنے مصاحبان خاص کے ہاتھوں سپرد کر دیا تھا۔ خافی خاں اور فرشتہ نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس وقت کے درباری حالات کا خاکہ کھینچا ہے۔ آخرالذکر نے لکھا ہے کہ "دہلی۔ لاہور۔ ایران کے گوئیے اور رقص کرنے والے جمع تھے قصہ گو اور شاہنامہ کے حافظوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ امراء نے بھی اپنے ظل اللہ کی تقلید کرتے ہوئے اپنے فرائض سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ مقدس ہستیوں نے بھی جام شراب کیلئے اپنی عبائیں رہن رکھوا دی تھیں۔ تقدس مآب معلموں نے بھی اپنی درسگاہوں کو چھوڑ کر میخانوں کے صدرنشین بنے ہوئے تھے۔ ان کا لازمی نتیجہ کچھ عرصہ بعد ہی منظر شہود پر آگیا۔ صوبہ تلنگانہ اور بیدر کے چند متصل اضلاع کے سوا بادشاہ کے قبضہ میں کچھ نہ تھا۔

قاسم برید نے جو نظام الملک بحری کا جانشین تھا۔ بادشاہ کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا اور حقیقی معنوں میں وہی ملک کا حاکم تھا۔ اسی زمانہ میں ملک احمد بحری نظام الملک۔ فتح اللہ عماد الملک اور یوسف عادل خان نے

علی الترتیب احمد نگر۔ براڑ۔ بیجاپور میں خود مختاری کا اعلان کیا کچھ عرصہ بعد قاسم برید بھی ادسہ میں خود مختار ہوگیا تھا۔ مگر بہت جلد ۱۴۹۲ء میں بادشاہ سے اوس کی مصالحت ہوگئی اور اسے امیر جملہ یا وزیر اعظم بنا دیا گیا اس کے بعد حقیقی معنوں میں سلطنت بہمنی کا چراغ گل ہوگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے بعد چار بادشاہ تخت پر بیٹھے جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) احمد شاہ دوم (۲) علاؤ الدین شاہ دوم (۳) ولی اللہ (۴) اور آخری کلیم اللہ جس نے ۱۵۲۷ء میں بحیثیت قیدی احمد نگر میں وفات پائی۔

۱۵۰۴ء میں قاسم برید کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا امیر برید جانشین ہوا۔ مگر بیجاپور کی نئی سلطنت سے ہمیشہ اس کی معرکہ آرائی ہوتی رہی ۱۵۲۹ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ اسمعیل عادل شاہ نے حملہ کیا۔ جس کی مدافعت کی گئی۔ اس نے مدافعت کا پورا بار اپنے ولیعہد پر ڈال کر خود قلعہ اودگیر کو چلا گیا۔ شہر کے قریب خوب خون ریزی ہوئی۔ محاصرہ کے دوران میں برید کی مدد کرنے کا خیال علاؤ الدین عماد شاہ براڑ کو ہوا۔ مگر اسمعیل عادل شاہ نے اسے مطلع کیا کہ اس نے شہنشاہ بیجاپور کی سخت توہین کی ہے جو کبھی بھی معاف نہیں کیجا سکتی۔ تھوڑے عرصہ بعد ہی امیر برید حالت نشہ میں مخمور گرفتار کر لیا گیا اور شاہ بیجاپور کے دربار میں روانہ کر دیا گیا اس نے جان بخشی کی التجا کی جو اس شرط پر منظور ہوئی کہ وہ خزانہ ہائے سلطنت بہمنی اور قلعہ بیدر کو ان کے حوالہ کر دیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ اس کی تعمیل کیلئے وہ اپنے بیٹے کو مجبور کریگا۔ جب اس وعدہ کی اطلاع اس کے بیٹے کو ملی تو اس نے دونوں شرائط کو قبول کرنے سے انکار کیا جس کی بناء پر شاہ بیجاپور نے امیر برید کو ہاتھی کے نیچے روندوانے کا حکم دیا۔ بہرحال کسی طرح سے امیر برید کی جان بچ گئی اور محاصرین کی مستقل مزاجی سے اس کے بیٹے کو وہاں کا تخلیہ کرتے بنی اور اپنے ساتھ سلطنت بہمنیہ کے بیش قیمت جواہرات لیکر اودگیر روانہ ہوا۔ اسمعیل قلعہ میں داخل ہو کر پورے خزائن کو اپنے امراء عمائدین اور فوج میں تقسیم کر دیا تاکہ عوام پر یہ واضح ہو جائے کہ اسے سلطنت بہمنیہ کی دولت کا لالچ نہ تھا۔

امیر برید، اسمعیل عادل شاہ کے ساتھ تھا جب کہ اس نے ۱۵۲۰ء میں مدگل اور رائچور پر حملہ کیا تھا۔

(باقی دارد)

مغلیہ سلاطین اور دکن کے تعلقات
عہد شاہجہاں تک

جناب میر نجابت علی خاں صاحب متعلم بی۔اے (عثمانیہ)

دکن اور شمالی ہند۔ سطح مرتفع دکن شمالی ہند سے جغرافی طور پہ اتنا مخلوط نہیں ہے۔ جتنا کہ عمرانی لحاظ سے محل وقوع کے اختلافات ان دونوں حصص ہند کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتے۔ ہرچند نسلی اور تمدنی علیحدگی ضرور رہی لیکن دکن پر شمالی اثرات ہمیشہ پڑا کئے۔ جب کبھی شمالی ہند کے حکمرانوں کو فرصت ملی۔ انہوں نے دکن کی طرف رخ کیا۔ اور اس طرح دکن کے حصے میں مرکز گیر قوتوں کا مقابلہ ہمیشہ سے رہا۔

اس کے باوجود سیاسی اتحاد ذرا مشکل ہی تھا کیونکہ دکن کا کوہستانی مثلث شمالی ہند کے مرکز حکومت سے بہت دور واقع ہوا تھا۔ عصر قدیم کے ذرائع نقل و حمل اتنے سہل نہیں تھے کہ آسانی سے عبور و مرور ہوسکے۔ راستہ کی خرابیاں جدا حائل تھیں علاوہ ازیں شمالی ہند کی فوجیں مدت تک دکن میں نہیں رہتی تھیں اور نہ خود بادشاہ زیادہ دن قیام کرتا تھا چنانچہ جب کبھی موقع ملتا یا کسی کمزور بادشاہ کے تخت نشین ہونے کی خبر ملتی یا داخلی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں سے بد امنی پھیلتی تو جنوبی ہند خود مختار ہو جاتا اور اس طرح شمالی ہند کا اقتدار زائل ہوجاتا اور پھر شمالی حکمرانوں کو از سر نو قوت حاصل کرنی پڑتی۔

دکن کے باشندے مشقت پسند واقع ہوئے تھے ان میں بلا کی پھرتی تھی۔ کبھی وہ دشمنوں سے جم کر مقابلہ کرتے تھے اور کبھی پوشیدہ جگہ سے چھاپے مارتے تھے ان کا خطرناک طریقہ مقابلہ قزاقانہ جنگ تھی جو ان کا مخصوص فن تھا۔

مغلیہ سلطنت سے پہلے دکن کی مختصر حالت مغلیہ سلطنت کے آغاز سے پہلے ہی دکن کی اسلامی ریاست پانچ حصوں میں بٹ گئی تھی۔

(۱) عادل شاہی (۲) نظام شاہی (۳) عماد شاہی (۴) قطب شاہی (۵) برید شاہی۔ تاریخ جہانگیر میں

لکھا ہے کہ دکن کی ان پانچ سلطنتوں کی سیاسی تاریخ اندرونی نفاق اور بیرونی حملوں کا ایک وسیع دفتر ہے۔
قاسم برید ایک غلام تھا جس نے بیدر میں برید شاہی حکومت قایم کی تھی محمود گاواں کے ایک منہ بولے بیٹے نے بیجاپور میں محمد عادل شاہ کے لقب سے اپنا عملدرآمد قایم کر لیا تھا۔ نظام الملک بحری نے دولت آباد پر قبضہ کر کے احمد آباد کی بنیاد ڈالی تھی۔ ایک نومسلم ہندو نے احمد شاہ کا لقب اختیار کر کے ایلیچ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ تلنگانہ کے صوبہ دار نے گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت بنا رکھی تھی اور بقول پروفیسر بینی پرشاد "ہندوؤں کی عظیم الشان سلطنت بیجانگر کا وجود اس الجھاؤ اور فتنوں میں اور بھی اضافہ کا باعث تھا"

اکبر اعظم

شمالی ہند میں تغلق خاندان کے بعد سے کوئی مستقل اور طاقتور حکومت قائم نہ ہو سکی تھی اس لئے دکن کو سیاسی فروغ حاصل رہا۔ لیکن جب سولھویں صدی میں اکبر کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو اسی قدیم طرز عمل کا اعادہ شروع ہو گیا جو دو ہزار سال سے شمال اور جنوب کے درمیان جاری تھا۔ یعنی شمالی ہند اور دکن کے درمیان جنگ و جدال کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

برار احمد نگر کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ بیدر کی حالت رو بہ تنزل تھی۔ البتہ احمد نگر، خاندیس، بیجاپور، اور گولکنڈہ کی اطاعت حاصل کرنی ضروری تھی۔ خاندیس میں فاروقیہ خاندان برسر تسلط تھا اور میراں مبارک شاہ اور اس کے بعد راجہ علی خاں وہاں حکمراں تھا۔ احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکومت کرتا تھا۔

احمد نگر | ۱۵۸۸ء میں مرتضیٰ نظام شاہ کا قتل کر دیا گیا تو میراں حسین اس کا بیٹا تخت نشیں ہوا۔ اس کے بھائی برہان شاہ نے تخت کے لئے کوشش کی اور جب کامیابی نہ ہوئی تو اکبر کے دربار میں پناہ گزیں ہوا اور مدد چاہی۔ اکبر نے برہان شاہ کی اعانت میں ایک فوج روانہ کی جو ناکام واپس ہوئی۔ اس کا انتقام لیا جانیوالا ہی تھا کہ میراں کا انتقال ہو گیا۔ برہان دھلی میں تھا اس لئے احمد نگر پر اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت نشیں کر دیا گیا۔ برہان کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ احمد نگر پہنچا اور ۱۵۹۰ء میں تخت پر قبضہ کر لیا۔

اکبر نے خاندیس، گولکنڈہ، بیجاپور کے ساتھ ساتھ احمد نگر کو بھی سفارت روانہ کی۔ مغل سفارت جب احمد نگر پہنچی تو برہان شاہ نے بڑی طوطا چشمی برتی اور اطاعت سے انکار کر دیا۔ حالانکہ میراں حسین کے خلاف

اس نے مغلوں سے اعانت کی درخواست کی تھی۔ اکبر نے اس انحراف پر سرکوبی کی ٹھانی۔ مگر ۱۵۹۴ءمیں برہان نظام شاہ نے انتقال کیا اور اس کا بیٹا ابراہیم نظام شاہ تخت نشین ہوا۔ ۱۵۹۵ءمیں وہ بھی مارا گیا تو احمد نگر کا کوئی جائز وارث باقی نہ رہا۔ اور تخت کیلئے کشمکش شروع ہوگئی۔ میاں منجھو، احمد نامی ایک کمسن لڑکے کو جس کا شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا تخت نشین کرنا چاہتا تھا اور اخلاص خاں ایک دوسرے لڑکے بہادر کو جس کا تعلق شاہی خاندان سے بہت دور کا تھا وارث گردانتا تھا۔ ان فریقین کے باعث خانہ جنگی رونما ہوگئی۔ میاں منجھو نے مراد سے امداد چاہی اکبر تو چاہتا ہی تھا کہ احمد نگر پر حملے کا موقع ملے۔ چنانچہ لگے ہاتھوں بہانہ ہاتھ آیا۔ شہزادہ مراد گجرات سے اور خان خاناں مالوے سے روانہ ہوئے۔

اس اثنا میں چاند بی بی نے جو ایک عقلمند دور اندیش اور بہادر خاتون تھی۔ احمد نگر کی ڈوبتی کشتی کا لنگر تھام لیا۔ اپنے کمسن بھتیجے بہادر نظام شاہ کی جانب سے خود حکومت کا روبار انجام دینے لگی۔ چونکہ اس کا نسب بیجاپور کے شاہی خاندان سے وابستہ تھا۔ اس لئے اس نے بہت جلد شاہ بیجاپور کو اپنی مدد کیلئے آمادہ کر لیا۔ احمد نگر کے امراء کے نفاق کو دور کیا اور ان کو واقعات سے روشناس کرکے ایک ایسی مرکزیت پیدا کردی جس کی اس نازک صورت حال کی مدافعت کیلئے سخت ضرورت تھی۔

شاہی عساکر کو خیال تھا کہ بہ آسانی کامیابی حاصل ہو جائیگی انہوں نے احمد نگر کا محاصرہ کرلیا اور اس کی تسخیر میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔ ایک دفعہ اس زور سے سرنگ چھوٹی کہ فصیل میں دراڑ پڑگئی اور دکنی سپاہیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ مغل یورش کیا ہی چاہتے تھے کہ چاند بی بی مردانہ وار آگے بڑھی اور ہتھیار تھامے سینہ سپر ہوگئی۔ اگر چاند بی بی اس نازک موقع پر آڑے نہ آئی ہوتی تو مغلوں کا یہ زبردست حملہ کامیاب ہوگیا ہوتا۔ اس نے اس شجاعت آفریں طرز عمل سے ایک جوش اور استعجاب پیدا کردیا۔ سپاہیوں کی ہمت افزائی کی۔ انعامات سے اُن کے دل بڑھائے۔ دکنیوں نے پھر ایک بار مدافعانہ جواب دیا۔ مغل فوجیں جہاں کی تہاں ٹھیر گیئں اور جنگ دوسرے دن کیلئے ملتوی کردی گئی۔ اس التوا کے باعث دکنیوں کو جو فرصت ملی تو انہوں نے شکستہ فصیل کی مرمت کرلی اور اس طرح دوسرے دن مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔

چاند بی بی کرنے کو تو مقابلہ کئے چلے جارہی تھی لیکن وہ بیرونی اعانت سے اتنی ہی مایوس تھی جتنی کہ

اندرونی خلفشار سے اندیشہ مند۔ ادہر شاہی فوجیں محاصرہ کی طوالت سے شکستہ خاطر ہوگئی تھیں۔ رسد کے لئے انہیں طرح طرح کی دقتیں پیش آرہی تھیں۔ اس لئے ہردو فریق آمادہ مصالحت ہوگئے۔ شاہی فوج محاصرہ سے دست کش ہوگئی اور برار پر مغلوں کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا (۱۵۹۵)
انجام کار دانیال مرزا اور خان خاناں کی متحدہ کوششوں سے ۱۶۰۰ء میں احمد نگر کی تسخیر عمل میں آگئی جب کہ اکبر خاندیس کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔

بیجاپور برار پر مغلوں کا قبضہ ہونا ہی تھا کہ بیجاپور پر رزم آرائی کا موقع آگیا۔ ۱۵۹۶ء میں ناندیڑ کے قریب ایک گھمسان کا رن پڑا جس میں بیجاپور۔ احمد نگر اور گولکنڈہ نے اپنے اتحاد ثلاثہ کے ساتھ شاہی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ خاندیس کے باجگذار امیر نے مغلوں کا ساتھ دیا۔ اس جنگ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

خاندیس خاندیس پر راجہ علی خاں بر سر حکومت تھا اس نے دور اندیشی سے کام لیا۔ مغل سفارت کا خیر مقدم کیا۔ مغلوں کی اطاعت قبول کرلی۔ دربار دہلی میں تحائف بھیجے۔
بادشاہ کے عزم دکن (۱۵۹۹ء) کا ایک مقصد تسخیر خاندیس بھی تھا خاندیس کے موجودہ والی بہادر نے جو مرحوم راجہ علی خاں کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کی طرح مغل بادشاہ سے فرماں بردارانہ تعلقات قایم نہیں رکھے تھے ایک عرصہ سے اس نے خراج بھی ادا نہیں کیا تھا۔ اکبر نے اس کے صدر مقام اسیر گڈھ کا محاصرہ کرایا۔ یہاں کے محاصرہ نے محاصرہ احمد نگر سے بھی زیادہ طول کھینچا۔ آخر کار ۱۶۰۱ء میں ڈیڑھ سال کے محاصرہ کے بعد اس کو فتح کرلیا گیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک علیحدہ صوبہ شمار کیا جانے لگا۔

جہانگیر

ملک عنبر سے چپقلش احمد نگر مسخر ہوچکا تھا لیکن اس کی تسخیر سے نظام شاہیوں کا خاتمہ نہ ہوسکا تھا امراد اور بادشاہ میں آئے دن چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی۔ ملک عنبر نے جو ایک زیرک اور شجاع شخص تھا اس منتشر شیرازہ کی سنبھال کا بیڑا اٹھایا تو گویا نظام شاہی خاندان کے نیم جان قالب میں ایک تازہ روح سی آگئی۔ اس نے کھرکی کو اپنا مامن بنایا اور مغلیہ علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کئے قزاقانہ جنگ سے عساکر شاہی کو پریشان کردیا۔ شاہی فوج کے قدم جم نہ سکے۔ خانخاناں جو اس مہم پر متعین

کیا گیا تھا۔ زیادہ نہیں ٹھہر سکا۔ اس کو برہان پور میں پناہ لینی پڑی۔ اس طرح احمد نگر پر دوبارہ نظام شاہی حکومت کا عملدرآمد ہوگیا۔

نظام شاہیوں کی بڑھتی ہوئی قوت خطرناک صورت اختیار کئے جارہی تھی اس لئے اس کے انسداد کے لئے خان جہاں اور شہزادہ پرویز مامور ہوئے۔ برار سے مان سنگھ اور گجرات سے عبد اللہ خاں ازبک ان کی اعانت کے لئے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے عبد اللہ خاں ازبک، ملک عنبر سے دوچار ہوا۔ اس کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ یہ شکست کچھ ایسی تھی کہ شہزادہ پرویز کو مقابل ہونے کی جراءت نہ ہوئی اور ملک عنبر کو استحکامات کے لئے کافی فرصت مل گئی۔

خرم نے جب رانا پر شاندار غلبہ حاصل کیا تو بادشاہ نے اس کو شاہ کا خطاب عطا کرکے دکن کی مہم پر روانہ کیا اور خود مالوہ کی طرف روانہ ہوا تاکہ مرکز جنگ سے قریب تر رہے ابھی شہزادہ خرم دکن پہنچا بھی نہیں تھا کہ چند دکنی سپاہ آپس کی ناچاقی کے باعث مغل سردار خان خاناں سے آملے۔

خان خاناں کے بیٹے نے ملک عنبر کو شکست دی۔ اس طرح جب شہزادہ دکن پہنچا تو کوئی ایسا نہیں تھا جو مدافعانہ جواب دیتا اس لئے نہایت آسانی سے اور بغیر کشت وخون کے فتح حاصل ہوگئی ملک عنبر نے مصلحتاً احمد نگر اور دوسرے مقامات مغلوں کو دے کر صلح کرلی (۱۶۱۶)

تین چار سال بعد ملک عنبر نے پھر قوت حاصل کرکے بغاوت کردی۔ دریائے نربدا کے پار تک بڑھتا چلا آیا۔ شہزادہ خرم سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ پہلے تو اس نے فریق مقابل کو نربدا کے اس کنارے ہٹادیا۔ اور پھر خاص اورنگ آباد پر یورش کی۔ ملک عنبر نے بہتیرے کوشش کی۔ تنزاقانہ جنگ اختیار کی لیکن ہر بار داؤں پٹ پڑا۔ خرم کی جنگی تدابیر اور بہادرانہ کوششوں کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔

ملک عنبر نے پھر عاجزانہ صلح کی درخواست پیش کی اور نسبتاً پہلے سے زیادہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ کشت وخون جنگ۔ جدل اور معرکہ آرائیوں نے اس ملک دکن کو جس کی شادابی اور تموّل کے افسانے سن کر علاؤ الدین نے اس پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالی تھیں۔ ویرانہ سا کردیا تھا۔ رسد رسانی میں مشکلات تھیں۔ اس لئے خرم نے صرف اطاعت کا وعدہ لیکر مراجعت کی (۱۶۲۱)

شاہ جہاں

جہانگیر کے بعد دکن کا فاتح شہزادہ خرم شاہجہاں کا لقب اختیار کرکے اس کا جانشین ہوا۔ برار پر مغلوں کا قبضہ تھا اور احمد نگر میں ان کی فوجی چھاؤنی قائم تھی۔ ملک عنبر کے بعد احمد نگر کی انحطاط پذیر حالت کا سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔

خان جہاں لودھی عہد جہانگیری میں خانجہاں لودھی مہمات دکن پر مامور کیا گیا تھا۔ اس نے موقع سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نگر کا مغربی حصہ بالاگھاٹ نظام شاہیوں کو دے کر صلح کرلی اور شاہ جہاں سے انحراف کیا لیکن جب شاہجہاں کا شاہانہ اقتدار ہر طرف قائم ہوگیا تو اس کے اکثر سردار اور سپاہی شاہی ملازمت میں منسلک ہوگئے اب خان جہاں کا ماتھا ٹھنکا اس نے معافی چاہی اور شاہ جہاں نے عفو سے کام لیکر اس کا قصور معاف کردیا۔ دکن کی بجائے اس کو مالوہ کی صوبہ داری عطا کی۔ خان جہاں نے بادشاہ کی بہی خواہی میں زندگی بسر کرنی شروع کی چنانچہ بندھیل کھنڈ کی شورش میں اس نے بادشاہ کی جانب سے داد شجاعت دی اور بادشاہ کی اطاعت اور بہوا خواہی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ شاہ جہاں نے اس کی اس کارروائیوں پر تحسین و ستائش کی اور پایہ تخت میں طلب کرکے توجہات و نوازشات سے اس کو نہال کیا۔

لیکن خان جہاں کی قسمت کھوٹی تھی۔ جانے اس کو کس شیطانی وسوسے نے اکسایا کہ وہ ایک رات دو ہزار جان نثاروں کو ساتھ لیکر آگرہ سے فرار ہوگیا چنبل کنارے شاہی افواج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ خان جہاں نے شکست کھائی، زخمی ہوا۔ گونڈوانہ کے گنجان جنگلوں میں پناہ لی جہاں نظام شاہیوں کی امداد کا اسے ایقان تھا۔

خان جہاں نے علانیہ بغاوت کردی مرتضیٰ شاہ اس کا معاون بن گیا دکن کے جنگی تسلسل کی بجھی ہوئی چنگاریوں نے پھر آگ کی صورت اختیار کرلی۔ شاہ جہاں خود جنوب کی طرف روانہ ہوا کہ صورت حالات پر قابو حاصل کرسکے۔ برہان پور سے تین فوجیں احمد نگر کی طرف روانہ ہوئیں اور گجرات کے صوبہ دار اعظم خاں کو حکم دیا گیا کہ احمد نگر کے غربی حصوں پر دھاوا بول دے خان جہاں سراسیمہ ہوگیا وہ بیجاپور کی امداد کا متوقع تھا لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی اور اس طرح وہ حالت پریشانی میں وسط ہند کی طرف

چل کھڑا ہوا تاکہ بندھیل کھنڈ سے گذر کر افغانی قبائل سے جا ملے لیکن کالنجر کے قریب ۱۶۳۰ء میں لڑ کر مارا گیا۔

حامیان خان جہاں اب ان لوگوں کی باری آئی جنھوں نے خان جہاں کو مغلوں کے خلاف مدد دی تھی اعظم خاں نے مرتضیٰ شاہ کو جا بجا شکستوں پر شکستیں دیں۔ اسی دوران میں قحط پھوٹ پڑا جس نے الجھنوں میں مزید زیادتی کی۔ ادھر محمد عادل شاہ نے مغلوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مرتضیٰ کے تدارک میں جو فوج روانہ کی گئی تھی اس سے ملک عنبر کے بیٹے نے جو اپنے محسن مرتضیٰ کو قتل کر چکا تھا صلح کر لی۔ شاہی فوجیں بیجاپور میں ہٹ کر اس کو گھیر لیں لیکن محاصرین کو قحط سالی نے پریشان کر دیا اور انہوں نے محاصرہ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ (۱۶۳۲ء)

بہت جلد فتح خاں نے انحرافی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس لئے دکن کا انتظام اور فتح خان کی سرکوبی مہابت خاں کے سپرد کر کے شاہ جہاں واپس لوٹا۔ فتح خان عہد شکن واقع ہوا تھا۔ موقع پر مغلوں کا مطیع ہو جاتا ہے اور پھر ان سے منحرف ہو کر نظام شاہیوں کی تائید کرتا۔ لیکن جب مغل بہادروں کا جنگی مستقر برہان پور بن گیا اور خاندیس و برار پر بھی انہیں دلاوروں کا بالکلیہ قبضہ ہو گیا تو فتح خاں کی دھوکہ بازیاں اور فریب کاریاں بے سود ثابت ہونے لگیں چنانچہ ۱۶۳۳ء میں اس نے اطاعت کر لی اور قلعہ دولت آباد مسخر ہو گیا۔ نظام شاہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔

ساہو کی چالبازیاں اس دوران میں ایک مرہٹہ سردار ساہوجی بھونسلہ نے اپنی قوت استوار کر کے احمد نگر کے مغربی اضلاع پر اپنا تسلط جما یا۔ مہابت خاں مر چکا تھا شہزادہ شجاع جو دکن کا صوبہ دار بنایا گیا تھا اور اس کے مددگار مفسدوں کا قرار واقعی سد باب نہ کر سکے اس لئے شاہ جہاں خود دکن کی جانب روانہ ہوا۔

۱۶۳۶ء میں شاہجہاں نے دولت آباد کو اپنا جنگی مستقر بنایا۔ دولت آباد پہنچنے سے پہلے ہی محمد عادل شاہ والی بیجاپور کو لکھا کہ وہ ساہو اور نظام شاہیوں کو اپنی ملازمتوں سے ہٹائے اور ان کو کسی بغاوت یا شورش میں کسی قسم کی مدد نہ دے۔ نظام شاہی قلعوں سے توپیں ہٹائے۔ اس کے عوض اس کو ریاست احمد نگر کے ساحلی علاقے عنایت کئے جائینگے۔ گول کنڈہ کے بادشاہ کو بھی لکھا گیا کہ وہ مقررہ رقمی پیشکش روانہ کرے۔ شاہ ایران کی بجائے شاہ ہندوستان کا نام خطبوں میں پڑھوایا کرے۔ اس کے علاوہ میں خلفائے راشدین کی حرمت میں جو تبرا کیا جاتا ہے موقوف کرے۔

موخر الذکر نے تو سب کچھ مان لیا لیکن عادل شاہ نے امتثال امر میں لیت ولعل کی۔چنانچہ اس کی سرکوبی کیلئے تین فوجیں روانہ کی گیئں پہلی فوج خان زمان خاں کے تحت بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ روانہ کی گئی جو احمدنگر کی جانب روانہ ہوئی۔دوسری فوج کے (جس کا مقصد ناسک اور جیبر کی تسخیر بھی تھا) سردار شائستہ خان اور الہ دوری خاں مقرر ہوئے۔تیسری فوج خان دوران خان کی زیر سرکردگی اس غرض سے بھیجی گئی کہ اودگیر فتح کرنے کے بعد ضرورت درپیش ہو تو بیجاپور سرحد میں درآئے۔پہلی فوج کو حکم ملا کہ وہ ساہو کی جاگیر اور وطن کو پامال کرتے ہوئے کوکن کے علاقہ میں پہنچ جائے۔

اب ساہوجی اور عادل شاہ کی آنکھیں کھلیں۔ احمدنگر کا علاقہ مفسدوں سے پاک کرکے شاہی افواج بیجاپور میں داخل ہوئیں اور حسب ہدایت ملک کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک تاراج کر ڈالا۔ عادل شاہ نے بادل ناخواستہ کئی لاکھ خراج کی ادائی کا وعدہ کرکے صلح کر لی۔بادشاہ نے ازراہ کرم گستری اس کو نظام شاہی ریاست کے چند ضلعے عنایت کئے۔ساہوجی بھونسلہ کو بھی بیجاپور کی ملازمت کرنے کی اجازت مل گئی یہ صلح نامہ بہت ہی اہم ہے کیونکہ اس سے نظام شاہی حکومت کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا۔بیجاپور اور گولکنڈہ کی نہ صرف قوت ٹوٹی بلکہ آئندہ ان کی فتح کا ایقان پیدا ہوگیا بادشاہ نے دکن کی صوبہ داری پر اورنگ زیب کو مامور کیا اور خود پایہ تخت کی جانب مراجعت کی (۱۶۳۷)

غزل

جناب لیلی بیگم صاحب لیلیٰ

الہی توبہ قیامت فراق کا غم ہے — تمہارے ملنے سے جتنی خوشی نہ ہو کم ہے

تغافل آپ کا کبتک گذر گیئں برسیں — نگاہ لطف کی مشتاق چشم پرنم ہے

نگاہ شوق سے گستاخیاں ضرور ہوئیں — سناؤں کیسے وہ نازک مزاج برہم ہے

نئی جفا کوئی پیش نظر ہوئی شاید — ستم رسیدہ پہ کیوں آج لطف پیہم ہے

بھلائے کیسے کوئی کربلا کو اے لیلیٰ — بسا ہوا میرے دل میں سدا محرم ہے

بزمِ کہکشاں

(۴)

جو بار آسماں زمیں سے نہ اٹھ سکا
تو نے غضب کیا دل شیدا اٹھا لیا (سودا)

آتی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

میری پہلو سے آخر اٹھ گیا غمخوار گھبرا کر
بہت مشکل ہے آکر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب اچھا
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانہ میں تھا

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھینگے تماشہ اپنے نشیمن کا

دل لگانیکی جگہ عالم ایجاد نہیں
خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں

لطف گلگشت چمن کنج قفس میں ہو سے
اب تو نقشہ بھی گلستاں کا مجھے یاد نہیں

مشت پر بلبل نالاں کے جو برباد ہیں سب
ہاتھ پر ہاتھ دھرے سوچ میں صیاد ہیں سب

اگر باب اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی
تو جی میں تھا کہ خواہان دل بے مدعا ہوتے

صندل کو مول لیکر کسکی بلا گھستی
ہیں درد سر کھنچا طریہ درد سر نکریا (آتش)

آنکھ اسکو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے
جلتی چمن میں نرگس بیمار ہو گئی (امیر)

نہایت خوشنما پتھر ہیں پھر بھی لعل پڑوں کے
جنہیں تسکین دی دل کی وہ لعل و زمرد ہو نہیں سکتی (اکبر)

(بیاض ج نقوی بی۔ اے۔)

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں (الم)

اللہ ری اضطراب تمنائے دید یار
اک فرصت نگاہ میں سو بار دیکھنا (تسلیم)

قید میں تجھے تو تھی یہ تمنا کہ ہوں آزاد کہیں
ڈر ہے یہ بال و پر میں چھوڑ نہ دے صیاد کہیں (آرزو لکھنوی)

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا
کیا کلیجہ ہے تماشائی کا

ان کی شہرت بھی گھٹی جاتی ہے
کیا ٹھکانہ مری رسوائی کا (داغ)

"عبرت"

محفل برخاست ہے پتنگے
رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں

ہے کوچ کا وقت آسماں پر
تارے کہیں نام کو رہے ہیں

ان کی بھی نمود ہے کوئی دم
وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

دنیا کا یہ حال ہے اور ہم کو
کچھ فکر نہیں ہے رو رہے ہیں (رہبر)

کہانی ہے کہ روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے (سیماب)

(بیاض وحید) بی۔ اے۔

ہر کس خمے کشید در مجلس وصالش
چوں دور خسرو آمد جام و سبو نماندہ

یک روز بود عید بہ یکسال بہ یکبار
ہر روز مرا عید ز دیدار تو ہم دار

تا چہا آئینہ حسرت دیدار تو ام
جلوہ برخود کن و ما را بہ نگاہے دریاب

تو کہ نازمی فروشی بہ نیاز دردمنداں
نظرے بہ خاک ما کن کہ نمیکند زیانے

میگذری و میکنی ناز عتاب زیر لب
بہر خدا نہاں مکن لطف کلام خویش را

(بیاض ؟)

"ثمرۂ غفلت"

جناب ج' نقوی صاحب بی۔ اے

بہار آنے سے پہلے اک پریشاں خواب دیکھا تھا — کہ جیسے چھٹ رہا ہے فصلِ گل میں آشیاں ہم سے

جب چارلس نے اپنی منگنی کا ارادہ اپنے ہونیوالے خسر سے ظاہر کیا اس بوڑھے جہاندیدہ کا پہلا سوال تھا۔
"لیکن تم کیا کما رہے ہو؟"

چارلس "ماہوار پانسو روپیہ سے زائد نہیں —— لیکن لوسی ——!"

جوزف "اُنہہ، اب مجھے اور کچھ سننے کی ضرورت نہیں۔ خیال تو کرو یہ بھی کچھ کمائی ہے۔ اس کو بھی آمدنی کہہ سکتے ہیں!"

چارلس "لیکن میں اور لوسی آپس میں اتنی محبت کرتے ہیں کہ ہم دونوں اسی میں خوش رہیں گے۔ ہم محبت کے بھوکے ہیں پیسے کے نہیں!"

چارلس۔ تو یہ کیا کچھ کم ہے کہ ہم دونوں آپس میں محبت کرتے ہیں۔ یہی محبت ہماری زندگی کو خوشگوار بنانے کافی ہے۔ پیسہ رکھکے کیا کرلینا ہے؟ بہت سی متمول ہستیاں اس سنسار میں ایسی ہونگی جن کے دل کو چین نہ نصیب ہوگا جو دولتمند رہتے ہوئے بھی اطمینان قلب سے تہیدست ہوں گے۔ ہم فقیر ہیں مگر ہمارے پہلو میں ایک محبت کرنیوالا دل ہے اگر میری اس آمدنی سے آپ کی تشفی نہیں ہوتی تو میں یہ بھی کہنے میں کیوں پس و پیش کردں کہ کچھ اور کام بھی کرلوں گا۔"

جوزف "وہ کس قسم کا کام ہے آخر؟ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ رہے محبت کے خواب اور عشق کی راگنیاں یہ مجھے مت سناؤ۔ میں اس نگری کا پرانا پاپی ہوں۔ دریا کے سامنے قطرہ کی بحث؟"

چارلس۔ میں فرنچ میں چند طلبار کو سبق دیا کرتا ہوں۔ ترجمہ وغیرہ کرلینا۔ سرکاری ملازمت کے علاوہ یہ کام بھی ہوتا رہیگا۔"

جوزف۔ ایک مصنوعی بے کیف لہجہ میں، —"آخر کتنا ترجمہ؟" اس نے پنسل ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

چارلس۔ "میں کوئی حد نہیں بتا سکتا۔ اب یہی لیجئے کہ آج کل ایک فرنچ کتاب کا ترجمہ کر رہا ہوں۔ فی باب دس روپیہ کے حساب سے۔"

جوزف۔ "جملہ کتنے باب ہوں گے اس کتاب میں"؟

چارلس۔ میرے خیال میں ۲۴ باب کی تصنیف ہے!

جوزف۔ چلو بس اور کچھ؟ یا یہ عمر تمام کیلئے کافی ہو جائیگا؟

چارلس۔ "آئندہ کا حال نہیں خبر — کچھ میں عالم الغیب تو نہیں ہوں شاید اس سلسلہ کا اور بھی کچھ کام نکل آئے ابھی تو مجھے اس کا یقین نہیں۔"

جوزف۔ "چیں بر جبیں ہوتے ہوئے کیا کہا؟ یقین نہیں؟ چہ خوش! اور پھر ایک شادی کا بھی قصد کرتے ہیں۔ شادی کا خیال تمہارا نہایت ہی عجیب وغریب ہے۔ میاں صاحبزادے۔ شادی کرنا کھیل نہیں ہے۔ آج شادی کل بچے۔ اس وقت کیا کرو گے؟ آئندہ کا حال دنیا کو دیکھنے سے بھی نہیں معلوم ہوتا؟ کیا تم انسانوں کے زمرہ سے باہر ہو؟ شادی ایک بکھیڑا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال۔ تعلیم تربیت۔ ایسا شخص شادی کا قصد کرے جس کے پاس کافی جائداد ہو یا وہ آمدنی معقول رکھتا ہو۔ زندگی کے ہر مرحلہ کو طے کرنے کیلئے اس کے جیب میں گنجائش ہو۔"

چارلس۔ قطع کلام کرتے ہوئے۔ "لیکن ہم کو اس قدر جلد بچے نہ ہونگے اور ہم دونوں آپس میں اتنی محبت کرتے ہیں کہ ——"

جوزف۔ بات کاٹ کر —— "بکواس مت کرو۔ ابھی تو تمہیں غیب کا علم نہیں تھا پھر کیسے خبر ہو گئی کہ بچے نہ ہوں گے؟ بچوں کا ہونا یا نہ ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ خیر، جب کہ تم اس قدر مصر ہو اور تم دونوں نے قطعی فیصلہ ہی کر لیا ہے کہ خواہ آسمان و زمین ایک جا ہو جائیں ہم شادی ضرور کرینگے۔ تو بسم اللہ۔ میرا بھی اب یہ فرض ہے کہ تم دونوں کو خوشی سے اجازت دوں اب رہا آئندہ کا سوال۔ یہ اب تم جانو۔ میں نے تو نشیب و فراز سمجھائے ہیں۔ اتنی میری ہدایت ضرور ہے کہ اپنی آمدنی میں اضافہ کی حتی الامکان سعی کرو۔ اپنی خاطر نہیں تو سی کی خاطر۔ اس کی زندگی خوشحالی میں بسر ہو جائے۔"

یہ سنتے ہی نوجوان قریب قریب دیوانہ ہوگیا۔ کیونکہ ایسے نٹ کھٹ بڈھے سے اقرار کرلینا ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ دوڑ کر اوس کے ہاتھوں کو چوم لیا " اوخدا وندا۔ آج میں نے کس کی صورت دیکھی تھی؟" اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب!" میری لوسی اس خوشخبری سے پاگل ہو جائیگی۔ جب ہم دونوں راستہ سے گذریں گے لوگ ہمارے سرور و کامران جوڑے کو کس حسرت سے دیکھیں گے"

بس یہی خیالی پلاؤ پکاتا ہوا چارلس روانہ ہوا۔ دوسرے دن شام وہ آیا۔ ساتھ کچھ پروف کا غذات بھی تھے جس سے بڈھے کو تسکین ہوئی کہ خیر یہ کچھ تو کرسکتا ہے۔ چارلس اور لوسی مل کر سینما چلدیئے۔ ٹیکسی کا کرایہ سینما کا خرچ۔ چاء وغیرہ ملاکر ایک ہی شام دس بارہ روپیہ خرچ کرڈالے۔ اسی طرح اس کی متعدد شامیں لوسی کی معیت چڑھ گیئں۔ وہی شام کے واقعات جب کہ وہ گھر پر چند طلباء کو درس دیا کرتا تھا۔ ہوا خوریوں اور دلبستگیوں کے نذر ہونے لگے گویا آمدنی کی صورتیں گھٹنے لگیں اخراجات بڑھنے لگے۔

جوں جوں شادی کا دن قریب آتا گیا دونوں کو گھر کی آرائش کی فکر ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ ضروریات زندگی کی اشیاء اور کچھ فرنیچر سے گھر کو خوب آراستہ کریں۔ پلنگ نہایت عمدہ اور قیمتی مع بستر کے خریدے گئے۔ لوسی نے اپنے سنہرے بالوں کی مناسبت سے نیلے رنگ کے لحاف پسند کئے ایک سرخ شیڈ کا لیمپ خریدا۔ وینس کا ایک مرمریں مجسمہ لیا۔ کھانیکی میز کا جملہ سامان۔ باورچی خانہ کی ضروریات کے برتن لوسی کی ماں کے ایماء سے خریدے گئے کیونکہ وہ ایک تجربہ کار عورت تھی۔ چنانچہ نوجوان کونسلر کیلئے یہ ایک مصروف زمانہ تھا۔ مناسب و موزوں مکان کی تلاش۔ مزدوروں کا مہیا کرنا۔ پھر فرنیچر کی آراستگی چکوں کا لٹکنا —— اور کیا کچھ نہیں!!

خیر رفتہ رفتہ یہ ایک قدرتی امر تھا کہ چارلس اس سے زیادہ اپنی آمدنی میں اضافہ نہ کرسکتا تھا۔ لیکن جب اسی محدود آمدنی میں شادی کا سرانجام بھی ہوا تو اس کو چار و ناچار اپنی زندگی گذارنی تھی۔ اس کو یوں بھی وقت نہ ملتا تھا کہ وہ سرکاری ملازمت کے علاوہ خانگی کوئی مشغلہ کرے۔ تمام دن کی دماغی محنت سے اس کا دماغ بالکل تھک جاتا تھا۔ ایک ہتھیار جو رہگیا تھا انہوں نے اسی سے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔ یعنی انتہائی کفایت شعاری" سے گزارنے کی کوشش ہونے لگی۔ زندگی کا آغاز

دو مختصر کمروں سے ہوا۔ بہرصورت تم ایک چھوٹے گھر کی آراستگی بہ نسبت ایک بڑے گھر کے نہایت عمدگی سے کرسکتے ہو۔ انہوں نے (۴۰۰) روپیہ میں ایک مکان خریدا جس کی کل کائینات دو کمرے۔ ایک باورچیخانہ اور ایک مودی خانہ تھا۔ جہاں سچی محبت کا طوطی بولتا ہو وہاں تکلیف و درد کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ لوسی نے خیال کیا کہ" یہ تکلیف بھی میرے لئے عین راحت ہے کیونکہ چارلس جیسا چاہنے والا شوہر میرا شریک حیات ہے"!

بہرکیف کمرے آراستہ کئے گئے۔ خوابگاہ کا کمرہ تو بعینہٖ "ایک مصور کا خواب" معلوم ہوتا تھا۔ دو بستر ہم پہلو۔ گویا ناقہ کی ایک جوڑی ہے جو کاررواں حیات میں متفق گامزن ہے اور اس طرح زندگی کی مسافت کو باہم ملکر طے کر رہی ہے۔ نیلے رنگ کے خوبصورت پلنگ پوش۔ برف کی طرح سفید چادر اور تکیے ان کے نفاست و پاکیزگی کا ثبوت دے رہے تھے دوسرا کمرہ کافی وسیع تھا جس میں ایک بلند خوبصورت سکرین اور لوسی کے جہیز کے باجے پیانو کو کچھ اس ترکیب سے رکھا گیا تھا کہ اس ایک کمرے کے تین حصے ہو گئے تھے۔ کھانے کا کمرہ۔ نشست کا کمرہ اور مطالعہ کا حصہ جس میں ایک دیدہ زیب ٹیبل رکھا ہے۔ اطراف چار کرسیاں ہیں۔ میز پر ایک دلفریب گلدان ہے۔ مطالعہ کے کمرہ میں ایک قدآدم آئینہ۔ ایک کتابوں کا شلف ایک سٹ صوفا بڑی آن بان سے ڈرائینگ روم کی زینت کو دوبالا کر رہے ہیں ——!

سینیچر کی شب ان کی شادی ہوئی۔ یہ دوسرے دن کی صبح کا ذکر ہے۔ طلوع آفتاب کی ہلکی ہلکی سرخ زرد کرنیں دریچہ کی جھلملیوں سے وینس کے مرمریں مجسمہ پر پڑ رہی ہیں —— لوسی ہنوز خواب راحت میں ہے راستہ کی بنڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ اس کے نیند کے عمیق تسلسل میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ گرجے میں گھنٹے بج رہے ہیں۔ چارلس علی الصباح ہی اٹھ چکا ہے اور ناشتہ کے انتظام میں مصروف ہے۔ بتدریج لوسی نے انگڑائیاں لی اور پھر بیدار ہوئی۔ چارلس بس ہرطرح لوسی کی خاطر میں مصروف ہے ناشتہ کی میز پر بیٹھنے کے بعد اس کی پہلی استدعا تھی کہ وہ شراب کا ایک گلاس پی لے۔

لوسی۔ ذرا غور توکرو اماں کیا کہیں گی جب وہ سنینگی کہ ان کی بیٹی شراب پیتی ہے۔ شاید شادی کا یہ طرۂ امتیاز ہے؟!

چارلس آج خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ وہ تلے ہوئے جھینگوں کی رکابی سامنے رکھے ہوئے بیئر کا گلاس لئے ہوئے سوچ رہا ہے۔ "کتنے بیوقوف ہیں یہ لوگ جو شادی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور درحقیقت یہ کتنے خود غرض ہیں اُن پر ٹیکس کیوں نہیں لگایا جاتا جس طرح کتوں پر ٹیکس لگتا ہے؟" اسی قسم کے سوالات کی وہ لوسی پر بوچھاڑ کر دیتا ہے ——— لوسی نے پیشانی سے بال کی لٹ ہٹاتے ہوئے کہا :۔ شاید وہ لوگ جو شادی نہیں کرتے پیسہ نہ رکھتے ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ خود انہیں کی ضروریات زندگی کیلئے ان کی آمدنی ناکافی ہو گی ——— یا پھر نہ معلوم کیا وجہ ہے!"

چارلس دل ہی دل میں ——— "اونہہ لوسی کا جتنا دل اتنی بات اس نے کی۔ محبت کیلئے پیسہ کی کیا ضرورت ہے۔ اطمینان قلب و روحانی مسرت کیا یہ سامان دولت سے مہیا ہوتے ہیں؟ جہاں محبت ہے وہاں بے سروسامانی کا بھی احساس ہوا ہے؟ بیوقوف لڑکی!" یہ اس کے خیالات تھے ——— "ان لوسی تمہیں کیا خبر میری زندگی جب کہ تم میرے ساتھ ہو کتنی خوشگوار و دلفریب ہے!"

تقدیر کی دیوی شاید ان پر کھڑی ہنس رہی ہو گی کہ ایک دن سے سب دن کا اندازہ لگانا کس قدر سادہ لوحی ہے! ہر روز شام یہ دونوں ہوا خوری کیلئے نکلجاتے ——— شادی کا پہلا مہینہ بڑے ترک و احتشام سے گذرا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ ناچ۔ دعوتیں۔ پارٹیاں۔ تھیٹر۔ سینما۔ غرض دنیا کی کوئی دلچسپی کی ہوس انہوں نے اپنے دل میں باقی نہ رکھی۔ ان سب پر مستزاد، گھر پر جو وقت کٹتا۔ ایک سائبان کے نیچے جو دن گذرتا اس کی تو مسرت کا ٹھکانا نہ ہوتا۔ پہلے پہلے تو چارلس اسراف کو بہت بری نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کو بمنزلہ گناہ سمجھتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ زبان کی چاٹ نے اس کو انتہا درجہ کا فضول خرچ بنا دیا۔ لوسی کا دل اگر کسی چیز کو چاہتا تو وہ ڈھیروں سے لاکر ڈال دیتا۔ جو تھوڑا بہت کھانے کے بعد رائیگاں جاتی۔ لوسی ان باتوں سے منع کرتی تو اس کو تکلیف ہوتی کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو بہت کم کوئی چیز خریدتے ہیں کیونکہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ ان پہ اب تو دنیا ختم ہونیوالی ہے۔ ہم کو کل تو مرنا ہی ہے۔ اب پیسہ کیوں خرچیں"! کیا میں ان میں سے ہوں؟ اسراف بھی اگر کرتا ہوں تو تمہاری خاطر" چنانچہ

لوسی نے اب اس کو کچھ کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

یوں ہی ایام گذرتے گئے۔ دو تین ماہ کے عرصہ میں اس کی طبیعت کچھ مضمحل سی رہنے لگی۔ کیا وہ نزلے کا شکار تو نہ ہوئی؟ یا شاید دیگچیاں بے قلعی ہوں گی جن کا زہریلا اثر اس کے جسم میں سرایت کر گیا ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے لوسی کی تشخیص کرکے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ "شاید دیوار پر جو رنگین کاغذ لگائے ہیں ان کی سمیت ہوا کے ذریعہ اس کے پھیپڑوں میں پہنچ گئی ہے اور اس کی یہ حرارت رہتی ہے"!

چارلس نے وہ کاغذات دیوار سے کھینچ کر دوا ساز کے یہاں بھیجے کہ ان کی جانچ کی جائے لیکن وہ زہریلے اثر سے عاری نکلے مگر لوسی کی علالت میں افاقہ نہ ہوا۔

چارلس نے ساری طبی کتابیں دیکھ ڈالیں لیکن اس کی عقل چکر میں تھی آخر لوسی کی محبت کا "ڈانواڈول" ہونا اس کی دلیل تھی کہ وہ حاملہ ہے۔ اب چارلس کو دوسری ہی فکر شروع ہوئی اس نے اپنا وہ فقرہ یاد کیا جب کہ اس نے بڑی شان سے اکڑ کر اپنے خسر کو جواب دیا تھا کہ "ہم کو بچے ابھی نہ ہونگے"۔۔۔۔ معاً اس کے ان وحشت ناک تخیل میں ایک خوش آئند لہر اٹھی کہ "ابا اور اماں کہلانا بھی کس قدر خوش بختی کی بات ہے"۔ "مجھے ضرور لڑکا ہوگا۔ ہم کو چاہئے کہ ہم ابھی سے اس کا کوئی اچھا سا خوبصورت نام تجویز کریں۔"

لیکن لوسی؟ اس کے تخیلات کے عمیق سمندر میں سکون نہ تھا۔ اس کو قسم قسم کے خیالات آرہے تھے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ چارلس بجائے کچھ پس انداز کرنے کے یا آمدنی کو زیادہ کرنے کی صورتیں مہیا کرے اپنی زندگی انتہائی فضول خرچی میں بسر کر رہا ہے۔ شراب تو اس کا لازمۂ زندگی ہے۔ لہو و لعب تو بالکل معمولی سی باتیں۔ آمدنی کی وہی صورت جو پہلے تھی سو اب بھی ہے اس نے کہا:۔

"اب تم ہی بتاؤ کہ یہ مرحلہ کیسے طے ہوگا جب کہ ہم بالکل قلاش ہیں۔ یہ زبردست انقلاب بھی زندگی میں اس قدر جلد رونما ہوا۔ یہ اونٹ آخر کس کروٹ بیٹھے"؟

اس کی معقول گفتگو سن کر چارلس سناٹے میں آگیا۔ فوراً اس کو اپنے ایک بیرسٹر دوست کا خیال آیا۔ اس نے کچھ پرامیسری نوٹ کا انتظام کرنے کے خیال سے اس کے گھر کا راستہ لیا۔ وہاں اس سے گفتگو ہونے کے بعد اس نے کہا:۔ "میرے دوست! شادی کوئی گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک قیمتی

سوداہے۔ اس میں پیسہ کا کھیل ہے اور سمجھ کی ضرورت۔ میں خود اس کا شکار ہوں۔ تم مجھ سے کسی قسم کے قرضہ کی امید نہ رکھو ——"

چارلس جو اب تک سمجھا ہوا تھا کہ قرض کی ماں تو نہیں مری ہے۔ اپنا سا منہ لیکر رخصت ہوا۔ ہیگ اپنی التجا رد ہوتے ہوئے دیکھ کر بہت صدمہ ہوا۔ لیکن —— دنیا کا جن کو تجربہ ہو چکا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ مسرت میں ایک کشش ہے کہ اپنے پرائے سب کھینچے چلے آتے ہیں مصیبت و تکلیف کے حصہ دار ہیں کہاں؟

ایک شام چارلس شاپنگ کیلئے گیا۔ راستہ میں اس کو نہایت اچھے سٹرابری نظر آئے اس نے بلا پس و پیش دو سیر خرید لئے اور معاملہ ادھار رہا۔ بڑے فاتحانہ انداز سے لوسی سے کہنے لگا —— "ذرا غور تو کرو دو سیر سٹرابری تین روپیہ میں اور پھر آج کل کا زمانہ۔ کس قدر سستے ہیں نا؟"

"اُف۔ پیارے چارلس اب یہ زمانہ ایسے اسراف کا نہیں رہا۔ آخر۔ اتنے سب کیا ہونگے؟ پھر تم کو بھاؤ کرنا بھی نہیں آتا" "پیاری لوسی فکر نہ کرو۔ میں نے اب یہ ٹھان لی ہے کہ کچھ اور دھندا کروں۔ اس طرح تم عنقریب دیکھو گی کہ آمدنی میں اضافہ کی صورتیں نکلتی آتی ہیں ——"

لوسی:۔ لیکن آخر ہمارے قرضوں کا کیا حشر ہوگا؟

چارلس۔ کیوں اس کی تمہیں کیوں اتنی فکر ہے؟ میں ایک بہت بڑی رقم کسی ساہوکار سے لیلوں گا۔ اور جملہ چھوٹے موٹے قرض ادا کر دینگے۔"

لوسی۔ اوہ چارلس تو کیا یہ ایک بالکل نیا قرض نہ ہوگا۔

چارلس۔ اونہہ۔ اس کا کیا مضائقہ۔ چو طرف سے قرض کی یکسوئی تو ہو جائیگی۔ اب اس وقت ایسے خوشگوار موسم میں بدمزہ گفتگو نہ کرو۔ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ تمہاری موجودہ حالت بھی اس قابل نہیں کہ تم اپنی جان کو افکارات میں گھلا ڈالو۔ وہ اسٹرابری جو میں نے لائے ہیں ان کے ساتھ ایک گلاس شیری کا کیا خوش ذائقہ چیز ہوگی۔" یہ کہتے ہی کہتے فوراً ملازم کو بازار بھجوایا گیا کہ ایک شیشہ شیری جلد لیتا آئے۔

دوپہر کے قیلولہ کے بعد ایک شام لوسی نہایت پریشان و مضطرب اٹھی۔ اس نے چارلس سے پوچھا۔

"کیا میں تم سے کچھ کہوں تو تم برا تو نہ مانو گے"!

چارلس۔ نہیں ہرگز نہیں۔ میں اور تمہاری بات کا برا مانوں؟ آخر وہ کیا ایسی بات ہے؟ کیا تمہیں گھر کے انتظام کے لئے کچھ رقم درکار ہے؟

لوسی۔ ارے کہاں کا گھر اور کس کا انتظام! نان بائی نے تقاضا شروع کر دیا ہے۔ قصاب تو دھمکیوں کے سوا بات نہیں کرتا۔ درزی کے بل علیٰحدہ چکتا کرنے ہیں۔ اور ادھر ادھر کے بیسیوں قرض ہیں۔ تم کو نیند کیسے آتی ہے اتنا قرض رکھکر!

چارلس۔ اچھا کل ہم ان کی پائی پائی ادا کر دیں گے۔ لیکن اس وقت ہم کو اپنے دماغ پر اتنا بوجھ نہ ڈالنا چاہئے۔ ہر بات کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ ہمیشہ وہی ایک تذکرہ۔ تمہیں سوائے اس کے اور کچھ یاد بھی ہے؟ چلو پارک چلیں۔ تھوڑی دیر چہلقدمی کر آئیں ذرا خیالات تو بٹ جائیں گے۔ اب قرض ہے تو کرتے کیا؟ "سنگ آمد وسخت آمد"۔

چارلس ایک بیفکر وخوش دل انسان تھا۔ وہ بہت کم کسی بات کو دل پر لیتا۔ اور لوسی کی حالت بھی آج کل ایسی نہ تھی کہ اس کے خیالات پراگندہ سے اس کی صحت متاثر نہ ہو۔ چنانچہ وہ جہاں تک ممکن ہوتا ان وحشت ناک تصویروں پر پردہ ڈال دیتا۔ اور اس کے دل بہلائی کا سامان کرتا۔ لیکن لوسی کو یہ خلش بےچین رکھتی۔ چنانچہ دونوں رسٹران پہنچے۔ اور ایک پرائیوٹ روم میں کھانا کھایا۔ عام کمروں کے مسافر جو کھانے پینے آئے تھے اس اڑ پنچھو جوڑے کو دیکھ کر مضحکہ اڑاتے رہے۔ چارلس کو یہ مضحکہ بھی دلچسپ معلوم ہوا ہے

سب کچھ روا ہے جنگ ومحبت کے باب میں

کھانے کے بعد لوسی نے جب بل دیکھی اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ارے یہ کیا ہے اسی قسم کے بیسیوں بل گھر پر پڑے تھے جن کی ادائی کے تقاضے ہو رہے تھے۔

گھنٹے۔ دن۔ مہینے۔ گذرتے چلے ـــــ اب وقت آگیا تھا کہ ایک ننھی جان جو دنیا میں قدم رکھنے والی ہے اس کی ضروریات زندگی کے سامان کئے جائیں ـــــ جھولا۔ کپڑے۔ بستر۔ نرس وغیرہ وغیرہ۔

ادہر قصاب اور بنیئے نے ادھار دینے سے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ دن بھرے افکار و پریشانی میں

گذرتے تھے۔

خیر — خدا خدا کرکے وہ گھڑی آپہنچی کہ چارلس ایک بچی کا باپ بن گیا۔ موجودہ پریشانیوں نے اس کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ نرس کی تلاش اور نئی ذمہ داریوں نے اس کے دماغ کے تاروں کو کچل کر رکھدیا تھا بچی کو گود میں لیکر پیار کرتا اور آنکھیں ڈبڈبا آتیں یہ آمدنی جس میں دو کی گذر بمشکل ہو رہی تھی تو ضخواہوں نے زندگی کو ایک پریشان خواب میں تبدیل کر دیا تھا — ضروریات زندگی کا طے پانا ایک طوفان نوح کا سامنا تھا۔ یہ تیسری ہستی کا عالم وجود میں آنا اس کے لئے ایک طرف باعث مسرت تھا تو دوسرے ہی رخ پر موجب صد الم — جس کا خیال فطری طور پر اپنے سے زیادہ رہتا ہے۔ چارلس آخر کبتک ترجمے کرکے گذارا کرتا! اور پانسو روپیہ بھی کوئی آمدنی تھی جو مستقل طور پر اس کو مل رہی تھی۔

اس کے حیلہ تخیل میں ان پریشانیوں کے ہجوم میں صرف ایک کا خیال آتا تھا اور وہ اس کا خسر تھا۔ اس نے سوچا۔ اب جو کچھ بھی ہو اسی سے مدد چاہنی پڑیگی۔ غیرت کو ایک طرف رکھدیا اور بوڑھے خسر کے پاس پہنچا۔ اس نے بڑی ترش روئی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ "بس یہ میری آخری امداد ہے جو تم کو پہنچ رہی ہے۔ مجھے خود میری آمدنی کافی نہیں ہوتی اور لوسی ہی میری ایک اولاد نہیں ہے"!

چارلس ندامت کے آنسو رو رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ — !!

لوسی کا یہ زمانہ ایسا نہ تھا کہ اس کو معمولی غذائیں دیجائیں۔ اس کے کھانے کیلئے تو خاصہ انتظام کرنا پڑتا تھا۔ مرغی کا شوربا اور شراب اس کے لئے ضروری و مفید غذائیں تھیں اور پھر نرس کی تنخواہ اس کے کھانے پینے کا انتظام وغیرہ۔

خوش قسمتی سے لوسی بہت جلد تندرست ہوگئی۔ یہ بڑی خوبصورت تھی ماں بننے کے بعد اس نے ایک غیر معمولی روپ لیا۔ اس کے قد وقامت میں ایک قسم کا لوچ اور کشش رونما ہوئی۔

ایک روز اس کے والد نے بڑی بے رخی سے مخاطب کیا۔ "اب زیادہ بچوں کی ضرورت نہیں۔ یہ چونچلے مجھے نہیں بھاتے۔ اگر اور بچے ہوں گے تو تم دونوں کے ساتھ میں بھی تباہ ہو جاؤں گا"! غرض بچوں پر خوب زبردست لکچر دیا گیا لعنت ملامت ہوئی اور یہ قصہ ختم ہوا۔

کچھ دنوں چارلس اورلوسی کا زمانہ یوں ہی "محبت اور قرض" میں بسر ہوا۔ایک دن نصیبہ کی گردش کا ایسا آیا کہ دیوالہ نکلنے کی نوبت آگئی۔ قرض خواہوں نے نالش کردی۔ گھر کا سارا اسباب جس کو اتنی خواہش اور سلیقہ سے خرید اتھا نیلام ہوگیا۔ بوڑھا جوزف اپنی لڑکی اور نواسی کو لیکر چلتا پھرتا نظر آیا۔ لوسی چارلس کو اس طرح تنہا بہ تقدیر عالم کس مپرسی میں چھوڑنے کسی عنوان راضی نہ تھی لیکن بچی کا خیال جس کی زیست کے لالے پڑے تھے اس کو مجبور و دل شکستہ کردیا۔ اپنے باپ کے ساتھ آب دیدہ روانہ ہوئی۔

یہاں چارلس بیک بینی و دوگوش اپنے اسباب کی گت بنتے دیکھ رہا تھا اور اس کو چوں وچرا کی مجال نہ تھی۔ غیرت۔ شرمندگی۔ تاسف۔ ناعاقبت اندیشی نے اس کے لب پر مہر سکوت لگادی تھی۔ اس کے تخیل کی دنیا میں ایک غیر معمولی ہلچل تھی آج اس کو یقین ہوگیا کہ واقعی دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔

شراب کی چاٹ۔ قرض بے ہنگام لینا۔ ناعاقبت اندیشی کی اندھا دھند زندگی کے آخر میں نتائج نکلنے والے تھے۔ جب یہ بالکل ہی بے سہارا ہوگیا۔ تنہا اور خانہ بدوش، نہ آمدنی، نہ سرمایہ، اس وقت کہیں جاکر تلافی مافات کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ آدھی آدھی رات گئے تک بیٹھ کر ترجمے کرتا۔ طلبا کو فرنچ کا سبق دیتا اور پھر وہی اپنی سرکاری ملازمت۔ اس کے جلاد و بے مہر خسر نے اس کے ساتھ صرف اتنی رعایت کی تھی کہ وہ سنیچر کے دن صرف ایک گھنٹہ کے لئے اپنی بیوی اور بچی سے مل لے اور بس ـــــ سالہا سال چارلس پر سے اسی طرح گذر گئے۔ بہرکیف وہ احسان فراموش نہ تھا۔ اپنے خسر کا شکرگزار تھا جس نے اس کی بیوی اور بچی کی کفالت ورنہ اس کا گذارا مشکل ہوتا۔ ماہوار ساری کی ساری قرضخواہوں کے بھینٹ چڑھ جاتی اور بسر اوقات کیلئے اس کو بہت کم رقم بچی رہتی ـــــ!

ہاں ـــــ سچ ہے انسانی زندگی واقعی بڑی کٹھن منزل ہے۔ بڑی ہی سخت اور ظالم۔ جانوروں کو غذا آسانی سے مل جاتی ہے جتنے ذی۔روح ہیں ان میں سب سے زیادہ سختی کا مورد غریب انسان ہے جس کو بغیر محنت کے روٹی نہیں ملتی۔ کہیں سر کھپانا ہے کہیں جان گھلانا ہے۔ کہیں ہاتھ پیر ٹوٹتے ہیں کہیں دماغی کاوشیں ہیں کہیں دلی صدمات ہیں۔ غرض کہیں کچھ تو کہیں کچھ جب جاکر پیٹ چلتا ہے۔ اگر آج کسی لوڈھیروں سے سٹرابری کھانے کو مل جائیں اور شراب کی بوتلیں لڑکتی رہیں۔ اور احباب کی محفلیں گرم ہوں تو زمانہ کے

انقلاب اور نتیجہ عاقبت سے اس کو بے فکر نہ ہونا چاہئے ـــــــ واقعی
" زندگی ایک بلا ہے جو "بلا وجہہ" آدم اور اس کی اولاد پر نازل ہوئی۔"

(توجہ)

یادِ رفتگاں

آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے حضرت فیض کے عرس کے موقع پر جو شاندار مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی یاد تو اب داستان ماضی رہ گئی ہے۔

زمانہ کے ساتھ مذاق۔ عادات بھی بدلنے لگے اب وہ مشاعرے کہاں! اور وہ دلچسپ صحبتیں کہاں؟ جس کیلئے شعرا اپنے کلام کی تیاریوں میں کئی مہینوں سے مصروف رہا کرتے تھے۔ اسی محفل کی ایک شمع مرد "تفضل حسین صاحب" بھی تھے ان کا مخصوص انداز یہ ہوتا تھا کہ فارسی طرح کو "اردوایا" کرتے تھے۔ تا کہ تفنن طبع کا سامان بھی مہیا ہو جائے۔

موجودہ صدر اعظم بہادر یعنی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کا کلام بھی اسی مشاعرہ میں پڑھا جاتا تھا جو اوس زمانہ میں "پیشکار" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ "تفضیل" اپنے ہر غزل میں مہاراجہ بہادر کی مدح وثنا فرماتے تھے چنانچہ ذیل میں چند شعر نقل کئے جاتے ہیں کہ عہد رفتہ کی یاد تازہ رہے۔

—(۰)—

پھاڑ کر ملبوس سارا تار تارم کردہ اند
وصل کے وعدہ پہ از بس بیقرارم کردہ اند

رشتہ نار دکو گویا رشتہ دارم کردہ اند
ایک بوسہ کیلئے امیدوارم کردہ اند

وہ نہ آتے تھے جو آئے تو قیامت ساتھ لائے
دامن ساڑی سے گل شمع فرازم کردہ اند

آج میخانہ میں کرتے تھے شکایت شیخ جی
صحبت رندان میکش بادہ خوارم کردہ اند

پوچھتے ہیں جو تفضل سے تو کہتا جھوٹ ہے
نظم میں نوکر جناب پیشکارم کردہ اند!

گولکنڈے کا جان نثار

قطب شاہی تاریخ کا ایک واقعہ انگریز مصنف کے قلم سے

جناب م۔ سروری صاحبہ

بوڑھا محمود ایک رات پہرہ گھر میں دیر تک بیٹھا اُن سپاہیوں سے گفتگو کر رہا تھا جو پہرہ ختم کر چکے تھے اُس نے اپنی لانبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جو حنا میں رنگی ہوئی تھی فارسی کا مشہور مقولہ پڑھا:۔

" تم کس کے متعلق گفتگو کر رہے ہو" ایک سپاہی نے پوچھا؟

اور کون؟ دروازے کے باہر کے دشمن کے متعلق۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے متعلق۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ عجیب وغریب آدمی ہے بہت کم لوگ ہیں جو اس سے محبت کرتے ہیں اور بہت سے ہیں جو اس سے ڈرتے ہیں۔"

" یہ صحیح ہے۔ لیکن لوگ اسے عدل گستر کہتے ہیں۔ گو خراج کے معاملہ میں اس نے شرط انصاف نہیں برتی"

" یہ کس طرح؟"

ہمارے ظل اللہ ابو الحسن نے معاہدہ کے مطابق جواہرات کی کشتیاں روانہ کیں اگر اورنگ زیب وعدہ وفا کرتے تو ہم امن چین میں رہتے۔ لیکن جواہرات کے پہنچتے ہی یہ خبر آئی کہ اورنگ زیب کثیر فوج کے ساتھ ہمارے شہر گولکنڈہ پر چڑھائی کرنے آ رہے ہیں"؟

" آہا! ان کو خبر نہیں کہ ان کے سر پر کیا مصیبتیں نازل ہونیوالی ہیں"

" نہیں۔ بیشک نہیں"

" سنا ہے کہ ان کے پاس آدمیوں کیلئے کافی سامان رسد موجود نہیں ہے نیز ان میں پلیگ بھی پھوٹ پڑا ہے کئی راہی عدم ہو چکے اور بہت سے ابھی مرنے پر تیار ہیں"

" یہ میں نے بھی سنا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے پاس شہر میں اب بھی کافی سامان رسد موجود ہے۔ ہمارے غلے اور چاول کے گودام بھرے پڑے ہیں اور جانوروں کیلئے بھی کافی چارا بھیا ہے۔

فصیل سے باہر ہمارے سواروں نے بہت دلیری سے کام انجام دیا ہے"

"خدا بچائے۔ مغل فوج سمندر کی موجوں کی طرح اُمنڈ پڑی ہے وہ شمار میں ہماری فوج سے بہت زیادہ ہے"

"زیادہ ہو اکرے کسی شہر کا محاصرہ کرنا اور بات ہے اور اس کو قبضہ میں لانا اور بات۔ عرصہ ہوا شہنشاہ کے آدمیوں نے فصیل پر چڑھنے کی کوشش کی تھی۔ سنو تو یہ کس کی آواز ہے ؟"

"کتا بھونک رہا ہے۔ کتا"

"کتے کی آواز ہوتے ہیں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن ایسا وحشت سے بھونک رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی آفت نازل ہوئی ہے۔ دیکھنا وہ فصیل پر چڑھ گیا دوسرے لوگ بھی چوکنے ہوگئے۔ کوئی آفت اُٹھ کھڑی ہوئی" تیار۔ تیار !

"سن !" ایک گولی ہوا میں سنسناتی ہوئی نکل گئی اور ایک لمحہ میں پوری فوج تیار ہو گئی کیونکہ پہرے کے سپاہی نے کتے کی وحشت ناک بھونک سن لی تھی اور اس چیز کو دیکھ چکا تھا جس کو کتے نے دیکھا تھا۔ دھندلی شکلیں رات کی دھندلی روشنی میں دبے پاؤں رینگتی اور قلعہ کی فصیل پر چڑھنے کی غرض سے اپنی سیڑھیوں کو فصیل سے جاتی نظر پڑیں۔

"دل مضبوط رکھو۔ میرے دوست صرف ایک کتا بھونک رہا ہے" ایک نے دوسرے سے سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "پہرے دار سپاہی سو رہے ہیں"

ابھی یہ گفتگو ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نہ نظر آنیوالے ہاتھوں نے۔ سیڑھیاں گرادیں اور حملہ آوروں میں پہلے ایک کو اور پھر دوسرے کو گولی کا نشانہ بنا کر مار دیا ـــــ

جب ابوالحسن تاناشاہ کو بعد میں یہ حال معلوم ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ کتے کے گلے میں سونے کا پٹہ ڈال دیا جائے۔

"کاش کہ بادشاہ کی تمام رعایا ایسی ہی وفادار اور جان نثار ہوتی جیسا کہ یہ کتا ہے" بوڑھے محمد نے کہا۔

دوسری دفعہ مغل شہنشاہ نے حملہ کی ایک اور تجویز سوچی۔ اس نے حکم دیا کہ پچاس ہزار تھیلے مٹی سے بھرے ہوئے لائے جائیں اور شہر کی فصیل کے اطراف خندق ان تھیلوں اور لکڑی کے کندوں سے بھری جائے۔ سب سے پہلے تھیلے کو شہنشاہ نے خود اپنے دست نازک سے سیا۔ عجیب بات ہے کہ وہ سینے کے کام سے ناواقف نہیں تھے۔ کیونکہ ایک زمانہ میں اپنی روزی کمانے کیلئے انہوں نے ٹوپیاں تیار کرنے کو اپنا فرض گردان لیا تھا۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ دنیا کے سب سے زیادہ مالدار شہنشاہ تھے۔

خندق کا بھرنا شہر پناہ کو سرنگ کے ذریعہ اڑانے کے سلسلہ میں پہلا قدم تھا۔ آخر کار سرنگوں کو آگ لگا کر اڑانے کا دن آگیا تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں اور جلد ــ کم سے کم وہ توقع رکھتے تھے ـ ایک بڑا شگاف فصیل میں پڑ جائیگا جس سے مغل سپاہی قلعہ میں داخل ہوکر فتح و نصرت کے علم بلند کرسکیں گے۔ لیکن شگاف جو پڑا وہ قلعہ کی فصیل میں نہیں تھا بلکہ مغل فوج کی پہلی صف میں۔ کیونکہ گولکنڈہ کے محافظین دوسری سرنگیں کھود کر غنیم کی سرنگوں کو ضائع کرنیکا انتظام کرچکے تھے اور جو ایک دھماکہ ہوا اس سے کئی درجن مغل سپاہی گرتی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کے نیچے دب کر مرگئے۔

"پتھر اینٹیں اور آدمی ہوا میں کبوتروں کی طرح اڑ رہے تھے"

گولکنڈہ کے لوگوں نے اس واقعہ کا بعد میں ذکر کرتے ہوئے کہا۔ دھماکے کے آواز سے جو انتشار پیدا ہوا۔ اس میں شہر پناہ کے محافظ سپاہی "ڈراتے ہوئے غنیم پر گرے اور جو لوگ بدحواسی کی وجہہ سے اپنی حفاظت نہ کرسکے ان میں سے بہت سوں کو تہ تیغ کیا اور کئی زخمی ہوکر بھاگ گئے۔ قلعہ سے توپیں بھی آگ برسانے لگیں۔ خندق کے پچاس ہزار مٹی کے تھیلوں اور لکڑی کے کندوں میں سے جتنے باقی رہ گئے تھے شہر کی فصیل درست کرنے کے کام میں لائے گئے۔

"ارے!" پہرے کے سپاہی نے کہا۔ "یہ مغل بندوقچی سیدھا نشانہ نہ لگا سکتے ہیں بشرطیکہ تم ان کو اتنا وقت دو کہ وہ اپنی بندوقوں کو لکڑی کے سہارے جما سکیں لیکن ان پر اچانک جا پڑو تو پھر وہ کہیں کے نہیں ہیں"

دوسرے نے کہا "اس کے علاوہ ان کو اپنی بندوقوں کے پھٹنے یا اپنے چہروں کے جلنے کا بڑا ڈر ہے"

"ہتھیاروں کے زور سے مغل شہنشاہ، گولکنڈہ کو نہیں لے سکتے" بوڑھے محمد و نے کہا۔ لیکن بعض دوسرے

ذرائع ایسے ہیں جن سے وہ زیادہ کامیاب رہیں گے میں نے یہ دیکھا ہے۔"

"تم نے کیا دیکھا؟"

"درباری امراء جن کے پاس شہنشاہ کے خطوط پہنچ رہے ہیں اور جواب دربار میں نظر آتے ہیں۔"

"کیا وہ قلعہ کے تہ خانوں میں مقید ہیں؟"

"نہیں مغلوں کے کیمپ میں۔ دوست دوستوں میں۔"

"وہ نمک حرام ہیں۔ ہم کو ان کے نام بتلاؤ۔ عبد الرزاق سپاہ سالار یا عبد اللہ خاں؟"

محمد و نے سر ہلایا۔"وہ وفادار ہیں۔" اس نے کہا۔"اور آخر تک وفادار رہیں گے۔"

"تمہارا یہ خیال ہے۔ لیکن عبد الرزاق کے پاس شہنشاہ کا خط پہنچا ہے۔"

"تمہارا خیال ہے عبد الرزاق غدار نہیں ہے۔"

"میرا خیال صحیح ہے اس وقت بھی وہ جاسوس جو خط لایا تھا جواب کے انتظار میں کھڑا ہے یہ مجھے خود عبد الرزاق کے آدمیوں سے معلوم ہوا ہے۔"

"ذرا ٹھہرو۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو عبد الرزاق چھاونی کی طرف جا رہا ہے چلو ہم بھی دیکھیں۔"

"سچ ہے وہ عبد الرزاق ہی ہے۔" محمد و نے گھوڑوں کو گذرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ لیکن میں اب بھی وہی کہتا ہوں جو پہلے کہا تھا۔۔۔"وہ غدار نہیں ہے۔"

"۔۔۔ اچھا جلد چلو دیکھیں گے کہ تقدیر کیا دکھاتی ہے۔"

عبد الرزاق سپاہ سالار اپنی فوجوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا خط تھا۔ اور اس کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم۔۔۔"وہ کیا کہہ رہے ہیں۔" محمد و نے بھیڑ میں ایک آدمی سے آہستہ سے دریافت کیا۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ شہنشاہ اورنگ زیب ان کی وفاداری کو دولت اور عزت کے داموں میں خریدنا چاہتے ہیں۔"

"وہ کیا جواب دے رہے ہیں۔۔۔"

عبد الرزاق شاہی خط کو پھاڑ کر ٹکڑے کر رہا تھا جو زمین پر بے توجہی کے ساتھ پھینک دیے گئے۔

"شہنشاہ سے کہو" اس نے قاصد سے کہا "کہ ہم مرتے دم تک لڑیں گے اسی وفاداری کے ساتھ جس وفاداری سے حضرت امام حسینؓ کے ساتھی میدان کربلا میں لڑے تھے"

"کیوں میرا خیال صحیح نہ تھا" محمد و نے آہستہ سے کہا "عبد الرزاق آخر دم تک وفادار رہیں گے"

"اور عبد اللہ خاں؟"

"ہاں۔ ہاں وہ بھی!"

لیکن چند دن بعد محمد و کو معلوم ہوا کہ اس کا خیال ایک کے متعلق تو صحیح تھا اور دوسرے کے متعلق غلط۔

شہر میں ایک غیر معمولی شور و غل کی وجہ محمد و چونک پڑا۔

چیخنے چلانے کی آوازیں۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی صدائیں۔ ہزاروں قدموں کی گڑ بڑ "مغل فوج فصیل کے اندر داخل ہو گئی" کی صدا بلند ہوئی۔ "اب کیا کریں ہائے ہائے! ہم پر لعنت ہو" لوگ بھاگ رہے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ کہاں ـــــ فرار ہونیکی کوشش ان میں اکثر غنیم کی تلوار کے گھاٹ اترا ہے۔

ایک سپاہی نے گذرتے ہوئے کہا "یہ ایک نمک حرام کا کام ہے۔ ایک دروازہ ان کیلئے کھول دیا گیا"

"کون سا دروازہ؟"

"مشرق کی طرف کی کھڑکی ـــــ"

"عبد اللہ خاں مشرقی کھڑکی کی حفاظت پر مامور تھا افسوس ـــ افسوس۔ آخر کار وہ دوسروں کی طرح بے وفا ثابت ہوا ـــــ"

"قلعہ! قلعہ!!" سپاہیوں نے چیخنا شروع کیا۔ اس کو اب بھی بچا سکتے ہیں ـــ" لیکن مغل فوجیں فتح و نصرت کے نعرے لگاتی ہوئی یہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں اور دروازوں میں سے امنڈ رہی تھیں۔ اور ان کے درمیان عبد الرزاق تنہا اپنے بادشاہ کے محل کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ محمد و نے

دیکھا کہ وہ دلیری سے لڑ رہا ہے۔ ایک شمشیر ہزار شمشیروں کے مقابلے میں۔ زخمی اور خون میں نہایا ہوا ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جھنیکا جا رہا ہے لیکن وہ گرا نہیں۔ پھر وہ سپاہیوں کے نرغہ میں گھر گیا اور محمد و آگے نہ دیکھ سکا۔ اُس نے جان سے ہاتھ دھولئے" بوڑھے آدمی نے کہا۔" اور یقین ہے کہ وہ اب فوجوں میں روندا جا رہا ہوگا" لیکن وہی ہوا جو میں نے کہا تھا۔ عبدالرزاق انجام تک وفادار رہا"

" لیکن انجام ابھی آنے والا تھا۔"

دوسرے دن بہادر سپاہی کا جسم خاک و خون میں لتھڑا ہوا شہر پناہ کے باہر ایک تاڑ کے درخت کے نیچے بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ ہزاروں زخموں سے چور لیکن ابھی تک سانس چل رہی تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب اس کی غیر معمولی بہادری خطا کے پرزے پرزے ہونے اور رشوت کے ٹھکرا دئے جانے کے قصہ کو سن چکے تھے۔

" اگر ابوالحسن کے پاس صرف ایک اور ملازم عبدالرزاق کا سا وفا شعار ہوتا تو شہر کبھی فتح نہ ہو سکتا" شہنشاہ نے کہا۔ اور فوراً اپنے دو طبیبوں کو زخمی ہیرو کی مدد کیلئے روانہ کیا۔ آہستہ۔ بہت آہستہ عبدالرزاق تندرست ہونے لگا۔ لیکن اپنے قدیم آقا کے ساتھ اس کی وفاداری میں کبھی تنزلزل نہ پیدا ہوا۔ شہنشاہ کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ عبدالرزاق کا جواب ہمیشہ وہی تھا۔ "جس شخص نے ابوالحسن کا نمک کھایا ہو۔ وہ اورنگ زیب کی ملازمت میں داخل نہیں ہو سکتا"

اور اورنگ زیب رنجیدہ خاطر ہوئے۔ کیونکہ ایسی وفاداری مغل ــــ شہنشاہ کے دربار میں شاذ و نادر ہی نظــر آئی تھی۔

(ماخوذ از "ٹیلز فرام انڈین ہسٹری" مصنفہ ر د)

نواب محمد کاظم علی خاں صاحب بی اے دوم تعلقدار ورنگل۔ احمد فاروق بیگ صاحب بی اے سیولین رائچور۔ عبدالجبار صاحب بی اے دارالعلوم۔ عبدالجلیل بیگ صاحب نے اس مہینہ خریداروں سے اعانت کی ہے۔ کیا آپ سے بھی شہاب کوئی توقع رکھے !؟؟

"ستم ہے!"

ستم ہے کہ جناب وجد اور میکش نے ایک ساتھ ایک ہی عنوان پر نظمیں بھیجی ہیں اس کا تصفیہ قارئین فرمائیں کہ "ستم کش" اور "ستمگر" کون ہیں۔

جناب سکندر علی صاحب وجد بی۔اے۔ عثمانیہ

مطلب میرے رونیکا جو پا جائے ستم ہے
وہ شوخ گر اپنے میں چلا آئے ستم ہے

دنیائے محبت میں پرستار محبت !!
ناکردہ گناہوں کی سزا پائے ستم ہے

ہر حال میں اک آفت جاں ہے وہ ستمگر
آئے تو غضب اور نہ آئے تو ستم ہے

ہنستے ہوئے چہرے پہ نہ بکھرائیے گیسو
بجلی جو گھٹاؤں میں تڑپ جائے ستم ہے

کیوں شل نہ ہوا درد سے یہ پیکر خاکی
وہ میرے تڑپنے سے تڑپ جائے ستم ہے

جس وجد نے قدموں میں تری عمر گزاری
اب نام بھی لینے کو ترس جائے ستم ہے

جناب صاحبزادہ محمد علی خان صاحب میکش عثمانیہ

جس کیلئے ہر بار ترستی ہیں نگاہیں
وہ بزم تصوّر میں بھی ٹھہرے نہ ستم ہے

ڈالی ہے نگاہ غلط انداز کسی نے
یہ تیر بھی سینے کو نہ برمائے ستم ہے

کیا جرم محبت کی ہمیں داد ملی ہے
مائل بکرم رہتے ہیں وہ جائے ستم ہے

دل جس کو سمجھتا ہو گنہگار محبت
معصوم نگاہوں میں بھی جچ جائے ستم ہے

ساون کی گھٹاؤں سے برستی ہیں شرابیں
اس وقت بھی ساقی ہمیں ترسائے ستم ہے

جس ماہ کے پرتو سے منور ہو زمانہ
اک ذرہ پامال کو ٹھکرائے ستم ہے

جس دل پہ کیا کرتے تھے ہم ناز ہمیشہ
ارمانوں کے سیلاب میں بہ جائے ستم ہے

جو اشک بہاتی تھی پتنگوں کے سرہانے
وہ شمع دلسوز بھی بجھ جائے ستم ہے

ان تشنہ نگاہوں پہ ہو احسان کی بارش!
وہ کیف نظر بزم میں برسائے ستم ہے

جس برق تجلّی کی تڑپ ہے مرے دل میں
وہ شوق محبت کو نہ برمائے ستم ہے

اے گرمی نظارہ مسیحا نفسی کر
تو سرد امنگوں کو نہ گرمائے ستم ہے

براہ کرم قارئین فرمائیں، دکھنی زبان کی ایک نظم موسومہ پریت نامہ مصنفہ میر عبدالغنی کی نسبت آپ یا آپ کے احباب کے جو کچھ معلوم ہوں۔ میر عبدالغنی کون تھے؟ سن ولادت سن وفات کیا ہے؟ کہاں کے باشندے تھے۔ کس کا عہد حکومت پایا۔ پریت نامہ طبع ہوا ہے تو کہاں سے دستیاب ہوگا؟

جوزیفین کا طلاق

جناب ہادی جعفری

نپولین کی جانشینی کا مسئلہ اگر غیر طے شدہ رہجاتا تو بیرونی اثرات سے فرانسیسیوں میں پھر باہمی نفاق ہوجاتا چونکہ شہنشاہ کو کوئی اولاد نہ تھی ۔ ملکہ جوزیفین کو ایک بیٹا اور بیٹی تھی ۔ مگر نپولین ان کو جانشین نہیں بنا سکتا تھا کیونکہ اس کے اور بھی قریبی رشتہ دار موجود تھے اور سب سے بڑھکر نپولین کی خواہش تھی کہ اب جنگ نہ ہو۔ بس یہی اسباب تھے جن کی وجہ سے نپولین پر اپنے تعلقات کو قطع کرنے اور جوزیفین کو طلاق دینے پر مجبور رہوا۔

نپولین پس وپیش کر رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے خیالات کا جوزیفین پر اظہار کرے۔ آخر اس نے آرک چیلیز کیمبے کو طلب کیا اور اپنا قصد اُس پر ظاہر کیا جس کی اطلاع نومبر ۱۸۰۹ء کو جوزیفین کو دی گئی وہ پہلے ہی سے یہ سب واقعات سُن چکی تھی جو اس کیلئے الم انگیز تھا ۔ یہ مصیبت کچھ ایسی منحوس تھی کہ فان ٹین بلو پر ایک قدرتی اداسی چھا رہی تھی ۔ جوزیفین اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی آنسو بہا رہی تھی نپولین میں باوجود بہادری اور جرأت کے اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی غمزدہ اور حسرت نصیب بیوی کے سامنے جا سکے۔ آخرکار وہ دونوں میز پر جمع ہوئے ۔ یہ بھی عجیب کھانا تھا کہ ایک لفظ بھی کسی کے منہ سے نہ نکلا کسی کو اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ ایک دوسرے کی صورت دیکھ سکے ۔ کھانے کی قابین سامنے آتیں اور بے چکھی ہوئی واپس کردی جاتیں ۔ جوزیفین بت مرمریں کی طرح خاموش تھی ۔ نپولین عالم خاموشی میں چھری کی دھار سے ایک گلاس کے کنارے کو کھنکار رہا تھا ۔ کھانا بڑھا دیا گیا ملازم رخصت ہوئے نپولین نے اٹھکر دروازہ بند کیا۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا وہ ملکہ کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھکر کہنے لگا " پیاری جوزیفین تم جانتی ہو کہ مجھے تم سے کس قدر گہری محبت ہے ۔ مگر میری تدبیر پر تقدیر غالب ہے اور قسمت کا یہی لکھا ہے کہ فرانس کی فلاح وبہبودی پر ان چیزوں کو قربان کردوں ۔

جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں"۔ اس قدر سننے کے بعد جوزیفین غش کھاکر فرش پر گر پڑی۔ نپولین نے نوکروں کو آواز دی جب اس کو اٹھاکر لیجا رہے تھے نیم بیہوشی کے عالم میں یہ الفاظ اس کی زبان پر تھے۔

"اُف غضب۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے یقین ہے کہ تم مجھے مار نہ ڈالوگے"۔ جب جوزیفین کو ہوش آیا تو نپولین اپنے کمرہ میں چلا گیا جہاں تمام رات وہ ٹہلتا رہا۔ بار بار وہ جوزیفین کے کمرے کے دروازے پر جاتا اور اس کی کیفیت دریافت کرتا۔ جوزیفین کی بیٹی ہورٹنس تمام شب ماں کے پاس سے نہ ہٹی۔ ایک دفعہ جب نپولین نے مزاج پوچھا تو کہا "جہاں پناہ! یقین رکھیں کہ جوزیفین جس طرح تخت نشین ہوئی تھی اسی طرح تخت سے اتر آئیگی اور فرمان عالی کی تعمیل میں ذرا بھی دیر نہ ہوگی۔ اور ہم اس کی اولاد ایسی شان و شوکت کو سلام کرتے ہیں۔ جہاں ہمارے دلوں کو ایک لحظہ بھی سکھ نہ ملا ہماری ماں کے برابر دنیا میں محبت کرنیوالی کوئی ماں نہیں ہم اس کے ساتھ رہکر دلاسا اور تسلّی دیتے رہینگے"۔ یہ سن کر نپولین سے ضبط نہ ہو سکا۔ جی کھول کر رویا۔ اور کہا "پیاری بیٹی! کیا تم مجھ کو چھوڑ دوگی۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم یوژین کے ساتھ میرے پاس رہو۔"

آخرکار اس سانحہ عظیم کی تکمیل کا دن آپہنچا۔ ۱۵/ دسمبر ۱۸۰۹ء کو ٹوئی لریز کے بڑے کمرے میں شاہی خاندان کے تمام اراکین اور سلطنت کے بڑے بڑے نامور سردار جمع ہوئے۔ سب کے چہرے اداس تھے۔ نپولین نے دردبھری آواز میں مجمع کو یوں مخاطب کیا "میری سلطنت کے ملکی مقاصد اور میرے جمہور کی خواہشیں جنھوں نے میرے افعال کی ہمیشہ رہنمائی کی ہے۔ مجھے مجبور کرتی ہیں کہ میں اپنا تخت و تاج اپنے حقیقی وارث کو پہنچاؤں اور مجھے امید نہیں کہ ملکہ جوزیفین سے مجھ کو کوئی اولاد ہوگی۔ بس اسی خیال سے میں اپنی جوزیفین سے قطع تعلقات کر رہا ہوں۔ اس کا علم خدا کو ہے کہ اس طلاق سے مجھے کتنا صدمہ ہے جوزیفین ایسی ملکہ ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کو تاج پہنایا تھا اس لئے ملکہ کا خطاب اور اعزاز اس کے لئے ہمیشہ قائم رہیگا اور میں ہمیشہ اسے ویسی ہی محبت کرونگا جیسی اب تک کرتا رہا ہوں"۔ جب نپولین نے اپنی تقریر ختم کی تو ایک کاغذ جوزیفین کو دیا گیا۔ اس نے پڑھنے کی کوشش کی۔

لیکن آواز رک گئی وہ دیوانہ وار کاغذ کو گھورنے لگی ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہ ہوسکا۔ مسٹر یگنانڈ نے وہ کاغذ پڑھکر سنایا۔

" اپنے عالیمقام اور شفیق شوہر کی اجازت سے میں اعلان کرتی ہوں کہ چونکہ اب مجھے اولاد ہونے کی امید نہیں ہے جس سے فرانس کے مقاصد اور حکمت عملی کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ شہنشاہ کے تمام خیالات کے جواب میں میں اپنی شادی کے تعلقات قطع کرنے پر رضامندی ظاہر کرتی ہوں کیونکہ ان تعلقات کا باقی رہنا فرانس کی خوشحالی کی راہ میں حائل ہے۔ ہم دونوں فخر کرتے ہیں کہ اپنے ملک کی بھلائی کیلئے ہم نے اپنے ذاتی مقاصد کی قربانی پیش کر دی ہے۔"

دوسرے دن بڑے کمرہ میں طلاق کی باضابطہ کارروائی کی تکمیل کیلئے سینیٹ کا جلسہ ہوا۔ یوژین صدر انجمن بنایا گیا۔ شاہزادہ نے کہا "حاضرین! شاہنشاہ جیسا شخص اس وقت رو رہا ہے یہ میری ماں کی شان و عظمت کیلئے کافی ہے۔

شاہنشاہ لباس شاہی پہنے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید کوئی مرگیا ہے جس کیلئے صف ماتم بچھی ہے اور سوگوار جمع ہیں بغلی دروازہ سے جوزیفین داخل ہوئی۔ پوشاک سفید ململ کی تھی۔ ہورٹنس کے کندھے کا وہ سہارا لئے تھی۔ جوزیفین کو آتا دیکھ کر سب کھڑے ہوگئے اور بے اختیار سب کے آنسو نکل پڑے۔ جوزیفین خالی کرسی پر بیٹھ گئی اور طلاق کے اعلان کو سنتی رہی جب طلاق نامہ پڑھا جاچکا تو جوزیفین نے قلم اٹھایا اور اس کاغذ پر دستخط کیا جس نے بنی نوع انسان کے سب سے زیادہ پیارے اور محبوب تعلقات کو قطع کر دیا۔ اس المناک منظر کو دیکھنے کی یوژین میں برداشت کی طاقت نہ رہی وہ بیہوش ہوکر وہیں گر پڑا۔

رات میں نپولین مغموم اور بے چین پلنگ پر کروٹیں لے رہا تھا کہ چور دروازہ کھلا اور جوزیفین لڑکھڑاتی ہوئی داخل ہوئی روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اپنے سابق شوہر کے پلنگ کے قریب آئی لیکن ڈر گئی اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حجاب نے اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے روکا کیونکہ اس کو اب نپولین کے کمرہ میں اسی طرح بے حجابا نہ آنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن محبت اس لمحہ تمام خیالات پر غالب آئی اور وہ پلنگ پر جاگری اور رونے لگی۔ نپولین اور

جوزیفین میں ایک گھنٹہ کامل یہ آخری تخلیہ رہا۔ یہ ایک ایسا المناک تخلیہ تھا کہ اس سے سابقہ کسی انسان کو ایسا سابقہ نہ پڑا ہوگا۔

"مال سے سن" کا خوبصورت محل جس کو جوزیفین نے گوناگوں آرائشوں سے سنوارا تھا جوزیفین کے آئندہ قیام کیلئے تجویز ہوا۔ ملکہ کا رتبہ اور خطاب اس کے لئے قایم رکھا گیا۔ اور تیس لاکھ فرانک سالانہ مصارف کے واسطے مقرر ہوئے۔

دوسرے دن گیارہ بجے ٹوی لریز میں ایک انبوہ کثیر جمع ہوا۔ کیونکہ ملکہ وہاں سے رخصت ہوکر "مال سن" کو جارہی تھی۔ یہ وہی ملکہ تھی جو سب کی محبوب ٹوی لریز جیسے ایوان کی رونق اور زینت تھی۔ منھ پر نقاب ڈالے ملکہ بالاخانہ سے اتری۔ تمام لوگ رورہے تھے اس نے رومال ہلاکر سب کو الوداع کہا اور ٹوی لریز کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا۔"

غزل

جناب حکیم ہبو علی صاحب صفیؔ

جوانی نہیں بن سنورنے کے دن　　جھجکنے کی راتیں ہیں ڈرنے کے دن

یہ پابند اقرار ہونے کا منھ؟　　یہ وعدے میں پورے اترنے کے دن

تصدق ترے بدگمانیئے عشق　　صفائی ہوئی ان سے مرنے کے دن

نہ بھولینگے جنت میں بھی یہ سماں　　کسی کا شباب اپنے مرنے کے دن

تمہارے نہ ملنے سے کیا ہوگیا　　گذر ہی رہے ہیں گذرنے کے دن

مری شکل سے کوئی بیزار ہے　　یہ جینے کے دن ہیں نہ مرنے کے دن

صفیؔ اب زمانہ ہے نازک بہت
یہ ہیں اپنے سائے سے ڈرنے کے دن

مائل اور اُن کی شاعری

(جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن))

ڈاکٹر احمد حسین مائل ۱۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد حاجی محمد رضا حسین رضا ابن حاجی حافظ مبارک احمد خان بہادر علاقہ صرف خاص میں میر منشی تھے۔ ان کا خاندانی سلسلہ شمالی ہند میں قاضیان گوپامو اور مدراس میں والا جاہی خاندان سے ملا ہوا ہے ان کے اجداد میں افغانستان کے سلطان شہاب الدین فرخ شاہ اور شیخ سلیمان فاروقی خاص کر قابل ذکر ہیں۔

مائل نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین ہی سے حاصل کی۔ فارسی کے کچھ سبق اپنے والد کے استاد میر مہدی حسین ثاقب سے بھی تبرکاً لئے تھے۔ انگریزی۔حساب۔ اقلیدس اور دیگر علوم میں کافی مہارت پیدا کی تھی۔ چنانچہ امتحانات کی اعلیٰ اور مسلسل کامیابیاں کی بناء پر سرکار سے ماہانہ پچھتر روپیہ الونس پاتے رہے۔ پھر مدرسہ طبابت سرکار عالی میں ساڑھے پانچ سال تک زیر تعلیم رہے اس اثناء میں سالانہ وظیفہ تعلیمی بھی ملتا رہا۔ کامیابی امتحان کے بعد نواب مختار الملک کے ہاتھ سے ۱۲۹۲ھ میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔

مائل کو طب یونانی اور ہومیوپیتھک سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے فن کے خاص ماہر تھے۔ چنانچہ ان کے بعض اہم علاج اضلاع سرکار عالی میں اس وقت تک زبان زد خاص و عام ہیں۔ اُن کے خاندانی اور حالات زندگی کے متعلق "مدنزک محبوبیہ" اور "تذکرہ شعرائے دکن" وغیرہ میں تفصیل موجود ہے اس لئے اس مختصر سے انتخاب کے ساتھ ان امور کی طرف صرف اشارہ کردینا ہی کافی ہے۔

طب کے بعد شعر و شاعری ہی مائل کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ شاعر پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ بچپن ہی سے مقفیٰ فقرے اور موزوں مصرعے اُن کی زبان سے نکلا کرتے تھے۔ فارسی میں اپنے والد رضا سے اصلاح لیتے اور جب سترہ سال کی عمر سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے تو غلام امام شہید کے ہمشیر زادہ

محمد سردار علی وصفیؔ سے اصلاح لینی شروع کی۔ وصفیؔ مرحوم کپتان اعجاز علی شہرتؔ کے والد اور میجر فرحت علی سابق صدر عثمانیہ میڈیکل کالج کے چچا تھے اور اپنے زمانہ کے باکمال اساتذہ سخن میں شمار کئے جاتے تھے۔

مائلؔ کی جودت طبع اور ولولۂ سخن نے استاد کو بہت جلد اُن کی طرف مائل کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین سال کے عرصہ میں شاگرد خود ایک استاد بن گیا۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں مائلؔ اور اُن کے ایک استاد بھائی احمداللہ واصلؔ نے (جو ہمیشہ مشاعروں میں اُن کے ساتھ ساتھ رہتے تھے) اپنی اپنی غزلیں سنائیں تو جہاں اکثر اصحاب نے تعریف کی بعض حاسدوں نے آوازے کسنے شروع کئے اور کہا کہ "یہ تو اپنے استاد سے لکھوالاتے ہیں"۔ اس واقعہ سے یہ دونوں اتنا متاثر ہوئے کہ ترک شاعری کا تہیہ کر لیا اور دوسرے روز وصفیؔ مرحوم کے یہاں اپنے تمام اثاثہ شاعری لئے ہوئے پہنچے اور کہا کہ "یہ سب آپ کے حوالے ہے۔ آئندہ سے ہم شاعر نہیں"۔ استاد نے نہایت شفقت و دلسوزی سے کہا کہ "آئندہ کا ارادہ تو آئندہ پر رہا مگر یہ تو بتاؤ کہ آخر یہ برہمی کیوں ہے؟ کیا واقعہ گذرا جو تم اتنے متاثر ہوئے"۔ مائلؔ نے رات کے مشاعرہ کا واقعہ سنانے کے بعد کہا کہ "اگرچہ عموماً بعض استاد اپنے شاگردوں کو بوقت اصلاح اپنے ایک دو شعر بھی دیدیا کرتے ہیں مگر حضرت کا یہ حال ہے کہ ایک آدھ مصرع اور شعر تو بڑی چیز ہے ایک آدھ لفظ بھی دینا پسند نہیں فرماتے اور ہمارے ایسے اشعار قطعاً قلمزد فرمادئے جاتے ہیں جو ایک آدھ لفظ کی اُلٹ پھیر سے بہت چست ہو سکتے ہیں اور بعد اصلاح صرف وہی شعر چھوڑ دئے جاتے ہیں کہ جن میں ایک لفظ بھی نہ بنایا گیا ہو۔ اور اس طریقہ عمل کی یہ وضاحت بھی فرمائی گئی ہے کہ اس طریقہ سے طبیعت بڑھتی ہے حقیقت حال تو یہ ہے مگر ہم کو جو صلہ ملتا ہے وہ یہ کہ ہم استاد کا کلام اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے ہیں"۔

یہ واقعہ سُن کر اور اس برہمی کی کیفیت کو دیکھ کر استاد متبسم ہوئے اور مبارکباد دی۔ شاگرد حیران تھے کہ یہ مبارک باد کا کیا محل ہے؟ پھر خود ہی استاد نے کہا کہ "شکرانہ کا دوگانہ ادا کرو اور خوشی مناؤ کہ اللہ نے تم کو یہ درجہ عطا فرمایا کہ اب لوگوں کو تمہارے اور تمہارے استاد کے کلام میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتے ہو کہ تمہارے کلام کو تمہارے استاد کا کلام قرار دیا جارہا ہے"۔

مائلؔ کی زندگی کا زیادہ تر حصہ (یعنی تقریباً تیس ۳۰ سال) ملازمت کی وجہ سے اضلاع ہی پر گذرا۔ البتہ وظیفہ لینے سے تین سال قبل حیدرآباد میں دواخانہ علی آباد پر تبادلہ ہوگیا تھا۔ نماز فجر کے بعد عموماً ایک دو گھنٹے مائلؔ کی فکر سخن کا وقت ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد بارہ بجے تک مطلب میں رہتے تھے۔ واپسی اور طعام کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتے پھر پانچ چھ بجے تک مطالعہ کتب۔ اور کبھی اُن کے فرزند ساتھ ہوتے تو یہ وقت درس و تدریس میں گذر جاتا۔ پانچ چھ بجے سے شب کے آٹھ نو بجے تک عموماً چار پانچ ملاقاتی روزانہ جمع رہتے۔ اور جب کبھی مہینہ دو مہینہ کے لئے حیدرآباد آتے تو صبح سے شام تک احباب کا مجمع ہوتا اور اکثر و بیشتر شعر و سخن کا چرچا رہتا۔

قیام اضلاع کے باوجود اکثر اشخاص مائلؔ کے یہاں اپنا کلام بغرض اصلاح روانہ کرتے تھے۔ وہ جدید حضرات کو اکثر یہی ہدایت دیتے کہ ایسے اصحاب کو اپنا کلام دکھائیں جن سے بالمشافہ اصلاح لینے کا موقع ملے۔ اکثر و بیشتر انکار کر دیتے تھے لیکن پھر بھی متعدد اصحاب کے کلام پر اُن کے شدید تقاضہ واصرار کی وجہ سے نظر ڈالنی پڑتی تھی۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں اہل دکن کے علاوہ اہل شمال بھی شامل تھے۔ ان کے خاص تلامذہ میں قابل ذکر یہ ہیں:- دائم جنگ الم۔ ۲۔ صادق جنگ علم۔ ۳۔ سید یوسف حسینی اعظم۔ ۴۔ وجیہہ الدین رساؔ۔ ۵۔ مفتی اعظم علی شائقؔ۔ ۶۔ عبدالسلام راغبؔ۔ ۷۔ عبدالوہاب عاصمؔ۔ اور ۸۔ خواجہ فیاض الدین وغیرہ۔

مائلؔ ہمدرد اور بار باش انسان تھے۔ کم استطاعت مریضوں کو اپنے صرفہ سے بمبئی سے دوائیں منگوا دیتے تھے۔ ان کے یہاں اکثر مہمانوں کا مجمع رہتا اور بعض دوستوں کی سالہا سال تک پابندی کے ساتھ ماہانہ مدد کرتے رہے۔ آخر عمر میں مذہبی رنگ بہت طاری ہوگیا تھا۔ حضرت آغا داؤد صاحبؒ سے بیعت تھی۔ ان کی فرمائش پر ایک "میلاد مبارک" لکھی تھی جس کو انہوں نے بہت پسند فرمایا۔ اس کے بعد سے مائلؔ نے سوائے نعت شریف کے کچھ نہیں لکھا۔ چنانچہ ایک نعتیہ دیوان مکمل ہوگیا تھا۔

حیدرآباد میں تبادلہ ہونے کے بعد سے فرائض منصبی کے بعد اکثر وقت مراقبہ میں گذارتے تھے یہاں تک کہ سواری میں بھی یہی عالم رہتا تھا۔ جب وظیفہ لیکر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اپنے مرشد کی درگاہ

کے قریب آغا پورہ میں ایک مکان میں مقیم ہوگئے۔ چند روز کے بعد فالج میں مبتلا ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ سال مبتلا رہنے کے بعد ۲۲ رمضان ۱۳۳۲ھ م ۹ مہر ۱۳۲۳ ف کو وفات پائی اور اپنے مرشد کی درگاہ کی سیڑھیوں کے سامنے جانب غرب دفن ہوئے۔

مائلؔ نے اردو زبان کی لازوال خدمت کی ہے۔ وہ دکن کے اُن خاص خاص شاعروں میں سے ہیں جن کے کارنامے دنیائے اُردو میں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائینگے۔ ان کے زمانہ میں دکن میں کوئی اُن کا ہم پلہ شاعر نہ تھا۔ استاد الاساتذہ حضرت فیضؔ کے بعد سے جیسا قادر الکلام، پختہ مشق، اور پر گو شاعر کوئی نہیں پیدا ہوا۔ مائلؔ میں وہ تمام صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں جو ایک حقیقی اور بلند مرتبہ شاعر میں ہونی چاہئیں۔ رفعت تخیل۔ فکر کامل۔ قادر الکلامی۔ شوخ طبعی۔ اور جرات رندانہ ــ اتنی خصوصیتیں بہت کم ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں اور فطرت کی یہی وہ فیاضی تھی جس نے مائلؔ کو یکتائے عصر بنادیا۔ انہوں نے قریب قریب ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کی غزلوں میں شوخی۔ رندی و مستی۔ اور کہیں کہیں تصوف کی بھی جھلک پائی جاتی ہے۔ اُن کے قصیدے لفظی شان و شکوہ اور قادر الکلامی کے اچھے نمونے ہیں۔ ان کے مرثیے ان کے قلم کی روانی اور قوت بیان کے دلچسپ ترجمان ہیں اور ان کی رباعیاں، نوحے۔ میلاد نامے۔ نعتیہ کلام اور منقبتیں روحانی لذتوں اور گوناگوں قلبی کیفیتوں سے مالا مال ہیں۔

مائلؔ کے قریب قریب پندرہ ہزار شعر کا پتہ چلتا ہے۔ اور جو کلام انہوں نے دوسروں کو دے دیا یا اُن کے بعد تلف ہوگیا وہ اس کے سوا ہے ۱۳۲۱ھ م ۱۹۰۳ء تک ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوچکے تھے۔ دو نعت میں جن کے نام "نور ظہور" اور "ظہور نور" ہیں۔ اور ایک "تحفۂ دکن" جس میں ہر صنف سخن کے نمونے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ تقریباً سات ہزار شعر پر مشتمل ہے اور ۱۳۱۴ھ م ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا ہے اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر غزل پر مصنف کی وہ عمر درجہ ہے جو اس کی تصنیف کے وقت تھی۔ "تحفۂ دکن" کے بعد اونھوں نے چار ہزار شعر کا اور ایک دیوان بھی مدوّن کیا تھا۔ اس کے علاوہ آخر عمر میں نعتیہ کلام کا بھی اور ایک دیوان مرتب ہوگیا تھا ان دونوں کے قلمی نسخے اس وقت موجود ہیں۔ اس مدون کلام کے علاوہ بہت سی غزلیں مرثیے۔ رباعیاں۔ اور معراج نامے وغیرہ خود مصنف ہی کے ہاتھ سے

لکھے ہوئے محفوظ ہیں۔

مائل کے اس مجموعہ شعر و سخن کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کی اصل عظمت بے نقاب ہونے لگتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے۔ ان کے یہاں کم غزلیں ایسی ملیں گی جو دو غزلہ اور سہ غزلہ نہوں۔ بعض بعض زمینوں میں تو انہوں نے سو سو کے قریب شعر کہے ہیں۔

کلام مائل کی دوسری خصوصیت نہایت ہی سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی ہے۔ شاہ نصیر اور فراق کے بعد اردو زبان کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا ہو جو اس خصوص میں مائل کی ہمسری کرسکے۔

اس قسم کی بعض زمینوں کی مثالیں اور ان میں مائل کے اشعار کی تعداد کے علم سے مائل کی دقت پسندی اور قدرت کلام کا ثبوت ملیگا۔

۱۔ کیوں نہ تڑپے راستہ میں خاک پھر زیر پا۔	قافیہ۔	مضطر۔	ردیف۔	زیر پا۔	شعر۔	۲۴۔
۲۔ آغوش نقش پا پہ ہے آغوش نقش پا۔	″	ہوش	″	نقش پا	″	۲۶
۳۔ آفتاب آئے چمک کر جو سر جام شراب	″	سحر	″	جام شراب	″	۳۴
۴۔ ہیں لب و خط و رخ انور سفید و سبز و سرخ	″	گوہر	″	سفید و سبز و سرخ	″	۳۵
۵۔ ہے عندلیب باغ سے دور اور شکستہ پر	″	ایاغ	″	سے دور اور شکستہ پر	″	۲۸
۶۔ دل میں ہیں کئی داغ برنگ پر طاؤس	″	فرنگ	″	پر طاؤس	″	۲۱
۷۔ دل لیکے اڑی کاکل جانانہ سر دوش	″	پروانہ	″	سر دوش	″	۳۰
۸۔ خمیدہ ہو کر بنے گا ہر ایک تار گیسو ہلال عارض	″	بہار	″	گیسو ہلال عارض	″	۳۵
۹۔ ہے نظر میں یہ جہاں پروانہ و فانوس و شمع	″	آسماں	″	پروانہ و فانوس و شمع	″	۳۰
۱۰۔ تجھ کو لگائیں گے نظر آئینہ شانہ شمع	″	خبر	″	آئینہ شانہ شمع	″	۱۴
۱۱۔ آسماں تجلی مہ انور دھواں بتی چراغ	″	پتھر	″	دھواں بتی چراغ	″	۳۱
۱۲۔ یارب ہوں میرے گھر میں گل دل بہار و باغ	″	نظر	″	میں گل دل بہار و باغ	″	۱۹
۱۳۔ جنبش میں زلف پرشکن ایک اس طرف ایک اس طرف	″	کٹھن	″	ایک اس طرف ایک اس طرف	″	۲۰

۱۴ - خاص تحفہ میں کچھ اے دلبر ہو سونے کا ورق ۔ قافیہ - خنجر ۔ ردیف - ہو سونے کا ورق ۔ شعر - ۲۳
۱۵ - تیرتا ہے ڈوب کر وہ تا بہ گردن آب میں " چلمن " آب میں " " ۶۶
۱۶ - فرقت کا نہیں رنج گلا اور ہی کچھ ہے " دعا " اور ہی کچھ ہے " " ۳۴

مائل کے کلام میں متعدد غزلیں ایسی بھی نظر سے گذرتی ہیں جو غالباً اردو کے مشہور و معروف اساتذہ کی خاص خاص غزلوں کے جواب میں لکھی گئی ہیں ۔ میر - سودا - انشاء - نصیر - انیس - دبیر - ناسخ - آتش - ذوق - مومن - اور غالب غرض کوئی ایسا استاد نہیں جس کی خاص غزل قصیدہ یا رباعی وغیرہ کی زمین میں مائل نے طبع آزمائی نہ کی ہو - محض تفریح طبع اور بعض وقت قدرت کلام دکھانے کی غرض سے اس قسم کی کوشش کیگئی تھی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آورد اور التزام کے باوجود بعض شعر ایسے نکل پڑے ہیں جو واقعی ان اساتذہ قدیم کے جواہر پاروں کے پہلو بہ پہلو رکھے جاسکتے ہیں ممکن تھا کہ مائل کے اس قسم کے اشعار بطور نمونہ و مقابلہ یہاں پیش کئے جاتے مگر اس موضوع پر آج سے ۴۳ سال قبل مائل کے ایک شاگرد اعظم نے ۱۳۲۰ھ میں سوا دو سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب " زمزمہ ہند دکن " شائع کی تھی جس میں اکثر اساتذہ فن کے کلام کے ساتھ ساتھ مائل کے کلام کو پیش کیا گیا تھا - مگر افسوس ہے کہ بعض جگہ شاگرد کا جوش عقیدت انتہائی حد کو پہنچ گیا تھا - اور اسی وجہ سے استاد کی شہرت بری طرح متاثر ہوئی اور ان کی صحیح عظمت بے نقاب نہ ہوسکی۔

" زمزمہ ہند و دکن " اصل میں اُن معترضوں کے جواب میں لکھی گئی تھی جو ایک دکنی شاعر ہونے کی وجہ سے مائل کی استادی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے اور زبان اور شعر و سخن کو بھی کسی خاص ملک یا شہر یا محلہ کے رہنے والوں کی میراث سمجھے ہوئے تھے ۔ اس زمانہ میں اردو کے اہل زبان صرف وہی معدودے چند خاندان یا اشخاص سمجھے جاتے تھے ۔ جو دہلی یا لکھنو کے خاص خاص محلہ جات میں سکونت پذیر تھے اور دوسرے ملک یا شہر یا محلہ کے وہ صاحبان علم و فن یا شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے بھی غیر اہل زبان سمجھے جاتے تھے جن کے اسلاف صدیوں سے اردو زبان کو مادری زبان کے طور پر استعمال کرتے آئے تھے ۔ اور جو سوائے اردو کے اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے ۔ یہ مصنوعی اور مضحکہ خیز امتیاز اس درجہ مستحکم کر دیا گیا تھا کہ دوسرے مقامات کے رہنے بسنے والے بھی خود کو غیر اہل زبان سمجھنے لگے تھے اگرچہ کہ ان کی مادری زبان

اردو ہی کیوں نہ ہو اور اس کے سوا وہ کوئی اور زبان بول ہی نہ سکتے ہوں۔

اردو زبان میں اہل زبان اور غیر اہل زبان کا جھگڑا اس وقت سے شروع ہوا جب عہد آصف الدولہ کے بعد سے خود لکھنو میں بڑے بڑے شاعر اور انشاء پرداز پیدا ہونے لگے۔ اس وقت اہل لکھنو نے جس طرح سیاسی حیثیت سے خود مختاری کا اعلان کیا زبان میں بھی خود کو دھلی کی غلامی سے آزاد کر لیا اور جیسے جیسے لکھنو کی تصنیف و تالیف میں اضافہ ہوتا گیا وہ ایک جداگانہ دبستان بنتا گیا۔ وہاں کے الفاظ۔ محاورے۔ اور روز مرے جو پہلے غلط سمجھے جاتے تھے اور جن پر دھلی سے آئے ہوئے اصحاب اکثر معترض رہتے تھے اب مستند ہو گئے۔ یہ بغاوت اہل دھلی کیلئے ناگوار تھی۔ چنانچہ آپس میں چشمک بڑھنے لگی۔ اُدھر میرامن نے "باغ وبہار" میں اپنی زبان پر فخر کیا اور رجب علی بیگ سرور نے "فسانہ عجائب" میں اس کا جواب دیا کہ :-

"اگرچہ اس ہیچمیرز کو یہ یارا نہیں کہ دعوئ اردو زبان پر لائے یا اس افسانہ کو بطرز نثاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہاں آباد کو مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہند وستان تھا وہاں چندے بود و باش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جب میرامن صاحب نے چار درویش کے قصہ میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصہ میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے"

مگر اہل لکھنو کی آزاد خیالی اور ایک جداگانہ دبستان کے قیام کے باوجود دھلی والوں کا احساس تفوق نہیں مٹ سکا۔ میر مہدی مجروح جن کی آنکھوں کے سامنے دھلی کی محفلیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ مرتے دم تک دھلی کی لکھنو پر فوقیت جتلاتے رہے حالانکہ ان کے استاد غالب ہمیشہ انہیں ڈانٹتے رہتے تھے کہ :-

"اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ ارے اب اہل دھلی ہند و ہیں یا اہل حرفہ، یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تُو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنو کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ . . . . .

قصہ مختصر شہر صحرا بن گیا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے

حسن اعتقاد - ارے بندہ خدا اردو بازار نہ رہا - اردو کہاں ؟ دلی کہاں ؟

دھلی اور لکھنو کے ان اختلافات کی وجہ سے ایک ایسا نا مبارک جھگڑا اردو بولنے والوں میں پیدا ہوگیا جس کے مضر اثرات سے اردو اس وقت تک نجات نہ پا سکی۔ اہل زبان اور غیر اہل زبان یا زبان داں کے مابین فرق و امتیاز کرنا جس ناگوار شکل میں اردو دنیا میں پایا جاتا ہے کسی زبان کی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا آئے دن کے ایرانی نو واردوں کی وجہ سے ہوئی جو ہندوستان کے عالموں اور فاضلوں کو اپنے مقابلہ میں کم رتبہ سمجھتے تھے اور اپنی فوقیت کا زیادہ تر ثبوت اپنے اہل زبان ہونے سے دیتے تھے۔ ہندوستان کا فارسی شاعر یا انشاپرداز خواہ کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو ایک ادنیٰ درجہ کے ایرانی شعر گو کے مقابلہ میں ہار مان جاتا۔ یہ احساس پستی ہندوستانیوں کی رگ رگ میں اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ ہر اہل قلم خود کو کسی نہ کسی طرح ایرانی النسل ثابت کرنا چاہتا۔ قتیل اور واقف جو فارسی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ مرزا غالب کی نظر میں اس لئے ذلیل ہیں کہ ہندوستانی الاصل ہیں۔

غرض جب لکھنو والوں نے زبان میں اصلاح اور کانٹ چھانٹ شروع کی تو دھلی والوں نے انہیں غیر اہل زبان قرار دیکر اس پر اعتراضات کئے اور انہیں اس کام کا اہل نہیں سمجھا لیکن جب رفتہ رفتہ لکھنو والوں نے اپنا لوہا منوالیا تو وہ بھی اہل زبان قرار پائے لیکن بعد کو خود لکھنو والے بھی اس مرض میں مبتلا ہوگئے۔

یہ مضحکہ خیز تفرقہ آج تک باقی ہے گو اتنا شدید نہیں۔ لیکن یہ اردو کی ہمہ گیری کے لئے مضر ہے۔ اگر اردو کو صحیح معنوں میں ترقی کرنا اور تمام ہندوستان کی زبان کہلانا ہے تو اس قسم کے تعصبات دور ہو جانے چاہئیں۔ پروفیسر سلیم نے لکھا تھا کہ :-

"یہاں زبان اور قلم کے بہت سے دربان موجود ہیں جو کہتے ہیں جو الفاظ پچھلے زبان میں بن چکے وہ سب سماعی ہیں ان پر قیاس کرکے نئے الفاظ بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر یہ مقولہ ان اشخاص کا ہے جو پرانی لکیر کے فقیر ہیں جو اپنی زبان کو وسیع کرنا نہیں چاہتے بلکہ بنے بنائے

الفاظ کو گھٹاتے اور ترک کرتے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اردو زبان اب دھلی اور لکھنو میں محدود نہیں رہی ہے وہ ان حدوں کو توڑ کر باہر نکل چکی ہے ۔ اُس کے لئے اب ایسی قدر و وسعت کی ضرورت ہے جس قدر کہ ہندوستان میں وسعت ہے" (افادات سلیم صفحہ ۲۳)

یہی خیال مائل کا بھی تھا اونہوں نے پروفیسر سلیم کی اس تحریر سے تیس۳۰ پینتیس۳۵ سال قبل ہی سے اپنے کلام میں اس کی طرف اشارے کرنے شروع کردئے تھے ان کو یقین تھا کہ اب اردو اتنی محدود نہیں رہ سکتی اور اب دکن بھی لکھنو کی طرح غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی زبان کا لوہا منوائیگا ۔ وہ کہتے ہیں ۔ مصرع

لکھنو اب حیدرآباد دکن ہو جائے گا ۔

اور یہ محض ایک شاعرانہ ترنگ ہی نہیں ہے ۔ وہ صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر شعر و سخن کا یہی ذوق اور قدر دانی جاری رہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے ۔ ؎

دلی سے بڑھے یہ حیدرآباد   مائل جو ہو قدر اس ہُنر کی

لیکن اس موقع پر اس حقیقت حال کو فراموش نہیں کرنا چاہتے کہ مائل کو جس ماحول سے مقابلہ کرنا پڑا ۔ وہ ان کے خیالات و معتقدات کے لحاظ سے نہایت ناخوشگوار تھا ۔ اغیار تو اغیار خود ان کے اہل ملک بھی یہی سمجھتے تھے کہ مائل ایک غیر اہل زبان شاعر ہیں اور وہ کسی طرح دھلی یا لکھنو کے کسی شاعر کے ہم پلہ بھی نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ اہل ملک کی ناقدر دانی کی شکایت کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں ؎

مائل جو قدر داں سفارش ملا تو کیا   مجھ کو تو قدر دان سخن کی تلاش ہے

مگر افسوس ہے کہ مائل کی یہ ساری کوششیں ان کے حق میں مضر ثابت ہوئیں ۔ عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا گیا کہ وہ ایک مغرور شاعر ہے اور اہل زبان اساتذہ کے ساتھ خواہ مخواہ مقابلہ کرتا ہے ۔ اس کی اصل وجہ تو یہی تھی جو مائل نے بیان کی ہے کہ ؎

قدر مائل کی جو کیوں کر کہ ہے مائل دکنی   وہ دکھاتا ہے یہی عیب ہنر سے پہلے
نشو و نما پائی ہے دکن میں قدر ہماری کیوں کر ہوگی   گھر کی مرغی دال برابر کس کو دکھائیں اپنا ہنر ہم ۔

مائل اہل ملک کی اصل کمزوری سے واقف تھے۔ اُس کو دور کرنے کی کوشش انہوں نے اس طرح سے بھی کی کہ اہل زبان شعرا کی اچھی سے اچھی غزلوں کے جواب میں خود بھی اعلی درجہ کی غزلیں لکھیں اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ اگر دکن کا بھی کوئی شاعر چاہے تو برابر کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ؎

مائل نے غزل لکھی ہے مومن کی غزل پر تھی ہند کی، اب ہوگئی دکھن کی زمیں

اسی طرح وہ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ اگر توجہ کرے تو ایک حیدرآبادی شاعر اہل دھلی یا اہل لکھنو جیسی زبان لکھ سکتا ہے۔ ؎

توجہ اگر ہو تو اُردو ہے کیا چیز کہ رازِ خدا آدمی جانتا ہے

ساتھ ہی اپنے ملک کو یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ تم جن کو اہل زبان سمجھتے ہو وہ بھی تو میری (یعنی ایک دکن کے شاعر کی) تعریف کرتے ہیں۔ ؎

گیا میں جو مائل خوش بیاں کئی اہل ہند تھے جمع واں ہوئے پھلے میرے سخن سے خوش ہوئے پھر سخن کے اثر سے خوش

وہ میں دکھن کا شاعر ہوں تباں ہند کی مجھ پر عنایت ہے نوازش ہے کرم ہے مہربانی ہے

میرے اشعار سن کر کہتے ہیں اہل زباں مائل دکن کا رہنے والا ہے کہ یہ ہندوستانی ہے

پھڑک جاتے ہیں اہل ہند مائل کی غزل سن کر دکن کے شاعروں کی بھی طبیعت ایسی ہوتی ہے

مائل کہاں سے آگئی ایسی زبان تجھے قائل ہیں اہل ہند تری بول چال کے

مجھے مہر سپہر شاعری کہتے ہیں جب مائل کہ سارے ہند میں ہے مجھ سے روشن نام دکھن کا

یہ محض شاعرانہ تعلیاں نہیں ہیں۔ بلکہ واقعہ ہے کہ شمالی ہند کے اکثر شاعر اور اہل ذوق مائل کی زبان اور قدرت کلام کے معترف تھے اور ان میں سے بعض تو اپنے کلام پر ان سے اصلاح بھی لیا کرتے تھے شمس العلماء حافظ نذیر احمد کے فرزند بشیر الدین احمد دھلوی نے ایک دفعہ مائل کو لکھا تھا کہ :-

” خدا خدا کرکے ایک دوست کی عنایت سے آپ کا دیوان مجھے ملا۔ اور میں نے بغور اسے پڑھا میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ میں شاعر نہیں۔ ادیب نہیں۔ مگر اچھے برے کی تمیز مجھ میں ہے۔ اور گو اہل زبان ہونے کا فخر نہیں مگر وہاں کا رہنے والا ہوں جہاں کی زبان مستند گنی جاتی ہے۔

یعنی دعلی اور ایسے شخص سے پڑھا لکھا ہے جس کی زبان آج ہند میں بے نظیر ہے یعنی مولوی نذیر احمد مدظلہ العالی۔ پس ان خصوصیتوں کے لحاظ سے مجھے بھی تھوڑا مذاق فہم سخن میں ہونا چاہئے۔ اور الحمد اللہ کہ کچھ ہے۔ میری سچی رائے ہے کہ آپ کا کلام اعجاز نما عجیب دغریب اثر رکھتا ہے۔ دکن کے لوگوں سے زیادہ اہل ہند کو اس کی قدر کرنی چاہئے کہ اعفیں کے بھائیوں میں سے ایک ایسا شخص نکلا جس نے دکن کا نام روشن کیا۔" مورخہ ۲۹ ہردے ۱۳۰۹ف

(ماخوذ از زمزمہ ہند و دکن صفحہ ۱۲۱)

مائل اپنے مقصد (یعنی اہل دکن کے وہم پستی کو دور کرنے) میں پوری طرح سے کامیاب ہو جاتے اگر ان کے ہمعصروں داغ اور امیر جیسے اعلی پایہ اساتذہ سخن سے دکن کے اہل ذوق اس وقت مرعوب و متاثر نہ ہوتے۔ اگرچہ جودت طبع، پرگوئی، ا۔ رعاشق مزاجی میں وہ داغ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ لیکن داغ کی طرح وہ پیشہ ور شاعر نہیں تھے اور نہ ان کی شاعری دربار کی قدر افزائیوں کی وجہ سے سربلند ہو سکتی تھی ان کی ساری زندگی شہر کی شعر و سخن کی محفلوں اور اہل ذوق کے مجمعوں سے دور اضلاع اور دیہات کے دواخانوں اور مریضوں میں گذر گئی۔ اپنے اس پیشہ کی مصروفیتوں کے بعد جو کچھ وقت ملتا اس کو وہ محض اپنے فطری ذوق کی بناد پر شعر و شاعری میں صرف کرتے۔ مگر اس پُرخلوص اور بے غرض خدمت کی وجہ سے انھیں طرح طرح کی پریشانیو اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ملک الشعرا مرزا داغ کو یہ خیال دلایا گیا کہ مائل اُن پر چوٹ کیا کرتے ہیں۔ اور دکن کے اہل ذوق طبقہ میں مائل کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر کوئی تعجب نہیں کہ داغ اس پر یقین بھی کرنے لگے ہوں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اعلیحضرت غفراں مکاں نے کبھی ان سے مائل کی نسبت دریافت فرمایا تھا تو داغ نے یہی جواب دیا کہ وہ "شاعر تو بہت اچھے ہیں مگر مجھ پر ہمیشہ چوٹ کیا کرتے ہیں" ممکن ہے کہ داغ کا یہ خیال اس لئے بھی بجنسہ ہو گیا ہو کہ مائل نے اپنے اہل وطن کا احساس پستی دور کرنے کے لئے بعض شعر ایسے بھی کہے جو علانیہ داغ کے اشعار کا جواب معلوم ہوتے ہیں۔ ؎

زباں کا بڑا جن کو دعویٰ ہے مائل | انھیں بھی تو آئی زباں آتے آتے

کیوں مادری زباں پہ ہے مدعی کو ناز | مائل وہ اک کنیز ہے میرے کمال کی

وصفی کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے اگرچہ مائل دبستان لکھنو سے تعلق رکھتے تھے مگر اُن کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس دبستان ہی کے رنگ پر قائم نہیں رہے۔ ان کے یہاں بہت سا کلام دبستان دہلی کے رنگ میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے بعض شعروں پر تو بالکل داغ کے اشعار کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کی شاعری اصل میں ایک ایسا سنگم تھی جہاں دہلی اور لکھنو دونوں مقامات کی خصوصیات سخن ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہی تھی۔ مائل نے ان دونوں دبستانوں کو ملا کر دکن میں ایک نیا دبستان پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اگرچہ وہ اپنے ہم خیالوں کے فقدان کی وجہ سے اس میں خاطر خواہ کامیاب نہیں رہے۔

مائل کے کلام میں جہاں عریاں جذبات نگاری اور جوبن پرستی کے اشعار ملیں گے ایسے پاکیزہ اور بلند مرتبہ شعر بھی دستیاب ہوں گے جو کسی اعلی پایہ صوفی یا بلند خیال شاعر ہی کے یہاں نظر آسکتے ہیں۔ انھوں نے صنف نازک کی دلفریبیوں اور خاص کر مانگ۔ چوٹی۔ جوبن۔ اور کمر سے متعلق بعض ایسے ایسے شعر بھی لکھے ہیں جو شاید اب رکیک سمجھے جائیں۔ مگر اُس زمانہ کے مذاق اور مائل کا ایک خاص رنگ دکھانے کی خاطر اس قسم کے بعض شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں:—

وہ پھولوں کے ہاروں کی وہ ٹھنڈی چھاؤں تاروں کی
کھنچے ہو مائل میرے جوبن کا دیوانہ ہوا

یار کی چوٹی کی جمعیت شعاعوں میں نہیں
ہے اُن کی ہلتی زلف میں موباف سرخ رنگ

ہیں قدم قدم پہ قیامتیں ہیں قیامتوں میں نزاکتیں
طلب کرتا ہے بوسہ وہ بھی کس سے عکس سے اپنے

وہ مسکرا کے پوچھتے ہیں معنیٔ وصال!
نہیں ہے مائل یہ شوق اچھا کہاں کی آفت کدھر کا جھگڑا

مزے یارب اڑاتے خوب ہم راتوں کو خلوت میں
نہ کر رندوں سے واعظ بحث تو پٹ جائیگا اک دن

وہ پچھلی رات کا اٹھنا وہ لُٹنا تیرے جوبن کا
مارے دیوانہ آئے تو اسی پتھر سے آپ

کیوں پریشاں ہو نہ اپنے موئے سر سے آفتاب
اثردر ہوا میں اڑتا ہے لیکر دہن میں آگ

لچک اس سے خوش وہ لچک سے خوش کمر اس سے خوش وہ کمر سے خوش
جوانی میں تجھے یہ کھیل کیا سوجھا لڑکپن کا

کیا دل میں گدگداتا ہے موسم شباب کا
تم اپنا دل ہو کہ ان کا بوسہ لیا نہ کرنا دیا نہ کرنا

فرشتوں کی جگہ حوریں جو ہوتیں دوش انساں پر
تیری باتیں ہیں جتنی جوتیاں کھانے کی باتیں ہیں۔

ان شوخ اور عریاں اشعار کے مقابلہ میں رفعت تخیل، صداقت خیال اور تصوف وغیرہ سے متعلق حسب ذیل اشعار دونوں رنگوں کے درمیان تفاوت راہ کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں:—

نہ ہو جب تک اشارہ میں نہ کچھ بولوں نہ کچھ لکھوں
بیاں تیرا دہن میرا، زباں تیری قلم میرا

ہوا جب آپ ہی اپنا تمنائی تماشائی
تجھے پہنایا جامہ نور مطلق نے مقید کا

حج کو چلا جو میں تو ملا کعبہ ہر جگہ
تو کس طرف نہ تھا تیرا جلوہ کدھر نہ تھا

بنوں گا خاک راہ جستجو کی!
کہ ہوں پس ماندہ اک کارواں کا

چمکا جو بخت سب نے کہا مجھ کو عقلمند
قسمت بگڑ گئی تو کہا بے شعور تھا

جنس وحدت ہوں مگر کثرت کے بازاروں میں ہوں
میں وہ یوسف ہوں جو آپ اپنے خریداروں میں ہوں

اسے سیکھا اسے پایا، اسے پایا، اسے کھو یا
مجھے علم الیقین برسوں رہا حق الیقین برسوں

تیری کثرت کا یہ غوغا ہے بھٹکتے جاؤ
تیری وحدت کا یہ ایما ہے نگہباں ہوں میں

غرض مائل نے سچ کہا ہے کہ:—

میرے دیوان میں ہر رنگ کے ہیں شعر اے مائل
وہی جانے وہی پہچانے جو اس فن میں کامل ہے

ختم چندہ کی اطلاع ایک سرخ چھٹی کے ذریعہ دیدی جاتی ہے جب کہ کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ پرچہ موقوف کر دیا جائے تو یہ سمجھ کر کہ آئندہ اعانت منظور ہے۔ یہاں سے وی۔پی کر دیا جاتا ہے۔ معاونین عموماً پرچہ پوسٹ آفس میں محفوظ کرا دیتے ہیں کہ متعاقب وی۔پی چھڑا لی جائیگی۔ لیکن بہ نیت مصروفیت کے سبب بھول جاتے ہیں اور مدت معینہ کے بعد وی۔پی واپس آجاتی ہے اور یوں بھی دفتر کو ہر مہینہ وی۔پی کے اخراجات ناگزیر برداشت کرنا پڑتے ہیں براہ کرم جب وی۔پی محفوظ کرا دی گئی ہے تو ممکنہ طور پر جلد وصول کرلیں تاکہ شہاب کو اخراجات کا خمیازہ بھگتنا نہ پڑے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ شہاب ہی وہ واحد ماہنامہ ہے جو نہایت پابندی سے آپ کی خدمت میں آرہا ہے اس کے ان خدمتوں کا اس قدر بھی اعتراف نہ کیا جائے کہ وی۔پی چھڑا لی جائے اور خریدار ہم پہنچائے جائیں۔

قومی زندگی میں ادب کی اہمیت

جناب مرزا سرفراز علی صاحب متعلم بی۔ اے عثمانیہ

ادب کیا ہے قومی حالات، روایات اور رجحانات کا آئینہ، موجودہ سوسائٹی کی جیتی جاگتی تصویر۔ اور ہر قسم کے ادائے خیال کا موزوں سانچا ــــ ادب ہی کے ذریعہ دنیا نے اپنے مختلف النوع تمدنوں اور قابل یادگار تاریخوں کی نگہداشت کی ہے۔ اس کی کوئی صنف بھی ایسی نہیں جس نے سماج کے شائستہ اور کارآمد بنانے میں ہاتھ نہ بٹایا ہو۔ کسی قوم کے معائب ومحاسن کا صحیح اور اطمینان بخش اندازہ سوسائٹی کی چھان بین ہی سے لگایا جاسکتا ہے اور سوسائٹی ادب کے سوا کہیں اور اپنے حقیقی رنگ میں نظر نہیں آسکتی چنانچہ اسی بنا پر قومی شاعر اور قومی انشا پرداز اپنے ماحول کا سچا ترجمان اور بہترین نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا نظریہ، مقام اور وقت کی قید سے بے نیاز اور دنیا کے ہر گوشہ میں قبول کئے جانے کا مستحق ہے۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں، انگلستان کی ذہنی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی ارتقاء مضمر ہے اور ہندوستانی میں بھارت ماتا کا تمدن، تہذیب، اور شائستگی۔

اردو ادب میں دھلی اور لکھنو اسکول اور میر۔ سودا۔ آتش۔ ناسخ۔ داغ۔ حالی اور اقبال وغیرہ کا زمانہ، اضافی اصطلاحیں نہیں بلکہ صدہا برس کی جامع تاریخ ہے۔

سلف ادب کی دو صنفیں ہیں یعنی نثر اور نظم، دونوں کا دنیا میں مساوی بول بالا ہے۔ جہاں ہم حضرت علیؑ۔ اڈمنڈ برک، سرسید اور ایسی ہی یگانہ روزگار ہستیوں کے خطبات اور مقالات سے اپنے معلومات میں وسعت اور خیال میں بلندی پیدا کرسکتے ہیں وہاں ہمیں فن شعر کی غیر معمولی قوتوں اور پیغمبرانہ بصیرت افروزیوں سے سرمو انکار نہیں ہوسکتا۔ نثر کی صنف کئی شاخوں پر منقسم ہے تنقید نگاری۔ ادب لطیف۔ ناول۔ افسانہ۔ ڈراما۔ وغیرہ وغیرہ۔

تنقید کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو پرکھنا یا کھوٹے اور کھرے، میں تمیز پیدا کرنا۔ تنقید نگاری

نہایت مشکل اور ذمہ دارانہ کام ہے۔ اس سے انسان کے عقل وتمیز، اخلاق اور شائستگی، اور دماغی قابلیتوں کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک اچھا نقاد قوم کا باعزت رہنما اور سچا علمبردار ہوتا ہے اور بے لوث تنقید ہی قومی اخلاق کو سنوارنے کا شریفانہ طریق کار۔

ادب لطیف نام ہے انسان کے جذبات شعری کو الفاظ کے حسین نثری قالب میں ڈھالنے کا۔ گھرے اور کارآمد مطالب کو دلنشیں پیرایہ میں ادا کرنا۔ انشا پرداز کے ذوق کا سخت ترین امتحان ہے۔ چند بے معنی الفاظ اور غیر متناسب لکیریں ادب لطیف کا سرمایہ نہیں ہوسکتیں۔

ناول اور افسانے میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ کسی قوم یا فرد کی بہادری، رومان، اور مذہبی معتقدات ان اصناف کا موضوع سمجھے جاسکتے ہیں۔ ناول میں وقت۔ حالات اور مباحث کافی طویل ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ حجم میں افسانہ سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کے افسانوں کی ابتدا ڈرامائی شان رکھتی ہے اور ان کا اختتام قارئین کو غیر متوقع نتائج کے انکشاف سے ایک قسم کی دلخوش کن حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ آج کل کی کاروباری دنیا، ناول کے مقابلہ میں افسانہ کو زیادہ پسندیدہ اور فائدہ مند سمجھتی ہے گوکہ ان دونوں کا فریضہ صرف ایک ہے اور وہ یہی کہ سوسائٹی کے تاریک اور روشن پہلو نہایت واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کر دئے جائیں۔

فطرت نگاری اور انسانی زندگی کا قریب ترین مطالعہ ڈراما کے لوازم میں سے ہے۔ ادب کی یہ صنف بھی صحت بخش فضا پیدا کرنے اور اس کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھی جانی چاہئے۔

شاعری کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ یہ فنون، انسان کی وجدانی کیفیات، لذت پسندی۔ اور لطیف جذبات کی نشو ونما کے ضامن ہیں۔ مفکرین نے ان میں بھی ایک اور ذیلی تقسیم کی ہے۔ مادی اور غیر مادی۔ مادی فنون سے مراد وہ فنون ہیں جن کی تکمیل، پتھر، اینٹ، چونا اور اس قسم کی بے شمار مادی اشیاء کے استعمال بغیر ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ معماری اور سنگ تراشی اسی قبیل کے فنون میں داخل ہیں۔ شاعری۔ مصوری۔ اور موسیقی غیر مادی فنون ہیں۔

ایثار انسان کا اعلیٰ ترین اخلاق ہے جو شاعری انسان میں محبت۔ ہمدردی اور ایثار کے جذبات کو

نہ ابھارے بیکار ہے۔ سماج کے جمود کو توڑنا، جذبات میں قیامت خیز حرکت پیدا کرنا۔ تخلیق کی قابلیت کا طباعی اور جدت شاعری کے سب سے زیادہ مقدم وظائف ہیں۔ ادب کی اس مقدس صنف کو ہوا رد اتِ قلبی سے نہایت نزدیک کا تعلق ہوتا ہے۔

لفظی بازیگری۔ اور فحش انداز بیان کسی بے احتیاط شاعر کے وہ خطرناک حربے ہیں جن سے بڑی بڑی قومیں آن کی آن میں گمنام اور معطل ہو جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے قدرت کے اس عطیہ کا صحیح استعمال ہم میں وہ ساری خوبیاں پیدا کرسکتا ہے جو اور ذرائع سے پیدا نہیں ہو سکتیں۔

اوپر کی بحث سے ادب اور زندگی کے باہمی ارتباط کا پتہ چلتا ہے۔ زندگی کی کٹھن راہیں ادب کے کارن طے ہوسکیں تو سمجھ لیجئے کہ اس نے اپنا سچا منصب ادا کر دیا۔ کیونکہ انفرادی زندگی کی سنبھال قومی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔

محبوبیہ کارخانہ جلد سازی واقع نبھر کی مسجد نے اپنے فن کارانہ کمال سے ملک میں جو خاص امتیاز حاصل کر لیا ہے اور مسابقت میں جو بازی جیتی ہے ممکن نہیں کہ دوسرا کارخانہ اپنے آپ کو پیش کرسکے۔ یہاں جس قسم کی جلدیں تیار کی جاتی ہیں کبھی خیال تک نہیں گذرتا کہ ہندوستان جیسے پسماندہ ملک میں بھی ایسا کام تیار ہو سکتا ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر کام مشین سے تیار کیا گیا ہے۔ نفاست اور صفائی۔ خوشنمائی اور زیبائی یہی اوصاف اس کارخانہ کی جان ہیں۔ پائداری اور ارزانی اس کا بلند کارنامہ ہے۔ حالانکہ:۔

ارزاں بہ علت گراں بہ حکمت

سنا تھا مگر یہاں یہ کلیہ ٹوٹ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملک اس کارخانہ کی قدر کرے۔ یہاں کام کے ساتھ غریب بچوں کو اس کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور وظائف سے بھی اعانت کی جاتی ہے کہ وہ آئندہ چل کر جہد للحیات میں کامیاب ہوں اور اپنے ملک کے دوسرے بچوں میں بھی اس فن کا مذاق پیدا کریں۔ جدید سال کی نئی ڈائریاں بالکل انگلش وضع کی عہ/ر - ۱۲/ر - ۶/ر وکلاء - اہل غرض کیلئے بیحد کارآمد اور مفید ہیں۔

دُکھی کی صدا



پریم پجارن

فرصت ہے تو سن لیجئے احوال مرے جی کا — بیکس کی کہانی ہے مظلوم کا افسانہ

سہیلی وہ راتیں تو اب قصہ کہانیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس میں پریم کے گیت گائے جاتے تھے۔ وہ کیا گئے کہ میری تمام مسرتوں کی دنیا اجاڑ ہوگئی۔ میرے لئے اس دنیا میں اب رکھا ہی کیا ہے؟ جس کی ہر حرکت زمین پر ایک حسین پھول کا نقشہ چھوڑتی تھی مگر اب ایک مرجھائی ہوئی پتی کا نشان بھی تو نہیں دکھائی دیتا۔ اون کی ہر نگاہ میرے لئے ایک خاموش پیغام مسرت ہوتی تھی۔ اس درس محبت کا پڑھنے والا بجز میرے کوئی اور نہ تھا۔

ساون کی راتیں تو زخمی دل کیلئے مرہم تھیں۔ کوئل کی کوک میری بنیا بیوں کا ایک نغمہ تھا جس سے وہ "مسحور ہوکر گھنٹوں آپ ہی آپ جھومتے اور لطف اٹھاتے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ میں عمداً ان کے ستانے کو روٹھ جاتی کہ بھلا دیکھوں وہ بھی کس حد تک میرے قدر دان ہیں۔ نہ جانے میرے اس ارادہ کی اونہیں کس طرح خبر ہوجاتی تھی کہ میرے روٹھنے سے پہلے وہ کہہ اوٹھتے تھے کہ "ہم جان گئے ہیں کہ اب کیا ہونیوالا ہے" ان کا بس اس قدر کہدینا میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا تھا۔ کیونکہ محبت جب کبھی پرکھی گئی ہے تو وہ آنکھوں کے ذریعہ پرکھی گئی۔ اس کے لئے نہ اہتمام اور تیاریوں کی ضرورت نہیں محبت تو دلوں کی وہ خاموش زبان ہے جس پر ہزار گویائی قربان۔

سکھی! اب پریم کا نغمہ چھوڑدے کہ اس میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ ہاں ہاں چھیڑ اوس نغمہ کو جس سے میرا دل سکون حاصل کرے۔ محبت تو اون کیلئے ہے جو محبت سے شادکام ہیں لیکن حرماں نصیب کے یہ نصیب کہاں کہ کسی کی دید سے آنکھیں اکتساب حسن کریں۔

آہ! میں نے تو پریم کا سودا نہایت گراں داموں پر خریدا تھا۔ مگر ہوا وہی جو نہ ہونا چاہئے تھا۔

جو میں جانتی کہ پیت کرے دکھ ہوئے — نگر ڈھونڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نہ کوئی
لکڑی جل بھئی کوئلہ کوئلہ بھے جل راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھی نہ راکھ
ارے سکھی وہ تو گئے پردیس!



شاہنشاہ اقلیم سخن شہریار دکن اعلیحضرت نواب میر عثمان علی خان بہادر
آصف جاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ

شہاب

جلد (۴) آذر ۱۳۴۵ف م اکتوبر ۱۹۳۵ع نمبر (۹)

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

عوام سے (لللعہ) — گورنمنٹ سے (عہ)

بمطبع [illegible] پریس [illegible] میں چھپکر دفتر شہاب [illegible] حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

سالگرہ ہمایونی

اس رشتہ میں لاکھوں تار ہوں بلکہ سواء — اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سواء
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سواء

رجب، شعبان، رمضان کے مہینے اسلام میں مقدس مانے جاتے ہیں کیونکہ معراج۔ برات۔ قدر انہیں مہینوں میں واقع ہوتی ہیں لیکن رجب کی تقدیس یوں بھی بڑھجاتی ہے کہ اسی مہینہ میں آقائے ولی نعمت کی سالگرہ ہے جس کے عہد حکومت میں ایک کروڑ پچاس لاکھ نفوس نہایت آسودہ عیش وکامرانی میں مصروف ہیں جس کے عہد زرین کا ہر قدم رعایا کے فلاح وترقی سے خالی نہیں ہوتا۔ ممکنہ آرام وآسائش بہم پہنچانے کی سعی کیجا رہی ہے۔

آج سے ۲۵ سال گذشتہ پر نظر ڈالی جائے تو ایک بین فرق نمایاں ہوگا تعلیم۔ تہذیب۔ تجارت صنعت صحت۔ آرائش غرض کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں انقلاب عظیم نہ ہوا ہو۔ اور روبہ ترقی نہ ہو۔

بغداد و قرطبہ کی داستانیں سنی تھیں آج آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں عہد شاہجہانی کے تذکرے آج ہر در و دیوار سے ظاہر ہو رہے ہیں۔

خوشا نصیب سرزمین حیدرآباد کہ اوس کو ایسا والی۔ ایسا فرمان روا نصیب ہوا ہے جس کے سایہ عاطفت میں رعایا مصروف علم وعمل ہے۔

اسی ماہ رجب کا آذر بھی ساتھ دے رہا ہے اور ہمارے لئے کس قدر مسرت آگین ہے کہ نونہال سلطنت شفیعہ شہزادہ نواب مکرم جاہ بہادر اطال اللہ عمرہ کی ولادت باسعادت کا شرف حاصل ہے اس لئے افراد ملک کا یہ سب اولین فریضہ ہونا چاہئیے کہ سلطنت اور والی سلطنت اور شاہزادگان بلند اقبال۔ شہزادیان فرخندہ فال کیلئے آٹھ پہر از دیاد عمر واقبال کی عمیق قلب سے دعا مانگیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۵۲۹)

پھر گرم نالہائے شرار بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

ماضی کا نغمہ اگر مستقبل کیلئے کیف انگیز اور نشاط آور ہو سکتا ہے تو بر بطِ شہاب کے چند تار آمادۂ ارتعاش ہیں۔ حال کی فکر مستقبل کی بشارت ہو سکتی ہے تو الحمد اللہ شہاب اپنی ادبی زندگی کے خیابانِ چہارم میں مصروف خرام ہے۔ ابتداءً جب اس کے اجرا کا خیال ہوا اور اس میدان میں اپنے آپ کو پیش کرنے کی جرأت پیدا ہوئی تو حال یہ تھا نہ بازو میں قوت نہ جیب میں سرمایہ۔ لیکن بازارِ مصر میں جہاں یوسف کی خریداری کیلئے بیسیوں مایہ دار گراں سے گراں بولی لگا رہے تھے وہاں ہمارے ہاتھ میں سوت کی انٹی تھی کہ اگر کچھ نہ ہو تو بے مایہ خریداروں میں نام ہی سہی۔

لیکن اس کارسازِ حقیقی کے کار فرمائیوں کا تماشا کیجئے جو دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے حال سے واقف ہے وہ حسن قبول عطا فرمایا کہ آج ملک کا واحد ماہنامہ ہے جو پابندیٔ وقت اور تنوعِ مضامین سے فضا کی تاریکیوں کو منور اور درخشاں کر رہا ہے۔

کسی پرچہ کے معیار اور اوس کی دلچسپی کا انحصار۔ اہل قلم پر منحصر ہے ورنہ ممکن نہیں کہ یہ دان چڑھ سکے۔ شکر ہے کہ ابتدا ہی سے قابل افراد اپنی قلمی کاوشوں سے اس کو سنوارنے میں مصروف رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اونہیں کے جنبشِ قلم پر شہاب کی بقا اور ارتقاء کا مسئلہ وابستہ ہے اور یہ جو کچھ آپ معائنہ فرما رہے ہیں اس کیلئے ہم سے زیادہ بھی اہل قلم قابل تشکر ہیں۔

قدیم قلمی معاونین | میں جناب عبد المجید صاحب ایم۔اے۔ال۔ال بی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ جناب ابو الفضل صاحب بی۔اے عثمانیہ۔ جناب ہادی جعفری نظام کالج۔ جناب ج نقوی صاحب بی۔اے کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ آخر الذکر نے تو مضامین کے سوا خریداروں سے جو اعانت کی ہے شہاب اس کا شکر یہ ادا کرنے کی اپنے آپ میں سکت نہیں پاتا۔

نظم کے معاونین | جناب مولانا امجد۔ جناب ضامن صاحب کنتوری۔ جناب سید امین الحسن صاحب بسمل۔ جناب صفی صاحب۔ جناب سکندر علی صاحب وجد بی۔اے۔ جناب صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش۔ جناب

لیلیٰ بیگم صاحبہ ومیسٹر ہیں۔

متفرق مضامین نگار | جناب مس فاطمہ جعفر کبیری جناب شمیم صاحبہ (ایران) جناب حجاب حسن محی الدین صاحب بی اے خاص کر نواب شہید یار جنگ بہادر جنھوں نے مسلسل اپنی سیاحت کے دوران میں یورپ کی دلچسپ ڈاک بھیج کر قارئین کے ذوقِ ذات میں جو دلچسپی پیدا کر دی ہے ہمارے تعارف سے بے نیاز ہیں اور ہم اسلئے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں خیال کرتے کہ ہم نے اپنا آپ شکریہ کب ادا کیا ہے۔ البتہ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ جناب عبد القادر صاحب سروری ایم۔اے۔ایل ایل بی پروفیسر جامعہ عثمانیہ

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ایم۔اے۔ال۔ال بی۔پی ایچ۔ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے سال تمام میں ایک ہی مضمون عنایت کیا ہے لیکن مزید توجہات سے شہاب مایوس نہیں ہے کیونکہ اکثر تبہ جب بزم شہاب میں تکلیف فرما چکے ہیں تو آئندہ بھی تشریف آوری میں کوئی عذر باقی نہیں رہیگا۔ البتہ یہ ہماری کوتاہی ہے کہ آخر الذکر سے مضامین حاصل نہ کر سکے ورنہ ہماری ہر درخواست آپ پاس قابل پذیرائی رہی ہے۔

خریداران کرام | کی خدمت میں اسی قدر عرض ہے کہ شہاب اونہیں کی اعانت پر پروان چڑھ رہا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے اور دوسروں کو بھی شرکت کی دعوت دیجائے تو آج شہاب بلند سے بلند ترین معیار پر نظر آنے لگیگا۔

شکوہ | اون خریداروں کی بارگاہ میں جنھوں نے ایکسال تک اس کو مطالعہ کی عزت دیکر اپنے معیار سے پست پایا اور اب ان کی علمی بارگاہ میں شہاب رسائی سے محروم ہے اگرچند سے یوں ہی عزت افزائی فرمائی جاتی تو کیا تعجب تھا کہ مستقبل قریب میں ناچیز شہاب اون کے معیار میں پورا اترتا۔

معاونین | جناب الحاج رحمت اللہ شریف صاحب اول تعلقدار ورنگل جناب غلام مصطفےٰ صاحب مددگار باغ عامہ جناب سید دلدار حسین صاحب صدر مہتمم انہار نظام ساگر جناب نواب محمد کاظم علی خاں صاحب بی اے دوم تعلقدار ورنگل جناب ح نقوی صاحب بی۔اے قابل ذکر ہیں جنھیں شہاب کے نشر و اشاعت کا خیال لگا ہوا ہے ہم کبھی ان کے توجہات کو فراموش نہیں کر سکتے اسی طرح ہمارے وہ کرمفرما ذرا سی توجہ فرمائیں تو حیدرآباد کی ایک کروڑ پچاس لاکھ کی آبادی میں لاکھوں نہ سہی ہزاروں خریدار تو نکل آئینگے۔

روزنامہ رہبر اور چیندر کانت پریس

جن کے بلاکس ہم نے اپنی ضرورت پر اس قدر بے تکلفی سے استعمال کئے ہیں گویا یہ ہماری ہی ملک ہیں۔ اول الذکر ہی ملک کا وہ واحد روزنامہ ہے جس نے صحافت میں ایک نئی روح پھونکی ہے ورنہ اس سے پہلے ہمارے یہاں صحافت محض نام ہی نام تھا۔ آخر الذکر وہ پریس ہے جس نے بلاکس کی طباعت کی مشکلات کو صحافت کیلئے نہایت آسان کر دیا جس افراط سے ان دونوں اداروں میں بلاکس کا ذخیرہ فراہم ہے شاید ہی کہیں اور نکلے پھر لطف یہ کہ بلاکس کے دینے میں ضرورت سے زیادہ سیر چشم واقع ہوئے ہیں۔

گزارش

عموماً ختم چندہ کی اطلاع ایک مہینہ پہلے سرخ چھٹی کے ذریعہ دی جاتی ہے کہ بصورت ناپسند ارادہ سے مطلع فرمائیں ورنہ پرچہ وی پی ہوگا۔ ہمیں آرزو رہی ہے کہ ابھی کوئی اطلاع کی کسی نے زحمت گوارا کی ہو یہ تصور کرکے آئندہ بھی اعانت منظور ہے پرچہ وی پی کیا گیا لیکن بلا تکلف واپس کرکے دفتر کو صریح نقصان پہنچایا جاتا ہے براہ کرم ایسے احسانات سے پرچہ کو معذور ہی رکھیں تو انتہائی عنایت ہوگی۔ آپ ایک کارڈ کیلئے تامل فرماتے ہیں اور یہاں تین آنہ فی پرچہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے

بارہا گزارش کی گئی کہ تبدیل پتہ سے دفتر کو اطلاع دیں مگر یہ صدا بھی صدائے صحرا ثابت ہوئی۔ ممکن ہے کہ ہمارے تساہل اور ڈاک کی وجہ سے آپ کو کبھی پرچہ نہ ملا ہو۔ اس کو لکھ رکھئے کہ ہر مہینہ کی پہلی کو نہایت احتیاط سے پرچہ حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے۔ اگر ۸ تاریخ تک نہ ملے تو مقامی ڈاکخانہ سے دریافت کرکے مطلع فرمائیں تو مکرر پرچہ بھیجنے کیلئے ہم آمادہ ہیں مگر ایسا تو نہ کیجئے کہ دو دو تین تین مہینوں کے بعد اطلاع دیں اپنے ملازمین کو تاکید کیجئے کہ پرچہ نہایت احتیاط سے آپ کی عدم موجودگی میں جب وصول ہو آپ کی خدمت میں پہنچا دیا کریں کیونکہ قصور ملازمین کا ہو اور خمیازہ بھگتے غریب شہاب !!

ستم ظریفی

ان حضرات کی ملاحظہ کیجئے جو وی۔ پی منگوا کر پرچہ واپس کر دیا کرتے ہیں اور ہم آج تک حیران ہیں کہ آخر اس میں کونسی خوبی مضمر ہے کہ دفتر کو زیر بار مصارف فرمائیں۔

اعتراف تشکر

آپ اس کو شکوہ تلخ فرمائیے یا نغمہ دلکش لیکن ایک خلش تھی جو دکھا دی گئی کیونکہ۔

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے۔

مقصودِ حیات

مقصودِ حیات، دل کی دلداری ہے
دل سے غفلت، بڑی دل آزاری ہے
امجدؔ! اس تن کے مجمرِ خاکی میں
لے دے کے یہی تو ایک چنگاری ہے

کعبۂ اعظم

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا
یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا۔ تو پھر بنا بھی لیتے!
افسوس یہ ہے کہ تونے دل کو توڑا

(امجدؔ)

مکتوبات جمیل

(۵)

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور تمہیں آج تک خبر نہ ہوئی

پیاری ریحانہ ——————!

تمہارا بیمار پڑنا واقعی میرے لئے عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے!! کہ آخر تم کیسی ہو؟ کب تک یوں ہی پڑی رہو گی۔ کل تمام دن تمہاری خیریت کیلئے ایک مرغ نوگرفتار کی طرح مضطرب رہی۔ کوئی آدمی بھی نہ تھا کہ تم تک بھجواتی! آج کل میری حالت تو بس دیوانوں کی سی ہے۔ کاش میں اس قابل ہوتی کہ تمہاری کچھ خدمت کر سکتی مگر یہ کیسی بھولے پن کی آرزو ہے —— تمہاری "ڈیوٹی" میں خلل نہ ہوتا۔ —— ان دنوں میرے لیل و نہار ہی اور ہیں۔

تھوڑے سے پھول بھجوائے ہیں یہ ایسے پھول ہیں جو کبھی مرجھائیں گے نہیں کیونکہ میرے دل میں تمہاری محبت کبھی کم نہ ہوگی، اور میرا دل کہاں ہے معلوم!

گلدستہ ہے جو آپ کی نظروں کے سامنے شامل اسی میں ہے دل ناشاد بن کے پھول

آج صبح سے اماں کی خوشامد کر رہی ہوں کہ وہ کہیں جانے کے لئے آمادہ ہوں تو اس سلسلہ میں میں بھی تمہارے پاس آجاؤں ان سے کیا کیا منتیں کی ہیں۔ کبھی موسم کی خوشگواری کی طرف انہیں توجہ دلائی۔ کبھی شام کا سہانا پن بتا کر کہنے لگی کہ کیا ایسے وقت کوئی گھر میں رہتا ہے؟ کبھی ان سے کہا۔ اماں آپ وہاں پرسوں جانیوالی تھیں نا؟ لیکن ری وال وہ نسنتے نہیں جنہیں ترشی اتار دے۔ وہ کب کسی کی سنتی ہیں جو اپنے جی میں آیا کرتی ہیں۔ واقعی ایسے موسم میں گھر میں رہنا تو بس ستم ہے۔ ایسی وحشت ہوتی ہے کہ پناہ بخدا۔ ابر آیا ہے۔ گھٹا ایسی امنڈ امنڈ کر آرہی ہے کہ اب برسا۔ خوبصورت رنگین تتلیوں نے اپنی رنگین اداؤں سے چمن کو ایک رقص رنگین میں تبدیل کر دیا ہے۔ چڑیاں قسم قسم کی بولیاں بولتی ہیں پپیہے نے "پی کہاں" کی وہ رٹ لگائی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ کوئل کی کوکو نے

تو میرے دل کو کو بکو کر دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ جی چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ تم ——— ہاں تم جو آج کل فریش ہو اور ڈاکٹر کی ہدایت نے تمہیں مقید کر رکھا ہے۔ آج سے چار روز قبل جب تمہارے پاس سے آئی، تو یہ شعر مجھے نہ معلوم کیوں بے اختیار یاد آرہا تھا جو پیاری ریحانہ ——— تمہاری حسب حال ہے ؎

قفس کی تیلیوں میں کونپلیں پھوٹیں تو میں سمجھا
اسیر غم کے لینے کو بہار آئی گلستان سے

ہاں تو اتنی ساری خوشامد کا بھی جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو میں اپنا سا منہ لیکر رہ گئی۔ کل شاید میں تمہارے دیکھنے کو آؤں لیکن کل کا دن تو عبادت کیلئے ہے۔ اس میں عیادت کیسی؟ پھر شاید تمہارے "گھر میں ہوں گے میری وجہ سے بیکار ان کو تکلیف ہو گی۔ نہ معلوم کیا کیا بڑبڑائینگے۔ دل ہی دل میں گالیاں ہوں گی۔ شہاب میں تم نے "گالی" پر مضمون نہیں دیکھا؟ بس اب کیا ہے ان کو تو مفت طرح ملجائیگا۔ اب تم یہ مجھے بتاؤ کہ یہ کس وقت باہر جاتے ہیں تب میں آؤں گی۔ شام میں آؤں یا صبح میں؟ اس کے بعد تم میرا کسی وقت انتظار مت کرو۔ بیکار تمہیں رنج ہوگا اگر میں کسی وجہ سے نہ آسکوں تو تم برا نہ ماننا کیونکہ میری مجبوریاں بیحد ہیں۔ ہاں یہ تو لکھنے بھول ہی گئی تھی ——— یوں بھی تم کو کون کم یاد کرتا تھا جو طوطا بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ یہ بیچارا جب سے آیا ہے تمہارے ہی نام کی اسکورٹ ہے نہ معلوم کس ناز سے اس کو پالا ہے کہ ذرا کوئی انسانی شکل نہ نظر آئے تو چیختے چیختے اس کے حلق میں کانٹے پڑجاتے ہیں۔ اس کو صحن چمن کی ایک خوبصورت درخت میں آویزاں کر دیا ہے جس پر تمام دن سایہ رہتا ہے۔ اطراف پھول ہیں درخت ہیں۔ بلبلیں ہیں۔ کونڈے ہیں۔ لیکن اس کو تو تمہاری ہی دھن ہے بعض وقت تو مارے رشک کے میرا جی جلنے لگتا ہے۔ جب یہ تمہیں یاد کرتا ہے یہ کہاں سے آگیا نگوڑا تمہیں مجھ سے زیادہ چاہنے والا ——— ؟

شاید موسم کی خوشگواری دیکھ کر اس کو جنون چڑھ گیا ہے۔ لیکن ہمیں کیا جب دل ہی نہیں تو اس میں کیا جنون رہیگا۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا۔

انہہ ——— "جہنم رسید" ——— ایسا دل رہا تو کیا اور نہ رہا تو کیا۔ ایک ہے
بس اب زیادہ اپنے بکواس کو طول دینا نہیں چاہتی۔ یہ مکتوب جمیل کہیں ثقیل نہ ہوجائے۔
اب تم جلد اچھی ہوجاؤ تو بہتر ہے ورنہ نہ معلوم مجھے کیا ہونیوالا ہے۔

"تمہاری وارفتہ محبت"

تنقیدات عبدالحق اون تنقیدات کا مجموعہ ہے جو مولانا عبدالحق صاحب نے مختلف کتابوں پر لکھی ہیں۔ ضرورت تھی کہ ذوق ادب کے گرویدہ کو ایک جگہ یہ تنقیدیں ملجاتیں۔ جناب تراب علی خاں صاحب باز کا ہم کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ آپ نے اکٹھا کرکے بڑی حد تک ہماری ضرورتوں کو پورا کردیا ہے۔ قیمت عہ
کاشانہ باز بازار گھانسی حیدرآباد دکن۔

ظاہر باطن۔ نئی روشنی۔ حشرات الارض ۔ مولوی فضل الرحمن صاحب بی اے آنرز کے یہ وہ ڈرامے ہیں جو اسلیپر میں اسٹیج کئے گئے تھے اور پبلک نے بیحد پسند کیا تھا جس کے دیکھنے کے لوگ اب بھی مشتاق ہیں۔ ملک کے اخبارات نے مفید رائے ظاہر کی ہے۔ کتابی صورت میں تیار ہوچکے ہیں۔ عہ۔ عثمانیہ۔ عہ۔ کلدار
مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

باز کے سو شعر ۔ مرتبہ واجد علی خاں صاحب جاوید۔ جس میں تراب علی خاں صاحب باز کے چوٹی کے سو شعر جمع کرکے ایک ننھا منا مجموعہ شایع کیا ہے۔ پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۲ر کا نشانہ بازار گھانسی حیدرآباد

تذکرۂ جمیل ۔ باتصویر کو اب تک آپ نے نہ دیکھا ہو تو فوراً ایک آدھ نسخہ طلب کیجئے۔ یہ دور حاضرہ کے تعلیم یافتہ خواتین کا دلچسپ تذکرہ ہے جس میں اون کے ادب و انشا کے دلکش نمونے۔ تعلیمی سرگرمیاں موجود ہیں۔ حجم تین سو صفحہ سے زیادہ۔ اعلی کاغذ۔ اچھی لکھوائی۔ مجلد قیمت (عا۱)

دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد دکن۔

بزم کہکشاں

بند شبین عشق ہیں دنیا سے نرالی دیکھیں
دل تڑپ جائے مگر لب نہ ہلائے کوئی (رضا لکھنوی)

دیکھا وہ جلوہ پھر نہ لباس مجاز میں
جرم اپنا ایک سجدہ بے اختیار تھا (" ")

چلے تھے اک نظر تری بزم دیکھ آئیں
یہاں جو آئے تو بے اختیار بیٹھ گئے (" ")

پھر نہ دیکھا بجز اک شعلہ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا (میر)

نمود تیری نمود اس کی نمود آں کی نمود تیری
خدا کو تو بے حجاب کر دے خدا تجھے بے حجاب کر دے (اقبال)

ہیں سمجھا قرب جاناں میں کہ پردہ درمیاں کیا تھا
مرے ذوق نظر کی ایک حد تھی آسماں کیا تھا (شوکت)

روز مرگ آرزو ہے تا یکے غم کیجئے
تا کجا دست دعا کو وقف ماتم کیجئے (ناسخ)

شاد عظیم آبادی

کیا دلق ضرور پارسائی کیلئے تسبیح فقط ہے خود نمائی کیلئے
اے زاہد سالوس نہ دے مجھکو فریب ساری ہے یہ بندگی خدائی کیلئے
(بیاض۔ مس فاطمہ جعفر کبری)

"مر گئے"

کیوں چل رہے ہو گور غریباں میں ناز سے
جو اس ادا کے دیکھنے والے تھے مر گئے (جاوید)

آتے ہیں کس خوشی سے ہمیں دیکھنے کو وہ
رستے میں سن لیا کسی سے کہ مر گئے۔ (آغا لکھنوی)

سچ پوچھئے تو زندہ جاوید ہیں وہی
جو جیتے جی کسی کی محبت میں مر گئے (داغ)

ہم کو تھا انتظار اجل موت سے سوا
آنے میں ان کے دیر تھی بے موت مر گئے (ریاض خیرآبادی)

پوچھا نہ ایک دن بھی کہ کیسا مزاج ہے
بیمار آپکے اسی حسرت میں مر گئے (صفدر)

شاد عظیم آبادی

ارباب قیود تجھکو کیا دیکھیں گے خواہان نمود تجھکو کیا دیکھیں گے
رویت کیلئے شرط ہے میدان فنا پابند وجود تجھکو کیا دیکھیں گے

دل کے پلٹی نہیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا
بجلیاں کوند گئیں جب وہ مقابل سے اٹھا! (فانی)
(بیاض باقر علی زاہد)

میری تخلیق سے پہلے

(ش)

گلزار جنت کی دلکش و رنگین صباحتیں نظروں میں اداس تھیں۔ نوا گونا گوں کے ذائقے کوئی لذت پیدا نہ کرسکے۔ سطح فلک کی قرمزی فضائیں روح نواز نہ ہوسکیں۔ شاداب پھولوں کی تعطر آلودگی مشام نوازی نہ کرسکتی تھی۔ نرگس میری چشم مخمور کی لرزشیں لیکر بھی نظر اندوزی نہ کرسکی۔ لالہ گوں سحر کی کیفیت فردوس رنگینیاں، میری دوشیزگی صبیح کے عکس سے خالی تھیں۔ صہبائے عنبر بار کا رقص لطیف میری خرام ناز کی لطافتوں کو پہنچ نہ سکتا تھا۔ ماہتاب کی سیمیں شعاعیں آفتاب کی زرّین کرنیں۔ میری نگاہ حیات افروز سے بڑھ کر جاذب نظر نہ تھیں۔ لیلائے شب کی حسین تاریکیاں میری آنکھوں کی سرمئی فضائے بصیرت سے بڑھکر وقعت نہ رکھتی تھیں۔ فردوس بریں کے فرحت آگیں لمحات اک ادائے برخاستہ خاطری سے زیادہ نہ تھے۔ طبیعت کی جنون زائیاں ترقی پر تھیں۔ نشاط قلب کی فراہمی ایک کوشش ناکام تھی۔ زندگی کی خاموش و پرسکون ساعتیں ناقابل برداشت سمہ تھیں۔

"زندگی" ایک سوال تھا پیچیدہ۔ ایک عقدہ تھا لاینحل۔ جو وا نہ ہوسکتا تھا۔ ایک نغمہ تھا۔ بےخود جو کبھی گایا نہ گیا ہو۔ ایک رباب تھا مضطر جس کے تار ابھی چھیڑے نہ گئے ہوں۔ ایک تمنا تھی بیتاب۔ جو دل کی مطمئن خلوتوں میں تڑپ رہی ہو۔

"میری تخلیق کے بعد"

فطرت کی تمام رنگینیاں متبسم و رقصاں ہوگئیں۔ میری مستی چشم کی کیف افزائیاں وسعت کائنات تسکر کی خرابیوں میں کھو گئیں میری طرب آگیں ہمکلامی سے سامعہ۔ کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب گیا۔ میری نقرئی قہقہوں کی آواز نے فضائے خاموش کو ہنگامہ زار لطافت بنا دیا۔ میرے بے پناہ تبسم نے حسیات شباب میں جان پیدا کردی۔ میرے خرام ناز کی نزاکتوں نے کائنات پر وجدانی کیفیتیں طاری کردیں میرے سیاہ و دراز بالوں کے انتشار سے پرسکون سانسیں الجھ گئیں۔ "میرا صہبائے شباب سے مخمور" دوشیزہ مجسمہ لمس

بصارت سے گنہگار ہوگیا تسکین روح میرے کنارِ لطیف میں حاصل ہوگئی، وحشت تنہائی کو "میری محبت حسین" نے کھودیا۔!!

گویا! "منشائے تخلیق عالم میری تخلیق ہوئی۔

جناب رحمت بیگم آسبر (ورنگل)

غزل

سنتے سنتے تھک گئے ہر بات پر کچھ بھی نہیں — پھر یہ ہم سے کیوں رکے ہو تم، اگر کچھ بھی نہیں

آج تک تو حاصل دردِ جگر کچھ بھی نہیں — آہ میں تاثیر رونے میں اثر کچھ بھی نہیں

مخلخہ: تیرا ہے۔ تیرا ذکر ہے۔ تیرا خیال — اور ہم کو کام دن بھر رات بھر کچھ بھی نہیں

دل میں رکھ لینے کے قابل ہے کہاں کا چاہنا — تجھ کو اپنی بھی خبر۔ اے بے خبر کچھ بھی نہیں

تم اگر ہو بات کے پورے یہی کہہ دو ہمیں — ہم کو دنیا بھر میں منظور نظر کچھ بھی نہیں

ہائے کیسی زندگی اب کٹ رہی ہے بے مزہ — دیدہ تر۔ سوزِ دل۔ دردِ جگر کچھ بھی نہیں

بات سن کر بت بنے رہنا بھی کوئی بات ہے؟ — منہ سے اتنا تو نکال اے فتنہ گر کچھ بھی نہیں

اے صفی ہم کو زمانے نے کیا ہے پائمال
اب تو یہ حالت ہے سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

(حکیم بہبود علی صفی)

مانٹی کارلو

دنیا کا مشہور عالم قمارخانہ

فرانس کے شہر (نیئس) سے مشرق کی طرف ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست (موناکو) نامی واقع ہے اس ریاست کے تین طرف ممالک فرانس اور ایک طرف بحر روم ہے ۔

اس ریاست کی کل کائنات صرف تین مقامات ہیں۔ شہر موناکو ۔ کوہ کارلو اور کندا۔ ریاست کی آبادی ۱۹ ہزار ہے جس میں ۲۴۱۰ موناکو میں ۳۸۹۳ کوہ کارلو میں ۶۲۱۸ کنداکے باشندے ہیں۔

رئیس کا نام شہزادہ (البرٹ) ہے جو اپنے باپ شہزادہ چارلس ثالث کے وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔

ریاست بہت چھوٹی ہے اس کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ چارلس ثالث سابق فرماں روائے ریاست کے تمام مصارف اس سے نکل سکتے اس لئے اس نے پیرس کے ایک باشندے سے توسیع آمدنی کی بابت مشورہ کیا۔ یہ شخص نہایت چالاک اور فطین تھا اس نے کہا کہ یہ کوئی مشکل معاملہ نہیں۔ نہایت آسانی سے آپ ایک بڑے والی ملک کی آمدنی پیدا کر سکتے ہیں۔ اب تک آپ نے صرف اپنی ریاست کی قلیل آمدنی کو صرف کیا اب بہتر ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی دولت مند قوموں کی دولت پر متوجہ ہوں۔ اس کیلئے صرف ایک عمدہ قمار خانہ قایم کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑیگی ۔ چارلس ثالث کو یہ مشورہ پسند آیا اور اس نے (دبول) اور نغاویرو فرانسیسی شخصوں کو اپنی ریاست میں قمارخانہ قایم کرنیکا لائسنس دیدیا۔ ان دونوں شخصوں نے مل کے ایک قمارخانہ قایم کیا۔ لیکن بعض حالات ایسے پیش آئے کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

قمارخانہ کارلو کا بانی شہر ہمبرگ میں (بلانک) نامی ایک شخص تھا۔ یہ شخص تار آفس کے کارپردازوں کو رشوت دے کے ان تاروں کو حاصل کر لیا کرتا تھا۔ جو بنکوں کے نرخ کے متعلق پیرس سے آیا کرتے تھے۔ اس جرم میں اس کو چھ مہینہ کی سزا ہوگئی۔ چھ مہینہ کے بعد جب قیدخانہ سے نکلا تو اس نے ایک چھوٹا سا ہوٹل قماربازی کے لئے قایم کیا۔ اس ہوٹل میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ اس نے خیال کیا اگر کامیابی کی یہی رفتار

رہی تو عجب نہیں کہ حکومت جرمنی ہوٹل کو بند کرانے پر متوجہ ہو جائے۔ اس لئے اس کو ایک مقام کی فکر ہوئی جہاں کسی طرح کی مزاحمت کی خلش نہ ہو کسی قدر جستجو کے بعد کوہ کارلو کا علم ہوا۔ اور اس نے فوراً یہاں پہنچکر ۱۸۶۱ئہ میں (دیول) اور (فلاویر) سے قمارخانہ کا لائسنس خرید لیا۔

بلانک نے ۶ لاکھ گنی لگا کے نہایت ماہر انجنیروں کی زیر نگرانی ایک پرشوکت عمارت اور ایک دلکش پائین باغ تیار کرایا۔ اور ہمبرگ سے اپنا تمام سامان قمار بازی بھی لے آیا رفتہ رفتہ اس قمارخانہ کی شہرت پھیلنے لگی۔ دور دور سے لوگ آ آ کر شریک ہونے لگے اور تھوڑی ہی دنوں کے اندر قمارخانہ یورپ اور امریکہ کے قمار بازوں کا ایک عظیم الشان مرکز ہوگیا۔

قمارخانہ کی آمدنی | اس قمارخانہ کی آمدنی اس تخمینے سے کہیں زیادہ ہے جس قدر ان حالات کے علم کے بعد کہا جاسکتا ہے۔ ریاست میں حفظ امن۔ نگرانی باغات۔ اصلاح ریلوے کے مصارف اور اس کے علاوہ ریاست کو ایک لاکھ فرانک سالانہ دینا۔ بلانک کے بجٹ کی صرف چند مدیں تھیں۔ اس نے اسی قمارخانہ کے خالص منافع سے تمام مصارف کے بعد دس ملین پونڈ جمع کرئے تھے لیکن ایک نئی مشکل یہ پیدا ہوگی کہ باشندگان ریاست کو قمارخانہ پسند نہ تھا۔ قمارخانہ کے خلاف عام جوش یہاں تک بڑھا کہ رعایا نے رئیس کے مقابلہ میں بغاوت کردی بلانک نے اس موقع سے عجیب طرح سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے یہ تجویز پیش کردی کہ تمام رعایا ٹیکس سے معاف کردی جائے ان کے معاوضہ میں ٹیکس کی پوری رقم میرا قمارخانہ ادا کردیا کریگا۔

اس تجویز نے رعایا کے دلوں کو مسخر کردیا اور بغاوت فرو ہوگئی ان مصارف کے معلوم ہونے کے بعد غالباً یہ تخمینہ (جیسا کہ کیا گیا ہے) بیجا نہیں کہ بلانک کو قمارخانہ سے کئی ملین پونڈ سالانہ کی بچت تھی۔

قمارخانہ کا لائسنس اور اس کا معاوضہ | اس قمارخانہ کا لائسنس بلانک کے پاس سے ایک کمپنی کے ہاتھ میں گیا۔ اس کمپنی نے لائسنس کی تجدید ۱۸۹۸ئہ کے لئے کی اور اس کے مقابلہ میں ریاست کو ۱۸۹۹ئہ تک ۲۴ لاکھ پونڈ دیتی رہی لیکن اس کے بعد یہ رقم برابر ترقی کرتی رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹ئہ میں کمپنی نے ۵ لاکھ پونڈ اور ۱۹۱۳ئہ میں ۶ لاکھ پونڈ ادا کئے اور ۱۹۱۷ئہ میں ۸ لاکھ پونڈ۔ ۱۹۲۰ئہ میں ۹ لاکھ اور ۱۰ لاکھ پونڈ دیگئے۔

قمارخانہ کے بند کرنیکی کوشش | قمارخانہ کی دلکشی اور عالمگیری روز بہ روز بڑھتی گئی۔ یورپ کے دولتمند خاندانوں کے ممبر یہاں آنے اور قسمت آزمائی کرنے لگے۔ قمارخانہ کے قواعد اس طرح ترتیب دئے گئے تھے کہ اکثر لازمی طور پر کھیلنے والے ہارتے تھے۔ گو بظاہر وہ سمجھتے تھے کہ جیت بھی جایا کرتے ہیں اس کو مجبور کرکے اس قمارخانہ کو بند کرانے کی کوشش کیگئی لیکن اوس نے جواب دیا کہ وہ ریاست سے دست بردار ہوکر جرمنی کی ماتحتی قبول کرلیگا۔

نوٹ ۔ مانٹی کارلو کے چشم جدید حالات نواب شہید یار جنگ بہادر نے اپنے خاص انداز میں قلمبند کرکے یورپ سے بھجوائے ہیں لیکن اس کی اشاعت اس لئے ملتوی رکھی جاتی ہے کہ عنقریب یورپ کی دلچسپ ڈاک کتابی صورت میں جس میں وینس وغیرہ کے نفیس بلاکس ہوں گے اس میں یہ حالات رہینگے۔ بہتر ہے کہ آپ آج ہی اپنا نام رجسٹر میں درج کرالیں۔ ان خطوط کی بیحد مانگ ہورہی ہے اور دفتر میں کوئی نمبر بھی نہیں ہے اس لئے مناسب یہی سمجھا گیا کہ یہ کتابی صورت میں شائع کرئے جائیں۔

آپ مطمئن رہیں شہید یار جنگ بہادر حیدرآباد پہنچ کر عرصہ ہوا ہے مگر یورپ کی دلچسپ ڈاک برابر جاری رہیگی۔

آئندہ اشاعت میں ایک اور دلچسپ خط شائع کیا جائیگا۔

قطعات سالگرہ

ہزار سال مبارک بہ طول عمر و حیات
دعائے وردِ زبان رعدؔ جشن شاہانہ
مبارک آپ کو اے تاجدار ملک دکن
دعائے رعدؔ ہے ہر سال جشنِ شاہی ہو

ایضاً

نظام جشن۔ ولائے نظام سالگرہ
مبارک است مبارک دوام سالگرہ
یہ تخت قائم و دائم بساط سالگرہ
مبارک آپ کو عیش و نشاط سالگرہ
۱۳۵۴ھ

(حکیم میر نادر علی رعدؔ

سیمین نمبر

ماہنامہ شہاب کے سیمین نمبر کیلئے عہد عثمانی سے متعلق بہترین مضامین۔ نظم و نثر کی ضرورت ہے ہمارے قلمی معاونین جو ابتدا ہی سے اوس کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے کیلئے کوشاں ہیں اس اہم تقریب کیلئے اپنے اپنے انداز نگارش کا کمال دکہائینگے۔ ہمارے لئے ان ایام سے زیادہ مسرت خیز نہیں ہیں۔ مضامین آخر دے تک وصول ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ اس کی ترتیب کیلئے زیادہ وقت درکار ہے۔

یورپ کی دلچسپ ڈاک جس کا سلسلہ عرصے سے شہاب میں آپ پڑھتے آئے ہیں اس کی نسبت جس کثرت سے ستائشی خطوط ملے ہیں اوس کا علم ہم کو ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ اگر آج ایک ہزار پرچے بھی ہمارے پاس ہوتے تو وہ نکل جاتے مگر کیا خبر تھی کہ نواب شہید یار جنگ بہادر

درچمن ہائے نگارش ہر قدم چوں کربلا
از نسیم کلک فرش ارغوان انداختہ

کا نقشہ پیش کرنیوالے ہیں۔ قارئین کے اشتیاق کو دیکھ کر اس کا ارادہ کرلیا گیا ہے کہ کتابی صورت میں نہایت خوشنما لکھوائی چھپائی اور کئی اعلیٰ بلاکس کے ساتھ شایع کردیں اور اس مجموعہ میں وہ آخری خط بھی رہے گا جس میں "مانٹی کارلو" کے چشم دید حالات لکھے گئے ہیں جو پڑھنے کے لائق ہیں آج ہی آپ اپنا نام درج رجسٹر کرالیں کہ فوراً آپ کی خدمت میں کتاب بھیجدی جائے۔

اپنے قمیص۔ بنیانوں۔ پاجاموں وغیرہ پر اپنے پورے نام جو انگریزی میں کڑھے ہوئے ہونگے اگر درکار ہوں تو ہم سے مراسلت کیجئے یہ حروف مختلف رنگوں میں بھی تیار ہوسکتے ہیں۔ فوٹو ہاؤس بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن

شریر دوشیزہ

شریر آنکھ۔ نگہ بیقرار۔ چتون شوخ

زندگی کی مسرتیں ظرافت اور خوش مزاجی میں مضمر ہیں اگر ان کا عنصر انسانی خمیر سے خالی رہے تو پھر وہ انسان انسان نہیں بلکہ نرا مضغہ گوشت سمجھا جائیگا جس کی قدر و قیمت ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا سے بڑھی ہوئی نہ ہوگی۔ اور جب حال یہ ہے تو زندگی کی تلخ ساعتیں شیریں اور خوشگوار کیوں کر ہو سکیں گی۔ مجھے غصہ آتا ہے ہمیشہ ان ہستیوں پر جو منہ پھلائے۔ ابرو چڑھائے رہتے ہیں جن کی آنکھیں مغموم پیشانیاں شکن آلود جنھیں دیکھنے کے بعد بجائے مسرت کے بے اختیار رونے کو جی چاہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ابھی ابھی حلقہ ماتم سے گریہ وفغاں کرکے واپس تشریف لائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستیوں کے پاس اسباب شادی بھی ہوں تو وہ نوحہ ماتم ہی دکھائے دینگے۔ ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے   مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

لیکن شکر ہے کہ میرے وسیع خاندان اور اس کے افراد کو ایسی ہستیوں سے دور کی بھی نسبت نہیں بزم شادی ہو یا حلقہ غم جب کبھی آپ ان سے ملیں گے ہنس مکھ اور بشاش ہی پائیں گے۔

حسینہ میری قریبی رشتہ دار ہے جس کو امی جان نے بیٹی سے زیادہ محبت سے پالا ہے۔ چونکہ میرے اور بھائی جان کے سوا گھر میں کوئی لڑکی نہ تھی اس لئے ان کی شفقتیں اس کے ساتھ دوچند تھیں یہ جس قدر حسین اور ملنسار تھی اوسی قدر شوخی چلبلا پن طبیعت میں تھا۔ نچلا خاموش تو کبھی بیٹھا نہ گیا۔ بات بات میں شوخی اور ظرافت اس کے ہر بن مو سے ٹپکتی تھی چونکہ سلیقہ شعار اور منتظم تھی اس لئے گھر کا تمام کاروبار اس کے سپرد تھا بھائی جان اس کے سلیقہ اور صفائی کے دلدادہ تھے تو بھابی جان اوس کی شوخی اور شرارت کی فریفتہ۔ ابتداء سے میرے ساتھ اس کی تعلیم اور تربیت ہوتی آئی تھی اس لئے میری اور اس کی خوب نبھتی تھی۔ فرق صرف اسی قدر تھا کہ میری تعلیم جاری تھی اور اس کا سلسلہ گھریلو کاروبار کے سبب منقطع ہوگیا تھا وہ گویا امی جان کی وزیر اعظم تھی گھر کے تمام ضوابط اوس سے وابستہ تھے باوجود میں تعلیمیافتہ ہونیکے

اس کی شوخی اور ذہانت کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بات بات میں لطیفہ پیدا کرکے آپ کے لبوں سے قہقہہ نکال دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہمارے بزرگوں کا قول ہے کہ جس دسترخوان اور جس محفل میں ہم دونوں نہ ہوں وہ دسترخوان پھیکا اور وہ محفل سونی دکھائی دیتی ہے یہی وجہ تھی کہ ہم سب ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے اگر میں زیادہ رات آؤں تو چاہے سب کھالیں لیکن وہ بھوکی رہتی یہاں تک کہ میں نہ آؤں کبھی اصرار بھی کیا جائے تو یہی جواب دیتی کہ ظفر بھائی کے بغیر حلق سے نوالہ کیونکر اترے گا۔ چنانچہ بھائی اور بھابی جان اسے چھیڑا بھی کرتے تھے مگر مسکرا کر ٹال دیتی مدرسہ کی لڑکیوں کا روزآنہ تانتا بندھا رہتا تھا جو اس کی بذلہ سنجیوں، شوخیوں کی فدائی تھیں گویا اپنی ہم عمر لڑکیوں کی وہ قاید تھی جس کے اشارے پر سب عمل کرنے تیار ہو جائیں۔

گھر کا کوئی رشتہ دار بھی اس سے ملتا تو اس کی مسکراہٹ پھول برسانے لگتی تھی لیکن بعض بڑی بوڑھیاں اس کے خندہ پیشانی کو گناہ کبیرہ سمجھتی تھیں کہ کنوار پنے میں اتنی شوخی اچھی نہیں۔ عورت چاہے جوان ہو یا لڑکی لیکن اس کو ایک بت رہنا چاہئے۔ لبوں پر تبسم ابرو میں بانکپن شیوہ نسوانی نہیں یہی وجہ تھی کہ میری اور حسینہ کی بے تکلف گفتگو کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھیں مگر امی جان کے خوف سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتی بھی تھیں۔

جب کبھی میں رات کو سینما سے لوٹوں تو وہ ہنستی ہوئی میری پذیرائی کیلئے بڑھتی اگرچہ کہ میں نے بارہا کہا بھی ہے کہ تیرا یوں رات کے وقت تنہائی میں مجھ سے ملنا موزوں نہیں تو وہ جواب یہی دیتی تھی کہ اتنی رات آخر دیکھنے والا ہے کون ہے اور جو بڑی بوڑھیاں ہیں وہ آنکھوں سے معذور ہیں اونہیں اس اندھیرے میں کیا خاک سجھائی دیگا۔

میں نے کہا کہ اتنی بھولی نہ بن، اری یہ آنکھوں سے معذور سہی لیکن ان کے دل کی آنکھیں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ وہ میلوں سے واقعات کا سراغ چلالیتی ہیں اس لئے سُن رکھ کہ آئندہ سے میری واپسی کا انتظار نہ کرنا لیکن کبھی اس نے اس پر عمل نہیں کیا۔

عورت! آہ! کس قدر مقدس ہستی ہے۔ اک ذرا سہارا دو وہ عہد وفا باندھتی ہے۔ اس کی قدر

کرو کہ وہ اپنی زندگی کی تمام مسرتیں تمہارے قدموں پر نثار کر دیگی۔ وہ فردوس کا ایک خوش نوا پرندہ ہے جو مغموم دلوں کو اپنے نغموں سے مترنم کیف بنا دیتا ہے وہ مرد کی زندگی میں نصف کی شریک ہو جاتی ہے کہ رنج و غم کا توازن قائم رہ سکے اگر تمہارا قلب مصائب سے پریشان ہو جائے تو وہ کوشش کرتی ہے کہ کشتیٔ حیات زندگی کے طوفان خیز سمندر سے کنارہ عافیت تک پہنچ جائے وہ چاہتی ہے کہ مرد اس کی خوبیوں کا اعتراف اور اس کی معصومیت اور نیکیوں کا پرستار بنا رہے۔

یہ تھی وہ حسینہ جس سے اٹھتے بیٹھتے مجھے روزانہ سابقہ پڑتا تھا ساتھ ہی ساتھ وقت پر وہ شوخی سے باز بھی نہیں رہ سکتی تھی اس کی خاموش شرارتوں سے میں گھبرا جاتا تھا۔ نعمت خانہ سے گلاب جامنوں کا غائب کرنا اور ان کے بدلے بینگن کا شریک کر دینا۔ بالائی کے عوض روئی کا بچھا دینا۔ کسی کو پان میں ہیر اکیس شریک کر کے لبوں کو سیاہ کر دینا تو اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ یہ شرارتیں اگرچہ میرے لئے کی جاتیں مگر خمیازہ غریب ماماؤں کو بھگتنا پڑتا۔ باوجود اس کے گھر کی مامائیں اوس سے کبھی ناخوش نہیں رہتیں۔ اگر اس کی شرارتوں اور شوخیوں کو قلمبند کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن چند جدت خیز شرارتیں سن لیجئے۔ آپ جس کو آج تک کوئی حل نہ کر سکا۔

دوپہر کا وقت تھا کام کاج سے فرصت پا کر حسینہ سینے پرونے کا سامان لئے ہوئے آپ ہی یہ اشعار گنگنا رہی تھی۔ ؎

علم دے تجھکو خدا جو ہو نمائش سے پرے   وہ بھی اتنا خود سمجھکر اور کو سمجھا سکے
اپنی ماں کی خوبیاں بھی تجھ کو ورثہ میں ملیں   باپ کی دولت مراتب تجھ کو ترکے میں ملیں
صلح جوئی کام میں ہر اک ہو بس تیرا شعار   سستی و تغضبہ سے تیری زندگی ہو برکنار

اتنے میں ایک ہمسایہ کی خاتون جو روزانہ آنیوالی تھیں آدھمکیں حسینہ کو کام کرتے اور گاتے ہوئے دیکھ کر وہیں ٹھیر گئیں اور اس خاتون کی آنکھیں کپڑے میں بچہ کو تلاش کرنے لگیں۔ یہ ایسے موقع سے کب چوکنے والی تھی۔ فوراً کپڑوں کو جوڑ جاڑ کر بچہ کی شکل بنا چادر اڑا کر تھپکنے لگی۔ پھر تو یہ خاتون جو کھڑی تھیں پاس آکر نہایت پیار و محبت سے بیٹھ گئیں اور ہمدردی سے کہنے لگیں " ماں کی مامتا بھی کیا بری بلا

ہوتی ہے کہ کام میں بھی بچہ کا دھیان نہیں جاتا۔" حسینہ نے جواب دیا "بیشک ماممتا بُری ہوتی ہے۔" فرمایا۔ بچہ۔ بچی؟ حسینہ نے کہا۔ بچی! کیا عمر ہے؟ آپ ہی دیکھ لیجئے نا۔ اب اونہوں نے کپڑا اٹھاکر بچہ کو دیکھنا چاہا تو وہاں کپڑے دھرے ہیں۔ حسینہ نے تڑپکر کہا دیکھئے نا۔ بچی تو آپ کے سامنے موجود ہے آپ ہی اندازہ لگائیے کہ کیا عمر ہوگی؟ یہ اور بھی خفیف ہوکر امی جان کی طرف چلدیں۔ شرمندہ تھیں ان بیاہی کی نسبت اونہیں اس وقت کیسا مغالطہ ہوا۔

کالج سے ایک دن ذرا سویرے گھر پہنچا کمپونڈ میں دیکھتا ہوں کہ موٹر تیار کھڑی ہے حالانکہ بھائی جان کے اس وقت باہر جانیکا وقت بھی نہ تھا۔ زنان خانہ میں داخل ہوتا ہوں تو حسینہ بنی ٹھنی ورانڈے میں کھڑی ہے مجھے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بڑھی اور میں نے بے اختیار یہ شعر پڑھ دیا۔؎

موٹر سجی ہوئی جو بعزم سفر ہے آج کہنا حسینہ تیرا ارادہ کدھر ہے آج

جواب دیا۔ بڑی دیر لگائی آپ نے۔ میں کب سے منتظر ہوں۔ مہربانی کرکے اولٹے پیر پھر جائیے اور مجھے تھوڑا سا سلوز انٹرک کا سلوشن بازار سے لادیجئے۔

سلوشن!! آخر کروگی کیا؟

کہنے لگی آج نازنین نے کالج کی لڑکیوں کو اپنے یہاں چاد پر بلوایا ہے آپ جانتے ہیں نا یہ وہی نازنین ہیں جن کا دماغ آٹھوں پہر عرش پر رہتا ہے جو اپنے پہننے اوڑھنے اور فیشن کے مقابلہ میں دوسری لڑکیوں کا مضحکہ اڑاتی ہیں ارادہ ہے کہ آج بیگم صاحبہ کا مزاج پوچھوں! جو اپنے سینٹ کی تعریفوں میں زبان خشک کرتی رہتی ہیں کہ راست لندن اور پیرس سے منگوایا ہے اور یہ ہندستان کے بازاروں میں کبھی مل نہیں سکتا۔ میں بھی دیکھوں کہ ان کا سنٹ آج کتنی لڑکیوں کو معطر اور مست بناتا ہے۔

سنٹ اور سلوشن دو متضاد چیزیں۔ اس کا مصرف بھی تو معلوم ہو؟

مصرف! خود معلوم ہو جائیگا۔ آپ لا بھی دیتے ہیں یا یوں ہی باتیں بگھارتے ہوئے میرا وقت خراب کرینگے؟ مجھ میں اتنی جرات تو نہ تھی کہ اوس کو ناخوش کروں۔ چنانچہ اولٹے پیر بازار جاکر آن کی آن میں سلوشن دیتے ہوئے دبی زبان سے اتنا کہدیا۔ نہ جانے تیرے یہ کرتوت کس دن

تجھے پٹوائیں؟"

مسکرا کر کہا ٹینگی وہی جنہیں ہمیشہ اپنے ساتھ والیوں کو منفعل کرنے کی دھن لگی رہتی ہے۔ ہمیں بھلا کیوں پٹنے چلی۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا حشر ہوگا۔ یہ کہکر میں اپنے کمرہ کی جانب بڑھا وہ موٹر میں سوار ہوکر چلتی بنی۔ میں اس واقعہ کو بھول بھال گیا اور جب حسب عادت زیادہ رات گئے گھر پہنچا تو حسینہ آچکی تھی اوس کی صورت دیکھتے ہی شام والی گفتگو یاد آگئی اور میں نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔ ہاں بتا تو سہی کہ آج پارٹی میں کیا کیا ہوا۔ کہنے لگی ہوتا کیا سبھوں نے کیک پیسٹری پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ریڈیو ایک طرف نغمہ سرائی کر رہا تھا تو دوسری طرف طشتریوں کی جھنکار بوتلوں کی آواز۔ لڑکیوں کے قہقہوں سے کان گنگ ہو رہے تھے مگر باوجود اس کے شریک ہونیوالیاں جب واپس ہوئی ہیں تو افسردہ اور مغموم تھیں جس شوق سے آئیں اس سے کہیں زیادہ حرماں نصیب گئیں اور نازنین کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر ایک سے نہایت عاجزانہ معافی مانگ رہی تھی۔ دیکھا بیگم صاحبہ کا کبر و غرور کس قدر جلد ناک کے راستہ نکل گیا۔

کچھ بتائے گی بھی کہ اس کا سبب کیا تھا؟

سبب کیا ہوتا وہی بیگم صاحبہ کا سنٹ اور کیا؟

بیگم صاحبہ کا سنٹ ؟

آپ بھی عجیب جھکی ہیں کہہ تو رہی ہوں کہ یہ سب سنٹ کا کرشمہ تھا۔

بس یہی کہ جتنی لڑکیاں شریک تھیں اون کی نفیس ریشمی ساڑیاں اور رنگین دستیاں اور چہرے اور ہاتھ سیاہ افشاں سے چھپے ہوئے تھے پوڈر نے بھی غریب کے چہروں کے سیاہ دھبے دور نہ کرسکے البتہ ایک آپ کی یہ خادمہ تھی جو اس خوش نصیبی سے محروم رہی۔

کیا کسی غلطی سے روشنائی کی بوتل ٹوٹ گئی یا کسی بچہ نے چھڑک دی۔

نہیں بلکہ نازنین کی یہ حرکت تھی جب سب لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی ہنس بول رہی تھیں۔

نازنین اٹھی اور کمرے میں سنٹ کا فوارہ ہاتھ میں لئے یہ کہتی ہوئی پہنچی کہ میں نے محض آج کی پارٹی کیلئے پیرس سے کوٹی کا سنٹ ایرمیل سے منگوایا ہے کہ میری سہیلیاں کیا یاد کرینگی کہ نازنین انہیں کس قدر عزیز رکھتی ہے اس کے ساتھ ہی وہ سب کی ساڑیوں، آستینوں، چہرہ پر سنٹ کی بارش برسانے لگی۔ جب میرے پاس پہنچی تو میں نے کہا نا بہن مجھے تو سنٹ سے معذور ہی رکھو۔ کیونکہ ابتدا ہی سے میرا دماغ ایسے دیسی عطروں سے بسا ہوا ہے یہ ہندوستانی پانی تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے۔ بعضوں نے میری تائید کی لیکن بیشتر بہنوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا کہ لو بہن حسینہ اگرچہ کہ تعلیم یافتہ ہے مگر سنٹ کے معاملہ میں کس قدر فرسودہ عقیدہ رکھتی ہے میں خاموش ہو رہی۔ خوشبو سے ساری فضا معمور تھی اور سبھوں نے بے انتہا تعریف کی اور نازنین کے نفاست مزاج کی جی کھول کر داد دی گئی۔

شاید اس کا سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہتا مگر ایک لڑکی نے اپنا ہاتھ دکھلا کر کہا بہن یہ سیاہ دھبے میرے ہاتھ پر کیسے؟ اب تو سبھوں نے اس کی جانب توجہ کی اور جب ایک دوسرے کی نظر کپڑوں پر گئی تو دیکھتی ہیں سب اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ نفیس نفیس ساڑیاں منقش ہیں ہاتھوں اور چہروں پر سیاہ دھبے گویا چیچک نکل آئی ہے ساڑیوں کا اتنا صدمہ ہوا کہ جو مسرت اور خوشی کچھ دیر پہلے چہروں پر رقص کر رہی تھی۔ اون کی جگہ حزن و الم نے لے لی۔ ہیں سب کی سب خاموش گویا سانپ سونگھ گیا ہے۔ اب عقل آرائیاں ہونے لگیں نتیجہ یہ نکالا گیا کہ سنٹ میں کسی چیز کی آمیزش ہو گئی ہے مگر سوال یہ تھا کہ آمیزش کس نے کی سوائے کمپنی کے کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ فوارہ میں سنٹ تو نازنین نے اپنے ہاتھ سے بھرا تھا۔ مجھے بھی نہایت افسوس رہا۔ بیچاری غریب نازنین کی پارٹی میں رنگ میں بھنگ والی مثل صادق آگئی۔

میں نے اس تفصیل کو سن کر کہا میں جانتا ہوں یہ تیری شرارت ہے!

آپ سمجھ لیجئے لیکن میرے ہاتھ تو اس گناہ سے آلودہ نہیں ہیں غرض نازنین کے پارٹی کے چرچے تمام نسوانی دنیا میں ہونے لگے۔ بیچاری ایسی خفیف ہوئی کہ پھر کبھی کسی سے منھ کھول کر بات کرنے کی جرات نہ کی۔ ہمارے یہاں بھی وہ آتی جاتی رہی لیکن تزک و احتشام اور وہ فیشن کا راگ اب نہ تھا۔

حسینہ کے آئے دن کی انوکھی فرمائشوں سے بعض اوقات میں گھبرا جاتا تھا لیکن بجز تعمیل کے چارہ

بھی نہ تھا۔ بھوکا پیا سا سینما سے نہایت بیتابی سے گھر لوٹا کہ کچھ کھا پی کر کالج کی تیاریوں میں معروف ہو جاؤں۔ کہ امتحان سر پر کھڑا ہے اور کورس کی بہت ساری کتابیں پڑھنی ہیں کیا دیکھتا ہوں کہ حسینہ چھ فٹ کا چہرہ بنائے ایک ستون سے لگی کھڑی ہے نہ وہ متبسم استقبال ہے اور نہ وہ شگفتہ صورت۔ خیال ہوا کہ شاید بھائی جان یا امی جان نے کچھ کہہ دیا نہ ہو لیکن ان کی عادتیں نہ تھیں کہ حسینہ کو کبھی سخت اور سست کہیں ہو نہ ہو آج طبیعت نصیب دشمناں ناساز ہوگئی اس لئے نہایت پیار و محبت سے میں نے پوچھا خیر تو ہے مزاج کیسا ہے؟ برس پڑی کہ مزاج جیسا کچھ ہوگا۔ ہوگا۔ اب تو مجھ میں یہ آئے دن کے مصائب برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے یہ روز آنہ کی ناز برداریاں کب تک اوٹھائی جائینگی ایک دن ہو تو کوئی صبر بھی کریگا۔ یہاں تو سلسلہ ہی لگا ہوا ہے کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

نیک بخت آخر کچھ بتائیگی بھی یا یوں ہی کہتی چلی جائیگی۔

کیا خاک بتاؤں۔ یہ جو بچوں کے مولوی صاحب ہیں نا۔ انھوں نے تو گھر دیکھ لیا اور کسی نہ کسی بہانہ ٹھیر جاتے ہیں مجھے ان کے ٹھیرنے سے کوئی تکلیف نہیں لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ٹٹو کے دانہ چارہ کا انتظام میرے لئے سوہان روح ہے۔ دانہ۔ چارہ تو مل بھی جاتا ہے مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ مالش کے لئے آدمی بھی میں ہی پکڑا بلاؤں۔ اگر کبھی کبھار مالش خود ہی کرلیں تو کوئی عیب نہیں آخر بیچارہ پر روز آنہ سواری کرتے ہی ہیں کبھی آپ بھی خدمت کریں مگر اونھوں نے تو یہ سونچ رکھا ہے کہ چلو جہاں سب کچھ ہو رہیگا۔ اگر اس میں ذرا سی غفلت ہو جائے تو بچوں کی جان کھائے جاتے ہیں اور بچے مجھے ستاتے ہیں کہ آپا یوں کردو۔ آپا ووں کردو۔ اس لئے روز آنہ کی جھک جھک سے محفوظ رہنے کا میں نے یہ علاج سونچا ہے یا تو مولوی صاحب ہی رہیں یا ان کا ٹٹو۔ دونوں ایک ساتھ نہ رہیں۔ وہ شوق سے آئیں مگر ان کا ٹٹو کمپونڈ میں قدم نہ دھرے۔

میں کیا کرسکتا ہوں؟ بگڑ کر کہنے لگی۔ پھر آپ ہیں کس مصرف کے جو ایک ٹٹو کو یہاں سے دفان نہ کر سکیں ٹٹو جائے یا مولوی صاحب۔ دونوں سے کسی ایک کی ذمہ داری۔ لیجئے تو میں کھانا کھاؤں۔

آخر کچھ بتائیگی بھی کہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہے؟ کام کیا؟ ذرا اتنا کیجئے کہ اس موذی ٹٹو کو موٹر گیاریج کی چھت پر چڑھا دیجئے۔ پھر دیکھوں کہ مولوی صاحب کا ٹٹو یا مولوی صاحب کیونکر اترنے کی جرأت کرتے ہیں۔

خوب۔ ٹٹو نہ ہوا کوئی کھلونا جو ہاتھ سے اوٹھایا اور چھت پر رکھدیا۔ کیا دیوانگی نے تو نہیں گھیرا ہے۔ اور کیا آپ سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ ٹٹو کو چھت پر چڑھا دیں!! پھر یہ جو مرد اپنی عقل اور دانش کی بڑی بڑی ڈینگیں لگایا کرتے ہیں کس برتے پر۔ چڑھا دیجئے نا ٹٹو کو چھت پر پھر میں جانوں کہ بڑے بول کا سر اونچا ہی ہوتا ہے۔

میں حیران تھا کہ یہ ایک ان ہونی بات ہے اور نہ جانے یہ خیال دماغ میں کیوں سما گیا۔

تو بس آج سے ہار مان لیجئے میں تدبیر بتادوں۔ کاش اللہ میاں تمہارے بدلے مجھے مرد بنایا ہوتا! تو آج بتا دیتی کہ کیا چیز ہے جو نہیں ہوسکتی!

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھئی میں ہارا تو جیت گئی۔ لے اب تو بتا دے۔

تو سنو! یہ جو کمپونڈ میں شہتیریں پڑی ہیں نا اُن کو موٹر گیاریج کی چھت سے زمین تک ڈھلوان جما دیجئے جس طرح کہ دو منزلہ تعمیر کے وقت مزدوروں کو سامان وغیرہ لیجانے کے لئے راستہ بنا دیا جاتا ہے اور بچھا دیجئے ان شہتیروں پر موٹا سا ٹاٹ اور چڑھا دیجئے ٹٹو کو اوپر چھت کے۔ یہ کچھ اونچی بھی تو نہیں ہے تین ساڑھے تین گز ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ مجھے اوس کی فراست اور عقلمندی پر ایمان لے آنا پڑا۔ چونکہ اس اثنا میں رات زیادہ جا چکی تھی۔ سب سو رہے تھے گیاریج بھی کمپونڈ سے دور تھا اس لئے حسینہ کی امداد سے آن کی آن میں یہ قلعہ سر کیا گیا اور نہایت خاموشی سے اطمینان کے ساتھ بستر پر دراز ہوگیا۔ صبح جب آنکھ کھولی تو دیکھتا کیا ہوں محلہ بھر میں ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے کہ "ٹٹو چھت پر چڑھ گیا" جو سنتا ہے دیکھنے کو دوڑ آتا ہے مولوی صاحب جو اس باخنہ کمپونڈ میں کھڑے ٹٹو کو چمکار رہے ہیں کہ کہیں وہ پھاند نہ پڑے اور ٹٹو مجمع کو دیکھ کر اور پریشان ہو رہا ہے دولتیاں جھاڑ رہا ہے لوگوں میں حیرت اور استعجاب پھیلا ہوا ہے کہ ٹٹو چھت پر خوب چڑھ گیا۔ کوئی گلہری اور گھرگٹ تو نہ تھا۔ جتنی منہ اتنی باتیں لیکن کسی کو اس مسئلہ کے سلجھانے کی عقل نہ آئی۔ میں بھی اونہیں میں ملا جلا پھر رہا ہوں۔ حسینہ گھر میں مسکراتی ہوئی امی جان سے پوچھ رہی ہے۔ امی جان ٹٹو چھت پر کیونکر چڑھ گیا وہ جواب دیتی ہیں۔ بیٹی! نئی روشنی۔ نیا زمانہ جو نہ ہو تھوڑا ہے۔ بھائی اور بھابی جان کا پختہ خیال تھا کہ بغیر میری اور حسینہ کی سازش کے

ٹٹو کا اوپر جانا ممکن ہی نہیں۔ ہم ٹھیرے چھوٹے۔ پاس ادب مانع بزرگوں کی تردید کریں تو کیوں کر خاموش رہنا پڑا۔ کہ ایسا ہی ہی۔ امی جان ماماؤں کو بلا کر پوچھتی ہیں۔ آخر غریب ٹٹو کا کیا حشر ہوگا۔ کیا وہ نیچے اتر بھی سکیگا یا اوسے وہیں حلال کرکے اتارنا پڑیگا۔

یہ تھے ہمارے لیل و نہار جو حسینہ کے معیت میں گذر رہے تھے کہ اس اثناء میں میرے بی۔ اے کی کامیابی نے غضب ڈھا دیا۔ امی جان کو اپنی ایک دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کا موقع نکل آیا۔ جب ہم سب دسترخوان پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہنے لگیں۔ بیٹا قمر! (یہ میرے بڑے بھائی کا نام ہے) مجھے ظفر کی کامیابی کا انتظار تھا سو احسان ہے اوس پاک پروردگار کا جس نے میری دعائیں سن لیں۔ زندگی کا بھروسہ ہی کیا ہے۔ چاہتی ہوں اپنی آنکھوں سے اس کا سہرا بھی دیکھ لوں۔ حسینہ بھی سیانی ہوچکی ہے۔ یہ سنتے ہی دسترخوان سے حسینہ چلتی بنی۔ بھائی جان نے کہا امی جان جو آپ کی خوشی۔ ہمیں انکار کی مجال نہیں۔ شادی تو ہوگی میاں ظفر کی۔ ذرا اُن سے بھی پوچھ لیجئیں۔ جب مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ دل تھا کہ مسرت کے مارے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہا تھا۔ اور عقل کہتی تھی کہ ایک برتن بلا سے پالا پڑیگا۔ خدا ہی خیر کرے۔

چونکہ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا شادی کی تیاریاں ہونے لگیں لیکن میرے لئے تو یہ عرصہ نہایت تکلیف دہ تھا کیونکہ آنکھیں جس حسین چہرہ کو اور کان جس مسرت آمیز گفتگو کو سننے کے عادی تھے وہ غائب ہے۔ حسینہ مشرقی شرم کے مارے میرے سامنے آنے شرماتی تھی اور میرا جی کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ ہر طرف دیوانوں کی طرح اوداس مارا مارا پھرتا تھا۔ لوگوں نے میری اوداسی کا یہ نتیجہ نکالا کہ میں اتنی جلدی شادی کیلئے تیار نہیں ہوں حالانکہ کیا خبر تھی اُن کو میرے قلب پر جو گذر رہی تھی۔ گھر میں حسینہ کی کوئی سہیلی بھی نہ تھی جو اوس کے توسط سے اپنا پیام پہنچاتا۔ یہ دو ہفتے نہ تھے بلکہ دو صدیاں تھیں۔

آخر وہ دن بھی آپہنچا۔ تمام عزیز و اقارب جمع ہوئے۔ شادیانے بجنے لگے۔ ماموں جان کی وکالت بھائی جان وغیرہ کی شہادت۔ اور قاضی جی کے دو بول پر حسینہ کے دائمی عیش و آرام کا مجھے ٹھیکہ دار بنادیا گیا۔ جلوہ کیلئے زنانہ میں میری طلبی ہوئی۔ عورتوں نے نوشاہ کی سج دھج دیکھنے کیلئے پردہ ادر اور غیر پردہ کو بالائے طاق رکھدیا تھا۔ کیونکہ ایسے وقت محض آنکھ کا پردہ رہجاتا ہے۔ میراثنین بنا میرا لمبی پکڑا سے

یاماں"۔ اور "آیا ماں میری چہیا کا دولہا" گانے لگیں۔ اور یہاں میری گت بننے لگی حسینہ کے اور میرے
ر پہ ایک سرخ کپڑا اڑھا دیا گیا اور فرمائش ہونے لگی کہ سورہ اخلاص پڑھ کر دلہن کے رخ پر دم کروں
ں کئی ہفتہ کا نادیدہ جب نہایت اشتیاق سے دیکھنا چاہا تو ظالم نے بھنگی آنکھیں ٹیڑھا منہ مضحک
رت بناکر میری جانب دیکھا۔ مجھے ہنسی آگئی چادر سے ہنستا ہوا سر نکال لیا عورتیں میری اس حرکت پر
پس میں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

جب انگوٹھی پہنانے کو کہا گیا تو میں نے بھی اس بہانہ سے انگلی کی پور اس آذیت سے دبائی کہ بے اختیار
پ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ لطف تو یہ ہوا کہ پیچھے جو خاتون بیٹھی ہوئی تھیں وہ گرتے گرتے رہ گئیں۔
میں مسرور تھا کہ اب حسینہ میری ہے لیکن دل کہہ رہا تھا کہ اس آتشیں مزاج سے کیونکر بنے گی۔

نباہ الفت کا ہم دو نازکوں میں سخت مشکل ہے ادھر آتش مزاج یار۔ ادھر ٹھنڈا مرا دل ہے

رنا ہی کیا۔ کیونکہ ع برسر اولاد آدم ہرچہ آید بگزرد۔ صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔ اپنا ہی گھر تھا۔ نہ برات
لی نہ باجے گاجے کے ساتھ تمام سڑکوں کی جاروب کشی کرنی پڑی۔ رات کے دس گیارہ بجے ڈرتا ڈرتا چھپتا۔
بیاتا۔ چوروں کی طرح کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ حجلۂ عروسی میں پہنچا۔ اور آہستہ سے داخل ہوا۔ برقی لمپ
ں رہا تھا جس کی ٹھنڈی روشنی میں ایک شوخ ہستی مظلوم بنی ہوئی مسہری میں ہلکا نیلا دوشالہ اوڑھے
ئے سکڑی پڑی ہے۔ آہستہ پہنچ کر چہرے سے دوشالہ ہٹاتا ہوں تو یا للعجب کہ حسینہ غائب ہے
ں کی جگہ تین تکیے جوڑ کر بستر پر رکھے ہوئے ہیں۔ پریشان کہ الٰہی کیا ماجرا ہے یہ بھی تو کوئی شرارت
ہیں۔ کمرہ میں ہر طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہوں کیا دیکھتا ہوں کہ کپڑوں کے اسٹانڈ کے
ریب کوئی سر جھکائے کھڑا ہے میں پنجوں کے بل چلتا ہوا بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر جو پکڑتا
وں تو حیرت اور تعجب کے سوا کچھ بھی نہ تھا کیونکہ وہ محض اسٹانڈ ہے جس پر اس طرح کپڑے رکھ دئے
ئے تھے کہ کسی انسان کا دھوکہ ہوتا تھا اب تو طبیعت جل گئی اور اپنی انتہائی خفت مٹانے کے لئے
مسہری پر بیٹھا ہوا غور کرنے لگا۔ کوئی خادمہ بھی وہاں نہ تھی جس سے پوچھتا شرم بھی غالب تھی کہ
ں سے دریافت کروں۔ چنانچہ آہستہ دروازہ کھول کر کئی بار باہر بھی دیکھا لیکن کسی کا پتہ نہیں۔

پھر ناکام واپس آکر نہایت مایوسانہ مسہری پر بیٹھا سوچنے لگا کہ مچھر نے پیر میں کاٹ لیا۔ جب کوئی تجویز سمجھ میں نہ آئی تو اس سوچ بچار میں لیٹ رہا۔ ابھی کوئی رائے ٹھیک طور پر قائم نہیں کی تھی معلوم ہوا کہ میرے بازو میں کوئی سخت چیز سوئی کی طرح چبھ گئی ہے۔ درد کے مارے بیتاب ہوکر اٹھتا ہوں تو مچھر دانی میں الجھ کر زمین کی پیمائش شروع کر دی۔ پڑے پڑے بیچ اتفاقاً نظر پڑی تو مسہری کے نیچے کوئی اوڑھا ہوا پڑا ہے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا بھی تھا کہ یہ بھی کوئی دھوکا اور فریب نہ ہو مگر ہمت کرکے جہاں سے اور ہے یہ بھی سہی چادر کو جو جھٹکا دیکر کھینچتا ہوں تو حسینہ ہے۔ اتنی دیر کی پریشانی۔ بازو کی سوزش میں غصہ میں بھرا ہوا تو تھا ہی نہایت بگڑ کر کہا " واہ یہ بھی اچھا مذاق ہے ۔ موقع نہ محل۔ اب تک میرے بازو میں سوزش ہو رہی ہے تمہیں کچھ خیال بھی آیا؟

اوس نے آہستہ سے کہا" جی ہاں یہاں جو کسی کی انگلی دکھ رہی ہے ——— "؟

غزل

محتاج بعد مرگ نہیں ہوں مزار کا ۔۔۔ بادل ہے آسمان پہ میرے غبار کا

لپکا ہے میری آنکھوں کو دیدار یار کا ۔۔۔ باندھے گا تار تار نظر انتظار کا

وہ پھول اب چڑھانے کو آئے ہیں قبر پر ۔۔۔ چھوٹے ہیں داغ دل کے ہی موسم بہار کا

پامالیوں کے لطف اٹھائے ہیں اس قدر ۔۔۔ ایسے مٹے رہا نہ نشاں تک مزار کا

کچھ دھوپ سے ہی خوف نہ ہی چاندنی سے کام ۔۔۔ ہی شامیانہ چرخ ہمارے مزار کا

مظہر یہ شرط عشق ہے تم اس کو سوچ لو ۔۔۔ افشا کرو نہ راز کبھی وصل یار کا

(حکیم محمد مظہر حسین صدیقی وکیل)

ایک دوشیزہ کو دیکھکر

اتفاقاً ایک دوشیزہ مجھے آئی نظر ہو گیا مبہوت میں اس کی جوانی دیکھ کر
حسن پاکیزہ کی اک تصویر تھی وہ سر بسر ہو رہی تھی صانع قدرت کی صنعت جلوہ گر

پھر رہے تھے گرد اس کے نوجواں دیوانہ وار
جس طرح ہوں شمع کے اطراف پروانہ نثار

اس کی آنکھوں میں شرارت ارغوانی تھی بھری جوش زن تھیں عارض رنگین و جبین نور کی
تھی سراپا سے نمایاں اس کے شان دلبری تھا تناسب جسم کا رشک بتانِ آذری

کوندتی تھی بجلیاں اس کی نگاہ ناز میں
سینکڑوں فتنے تھے پوشیدہ ہر اک انداز میں

چال مستانہ تھی اس کی آنکھ شرمائی ہوئی اور ظالم کی جوانی جوش پر آئی ہوئی
وہ جدہر گذری ادھر ہنگامہ آرائی ہوئی ایک خلقت حسن کی اس کے تماشائی ہوئی

پھر رہی تھی ہر طرف وہ تیر برساتی ہوئی
دیکھنے والوں کے دل تہ سوں سے ٹھکراتی ہوئی

منہ پہ برقع ڈال لینا اور ہٹا لینا کبھی چلتے چلتے یک بیک اس کا وہ رک جانا کبھی
آنکھ اٹھا کر دیکھ لینا اور شرمانا کبھی آگے بڑھتے بڑھتے پھر تیزی سے مڑ جانا کبھی

کس قیامت کی ادا تھی کس غضب کا ناز تھا
کس بلا کا حسن تھا کیا فتنہ گر انداز تھا

ساتھیوں میں اسطرح وہ پھر رہی تھی سیم بر ماہ جھرمٹ میں ستاروں کے ہو جیسے جلوہ گر
برقعہائے سبز تھے ان ساتھیوں کے زیب بر گیروے برقع میں تھی پوشیدہ یہ رشک قمر

اس طرح سے تھا نمایاں اس کا حسن لاجواب
ہو شگفتہ جس طرح سے سبز پتوں میں گلاب

گیروئے برقع میں تھا یوں جسم نورانی نہاں ہو شفق سے جس طرح خورشید کا جلوہ عیاں
حسن عالمتاب کا بھی تھا عجب دلکش سماں صورت آئینہ حیراں تھا ہر ایک پیر و جواں

ہاتھ میں ایک ظرف چینی تھی لیئے وہ مہ لقا
کر رہا تھا دست نورانی سے جو کسب ضیاء

میں نے جو دیکھا اسے پھر دل کھڑا دیکھا کیا ایک سکتے کا سا عالم مجھ پہ طاری ہوگیا
آہ نکلی اک جگر سے تھام کر دل رہ گیا حسن اُس کا دیکھ کر پڑھتا رہا صل علیٰ

کیا حیا تھی کیا ادا تھی ہائے کیا انداز تھا
حسن بھی تھا جس پہ نازاں وہ دو نور ناز تھا

زندہ باد اے تاجدار کشور حسن و ضیاء زندہ باد اے کوکب برج جمال باصفا
زندہ باد اے ماہ پیکر حوروش زہرہ لقا زندہ باد اے مہر خوبی پرتو نور خدا

از بلا ہائے زمین اے مہ جبین مامون باد
ہم ز آفات سماوی ہر زماں مصئون باد

(اللہ بخش بی۔اے۔بی۔ٹی)

قارئین کی خدمت میں بارہا عرض کیا گیا ہے کہ ختم چندہ کی اطلاع ایک مہینہ پہلے دیدی جاتی ہے اگر آئندہ خریداری منظور نہ ہو تو براہ کرم ذریعہ کارڈ مطلع کردیں ورنہ وی۔پی روانہ ہوگا لیکن کوئی توجہ نہیں کیجاتی اور جب وی۔پی کردیں تو بلا تکلف واپس کرکے دفتر کو صریح نقصان پہنچایا جاتا ہے آخر اس قدر وسعت اخلاق سے جو فائدہ اخذ کیا جاتا ہے اس سے ہمیں بھی مطلع فرمائیں تو انتہائی کرم ہوگا تاکہ ہم بھی آپ سے یہ اخلاق سیکھ سکیں۔ ورنہ اب تک ہم سمجھ نہ سکے کہ کیا طریقہ اختیار کریں جس سے آپ کے ارادہ کا علم ہو۔

نقد و بحث

شہاب بابتہ مہر ۱۳۴۵ف جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۴۱ پر ایک نظم بعنوان "ایک نرس سے خطاب" جناب سکندر علی صاحب وجد بی۔اے کی شایع ہوئی ہے جس کا آٹھواں شعر حسب ذیل ہے:۔

تبسم حسن کے آگے خندہ گل زہرخندہ ہو ۔۔۔ تکلم وہ کہ بلبل گل کے بدلے تجھ پہ شیدا ہو

اس شعر کی نسبت ایک صاحب نے ذیل کا استفسار کیا تھا:۔

پہلے مصرعہ میں گنجلک بھی ہے اوس سے قطع نظر زہرخندہ کا معنی سمجھہ میں نہ آیا لفظ "زہرخند" تو دیکھا اور سنا مگر "زہرخندہ" لغت میں بھی نہ ملا۔

دوسرے مصرعہ میں عجیب و غریب تشبیہ ہے۔ گل کو تکلم سے کیا نسبت۔ بلبل گل کی رنگ و بو اور حسن و جمال کی شیدائی کہی جاتی ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ معشوق یا ممدوح کے حسن و جمال کو دیکھ کر بلبل شیدا ہوئی گل سے منھ موڑ لیا۔ لیکن ممدوح کے حسن تکلم یا خوش الحانی کو گل سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ کیا چودھویں صدی کی سائینٹفک تحقیقات میں گل کا تکلم اور بلبل کا کسی کی خوش الحانی پر فریفتہ ہونا بھی ثابت ہوا ہے؟

میں مشکور ہونگا اگر از راہ کرم میرے شکوک رفع اور اپنی رائے سے مجھ کو استفادہ کا موقع عطا فرمائیں۔

اس کی نسبت ہم نے بھی مناسب خیال کیا کہ وجد صاحب سے استفسار کریں۔ چنانچہ آپ نے جو جواب بھیجا ہے وہ اس کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ یقین ہے کہ جو شکوک پیدا ہوئے ہیں وہ اس جواب سے رفع ہوجائینگے۔

(بسمل)

مکرمی۔ تسلیم! میں آج کل بہت مصروف ہوں۔ آپ کے گرامی نامہ کا دیر میں جواب دے رہا ہوں۔

میرے شعر پر جب کوئی اعتراض کرتا ہے تو میں اس کو "شعر میں کہتا ہوں ۔ تجھے تم کرو" کہہ کے ٹال دیتا ہوں اس لئے کہ شاعر کا کام شعر کہنا ہے نہ کہ اپنے کلام کی ایک شرح بھی لکھنا اس کا فرض ہے۔ اس وقت بھی میں محض آپ کے ارشاد کی تعمیل کر رہا ہوں۔

ہنسی کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ خندہ۔ ۲۔ شکر خندہ۔ ۳۔ زہر خندہ۔ لفظ "خندہ" ہی پر شکر اور زہر کے سابقے لگا کر دو نئے مرکب الفاظ "شکر خندہ" اور "زہر خندہ" بنا لئے گئے ہیں۔ ضرورت شعری کے لحاظ سے کہیں تو زہر خندہ استعمال ہوتا ہے اور کہیں زہر خند اور اسی طرح بعض اوقات شکر خندہ کہتے ہیں اور کبھی شکر خند۔ شکر خند اور شکر خندہ جس طرح ہم معنی ہیں بالکل اسی طرح زہر خند اور زہر خندہ بھی ہم معنی ہیں۔ اس وقت مجھے دو شعر یاد آ رہے ہیں جن میں "شکر خند" اور "شکر خندہ" دونوں استعمال ہوئے ہیں ؎

جہاں ز صبح "شکر خندہ" نور روشن شد — کہ دیدہ است شکر ایں قدر سفید شود — صائب

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ "شکر خند" — اقبال (بال جبریل)

صائب کا ایک اور شعر ہے ؎

می کند چرخ ستمگر به "شکر خندہ" حساب — لب مخمور بہ خمیازہ اگر باز کنم

پس اگر "شکر خندہ" صحیح ہے تو "زہر خندہ" کو درست ماننے میں کیوں تامل ہے؟ لفظ "خندہ" کا مخفف "خند" ہے ورنہ بذاتہ کوئی اسم نہیں ہے یہ تو نہایت صاف سیدھا معاملہ تھا۔ نہ اس کیلئے قاموس چھاننے کی ضرورت ہے اور نہ لغت کی ورق گردانی کی حاجت۔

"تبسم جس کے آگے خندہ گل زہر خندہ ہو"

تیرے بیساختہ تبسم کے مقابلہ میں خندہ گل جو نہایت ہی دلکش ہوتا ہے "سراسر ساختہ" معلوم ہوتا ہے جس میں نہ کوئی خوبی ہے نہ حسن یا تیری ادائے تبسم کے آگے گل کی ہنسی دراصل کھسیانی سی معلوم ہوتی ہے۔

تکلم وہ کہ بلبل گل کے بدلے تجھ پہ شیدا ہو۔

غالباً یہاں اعتراض "تکلم گل" پر ہے۔ اگر میں اعتراض کر بیٹھوں کہ "عشق بلبل" کے کیا معنی؟ کہاں ایک پھول کہاں ایک پرندہ! آدمی کو آدمی سے۔ جانور کو جانور سے عشق ہوتے تو سنا تھا لیکن کہیں یہ تو دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا کہ کسی طوطے کو تیتری سے محبت ہو گئی ہو۔ آپ کہیں گے کہ بلبل

بلبل شاخ گل پر فرط محبت سے چہچہا چہچہا کر اپنی جان تک دے دیتی ہے میں کہتا ہوں بلبل کو پھول سے نفرت ہے اس لئے جہاں کہیں اس کو پھول نظر آتا ہے وہ گریہ و زاری آغاز کر دیتی ہے۔

واقعہ در اصل یہ ہے کہ شاعری میں پہلے مفروضات قائم کئے جاتے ہیں پھر ان سے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ شاعر یہاں بھی فرض کر لیتا ہے کہ پھول جس کو ہنسی آ سکتی ہے "گفتگو" بھی کر سکتا ہے۔ شاعر کے نزدیک پھول کی ہنسی کی طرح اس کی گفتگو بھی نہایت دلآویز ہے۔ اعتراض کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ مفروضہ نیا ہے ہماری قدامت پسندی کی یہ انتہا ہے کہ نہ صرف وضع قطع۔ طعام کلام وغیرہ وغیرہ میں قدامت کا خیال رکھا جائے بلکہ کوئی مفروضہ بھی نیا نہ قایم کیا جائے۔ زمانہ قدیم حقیقتوں کو بھی اب باطل ثابت کر رہا ہے اور ہم ہیں کہ مفروضات ہی کی قدامت کی حفظ میں کوشاں ہیں۔ اقبال کہتا ہے۔ ؎

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تیری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں!!!

یہاں بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "شجر حجر خدا سے کیوں کر کلام کر سکتے ہیں"؟

انسان جب کوئی نیا خیال پیش کرتا ہے تو اس کو نہ صرف نئی تشبیہوں نئے استعاروں اور نئے اسلوبوں کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ وہ نئی ترکیبوں اور نئے مفروضوں کے استعمال پر بھی مجبور ہے۔ غالب نے "انگور" کو عقد وصال سے تشبیہ دی۔ اقبال نے "دل" کو "ہنگامہ خاموش" کہا۔ فانی نے "محشر سکوت" اور صائب نے "لب مخمور" جیسی عجیب عجیب ترکیبیں استعمال کیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ تشبیہیں اور ترکیبیں ان شاعروں سے پہلے بھی کسی شاعر کے کلام میں کہیں ملتی ہیں؟ اگر اقبال پتھروں اور درختوں میں خدا سے کلام کرنے کی صلاحیت پاتا ہے تو عزیب وجد کو اگر "زبان گل" میں تکلم کی قوت محسوس ہو تو کونسی عجیب بات ہے؟ اقبال ایک جگہ کہتا ہے ؎

انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے "بوئے بلبل" بو "پھول کی چہک" ہے

ذرا غور فرمائیے کہ "بوئے بلبل" اور "پھول کی چہک" کس قسم کے معنے ہیں!

"تکلم وہ کہ بلبل گل کے بدلے تجھ پہ شیدا ہو"۔ اس مصرعہ کے معنی سمجھنے کے لئے اس خیال پر نظر رکھئے۔ نرسوں کو مریضوں سے زیادہ گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اس سے اکثر وہ اشاروں ہی سے بیمار کی

مزاج پرسی کر لیا کرتی ہے۔ اس ادائے مزاج پرسی کو شاعر "خاموش گویائی" سے تعبیر کرتا ہے اور اسی صفت کو وہ پھول میں بھی پاتا ہے۔ بلبل آہ وزاری کرتی ہے اور وہ چپ سنتا رہتا ہے: یہی چیز وجہ شبہ ہے شاعر کا خیال ہے کہ بلبل کمبخت محض رنگ و بو ہی کیلئے تو ہلاک ہوتی نہیں پھرتی بلکہ اس کی بیچینی کا سبب کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔ بلبل کے لب پر تو اضطراب میں "لاکھ سخن" ہیں لیکن گل ان تمام کا جواب صرف ایک "خاموشی" ہی سے دیدیتا ہے۔ شاعر کی دانست میں بلبل جو عاشق صادق ہے صرف رنگ و بو جیسی ظاہری چیزوں پر ہی نہیں مرتا بلکہ وہ دراصل پھول کے اس انداز گفتگو کا شیدا معلوم ہوتا ہے۔ اب پورے شعر کا مطلب یہ ہے کہ:۔

"قطع نظر تیرے تبسم سے کہ جس کے آگے خندہ گل زہرہ خندہ معلوم ہوتا ہے۔ تیرا طرز تکلم بھی ایسا دلاویز ہے کہ بلبل جیسا عاشق صادق جو گل کی "خاموش گویائی" پر مٹا ہوا ہے۔ اگر کہیں تیری گفتگو سن لے تو گل کے بدلے تجھ ہی سے محبت کرنے لگے۔

میں نے یہ جواب محض تعمیل ارشاد کے طور پر لکھا ہے۔ اگر اس پر بھی مستفسر صاحب مطمئن نہ ہوں اور انھیں پہلے مصرعہ میں "گنجلک" نظر آئے اور دوسرا مصرعہ "بے معنی" معلوم ہو تو فرما دیجئے کہ:۔

بندشِ اگرچہ سست ہے مضمون بلند ہے۔

لیکن یہ کہنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

سکندر علی وجد بی-اے

صنفِ نازک مکمل ہو چکی ہے اور عنقریب پریس میں طباعت کیلئے جائے گی اور یہ نقش ثانی بہتر از اول ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس میں علاوہ تصویر کے مضامین المضاعف ہیں۔ ضرورت ہے کہ ذوق ادب کے دلدادہ ابھی سے اپنا نام شریک رجسٹر کرائیں کہ وقت پہ کتاب مل سکے۔ اس کیلئے (عہ) روپیہ دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد دکن بھیج دیجئے گا۔

قتل شہزادی عباسہ

رات کا جوبن ڈھل چکا ہے۔ اس غضب کی تاریکی چھائی ہوئی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھائی دیتا۔ بغداد جو عراق کی دلہن ہے اس وقت اتنی سنسان معلوم ہو رہی ہے کہ گویا کسی عروس نو کا سہاگ لٹ چکا ہے۔

اس وقت خلیفہ ہارون رشید ذریزدی ہوئی جعفر برمکی کے خون سے ہاتھوں کو رنگے ہوئے اسی تلوار کے ساتھ خوابگاہ عباسہ میں پہنچا۔ اس کا خادم مسرور بھی سر جھکائے ہوئے ساتھ ہے۔

شمع محفل موسیقی و نور آسمان شاعری۔ حور مجسم۔ شہزادی عباسہ دارالخلافہ کے آراستہ خوابگاہ میں مرصع مسہری پر جعفر کی یاد میں کروٹیں بدل رہی ہے کہ خلیفہ وقت کے بے اطلاع آدھی رات کو محل میں آ نیسنے تمام کنیزیں اور خواصیں گھبرا کر کانپتی لرزتی عباسہ کی خدمت میں آئیں۔

ایک کنیز خاص جو جعفر و عباسہ کے واقعات عشق کی راز دار ہے آگے بڑھکر اور دیوانہ وار چاروں طرف دیکھ کر بولی۔ محترم خاتون۔ بہر وجلد میں بجز اتنا رہے جو انی پر رحم فرمایئے اور فوراً بھاگئے امیر المومنین باب القصر پر برہنہ شمشیر لئے آ پہنچے ہیں

اسکتی بنات الہاشم لا یھربن من الموت۔ چپ رہ بنی ہاشم کی بہو بیٹیاں موت سے نہیں بھاگتیں“

عباسہ نے ڈانٹ کر کہا اور سرو قد اٹھ کر کھڑی ہوئی تاکہ اپنے بھائی کا استقبال کرے وہ آگے بڑھی تھی کہ باب القصر کے پہلے ہی زینہ پر خلیفہ ہارون رشید کی ملاقات ہوئی۔ عباسہ نے ہلال شب اول کی طرح خمیدہ ہوکر نہایت ادب و احترام سے سلام کیا لیکن ہارون رشید نے التفات نہ کی اور خاموش سر جھکائے چین بر جبین دیوان خانہ کی طرف بڑھا جہاں وہ ہمیشہ عباسہ اور جعفر کے ساتھ مجلس مناظرہ و مشاعرہ میں بیٹھا کرتا تھا۔ سوختہ قلب عباسہ بھی سر جھکائے ہوئے خاموش خلیفہ کے پیچھے پیچھے پہنچی۔

خلیفہ نے اپنی نشست درست کر کے بھرائی آواز میں کہا ”دروازہ بند کرو“

منہ سے بغیر کوئی حرف نکالے کل کی پتلی کی طرح جباسہ نے تعمیل حکم کی اور خاموش نگاہ بزرمین سامنے کھڑی ہوگئی۔

خلیفہ نے عباسہ پر غضب آلود نگاہیں ڈال کر کہا "کیا میری آدھی رات کو آنیکا سبب معلوم ہے؟

جواب ندارد۔ . . . اگر نہیں معلوم تو سن لے کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ تیری زبان سے خیانت بنی ہاشم اور مخالفت حکم شاہی کے اسباب سنوں۔ ناکارہ آج سے تو میری بہن نہیں۔ بول بول اور جلد بول۔ کہ تیرا کیا جواب ہے۔ اپنی عصمت ریزی کا واقعہ اس سے پہلے بیان کرلے کہ تیری ناپاک روح اس قفس بلورین سے پرواز کر جائے اور تیرے گلشن حیات کو عزرائیل خزاں کی شکل میں برباد کردے۔

عباسہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگی مگر پھر اس کا ہاشمی خون رگوں میں متلاطم ہوگیا وہ سنبھلی اور سنبھل کر کہا۔ میری دوگذارشیں ہیں"

ہارون رشید۔ دوگزارشیں!

عباسہ۔ جی ہاں۔ پہلے تو یہ کہ میں ایسے کسی امر شنیعہ کی مرتکب نہیں ہوئی کہ جس سے ہاشمی دامن داغ آلود ہو۔ دوسرے یہ کہ میں نے آج تک کسی فرمان شاہی کی مخالفت نہیں کی۔ ہاں آپ کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ مجھے موت کی قطعاً پروا نہیں اور نہ زندگی کی تمنا ہے جس غیور ماں کے دودھ سے آپ نے پرورش پائی ہے اسی مقدس دودہ کا خون میرے رگ و ریشہ میں دوڑ رہا ہے ہارون اور عباسہ ایک ہی درخت کے دو پھل ہیں۔

ہاں لیکن ایک پھل کو زہریلے کیڑے نے خراب کر دیا ہے۔ خلیفہ نے گھور کر کہا۔ تو اس خواب میں نہ رہ کر مجھے تیری اور جعفر کی خانگی ملاقاتوں کا علم نہیں ہے اور نہ میں اس سے ناواقف ہوں۔ میری غیرت وحمیت اس کی متقاضی نہیں ہے کہ میں اس واقعہ کو اپنی زبان سے دہراؤں۔ یہ کہتے کہتے ہارون رشید کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے اور ہونٹوں کو چبا کر کہا "وہ ایرانی غلام ہے" یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں تمہاری ملاقاتوں کو نظرانداز کرسکوں میں فرار واقعی اس کی سزا دوں گا۔ وہ فرط غضب سے کھڑا ہوگیا۔

اگر بنی ہاشم کی عزت کی قیمت تیری نگاہوں میں ایک ذرہ برابر بھی وقعت رکھتی ہے تو تجھے ایک لمحہ بھی

زندہ نہ رہنا چاہئے

عباسہ مبہوت ہوگئی آنسو خشک ہوگئے۔ پاؤں شل تھے۔ رگوں میں خون منجمد ہوگیا۔ وہ مجسمہ کی طرح اپنے بھائی کی شعلہ بار آنکھوں کو دیکھ رہی تھی اور خلیفہ کا طیش وغضب لمحہ بہ لمحہ ترقی پذیر تھا۔ منھ سے کف جاری تھا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے پشت ہتیلی کو اتنی زور سے کاٹا کہ خون جاری ہوگیا۔ عباسہ جلد جواب دے میں منتظر ہوں"

عباسہ نے جس طرح تپ دق کا بیمار آخری سانس لیکر وصیت کے چند الفاظ ادا کر رہا ہو۔ جواب دیا۔ محترم پیارے بھائی جان۔ سچ ہے میں جعفر کی منکوحہ ہونے کے ساتھ ساتھ مدخولہ بھی ہوں اور مجھے اس سے محبت بھی ہے مگر یہ سب کچھ آپ ہی کے فرمان آپ ہی کی خوشی اور آپ ہی کی مرضی مبارک سے ہوا ہے اگر آج وہی فرمان وہی حکم گناہ اور موجب عزت ریزی متصور ہے تو یہ گنہگار عباسہ آپ کے قدموں کے پاس حاضر ہے۔ شوق سے اس کا سر رشتہ حیات منقطع کر دیجئے۔ لیکن اس ہستی کے خون سے ہاتھوں کو رنگین نہ کیجئے کہ جس کو آپ ایرانی غلام فرما رہے ہیں وہ ایک ایسا مدبر اور دانشمند شخص ہے کہ جس کی بدولت آج دولت عباسیہ کا سنہری پرچم آسمان نیلی رواق تک لہرا رہا ہے اور آپ کا ضمیر بھی اس کا شاہد ہے کہ اسی کی قوت بازو سے شہر بغداد مرجع علوم وفنون ہونے کے ساتھ ساتھ مرکز تجارت بھی ہوگیا ہے میرے اچھے بھائی اگر آپ نے اس کے خون سے زمین رنگین کی تو یہ یاد رہے کہ تاریخ بغداد یا کتاب دولت عباسیہ میں ایک سیاہ ورق ظلم وستم کے عنوان سے زیادہ کیا جائیگا اور یہ ورق آن مٹ ہوگا۔ آہ اگر آپ کو کسی بسمل کا تماشہ دیکھنا منظور ہے۔ کسی کو خاک وخون میں لوٹتے دیکھنے کی خواہش ہے یا آپ کا دل فوارہ خونیں کو ابلتے ہوئے دیکھنے کا متمنی ہے تو یہ غریب مجبور بہن سر خمیدہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے اس کے قتل سے اور صرف اس کے قتل سے یہ تمام حسرتیں۔ یہ سب تمنائیں۔ یہ کل کیفیتیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ لیکن یا امیرالمومنین میں سچ عرض کرتی ہوں کہ میں نہ تو خیانت عصمت اور نہ مخالفت حکم شہنشاہی کی مرتکب ہوں۔ اگر شریعت غرا اور ملت بیضاء میں نکاح وتزویج کی بھی قدر ومنزلت اور عقد جائز کا یہی انجام اور یہی سزا ہے اور نکاح کا مطلب صرف "بہ جلوت نشستن جزا و بخلوت سزا ہے" تو الحمد اللہ مجھے کوئی عذر نہیں

خدارا چشم انصاف کھولئے اور پہلو میں دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھئے کہ جو آپ فرما رہے ہیں وہ کہاں تک اور کس حد تک ٹھیک اور صداقت آفریں ہے۔

عباسہ کی اس پر درد اور فصیحانہ تقریر نے باوجود ہارون رشید کے دل پر اثر کرنے کے اس کے رخشِ غضب پر مہمیز کا کام کیا اور وفورِ غضب سے لرزنے لگا حلقہ چشم میں پتلیاں زور زور سے گردش کرنے لگیں۔ اور بے اختیار ہو کر اس زور سے زمین پر پاؤں مارا کہ ارکانِ قصر ہل گئے چیخ کر کہا۔ بس کر حدودِ ادب سے تجاوز نہ ہو میں ایسی واہیات اور بے معنی باتیں نہیں سننا چاہتا۔ تو گنہگار ہے تجھے مرجانا چاہئے۔" بیشک میں نے جعفر سے تیرا عقد کیا تھا لیکن ایک شرط کی وابستگی کے ساتھ جس سے تو اس وقت عمداً انجان ہو رہی ہے۔

نہیں حاشا وکلا میں اس شرط سے انجان نہیں ہوں۔ عباسہ نے ادب سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ لیکن کیا وہ شرط شرعی ہے؟ کیا آپ ایسی مہمل اور بے انجام شروط ملت بیضا اور دین حنیف میں جائز تصور فرماتے ہیں؟ میں ایسے کسی فعل کی مرتکب نہیں ہوں جو دین فطرت کے خلاف ہو لیکن آپ ہیں کہ وہ نعمت عظمیٰ جو بہترین تحفہ زندگی بشری ہے اور مقصد حیات انسانی ہے گناہ قرار دے رہے ہیں اور موجب خیانت عزت خیال کرتے ہیں۔

یہ کہتے کہتے عباسہ کچھ تیز ہوگئی۔ ہارون خدا سے ڈر تیرا ایمان کہاں ہے؟ تو کسے قتل کرنے آیا ہے ایک عورت کو وہ بھی تیری پیاری بہن العظمۃ للہ اگر تو مجھے قتل کریگا تو میں بلاشبہ تیرے آستانِ کبر و نخوت کی بھینٹ چڑھ جاؤں گی لیکن تو جعفر کے قتل سے بہت پچھتائیگا اور تا دمِ مرگ کفِ افسوس ملتا رہیگا۔

اور یہ فراموش نہ کر کہ ایسا درخشاں موتی تجھے کبھی پھر ملیگا کہ جس کو تو سلطنت عباسیہ کی بے بہا مالا میں منسلک کر سکے۔

اگر تجھے آج اس بات کی ضد ہے اور فطرت شاہی کے مطابق یہ ہٹ ہے کہ انقلاب آفریں اور ظلم وافتراق پسند آسمان کو کوئی خونی منظر دکھائے تو میں پھر عرض کرتی ہوں کہ اس قربانی کیلئے بدنصیب عباسہ تیار ہے۔ شوق سے اس کے رنگین خون کو بغداد کی مٹی میں جذب کرے اور اپنی آتش نخوت کو اس ذبیحہ سے فرو کرو۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ لاَ تلوث بدیک بحر میمین اپنے ہاتھوں کو دو بے گناہ گاروں کے خون سے ملوث و

اب خلیفہ کا دامن صبر و ضبط چاک چاک ہوگیا۔ شیرازہ تحمل بکھر گیا۔ اسے ایسے تیر و نشتر کے کام کرنیوالے الفاظ سننے کی مطلقاً تاب نہ رہی اس کے دماغ میں یہ آخری جملہ گھومنے لگا کہ:-

"بے گناہ گاروں کے خون سے ہاتھوں کو ملوث نہ کر۔" "میرے سامنے سے دفع ہو"

وہ اتنی زور سے چلایا کہ آواز پھٹ گئی اور منہ سے کف نکلنے لگا۔

جعفر۔ تو۔ اور حسن۔ تینوں قتل کئے جائیں گے۔ میں بادشاہ ہوں میرا فرمان اٹل ہے۔ لفظ "حسن" نے عواطف مادری کو تڑپا دیا خون نہایت سرعت سے رگوں میں دوڑنے لگا۔ سانس پھول گئی آنکھیں پرآپ ہوگئیں جسم میں کپکپی آنے لگی۔

وہ اپنے بھائی کے سامنے دامن پھیلا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور زر جم طلب انداز میں ٹوٹے الفاظ سے کہنے لگی۔ بھائی۔ . . . میرے اچھے بھائی۔ پیارے بادشاہ بھائی خدا کیلئے معاف کرو۔ ایک معصوم بے گنہ کا سرخ خون زمین پر نہ بہاؤ۔ امیر المومنین تو اس کے باپ کی جگہ ہے میں دامن پھیلا کر ہاتھ جوڑ کر تجھ سے اور کوئی چیز نہیں مانگتی صرف میرے بچے کی زندگی بھیک میں چاہتی ہوں۔ عباسہ تجھ سے اپنی زندگی کی خواہش نہیں کرتی وہ اپنی حیات کی طالب نہیں بلکہ ایک ایسے غنچہ ناشگفتہ کی زندگی کی خواہشمند ہے کہ جس نے ابھی باغ عالم کی ہوا تک نہیں دیکھی کہ صیاد موت کا دست ظلم اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ رحم رحم اے خلیفہ زماں رحم۔ میں رحم چاہتی ہوں کس سے؟ میرے بھائی سے!!

یہ کہکر عباسہ زار قطار ابر نوبہار کی طرح رونے لگی۔ اس کے موتی جیسے آبدار آنسو ٹپ ٹپ زریں قالین پر گر کر جذب ہونے لگے اب اس نے اپنے مخملی بالوں کو پریشان کر دیا۔ دنیا آنکھوں میں سیاہ ہوگئی۔ لخت جگر کے قتل کے ذکر نے جگر پر ایک ساتھ سینکڑوں چھریاں چلا دیں۔

ہارون نے ان آنسوؤں کی۔ اور اس التماس کی کوئی پروا نہ کرتے ہوئے اسے ٹھکرا دیا۔ اور منہ پھیر کر کہا "جو کچھ تو مانگ رہی ہے اس میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں" اس نے پھر مسرور کو آواز دی۔ عباسہ سمجھ گئی۔ چونکہ وہ مسرور جلاد کو پہچانتی تھی۔

وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور پھر سجدہ میں گر کر اپنے خالق و معبود سے استغفار طلب کرنے لگی۔

جلاد مسرور اندر داخل ہوا۔ عباسہ کعبہ کی طرف پھر کر کہنے لگی۔

اے مولیٰ (اس کے فرزند حسن کے محافظ کا نام ہے) میرے نور عین حسن میرے معصوم حسن۔ میرے لخت جگر حسن سے خبردار رہنا قسمت اسے بچپنے ہی میں آغوش مادری سے محروم کر رہی ہے۔ مولیٰ دیکھنا میرا بچہ رونے نہ پائے اگر مجھے یاد کرے یا دودھ کیلئے ضد کرے تو خانہ کعبہ میں لیجا کر بہلانا۔ دیکھ اگر میرے بچہ کو کوئی تکلیف یا گزند پہنچے گا تو میری روح تڑپ جائیگی۔ یہ کہتے ہوئے محبت مادری سیلاب کی طرح ابل پڑی اور عالم تصور میں ہاتھوں کو پھیلا کر گود میں لینے کو باب القصر کی طرف دوڑی اور ٹکرا کر گر پڑی۔

آہ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا سرمایہ زندگی ماں سے پہلے ہی ارض مکہ میں آغوش قبر میں ہمیشہ کی میٹھی نیند سو رہا ہے اور ہارون رشید کے یکایک سفر حجاز میں یہی راز پوشیدہ تھا تاکہ حسن کے خون سے جو عربی و عجمی اتحاد کا نتیجہ تھا زمین مکہ کو گلگوں بنا دے۔

عباسہ کو کچھ افاقہ ہوا تو وہ قصر جعفر کی طرف ملتفت ہوئی کہ آخری داد محبت دے۔ کہ خلیفہ کے اشارہ کے ساتھ ہی جلاد کی تلوار سن سے چلی اور شہزادی عباسہ کا سر ہارون رشید کے قدموں پر جا پڑا۔ نرگسی آنکھیں جو اشتیاق دیدار جعفر میں کھلی تھیں وہ کھلی ہی رہگئیں اور جسم بلوریں فرش قالین پر خون میں مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

ہارون رشید انسان تھا اپنی ماں جائی بہن کے حلق بریدہ سے ابلتا خون نہ دیکھ سکا اور فوراً ایوان سے باہر چلا گیا۔ مسرور نے آہستہ سے دس آدمیوں کو آواز دی کہ تمام کھڑکی سے کود کر داخل قصر ہوئے اور محل کے بیچ میں گڑھا کھود کر اس کشتہ محبت کو دفن کر دیا۔ اس کے بعد ہارون رشید نے ان دسوں کا سر اڑا دینے کا حکم دیا تاکہ یہ واقعہ محبت پردہ راز میں رہے اور جسموں کو نہر دجلہ میں پھنکوا دیا۔

علی الصبح عالم کو روشن کرنے والے دوست و دشمن کو برابر فائدہ پہنچانے والے آفتاب نے قصر بغداد کی کھڑکی سے مرقد شہزادی عباسہ پر کرنوں کا منور ہار چڑھایا۔ اور عشق نے سورۂ یٰسین کی ابتدا اس شعر سے کی ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

(ملا عباس اورنگ آبادی)

قوم اور زبان

ہر ملک و ہر قوم میں زبان ناموس حیات اور اساس جامعہ اور ملک وقوم کی پاسبان رہی ہے۔ آدم کی تخلیق کے ساتھ ہی زبان اور لغت بھی ظہور میں آچکی۔ انسان کو حیوان پر تفوق اور برتری اور بقاء اسی کی وجہ سے حاصل ہوئی

یہی سبب ہے کہ اس کے پیدائش کی ابتداء نہیں تبلائی جاسکتی اور جنھوں نے جو کچھ جدوجہد کی ہے وہ سوائے خلاف واقعہ نئی چیزوں کے اور کچھ نہیں ہے آپ جانتے ہیں کہ افراد زندگی و بقاء میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور تنہا زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہے۔ السنہ اور لغات بھی اسی طرح ایک دوسرے کی محتاج ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے قرض اور امداد لینا ضروری ہے۔ ہزاروں سال کے تغیر و تبدل اور آمیزش کے بعد ان میں سے بعض علم و ادب اور کمال کے درجے کو پہنچی ہیں۔

ہر وہ زبان جو آج معراج کمال پر پہنچی ہوئی ہے دوسرے زبانوں کے الفاظ اور لغت سے معمور نہ ہو۔ اور تمام دنیا میں کوئی زبان اور کوئی لغت ایسی نہیں کہ اس کے نصف کلمات دوست و دشمن اور بیگانوں کی زبان سے مستعار نہ لئے گئے ہوں۔

باوجود اس کے تعجب یہ کہ زبانوں اور لغتوں نے کبھی بھی آپس میں جنگ نہیں کی اور اقوام عالم درمیان جنگ و صلح کے چاہے کیسے ہی حالات و واقعات رونما ہوں لیکن زبانوں کے درمیان ہمیشہ صلح و امن ہی قایم رہا۔ اس وقت جبکہ دو قومیں اور دو ملک آپس میں جنگ و لوٹ گھسوٹ میں ہیں مگر ان کے لغات اور ان کی زبانیں میل ملاپ اور اتحاد کا کام سرگرمی سے انجام دیرہی ہوں گی بلکہ جنگ کے موقع پر تو ایک دوسرے کی دوستی کا تعلق گہرا ہو جائیگا اور ایک دوسرے میں تبادلہ ہوتا رہیگا۔

جرمن۔ روس۔ برطانیہ فرانس اور دوسری قوموں کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے لیکن ان کی لغت اور زبانوں کے درمیان صلح و لین دین برابر جاری رہا۔ جیسا کہ سعدی صاحب فرماتے ہیں۔ ؎

اگر عداوت و جنگ است درمیان عرب — میان لیلی و مجنوں محبت است و صفاست

عہد جدید کا یہ مُسلّمہ مسئلہ ہی کہ اقوام اور خاندان ایک دوسرے کے اختلاط اور امتزاج سے اپنی کمزوریوں کو دور کرتے ہیں اسی طرح دیکھئے کہ جب کوئی بے ثمر درخت دوسرے ثمردار درخت سے پیوند کھاتا ہے جنسیت اور تناسب کے اعتبار سے بے ثمر درخت پھل دار ہو جاتا ہے۔

زبانیں بھی ایک دوسرے کے میل ملاپ سے سلاست، نزاکت، صحت سے وسعت حاصل کرتی اور برے اور بھدے الفاظ کو نکال کر خوشنما الفاظ سے اپنے آپ کو آراستہ کرتی ہے تب کہیں علم و حکمت اور ادب کے شاہد بازار کی دلفریب صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ آج کل کی زندہ زبانوں مثلاً جرمنی، روسی، فرانسیسی اور انگریزی نے آپس میں نصف بلکہ اس سے زیادہ ایک دوسرے سے تبادلہ کر لیا ہے اسمیں دوستی اور دشمنی کی انہوں نے کوئی رعایت نہیں کی اور یہ مسئلہ دنیا کے مختلف السنہ کے ماہرین پر پوشیدہ نہیں ہے۔

اگر ہم ایک زبان کو لیں اور طائرانہ نگاہ اس پر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ دوسرے الفاظ اس زبان میں بہت کم لئے گئے ہیں مگر حقیقت میں اس کے اپنے الفاظ بہت کم ہونگے۔ مثلاً عربی زبان کو لیجئے اور غور سے مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے نصف کلمات اور لغات ہمسایہ قوموں اور دوسری زبانوں سے قرض لئے گئے ہیں ان کی صورتوں میں ایسا تغیر و تبدل ہو گیا اور اس سے صرف اشتقاق کے صیغے نکالے کہ کئی ہزار سال گذرنے کے بعد ان بیگانہ لفظوں پر آشنائی کا نقاب ڈال کر نظروں سے چھپا دیا ہے اہل ادب اور عربی لغات کے جمع کرنے والوں نے ایسے چند بیگانہ الفاظ کا "دخیل" نام رکھا اور وہ بھی ان چند الفاظ کے متعلق کہ جن کو قریب قریب قرنوں میں یعنی اسلام سے پانچ چھ قرن قبل اور پانچ چھ قرن بعد دوسروں سے قرض لئے گئے ہیں۔

بہرحال بر سبیل تذکرہ مجمل طور پر ہم ان کلمات کو کہ جو اساتذہ فن کے قول کے مطابق زبان عربی میں دخیل ہوئے ہیں ذکر کرتے ہیں تاکہ قارئین وارباب ذوق اس وسیع اور فصیح زبان کے متعلق معلومات حاصل کریں کہ وہ (عربی) دوسری زبانوں کے الفاظ قرض لیکر کتنے بلند ادبی مقام پر پہنچی ہوئی ہے۔

یہ کلیہ ہے ایک زبان کا دوسری زبانوں سے قرض لینے تعلقات پیدا کرنے اور ان کے ردّوبدل

کے اسباب۔ تاجروں اور سیاحوں کا سفر کرنا۔ لوگوں کا ہجرت کرنا۔ قوموں کا آپس میں میل ملاپ۔ ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلہ سے شادی بیاہ۔ مراسم و تعلقات۔ لڑائی جنگ۔ فاتح زبان اور مفتوح زبان کا میل جول۔ بڑی بڑی شخصیتوں۔ پیغمبروں اور حکیموں کا ظہور۔ بڑے بڑے سخن دانوں۔ سخن سنجوں اور عظیم الشان شاعروں کا وجود بھی اسی اتحاد باہمی کا نتیجہ ہے۔

قوم عرب بہت ہی پرانے زمانہ سے ہمیشہ ان حالات اور حادثات میں سے گذری ہے اور تمام زبانوں مثلاً فارسی۔ کلدانی۔ یونانی۔ مصری۔ عبرانی اور حبشی سے الفاظ قرض لئے ہیں اور ان الفاظ میں سے بعض اب بھی اپنی اصلی صورت رکھتے ہیں اور ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ان کی پہلی اصلی صورت پوری طرح مسخ ہوگئی ہے۔ اب صرف ان میں سے بعض کی اصلی حالت بہت ہی غور و خوض اور دقت نظر سے معلوم کرسکتے ہیں۔

اسلام سے پیشتر تقریباً ہمیشہ ایرانی۔ اہل عرب پر حکومت کرتے تھے۔ ایرانیوں نے صدیوں تک یمن پر بلکہ تمام حجاز پر حکمرانی کی اور کبھی محکوم بھی ہوئے دونوں حالتوں میں عربی زبان نے اسی زمانہ میں بہت سے الفاظ زبان فارسی سے قرض لئے۔

صاحب المزہر نے کلمات ذیل کو فارسی سے عربی میں دخیل کیا ہے۔

کوزہ۔ جرۃ۔ ابریق۔ طشت۔ خوان۔ طبق۔ قصعۃ۔ سکرجۃ۔ سمور۔ سنجاب۔ قاقم۔ فنک۔ دلق۔ خز۔ دیباج۔ تاختج۔ رانختج سندس۔ یاقوت۔ فیروزج۔ بلور۔ کعک۔ درمک۔ جرذق۔ سمید۔ سکباج۔ زیرباج۔ اسفیداج۔ طباہج۔ فالوذج۔ لوزینج۔ جوزینج۔ بغرینج۔ جلاب۔ شکنجبین۔ خلنجبین۔ دارصینی۔ فلفل۔ کرویا۔ زنجبیل۔ خولنجان۔ فرفۃ۔ نرجس۔ بنفسج۔ مانسرین۔ خیری۔ سوسن۔ مرزنجوش۔ یاسمین۔ جلنار۔ مسک۔ عنبر۔ کافور۔ صندل۔ قرنفل۔

فارسی کے علاوہ اس قسم کے اور کلمات ہندی وغیرہ سے لئے ہیں ان کے بیان کرنے کی ان صفحات میں گنجائش نہیں۔ مصر کے ایک متقدمین افاضل نے ذیل کے کلمات کو یونانی ولاتینی بتائے ہیں۔

"فردوس۔ قسطاس۔ بطاقہ۔ قرسطون۔ قبان۔ اصطرلاب۔ قنطار۔ بطریق۔ تریاق۔ قنطرہ۔"

اس قسم کی مثالیں اور بہت سی ہیں اور لکھتے ہیں کہ حبشی زبان کے بہت سے الفاظ عربی میں دخیل ہیں۔ مثلاً کفلین۔ مشکاۃ۔ ہرج۔

منبر بھی حبشی زبان سے لیا گیا ہے اصل میں یہ (ومبر) تھا جس کے معنی کرسی و تخت کے ہیں۔ صاحب قاموس نے اس کو (منبر) سے مشتق گردانا ہے جس کے معنی تکلف و اخترام سے اوپر چڑھنے کے ہیں۔

نفاق جس کے معنی کفر کو چھپانا اور ایمان کا اظہار کرنا ہیں یہ حبشی زبان سے ماخوذ ہے اور حبشی میں گمراہی اور بدعت کے معنی میں آتا ہے۔ بعض اہل لغات نے کہا ہے کہ "نفاق" "نفق" سے مشتق ہے جس کے معنی راج یا رعب کے ہیں ظاہر ہے کہ مصدر کے معنی اور مشتق کے معنی میں کوئی نسبت نہیں ہے۔

اور اس استعارہ (خروج الیربوع من نافقائہ) سے اس پر علت قایم کیجاتی ہے اور کہتے ہیں (ومنہ اشتقاق المنافق فی الدین)

لیکن اس قسم کے معنی کھینچ کھانچ کر پیدا کئے ہیں اور یہ مسلم ہے کہ یہ کلمہ زبان حبشی سے ماخوذ ہے۔

حواری۔ یہ بھی حبشی سے ماخوذ ہے۔ حبشی اور عربی دونوں میں بمعنی رسول مستعمل ہے۔ صاحب قاموس نے اس کو (حار) سے مشتق گردانا ہے جس کے معنی سفید کے نیلائے ہیں کہتے ہیں (انہ سمی بذالک لخلوص الحواریین ونقاد سریرتھم او لانھم یلبسون الثیاب الابیض) ظاہر ہے کہ یہ لفظ معرب ہے اور زبان حبشی سے ماخوذ ہے۔

برہان حبشی سے ماخوذ ہے اور زبان حبشی میں اس کے معنی نور اور روشنی کے ہیں۔ صاحب قاموس نے اس کو (برھن) سے مشتق بنایا ہے اور دوسروں نے اس کو (برہ) سے مشتق گردانا ہے۔ لہذا "نون" زائد کے ساتھ ٹکڑے کرنے کے معنی ہوئے اس میں سوائے کھینچ تان کے اور کچھ نہیں۔

علبسہ۔ بمعنی دودھ۔ یہ لفظاً اور معناً حبشی سے ماخوذ ہے۔

عرب کے اکثر لغات دینیہ عبرانی سے لئے گئے ہیں مثلاً حج، کاہن۔ عاشورہ۔ اور بہت سے الفاظ ہیں۔ چونکہ عربی و عبرانی دونوں نزدیک اور بمنزلہ دو بہنوں کے ہیں۔ اس لئے عبرانی الفاظ بہ نسبت

دوسری زبانوں کے زبان عربی میں بیشمار ملیں گے۔

(صبح) و (بہا) سنسکرت سے لئے گئے ہیں اس لئے کہ یہ طلوع ہونے۔ظاہر ہونے اور روشنی کے معنی میں مستعمل ہیں اور یہ خیال کہ سنسکرت نے عربی سے لیا غلط ہے۔اس لئے کہ سنسکرت لغت کی تدوین عربی زبان سے مدتوں پہلے ہوئی۔ ہے اگر اپنی زبان میں عربی الفاظ شامل کرتی بھی تو بہت سے الفاظ ہونے چاہیئے تھے۔

" نبی " مصری قدیم زبان (ہیرو گلیفی) سے لیا گیا ہے۔

وہاں اس کے معنی کسی خاندان کا بزرگ اور صاحب خانہ کے ہیں۔اس کے صرف واشتقاق کے صیغے بھی بنا لئے ہیں اور لفظ "نبی" سے "نباؤ" "تنبأ" بنے ہیں۔

لجام فارسی الاصل لفظ "لگام" تھا۔عربی میں آکر اس کے صیغے نکال لئے گئے مثلاً۔الجم۔والجم۔

دیوان۔ یہ بھی فارسی ہے۔عربی میں "دون" اس سے مشتق بنا ہے۔

سراب۔ جزاف۔زمہریر۔خنک۔ فارسی الفاظ ہیں جو اصل میں سیرآب۔گزاف۔تنک۔زم اریر۔تھے۔عربی زبان نے ان الفاظ کے صرف واشتقاق کے صیغے بنا لئے۔

شارع۔ بمعنی راستہ۔یہ فارسی الاصل ہے۔اصل فارسی لفظ "شاہراہ" تھا۔تعریب کرنے کے بعد شارع ہوگیا اور معنی اس کے وہی رہے اور چونکہ وہ لفظ "شارع" سے مشابہ ہے۔جو شرع سے مشتق بنا ہے۔ لہذا ارباب لغت شبہ میں پڑ گئے اور صاحب قاموس نے اس کو "شرع" کے مشتقات سے فرض کیا ہے اور اس کی دلیل اس طرح دیتے ہیں (وھو الطریق النافذ الذی یسلکہ جمیع الناس صیغۃ فاعل بہ معنی مفعول)

کھینچ تان کر یہ معنی پیدا کر لئے ہیں اور فاضل مصر کی تحقیقات میں اس لفظ کا فارسی الاصل ہونا ثابت ہے۔

بہت سے الفاظ جو دوسری زبانوں سے عربی میں لئے گئے ہیں وہ عربی الفاظ کے قائم مقام ہوگئے ہیں اور وہ ایسے جانشین ہوگئے ہیں کہ عربی الفاظ پوری طور پر متروک ہوگئے ہیں۔

منجملہ ان کے عربی میں "ابریق" کی بجائے (تاموره) طامن کی جگہ (مقلی) ہاون کی جگہ (منحاز) یا (مہراس) میزاب کی جگہ (مشعب) سکرجہ کی جگہ (ثقوه) مسک کی جگہ (مشموم) جاسوس کی جگہ (ناطس) توت کی جگہ (فرصاد) اترج کی جگہ (متک) کوسج کی جگہ (اثطہ) بادنجان کی جگہ (انب) رصاص کی جگہ (حرفان) خیار کی جگہ (قثد) الفاظ مستعمل تھے چونکہ جاہلیت کے زمانہ میں یہ الفاظ فارسی سے اخذ کئے گئے ہیں اور ان لفظوں نے عربی الفاظ کو نکال کر ایک قابو پا لیا اور عربی الفاظ کو اس طرح نکال باہر کیا کہ عرب بھی ان سے بے خبر ہیں کتب اور اشعار کے بغور مطالعہ سے اصلی عربی الفاظ کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں۔

بہت سے الفاظ کو اہل عرب نے ضرورت کے اعتبار سے لے لیا اور عربی زبان ننگی۔ چونکہ اس کام کو کسی ایک ذات یا کسی ایک شخص نے انجام نہیں دیا اس لئے کوئی شخص بھی ان الفاظ کو عربی لغت سے نکال باہر نہیں کر سکتا یہ صرف عربی لغت سے مخصوص نہیں بلکہ ہر زبان میں یہی اصول جاری و ساری ہے۔

جو کچھ لکھا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ عربی لغت میں کس قدر دخیل ہیں کہ جس کو ہم نے "مشتے نمونہ از خروارے" ظاہر کیا ہے۔

احمد محی الدین (ماخوذ)

غزل

کون کہتا ہے کہ اک عاشق نادار ہوں میں
نقد جان دیکے ترا دل سے خریدار ہوں میں

قیس بھی مان گیا ہے مری استادی کو
خود وہ دیوانے ہیں جو کہتے ہیں ہشیار ہوں میں

ایکدن وہ تھا کہ نظروں میں جگہ ملتی تھی!
ایکدن یہ ہے کہ رسوا سر بازار ہوں میں

طشت از بام ہوا چاہتا ہے راز دروں
دیکھ کو ٹھے سے ترے گرنے کو تیار ہوں میں

لن ترانی تری مجھ سے نہیں اچھی ہر دم
پور عمران میں نہیں طالب دیدار ہوں میں

درد بڑھ بڑھ کے ترے ہجر میں درماں ہوا
اے مسیحا مری مت کرش آزار ہوں میں

وقفہ عالم ہستی ہے تحیر کا مقام
حالت خواب میں ہوں اور نہ بیدار ہوں میں

مصحف رخ کا ہوں بندہ کبھی زلفوں کا غلام
کبھی کافر ہوں کبھی ماہر دیندار ہوں میں

(علی رضا ماہر شیرازی کالجر سٹی کالج)

"ناممکن"

فرانسیسی لغت کا لفظ نہیں ہے۔

۱۰ مئی ۱۷۹۶ء کو آفتاب نہایت آب وتاب سے میدان لمبارڈی پر چمک رہا تھا۔ ندی اڈا خاموشی سے بہہ رہی تھی جس کے کنارے شہر لودی آباد تھا۔ ندی تقریباً دوگز چوڑی تھی اور صرف ایک تیس فٹ چوڑا پل تھا جس کو عبور کرکے شہر میں داخل ہوسکتے تھے۔ کائنات کی ہر شئے پر خاموشی اپنا سکہ جما رہی تھی مگر انسان ——————

بولیو (BEAULIEU) آسٹرین کمانڈر اپنی فوج کے ساتھ دوسرے کنارے پر تھا اس کی فوج کو شکست ہوگئی تھی اور وہ پل عبور کرکے اپنی باقی فوج میں مل چکے تھے۔ فرانسیسی ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ مگر آسٹرین سپاہیوں کی متواتر گولیوں نے اونہیں روک دیا اور وہ اپنے جنرل کے حکم کے منتظر تھے مگر جنرل بغیر حالات کا معائنہ کئے حکم دینے والا نہ تھا۔ وہ کمپ سے نکلا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک ڈراؤنہ منظر میں پایا۔ آسٹرین فوج کے بارہ ہزار پیادہ اور چار ہزار سوار صف باندھے اس کے سامنے تھے ان کے توپ خانے اپنے موقع پر تھے کہ اگر دشمن ان کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرے تو وہ آسانی سے اس کو گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے۔

فرانسیسی جنرل کون تھا؟

وہ ایک نوجوان کمانڈر تھا چھبیس ستائیس کے لگ بھگ ہوگا۔ دبلا اور پست قد تھا۔ چہرہ سے دور اندیشی اور متانت ٹپکتی تھی۔ آنکھیں چمکدار اور تیز تھیں وہ اس وقت آسٹرین کے ناقابل تسخیر مورچہ بندی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے آگے قدم بڑھائے "یہ تو بہت ہی معمولی مورچہ بندی ہے۔ مجھے آگے چل کر اس کو دیکھنا چاہئیے" وہ تین چار میل تک ندی کے کنارے چلتا رہا۔ اس کو ایک قلعہ نظر آیا جس کو دشمن نے بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جو

بعید الفہم تھی۔ پھر وہ اپنے کیمپ کو لوٹا۔ یو لیو آسٹرین کمانڈر سر جھکائے کنارے سے تھوڑی دور پر کھڑا پل کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اور یہ الفاظ اس کی زبان پر تھے "کیا میں پل کو توڑ دوں" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا "نہیں مجھے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ فرانسیسی بغیر پل کو عبور کئے ہم پر حملہ نہیں کر سکتے جب وہ اس طرف بڑھینگے تو ہم آسانی سے ان کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

کیمپ پہنچکر فرانسیسی جرنل نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ اپنی توپوں کا رخ دشمن کے توپوں کی طرف کر دیں۔ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو اس نے اپنے افسران فوج کو جمع کیا اور کہا "ہمیں پل عبور کر کے دشمن پر حملہ کرنا چاہیئے" اونچے اور سن رسیدہ افسروں نے مسکراتے ہوئے نوجوان کمانڈر کو دیکھا۔ ایک نے اٹھ کر کہا "یہ محض خیال ہی خیال ہے" وہ کچھ اس قدر پریشان تھا کہ گویا اس کو ہی سب سے پہلے عبور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسرے نے کہا "یہ ناممکن ہے کوئی انسان ان گولیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا" نوجوان جرنل کے ابرو پر بل پڑ گئے اور کڑک کر کہا "ناممکن" فرانسیسی لغت کا لفظ نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے میں اور میرے بہادر سپاہی اس کو کر دکھائینگے"

بہادر جرنل نے چھ ہزار سپاہیوں کو جمع کیا اور انہیں یوں مخاطب کیا۔

"بہادرو ہمیں دلیروں کی طرح جان دینا چاہیئے۔ پل عبور کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ مگر ایک مشکل کام میں مرجانا بہتر ہے آسان اور معمولی کاموں کیلئے جینے سے۔ جتنا مشکل کام انجام ہوگا اتنی ہی عزت و توقیر ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک خوفناک کھیل ہے اور تمہارے بوڑھے افسروں کے نزدیک تو بالکل ناممکن اور محض خیال ہی خیال ہے۔ مگر ہمیں کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم اس وقت ہمت سے آسٹرین سپاہیوں کو شکست نہ دے سکے جو تھوڑی دیر قبل ان کے سامنے میدان جنگ سے بھاگے تھے۔ اُف بہادرو۔ فرانسیسیوں کیلئے اس سے زیادہ کوئی ذلت نہیں ہو سکتی۔ آؤ میرا ساتھ دو"

اس موثر تقریر نے سپاہیوں کے دل میں ایک جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ سب اپنے نوجوان جرنل کا ساتھ دینے آمادہ ہو گئے۔ جرنل نے سوار فوج کو جمع کیا اور قلعہ کے عقب سے دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ انہیں اس طرف روانہ کر کے وہ اپنے چھ ہزار سپاہیوں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ سر جھکا ہوا تھا

آنکھیں آسٹرین کی طرف لگی تھیں۔ کیا وہ غور کر رہا تھا اور حملہ کرنے سے ڈر رہا تھا۔ کیا وہ واپس ہونا چاہتا تھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ جنگ کی چالوں سے اچھی طرح واقف تھا اور کوئی اناڑی سپاہی نہ تھا۔ وہ منتظر تھا اس بے چینی اور اضطراب کو دیکھنے کیلئے جو آسٹرین میں فرانسیسی سواروں کو دیکھ کر پیدا ہونیوالی تھی۔

شام ہو رہی تھی۔ ندی بالکل خاموش تھی۔ فطرت بھی حیرت سے اس منظر کا مشاہدہ کر رہی تھی کہ آج آہستہ آہستہ ٹائی اولین TYROLEAN کی چوٹیوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا۔ شام کی تاریکی فطرت کی دلفریبیوں اور خوبصورتیوں کو اپنی آغوش میں لے رہی تھی جو انسان کے ہاتھ سے پامال ہو رہی تھی۔

آخرکار آسٹرین فوج میں اضطراب پیدا ہو گیا وہ حیران تھے کہ کس طرح فرانسیسی سوار ان پر نازل ہو گئے نوجوان فرانسیسی جرنل نے سر اٹھایا اور اپنے بگل والوں کو حکم دیا کہ بگل بجائیں۔ سپاہی پل کی طرف بڑھنے لگے مگر آسٹرین فوج نے پہلی چند صفوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ مگر بہادر سپاہی بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ آخرکار وہ نصف پل پر پہنچ گئے یہاں ان کی ہمتیں پست ہو گئیں اور اندیشہ تھا کہ وہ واپس ہو جائیں۔

جب نوجوان جرنل نے یہ حالت دیکھی تو گھوڑے کو ایڑ لگائی ایک جھنڈی اٹھالی۔ لینیس LANNES میسینا MASSENA اور برتھوما BERTHIA اس کے ساتھ تھے۔ یہ سب آتش کے طوفان میں گھس گئے۔ جب جرنل نصف پل پر پہنچا اور آواز دی "بہادرو اپنے جرنل کا ساتھ دو" سپاہیوں میں ولولہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہوں نے پل کو عبور کر لیا۔ لینیس سب سے پہلے تھا اس کے بعد نوجوان جرنل اس کے پیچھے تمام فوج تھی۔ اس وقت نہ جانے بوڑھے افسر کہاں تھے

سپاہیوں نے آسٹرین پر حملہ کر دیا۔ اس وقت فرانسیسی سوار فوج بھی حملہ آور ہوئی۔ میدان جنگ گرم ہو گیا۔ لینیس جوش و خروش کے عالم میں آسٹرین فوج میں گھس گیا ایک اور

ڈنا چھین کرلے آیا ۔ اس کا گھوڑا مر گیا۔ مگر اس نے پھرتی سے ایک آسٹرین افسر کے پیچھے سوار ہوگیا۔ اس کو خنجر سے مار کر گھوڑا اپنے قبضہ میں کرلیا۔ چھ سات کو مارنے کے بعد اپنی فوج میں واپس ہوا۔ نوجوان جرنل نے اس بہادری کے صلہ میں فوراً اس کے اعزاز اور مدارج میں اضافہ کیا۔

جنگ زوروں پر تھی۔ آسٹرین کے ایک توپ خانے فرانسیسیوں کو بہت پریشان کردیا تھا۔ ایک افسر نے جرنل سے کہا۔ "توپ خانہ کو کس طرح خاموش کرنا چاہیئے"۔

"بہت اچھا" کہکر جرنل نے گھوڑے کی باگ اس طرف موڑی اور سپاہی اس کے پیچھے پیچھے جانے لگے وہ اس اطمینان اور خوشی سے اس کے ساتھ جا رہے تھے گویا وہ شادی کی دعوت میں جا رہے ہیں۔ آخرکار توپ خانہ بھی مغلوب ہوگیا نہ جانے اس وقت بولیو کہاں تھا؟

آسٹرین کے قدم میدان سے اکھڑنے لگے۔ وہ بھاگ رہا تھے۔ بولیو دور کھڑا تھا سر جھکا تھا ۔ ایک افسر نے کہا۔ "جرنل کیا آپ اپنی حفاظت نہ کرینگے؟" اس نے سر اٹھایا ناقابل التسخیر مورچہ کو دیکھا پل کی طرف نگاہ کی اور کہا "یہ نوجوان جرنل عجب قسم کا ہے۔ اس نے آج ایسے کام کئے ہیں جو ناممکن تھے۔ یہی پل جس کو میں اپنے بچاؤ کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا وہی میری تباہی کا باعث ہوا۔ میرے امکان میں جو کچھ تھا میں نے پورا کیا۔ مگر مرے مخالف کی ہستی ایسی ہے جس کو کوئی مغلوب نہیں کرسکتا"۔ اس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور میدان چھوڑا۔ آسٹرین کو کامل شکست ہوگئی۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد تمام فرانسیسی افسر اپنے جرنل کے پاس جمع ہوئے اس کو فتح کی مبارک باد دی اور سب نے مل کر کہا۔ "خدا نپولین بوناپارٹ کو زندہ رکھے"۔

دراصل وہ نوجوان جرنل نپولین بوناپارٹ تھا۔

دوسرے دن صبح کو سورج حسب معمول میدان لمباڑی میں چمک رہا تھا۔ ندی سرعت کیساتھ بہہ رہی تھی اور خاص آواز پیدا ہورہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آسٹرینا پر نوحہ خوانی کر رہی ہے۔

ہوا زوروں پر چل رہی تھی پتوں اور درختوں سے گذرتے وقت ایک سریلی صدا پیدا ہو رہی تھی گویا وہ نپولین اور اس کے شاندار کارناموں کا قصیدہ گا رہی تھی۔

([illegible])

”افلاطون“

یونان کا مصلح اعظم

یونان کے سب سے زبردست فلسفی سقراط کا نام آج صرف دو وجوہ سے زندہ ہے ایک اس کے محاسن اخلاق کی وجہ سے اور دوسرے اس کی سحر بیانی سے جس کی بدولت اس نے اپنے زمانہ کے مدبرین و مفکرین کو موہ لیا تھا۔ برخلاف اس کے مصلح اعظم افلاطون کا نام صرف اس کی تصانیف کی وجہ سے باقی ہے اور انہیں تصانیف کی وجہ سے اس کے استاد سقراط کو حیات جاوید نصیب ہوئی لیکن جہاں افلاطون نے اپنی تحریرات میں سقراط کی جلیل القدر شخصیت کے بے نقاب کرنے میں زور قلم کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا وہیں اس نے خود اپنی ہستی کو بہت پس پشت ڈال دیا ہے۔

افلاطون ایک نہایت امیر گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کا تعلق ماں اور باپ دونوں کی جانب سے ”قودروس“ سے جا ملتا تھا یہی وجہ تھی کہ جہاں اور امیروں اور اعلیٰ خاندانوں کے لڑکے سقراط کے اس فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے اور اپنی علمی استعداد کو بڑھانے آتے تھے وہیں افلاطون بھی جا پہنچتا لیکن اس کا مقصد اوروں سے بالکل ہی جداگانہ تھا۔ وہ سقراط کے علمی مباحث کو نہایت غور سے سنا کرتا تھا اس کو سقراط سے ایک روحانی لگاؤ تھا اور وہ اپنے استاد کا بیحد شیدا تھا۔

سقراط کی موت نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس وقت اس کی عمر پچیس ۲۵ اور تیس ۳۰ سال کے درمیان تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ سقراط کی موت کے المناک سانحہ کے بعد ہی افلاطون نے ایتھنز کو خیرباد کہا۔ اپنی زندگی کے جو اصول اس نے اب تک متشکل کئے تھے ان میں یک لخت تبدیلی ہو گئی حتیٰ کہ اس نے اپنے نام و نمود کو بھی خیرباد کہا۔ ابتداً اسے اپنی امارت اور جاہ و ثروت کا احساس تھا لیکن اپنے عزیز استاد کی موت نے اس کے دل میں ایک نئی خلش کو ابھارا۔ اب اسے یہ دھن لگ گئی کہ کسی نہ کسی طرح ان مختلف النوع علمی مباحث کو ضبط تحریر میں لائے جن کو سقراط نے دنیا کے آگے تخیلی صورت میں پیش

کیا تھا۔

اپنے ان ارادوں کو اس نے باقاعدہ رسائل کی صورت میں تصنیف نہیں کیا بلکہ علماء کے مکالموں کی شکل میں پیش کیا ہے جس کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ مکالمے سقراط اور اس زمانہ کی مشہور شخصیتوں کے درمیان ہوتے ہیں یا ان مباحث میں متعدد مشاہیر شریک ہوتے ہیں جو افلاطون کے زمانہ میں ایتھنز میں موجود تھے۔ ان میں اس نے خود اپنے نام کو صرف تین مرتبہ ظاہر کیا ہے اور وہ بھی اشارۃً وکنایتہً۔ ان مباحث میں سب سے مشہور بحث "جمہوریت" کے متعلق ہے جس میں افلاطون کے دو بھائی "گلاکن اور اڈیمانٹس" بہت زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ اس کے کل مکتوبات میں غالباً سب سے زیادہ اہمیت اسی مکالمہ کو حاصل ہے۔

افلاطون کے مکالموں کا مطالعہ کرنا گویا فلسفہ اور ادب کا درس حاصل کرنا ہے کیونکہ یہ مکالمے مدبرانہ ومفکرانہ دلائل سے بھرے پڑے ہیں اور بلحاظ زبان یونانی ادب میں یہ چوٹی کے مخطوطات میں شمار ہوتے ہیں

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ترجمہ کرنے میں اصل زبان کی بہت ساری خوبیاں زائل ہوجاتی ہیں تاہم افلاطون کی تحریرات کے بعض ترجمے اصل کے قریب قریب جا پہنچتے ہیں مثلاً Shelley شیلی کے ترجمے "جشن" اور جوویٹ کے ترجمے "جمہوریت" میں بہت ساری ادبی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ غائر مطالعہ کرنیوالوں کیلئے افلاطون کے ان مکالموں سے ایک منتخب مکالمے کا پڑھ لینا بھی اس کی دماغی قابلیت اور ادبی مہارت کے ظاہر کرنے کو بہت کافی ہے اس کے علاوہ اس سے افلاطون کے نقطۂ نگاہ سے سقراط کی عظیم ترین شخصیت کا انکشاف ہوتا ہے

مکالمے۔ ان مکالموں کی کل تعداد پینتیس ۳۵ ہے جن میں چوبیس ۲۴ کے متعلق علماء کی متفقہ رائے ہے کہ انہیں افلاطون ہی نے تصنیف کئے ہیں۔ باقی کے متعلق بھی بعض کا یہی خیال ہے کہ وہی ان سب کا مصنف ہے لیکن بعض اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

ان کے موضوعات مختلف النوع ہیں۔ سب سے آسان مکالمہ "معذرت" ہے۔ موجودہ حالت میں یہ مشکل مکالمہ کہلایا جاسکیگا البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ سقراط کی ان دلچسپ تقاریر کا مجموعہ ہے جو اس نے ایتھنز کے ججوں کے سامنے کیں تھیں۔ "کریٹو" "گارجیاس" اور "جمہوریت" کی ابتدائی چار جلدوں کا شمار اس کی

آسان تحریرات میں ہو سکتا ہے۔

افلاطون کا مطالعہ کرنا آسان کام نہیں۔ اس کے بعض مخطوطات مثلاً "پرینا ئیڈس" "صوفی" "تیاں" "فائیبس" اور "جمہوریت" کے بعض حصص کے مطالعہ کیلئے خاص مذاق اور اہم توجہ کی ضرورت ہے اس میں شک نہیں کہ اس کے وہ مکالمے جن میں ادبیت اور ٹھوس علمیت کی طرف کم توجہ کی گئی ہے اس کے ابتدائی مطالعہ کرنیوالوں کیلئے مفید اور دلچسپ ہیں لیکن بعض مواقع پر افلاطون جیسا عظیم شخص بھی اپنے عزیز جزیرے اٹلانٹس کی محبت کے اظہار میں ان قدیم اور ناقابل یقین عقاید کے اظہار سے باز نہیں رہتا جن سے یونان کا سارا مایہ ناز ادب بھرا پڑا ہے۔

ان کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے اس نے بعض مقامات پر ایتھنز کے مختلف مناظر کی تصاویر کھینچی ہیں کسی جگہ یونان کے ایک جلیل القدر اور رفیع المنزلت ہستی کے مکان کی حالت اور اس کے گھر پر شائقین علم و ادب کی کثرت کا حال دکھلایا ہے تو کہیں بالکل کسی دلچسپ ڈرامے کی ابتداء کا سا سماں کھینچا ہے کہیں نوجوانوں کی پرجوش گفتگو اور دلکش قہقہے ہیں تو کسی مقام پر بوڑھوں کا فلسفیانہ اور خشک انداز بیان ہے لیکن ان .... مکالموں میں سقراط کی عظمت کو کسی مقام پر بھی نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ اس کی حیثیت ہر جگہ ایک عالمگیر شہنشاہ ایک خدارسیدہ صوفی یا ایک عظیم المرتبت پیغمبر کی طرح نمایاں کیگئی ہے۔

افلاطون ایک شاعر بھی ہے اور ایک پیغمبر بھی ساتھ ہی فلسفہ اس کا اوڑھنا بچھونا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ مکالموں میں متکلم کی قوت تقریر یا مبحث کے الفاظ اس قابل نہیں کہ اس کے پیش نظر مسائل کو بخوبی حل کر سکیں تو ان کی تفہیم کے لئے وہ دلچسپ قصص اور افسانوں کو پیش کرتا ہے چونکہ ان قصص کی شکل یونان کے ان مافوق الفطرت افسانوں کی سی ہے اسی لئے ان کا شمار افلاطون کے "خرافات" ہی میں ہوتا ہے۔ ان کا شمار عمدہ تمثیلات میں بھی نہیں ہو سکتا گو بعض قصے صرف اسی مقصد کے لئے پیش کئے گئے ہیں ان تمثیلات میں اس نے ایک مقام پر ماوراء العالم کی تصویر کھینچی ہے اس میں یوم محشر کی کیفیت خدائی انصاف اور خوش نصیب ارواح کی مسرت کو واضح طور پر دکھلانیکی کامیاب کوشش کی ہے ایک اور تمثیل میں دکھلایا ہے کہ باوجود فلسفی اور مفکر ہونے کے وہ کس طرح بعض اوقات زندگی کی معمولی

گتھیوں کے سلجھانے میں عاجز آجاتا تھا ـــــــــ بیشک کامیاب زندگی گزارنے کے لئے عقل سلیم کی ضرورت ہے . . . . فلسفہ، سیاست اور منطق کی نہیں!!!

جب ان تمثیلات کو وہ لوگ پڑھتے ہیں جو دنیا کے اسرار سے واقف ہیں تو انہیں یہ معلوم کرکے سخت حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کی آبادی کے بیشتر لوگ ان حقائق کو معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے اور یوں ہی اپنی عمریں گزار دیتے ہیں ایک تمثیل میں اس نے روح کی تاریخ اس کے ارتقائی منازل اور اس کے انجام کی تصویر کھینچی ہے نیکی اور بدی خمیر اور نفس۔ محاسن اور معایب کی کشمکش اس سے زیادہ واضح طور پر کہیں نہیں دکھلائی گئی۔ ایک اور مثال میں اس نے تہذیب و تمدن اور علم و فن کی خوبیوں کو بیان کیا ہے کہ جس کی بدولت انسان اس گمراہ کن عالم میں کامیابی کی زندگی گزار سکتا ہے۔

ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے میں یہاں ایک غیر معروف لیکن دلچسپ قصہ پیش کرتا ہوں جس کو افلاطون نے فن تحریر کے نقصانات دکھلانے کے لئے لکھا تھا۔

قصہ یوں ہے کہ "ناکریٹس کے مقام پر جو مصر میں واقع ہے اہل مصر کا ایک قدیم دیوتا رہا کرتا تھا اس کے قبضہ میں وہ مقدس پرندہ بھی تھا جو "ابنیس" کہلاتا ہے۔ اس دیوتا کا نام "تھیوتھ" تھا۔ یہ وہی دیوتا تھا جس نے سب سے پہلے ریاضی اور علم ہندسہ کو دنیا کے آگے پیش کیا۔ نقشہ نویسی اور پانسے کے کھیل کا بھی یہی موجد تھا۔ اور سب سے زیادہ اہم بات جو میرے قصہ سے متعلق ہے یہ ہے کہ اس نے "فن تحریر" سے بھی دنیا کو روشناس کرنا چاہا۔

اس زمانہ میں سارے مصر کا حکمران "تہموز" تھا جس کا پایہ تخت مصر کے شمال میں تھا۔ اس عظیم الشان اور پر رونق شہر کو اہل یونان "مصر کا تھبیس" کہتے تھے بہر حال تھیوتھ اپنی ان اختراعات کو لئے ہوئے تہموز کے دربار میں پہنچا کہ اہل مصر کو ان سودمند ایجادات سے واقف کرادے۔ تہموز اس کی ہر ایک ایجاد اور اس کے طریقہ استعمال کے متعلق سوالات کرتا رہا اور موجد کے جوابات پر وقتاً فوقتاً اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا جاتا تھا کہا جاتا ہے کہ تہموز نے تھیوتھ سے اتنی باتیں کہیں کہ ان کی ایک علیحدہ کتاب تیار کی جا سکتی ہے۔

اس نے تھیوتھ کی بعض اختراعات کی تعریف کی تو بعض کو نقصان دہ ثابت کیا لیکن جب تھیوتھ نے اس کے سامنے فن تحریر کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ

"اے شہنشاہ! میری یہ ایجاد اہل مصر کے لئے نہایت مفید ثابت ہو گی اس سے ان کی سمجھ میں اضافہ اور ان کے حافظہ میں ترقی ہو گی ——— میری ایجاد ذہنی ترقی اور ارتفاع عقل کیلئے آبحیات کا کام دیگی" تو تھموز نے جواب میں کہا کہ :-

اے موجد اعظم! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ خدا نے اگر کسی میں مختلف چیزوں کے ایجاد کرنیکی قوت عطا کی ہے تو کسی کو ان ایجادوں کی بھلائی برائی جانچنے کی قابلیت اور ان پر تنقید کرنیکی صلاحیت بخشی ہے چونکہ اس اختراع کو تم دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہو اسی لئے اس کے ساتھ تم نے ایسی تعریف و توصیف وابستہ کر دی ہے جو سراسر اس کے برخلاف ہے۔

"اختراع تحریر کے غلط طریق استعمال سے لوگوں میں بھول چوک کا مرض بحد عام ہو جائیگا یہ سمجھ کر کہ علوم و فنون کی حفاظت خیالات کو ضبط تحریر میں لانے سے بوجوہ احسن ممکن ہو گی وہ اپنے دماغوں کے صحیح استعمال سے بے خبر ہو جائیں گے - اور اس طرح ایک ایسی چیز پر ان کا اعتماد اور اعتبار مستحکم ہوتا چلا جائیگا جو فی الحقیقت ان کے اجسام کا جزو نہیں ہو سکتی ——— اور نہ اس کا تعلق ان کے قلوب ہی سے ہے کیونکہ ہر حالت میں وہ ایک بیرونی چیز ٹھیرتی (فن تحریر) لہٰذا تمہاری ایجاد قوائی دماغی کی ترقی کی ممد و معاون ہونیکی بجائے وہ انہیں ایک بے فائدہ شیشے پر اعتبار کرنا سکھلائیگی اس طرح تم اپنے شاگردوں کو قابل اور حقیقی عقلمند بنانے کی بجائے "عقلمند نما" بنا رہے ہو جو در اصل ایک سعی لاحاصل ہے۔

انہیں اسباب کی بنا پر وہ لوگ (جو اسے استعمال کریں گے) ہر قسم کی معلومات سے یقیناً باخبر ہو جائینگے۔ لیکن درس و تدریس کے فائدوں سے قطعاً بے بہرہ رہیں گے۔ باوجود حقیقی علمیت سے ناواقف اور اس کی تفہیم سے ناآشنا ہونے کے وہ اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھنے لگیں گے گویا وہ "عقلمند نما" عقلمند رہیں گے ——— فی الحقیقت کچھ نہیں"

افلاطون کا مذاق | ہر مکالمہ کسی خاص مطلب یا خاص جذبے کے تحت لکھا گیا ہے۔ جہاں اس نے

ط کی آزمائش اور قتل کے مناظر پیش کئے ہیں وہاں انتہائی حزنیہ جذبات اور الم آگیں تاثرات کا اظہار
، ان کے قوی اثرات کو کم کرنے کیلئے اس نے جا بجا مزاحیہ جذبات بھی شامل کر دیے ہیں جن کی دلچسپی کے
ل کو قایم رکھنا افلاطون ہی کا حصہ ہے بعض اوقات ظرافت نگاری کی اعلیٰ مثالیں بھی آپ کو اس
ریرات میں نظر آئینگی۔ طوالت کے خیال سے ہم یہاں اس کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

ں کے ذاتی خیالات انسان میں سب سے اہم اور دلچسپ چیز کسی شیئے کے متعلق اس کی ذاتی
ے ہے۔ کسی امر میں آپ مختلف لوگوں سے آراء حاصل کیجئے وہ نہ صرف مختلف ہی ہونگی بلکہ بعض تو
ں دلچسپ بھی ہونگی اسی غرض سے اب تک صدہا عالموں نے اس بات کے معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ

افلاطون کی رائے کسی معاملہ میں کیونکر پیدا ہوتی تھی؟
اس کی نوعیت کیسی ہوتی تھی؟
اور وہ موجودہ زمانے کے خیالات کی کس قدر موافق یا مخالف ہے؟

لیکن جہاں اس کا معلوم کرنا بیحد دشوار ہے وہیں اتنی جد وجہد کرنے کے بعد کسی حقیر انجام کو پانا
مد درجہ باعث پشیمانی ہوگا!

اس امر کی جستجو تو سراسر فضول ہے کہ ہر چیز کے متعلق افلاطون کی رائے معلوم کرنیکی کوشش
ئے البتہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا تعلق انسان اور اس کی زندگی کے ساتھ بہت گہرا ہوتا
اور جن کا رشتہ انسانی زندگی کے ساتھ اب بھی وہی ہے جو افلاطون کے زمانہ میں تھا ان کے متعلق
فلاطون کی رائے معلوم کی جائے تو وہ یقیناً کار آمد اور مفید ہوگی لیکن جہاں تک اس امر کیلئے
شیں کی گئی ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ "افلاطون کو آسانی سے سمجھنا بیحد مشکل ہے"

کائنات، موجودات عالم اور تمام اشیاء کے پیدا کرنیوالے کے متعلق اس کے خیالات تقریباً صوفیوں
ہمہ اوست" سے ملتے جلتے تھے۔ عالم کی نیرنگیوں میں شامل ہونیوالی ہر چیز کو وہ اس اصل کی ناتمام
" قرار دیتا تھا جو پیدا کرنیوالے کے پاس موجود ہے اور جس کو اہل دنیا اپنی جد وجہد سے اس اصل
مد د لینے کی فکر میں مصروف ہیں اور یہی ناتمام اشکال یا تشبیہیں بلحاظ اصل ایک ایسے اجزاء کے لاینفک ہیں۔

صفات انسانی کی تکمیل اور خوبی میں وہ حسن، عدل، صحت، دلیری اور علم " کو کارفرما دیکھنا چاہتا تھا۔ عدل، حسن اور علم کی حقیقت اس کے خیال میں ان چیزوں سے بلند و برتر تھی جو بظاہر راست، حسین اور معروف ہوں۔ یہی خیالات تھے جو اسے ہر چیز میں کمال، خوبی اور " ہم رنگی فطرت " کے دیکھنے اور اس کی تلاش کرنے میں سرگرداں رکھتے اور انہیں سے وہ حقیقت کی تہ کو پانا چاہتا تھا۔

" تلاش حقیقت کی امنگ چنگاری کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں ہمیشہ سلگی ہوئی رکھنے والا یہ مصلح اعظم اہل عالم کو ایک دلچسپ پیغام بھی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے سارے آدمی نیکی کے پتلے اور اخلاق کے نمونے بننے کی انتہائی جد و جہد میں بھی اس بات کو ہرگز فراموش نہ کریں کہ ان کی زندگی کا راز علم حقیقت کا پہلا زینہ ہے اور طلسم زندگی کا اصل طمانیت نفس، صفائی ضمیر اور قلب و روح کی رفعت میں مضمر ہے۔

افلاطون کے زمانہ تک عدل کا مفہوم صرف یہی تھا کہ عدل صرف قوی اور دولتمند لوگوں کیلئے ہے۔ سقراط کی زندگی میں ایک مرتبہ افلاطون کے دونوں بھائی گلاکن اور اڈیمانٹس کسی مباحث کے دوران میں اس سے منصف، فراخ اور ظالم کے افتراق کی تشریح چاہتے ہیں اور اسی تشریح کی پیروی میں ہمیں عدل کے متعلق افلاطون کے دلچسپ خیالات کا پورا پتہ چل جاتا ہے اس کے " انصاف " کا مفہوم اسلامی " نظریہ معدلت " کے قریب قریب جا پہنچتا ہے جہاں کہا گیا ہے ۔ " کہ بالاتر از معدلت کار نیست " جس کو آج کل کی عدل گستری سے کوئی تعلق نہیں جہاں قوانین کی انصاف نما سحر گری آناً فاناً ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم سے بدل سکتی ہیں اس کے نزدیک انصاف کا سب سے بڑھکر خون کرنیوالا وہی شخص ہے جو باوجود ناحق شناس ہونے کے لوگوں کی نظروں میں عادل دکھائی دینے کی کوشش میں مصروف ہو۔

ایماندار بننا اس کے نزدیک عادل بننے کی پہلی سیڑھی ہے۔ اگر کوئی یوں ہی مشہور ہو جائے تو اس کے پاس ایسے شخص کی کوئی وقعت نہیں عادل کو شہرت کی ضرورت نہیں بلکہ شہرت کیلئے حقیقی عادل ہونے کی سخت ضرورت ہے نیکی کی تلاش نام و نمود کیلئے نہیں کیجاتی بلکہ نیکی میں جو حقائق اور خوبیاں پنہاں ہیں انہیں حاصل کرنے کے لئے اس کی جستجو کیجاتی ہے۔

بہر حال افلاطون کا مطالعہ ہمیں دماغ اور عقل سلیم سے کام لینا سکھلاتا ہے کہ اسی کے ذریعہ ہم کائنات کی حقیقت اور ہر شئے کی صحیح قدر و قیمت کو جانیں اور اس سے حتی المقدور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور ہمیشہ حقیقت کی تلاش میں رہیں !!

(سید ابو الفضل بی اے عثمانیہ)

خفیہ قتل

(۲)

اگر آج خلاف معمول گیتی تھیٹر میں دریا کی موجوں کی طرح جوق جوق حضرات چلے آ رہے ہیں تو تعجب ہی کونسا ہے کیونکہ مسٹر فضل الرحمن بی۔ اے آنرز کا نیا ڈراما "نئی روشنی" اسٹیج ہونیوالا ہے جس کا مدتوں سے پبلک کو انتظار تھا۔ ہادی حسن نے اپنی دوست زرینہ کو اس سے پہلے ڈراما دیکھنے کی دعوت دیچکا ہے کسی قدر رنجیدہ تھا کہ اوسے درجہ خاص کی عقبی نشست نہ ملسکی۔ ڈراما کا آغاز نہایت دلچسپ انداز سے ہوا دوسرا ایکٹ قریب الختم تھا لوگوں میں لحہ بہ لحہ دلچسپی بڑھتی جاتی تھی دو اداکار اسٹیج پر آہستہ گفتگو کر رہے تھے کہ یکایک درجہ خاص میں کچھ ہلچل سی مچگئی ایک دبی ہوئی آواز سنائی دی جس کے جواب میں کسی مرد نے آہستہ سے کچھ کہا اور پھر خموشی چھاگئی یکایک کسی کے دردناک طریقہ پر کراہنے کی آواز سنائی دی جو ہوا کو چیرتی ہوئی سامعین کے دلوں کو چھلنی کر رہی تھی لوگ اس کو سننے کیلئے بالکل ساکت ہوگئے اداکاروں نے اپنا کام روکدیا پھر اسی طرح کی آواز آنے لگی یہ پہلے سے زیادہ دردناک اور مہیب تھی کسی نے مدد کیلئے چیخا۔ کسی نے چیخ کر کہا خون! خون! مجھے بچاؤ۔

فوراً روشنی کردیگئی تمام تھیٹر میں شور و غل سے ایک ہنگامہ برپا تھا وہ ایک عورتیں عالم وحشت میں چیخ مار کر بیہوش ہو گئیں۔ درجہ خاص کی آخری نشست پر زرینہ ہادی سے چمٹی ہوئی تھی۔ ہادی اپنے آپکو اس حالت میں دیکھ کر شرما گیا۔ روشنی کے ساتھ تھیٹر کے مجمع نے ہادی کی جانب دیکھا جس سے وہ اور شرمندہ اور پریشان ہوگیا۔ زرینہ۔ ہادی سے لگی کھڑی تھی اس کے کندھے اور سینہ پر تازہ خون کے دھبے پڑے ہوئے ہیں اور کچھ خون اس کے ہاتھ کے ذریعہ سے نیچے کی طرف بہہ رہا تھا اس منظر کو دیکھ کر لوگوں میں سنسنی پیدا ہوگئی۔

تھیٹر کے منیجر نے تیزی سے پردہ گرادیا اور مجمع سے خاموش رہنے کی التجا کی اس عرصہ میں پیچھے کی طرف سے کوئی شخص مجمع کو چیرتا پھاڑتا زرینہ کی طرف جانا چاہتا تھا اس نے آگے بڑھکر کہا میں ڈاکٹر ہوں اور میرا نام جعفر ہے کیا اس وقت میری خدمات کام آسکتی ہیں۔ ہادی نے چیخ کر کہا۔ خدا کی پناہ! اس کے جسم پر خون کیسے گرا ہے۔ ساتھ ہی چہرہ کا رنگ فق تھا۔ اس کے ہاتھ پر جو زرینہ کے کندھے پر تھا کچھ خون کے قطرے گرنے لگے۔ یہ فوراً چونک اٹھا کہ یہ تو کہیں اوپر سے گر رہے ہیں ڈاکٹر اور ہادی نے جب اوپر نگاہ کی تو دیکھا کہ بکس میں کسی کا سر نظر آرہا ہے وہ ہاتھوں پر اسی طرح سہارا لئے ہوئے ہے کہ گویا سو رہا ہے ڈاکٹر نے کہا اس خاتون کو کمرہ میں پہنچا دو اور پوری

پوری طرح دیکھ بھال کرو۔ مجھے اس آدمی کے پاس جانا چاہئے۔ اس نے منیجر سے نہایت آہستہ سے کہا۔ ہاں ذرا تھیٹر کو جلدی خالی کرادو اور پولس کو ابھی فون سے اس واقعہ کی اطلاع کردو۔ اس کے بعد تم میرے پاس بکس میں چلے آنا۔

بکس میں بجز مقتول کے جو سوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر قریب پہنچ کر غور سے اوس کو دیکھنے لگا کسی تیز چھرا سے اس کی گردن بری طرح مجروح تھی اور ہلاکت کچھ ایسی ناگہانی طور پر واقع ہوئی تھی کہ مقتول کی گردن ابھی اسٹیج کی طرف خمیدہ تھی گردن سے خون نیچے کی طرف بہہ رہا تھا جو نیچے گر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پلٹ کر منیجر کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے کھڑا تھا اور کہنے لگا کیسی اچانک موت واقع ہوئی ہے۔ ہاں کیا تم نے پولس کو اطلاع دیدی۔

جی ہاں ابھی۔ منیجر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے پھر کہا۔ غالباً پولس آگئی اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا پولس انسپکٹر مع چند جوانوں کے موجود تھا۔

انسپکٹر نے آتے ہی دریافت کیا۔ جناب کیا واقعات ہیں؟

ڈاکٹر بکس کے مردہ شخص کی طرف بتلاتے ہوئے جواب دیا یہ دیکھئے۔

انسپکٹر۔ قریب پہنچکر مقتول کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ مردہ! کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟

جی ہاں۔ ڈاکٹر نے کہا۔

انسپکٹر۔ غور سے امتحان کر کے کہنے لگا۔ غالباً کسی نے قتل کیا ہے یہ خودکشی کسی طرح بھی نہیں ہوسکتی کیوں۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر نے جواب دیا بالکل درست اگر کوئی شخص آج سے قیامت تک بھی کوشش کرے تو وہ اپنے آپ کو اس طرح کبھی زخمی نہیں کرسکتا۔

خدا کی پناہ! انسپکٹر بکس میں ہر جانب نگاہ ڈال کر کہنے لگا۔

ڈاکٹر نے منیجر کی طرف بتلا کر کہا کہ آپ تھیٹر کے منیجر ہیں۔

انسپکٹر نے منیجر سے پوچھا۔ کیا آپ مقتول کو پہچان سکتے ہیں؟

میں نے اس سے پہلے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ منیجر نے جواب دیا۔

ڈاکٹر اور منیجر دونوں مل کر نہایت احتیاط سے مردہ کو پلٹنے لگے کہ اس کا چہرہ صاف طور پر نظر آسکے۔ یہ ایک ادھیڑ عمر والا شخص تھا داڑھی اور مونچھ دونوں صاف تھے آنکھیں کسی قدر بھاری تھیں اور پپوٹے ابھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے منیجر نے اس کو دیکھ کر بالکل اجنبیت ظاہر کی۔

تم اسے نہیں جانتے!

منیجر نے جواب دیا۔ نہیں میں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا۔

انسپکٹر۔ کہنے لگا۔ میں بھی نہیں پہچان سکتا۔ اچھا آفس کے منشی کو تو بلاؤ۔ دیکھیں کہ اس سے بھی کچھ پتہ چل سکتا ہے کہ نہیں۔

منیجر۔ پریشان ہو کر کہنے لگا۔ جی میں خود ہی جاتا ہوں یہ

انسپکٹر۔ کہنے لگا یہ ایک مشکل معمہ نظر آتا ہے۔ میں تو یہ

سمجھتا ہوں کہ تھیٹر ہی کے کسی آدمی نے ارتکاب کیا نہ ہو۔ چونکہ تھیٹر خالی ہو چکا ہے اس لئے پتہ چلنا ذرا مشکل ہی ہے۔

ڈاکٹر نے کہا معاف کیجئے یہ غلطی میں نے کی اور میں نے ہی منیجر سے تھیٹر خالی کر دینے کو کہا تھا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ عورتیں اس منظر کو دیکھ کر اور بدحواس نہ ہو جائیں۔

انسپکٹر نے کہا جناب اس میں آپ کی کوئی غلطی نہیں۔ میں عورتوں کے کمزور قلب سے خوب واقف ہوں۔ ہاں کیا آپ بتا سکیں گے کہ یہ قتل کس ہتھیار سے کیا گیا ہے؟"

بظاہر اس کا معلوم کرنا ذرا مشکل دکھائی دیتا ہے ممکن ہے کہ کوئی چاقو ہو۔ کوئی چھوٹا سا چاقو ہوگا یا کوئی تیز خنجر استعمال کیا گیا ہو۔ میں ٹھیک طور پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

کچھ دیر دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پیچھے سے منیجر منشی کے ساتھ آ پہنچا۔

بکس کے باہر والے برآمدہ میں کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ کیونکہ اس حادثہ کی خبر لوگوں میں اچھی طرح پھیل چکی تھی۔ تھیٹر کے تمام اداکار اور دوسرے ملازمین بھی حیرت اور تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

منشی اس منظر کو دیکھ کر پریشان ہو گیا کہنے لگا بکس کو نواب بلند اختر نے محفوظ کرایا تھا اور کل ہی ان کی علالت کی وجہ سے نام کاٹ دیا گیا پھر مسٹر داور نے اپنے لئے یہ جگہ محفوظ کرائی تھی۔

غالباً میں اس نام سے واقف ہوں! داور ہی سب جج تو نہیں۔ پھر تو میں نے انہیں عدالت میں دیکھا ہے جب کہ بخت آور بنک کے دیوالیہ کا مقدمہ عدالت میں زیر تصفیہ تھا۔

ڈاکٹر بھی آہستہ سے کہنے لگا "اچھا تو یہ وہی داور جج ہیں"

"کیا آپ بھی انہیں جانتے ہیں"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ہاں صرف میں نے ان کا نام اخباروں میں پڑھا تھا۔

انسپکٹر نے منشی سے دریافت کیا "کیا وہ بکس میں اکیلا تھا"

"یہ ابھی معلوم ہو سکتا ہے۔ میں اس بکس کی خادمہ کو بلاتا ہوں" منیجر گیا اور ایک خوبصورت سبز پوش عورت کو ہمراہ لے آیا۔ یہ ایک دلکش حسین لڑکی تھی۔ قد اونچا جسم منحنی۔ بال بالکل سیاہ کالی کالی آنکھیں اور لب چھوٹے چھوٹے خوش وضع تھے۔

منیجر نے انسپکٹر سے کہا "یہ مرجانہ ہیں"

انسپکٹر جلدی سے پلٹا۔ لڑکی نے آداب بجا لایا اور کھڑی ہو گئی۔

"کیا تم نے مسٹر داور کو اس بکس میں بٹھایا تھا؟"

"جی ہاں!"

"کیا وہ یہاں تنہا تھے؟"

"جی نہیں!"

"تو ان کے ساتھ اور کون تھا؟"

"ایک عورت تھی!"

مینیجر نے بہت ہی تسکین دہ لہجہ میں مرجانہ کو کہا۔ "تم جو کچھ ان کے متعلق جانتی ہو کہہ دو۔"

"بہت خوب لیکن افسوس ہے کہ مجھے کچھ زیادہ معلومات بھی نہیں کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم اپنے کاموں میں کس قدر مصروف رہتے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا "بالکل سچ ہے" "کچھ تو یاد کر کے بتاؤ کیا وہ عورت نوجوان تھی؟"

"وہ میرے خیال میں نوجوان تو نہ تھی البتہ اس کا لباس سنہری رنگ کا تھا اور اس کے بال اس قدر چمکدار معلوم ہو رہے تھے جیسے کسی نے رنگ دیا ہے!"

"بہت خوب! کچھ اور سوچنے کی کوشش کرو۔ کیا تم اسے اب پہچان لو گی۔"

مرجانہ پر پریشانی چھا گئی کہنے لگی میں . . . نہیں . . . سمجھتی کہ اب اسے پہچان بھی سکوں گی کیا مسٹر داور نے کھیل کا پروگرام بھی خریدا تھا؟"

"جی ہاں اس نے دو پروگرام خریدے تھے۔"

پولس کا جوان جواب تک خاموش کھڑا تھا کہیں سے پروگرام اٹھا لایا اور کہنے لگا "دیکھئے صاحب یہاں موجود ہے۔"

تو دوسرا شاید اس عورت کے پاس رہ گیا ہو گا۔ اچھا مرجانہ کیا تم نے اس عورت کو بکس سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا؟"

"جی نہیں۔"

پولس کا جوان پھر آگے بڑھ کر کہنے لگا "حضور دیکھئے اس ٹوپی میں ایک روپیہ بھی رکھا ہوا ہے۔"

انسپکٹر تعجب سے اس ٹوپی کو دیکھنے لگا۔ تمام لوگوں نے بھی اسی طرف ٹکٹکی لگا دی تھی۔

"تعجب کی بات ہے" انسپکٹر نے پھر مرجانہ سے پوچھا۔ "کیا مسٹر داور نے تمہیں کچھ انعام بھی دیا تھا؟"

"جی ہاں دیا تھا۔"

"کیا دیا تھا؟"

"ایک روپیہ۔"

"پھر وہ کہاں ہے؟"

غالباً . . . غالباً وہ یہی ہے اس وقت چونکہ اندھیرا تھا اس لئے میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں چاہتی تھی کہ پھر واپس آ کر ڈھونڈھ لوں)۔

"بہت خوب مرجانہ کیا تم کچھ اور بتا سکتی ہو؟"

لڑکی نے نفی میں جواب دیا اور یہ کہتے ہوئے بکس کے منشی کے ساتھ چلی گئی۔ ڈاکٹر اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر کہنے لگا "انسپکٹر صاحب یہ لیجئے میرا پتہ ہے آپ جب ضرورت سمجھیں مجھے بلا لینا ممکن ہے کہ میں

آپ کی مدد کر سکوں"۔

ڈاکٹر صاحب آپ کا شکریہ۔ فی الحال تو کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی البتہ جرح کے وقت مجھے آپ کو بلانا ہوگا میرا نام محمود ہے۔ مجھے انسپکٹر محمود کہتے ہیں۔

"بجا ارشاد" ڈاکٹر تھوڑی دیر بعد بکس سے نکل کر چلا گیا۔ انسپکٹر اس چھوٹے سے واقعہ پر غور کرنے لگا جو تول سے متعلق تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی ٹوپی میں کیوں کر رہ گیا۔ اگر مرجانہ ہی نے وہاں رکھا تھا تو اس رکھنے میں مصلحت کیا تھی

دوسرے روز جب انسپکٹر دفتر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کسی نے فون کیا ہے۔

اور کچھ دیر بعد اطلاع دی کہ کوئی عورت مسٹر داور والے مقدمہ کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہے۔ انسپکٹر نے کہا "انہیں یہیں بلا لو"۔

تھوڑی دیر بعد ایک عورت انسپکٹر کے پاس لائی گئی یہ عمر رسیدہ عورت تھی۔ چہرے کی جھریاں اس کے مزاج کی تلخی کا پتہ دیتی تھیں۔ ایک خوش نما لباس زیب تن کئے ہوئے تھی۔ بال واقعی چمکدار نظر آتے تھے انسپکٹر نے بیٹھنے کیلئے کرسی دی۔

"کیا آپ ہی مجھ سے ملنا چاہتی تھیں؟"

"جی ہاں" اس نے ایک اخبار آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ ملاحظہ فرمائیے یہ اس کے متعلق آپ سے ملنا چاہتی تھی کل مسٹر داور کے ہمراہ میں ہی تھی۔

انسپکٹر تو عورت کے آتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہی عورت ہوگی لیکن جونہی اس عورت نے اس کی تصدیق کی۔ انسپکٹر چونک پڑا اور حیرت سے پوچھنے لگا "کیا آپ ہی اس شخص کے ساتھ تھیں؟"

جی ہاں!

"کیا آپ سے اور مسٹر داور سے کوئی رشتہ داری ہے؟"

وہ کچھ دیر انسپکٹر کو غور سے دیکھنے لگی اس کا ہاتھ جس میں اخبار تھا کانپنے لگا۔ اس نے کہا "افسوس کہ مجھ سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ . . . خیر میں اب سب کچھ کہے دیتی ہوں۔ . . . میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے والے ہیں"۔

تو آپ مسٹر داور کے ہمراہ تشریف لائی تھیں۔

"جی ہاں"

"آپ کس وقت تھیٹر سے باہر نکلیں"

"غالباً پہلے ایکٹ کے اختتام سے کچھ دیر پہلے وہاں سے نکلی"

"کیا آپ کھیل کے پہلے وقفہ میں تو نہیں نکلی تھیں؟"

"نہیں میں نے وقفہ کا کوئی انتظار نہیں کیا"

"کس لئے نہیں کیا گیا؟"

حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت رو رہی تھی اور پہلے ہی وہاں سے کسی طرح نکلنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس نے چھ ماہ شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔"

انسپکٹر نے دریافت کیا۔ "تو پھر کل اس نے کیا کہا؟"

"کل رات اس نے مجھ سے صاف کہدیا کہ مجھ سے شادی کرنے کا مطلق ارادہ نہیں ہے۔"

"اچھا جب آپ باہر جا رہی تھیں تو کیا آپ نے کسی اور کو وہاں دیکھا؟"

"وہاں اور کوئی نہیں تھا!"

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی انسپکٹر رسیور لیکر سننے لگا۔ "جناب میں تھیٹر سے بات کر رہا ہوں۔ یہاں کے جھاڑو دینے والوں نے بکس کے سامنے والے برآمدہ میں ایک چاقو جو فرش کے نیچے کونہ میں پڑا ہوا تھا پایا ہے۔ بانی ہر فرما کر آپ جس قدر جلد ممکن ہو تشریف لائیے۔" "بہت اچھا۔" انسپکٹر نے کہا ٹیلیفون رکھ کر عورت سے کہنے لگا "اچھا تو مقدمہ کے وقت آپ کو کافی ثبوت دینا ہوگا۔ کیونکہ ابتک صرف آپ ہی ایک ہیں جنھوں نے مسٹر داور کو زندہ دیکھا ہے۔"

جب وہ عورت وہاں سے رخصت ہوگئی تو انسپکٹر نے تھیٹر کی راہ لی وہاں منیجر کے میز پر ایک چاقو رکھا تھا اس کی نوک بہت تیز تھی اور اس کا دستہ سفید ہڈی کا بنا ہوا تھا جس ملازم کو چاقو ملا۔ انسپکٹر اس کو بغور دیکھتا رہا۔ ملازم نے انسپکٹر سے کہا کہ اس کو وہ چاقو فرش کے ایک کونہ کے نیچے دبا ہوا ملا ہے۔ انسپکٹر پھر منیجر کے کمرہ میں جاکر چاقو کو غور سے دیکھنے لگا۔

منیجر نے پوچھا "کیا وہ قتل اسی چاقو سے کیا گیا ہے؟"

"یہ معلوم نہیں ہوسکا" "یہ چاقو تو بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اس پر کسی قسم کا داغ دھبہ نہیں پایا جاتا۔ . . . میرے خیال میں اگر قاتل نے اسی چاقو سے اپنا کام کیا ہے تو نہایت چالاکی سے اسے بالکل صاف بھی کر دیا ہے۔ غور کرنے پر بھی پتہ چلنا دشوار ہے کیا آپ نے اس چاقو کے متعلق یہ بھی دریافت کیا ہے کہ یہ چاقو کس کا ہے اور وہاں کیسے آیا؟"

منیجر نے جواب دیا "جی نہیں یہ سب آپ ہی پر چھوڑ رکھا ہوں"

ڈاکٹر کو اس کے دئے ہوئے پتہ پر اطلاع بھیجی گئی وہ جتنا جلد ممکن ہو سکے تھیٹر کو چلا آئے بار بار انسپکٹر نے اس چاقو کے متعلق لوگوں سے سوالات کئے۔

ہوٹل کی خادمہ جو وہاں اس وقت موجود تھی کہنے لگی "مجھے کچھ کچھ خیال ہے کہ جب اپنے کاموں میں مصروف تھی تو کسی نے آکر مجھ سے چاقو مانگا تھا۔"

محمود نے اطمینان کا سانس لیا اور پوچھا!

"آخر وہ کون تھا؟"

یہ اسے مطلق یاد نہ تھا کہ لینے والا کون تھا۔ بہت دیر کے بعد اسے صرف اتنا یاد آیا کہ چاقو مانگنے والی کوئی عورت تھی۔"

"کیا تم نے اسے چاقو دیا تھا ؟"

"نہیں بلکہ میں نے اسے خود لے لینے کو کہا تھا۔"

"تو پھر اس نے لے لیا۔"

خادمہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا " یہ میں نہیں کہہ سکتی۔"

انسپکٹر نے تھیٹر کے تمام ملازمین کے نام رجسٹر منگوا کر پڑھ ڈالے اور ہوٹل کی خادمہ سے دریافت کیا انہیں میں سے کسی عورت کا نام بتا سکتی ہو۔ ہر ایک نام پر خادمہ نے نفی میں جواب دیا البتہ مرجانہ کے نام پر کچھ چونکی۔ اور انسپکٹر تشویشناک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا وہ عورت مرجانہ تو نہ تھی ؟"

خادمہ نے جواب دیا " شاید وہ مرجانہ ہی تھی "۔

"کیا اس نے چاقو کھیل شروع ہونے کے پیشتر مانگا تھا"

"جی نہیں۔"

"غالباً کھیل کے پہلے وقفہ میں ۔"

"جی ہاں بالکل صحیح۔"

محمود کچھ سوچنے کے بعد سیدھے منیجر کے دفتر کو چلا گیا۔

مرجانہ کو پھر بلایا گیا۔ وہ فوراً سبز پوشاک پہنے ہوئے وہاں آ گئی اس نے آتے ہی انسپکٹر کو آداب بجا لایا۔

"کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے۔"

انسپکٹر نے چاقو بتلاتے ہوئے اس سے پوچھا "کیا تم نے اس چاقو کو اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا۔"

لڑکی نے بالکل بے باکی سے جواب دیا "جی ہاں میں نے اسے کل لیا تھا۔"

"اچھا کیا تم مجھے بتلا سکتی ہو کس لئے لیا گیا تھا؟"

"میں چاہتی تھی کہ اپنے جوتے کے سامنے والے حصہ کو کتر دوں لیکن میرے پاس قینچی نہ تھی۔"

"تمہارا جوتا کترنے کے لئے ؟"

"جی ہاں کیونکہ وہ بالکل نئے ہیں اس لئے تنگ اور تکلیف دہ ہے میں نے چاقو اس لئے مانگا تھا کہ اسے کاٹ کر برابر کر لوں"۔ اس نے جوتے کو بتلاتے ہوئے کہا۔ دیکھئے یہی جوتا ہے جو میں پہنے ہوئے ہوں۔"

اس نے پیر سے ایک جوتا نکال کر انسپکٹر کو بتلایا۔ حقیقت میں وہ جوتا سامنے بٹن کے پاس کٹا ہوا تھا۔

انسپکٹر نے اس کا جوتا واپس کرتے ہوئے کہا "تم نے اس چاقو کو بکس کے سامنے والے برآمدہ میں کیوں چھپایا تھا ۔"

لڑکی نے کہا " میں نے ہرگز نہیں چھپایا ۔"

انسپکٹر نے "آخر یہ پھر کس نے چھپایا ۔"

"میں نہیں جانتی!" اس کے چہرے سے کسی قسم کا تغیر ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ اس کا لہجہ کچھ کرخت ہوتا جاتا تھا۔

"تم نے اپنا جوتا کس جگہ اتارا تھا؟"

"ہمارے لباس تبدیل کرنے کے کمرہ میں۔"

"کیا تم نے چاقو کو وہیں چھوڑا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"پھر اس کے بعد تم نے چاقو کو نہیں دیکھا؟"

"نہیں!"

محمود کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر لڑکی سے پوچھنے لگا "کیا تم پہلے وقفہ میں اس برآمدہ میں تھے؟"

"جی ہاں میں تو لوگوں کے لئے چائے وغیرہ لانے میں مصروف تھی۔"

"کیا مسٹر داور نے بھی منگوائی تھی؟"

"جی نہیں!"

"کیا اس وقت برآمدہ میں اور لوگ بھی تھے؟"

"جی ہاں بہت سے لوگ باہر کھڑے سگریٹ پیتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔"

"کیا تمہیں خیال ہے کہ مسٹر داور کے بکس کا دروازہ بند تھا؟"

"میں نے دیکھا تو نہیں غالباً وہ بند ہی تھا۔"

"کیا اس وقت وہاں اور کوئی تھا؟"

"غالباً . . . . غالباً کوئی نہیں۔"

"کیا تمہیں اس کا یقین ہے؟"

"غالباً میں نے کسی شخص کو اس کونہ کی طرف مڑتے دیکھا تھا۔ وہ شخص پلٹ کر پیچھے کی طرف بھی دیکھتا تھا۔ چونکہ روشنی بہت دھیمی تھی اس لئے میں برابر دیکھ نہ سکی۔"

"کیا تم نے اسے نہیں پہچانا؟ اس کے متعلق اتنا بتا سکتی ہو کہ اس کا لباس کیا تھا؟ ذرا سوچو اور جو کچھ یاد آسکے مجھ سے کہو۔"

مرجانہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "مجھے اس کا بھی یقین نہیں ہے کہ میں نے کسی کو وہاں دیکھا بھی ہے اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"جی کچھ نہیں۔"

ڈاکٹر۔ اس عرصہ میں اندر داخل ہوا اور مینیجر کی طرف بڑھتے ہوئے دریافت کیا "کیا کچھ پتہ چلا؟"

"جی ہاں ایک چاقو ملا ہے۔"

ڈاکٹر چاہتا تھا کہ اس چاقو کو لیکر دیکھے لیکن انسپکٹر نے اسے منع کر دیا اور کہنے لگا "آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مردہ کا امتحان کیا ہے لیکن کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ وہ قتل اسی ہتھیار سے کیا گیا ہے؟"

ڈاکٹر جس وقت اس چاقو کو غور سے دیکھنے لگا تو سب کے سب خاموش کھڑے تھے جب انہوں نے اس کو پوری طور پر دیکھ لیا تو انسپکٹر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "میرے خیال میں تو یہ چاقو استعمال نہیں کیا گیا۔ گو میں اس کا پورا پورا امتحان کرنے تک یقین نہیں دلا سکتا۔ لیکن اس چاقو سے وہ زخم جس کی وجہ سے مسٹر داور کی موت واقع ہوئی ہے ناممکن ہے"

محمود نے کہا "آپ بالکل سچ فرماتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ یہ چاقو وہاں کیسے پہنچ گیا۔ اگر یہ چاقو استعمال نہیں ہوا ہے تو آخر اس ہتھیار کا پتہ چلانا بھی لازمی ہوگا۔ فی الحال میں اس کو اپنے ساتھ لیجاتا ہوں" اس نے احتیاط کے ساتھ اس چاقو کو اپنی دستی میں لپیٹ لیا اور چلا گیا۔

مرجانہ نے کھڑی ہو کر انسپکٹر سے پوچھا "کیا اب میں جا سکتی ہوں"

"ہاں لیکن تمہیں عدالت میں آنا ہوگا"

"عدالت" وہ کسی قدر گھبرا گئی لیکن اپنے آپ کو سنبھال کر کہنے لگی "بہت خوب"

پھر ڈاکٹر نے کہا "اگر میرا کام ختم ہو چکا ہو تو اب اجازت دیجئے۔ کیونکہ مجھ کو کچھ ضروری کام پر جانا ہے"

"ضرور تشریف لیجائیے آپ نے بہت زحمت فرمائی میں بہت مشکور ہوں"

دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

ڈاکٹر ابھی برآمدہ میں قدم ہی رکھا تھا کہ مرجانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ "اچھا میں نے اب پہچانا میں نے تمہیں کل رات دیکھا ہے اس وقت میں تمہیں پہچان نہ سکی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو تم مڑے ہیں تو میں فوراً تاڑ گئی۔ کیونکہ تم گذشتہ رات کو اسی طرح مڑے تھے۔ وہ سوائے تمہارے اور کون تھا۔"

ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ خوب زور سے جھٹکا۔ اور کہنے لگا۔

"یہ کیا غضب کر رہی ہو؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا "آپ خوف نہ فرمایئے میں تو آخر وہیں تھی"

"خدا بچائے لیکن وہ چاقو ــــــ"

"وہ میرے پاس تھا میرا ۔ ۔ ۔ ۔ میرا بھی وہی ارادہ تھا جو آپ کا تھا"

"جو میں نے کیا"

"ہاں میں برآمدہ میں رینگتی جا رہی تھی جبکہ میں نے تمہیں سامنے دیکھا ہے۔ تم پہلے ایک سکنڈ تک چوطرف دیکھتے رہے صرف ایک سکنڈ کیلئے۔ پھر نظروں سے غائب ہو گئے میں ٹھیر گئی مجھے خوف تھا کہ تم واپس پھر آ نکلو گے"

"پھر کیا ہوا؟" ڈاکٹر لڑکی کا ہاتھ اسی طرح مضبوط پکڑے ہوئے تھا۔

پھر میں آگے بڑھی۔ اس بکس کے اندر ـــ میرے پاس چاقو تھا ـــ لیکن میں نے دیکھا کہ تم مجھ سے پہلے موجود تھے ۔"

" اس سے تمہارا مطلب ۔"

" بہت خوب۔"

کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو گھورنے لگے ڈاکٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا " کیا اوس نے تمہارے ساتھ بھی کچھ بدسلوکی کی تھی ۔"

" ہاں وہ میرے باپ کا قاتل ہے اس نے انھیں برباد کر ڈالا یہاں تک کہ جان لیلی۔ پھر میری ماں نے دنیا کو خیرباد کہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے فاقہ کشی کرنی پڑی اس نے ہماری زندگی برباد کر دی میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ جب کبھی وہ مجھے ملیگا میں اس کی جان لیکر رہونگی مجھے اپنی کئی جانوں کا بدلہ لینا تھا۔ کل رات ہی کو میں نے اوس کو دیکھا وہ مجھے ایک روپیہ دیا ۔ کاش وہ اس وقت اکیلا ہوتا وہ روپیہ اس کے منھ پر پھینک مارتی۔

میں نے عمداً وہ روپیہ اس کی ٹوپی میں ڈال دیا جب میں نے اس کے ساتھ والی عورت کو جاتے دیکھا تو سمجھی کہ اب موقع آگیا۔ لیکن آپ نے اس کے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر ڈالا۔

ڈاکٹر بالکل خاموش کھڑا رہا۔

مرجانہ نے پوچھا بولو آخر تم نے اسے کس لئے مارا ؟"

" ایک عرصہ ہوئے اس نے میری منگیتر کو دولت کا لالچ دلاکر مجھ سے چھین لیا تھا اور اس قدر بدسلوکی کی کہ نتیجۃً وہ چھ مہینے بعد مرگئی ۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ کسی نہ کسی روز اس کی بھی جان لیکر رہوں گا۔ مجھے موقع کا انتظار ہی تھا۔ اسی غرض سے میں اکثر تھیٹر آیا کرتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ تھیٹر بہت پسند کرتا ہے اور اس طرح بدلہ لینا چاہتا تھا۔"

" اچھا تو پھر۔"

" میں جلدی سے واپس لوٹا اور دروازہ کے پیچھے تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ میں نے تم کو اس وقت برآمدہ میں نہیں دیکھا۔ خیال تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ لیکن جب شور و غل شروع ہوا تو فوراً میں نے ایک چالاکی کی۔ جو بہت کارآمد ثابت ہوئی میں باہر نکلتے ہی پوچھا " کہ میں کوئی مدد کر سکتا ہوں ؟"

لڑکی نے کہا " کیا آپ بالکل بچ گئے ؟ کیا وہ لوگ آپ کا پتہ نہیں چلا سکتے ؟"

" بالکل ناممکن۔ تا وقتیکہ تم ان سے نہ کہو !"

" میں ہرگز کسی سے نہ کہوں گی۔ میرا وہ کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ کیا اس چاقو سے انہیں کچھ پتہ چلیگا ؟ کیونکہ درحقیقت میں نے ہی چاقو چھپایا ہے ۔

"تم نے اسے وہیں کیوں نہ رکھدیا جہاں سے لے آئی تھیں"

"مجھے اس کا خوف تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے اس لئے میں نے جلدی سے فرش کے نیچے چھپا دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی ایک ترکیب آئی تھی"

"پھر تو تم اب صاف انکار کر دو کہ چاقو تم نے وہاں رکھا ہی نہیں۔ پھر کوئی خوف کی بات نہ ہوگی۔ وہ چاقو بہت بڑا ہے اس کا شبہ تک نہیں کیا جا سکتا صرف تم اس بات پر قایم رہو۔ پھر ان دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ جب کہ ڈاکٹر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دینا ہی چاہتا تھا کہ باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ جب وہ قریب تر ہونے لگیں تو مرجانہ نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ خدا حافظ کہکر ڈاکٹر وہاں سے چلے گیا۔

بجس کے قتل کا معمہ شہر بھر میں اب تک کوئی حل نہ کر سکا۔ قاتل کی تلاش ایک زمانہ تک ہوتی رہی۔ انسپکٹر نے اپنی تمام کوششیں ختم کر دیں۔ ہر کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعات محمود کو ایک جانب سے دوسری جانب جھکاتے تھے جب ڈاکٹری معائنہ سے یہ ثابت ہو چکا کہ قتل کسی طرح اس چاقو سے نہیں کیا گیا جو تھیٹر میں ملا ہے تو انسپکٹر محمود کا شبہ جو مرجانہ پر تھا بالکل دور ہو گیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کی عمر میں یہ پہلا واقعہ ہے جس کا وہ پورے طور پر سراغ نہ لگا سکا۔ اس کا دماغ اس کے سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ چاقو جس سے مسٹر داور کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ آخر برآمدہ میں کیوں چھپا دیا گیا۔

(ترجمہ)

(عبد المحمود۔ نظام کالج)

اقوال جناب حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ

(پ)

تاریخ اسلام کا وہ الوالعزم اور زبردست خلیفہ جس کی ہیبت شاہان روم و چین کو لرزہ براندام کر دیتی تھی اور بڑے سے بڑا مغرور و متکبر جس کے سامنے ہونے سے پس و پیش کرتا۔ دنیا کا عظیم ترین سپہ سالار جس کے مقابلہ کی تاب نہیں لاتا تھا یہ کون تھا؟ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ باوجود زبردست حکومت و سلطنت رکھنے کے اپنی زندگی جس طرح بسر کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے خوب واقف ہیں۔ یہ اقوال ہیں اس خلیفہ کے جس کا یہ قول تھا کہ اگر مجھے خوف حساب نہ ہوتا تو میں روز آنہ دنبے بھنوا بھنوا کر کھایا کرتا۔ باوجود زبردست زہد و تقویٰ کے اور جنتی ہونے کے کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنتی ہونے کی بشارت دی تھی ہمیشہ حساب روز محشر سے ڈر کے مارے رویا کرتے تھے اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کرتے اے ابن خطاب خدا سے ڈرتا رہ ورنہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوگا۔

۱۔ آپ اپنے اختیار میں رہنا چاہو تو اپنا راز چھپائے رکھو۔

۲۔ جس کی طرف سے تمہارے دل میں نفرت ہو اور بغض ہو اس سے ڈرتے رہو۔

۳۔ پیچھے ہٹی ہوئی چیز پھر آگے نہیں بڑھتی۔

۴۔ جو برائی سے بالکل واقف نہیں وہ برائی میں مبتلا ہوگا۔

۵۔ دوسروں کی فکر میں اپنے آپ کو نہ بھول جایا کرو۔

۶۔ امانت اس کا نام ہے کہ ظاہر و باطن میں باہم مخالفت نہ ہو۔

۷۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسے برائیوں سے بچاتا ہے۔

۸۔ جو عالم حلال و حرام سے واقف ہو اس کی موت ان ہزار عابدوں کی موت سے زیادہ افسوسناک ہے جو قائم اللیل اور صائم النہار ہوں۔

۹۔ جو شخص [illegible] سے بچا اور ہمیشہ مخلص پایا [illegible]۔

شہاب

جلد (۴) اردی بہشت ۱۳۴۵ف مطابق مارچ ۱۹۳۶ء نمبر (۱)

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے (للعہ) — گورنمنٹ سے (عـــہ)

رہبر دکن برقی پریس میں طبع ہو کر بیرون دبیر پورہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔

رباعیات

جناب مولانا امجد

دھوکا ہی سہی

اصلیت اگر نہیں تو دھوکا ہی سہی
اللہ بہت نہیں تو تھوڑا ہی سہی
تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو
رویت ممکن نہیں، تو رویا ہی سہی

قطعہ خاکساری

جہاں کو ناز ہے ہستی پہ اپنی
میں اپنی پستی پہ مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطف خاکساری
تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

جناب نواب شہید یار جنگ بہادر

کب وقت کسی کے ٹالے دیکھا
اب پڑ گئے ہیں جان کے لالے دیکھا
وہ خود تجھ سے زیادہ محتاج ہیں آج
بندوں کو خدا سمجھنے والے دیکھا؟

کب تک آخر یہ حب دنیا دل میں
ہمجنسوں کی الفت نہیں اصلا دل میں
بندوں سے تو ملنا نہیں آتا تجھ کو
اللہ سے ملنے کی تمنا دل میں

ہر چیز جو گھر میں ہاتھ آئی لے لی
ماں باپ کی بھائی کی کمائی لے لی
جو کچھ بھی تھا اپنے پاس وہ سب دیکر
واللہ حسینؑ نے خدائی لے لی

غزل

عالیجناب امیر اکبر نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر (امیر پائیگاہ)

ـمنی ہم سے وہ کرتے ہیں محبت کے عوض
ہم دعا دیتے ہیں خوش ہو کے شکایت کے عوض

ـاغ پر داغ دئے وصل کی دولت کے عوض
خوب گن گن کے لئے تم نے محبت کے عوض

ـصلہ ان کا مرا سہل نہیں داور حشر
دن کوئی اور مقرر ہو قیامت کے عوض

ـشم ساقی کا بندھا دل میں تصور دم ذبح
پی لیا ساغر مئے جام شہادت کے عوض

ـے ہو جب سر مدفن تو کدورت کیسی
خاک ہی ڈال دو تم چادر تربت کے عوض

ـمہ شوق پہ تم لکھدو فقط ہاں کہ نہیں!
ایک ہی لفظ یہ کافی ہے عبارت کے عوض

ـی طفلی تو جوانی میں حیا ساتھ ہوئی
تمکنت بڑھنے لگی اور شرارت کے عوض

ـج ہی تم رخ روشن سے اٹھا دو پردہ
آج ہی سامنے آجاؤ قیامت کے عوض

ـگر جور رہوں تسکین اسی سے ہوگی
ظلم پر ظلم کرو مہر و مروت کے عوض

ـا خبر تھی کہ سر منزل عشق و الفت
آفتیں ہیں مری تقدیر میں راحت کے عوض

ـن بتوں میں نظر آیا ترا جلوہ یارب
تیری تصویر ہی دیکھی تری صورت کے عوض

ـت تو جب ہے کہ اے داور محشر مجھ کو
کوچہ یار ملے گلشن جنت کے عوض

ـے دیا میرے خط شوق کا دو ٹوک جواب
ایک خط کھینچ دیا اس نے عبارت کے عوض

شکر نعمت تو کجا طرفہ تماشہ ہے معینؔ
مجھ سے ضد کرتے ہیں نااہل اطاعت کے عوض

مسروقہ جراثیم

(جناب عبد الحلیم صاحب بی اے)

ماہر جرثومیات نے خوردبین کے نیچے ایک شیشہ کے ٹکڑے کو سرکاتے ہوئے کہا "یہ ہیضہ کے جراثیم ہیں"

نو وارد جو ایک زرد رنگ کا بیمار سا آدمی معلوم ہوتا تھا اپنی ایک آنکھ بند کر کے ایک عجیب انداز سے خوردبین دیکھنے لگا "مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔" "اس اسکرو کو پھرائیے۔ شاید خوردبین آپ کی بصارت کے لحاظ سے درست ہے آنکھوں میں اختلاف اکثر پایا جاتا ہے صرف اس اسکرو کو ادھر یا ادھر پھرا دیجئے"

"ہاں اب نظر آرہا ہے" نو وارد نے جواباً عرض کیا "گو اچھی طرح تو نہیں کچھ گلابی رنگ کے دھبے نظر آرہے ہیں" "یہی دھبے۔ یہی چھوٹے چھوٹے دھبے آپس میں مل کر شہر کے شہر تباہ کر سکتے ہیں۔" "خوب" نو وارد اس شیشہ کے ٹکڑے کو کھڑکی کے پاس لیکر غور سے دیکھنے لگا "مشکل سے نظر آتے ہیں۔ کیا یہ زندہ ہیں۔ خطرناک ہیں"

"نہیں نہیں۔ یہ مرے ہوئے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ سارے جراثیم اسی طرح ختم ہو جائیں" "میرے خیال میں آپ نے زندہ جراثیم تو نہ دیکھے ہوں گے"

"برخلاف اس کے ہم مجبور ہیں کہ" یہ کہکر وہ مرد ایک کونہ میں گیا اور بہت سی مہر شدہ تجربی نلیوں میں سے ایک نلی لیکر کہنے لگا۔ "یہ زندہ نہیں ہیضہ اس نلی میں بند ہے"

مسکراہٹ کی ایک خفیف جنبش نو وارد کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

"یہ مہلک شئے تمہارے قبضہ میں ہے" وہ نلی کو گھورنے لگا ماہر جرثومیات نے اس شخص کے چہرہ پر غم آلود ہنسی کو دیکھا۔ یہ شخص اس کے ایک قدیم دوست کے پاس سے تعارفی رقعہ لیکر آیا تھا اس کے بال کالے اور لانبے تھے آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرہ پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے اور اطوار میں ایک قسم کی بےچینی ظاہر ہوتی تھی اور پھر اس کا زندہ جراثیم دیکھ کر مسکرانا ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

ماہر جرثومیات نلی کو ہاتھ میں لئے ہوئے اس کی توضیح کر رہا تھا "ہاں یہ جراثیم مفید ہیں" لیکن اس نلی کو کسی خزانہ آب میں توڑ دو۔ پھر دیکھو یہی جراثیم جو سوائے خورد بین کے نظر بھی نہیں آتے ہیں اور جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے کس طرح پانی میں پہنچ کر اپنا تماشا دکھلاتے ہیں۔ موت۔ تباہی۔ خوفناک موت۔ کہیں یہ عروس کو دولہا سے چھین لینگے کہیں معصوم بچہ کو ماں سے جدا کر دیں گے۔ کہیں سپاہیوں کو اپنے فرائض سے سبکدوش کرا دیں گے کہیں کمزور اور بیکسوں کو تکلیف سے نجات دلا دینگے۔ یہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ گلیوں کوچوں میں پہنچ جائینگے غیر محفوظ مکانوں میں تباہی پھیلائینگے۔ کیچڑ میں جذب ہو کر ہزاروں جگہ نمودار ہوں گے۔ صرف ایک مرتبہ ان کو پانی میں چھوڑ دو۔ پھر قبل اس کے کہ حفاظتی تدابیر اختیار کی جائیں۔ سارا شہر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوقوفی کو محسوس کیا اور جلدی سے کہنے لگا "لیکن یہ بالکل محفوظ حالت میں ہیں۔ ان سے کوئی خطرہ باقی نہیں ہے۔" نووارد غور سے سنتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی اور وہ اپنا گلا صاف کر کے کہنے لگا "یہ انارکسٹ بھی کتنے بیوقوف ہیں کہ خواہ مخواہ ہی گیس اور بمبیں کے پیچھے سر کھپاتے پھرتے ہیں۔ جب کہ انہیں یہ جراثیم آسانی سے میسر آ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں۔ . . ." دروازہ پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ یہ ماہر جرثومیات کی بیوی تھی جس نے ایک ضروری کام کی وجہ سے اپنے شوہر کو ایک منٹ کے لئے باہر بلایا۔ جب وہ دوبارہ تجربہ خانہ میں داخل ہوا تو اس کا ملاقاتی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔ چار بجنے میں بارہ منٹ ہیں۔ حالانکہ مجھے ۳ ½ بجے رخصت ہو جانا چاہئے تھا مگر آپ کی گفتگو اتنی دلچسپ تھی۔ مگر اب میں نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے ٹھیک چار بجے ایک اور صاحب سے ملنا ہے۔ ماہر جرثومیات اس کو دروازہ تک چھوڑ آیا۔ "یہ کوئی خبیث آدمی معلوم ہوتا ہے وہ ان جراثیم کو کس بری طرح گھور رہا تھا۔" جراثیم کا خیال آتے ہی اسے نلی یاد آئی جو اب غائب ہو چکی تھی اس نے ہر جگہ اسے تلاش کیا یہاں تک کہ اپنی بیوی کے کمرہ تک دیکھ آیا۔ لیکن اس کا پتہ نہ تھا وہ گھبرا گیا اور اسی حالت میں دروازہ کھول کر ملاقاتی کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کی بیوی نے دروازہ کی آوازسنی اور کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھنے لگی۔ ملاقاتی ایک گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ اور ڈاکٹر اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ نووارد نے

ڈاکٹر کی طرف اشارہ کرکے گاڑی بان سے کچھ کہا اور گاڑی تیزی میں روانہ ہوئی لیکن ڈاکٹر بھی اس کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہا تھا "اسے سائنس دیوانہ کرکے چھوڑیگی" یہ کہکر بیوی نے ڈاکٹر کے کپڑے لئے اور ایک گاڑی پر ان کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔ ڈاکٹر دیوانہ وار تعاقب کر رہا تھا۔ ایک سلیپر بھی نکل گئی۔ مگر اس نے کوئی پروانہ کی۔ لوگوں نے فقرے بھی کسے مگر وہ ان سب کو پی گیا۔ اتنے بڑے شہر میں اس وقت ننگے پیر بھاگنا صرف دیوانگی پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ نو وارد ملاقاتی گاڑی کے ایک کونہ میں اپنے ہاتھ لپیٹے ہوئے بیٹھا تھا اور وہ اس نلی کو انتہائی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ گو وہ غمگین تھا لیکن اس میں ایک خاص وقار بھی پایا جا رہا تھا اگر اسے کچھ ڈر تھا تو صرف اتنا کہ وہ اپنا فرض انجام دینے سے پہلے گرفتار کر لیا جائے لیکن اس کا وقار ان سب پر غالب آگیا۔ اب تک کسی انارکسٹ کا خیال بھی یہاں تک نہ پہنچا ہوگا صرف اس نلی کو کسی خزانہ آب میں توڑ لینا ہے اب وہ دنیا کو تبلا دیگا کہ وہ کیا کچھ کر سکتا ہے اب تک جو اسے نظر انداز کیا گیا ہے دوسروں کو اس پر ترجیح دیگئی ہے ان کو یہ معلوم ہو جائیگا۔ موت۔ موت۔ اس کے ساتھی اسے نکما سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے تمام دنیا اسے حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اب وہ سب کو سبق سکھا دیگا اور بتلائیگا کہ بدلہ کس طرح لیا جاتا ہے۔

اس نے سر باہر نکال کر دیکھا تو ماہر جرثومیات قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے فوراً گاڑی بان کو رقم دیتے ہوئے اشارہ کیا۔ گاڑی بان نے ایک چابک لگایا اور گاڑی ہچکولے لیکر بڑھی۔ لیکن اس ہچکولے نے اس کا توازن خراب کر دیا اور وہ نلی ٹوٹ گئی۔ چند قطرے اس کے کپڑوں پر بھی گر گئے اس کے چہرہ پر غم واندوہ کی ایک لہر دوڑی، مگر اس نے اپنے کو فوراً سنبھالا۔ اسے ایک خاص خیال آیا ابھی نلی میں ایک قطرہ باقی تھا جسے وہ پی گیا۔ اب ماہر جرثومیات سے بچنے کی کوشش بیکار تھی اس نے گاڑی روکنے کا حکم دیا اور اتر پڑا۔ ڈاکٹر قریب تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ اترے اس نے چلا کر کہا "افسوس تم دیر سے آئے ہیں اس کو پی گیا۔ یہ کہکر وہ سڑک پر لوگوں کو دیکھتے ہوئے اور اپنی دانست میں سب کو متاثر کرتا ہوا چلدیا۔

ڈاکٹر کی بیوی بھی پہنچ گئی۔ اس نے اپنا لباس پہنیں لیا اور انارکسٹ کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا۔

" وہ دیکھو۔ وہ شخص مجھ سے ملنے آیا تھا وہ انارکسٹ ہے میں نے اسے غلطی سے ایک نلی میں جس میں ایک غیر متضرر دوا تھی۔ ہیضہ کے جراثیم تبلا دئے۔ وہ غارت گر ہے وہ اسے پی گیا۔ اور اپنی دانست میں اپنے فرض کو

یخو بی انجام دیتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ (ماخوذ)

غزل

جناب لیلیٰ بیگم صاحبہ لیلیٰ

سودا سا سما جاتا ہے اچھے بھلے سر میں
جادو تو نہیں ہوتا ہے کافر کی نظر میں

دل ہو گیا بیتاب گلہ شکوے ہوئے دور
کیا تھا کرم یار کی دلچسپ خبر میں

اوس حسن شگفتہ کی بہاریں میں کہوں کیا
خاکہ سا ملے گا تو ملے گا گل تر میں

اللہ غنی صبح ملاقات کی رونق
ہے جلوہ نما جلوہ طور آج سحر میں

وحشت در و دیوار کی جاتی رہی لیلیٰ
وہ آ گئے گھر میں کہ بہار آ گئی گھر میں

شمیم سخن

جناب نبی الحسن صاحب شمیم بی۔ اے

یہ کہہ سکتا نہیں ہیں دل نہیں ہے
مگر ہاں آپ کے قابل نہیں ہے

جہاں آرزو ہے دل نہیں ہے
یہ دنیا دین کے قابل نہیں ہے

نکلتے ہی نہیں ارمان دل کے
جو تم چاہو کوئی مشکل نہیں ہے

ذرا تم ہاتھ رکھکر مسکرا دو
علاج درد دل مشکل نہیں ہے

دل برباد کو پیروں سے روندھو
نگاہ ناز کے قابل نہیں ہے

بنے بجلی نہ اس کوچہ میں پہنچے
تڑپنے کا کوئی حاصل نہیں ہے

ہنسے دیتے ہو بے تابی پہ میری
یہ پتھر ہے تمہارا دل نہیں ہے

شمیم زار کو کافر نہ سمجھو!
خدا کی یاد سے غافل نہیں ہے

فریب کمال

جناب محمد رفیع الدین حسین صاحب بسمل صدیقی (حیدرآباد)

—(۱)—

سویرے سویرے مصور نے اپنا ضروری سامان لیا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔

نسیم سحر کی عطر بیزی اور طیور کی نغمہ ریزی دماغ میں ایک تازگی پیدا کرنے کے لئے کافی۔

مصور گلاب کے تختوں اور چنبیلی کے پودوں سے ہوتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔

اس کا دل مسرت کے گیت گا رہا تھا۔ اس نے کہا "آج میں ایک ایسی تصویر بناؤں گا کہ جیسے دنیا نے آج تک نہ دیکھا ہو خیال بھی جس کی نفاست کو نہیں پہنچ سکتا" اور اس کے قدم ہر لحظہ ایک غرور، ایک تمکنت اور ایک شان کے ساتھ اٹھنے لگے۔

چلتا چلتا وہ ایک مقام پر پہنچا وہاں کیا نہیں تھا؟ وادی، پہاڑ، دریا، درخت، سبزہ زار، پھول، اور رنگ برنگ کے پرند۔

"فطرت اپنے تمام جلووں سمیت بے نقاب ہو کر دعوت پرستش دے رہی ہے بیشک یہی بہترین مقام ہے"

مصور فرط مسرت سے چلا اٹھا اس کے بعد ایک چھوٹے سے ٹیلے پر اس نے اپنے لئے جگہ منتخب کی اور اپنا کام شروع

آسمان پر غائب ہونیوالے تارے بھی اس کے موقلم کی جنبشوں کو حسرت و انبساط سے تک رہے تھے۔ تصویر اصل کا ایک نادر انعکاس تھی۔ کوئی فرق ذرہ برابر بھی نہیں۔

وہ ایک عرصہ تک اپنے کام میں محو رہا۔ نظریں کبھی تصویر پر اور کبھی منظر کی دلفریبیوں کا جائزہ لیتی ہوئی فطرت کی زبان سے تعریف سنتے ہوئے شاہ خاور بھی افق مشرق سے جھانک کر تصویر کو دیکھنے لگا۔

مصور نے دیکھا۔ ایک لہر انبساط اور جنون آمیز مسرت کی اس کے دل میں پیدا ہو گئی۔

"قلم سے پیدا کی ہوئی سنہری کرنیں اور سورج اصل سے کہیں زیادہ دلفریب اور حسرت انگیز۔

تصویر اب اس کے خیال میں مکمل ہو چکی تھی اس نے ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ پھر منظر کی طرف دیکھا۔ پھر تصویر کو

پھر منظر کو اور پھر تصویر کو۔ اس کی گردن کی حرکت غیر اختیاری طور پر تیز ہوگئی۔

آہ خدا! کتنی بیرنگ باحقیقت سے کتنی دور! نہیں نہیں۔ میرے دعاوی غلط۔ یہ اغرور عبرت انگیز تصویر اس کے سامنے پرزوں میں تبدیل ہو کر پڑی تھی۔

—(۲)—

جنگل۔ تاریکی۔ بھیانک اور خوفناک۔

رات کی لامتناہی گہرائیوں میں سے دہشت انگیز شکلیں جھانکتی ہوئی۔

بھولا۔ بھٹکا اور تھکا ماندہ مسافر ایک مغنی تھا۔

وسوسے اور توہمات کا ہجوم لرزاں کناں۔ اٹھ بیٹھا۔ ایک نا معلوم خوف دہراس دل پر مسلط۔

آخرکار اس نے رباب اٹھایا اور فضا نغموں سے مرتعش ہوگئی۔

آوازوں کا چڑھاؤ اتار ایک مستقل ہم آہنگی کے ساتھ ہر طرف محیط۔

تھوڑی دیر بعد انسانی آواز۔ روح پرور کیف انگیز۔ اپنے اصولی اتار چڑھاؤ کے ساتھ گھٹتی اور بڑھتی

اسی طرح ایک عرصہ گذر گیا اور مغنی خود اپنی آواز کی انتہا گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

انتہائی کمال کا ثبوت۔

لیکن وہ اچانک رک گیا اور رفتہ رفتہ تمام نغموں پر سکوت چھا گیا۔

"اس کی حد صرف یہیں تک نہیں۔ آہ میں جانتا ہوں۔ یہ کمال کا آخری زینہ نہیں"

وہ جنوں آمیز تیزی کے ساتھ کچھ بکنے لگا۔ پھر رک گیا۔

رگوں میں تشنج۔ آنکھوں میں خون، ایک خیال اور اس کو دور کرنے کی ناکام جدوجہد۔

اس نے رباب پر نظر ڈالی اور توڑ پھوڑ کر پرزے ہر طرف بکھیر دئے۔

کپڑوں کو دیکھا اور تار تار کر دئے۔ اپنے ناخن چہرے میں گاڑ دئے۔

پاگل ہو چکا تھا۔

—(۳)—

رات خاموش تھی۔ فضا خاموش تھی اور کائنات کا ہر ذرہ خاموش۔

شاعر بھی خاموش تھا۔ محوِ بے خودی اور غرقِ تفکر۔

اس کے سینے میں پے در پے خیالات کا ہجوم تموج پیدا کر رہا تھا۔

اس کے دماغ میں ایک ہی ہستی، ایک ہی شخصیت کا تخیل اپنے اندر ہزاروں جذبات، گوناگوں اور مختلف النوع لئے ہوئے۔

اس کا دل حزن و ملال اور کبھی خوشی و مسرت دو متضاد کیفیتوں کا حامل

اس کی نظریں دور، بہت دور آسمان پر گڑی ہوئی۔

ناگہاں اس نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس لیا اور پھر چند بے ربط جملے۔

کہیں دور کوؤں نے چاندنی کو صبح صادق سمجھ کر شور مچانا شروع کر دیا۔

شاعر چونکا اور بڑبڑایا "یہ یوں بھی نہیں ہو سکتا نہیں۔ اس طرح بھی نہیں۔ سب خیالات لچر اور حقیقی معنوں میں غیر شعری۔"

جوشِ اضطراب میں وہ کھڑا ہو گیا۔ "میں اپنے ہی دل کی کیفیتوں کا صحیح اظہار نہیں کر سکتا؟ مجھ سے اپنے ہی خیالات کی پوری ترجمانی نہیں ہو سکتی۔

وہ نڈھال ہو کر گر پڑا۔

اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی۔ اس کا قالب بیجان ہو گیا اور اس کی روح اپنے اصل میں مرتسم۔

اگر اس کا معقول حل بتایا جائے کہ کیوں پرچہ وی۔ پی طلب کر کے واپس کیا جاتا ہے جب کہ ایک مہینہ قبل ختم چندہ کی اطلاع دیدی جاتی ہے تو ان کی خدمت میں بلاچندہ کے شہاب ایک سال تک حاضر ہوا کریگا۔ کیونکہ ہم نے اس نقصان سے محفوظ رہنے کیلئے تمام مراحل طے کر کے دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے آپ اس گتھی کو سلجھا سکیں۔

حسن کی ستمرانیاں

جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی - بی۔ اے

آپ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیے کسی قوم پر نظر ڈالئے۔ سماج کے کسی طبقہ پر نگاہ کیجئے حزب العمال سے لیکر حزب الامر تک اور شاہ سے لیکر گدا تک۔ غرض ہر جگہ کثیر تعداد میں لوگ طبقہ حسینان کی ستمرانیوں سے نالاں نظر آئینگے اور شاعروں کی جماعت تو انہیں کے جور وستم کی آفریدہ اور انہیں کی غارت گریوں کی نوحہ خواں ہے اور یہی نہیں بلکہ آپ انسانی تاریخ کی ورق گردانی کیجئے تو دیکھئےگا کہ قوموں کے زوال بادشاہوں کی شکست اور جماعتوں کے انحطاط کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب (جس کو مورخین اپنی کم نگہی سے نظر انداز کرجاتے ہیں) اسی طبقہ کی کارفرمائیاں اور ستم طرازیاں ہیں یہ تو اجتماعی زندگی پر حسینوں کے احسانات ہیں۔ انفرادی زندگی میں آپ کشتگان یا نیم کشتگان حسن کی کمی نہ پائیےگا ہر جگہ آپ کسی نہ کسی کو انہیں کی کافر نگاہوں کا زخم خوردہ پائینگے۔ اور مشکل تو یہ ہے کہ ان زخمیوں کے لئے دوا علاج اور آپریشن بھی بے سود ہے۔ شاعروں کی پریشان خیالیاں کیوں ہیں اس لئے نہ کہ فراق کی دراز راتیں اختر شماری میں کٹتی ہیں اور دن میں دماغ ٹھیک کام نہیں کرتا ہے محنتی اور ذہین طلباء کی امتحان میں ناکامیوں کا کیا سبب ہے۔ یہی نہ کہ دن بھر تو خیر کسی نہ کسی طرح مدرسہ میں وقت گذر جاتا ہے مگر رات ہوئی اور کسی غزال رعنا کا تصور نیند حرام کئے ہوئے ہے اگر کوئی آلہ دردپیما یا کوئی مقیاس الالم ہوتا تو پتہ چلتا کہ دنیا کی کلفتوں اور زندگی کی تلخیوں کا کس قدر حصہ حسینوں کے جور وجفا کا منت کش ہے آنسوؤں کی کتنی مقدار ابتدائے آفرینش سے لیکر اس وقت تک ان کے مظالم کی وجہ سے صرف ہوئی ہے اور بینائیاں کس قدر ضعیف قوائے عمل کس درجہ مضمحل ہوئے ہیں۔

تعجب تو یہ ہے کہ آج تک ان مظالم کے خلاف کسی نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی اور کوئی منظم کوشش اس جور وجفا کے تدارک کے لئے نہیں کیگئی البتہ شاعروں نے چند احتجاجی آنسو بہائے۔ عاشقوں نے کچھ احتجاجی نعرے لگائے اور بعضوں نے احتجاجاً اس جور وستم سے تنگ آکر خود کو آغوش لحد کے سپرد کردیا۔ مگر چونکہ یہ کوششیں منتظم نہ تھیں اس لئے آنسوؤں نے کوئی طوفان نہیں اٹھایا۔ نالے نارسا رہے اور خودکشیاں غیر موثر۔ نہ کبھی

احتجاجی جلسے ہوئے نہ اس کے انسداد کیلئے انجمنیں قایم ہوئیں اور نہ اخبارات نے اس جانب کوئی توجہ کی اور اگر کسی اخبار میں کوئی احتجاجی مضمون شائع ہوا تو اس کے جواب میں ہزارہا دلدادگان حسن نے اپنا زور قلم صرف کر دیا۔ خیر ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت کے پروردہ افراد سے تو اس کی توقع رکھنا ہی بیسود ہے کیونکہ یہ تو ہمیشہ سے آستان ناز پر اپنی جبین نیاز جھکاتے رہے ہیں اور اسی ناصیہ فرسائی کو اپنا سرمایہ حیات اور اپنے درد کا درمان تصور کرتے رہے ہیں تعجب تو یہ ہے کہ یورپ جو آزادی کا حامی اور ظلم و ستم کا دشمن ہے اس معاملہ میں ہندوستان سے بھی پیچھے رہگیا اور بارگاہ حسن کی دلنشین برداشت کرنا شاہدان پرکار کی ستم طرازیوں کا ہدف بننا نہ صرف گوارا کرتا ہے بلکہ اپنے لیئے باعث صد افتخار خیال کرتا ہے نہ پارلیمنٹ میں کبھی یہ سوال اٹھایا گیا اور نہ کوئی سیاسی جماعت اب تک قایم ہوئی ہے جس کی اساسی پالیسی اس طبقہ کے اقتدار و تسلط کیخلاف ہنگامہ آرائی کرنا ہو۔ جائے حیرت ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کے خلاف تو اس قدر شور و غوغا اور طبقہ حسینان کی طرف سے یہ استغنا حالانکہ اگر اول الذکر کی وجہ سے انسانوں کی ایک کثیر تعداد مادی فوائد سے محروم ہے تو دوسرے طبقہ نے انسانوں کا روحانی سکون چھین لیا ہے۔ چوروں ڈاکوؤں اور گرہ کٹوں کے خلاف تو تعزیرات میں گنجائش رکھی گئی ہے لیکن اس "رہزن تمکین و ہوش" طبقہ کے خلاف قانون میں ایک دفعہ کا اضافہ بھی نہیں کیا گیا حالانکہ اس دور عقل پرستی میں سب سے بڑی محرومی عقل و خرد کی محرومی ہے۔ پھر جو لوگ اچھے بھلے انسانوں کی عقل و دانش سلب کر لیں اور ان کو دارالمجانین تک پہنچا دیں جنھوں نے ہزارہا قیس و فرہاد پیدا کئے ہوں افسوس ہے کہ حکومتیں ان کی چیرہ دستیوں سے یوں بے نیاز رہیں)۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے کہ حسن اور ذوق حسن ہیئت اجتماعی کے لیے کہاں تک مفید ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے ان دونوں کا تخریبی پہلو نمایاں رہا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ طلب حسن اور ذوق جمال نے کسی قوم کو بام ترقی تک پہنچایا ہو بلکہ ہر قوم کی تاریخ میں یہ امر عیاں ہے کہ حسن و جمال میں شغف و انہماک نے ہمیشہ انحطاط و نکبت کی طرف راہبری کی ہے اس لئے خواہ دنیا کچھ سمجھے یا کہے میرا خیال ہے کہ فنون لطیفہ کی ترقی ناگزیر طور پر مترادف ہے تو ہمی انحطاط اور جماعتی پستی سے۔ بات یہ ہے کہ حسن و جمال کا افسوں انسان کی عملی قوتوں کو افسردہ اور مضمحل کر دیتا ہے اور اپنی دلکشی اور جاذبیت کی وجہ سے ذوق جمال صرف ذوق تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ بہت جلد ایک انہماک و شیفتگی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کون ہے جو موسیقی کے روح پرور

اور پرکیف نغموں سے لذت اندوز نہ ہوتا ہو۔ کون ہے جس نے کبھی کوئی نغمہ جانفزا سنا ہو اور اپنی روح کی بےچینی کا احساس نہ کیا ہو۔ یہی حال مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ کی دلکشی کا ہے لیکن ساتھ ہی ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ ان چیزوں سے زیادہ لگاؤ پیدا کرنا ہماری عملی زندگی کے لئے حد درجہ خطرناک ہے کیونکہ حسن وجمال کا افسون ایک غیر محسوس طریقہ سے انسان کو مسحور و مجبور کردیتا ہے ہمارے سامنے ایسے لوگوں کی مثالوں کی کمی نہیں ہے جن کا شغف وانہماک فنون لطیفہ سے جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے اور جو اپنی عملی اور اخلاقی قوتیں اسی کے پیچھے کھو بیٹھے ہیں۔ اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ فنون لطیفہ سے زیادہ شغف قوم کو اخلاقی اور عملی انحطاط کی طرف لیجاتا ہے جو پیش خیمہ ہے اس کے ادبار وہلاکت کا۔

اس میں شک نہیں کہ حسن کا وجود بیکار محض نہیں ہے اور نہ قدرت نے انسان کی فطرت میں طلب حسن اور ذوق جمال بے سود ودیعت کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کا جمالیاتی ذوق ہی ہے جو اس کی طبیعت میں شگفتگی اور خوش دلی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور اس کی افسردگی دور کرتا ہے حسن کا وجود اسی لئے ہے اور ذوق حسن اسی لئے عطا کیا گیا ہے کہ جب انسان کشمکش زندگی سے تھک جائے اور دنیاوی کلفتوں سے پژمردہ ہوجائے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے زندگی کے تلخ حقائق سے بے نیاز ہوکر انفس عالم کی گوناگوں رنگینیوں اور موجودات کے حسن وجمال سے اپنے قلب ونظر کو آسودہ کرے اور زندگی کی جد وجہد کے لئے تازگی اور گرمی حاصل کرے لیکن جہاں انسان کا ذوق جمال ان جائز حدود سے متجاوز ہوا اور جہاں طلب حسن بجائے خود ایک مقصد بن گیا یقینی ہے کہ اپنے مضر اثرات اس کی عملی اور اخلاقی زندگی پر مترتب کرے کیونکہ حسن وجمال میں شغف وانہماک کچھ عرصہ کے بعد تعیش وتنعم کی شکل اختیار کرلیتا ہے یہی وجہ ہے کہ فنون لطیفہ ہمیشہ ایسے ہی دور میں اوج کمال تک پہنچتے ہیں جس میں کوئی قوم اپنی سادہ زندگی کو چھوڑکر عیش وعشرت میں پڑجاتی ہے اس لئے حسن کا وجود کتنا ہی سودمند کیوں نہ ہو انسان کا جمالیاتی ذوق کتنا ہی فطری کیوں نہ ہو لیکن حسن پرستی کو کسی طرح سے حق بجانب ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

جب ہم مغربی اقوام کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب قومیں آج اسی حسن پرستی میں گرفتار ہیں اگر آپ یورپ کی عورت کی زندگی پر غور کریں تو صاف نظر آئیگا کہ اب اس کی زندگی کا اور کوئی مدعا باقی نہیں رہا ہے بجز اس کے کہ وہ کسی نہ کسی طرح حسین وجمیل نظر آئے۔ خواہ قدرت نے اسے حسن عطا کیا ہو

یا نہ ہو۔ مغربی عورت بازارِ حسن کی ایک جنس ہو کر رہ گئی ہے جس کے لئے باعثِ افتخار یہ نہیں ہے کہ اس کا وجود سماج کے لئے کہاں تک مفید ہے جس کی قیمت اس کے باطنی محاسن اور اخلاق پر نہیں لگائی جاتی ہے بلکہ اس پر کہ وہ اپنے اندر کتنی دلکشی پیدا کر سکتی ہے اس کی ادائیں کس قدر دلربا اس کی رعنائیاں کس قدر مسحور کن۔ اور اس کا حسن کس درجہ موثر ہے عورت کی زندگی کا وہاں اس کے سوا اور کچھ مفہوم نہیں کہ وہ مردوں کے لئے جاذب نظر بن سکے اور ان کو اپنے حسن و جمال کا دلدادہ بنا سکے۔ اس کا مقصود زندگی یہ نہیں ہے کہ وہ ایک اچھی ماں بنے اور اپنی توجہ تربیت اولاد پر صرف کرے اس کی غایت حیات یہ نہیں ہے کہ وہ شوہر کے لئے باعث راحت و سکون ہو۔ بلکہ اس کی زیست کا مدعا صرف یہ ہے کہ بازارِ حسن میں اس کی طلب بڑھے اور بڑی سے بڑی قیمت اس پر لگائی جائے

اس مقصد کے حصول کی غرض سے وہ قدرت کے عطا کردہ ذرائع کو کافی نہیں سمجھتی ہے بلکہ اس نے ایک مستقل فن تجمیل قائم کر رکھا ہے اور اپنے حسن و جمال کو بڑھانے کے لئے دنیا کی کوئی تکلیف کوئی اذیت ایسی نہیں ہے جسے وہ برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو۔ اور اگر وہ اس میں ناکام رہی تو پھر پستول کی گولی اس کا آخری علاج ہے۔ اسی ذہنیت کے ماتحت ہر عورت خواہ قدرت نے اس کو حسن و جمال سے کتنا ہی محروم کیوں نہ رکھا ہو بغیرت ناہید اور رشک قمر بننے کی آرزو مند ہے۔ یہ ہے ان قوموں کا حال جن کا ذوق حسن و جمال تکمیل کی حد تک پہنچ گیا ہے اور جو ان کے روکے رکتا ہوا نظر نہیں آتا۔

پھر سوال یہ نہیں ہے کہ یورپ اس ذہنیت میں کیونکر مبتلا ہوا۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ ہندوستانی ذہنیت جس نے اب تک عورت کو اس کی نسائی خصوصیات اس کے ایثار و عفت اس کی شرم و غیرت اور اس کی حیا و عصمت کی بنا پر نگاہ قدر سے دیکھا ہے کیوں کر خود کو اس بڑھتی ہوئی حسن پرستی سے بچا سکتی ہے اور کیا ہندوستانی عورت یہ گوارا کرے گی کہ وہ بازارِ حسن کی ایک جنس قابل بیع و شریٰ ہو کر رہ جائے۔؟

براہ کرم جب چندہ دینا ہے تو پھر کیوں نہیں ملازم کے رسید پیش کرنے پر ادا کر دیا جاتا خیال فرمائیے کہ کب تک روزانہ ملازم حاضر ہوا کرے گا آپ معاونین سے ہیں تو پھر وقت پر اعانت کر کے ہماری ہمت افزائی کرنی چاہئے نہ کہ ہمیں دل شکستہ کیا جائے۔

انوکھا انتقام

جناب سید شبیر حسین صاحب تبسم ورنگل

بوڑھی نندی اپنے بیٹے کے ساتھ سرپور کے ایک قصبہ میں رہا کرتی تھی یہ گاؤں ایک دریا کے کنارے واقع تھا جہاں کشتیاں آکر رکا کرتی تھیں ہفتہ میں ایک بار مسافر یہاں سے آیا جایا کرتے تھے یہ خوبصورت چھوٹا گاؤں جو جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ پہاڑی پر کے چند مکانات خوشنما معلوم ہوتے تھے۔

اس کے بیٹے کا نام سوامی تھا۔ مترو ان کا وفادار پہاڑی کتا تھا۔ ایک تاریک رات کو سوامی کو اس کے دوست ناسو نے رقابت کی وجہ قتل کردیا اور دریا پار کسی گاؤں کو فرار ہوگیا جب جوان بیٹے کی لاش دکھیاری ماں کے سامنے لائی گئی تو اس نے ایک آنسو تک نہیں بہایا۔ بلکہ ساکت وصامت کھڑی رہی چند منٹ بعد اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھکر قسم کھائی کہ اس کا بدلہ لیا جائیگا۔ تعزیت کیلئے جو لوگ اس کے پاس آئے ان سے وہ نہیں ملی وہ لاش اور کتے کے ساتھ ایک کمرہ میں بند ہوگئی۔ مترو دردناک چیخیں مار رہا تھا اور نندی آہستہ آہستہ رو رہی تھی جب وہ لاش سے مخاطب ہوئی تو کتے نے بھونکنا بند کردیا۔ میرے پیارے لعل! میرے دلارے! تیری بوڑھی ماں جب تک زندہ ہے انتقام کی آگ ہر سانس کے ساتھ بھڑکیگی۔ ناسو سے تیرے خون کا بری طرح بدلہ لوں گی تجھے معلوم ہے کہ تیری ماں نے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا اسلئے تو آرام کی نیند سو۔ جب وہ چپ ہوگئی تو کتے نے پھر چلانا اور رونا شروع کردیا صبح تک دونوں اس کیفیت میں رہے۔

دوسرے روز مترو کی لاش نذر آتش کردیگئی اس کے بعد سب اس واقعہ کو بھول گئے۔

مترو کا کوئی بھائی برادر نہیں تھا اس لئے کوئی بھی نندی کو انتقام میں مدد نہیں دے سکتا تھا۔ روزانہ وہ اس بارے میں سوچتی مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی وہ غصہ سے دریا پار نظر دوڑاتی اور دانت پیس کر رہجاتی وہ مجبور تھی بے بس۔ مگر جذبہ انتقام برابر بھڑک رہا تھا جس کے لئے وہ قسم کھا چکی تھی نیند اس کیلئے حرام ہوگئی تھی اور وفادار کتا بھی بے چین اور ملول نظر آتا تھا۔

ایک رات کو جب مترو بھونک رہا تھا تو یکایک نندی کے ذہن میں ایک تدبیر سمجھ میں آ گئی۔ صبح کو دیول میں گئی اور دیوی کے سامنے گر کر کامیابی کے لئے دعا مانگنے لگی۔ وہاں سے واپسی پر اس نے ایک پیپے میں کتے کو بند کر دیا پھر تمام رات وہ اسی طرح بھونکتا رہا اور صبح کو نندی نے اسے صرف پانی پلایا اور کوئی چیز کھانے کو نہیں دی۔ اس طرح دو دن اس نے بھوکا رکھا۔ مترو بھوک سے تڑپتا رہا۔ تیسرے روز اس نے پھونس کا انسانی پتلا تیار کیا اور اس کی گردن پر تھوڑا سا گوشت کپڑے میں مضبوط باندھ دیا۔ اور کتے کو چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے پتلے پر لپکا اور گردن کو جھنجھوڑنے لگا۔ مگر گوشت کی ایک بوٹی وہ کھا نہ سکا وہ غصے سے پتلے کو پھاڑنے لگا۔ نندی چمکتی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی پھر اسے پکڑ کر زنجیر سے باندھ دیا۔

جا۔ تین ماہ تک اس نے یہی عمل جاری رکھا روٹی کے چند ٹکڑے اسے دیتی تھی جب وہ کہتی "مترو! ہاں لینا!" تو وہ فوراً ہی پتلہ پر حملہ آور ہوتا اور تیز دانت اس میں گاڑ دیتا۔

نندی کو ناسو کا پتہ تو لگ چکا تھا۔ اس لئے ایک روز وہ کتے کو لیکر اس گاؤں کو روانہ ہوئی وہ اثنائے راہ میں کتے کو اس انوکھے عمل کی مشق کراتی رہی۔

گاؤں پہنچ کر اس نے ایک آدمی سے مترو کا مکان دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ پہاڑی کے تلے رہتا ہے اور بڑھئی کا کام کرتا ہے۔ نندی نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا وہ تیزی سے اس کے جھونپڑے میں داخل ہوئی "مترو" وہ چلائی وہ کام کرتے کرتے پلٹا۔ اس نے کتے کی زنجیر کھول دی "مترو! ہاں لینا۔ تکا بوٹی کر ڈال" فوراً ہی کتا خونخوار بھیڑئے کی طرح ناسو سے چمٹ گیا اور گلا پھاڑ ڈالا۔ اس نے آخری سانس تک جان بچانے کی کوشش کی۔ مگر مترو کے تیز دانت اس کی گردن میں گڑ چکے تھے۔ اس نے اس بری طرح اس کو زخمی کر ڈالا تھا کہ ناسو کی صورت کی شناخت نہیں ہوتی تھی۔

اس رات نندی نے اطمینان کی نیند لی۔ (مولسیانی)

براہ کرم تبدیل پتہ کی اطلاع دفتر کو فوراً دیجئے کہ پرچہ وقت پر آپ تک پہنچ سکے۔

صنعت تسر

جناب حمید الدین احمد صاحب بی ۔ ایس ۔ سی ۔ ایچ ۔ سی ۔ ایس

تسر عام طور سے تلنگانہ کے اکثر و بیشتر حصص میں پیدا ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی پیدائش اور اوس سے کپڑا بننے کی صنعت مفقود ہوتی جا رہی ہے چونکہ میری دریافت اور خاص کر اعداد جنور ہی کے حد تک محدود ہیں اس لئے شروع ہی میں اس کی وضاحت ضروری ہے تاکہ ناظرین اس کے لحاظ سے کسی عام نتائج پر نہ پہنچ جائیں جو ممکن ہے کہ یہاں کے حالات سے مطابق نہ ہوں اس بنئے میں بالکلیہ اپنی دریافت کو تعلقہ جنور ضلع آصف آباد کی حالت صنعت تک محدود کرتا ہوں

اس تعلقہ کے مندرجۂ ذیل مواضعات میں عام طور سے یہ صنعت زیادہ مروج رہی ہے :۔

کسٹم پیٹھ ۔ کشنے پلی ۔ پار پلی ۔ لنگنا پیٹھ ۔ اور ریمن پلی ۔

ان مواضعات میں اب بھی ان صناع خاندانوں کے افراد موجود ہیں جن کو عام طور سے یہاں کی زبان میں دین روڈ کہا جاتا ہے لیکن مختلف وجوہ کی بناء پر جن کی تفصیل بعد میں آئیگی ان لوگوں میں سے اکثر افراد نے اپنے آبادی پیشہ کو چھوڑ کر زراعت وغیرہ کی طرف رجوع کیا ہے ۔

دین روڈ خاندان کی موجودہ معاشی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی اس صنعت کے ذریعہ آمدنی کا تناسب زراعت کی آمدنی سے صرف ۱ : ۱۰ کا ہے ۔ گویا یہ فی الوقت زراعت پیشہ ہی کہلائے جانے کے مستحق ہیں اس صنعت کے زوال کا اندازہ گذشتہ پانچ سال کے تخمینی اعداد سے ہو سکتا ہے جو مجموعی قیمت فروخت تسر کے اعداد پر جو جنور میں ہوئی ہے کیا گیا ہے ۔

سنہ ۱۳۳۹ف بست	” کمی فیصد بلحاظ سنہ گذشتہ ۱۳ء۳ فیصد	سنہ ۱۳۴۱ف ۔ انہا ”	کمی فیصد بلحاظ سنہ گذشتہ ۱۴ء۴ فیصد

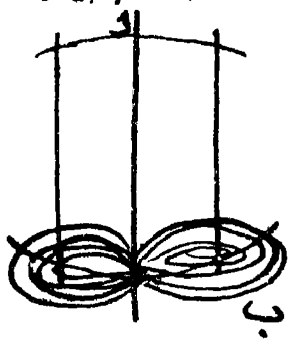
۴۳-۱۳۴۲ف ا۔ ″ ... ۳۵۰ فیصد } ۴۴-۱۳۴۳ف ال سعاد ″

۴۳-۱۳۴۲ف۔ ۴۴-۱۳۴۳ف کے درمیان اس قدر زیادہ تفاوت کی وجہہ مقامی بیوپاریوں نے نوصرف عثمان شاہی ملز ورنگل کے قیام کو ظاہر کیا ہے لیکن اس سے زیادہ اہم میرے نزدیک جاپانی کپڑے کی فراوانی اور ارزانی ہے جس کی Dumping نے تقریباً اس صنعت کو معدوم کے برابر کردیا ہے دیگر سنین میں کمی کا تناسب نہایت آہستہ آہستہ رہا ہے اور یہ عالمہ عالمی اقتصادی پستی کا لحاظ کرتے ہوئے کسی دیگر وجوہ کی بنا دپر تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم دیگر وجوہ جو اس کے ذمہ دار ہیں ان میں مقامی طور پر ملس کے کپڑے کی ارزانی۔ خود ٹسر کے بعض نقائص) اور کیڑوں کی فراہمی میں دقتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کے متعلق علیحدہ علیحدہ تفصیل سے عرض کیا جائیگا لیکن اس سے قبل خود ٹسر کی پیدائش کے متعلق تفصیل ضروری ہے۔

ٹسر پیدا کرنیوالا کیڑا اپنے Lovar کی اسٹیج پر پہلے ٹبادرمی نامی درخت پر پیدا ہوتا ہے۔ جہاں سے اس کو تلامدی ( ) پر منتقل کردیا جاتا ہے۔ یہاں وہ Pupae کے درجہ سے گذرتا ہوا ایک پھل کی شکل میں منتقل ہوجاتا ہے جس کو تلنگی زبان میں واسل کایا (DASALKAYA) کہتے ہیں۔ یہ ایک بیضاوی شکل کی پھل نما چیز ہے جس کا باہر کا چھلکہ ہلکا خاکستری اور سخت ہوتا ہے اس کو توڑا جائے تو اندر ٹسر کا کویا ہوتا ہے جس میں خام ٹسر کے ریشہ مردہ کیڑے کے گرد لپٹے ہوئے پائے جاتے ہیں اس کو ابالنے پر یہ تار زیادہ مضبوط ہونے کے علاوہ آسانی سے علیحدہ علیحدہ بھی ہوجاتے ہیں غالبًا ابالنے سے تاروں کے درمیانی Matria. کا مادہ جو ایک لعاب دار Gelatine. کے مانند ہوتا ہے حل ہوجاتا ہے اور اس طریقہ پر تار بہ آسانی علیحدہ علیحدہ ہوسکتے ہیں یہ ابالنے کا عمل نہایت اہم ہے ورنہ اگر اس میں تاخیر ہوجائے تو کچھ عرصہ کے بعد باہر کا چھلکہ خود بخود تڑک جاتا ہے اور اندر کا ٹسر ہوا اور نم کے اثر سے سخت اور ناقابل استعمال ہوجاتا ہے اس لئے کچے پھلوں کو پانی میں ابالا جاتا ہے پانی میں تھوڑا سا سوڈا جو تقریبًا خالص (SODIUMCARBONATE.) ہوتا ہے ڈال کر ابالا جاتا ہے اس نمکین محلول میں جوش دینے کے نتیجہ کے طور پر ٹسر کے گرد تمام لعابدار مادہ حل ہوجاتا ہے اور اس کے تار بہ آسانی

ایک دوسرے سے جدا ہو کر مسلسل تاگے کی شکل میں کھینچے جا سکتے ہیں۔

ایک پھل کا وزن تقریباً ا سے ۱½ تولہ ہوتا ہے اور اس میں سے بہ آسانی ایکہزار سے ڈیڑھ ہزار گز کا "اکیلا تار" برآمد ہوتا ہے چونکہ سنگل تھیرڈ نہایت باریک اور کمزور ہوتا ہے اس لئے بننے کے لئے ایسے آٹھ تاروں کو ملا کر تاگہ تیار کیا جاتا ہے فرمائیشی کپڑے بننے کے لئے سولہ تاروں کو ملا کر تاگہ تیار کیا جاتا ہے جس کو جملی کہا جاتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ آٹھ عدد پھل علیحدہ علیحدہ رکھدئے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک سے ایک ایک سرا تار کا نکال کر ایک تقریباً مستطیل شکل کے سادہ آلہ پر جس کا نقشہ درج ذیل ہے لپیٹ لیا جاتا ہے اس کے بعد صناع اس آلہ کو ایک اس کے محور ا کے گرد دائیں اور بائیں حرکت دیتا ہے اس سے تاگہ ب کے گرد حسب صراحت نقشہ لپٹا جاتا ہے



اس عرصہ میں تاروں کو نم رکھا جاتا ہے یہ اس طریقہ پر کہ ان آٹھوں کے مجموعہ کو صناع اپنی ران پر بھیگے ہاتھوں سے ملتا رہتا ہے جب کبھی ان میں سے ایک کا تار بھی ٹوٹ جاتا ہے وہ فوراً اس کو جوڑ لیتا ہے اس طریقہ پر تیار کیا ہوا تاگہ بعد میں ایک اور مرتبہ صاف کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کو بننے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کپڑا ہر موسم میں تیار نہیں ہو سکتا۔ اول تو اس لئے کہ پھل صرف سال میں دو موسموں پر دستیاب ہو سکتے ہیں یعنی ایک دیوالی کے عین ماقبل اور پھر تلسکرات یعنی گرمیوں کے قریب۔ دوسرے یہ کہ خود کپڑا بننے کیلئے بارش کا موسم نہایت غیر موزوں ہے جو کچھ بھی کام ہو سکتا ہے وہ جاڑے اور گرمیوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جاڑے اور گرمیوں میں تین گز روزآنہ کپڑے ایک شخص کی بنوائی کا اوسط ہے موسم بارش میں زیادہ سے زیادہ صرف ایک گز روزآنہ کپڑا تیار ہو سکتا ہے اس طریقہ پر اس صنعت کے لئے صرف سال میں آٹھ مہینے ہی دستیاب ہوتے ہیں بقیہ کے چار ماہ صناع تقریباً بیکاری میں گزارتا ہے سوائے اس صورت کے وہ کاشتکاری بھی کیا کرے۔

اب ہم ایک گز کپڑے کے مصارف اور اس کے لحاظ سے اس کی آمدنی کے حساب پر غور کرتے ہیں۔

ایک گز کپڑے کیلئے اوسطاً دو سو پھلوں کی ضرورت ہوتی ہے پھلوں کی قیمت مختلف مقامات اور مختلف موسموں پر علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اڈیل سرا میں مقام کا لیشور فی روپیہ تین سو پھل ملتے ہیں اسی مقام پر بارش میں فی روپیہ دو سو پھل ملا کرتے ہیں چنپور میں صرف ڈیوالی تک پھل ملا کرتے ہیں اور ان کی قیمت کبھی فی سو ۸ر سے کم نہیں ہوتی اس لئے عام طور سے لوگ مقامی پھل خریدنے پر کالیشور سے پھل لانیکو ترجیح دیتے ہیں اگر بلا لحاظ موسم پھلوں کی قیمت فی روپیہ تین سو قرار دی جائے تو گویا ایک گز کپڑے کیلئے ۱۰ ر۸ سر قرار پاتی ہے لیکن عام طور سے پھل اس قدر سستے نہیں ملا کرتے اس لئے ۲۵۰ فی روپیہ کا اوسط زیادہ قریب حالات واقعی ہوگا۔ اس کے حساب سے اس کی قیمت ۱۲ ار۹ ہر پائی ہوگی اگر جاڑوں کا زمانہ ہے تو ایک شخص ہر روز تین گز کپڑا بن سکیگا۔ گویا اس روز اس کو دو روپیہ پانچ آنے گیارہ پائی کا ٹسر درکار ہوگا۔ اب ہم ایک دن کے اخراجات اور آمدنی کا اندازہ اس طریقہ پر کر سکتے ہیں کہ :-

برائے خریدی ٹسر	عہ ۱۱/۵	آمدنی بحساب فی گز	۱۴ار عالہ
برائے سویاں مثلاً پیچ وغیرہ	ار	لہٰذا خالص آمدنی	۳ر ۱ار
جملہ اخراجات	عالہ ۶ر ۱۱ار		

فی الوقت ٹسر کی قیمت ۱۴ار فی گز ہے اور اس حساب سے ایک دن کی خالص مزدوری ۳ر ۱ار برآمد ہوتی ہے یہ اس مزدوری سے کم ہے جو عام طور سے اسی طبقہ کے مزدور پیشہ حاصل کرتے ہیں تاہم مزدوری کے حصول میں دقت اور پھر اس کے روز حاصل نہ ہونیکی غیر اطمینانی کے مدنظر بعض صناع ہنوز اس صنعت کو مزدوری پر ترجیح دیتے ہیں اور یہی وجہ اس کے اب تک زندہ رہنے کی ہے۔

چند سال قبل ٹسر کی اقل ترین قیمت ۱۴ر فی گز تھی جس کے لحاظ سے روزآنہ خالص آمدنی عہ ۵ر ۱ار ہوتی ہے۔ یہ اب کم ہو کر ۱۴ار فی گز کے لحاظ سے صرف ۳ر ۱ار رہ گئی ہے۔

اس انحطاط کے وجوہ میں سب میں اہم گرنیوں کے کپڑے کی ترویج ہے اس کے متعلق کسی قسم کی وضاحت غیر ضروری ہے دوسری وجہ کیڑوں اور پھلوں کی فراہمی کی دقت ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کیڑوں کا پالنا خود اس درخت کیلئے جس پر وہ پالا جائے نہایت مضر ثابت ہوا ہے اور اسی لئے محکمہ جنگلات نے اندرون

محصورہ اس کو ممنوع کردیا ہے تیسری وجہ خود کپڑے ہیں موسم برسات میں کیڑا لگنے کا اہم نقص ہے یساگرمٹے اور سستے جاپانی ریشم کے کپڑوں کی بہ لحاظ خوبصورتی وچمک ٹسر پر فوقیت ایک چوتھی اور اہم وجہ ہے

اب ان وجوہ کے متعلق فرداً فرداً غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وجہ اول کو رفع کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ مشین کے مقابلہ میں انفرادی کاریگروں کی کامیابی مشکل ہے البتہ مشین کے کپڑے پر کسی زائد محصول کو عائد کرکے صنعت کو Protection دیا جا سکتا ہے لیکن یہ بذاتہ ایک اہم مالی مسئلہ ہے جو اس مضمون کے حدود بحث سے باہر ہے۔

دوسری وجہ یعنی جنگلات کی طرف سے کیڑوں کی پیدائش میں مزاحمت ایسی ہے جس کا آسان حل یہ ہوگا کہ خود صناع ایسے اراضیات میں ان جنگلی درختوں کے نشو ونما کا انتظام اور اس پر کیڑوں کی پرورش کیا کریں لیکن بحالت موجودہ یہ عملاً ناممکن ہے البتہ ایک آسان طریقہ یہ ہوگا کہ جنگلات اختیار سے کام لے اور درخت کے نقصان کو صنعت کی ترقی پر قربان کرے تیسرا نقص برسات میں کیڑا لگنے کا ہے اس کی وجہ زیادہ تر وہ کلف ہے جو کپڑے کو موٹا ظاہر کرنے کیلئے دیا جاتا ہے اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اگر کپڑا ابال کر رکھا جائے تو اس میں سے کلف علحدہ ہو جانیکی وجہ اس میں کیڑا نہیں لگتا۔ کلف لگانے کا مقصد اگر صناع دبیز تاگے اور زیادہ قریبی بافت کے ذریعہ پورا کرلیں تو عیب بھی رفع ہو سکتا ہے اس کے سوا ایک گھانس، جس کو نلنگی میں وسنا کہتے ہیں اور (PHENOL) گولیوں کے استعمال سے بھی اس کا بہت کچھ سدباب ہو سکتا ہے۔

چوتھی وجہ اس قدر عام معلوم ہے کہ اس کی نسبت وضاحت غیر ضروری ہے تاہم اگر ٹسر کے متعلق کسی ایسی آسان ترکیب (MERCERIZATION.) پر غور کیا جائے جو صناع کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہ ہو تو اس کے مضر اثرات بہت کچھ رفع ہو سکتے ہیں۔

انہی وجوہ وانحطاط پر غور کرنے کیلئے یہ مضمون دعوت عمل ہے۔ میں محسوس کروں گا کہ اس مضمون کا مقصد پورا ہوگیا اگر ہمارے ملک کا کوئی ایک ہونہار فرد اس کی تحقیق اور دریافت میں اپنا کافی وقت صرف کرکے کسی عمدہ لائحہ عمل کو مرتب کر سکے تاہم فی الوقت جو مجوزات اس صنعت کے احیاء کے لئے میرے

ذہن میں ہیں ان کو مختصراً نفقرہ وار عرض کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایک صنعتی انجمن کا قیام جس میں نہ صرف صنعت گروں کو مناسب رقوم بطور قرضہ ایصال ہوا کریں بلکہ ان کے تیار کردہ مال کی فروخت بہ طریق فروخت بذریعہ امداد باہمی کی جائے۔

۲۔ سررشتہ جنگلات میں تحریک کرکے اس امر کی اجازت حاصل کی جائے کہ اندرون محصورہ پیدائش بہ اخذ حق سرکار ہوا کرے۔

۳۔ مال کی فروخت کو مقامی مانگ پر بالکلیہ منحصر نہ رکھا جائے بلکہ اس کو یہاں سے باہر بھجوایا جائے مثلاً یہ کہ حیدرآباد کاٹج انڈسٹریز کی طرف سے اس کی فروخت کا انتظام ہو۔ ایسی صورت میں ملز کے قیام کی وجہ جو مقامی رعایا میں اس کی مانگ کم ہوگئی ہے اس کی تلافی اس طریقہ پر ہوگی کہ حیدرآباد کے شوقین مزاج خواہشمند اس کو یقیناً سوت کے سستے کپڑے پر ترجیح دیں گے کہ ان کے نزدیک صرف کپڑے کی کم قیمتی ہی اس کی وجہ خرید نہیں بلکہ ذاتی شوق اور فیشن کو بھی اس میں بہت کچھ دخل ہوا کرتا ہے۔

۴۔ کپڑے میں کیڑا لگنے کا عیب اس طریقہ پر رفع ہوسکتا ہے کہ صناعوں کو کلف سے احتراز کی ترغیب دی جائے۔ نیز کپڑا ذخیرہ کرنے سے قبل ہمیشہ ابال کر اور سوکھا کر ذخیرہ کیا جائے۔

۵۔ سررشتہ صنعت وحرفت کے دارالتجربہ میں ٹسر کے (MERCERIZATION) مسئلہ پر تجربہ کیا جائے اور کامیابی کی صورت میں اس آسان طریقہ کی ترویج کی جائے۔

۶۔ عمدہ کیڑوں کی نسل بنگلور سے منگائی جاکر مروج کی جائے ان کی ترویج سے نہ صرف ریشم کی نوعیت بلکہ مقدار میں بھی اضافہ کی امید ہے۔

۷۔ ٹسر کے پیدائش کرنے والوں کی توہمات کو پروپگنڈا کے ذریعہ نکال دیا جائے ان توہمات کا نتیجہ یہ ہے کہ فی الوقت وہ دوران پیدائش میں مندرجہ ذیل تکلیف دہ امور کا پابند ہوا کرتا ہے۔

۱۔ دوران کاشت میں بالکلیہ جنگل ہی میں گذر اوقات کرنا۔

۲۔ کسی ناپاک شخص کا درختوں کے قریب سے گذر نہ ہونے دینا۔

۳۔ دوران کاشت میں کبھی سر کے بال نہ منڈوانا۔

۴۔ دوران پیدائش میں کبھی پلنگ پر نہ سونا۔

ان توہمات کی وجہ عام طور سے لوگ اس کی طرف راغب نہیں ہوتے کہ شکل پسندی فطرت انسانی کے مغائر ہے۔

۸۔ کپڑے میں مختلف رنگ دینا۔ فی الوقت صرف تین گز کا تسر دستیاب ہوسکتا ہے۔ ایک نرائی کا پھول۔ سرخ۔ اور سادہ سفید۔ یہ رنگ علی الترتیب پلاس کے پھول اور لاک سے مقامی طور پر تیار ہوتے ہیں اور پکے رنگ ہوتے ہیں یہ لحاظ اس کے یہ رنگنے کی صنعت بھی مقامی ہے اس کو جاری رکھنا ضروری ہے البتہ دیگر رنگ دینے کیلئے مختلف (ANILINE DYES.) کا استعمال کپڑے کی دیدہ زیبی کو بہت زیادہ کردیگا۔

مقامی طور پر رنگوں کی تیاری کے طریقے بھی نہایت دلچسپ ہیں اور ان کی کیمیا (CHEMESTRY.) بھی معلومات سے خالی نہیں بلکہ بخوف طوالت اور زیادہ فنی ہونیکی وجہ اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

عید قرباں

جناب ر۔ الف صاحبہ نسیم

کسی کی نذر کے قابل جو زندگی نہ رہی
ہماری عید میں اگلی سی وہ خوشی نہ رہی

ہے دل ملول تو نغمے کہاں سرور انگیز
شکستہ ساز میں کیسی صدائے فرحت خیز

یہ حکم تھا کہ اشاروں پہ جان ہو قرباں
ادھر ہو موت ادھر زندگی کے ہوں ساماں

دل گداز میں درد جگر کا درماں تھا
خلیل کیلئے آتشکدہ گلستاں تھا

اثر دعا میں مگر اب کہاں گداز نہیں
کہیں خلوص سے دست طلب دراز نہیں

اداس شام کے ہیں دل فگار نظارے
ہلال عید کے انکھوں کے اشک ہیں تارے

کاغذ سازی

(جناب عبد الباسط بیگ صاحب)

جب کوئی ملک متمدن ہو جاتا ہے تو وہاں طرح طرح کی صنعتیں جاری ہو جاتی ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی ملک کی تہذیب اور تمدن کا پتہ چلانا ہو تو وہاں کی صنعتوں کا حال معلوم کیا جائے۔ حیدرآباد کی تہذیب و معاشرت اس قدر ترقی یافتہ ہو چکی تھی کہ یہاں گوناگوں قسم کی صنعتیں جاری ہو گئیں ان میں کاغذ سازی کی بھی صنعت ہے جس کے صرف آثار باقی ہیں اس صنعت کی ابتداء مغلیہ دور حکومت میں ہوئی اور اورنگ زیب کے عہد میں اسے فروغ حاصل ہوا۔ غرض یہ ہمارے ملک کی قدیم صنعت ہے جسے نصف صدی قبل تک عروج حاصل رہا۔ لیکن جب مشین ساختہ کاغذ کی درآمد ہونے لگی تو جس طرح ہندوستان کی دوسری صنعتوں کو زوال ہوا۔ کاغذ سازی کی صنعت بھی تباہ ہو گئی (اس صنعت کے زوال کا ایک اور سبب یہ ہے کہ دھاتی کے قلم اور دیسی سیاہی کا رواج بھی متروک ہو گیا۔ مختلف اقسام کی روشنائیاں درآمد ہونے لگیں جو مشین ساختہ کاغذ کیلئے نہایت موزوں تھیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد کو مشین ساختہ کاغذ کی وجہ سے دوگونہ نقصان ہوا) اب دولت آباد۔ کورٹلہ اور گورد میں صرف چند گھرانے باقی رہ گئے ہیں جو اس فن سے واقف ہیں خواجہ نظام الدین صاحب نے اس کے متعلق تحقیق کر کے حسب ذیل اعداد فراہم کئے ہیں :۔

نام	کاغذ سازوں کی تعداد		سالانہ پیداوار کی قیمت	
	موجودہ	اگر طلب بڑھ جائے تو	موجودہ پیداوار	اگر طلب بڑھ جائے تو
کاغذی پورہ۔ اورنگ آباد	۱۵	۲۵	۲ سے ۲½ ہزار تک	۷۰۰۰
کورٹلہ ۔ کریمنگر	۲۵	۵۰	۳ سے ۴ ہزار تک	۱۵۰۰۰
گورد ۔ محبوب نگر	۳۲	۴۰	بیس ہزار تک	۲۵۰۰۰
جملہ	۷۲	۱۱۰	۲۷ سے ۲۹ ہزار تک	۴۷۰۰۰

لیکن ان دستکاروں کو کسی طرح کی امداد نہیں دیجا سکتی تاکہ وہ دوبارہ اس صنعت کو جاری کریں۔ کیونکہ موجودہ دور میں کوئی کاروبار مسابقت کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا اور مسابقت کیلئے پیدائیش بڑ پیمانہ کبیر لازمی ہے۔ ہمارے صناع دست کار ہیں اس لئے اگر اونہیں کسی طرح کی امداد بھی بہم پہنچائی جائے تو کامیابی حاصل ہونا دشوار ہے البتہ یہ صورت ممکن ہے کہ جدید پیمانہ پر اس صنعت کو حیدرآباد میں جاری کیا جائے اور قدیم صناعوں کو اس میں شرکت کا موقع دیا جائے۔ اس طریق عمل میں بظاہر یہ سہولت معلوم ہوتی ہے کہ ہمیں باہمارت مزدوروں کی (SKILLED LABOURS) کی بڑی تعداد کو درآمد کرنا نہیں پڑیگا اور ملک کے ایک بے روزگار اور مستحق طبقہ کیلئے کاروبار مل جائیگا۔

حیدرآباد میں مختلف صنعتوں کے قیام کی گنجائیش موجود ہے جس میں کاغذ سازی کی صنعت بھی شامل ہے خواجہ نظام الدین صاحب بی۔ ایس۔سی اے۔ یم۔ سی۔ ٹی مانچسٹر۔ گولڈ مڈلسٹ ہیر اکسپرٹ سرکار عالی نے ایک مکمل اور جامع رپورٹ پیش کی ہے جس کا خلاصہ اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے (گورنمنٹ کیمیکل لیبوریٹری میں آپ نے تجربہ کیلئے بانس سے مختلف قسم کا کاغذ تیار کیا جو کاٹیج انڈسٹریز اسٹور میں معمولی داموں پر فروخت کیا جاتا ہے) عہد عثمانی انقلاب کا ایک مبارک دور ہے اس عہد میں حیدرآباد میں بہت سی اصلاحیں ہوئیں۔ اور معاشی ترقی کیلئے بڑی گنجائیش پیدا ہوگئی ہے حکومت نے عام معاشی خوشحالی کی خاطر لاکھوں کے اخراجات برداشت کئے۔ بڑے بڑے اسکیم مرتب اور منظور ہوئے اور آئندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رہیگا۔ کاغذسازی کی اسکیم اس عہد میں معاشی ترقی کیلئے گویا ایک نئے راستہ کی تیاری ہے یقین ہے کہ بہت جلد اسے منظوری حاصل ہوسکیگی۔

بانس سے کاغذ تیار کرنے کیلئے سرپور یا منچریال (ضلع آصف آباد) نہایت موزوں مقامات ہیں جہاں کارخانہ قایم ہوسکتا ہے بانس کی کافی مقدار فراہم ہوسکتی ہے جس کا کیمیائی امتحان کیا جاچکا ہے۔ جاپان۔ چین۔ یا دوسرے علاقوں کے قطع نظر خود ہندوستان میں بانس سے کاغذ تیار کیا جارہا ہے۔

حکومت ہند نے برما اور ہندوستان میں بانس کی فراہمی اور کاغذسازی کے مسئلہ کے پیش نظر مختلف مواقع پر اس کی پیمائیش کرائی تاکہ اس مقصد کیلئے لکڑی درآمد نہ ہوا اور ہندوستان کا کاغذ برآمد کیا جاسکے۔

چونکہ مصنوعی سلک، کاغذسازی اور دوسری صنعتوں کے لئے لکڑی کی بے حد مانگ ہے ہندوستان کے محکمہ جنگلات کو اس کی رسد فراہم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ عنقریب لکڑی کی رسد محدود ہو کر اس صنعت پر اثر انداز ہوگی۔ حکومت ہند کے زیر غور مسئلہ کی اہمیت میں اس لئے بھی اضافہ ہوجاتا ہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تہذیب کی ترقی کی وجہ سے کاغذ کی مانگ بڑھتی جارہی ہے۔

ہندوستان میں اس کوشش کے باوجود کہ اس صنعت کو وسعت دی جائے صرف (۵۰) ہزار ٹن کاغذ تیار ہوتا ہے اور ایک لاکھ ٹن کاغذ (اخباروں کے کاغذ کے علاوہ) باہر سے درآمد ہوتا ہے اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ہندوستان میں فی الحال اعلیٰ قسم کا کاغذ تیار نہیں کیا جاسکتا تو بھی ۲۰ ہزار ٹن کاغذ ہندوستان میں بانس سے تیار ہوسکتا ہے اس لحاظ سے حیدرآباد میں (۵) ہزار ٹن سالانہ تیار ہوں تو آسانی سے اس کی نکاسی ہوسکتی ہے خام پیداوار کی ہمارے ملک میں اتنی کثرت ہے کہ ۱۰ ہزار ٹن کاغذ بہ آسانی تیار ہوسکتا ہے لیکن اس صورت میں بہت زیادہ سرمایہ درکار ہوگا۔ اس لئے اوسطاً (۵) ہزار ٹن سالانہ کے لئے اسکیم مرتب کیا گیا۔

عادل آباد ایک کارخانہ کے قیام کیلئے نہایت ہی موزوں مقام ہے اسلئے کہ بانس کے جنگل چونے اور کوئلہ کی کانیں، وادھا اور گوداوری کی وجہ پانی کی سہولت کے علاوہ ریلوے لائن (گرانڈ ٹرنک لائین) کی قربت مزید سہولت کا باعث ہے معمولی کاروبار کیلئے مزدور اطراف واکناف کی آبادیوں سے ملسکتے ہیں۔ البتہ مہارت طلب کاموں کے (SKILLED LABOUR) لئے مزدور تربیت یافتہ برطانوی ہند کے علاقہ سے درآمد کئے جاسکتے ہیں یہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ ہر نئی صنعت میں ابتداءً ایسا ہی ہوتا ہے تاوقتیکہ ملکیوں کو اس کا تجربہ حاصل نہ ہوجائے کسی کارخانہ کے قیام کیلئے مندرجہ بالا سہولتوں کے علاوہ اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے کہ مال کی نکاسی کیلئے قریب کی کسی مارکٹ میں گنجائش پیدا ہوسکتی ہے یا نہیں؟ بلا شبہ کوئی ایسا مارکٹ بہ حالت موجودہ نہیں ہے جو ساری پیداوار صرف کرسکے لیکن حیدرآباد کی ضروریات پوری کرنے کے بعد بقیہ پیداوار کے لئے وسطی مغربی اور جنوبی ہند کی مارکٹوں میں نہایت آسانی سے گنجائش پیدا کیجاسکتی ہے حیدرآباد میں ۴۲-۱۳۳۵ف اوسطاً (۱۵) سو سے (۱۶) سو ٹن کاغذ درآمد ہوا یعنی ہر سال اوسطاً (۶) لاکھ روپیہ کا کاغذ درآمد ہوتا ہے جس کی مندرجہ ذیل

اعداد سے وضاحت ہوگی۔

سنہ ۱۳۳۵ ف	۴۷۹۳۴۹	سنہ ۱۳۳۹ ف	۶۱۱۳۶۰
سنہ ۱۳۳۶ ف	۵۳۹۹۸۳	سنہ ۱۳۴۰ ف	۴۲۱۷۵۸
سنہ ۱۳۳۷ ف	۷۲۵۹۸۳	سنہ ۱۳۴۱ ف	۷۱۲۲۸۶
سنہ ۱۳۳۸ ف	۵۴۷۲۶۹	سنہ ۱۳۴۲ ف	۶۶۳۴۲۹

اگر ۵ ہزار ٹن سالانہ تیار ہوں تو حیدرآباد میں سات سو سے آٹھ سو ٹن تک فروخت ہو سکیگی اور بقیہ پیداوار، تامین صنعت کے سبب پانچ فیصد محصول معاف ہونیکی وجہہ سے باہر فروخت ہوگی۔ کارخانہ کے قیام کے لئے پچاس لاکھہ کے سرمایہ کا تخمینہ کیا گیا ہے جب حیدرآباد کو اتنی سہولتیں حاصل ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت اس اسکیم کو منظور نہ کرے۔ اس کارخانہ کے قیام سے اوّل تو جنگلات کی آمدنی میں ایک معقول اضافہ ہوگا دوسرے خود حکومت کو اپنی ضروریات کے لئے ارزاں داموں پر کاغذ مل سکیگا۔ اسی طرح ریلوے کی آمدنی میں بھی ایک معتدبہ اضافہ ہوگا۔

خام پیداوار کی رسد۔ کسی کاروبار کو وسیع پیمانہ پر انجام دینے کیلئے خام پیداواروں کی بروقت مطلوبہ مقدار کی فراہمی ناگزیر ہے ممالک محروسہ کے اضلاع آصف آباد۔ کریمنگر۔ اور ورنگل میں بڑے بڑے جنگل موجود ہیں جہاں بانس کی بکثرت پیداوار ہوتی ہے دوسرے اضلاع میں بھی اس کی پیداوار موجود ہے لیکن اتنی کثیر نہیں۔

ضلع آصف آباد کے شمال میں واردہا اور پین گنگا اور جنوبی سرحد پر گوداوری بہتا ہے محکمہ جنگلات نے اپنی سہولت کی خاطر اس جنگل کو آصف آباد اور نرمل دو حصوں میں تقسیم کیا ہے لیکن سارے ضلع میں ایک ہی قسم کا بانس اوگتا ہے ورنگل اور کریم نگر گوداوری کے جنوب میں واقع ہیں جس میں سے اول الذکر کے جنگل گوداوری کے (PARALLEL) ہیں ان دونوں اضلاع میں دو قسم کے بانس پائے جاتے ہیں۔ (I) BAMBWSA ARM (II) DENDROCALAMUS STRICTUS. LDENAGE A ۔ ان میں پہلی قسم جو سب سے اچھی قسم ہے آصف آباد میں بکثرت مہیا ہوسکتی ہے

جنگل کا رقبہ آصف آباد ڈویژن میں ۶۷۶ مربع میل اور نرمل ڈویژن میں ۲۷۰ مربع میل یعنی جملہ ۹۴۶ مربع میل ہے (مولا بخش صاحب نائب ناظم سررشتہ جنگلات نے اس پیمائش میں کافی حصہ لیا اور صحیح اعداد فراہم کئے)

کسی کارخانہ کی کامیابی کیلئے جنگل۔ ندی۔ ریل۔ چونہ۔ کوئلہ وغیرہ کی فراہمی کے سہولتوں کو پیش نظر رکھکر مقام کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ سرپور اور بیلّم پلی اس لحاظ سے غیر معمولی طور پر موزوں مقامات ہیں جو گرانڈ ٹرنک لائن (مدراس سے پشاور) پر واقع ہیں۔ مزدور اطراف و اکناف کی آبادیوں سے حاصل ہو سکتے ہیں بیلّم پلی کی آبادی میں گرانڈ ٹرنک لائن کی وجہ سے روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور سرپور پہلے ہی سے ایک مشہور مقام ہے۔

بانس کاٹنے کے اخراجات سرپور کے قریب جو جنگل واقع ہے اس کے دو قطعے قرار دئے جا سکتے ہیں۔ ۱۔ کاڈمبا KADAMBA (۲) گارلا پیٹھ۔ کاڈمبا کچھ غیر مسطح قطعہ ہے اور گارلا پیٹھ سرپور کے مغرب میں واقع ہے (۵) ہزار ٹن کاغذ تیار کرنے کے لئے تقریباً (۱۲۵۰۰) ٹن بانس درکار ہوتا ہے۔ جن کی فراہمی میں کسی قسم کی دشواری نہیں بلکہ اس صنعت کو وسعت ہو جائے تو بھی حسب ضرورت رسد کی فراہمی ممکن ہو سکتی ہے۔

بانس کاٹنے کے اخراجات اور بنڈی کے رستہ تک پہنچانے کے مصارف تقریباً ۱۰/ فی سو بانس ہونگے (ایک ٹن میں ۳۱۲ سے ۳۲۰ تک بانس ہوتا ہے) قطعہ کاڈمبا KADAMBA بنڈیوں میں کارخانہ تک پہنچانے کے لئے سرکاری مقررہ نرخ (۲/) فی میل ہے۔ ایک ٹن بانس کیلئے بحساب (۸۰) بانس فی بنڈی چار بنڈیاں درکار ہوں گی اس طرح سے سرپور پہنچنے تک جملہ ۱۴/ فی ٹن کا صرفہ ہوگا (بانس کاٹنے کے لئے فی ٹن ۱۲/ + بنڈی کا کرایہ اگر غیر معمولی رعایت ہو تو بھی بڑے جملہ ۱۲/) گارلا پیٹھ کے اخراجات نسبتاً زیادہ ہوں گے یعنی بانس کی اجرت عام رعایت کے ساتھ اور بنڈی کے اخراجات ۱۴/ جملہ ۲/ فی ٹن بانس کیلئے۔

اخراجات کے سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ (۱) ایک طویل عرصہ تک

اوّل الذکر قطعہ ہی سے استفادہ کیا جا سکیگا اور وقتاً فوقتاً گارلا پیٹھ کے قطعہ سے مدد لیجائیگی (۲) اگر سرپور تک دس میل کی ایک پختہ سڑک تعمیر ہو جائے تو موٹر لاریوں کے ذریعہ نقل و حمل کی سہولت ہو جائیگی اور اس صورت میں اخراجات بہت کم ہو جائینگے۔

آب رسانی } خام پیداوار کے سلسلہ میں آب رسانی کا ذکر کچھ بے موقع سا معلوم ہوتا ہے لیکن کارخانہ کے قیام کے سلسلہ میں دیگر امور کی طرح اسے بھی اہمیت حاصل ہے۔ کارخانہ کی ضروریات کے علاوہ مقامی آبادی کی ضروریات کے لئے تقریباً (۲۰ ۶) لاکھ گیلن سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ سرپور میں باؤلیوں کے ذریعہ سے مطلوبہ مقدار آب حاصل کرنا دشوار نہیں لیکن اگر یہ صورت ممکن نہ ہو تو وارد ہا ندی سے جو صرف دو میل پر واقع ہے نلوں کے ذریعہ پانی کا انتظام کیا جا سکتا ہے یہ بھی ایک ممکن صورت ہے کہ فیکٹری کی موجودہ منتخب شدہ مقام سے سرپور اسٹیشن کی طرف ایک میل ہٹا یا جائے تو کارخانہ وارد ہا ندی اور اسٹیشن کے قریب ہو جائیگا۔

مینچر یال میں کارخانہ کے قیام کے لئے جو مقام موزوں ہوسکتا ہے وہ گوداوری سے ایک میل کے فاصلہ پر اس سے صرف پچاس فٹ کی بلندی پر واقع ہے اس لئے گوداوری سے پمپ سے پانی حاصل کرنے میں کوئی بڑی رکاوٹ یا دشواری نہ ہوگی۔

ایک ٹن کاغذ کی تیاری کے لئے تقریباً (۵ ۱/۲) ٹن کوئلہ صرف ہوتا ہے اسی لئے جس طرح کارخانہ کا قیام جنگل کے قریب بانس کے فراہمی کے لئے ہونا چاہئے اسی طرح کوئلہ کی کان کی قربت نہایت ضروری ہے۔ مینچریال، سنگرینی کی معدن سے صرف گیارہ میل اور سرپور (۴۳) میل پر واقع ہے۔ سرپور کے لئے ایک اور سہولت یہ ہے کہ بلہار شاہ کی معدن سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر سنگرینی کی معدن سے کوئلہ حاصل کیا جائے تو سرپور تک للعہ ۱۵/۱۱ اور مینچریال تک ۱۲/۹ لے فی ٹن صرف ہوں گے جب سنگرینی کمپنی سے معاہدہ ہو جائیگا تو چونکہ کارخانہ کوئلہ کی ایک بڑی مقدار ہر سال خرید یگا ان موجودہ نرخوں میں بھی کمی ہو جائیگی لیکن اگر یہ کمی نہ ہوسکے تو بھی کرایہ ریل اور بار برداری کے اخراجات شامل کرکے فی ٹن کوئلہ کی قیمت سرپور کے لئے (۴/ لے) اور مینچریال کے لئے (۴/ معہ) ہوگی۔

چونہ } بانس کو گلانے (DIGEST.) کے لئے MR, RAITT. کے ملفیت والے

طریقہ کی وجہ ایک ٹن کاغذ کی تیاری کے واسطے سات سو پونڈ چونہ اور (۳۸۰) پونڈ سوڈیم سلفیٹ کی ضرورت ہوگی۔ راماگندم کے مقام پر جو منچریال سے صرف سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جہاں ایسے کنکر دریافت کئے گئے جن میں مطلوبہ کیمیائی اجزا موجود ہیں ان کا سرکاری طور پر امتحان کرایا گیا تو خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔

مزدوروں اور بنڈیوں کی فراہمی } کسی کاروبار کے لئے مزدوروں کی رسد کا سوال بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ۵ ہزار ٹن کاغذ کیلئے سالانہ ۴ ملین بانس (یعنی ۱۲۵۰۰ ٹن) کی ضرورت ہوگی۔ ایک آدمی روزآنہ اوسطاً پچاس بانس کاٹ سکتا ہے اور ہر بنڈی میں (۸۰) یا اگر غیر معمولی رعایت کی جائے تو ساٹھ بانس اٹھائے جاسکیں گے۔

اس علاقہ میں زراعت صرف دو فصلوں پر مشتمل ہے (۱) خریف (۲) ربیع۔ یعنی صرف خشکی کی کاشت ہوتی ہے اور کاشتکاروں کی مصروفیت سال میں پانچ مہینے سے زیادہ نہیں (اور یہ زرعی کاروبار کی ایک عام خصوصیت ہے) پھر پلو ضعیفین تو باقی نہیں رہیں کہ زرعی کاروبار کے بعد سال کے بقیہ ایام اس میں صرف کریں بلکہ وہ بالکل بیکار رہتے ہیں اور انہیں کسی کاروبار کی تلاش رہتی ہے بحالت موجودہ اگر مذکرہ تعداد کے نصف مزدور بھی حاصل ہو جائیں تو کافی سے زیادہ ہوں گے۔ اطراف واکناف کے بعض لوگ اس قدر مفلس ہیں کہ زرعی پیداوار صرف کرنے کے بعد جڑی بوٹی کھاکر اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ بنڈیوں کی کم سے کم تعداد کا تخمینہ (۱۸۷۹) ہے اور یہ مطلوبہ تعداد سے نوگنا زیادہ ہے۔

رائلٹی } رائلٹی کا مسئلہ اہم اور پیچیدہ ہے حکومت، رائلٹی اسی شرح پر وصول کرسکتی ہے جس پر کہ محکمہ جنگلات بانس فروخت کرتا ہے (جب KADAMBA RESERVE کے باہر بانس کا ہراج ہوا تو معمولی قیمت وصول ہوئی اور گتہ داروں نے عدم طلب کی وجہ سے بانس کاٹنے کی بھی پروا نہیں کی تقریباً آٹھ سال قبل اسی قطعہ میں ہراج ہوا تو ۸۴۰ بیگڑ کے لئے (۵۸۵۰) روپیے قیمت تخمیناً سات روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے وصول ہوئی اور یہ قیمت اب تک ایک ریکارڈ ہے اس کے بعد بتدریج کمی ہوتی گئی حتی کہ عہ فی بیگڑ تک قیمت گر گئی) مقامی ضروریات کی تکمیل کے بعد کچھ بانس حیدرآباد اور سکندرآباد روانہ کیا جاتا ہے

اور یہ مطلب قابل لحاظ نہیں ہے ایسی حالت میں اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ محکمہ جنگلات نے گویا بانس کے جنگل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنے کی خاطر کاغذ سازی کی صنعت کو رائج کیا تو رائلٹی (للعہ ۳ر۸م) مقرر ہونی چاہئیے اور فی ٹن تیار شدہ کاغذ پر (عہ ۹ر)۔ لیکن مارکٹ کے موجودہ حالات کے لحاظ سے رائلٹی کا اس طرح معین کرنا دشوار ہے اس لئے اگر منافع کے حساب سے رائلٹی کا کوئی تعین کیا جائے تو قابل قبول ہوسکتا ہے یعنی جملہ آمدنی سے مصارف پیدائش، مصارف خطر۔ اور سرمایہ کا سود وضع کرنے کے بعد ۱۲½ فیصد کا نرخ واجبی معلوم ہوتا ہے۔

کسی کاروبار میں ابتداد ہی سے منافع نہیں حاصل ہوتا۔ بلکہ قدم جمانے کے لئے دو چار سال کی مہلت درکار ہوتی ہے بہ الفاظ دیگر کارخانہ کے قیام سے ہی کسی کاروبار میں محاصل ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے ابتداءً برائے نام محصول عائد کرکے اس میں تدریجی اضافہ کیا جاتا ہے اور چند ہی سال بعد جب کاروبار کی کامیابی کے خطرات میں کمی ہو جاتی ہے تو مقررہ نرخ کے مطابق محاصل وصول کئے جاتے ہیں جس کا سلسلہ معاہدہ کے اختتام تک عموماً اسی مقررہ نرخ پر قائم رہتا ہے۔

سرمایہ۔ مصارف پیدائش اور منافع (۵) ہزار ٹن کاغذ تیار کرنے کے لئے (۵۰) لاکھ کے سرمایہ کا تخمینہ کیا گیا ہے جس میں مشینوں کی خریدی، اس کا محصول، باربرداری، مکانات کی تعمیر وغیرہ کے لئے چالیس لاکھ، ابتدائی اخراجات کے لئے تین لاکھ اور کاروبار کے لئے سات لاکھ شامل ہیں۔

خام پیداوار کی فراہمی، مزدوروں کی اجرت، انتظامی مصارف، مطالبات خطر، اور مارکٹ تک مال پہنچانے کے اخراجات شامل کئے جائیں تو جملہ مصارف تقریباً (۱۰) لاکھ (۴۰) ہزار ہوں گے مارکٹ کی قیمت اوسطاً (۲۵) لاکھ ہے۔ اس لحاظ سے (۶) لاکھ (۰۰) ہزار کا منافع ہوگا۔ اس منافع سے اگر سرکاری محاصل (رائلٹی) اور سرمایہ کا سود وضع کیا جائے تو خالص منافع (۲۸۶۲۵۰) ہوگا۔

اس رپورٹ میں اس امر کی تفصیل نہیں ہے کہ یہ سرمایہ کس طرح جمع کیا جائیگا۔ ہماری حکومت کا سرمایہ کتنا ہوگا۔ اور پبلک سے حصص کی صورت میں کس قدر رقم جمع ہوسکیگی۔ بہرحال ہمیں یقین ہے کہ حیدرآباد

ہی سے جملہ سرمایہ فراہم کیا جائیگا۔ تاکہ ہمارا ملک اس صنعت سے پورے طور پر مستفید ہوسکے۔

حیدرآباد میں کاغذ سازی کی صنعت کے قیام کی گنجائش کا اس مختصر مضمون سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ کسی ملک میں صنعتوں کی ترقی ملک کی عام خوشحالی کے مترادف ہے اور اگر کوئی صنعت وسیع پیمانہ پر قائم کی جائے تو اس سے گوناگوں فوائد حاصل ہوتے ہیں یعنی اس صنعت سے نہ صرف براہ راست وہی لوگ مستفید ہوسکتے ہیں جن کا سرمایہ مشغول ہے۔ بلکہ مزدوروں کی کثیر آبادی کے اضافہ کی وجہ سے تجارتی ترقی، تجارت کی ترقی کے باعث حمل و نقل کے انتظامات غرض کئی ایسے ذیلی شعبے ہیں جو ایک صنعت کی وجہ سے مستفید ہوتے ہیں اور ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری حکومت اس اسکیم پر غور کرکے جلد از جلد اس صنعت کے قیام کے متعلق تدابیر اختیار کریگی ۔

تبصرہ!!

نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ بیت الفضل متصل ڈاکخانہ گوڑہ ڈسٹرکٹ حیدرآباد دکن نے اپنی دو کتابیں ذکر نبی صلعم۔ مکتوبات امجد بھیجی ہیں اول الذکر میں حضرت رسول کریم صلعم کے حالات مبارک نہایت مختصر اور دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں کہ پڑھنے والا جوں جوں پڑھتا جائے دل پر نقش ہوتے چلے جاتے ہیں ایسی مختصر تالیفوں کی اسی ضرورت ہے کہ ہم نئی روشنی میں آگے بڑھنے والے پیچھے ہٹتے چلے جائیں تو ہمارا مقصد حیات پورا ہو جائیگا۔ مولف لائق ستائش ہیں کہ بگڑی کے سنوارنے کا خیال دامنگیر ہے۔ لکھوائی چھپوائی کاغذ اچھا ہے قیمت غیر مجلد ۱۲ ار مجلد عہ

مکتوبات امجد۔ ۹۵ صفحہ کا مختصر مجموعہ ہے جس میں مولانا امجد کے خطوط جمع کئے گئے ہیں جس طرح مولانا اس وقت رباعیوں کے بادشاہ ہیں اوسی طرح نثر میں بھی وہی روحانی غذا کا سامان فراہم کیا گیا ہے اگرچہ خطوط مختصر ہیں کہ قاری العطش کی صدائیں لگاتا جاتا ہے مگر لذت اور شیرینی اپنا وہی اثر دکھاتے ہیں جو شہد کی بوتل میں ہوتا ہے۔ نواب جیون یار جنگ بہادر رکن ہائیکورٹ کا مختصر پیش لفظ ہے۔ قیمت ۸ ر

حیدرآباد کی قدیم صنعتیں

(جناب ہادی جعفرای)

ہندوستان کی جغرافیائی اور معدنی حالات کا غائر نظر سے مطالعہ کیجئے آپ کو حیدرآباد کی طرح کوئی ریاست ایسی نظر نہ آئیگی جس میں الماس سے لیکر کوئلہ تک کے معادن پائے جاتے ہوں قطب شاہی حکومت کے زمانہ میں گولکنڈہ کے الماس کی دہوم تمام متمدن دنیا میں مچی ہوئی تھی - یورپ تک ان کی مانگ تھی وہ مشہور اور تاریخی الماس جس کو ہم کوہ نور کہتے ہیں جو اس وقت تاج برطانیہ کو جگمگا رہا ہے اسی قلم کا ہے اس طرح یہاں کے لوہے کی بھی شہرت تھی اور وہ سوئیڈن کے لوہے سے بھی عمدہ خیال کیا جاتا تھا -

اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب نے حیدرآباد کے معادن پر اثر کرنا شروع کیا -

کوئی ملک بھی اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک صنعت وحرفت کی جانب توجہ نہ کی جائے جس ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں صنعت ہوگی وہ ملک میں دولت کے انبار جمع کرسکتے ہیں - صرف اعلیٰ پیداوار ملک کو ترقی پر نہیں پہنچا سکتی زراعت کے ساتھ صنعت کا ہونا بھی لازمی ہے - دکن بھی مثل دیگر بلاد ہندوستان کے قدیم سے پیداوار کی طرح صنعت وحرفت میں بھی مشہور تھا - تقریباً دیڑھ صدی سے شہرت کم ہی نہیں بلکہ زوال پذیر ہوگئی ہے -

متمدن انسانوں کو ہر زمانہ میں اشیاء مایحتاج کی ضرورت پیش آتی رہی ہے جس ملک و قوم میں تہذیب و تمدن کے صحیح اصول پر گرم بازاری رہا کرتی ہے تو وہ ملک اپنے اشیاء مایحتاج خود تیار کرلیتا ہے دکن کم ازکم دو ہزار سال سے اعلیٰ ترین تمدن کی روشنی سے جگمگا تا رہا - اور باشندگان ملک نے ہر قسم کے ہنر و دستکاری کو ترقی دی - متعدد مرتبہ ہندو اور مسلمانوں نے اس کو اپنے قبضہ اقتدار میں لایا - بعض دفعہ یہ قومیں لوٹ مار کرکے چلی جاتی تھیں جس سے ملک کو کچھ خفیف سا نقصان ہوتا تھا پھر مثل سابق کے ملک اپنے کاروبار میں مصروف ہوجاتا تھا اور بعض دفعہ فاتحوں نے اس کو اپنا بنالیا - فاتح نے مفتوح کے ساتھ مل کر نئی نئی صنعتیں ایجاد کیں -

اور پرانے صنعتوں کو ترقی دیجانے لگی ہندو اور مسلمان کے حملوں میں صرف فرق اتنا تھا کہ جب ہندو فاتح ہوتے تو ہندوانی طرز کی اشیاء کو ترقی دی جاتی اور مسلمانوں کے وقت اسلامی طرز کی اشیاء کے طرف توجہ مبذول کیجاتی۔ بہمنی و قطب شاہی دور میں بہت ترقی ہوئی۔ قطب شاہیوں کے اختتام کے ساتھ ہی ساتھ زوال شروع ہو گیا۔ زوال کی وجہ یہ ہے کہ اٹھارویں صدی تک مغربی اقوام کا تجارتی و حرفتی تعلق دکن سے قائم تھا۔ انیسویں صدی سے اہل یورپ نے اسٹیم و الکٹرسٹی کو اپنا غلام بنایا اس کی مدد سے مصنوعات تیار کرنے لگے۔ وقت۔ فاصلہ و محنت کی دشواریوں سے نجات ملی اور ان سب سے زیادہ وہ بدیسی اشیاء کے استعمال سے پرہیز ہونے لگا اور ان کی عادت سے بھی ملکی صنعت کو ترقی دینے میں تکملہ مدد دی۔ بیرونی اشیاء پر گراں ترین ٹکس لگائے گئے خام اشیاء ہندوستان اور امریکہ وغیرہ سے آنے لگیں اور ان سے جو چیزیں تیار ہوئیں ان کو گراں قیمت پر فروخت کیا جانے لگا اور مشترکہ سرمایہ سے کئی کارخانے قائم ہوئے غرض مغرب کی مصنوعات مشرق میں آنے لگیں۔ دیگر ممالک مشرق کی طرح دکن پر بھی اس کا اثر پڑا۔ انیسویں صدی میں ہماری گورنمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک تجارتی معاہدہ کیا جو فری ٹریڈ کے اصول پر مبنی تھا ہم میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ اس معاہدہ سے فائدہ اٹھاتے رہیں بلکہ اس کے نتائج و ثمرات ہی پر غور کرتے مگر دوسرے فریق نے معاہدہ سے پورا پورا فائدہ حاصل کیا کمپنی سے ارزاں اور خوشنما سامان آنے لگا۔ یہ لازمی ہے کہ بازار میں وہی چیز زیادہ فروخت ہوگی جو خوشنما اور ارزاں ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اس کے لئے کافی گنجائش نکلنے لگی۔

صنعتی تنزل کا ایک بڑا سبب فیشن کی تبدیلی بھی ہے جب ہم ایک چیز استعمال کرتے کرتے اس کو چھوڑ کر دوسری چیز استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے اس چیز کی وقعت اگر کم ہو جائے تو اس کی صنعت کو زوال ہوگا اور رفتہ رفتہ وہ بالکل مٹ جائیگی۔ حیدرآباد میں انگریز نما دیسی بننے کا شوق کچھ ایسا پیدا ہوا کہ اونہوں نے اپنی طرز معاشرت، اپنا لباس، مکان۔ فرنیچر غرض ہر چیز میں مغرب کی تقلید کرنی شروع کی۔ اور اس فیشن ایبل دائرہ میں دیسی اشیاء کا استعمال حماقت سے تعبیر کیا جانے لگا صنعت و حرفت کو زوال سے بچانے کے لئے ضرورت تھی کہ ایسے اصول تعلیم کے جاتے جنھوں نے یورپ کو یورپ بنا دیا۔ چاہئے تھا صنعتی تعلیم

خصوصیت کے ساتھ رائج کیجاتی۔ تجارت کا طریقہ اور حبّ وطن کا جذبہ دلوں میں پیدا کیا جاتا مگر افسوس ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہوا غرض ملک کی صنعت تباہ ہوتی رہی لیکن نسیم عثمانی کی صنعت پرورانہ فضاؤں نے ان مردہ صنعتوں میں از سر نو جان ڈال دی ہے کیونکہ ذمہ داران تعلیم اس وقت نہایت گہری نظر سے صنعت و حرفت پر غور کر رہی ہیں مستقبل میں مردہ صنعتیں پھر زندہ ہو جائینگی۔

چنانچہ سلور جوبلی کے موقع پر محکمہ صنعت و حرفت کی نگرانی میں ایک نمائش قایم کیجا رہی ہے جس میں ملک کی تمام صنعتیں رہینگی اور لوگوں کو معلوم ہو جائیگا کہ حیدرآباد میں کیسی کیسی صنعتیں موجود ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا جب کہ دکن کی تیار شدہ اشیاء یورپ کی تیار شدہ چیزوں سے مقابلہ کرتی تھیں مگر اب وہی اشیا ہندوستان کے دیگر مقامات کی تیار شدہ اشیاء کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ان کا باہر جا کر فروخت ہونا تو ایک طرف وہ خود حیدرآباد میں بھی فروخت نہیں ہوتیں۔ بنارس۔ مدراس۔ کانپور۔ کلکتہ۔ کشمیر وغیرہ کا تیار شدہ مال حیدرآباد میں اس کثرت سے فروخت ہوتا ہے کہ اس کے مقابل میں ممالک محروسہ کے دستکاریوں کی فروخت کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

جب ہم ان کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مقامات مذکورہ میں گورنمنٹ کی توجہات کی بدولت صنعتوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے کارخانہ قایم ہیں۔ بیشتر مشترکہ سرمایہ سے چلتے ہیں۔ سامان بڑی مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔ کل ہندوستان میں ان کی ایجنسیاں قایم ہیں۔ فہرستوں اور اشتہارات کی اشاعت کثرت سے ہوتی ہے یورپ اور امریکہ اور ہندوستان کی نمائشوں میں ان کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ہاں پہلے تو کوئی بڑے کارخانے ہی نہیں اور جو ہیں بھی وہ چھوٹے اور معمولی ہیں اکثر جگہ خود کاریگر مال تیار کرتے ہیں جب تک فرمائش نہ کی جائے اور کچھ قیمت پیشگی نہ دی جائے مال تیار نہیں ہوتا اور حیدرآباد کے باہر بمشکل روانہ کیا جاتا ہے ایسی صورتوں میں مصنوعات ملک کی ترقی کس طرح ممکن ہے۔ ذیل کے حالات حیدرآباد کی قدیم صنعتوں پر کافی روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ارض دکن میں کیسی کیسی صنعتیں موجود تھیں۔

اشیائے فلزات

زیورات اور طلائی و نقرئی تیلی برتن } ہر زمانہ میں حیدرآباد کے ہر قصبے میں زرگر بکثرت موجود تھے جو جڑاؤ

طلائی۔ نقرئی جمع زیور اور برتن جو ہندوستان میں مستعمل ہوتے ہیں تیار کرتے تھے ان کی موجودگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ہر تمدن ملک میں تمول طبقہ ہمیشہ زیورات طلائی و نقرئی بکثرت استعمال کرتا ہے اور دولت کی حفاظت و بقاء کا طریقہ اسی کو سمجھتا ہے اس علم اور نظریوں سے حیدرآباد دکن مستثنیٰ نہیں ہے اور اسی وجہ سے یہاں زمانہ قدیم میں بہت ترقی کی بڑے بڑے قصبوں اور اضلاع میں ہوشیار کاریگر موجود تھے جو عمدہ کام کرتے تھے خصوصیت کے ساتھ حیدرآباد۔ اورنگ آباد۔ کریمنگر اس کام کیلئے بہت مشہور ہیں کسی زمانہ میں گولکنڈہ۔ ورنگل۔ گلبرگہ بیدر میں جو دارالحکومت ہونیکی وجہ سے مشہور تھے مگر اب ان کی شہرت ختم ہو گئی کاریگر فنا ہو گئے

ہر قسم کا طلائی و نقرئی سامان سادہ و مینا کار مثل پلنگ۔ پاندان عطردان حقہ۔ صراحی ہتھیار کے قبضے وغیرہ بہت عمدہ تیار ہوتے تھے۔ اورنگ آباد زیورات کے علاوہ چاندی کے تار کے کام اور سوہن کاری میں مشہور تھا بگلوس حقہ۔ پاندان وغیرہ نہایت خوبصورت تیار ہوتے تھے اور حیدرآباد میں بکثرت فروخت ہوتے تھے۔

کریمنگر میں تار کا کام نہایت باریک اور نفیس ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے مگر پہلے کی طرح نہیں ہے صرف دو چار قدیم خاندان ہی ہیں جو ایسا نفیس کام کرتے ہیں۔

جب ملک میں ہر قسم ہر وضع کے اشیاء تیار ہو سکتے تھے تو چاہئے تھا کہ امراء و معززین شہر اس صنعت کو اپنی سرپرستی سے اور ترقی دیتے مگر افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے امراء اپنے محلوں کی زینت۔ کلکتہ۔ مدراس بمبئی اور یورپ کے تیار شدہ مال میں سمجھتے ہیں اگر ان سے اس کا سبب پوچھا جائے تو جواب ملیگا کہ مال وقت پر تیار نہیں ملتا اور پھر کاریگروں کو تنخواہ دینے کی تکلیف الگ گوارا کرنی پڑتی ہے اس کے بجائے ہم کیوں نہ بنی بنائی چیز خریدیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ گاہک مال تلاش نہیں کرتا بلکہ مال گاہک کو ڈھونڈھتا ہے حیدرآباد میں بمبئی۔ مدراس کلکتہ کی طرح بڑی بڑی شاندار دکانیں نہیں ہیں اگر ہم حیدرآباد میں بڑی بڑی دکانیں قائم کریں جس میں ہمارے ہی ملک کی صنعتیں ہوں اور پھر ہمارے امراکو بیرونی مصنوعات کی سرپرستی کرنیکی ضرورت نہ ہوگی۔

ہندوستان اور دکن میں پیتل ۔ تانبے کے گھڑے ۔ تھالیاں ۔ رکابیاں ۔ لوٹے ۔ کٹورے وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے اس لئے اکثر مقامات پر تیار کئے جاتے تھے مگر اب چونکہ جرمنی ۔ جاپان وغیرہ کے سستے مال نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے یہ صنعت بھی تقریباً معدوم ہوگئی ۔ ننگم پیٹھ میں علاوہ دیگر اشیاء کے حقہ ۔ چلم ۔ سماور بہت عمدہ بنتے تھے ۔ مدکھیڑ میں پیتل کی شمعیں اچھی تیار ہوتی تھیں ۔

اشیائے آہنی } ورنگل ' آصف آباد ' کریمنگر ' بیدر ' وغیرہ میں جہاں لوہے کے معدن ہیں ۔ لوہا گلایا جاتا تھا ۔ مگر اب ولایتی لوہے کی درآمد کی وجہ سے ترک کر دیا گیا ہے ۔ قدیم زمانہ میں گاؤں کے لوہار آلات کاشتکاری ۔ معماری ۔ اور اشیائے خانہ داری وغیرہ تیار کرتے تھے ۔ مثل ہل ۔ پھوڑے ۔ گھڑے ۔ ہنڈیوں کے پٹے وغیرہ ۔ ولایتی اشیاء نے ملکی آہنی سامان پر بھی اثر ڈالا ۔ اس لئے روز بروز تنزل ہوتا گیا ۔ اورنگ آباد میں لوہے پر چاندی کے تاروں کو جڑ کر بیل بوٹے بنائے جاتے تھے ۔ زیادہ تر یہ کام تلوار قبضوں اور بگلوسوں پر ہوا کرتا تھا ملک میں ابھی اچھے کاریگر موجود ہیں جو ہاتھ سے ایسا کام کر سکتے ہیں جو کلوں کے کام کا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اپنی کتاب " دولت آصفیہ " میں لکھتے ہیں " جاترائے جڑ کل (ضلع ورنگل) میں انگلیند کسی لوہار نے ایک بیکل پیش کی تھی جو بخوبی کام دے سکتی تھی اور اسی کی تیار کردہ تھی " ہمارے ہاتھ سے کام کرنیوالے لوہار یورپ کے سحر نما اور عظیم الشان کلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے انہیں شکست ہوئی ۔ اور صنعت مٹنے لگی ۔

اشیائے فولادی } نرمل ۔ ابراہیم پٹن ۔ یلغرپ ۔ وغیرہ زمانہ قدیم سے لوہے کے معادن کی وجہ سے بہت مشہور ہیں ان سب سے زیادہ مشہور مقام کنا سمندرم (تعلقہ آرمور ضلع نظام آباد) تھا جس کی دھوم دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی ۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانیوں نے متعدد مرتبہ کوشش کی کہ کنا سمندرم کے فولاد سے اچھا فولاد تیار کریں مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی ۔ قدیم دمشقی تلواریں اسی لوہے سے تیار کی جاتی تھیں ۔ یورپ کی کلوں اور اٹھارویں صدی کی شورشوں نے نہ صرف اس صنعت کو تباہ کر دیا بلکہ ہنرمند کاریگروں کو تنگ دنا کر دیا ۔ ہتھیاروں کا استعمال کم ہو جانے سے اس صنعت کو اور بھی زوال ہوا ۔ فولاد سے جو ہتھیار تیار ہوا کرتے تھے ان سب کا اجمالی بیان حسب ذیل ہے ۔

ہتھیار } ڈیڑھ صدی بلکہ ستر اسی سال قبل تک ممالک محروسہ کے اکثر مقامات پر ہتھیار بنائے جاتے تھے

حیدرآباد۔ گدوال۔ کھم۔ اورنگ آباد۔ بیدر۔ ونپرتی۔ ورنگل وغیرہ بہت مشہور مقامات تھے۔ لاکھوں روپئے کا مال تیار ہوتا تھا اور ہاتھوں ہاتھوں فروخت ہوجاتا تھا۔ کیونکہ رعایا ہتھیار بند ہوتی تھی اور باہر بھی فروخت کیلئے روانہ کیا جاتا تھا۔ ملک میں امن وامان قایم رکھنے کیلئے رعایا سے ہتھیار لئے گئے تھے اور قانون اسلحہ جاری کیا گیا اس لئے بتدریج ملک سے ہتھیاروں کا استعمال موقوف ہوگیا۔ اگرچہ اب بھی بعض عمدہ کاریگر موجود ہیں یا تو انہوں نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا یا اب صرف چاقو۔ قینچی۔ سروتے۔ بنانے لگے یا ہتھیاروں کو صاف کرنے اور باڑ دیتے ہیں شاید ہی اب کوئی مقام ایسا ہوگا جہاں نئے ہتھیار تیار ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ مروج ہتھیار جو بکثرت تیار کیا جاتا تھا وہ تلوار تھی اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ پانچ سے لیکر پانچ ہزار روپیہ تک ان کی قیمت ہوا کرتی ہے عموماً اچھی اور قیمتی تلواریں کنا سمندرم کے فولاد سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

عباسی۔ ایرانی وضع کی تلوار ہے۔ بالکل ایرانی تلوار کے مشابہ ہوتی ہے۔ سیدھی اور چوڑی ہوتی ہے۔ مغل زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

فرنگ۔ یورپ کے قدیم تلواروں کے وضع کی ہوتی ہے۔ بہت وزنی اور چوڑی ہوتی ہے اسکا استعمال پھیکت اور تلوار کے جاننے والے کرتے ہیں۔

دھوپ۔ بہت عمدہ فولاد سے تیار ہوتی ہے دھار بہت تیز اور چوڑی ہوتی ہے ہلکی بھی ہوتی ہے امراء ومعززین استعمال کرتے ہیں۔

سردہی۔ ہلکی اور خمدار تلوار۔ جگدیو پور میں تیار ہوا کرتی تھی۔ اکثر راٹھور استعمال کرتے تھے۔

جوہردار۔ یہ کنا سمندرم کے فولاد سے تیار ہوا کرتی تھی اور سب سے زیادہ قیمتی ہوتی تھی۔

سیلابہ۔ یہ عرب شام کی بنی ہوئی تلوار ہے جس کو عرب اپنے ساتھ لائے تھے۔ دکن والوں نے اس کی نقل اتاری ہے۔ کنا سمندرم کے فولاد سے بنتی ہے اور اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہے اور بڑی قیمت سے فروخت ہوتی ہے۔

پیش قبض۔ روہیلوں کا ہتھیار ہے ایک قسم کا خنجر ہے جس کا پھل ایک فٹ طویل ہوتا ہے۔ دھار ایک ہی

رہتی ہے۔ قیمت دس (روپئے) سے پچاس (روپئے) تک ہوتی ہے۔

کٹار۔ پٹھانوں کا ہتھیار ہے دو دھار ہوتی ہیں۔ پھل سولہ انچ سے ایک فٹ تک طویل اور دو تین انچ تک عریض ہوتا ہے قیمت پانچ سے پندرہ تک ہوتی ہے۔

قروکی۔ ایک چھوٹا ہتھیار ہے جو پانچ انچ طویل ہوتا ہے۔

بچھوا۔ چھ انچ لانبا ہوتا ہے۔

گپتی۔ برچھا۔ بھالا۔ تیر۔ علم تیر و کمان۔ زرہ بکتر وغیرہ بھی تیار ہوتے تھے۔

حیدرآباد کے وہ مقامات میں جہاں پہلے جنگ و جدل ہوتی تھی اور جو مستقر سلطنت تھے۔ بندوقیں اور توپیں تیار کیجاتی تھیں مثلاً حیدرآباد۔ گلبرگہ۔ بیدر۔ اورنگ آباد وغیرہ۔ ان کے بنانے میں یورپ کے کاریگروں سے مدد لیجاتی تھی مگر اب یہ موقوف ہوگیا ہے زمانہ قدیم کی توپیں جواب بھی ہمارے دیران قلعوں میں (بیدر۔ دولت آباد۔ گولکنڈہ وغیرہ میں) رکھی ہوئی ہیں دیکھنے والے کو تحیر کرتی ہیں۔

نمائش گاہ شکاگو میں پیش کرنے کیلئے ایک یوروپین کمپنی نے ہزاروں روپیے کے ہتھیار خریدے تھے۔ حیدرآباد۔ گدوال۔ اورنگ آباد کے بنے ہوئے خنجر۔ تلوار۔ وغیرہ کی شہرت دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان پر طلائی نقرئی اور مینا کاری کا کام بھی ہوتا تھا جنگی ہتھیاروں کے علاوہ گھر یلو ہتھیار مثل چاقو قلمتراش۔ استرہ قینچی۔ وغیرہ بھی تیار ہوتے تھے۔ مگر جرمنی اور جاپان کے فولادی اشیاء نے ان کی قدر و قیمت گھٹا دی۔ تاہم اب بھی اورنگ آباد میں چاقو اور تعلقہ کلم ضلع عثمان آباد میں سروتے اچھے ہتھیار ہوتے ہیں۔ فولادی تار جو ستار و آلات موسیقی پر لگایا جاتا تھا حیدرآباد میں تیار ہوتا تھا چنانچہ مولوی سید جلال صاحب اپنے مضمون "صنایع دکن" میں لکھتے ہیں کہ "غلام حسین صاحب نامی کوئی باکمال حیدرآباد میں ہیں جو فولادی تار تیار کرتے ہیں جو فی تولہ ایک اشرفی تک فروخت ہوتا ہے"۔

اشیائے جست } اورنگ آباد میں جست کی صراحیاں۔ کٹورے۔ تھالیاں وغیرہ بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ مگر یورپ کے کانچ اور المونیم کے بنائے ہوئے اشیاء نے ان کی قدر و قیمت گھٹا دی۔

اشیائے بیدری } حیدرآباد کی قدیم اور مشہور ترین مصنوعات میں اسے شمار کیا جاتا ہے متعدد

دھاتوں کو ترکیب دیکر ایک دھات تیار کی جاتی ہے جس سے مختلف اشیا بنائے جاتے ہیں اور ان پر چاندی کی پیچ کاری کا کام کیا جاتا ہے مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اپنی کتاب "دولت قلمرو آصفیہ" میں لکھتے ہیں "پیدائش مسیح سے چار صدی پیشتر اس صنعت کا آغاز پہلے پہل بیدر ہی میں ہوا۔ اور دہن کے ایک راجہ نے اس کو ایجاد کیا اور اسی مناسبت سے یہ بیدری برتن کے نام سے موسوم ہو گئے" ممکن ہے کہ آپ کا یہ خیال صحیح ہو۔ مگر اس کے بعد سے اس صنعت میں مسلسل ترقی ہوتی گئی جب مسلمان دکن میں آئے اور بیدر دکن کا اسلامی دارالسلطنت بنا تو انہوں نے اس کی طرف توجہ کی اور صنعت ترقی کرنے لگی دور دراز تک اس کا شہرہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ یورپ میں تک مشہور ہو گیا اس دھات کی تحقیق بہت سے یورپ والوں نے کی ہے مگر ان کے باہمی بیانات میں مقدار کے متعلق اختلاف ہے۔ مگر جناب جے راؤ صاحب نائب ناظم صنعت و حرفت اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "دھات جست (ZNIC) اور تانبے (Copper) کو ملا کر بنائی جاتی ہے۔ ان کو الگ الگ پگھلا کر سولا نو را کے تناسب سے ملایا جاتا ہے یہ دھات تیار کرنا ہی سب سے زیادہ مشکل کام ہے اس کو کاریگر اپنی فرصت کے وقت بڑی مقدار میں تیار کر لیتے ہیں اور وقت ضرورت جتنی ضرورت ہو اس سے لیکر اشیاء تیار کرتے ہیں آدھ گھنٹے تک دھات کو گوبر کے اُپلوں پر گرم کرتے ہیں اور وہ جب پگھلتا ہے اس کو سانچے میں ڈال کر اشیاء بنا لیتے ہیں۔ کاپر سلفیٹ (Copper Salphate) اشیا کی سطح پر لگایا جاتا ہے جس سے اس کا رنگ سفید سے کالا ہو جاتا ہے پھر اس پر مختلف بیل بوٹے کندہ کئے جاتے ہیں۔ سونے چاندی کے ورق یا تار ان پر بٹھائے جاتے ہیں اس کے بعد وہ بعض خاص وضع کے سوہن سے پالش کئے جاتے ہیں اس کے بعد اس پر کوئلہ ملتے ہیں اس کے بعد فلالن کو میٹھے تیل میں بھگا کر اس پر خوب ملتے ہیں یہ بہت دقت طلب کام ہے مگر اب مشین سے بھی پالش کی جاتی ہے۔

PALiSH پالش کرنے کے بعد اشیاء کو پھر گرم کیا جاتا ہے اور وہاں کی مٹی اور امونیم کلورائیڈ سے ایک لیپ تیار کیا جاتا ہے اس کو اشیا پر ملتے ہیں جس سے اس کا رنگ بالکل سیاہ ہو جاتا ہے اور اسی لیپ بنانے میں صنعت کا راز پنہاں ہے اور جب تک جست اور تانبا برابر تناسب میں نہ ہوں اشیا کا رنگ سیاہ نہیں ہوتا اور صرف بیدر ہی کی مٹی سے یہ لیپ تیار ہوتا ہے دوسری مٹی سے نہیں اس کے بعد

پھر ان پر پالش کیجاتی ہے اور بازار میں فروخت کیلئے روانہ کئے جاتے ہیں۔ بیدری برتنوں میں صراحیاں۔ کٹورے۔ سیلاپچیاں۔ ڈبیاں۔ ہتھیاروں کے قبضے وغیرہ تیار ہوتے ہیں کچھ زمانہ سے اس مشہور و معروف صنعت کو بہت تنزل ہوگیا ہے۔ پرانے برتنوں کے سامنے نئے برتن کوئی حقیقت نہیں رکھتے اس صنعت کے زوال کے وجوہات وہی ہیں جو دوسری صنعتوں کے ہیں یعنی اوّل تو فیشن کی تبدیلی دوسرے بیدر کو ریلوے لائن سے اتصال نہیں ہوا تھا۔ چند سال قبل ریلوے لائن کھولی گئی ہے اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان کی دوسری صنعتوں کی طرح اس صنعت کا راز بھی صرف چند گھرانوں تک محدود رہا اور وراثتاً اپنی اولاد کو سکھاتے رہے یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک نسل یا خاندان کے ہر ایک فرد کو یکساں کمال حاصل ہوا ہو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ زوال ہوتا گیا اب بیدر میں صرف دو گھرانے باقی ہیں ایک سید تصدق حسین کا ہے دوسرے غلام غفور صاحب کا گھرانا ہے جو اس وقت بیدری اشیاء تیار کرتے ہیں یورپ اور ہندوستان کی نمائشوں میں بعض دفعہ گذشتہ زمانہ کا بنا ہوا بیدری سامان جس کو سرکار یا پرانے اشیاء کی تجارت کرنیوالوں نے روانہ کیا تھا بہت پسند کیا گیا تھا اور بھی بیدری بٹن نہایت مشہور ہیں اگر ملک ان کی قدر کرنے لگے تو مردہ صنعت میں پھر جان آجائیگی۔

اشیائے ٹن } زمانہ قدیم میں حیدرآباد۔ اورنگ آباد۔ گلبرگہ ٹن کی فنادیل۔ صنادیق۔ لوٹے۔ سمادار۔ کھلونے وغیرہ بنانے میں مشہور تھے ٹن کے صندوق پر اکثر رنگ وغیرہ چڑھا کر انہیں نہایت خوشنما بنایا جاتا تھا اگلے زمانہ میں شادیوں میں مہمانوں کو ٹن کے پاندان وکشتیاں دئے جاتے تھے جس کی وجہ سے صنعت کو بہت مدد مل رہی تھی مگر وہ کسی قدر وزنی ہوتے تھے اور اٹھا کر لیجانا بہت مشکل تھا۔ اس لئے یہ رسم متروک ہوگئی اور ان کی جگہ جرمنی کی رنگین ڈبیوں کا رواج ہوا جس کی وجہ سے صنعت کو بہت نقصان پہنچا۔ تاہم ٹن کی اشیاء کی ترقی کیلئے وسیع میدان موجود ہے۔

اشیائے سنگ شیشہ گِل

الماس تراشی } خاص کر قطب شاہی دور میں الماس تراشی کی صنعت درجہ کمال وعروج پر تھی تمام متمدن دنیا میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ شاہی کارخانے اور رعایا کے کارخانے دونوں قائم تھے اکثر یورپین سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس کی بہت تعریف کی ہے مگر افسوس ہے کہ اب یہ صنعت معدوم ہوچکی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں معدنوں سے الماس نکالا جاتا تھا جس کی وجہ سے قدردان ملک میں بکثرت آتے تھے اور الماس تراشی کی صنعت اوج پر تھی جب معدنوں میں کام بند ہوچکا اور یورپ والوں نے اس میں بھی کمال حاصل کرلیا تو یہ صنعت معدوم ہوگئی۔

اشیائے شیشہ کے حیدرآباد اور بعض قصبوں میں کانچ کی چوڑیاں بکثرت تیار ہوتی تھیں ہندوستان کے علاوہ یورپ میں بھی ان کی مانگ تھی حسینان فرنگ اپنی سیمیں کلائیوں کو انہیں چوڑیوں سے زیب دیتی تھیں مگراب ولائتی اور کلکتہ کی چوڑیوں کی چمک اور رنگ نے ان کی مانگ کو بہت کم کردیا۔اب بھی تیار ہوتی ہیں۔مگر صرف غربا ہی استعمال کرتے ہیں۔البتہ یہاں لاک کی چوڑیاں تیار ہوتی ہیں جس کو "جوڑا" کہاجاتا ہے اکثر دولہنوں کو پہنایا جاتا ہے اس پر مسالہ وغیرہ لگا ہوتا ہے اس کی قیمت پانچ سے لیکر پچاس تک ہوتی ہے۔مشہور فرم مسرس پالمر کے ذریعہ ہرسال ایک ایک لاکھ کا بھوکر دن اور جالنہ میں کانچ کا سامان مثل بوتل۔شیشہ۔آئینہ گلاس وغیرہ۔بہت تیار ہوتے تھے مگراب یہ صنعت معدوم ہوگئی۔ ضلع ورنگل قصبہ مسیورہ جہاں کانچ کا پتھر ملتا تھا۔عینکیں بہت عمدہ تیار ہوتی تھیں مگراب یورپ نے اس صنعت پر بھی قبضہ کرلیا۔

اشیائے چوبی

حیدرآباد اور اکثر اضلاع میں عمدہ مشرقی اور مغربی فیشن کا سامان مثل میز۔کرسیاں۔صندوق۔پلنگ۔ تخت۔الماریاں۔تلوار کے نیام۔کھلونے وغیرہ تیار ہوا کرتے تھے۔حیدرآباد میں ہرقسم کی سواریاں مثل "بگی"۔جھٹکے۔ٹانگے۔شکرام۔میانے وغیرہ تیار ہوتے تھے اور اس پر رنگ روغن بہت ہی نفاست سے کیاجاتا تھا۔حیدرآباد اور اورنگ آباد میں صندل کی لکڑی پر نہایت عمدہ کام کیاجاتا تھا۔مختلف اشیا بنائے جاتے تھے مثلاً عطردان۔قلمدان۔چھوٹے ڈبے وغیرہ اس پر ہاتھی دانت کا کام بھی کیا جاتا تھا۔میسور اور دیگر مقامات کے کاریگروں کی وجہ سے اس صنعت کو زوال ہوگیا۔

ہاتھی دانت کے کنگھیاں۔قلمتراش۔ہاتھ میں رکھنے کی چھڑیاں۔ہتھیاروں کے قبضے وغیرہ حیدرآباد اور اورنگ آباد میں تیار ہوتے تھے کسی زمانہ میں اورنگ آباد اور پیٹن لکڑی کے کام میں بہت مشہور تھا۔

یہاں مکانات کے شہتیر۔ دروازے۔ ستون وغیرہ بہت عمدہ تیار ہوتے تھے چند قدیم مکانات اب بھی اگلے زمانہ کے اہل کمال کی شہادت دیتے ہیں صرف پٹن ہی نہیں بلکہ دکن کے اکثر راجدھانیوں اور بڑے بڑے شہروں میں زمانہ قدیم میں ماہران فن موجود تھے بیدر کا قلعہ اور دوسرے قلعے ہمارے بیان کی شہادت کیلئے کافی ہیں۔ مگر اب اس صنعت کو بھی زوال ہوگیا۔

پارچہ

مملکت دکن میں روئی بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ مویشیوں کی بھی زیادہ تعداد ہے اور زمانہ قدیم سے حیدرآباد کے ہر گاؤں میں جولاہے موجود تھے جو مختلف قسم کے پارچے تیار کرتے تھے خود حیدرآباد میں بھی وہ فروخت ہوتے تھے اور باہر بھی روانہ کئے جاتے تھے۔ ڈیڑھ صدی پیشتر تک حیدرآباد کے بنے ہوئے پارچوں کی دھوم تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اکثر یورپین سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ان کی تعریف کی ہے زمانہ گذشتہ کی صنعت پارچہ بافی کا اندازہ ان پارچوں سے ہوسکتا ہے جو اس وقت ہمارے امراء کے توشک خانوں میں موجود ہیں۔ یورپ کے ریشم کی نیا کٹریوں نے دکن کی اس صنعت کو بالکل تباہ کردیا اس کی بدولت ہزاروں جولاہے جو مالدار تھے اور جن کا کاروبار وسیع تھا بالکل تباہ و تاراج ہوگئے اس صنعت کو چھوڑ کر انہیں مجبوراً پیشہ زراعت اختیار کرنا پڑا۔ حیدرآباد کے اکثر کاریگر جو کلوں کے بجائے ہاتھ سے کام کرتے تھے فکر معاش میں حیدرآباد چھوڑ کر احمد نگر۔ ناسک۔ شولاپور چلے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے غریب جولاہوں کو خام اشیاء جو برٹش انڈیا سے لائے جاتے تھے محصول کروڑگیری ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور جب مال تیار ہوکر پھر برٹش انڈیا کو واپس جاتا تب بھی محصول کروڑگیری ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس دوگنا محصول کو وہ برداشت نہیں کرسکتے تھے اس کے علاوہ چند سال تک چاندی پر گراں محصول لگایا جارہا تھا جس کی وجہ سے زرّین پارچہ بافی کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اور حیدرآباد میں جدید ایجاد شدہ کرگھوں سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ سے مجالس سرکار عالی و انڈسٹریل اسکول اورنگ آباد میں اس کا رواج ہوا ہے مگر سودیشی خیالات جو ہندوستان میں پیدا ہوگئے۔ انہوں نے اورنگ آباد کی صنعت پارچہ بافی کی بہت مدد کی اگر صحیح اصول پر کوشش کیجاتی تو بہت فائدہ پہنچتا ملک میں حسب ذیل مال تیار ہوتا ہے۔

سوتی پارچے } ضلع ناندیڑ زمانہ قدیم سے ایک خاص قسم کی پارچہ بافی میں مشہور ہے جس کو ناندیڑ کے "تیلے" کہا جاتا تھا ایک قسم کا نہایت ہی باریک اور مہین کپڑا ہوتا ہے جس کو جولاہے ہاتھ سے تیار کرتے ہیں اور یہ امر کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ہم مشین سے ۱۰۰ کاونٹ (Count) سے زیادہ کا سوت نہیں کات سکتے مگر جولاہے ہاتھ سے ۲۵۰ کاونٹ کا سوت کات سکتے ہیں یہ کپڑا اتنا مہین ہوتا ہے کہ اگر سبزہ پر ڈال دیا جائے تو پتہ نہیں چلتا کہ آیا سبزہ پر کوئی کپڑا بھی ہے یا نہیں؟ ایک تھان جو عموماً چھ گز لانبا اور ایک گز چوڑا ہوتا ہے ایک چھوٹی سی ناس کی ڈبیہ میں آجاتا ہے اور یہ کپڑا بہت قیمتی ہوتا ہے اگر امرا استعمال کرتے ہیں۔ ڈھاکہ کے ململ کا یہ کپڑا بہ آسانی مقابلہ کرسکتا ہے مگر اب چونکہ اس کا رواج نہیں رہا اور کاریگر بھی فنا ہوگئے یہ صنعت معدوم ہوگئی مگر ہمارا محکمہ صنعت و حرفت پھر اس کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ناندیڑ میں تیلے کے علاوہ دوسرے باریک کپڑے مثل محمود خانی۔ شیر خانی۔ آغا خانی وغیرہ تیار ہوتے تھے۔ اس کے تھان (۵۰۰) سے (۱۰۰۰) تک فروخت ہونے لگے۔

محبوب نگر۔ پیٹھن۔ جالنہ۔ کریم نگر۔ گدوال میں باریک سوتی ساڑیاں اور دھوتیاں اچھے تیار ہوتے تھے۔ ورنگل اور چریال میں سوتی رنگین رومال تیار ہوتے تھے یہ رومال تمام ہندوستان میں حیدرآبادی رومال کے نام سے مشہور تھے پچاس سال قبل کسی انگریزی ایجنسی نے ورنگل میں ہر وضع کے رومال خریدے تھے اور اب لنکا شائر نے اسی نمونہ کے چھپے ہوئے رومال بناکر حیدرآباد کی اس صنعت کو تباہ کردیا۔ مگر لنکا شائر کے رومال حیدرآبادی رومال کا مقابلہ پائیداری میں نہیں کرسکتے مگر ارزاں ہوتے ہیں اس لئے زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔

ورنگل اور میدک کی سوسیاں اور کھاروے بہت مشہور تھے ناندیڑ اور رائچور میں تیار ہوتے ہیں قطب شاہی دور میں حیدرآباد اور گولکنڈہ میں چھینٹ بہت عمدہ بنتی تھی اور مچھلی بندر کی چھینٹوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ سوزنیاں۔ بیدر اور عالم پور میں اچھی بنتی ہیں۔ ورنگل۔ ناندیڑ۔ گلبرگہ۔ نرمل میں شطرنجیاں بہت عمدہ بنتی ہیں مگر اب یہ صنعت ختم ہو رہی ہے۔

اونی پارچے } حیدرآباد میں مویشی بکثرت موجود ہیں جن سے اون بآسانی دستیاب ہوسکتا ہے اور

زمانہ قدیم سے ہر بڑے گاؤں میں جولاہے موجود تھے جو ادنی پارچے تیار کرتے تھے مگر کثرت کملی بننے والوں کی تھی کیونکہ غربا کا یہ ضروری لباس ہے۔ نلگنڈہ۔ بمراج پیٹھ۔ محبوب نگر۔ نارسنگی۔ الوال جنگاؤں اور خاص کر بھونگیر اور چریال کے کمبل بہت مشہور تھے۔

حیدرآباد اورنگ آباد۔ بیڑ میں سا خو گرا در نمدے عمدہ تیار ہوتے ہیں کسی زمانہ میں اورنگ آباد میں جامہ وار کے تھان بکثرت بنتے تھے۔ کشمیر کے مال کی وجہ سے ان کا بنانا موقوف ہوگیا ہے مگر اب بھی فرمائش پر تیار ہو سکتے ہیں مختلف وضع کی شالیں بھی اورنگ آباد میں تیار کی جاتی ہیں مگر اب اس کا رواج متروک ہو جانے سے نہیں بنائی جاتی ہیں۔ مہاراجہ بہادر اور نواب سالار جنگ بہادر اور دیگر امرا کے پاس قدیم زمانہ کی شالیں موجود ہیں جو اس زمانہ کی صنعت کے کمال کی شہادت دیتی ہیں۔

ریشمی و زرین پارچے } دکن کے زرین اور ریشمی پارچے قدیم زمانہ میں بہت مشہور تھے۔ یورپ اور برٹش انڈیا کے مال کی وجہ سے اس صنعت پر برا اثر پڑا کسی زمانہ میں نانڈیڑ۔ نلگنڈہ۔ سنگاریڈی۔ ورنگل میں ہندوستانی ساڑیاں کھنیاں (چولیاں) دھوتیاں بہت ہی نفیس اور عمدہ تیار ہوتی تھیں۔ ریشمی چوخانہ دار پارچے بگر نگے جو فنیبروانی زنانی پاجاموں وغیرہ کیلئے موزوں ہیں سنگاریڈی۔ نارائن پیٹھ۔ کلبگور۔ ورنگل۔ نلگنڈہ میں بہت عمدہ تیار ہوتے تھے۔

ٹسر ملک کے شرقی و جنوبی حصہ میں خاص کر ورنگل میں دستیاب ہوتا ہے۔ ٹسر کے تھان حسن پرتی (ضلع ورنگل) میں بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔

زرین پارچے } حیدرآباد اورنگ آباد کے زرین پارچوں کی شہرت دور دراز تک پھیلی ہوئی تھی۔ کمخواب۔ مشجر۔ تاش وغیرہ نہایت ہی عمدہ اور نفیس تیار ہوتے تھے۔ زمانہ قدیم میں لاکھوں روپیے کا مال ملک کے باہر جاتا تھا مگر اب مشین کی تبدیلی اور بنارس کے مقابلہ کی وجہ سے اس کی قدر گھٹ گئی۔ طاعون اور قحط کی وجہ سے اس صنعت پر برا اثر پڑا۔ پٹن میں کمخواب اور زرین ساڑیاں۔ دھوتیاں بہت عمدہ تیار ہوتے تھے۔ پٹن کے زرین پارچوں کے متعلق اکثر یورپین سیاحوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ذیل میں انڈین آرٹ آف دہلی مصنفہ سر جارج واٹ سے کچھ انتخاب کیا جاتا ہے جس سے ہم کو اولین زمانہ کی صنعت کا اندازہ ہوگا۔

"پٹن جو اورنگ آباد کے نزدیک واقع ہے ایک خاص وضع کے مہین۔ ابریشمی و زرین پارچوں کیلئے مشہور ہے۔

یہاں کی معجز نما بافندگی کا خاکہ الفاظ میں اتارنا ناممکن ہے یہ عموماً گہرے یا ہلکے نارنجی رنگ کے ریشم سے بنائے جاتے ہیں اور ان پر زرین چوخانے یا تصویریں بنائی جاتی ہیں جن کے اندر مختلف قسم کے نقش رہتے ہیں اکثر تو ایک قاز رہتی ہے جو اپنی چونچ میں زیتون کی شاخ لئے ہوئے ہے ان ساڑیوں کے حاشیے اور پلو ریشم اور بکثرت زرین تار ملا کر جداگانہ بنے جاتے ہیں اور بعد ساڑی کے ساتھ ٹانک دیے جاتے ہیں مگر یہ مہین نہیں بنائے جاتے بلکہ دبیز زربفت کے ہوتے ہیں جن میں زری کا کام کیا جاتا ہے ان خوشنما حاشیوں اور پلوؤں کی خاص ندرت ان کے چمکدار اور بھڑکیلے رنگ ہیں مثلاً سبز۔ فیروزہ۔ ہلکا نیلگوں۔ شوخ گلابی وغیرہ۔

ان کا زرتار اور چمکیلا تھا جس میں موج نما گوشہ دار تحریریں پڑی ہوئی ہیں ان کی ساخت اور وضع پٹہ دار تھی۔ پٹے بہت کم چوڑے تھے ان پٹوں میں سبز رنگ کے طوطوں اور زمرد فام طاؤسوں کی خوشنما صورتیں بنائی گئیں تھیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک پرندہ اپنے پھولوں پر سے گردن اٹھائے اپنے ساتھی کو دیکھ رہا ہے ساڑیوں کے پلو کو دیکھنے سے جن کے حاشیے بھی اس قسم کے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ سنہری زمین پر گلدستے رکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایرانی وضع کے مخروطی گل بوٹے سر باہر نکال رہے ہیں اور جن کو طاؤس کے جوڑے آزو بازو تھامے کھڑے ہیں۔

وہ اعلیٰ درجہ کا تناسب جو ان بھڑکدار اور خوش رنگ پھولوں کی ٹھنیوں میں پایا جاتا ہے اور جو ایرانی وضع کے مخروطی گل بوٹوں کو پیدا کرتا تھا اور باغ بہشت کے غنچوں کی بہار دکھلاتا تھا اس لطیف اور دقیق اصول کی شرح کر رہا ہے جس کی بناء پر ان پارچہ جات کے مختلف الوان اور اقسام کی آرائشوں کا موزوں انتخاب کیا گیا تھا ان کا تناسب اور ان کی موزونیت بلا کی تھی۔ یہ گل بوٹے یکے بعد دیگر سرخ اور نیلے کناروں کے بنائے گئے تھے ان میں سے خاص خاص پھول سرخ تھے لیکن ان کے گرد سفید رنگ دیا گیا تھا۔ بعض سفید تھے لیکن ان کے کنارے سرخ تھے بعض نیلگوں تھے لیکن ان کے حواشی سفید تھے۔ بعض سفید تھے مگر نیلگوں حاشیے رکھتے تھے۔ یہ تمام پھول۔ بیل بوٹے بالکل مختلف وضع کے تھے باایں ہمہ فطرت کی پوری تصویر اور صنعت انسانی کا کامل نمونہ تھے۔ طاؤسان طناز اپنے زمردیں پر و بال سے طوطیان سبز نام اور نیلگوں پھولوں کے ساتھ تناسب اور موزونیت میں مساوات کا دم بھر رہے تھے۔

سرجارج ٹرڈ وڈ نے اپنی کتاب انڈین آرٹ (حصہ ۳) میں پٹن کی ایک ریشمی خوشنما ساڑی کا خاکہ اتارا ہے اڈورڈ ہفتم ہندوستان کی سیاحت کے وقت یہاں سے اس کو اپنے ساتھ انگلستان لے گئے تھے۔

نمایش گاہ میں بہت سے خوبصورت نمونے پٹن کی ساڑیوں کے موجود ہیں حصہ اشیائے مستعار میں ہز ہائینس مہاراجہ بڑودہ کی متعدد فرستادہ ساڑیاں رکھی ہوئی ہیں جو سب کی سب کم و بیش تاریخی دلچسپی رکھتی ہیں کہ ان کو مہارانیوں نے اپنی شادی کے موقع پر اوڑھا تھا حصہ اشیائے فروختنی میں ایک بہترین ساڑی تھی اس کا پتہ مسٹر پرسی براؤن پرنسپل آف آرٹ اسکول لاہور نے نمائش گاہ کیلئے اورنگ آباد میں اشیائے نو فراہم کرتے ہوئے لگایا تھا ایسی دو ساڑیاں تھیں ایک کو جلا کر زر نکال لیا گیا تھا دوسری نمائش گاہ میں پیش ہوئی اس کو انڈسٹریل میوزیم کلکتہ نے خرید لیا پیش کرنے والے نے جو تاریخ بیان کی ہے وہ حیرت انگیز اور دلچسپ ہے وہ لکھتا ہے کہ "وہ مشہور ساڑی ۱۸۵۳ء میں مہاراجہ بھولا ناگپور کے مصارف سے تیار کی گئی تھی مگر اس عرصہ میں ان کی سلطنت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ملحق ہو جانے کی وجہ سے راجہ کے خاندان میں پہنچ نہ سکی۔ اور بابا سیٹھ ہی کے پاس رکھی رہی جس کے اہتمام سے یہ ساڑی تیار ہوئی تھی بابا سیٹھ کا جب دیوالہ نکل گیا تو یہ فروخت کیلئے پٹن سے اورنگ آباد آئی تھی۔"

پٹن کے کمخواب بھی نہایت اعلیٰ درجہ اور قیمتی ہوتے تھے۔ ۱۶۰۱ء میں ایک ایرانی سفیر گولکنڈہ میں آیا تھا واپسی کے وقت ایک گراں قیمت کمخواب ساتھ لیگیا۔ صرف اس کی قیمت سے تین سال تک کارخانہ چلتا رہا۔ پٹن گذشتہ زمانہ میں تجارتی راستہ تجارتی منڈی اور دکن کی راجدھانی تھا۔ اسی لئے اس کی صنعت بھی عروج پر تھی۔ اب تنزل کرتے کرتے ایک تعلقہ کا مستقر رہگیا ہے اس لئے صنعت کو بہت زوال ہوا۔ (دولت قلمرو آصفی)

سوتی اور ریشمی پارچہ۔ (مخلوط) ہمرو ایک کپڑا ہے جو جامہ وار کی وضع کا ہوتا ہے اور اورنگ آباد میں تیار کیا جاتا ہے مختلف وضع کے رنگ بیل بوٹے ہوتے ہیں فی تھان کی قیمت ۶ سے ۱۶ تک ہوتی ہے۔ ہمرو یورپ، احمد آباد۔ بنارس۔ ترچناپلی میں بھی تیار ہوتا ہے۔ مگر کوئی ہمرو اورنگ آباد کے ہمرو کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ سرجارج واٹ نے نمائش گاہ دہلی کے موقع پر اورنگ آباد کے ہمرو کی بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا "شاندار

ہمرو جو اورنگ آباد سے آتے ہیں بتلا رہے ہیں کہ ان لوگوں نے جو ہندوستانی مصنوعات کو یورپ اور امریکہ میں رواج دینا چاہا بہت کچھ غفلت برتی ہے "افسوس ہے کہ سر جارج واٹ جیسے مبصر کے خیالات سے نفع اٹھانے کی کوشش نہیں کیگئی۔ اب ہمرو کی صنعت کو بہت زوال ہوگیا ہے چنانچہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں کالج کی پارٹی کے ساتھ میں اورنگ آباد گیا تھا اور ہمرو خریدنا چاہا جب دکان پر پہنچا تو مال بہت ہی معمولی تھا۔ رنگ وغیرہ بھی خراب تھے۔ میں نے وجہ دریافت کی دکاندار نے کہا کہ اب ہمرو کی طلب کم ہوگئی ہے اس لئے ہم اچھا مال تیار نہیں کرتے مگر فرمائش پر مال تیار کیا جاتا ہے اگر نصف قیمت پیشگی ادا کر دی جائے" خوف ہے کہ کہیں یہ صنعت بھی تباہ نہ ہو جائے۔

مشروع - الائچہ } زمانہ قدیم میں اورنگ آباد میں بکثرت تیار ہوتا تھا۔ مگر اب بنارس اور سورت کے مقابلہ سے تجارت پر برا اثر پڑا ہے اورنگ آباد کا مشروع دوسرے مقامات کے مشروع سے زیادہ قیمتی اور پائیدار ہوتا تھا پندرہ سے پچیس تک تھان کی قیمت تھی۔ کسی زمانہ میں گدوال میں بھی تیار ہوتا تھا۔

مسالہ } حیدرآباد۔ اورنگ آباد۔ ناندیڑ میں مصالحہ مثل۔ گوٹا۔ لچکہ۔ کناری۔ گھوکرو۔ مقیش۔ لیس۔ زرین فور۔ نقرہ ی وطلائی تار۔ کلابتوں۔ سلمہ۔ ستارے۔ مرزا بے پردہ۔ جھلی۔ کٹوری۔ کرن وغیرہ تیار ہوتے تھے۔ مگر برٹش انڈیا کے شہروں کے صحیح اصول پر مقابلہ کی وجہ سے پہلے کی حالت نہیں رہی۔ طلائی و نقروی ورق بھی تیار ہوتا تھا۔ مگر بنارس کے فیشن آمیز ورق کی وجہ سے اس کی قدر کم ہوگئی۔

ریشمی قالین } حیدرآباد کی یہ صنعت بہت مشہور ہے اور کئی صدیوں سے قایم ہے۔ مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اپنی کتاب "دولت قلمرو آصفیہ" میں لکھتے ہیں کہ "دکن میں یہ ایجاد ایک سنی مسلمان کاریگر کے نام سے موسوم کی جاتی ہے جو ابتدائی حملہ آوروں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

ورنگل کے تیار شدہ قدیم قالین مختلف نمائش گاہوں میں اور اکثر امراء کے پاس اب بھی موجود ہیں۔ اور اس صنعت کا بہترین نمونہ خیال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو تین جو ہز ہائینس مہاراجہ پٹیالہ کے پاس ہیں ان کی خاص شہرت ہے ان میں سے اعلیٰ درجہ کے قالین وہ تھے جو ۱۸۵۱ء میں نمائش گاہ لندن میں روانہ کئے گئے تھے اور اب وہ ساوتھ کنگسن میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ پٹیالہ اور ساوتھ کنگسن کے قالین جو نمائش گاہ دربار دہلی میں لائے گئے تھے اور ان کے متعلق سرکاری رپورٹ میں لکھا گیا ہے اس کا

انتخاب حسب ذیل ہے :-

" نمائش گاہ میں ہز ہائینس مہاراجہ میرا کے تین اعلیٰ درجہ کے ورنگل کے تیار شدہ قالین ہیں۔ ورنگل کے کئی اور قالین کی طرح ان کی ساخت میں بھی بہت سے رنگ برنگ کے مختلف دھاگوں کا بل دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت بھڑکیلے نظر آتے تھے ۔

نمائش گاہ کرٹیل پالین کے قالینوں کی نسبت یہ لکھا گیا ہے کہ ورنگل کے قالین جو ۱۸۵۱ء کی نمائش میں دکھلائے گئے تھے ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی ہی حیرت انگیز و تعجب خیز صنعت کا ثبوت دیتے تھے سر جارج براڈ رود لکھتے ہیں کہ " ان قالینوں کی جن میں سے کئی ایک انڈین میوزیم میں موجود ہیں۔ خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ساخت میں فی مربع انچ تیرہ ۱۳ ہزار دھاگے شریک ہیں اور سب کے سب رنگ کے لحاظ سے مکمل طور پر تناسب ہیں یہی قالین ایسے ہیں جن میں ریشم اس طرح کامیابی اور تناسب کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے مختلف رنگوں کی چمک دمک نہایت اعتدال اور تناسب کے ساتھ تقسیم کی گئی تھی اور بافت میں اتصال اور نزدیکی کا نہایت درجہ لحاظ رکھا گیا تھا۔ ان دونوں باتوں کا ریشمی چیزوں کی ساخت میں خیال رکھنا ضروری ہے ۔

ان عجیب و غریب قالینوں سے وہ اس نمائش میں وکٹوریہ انڈ البرٹ میوزیم سے آئے ہیں جس کا تذکرہ سر جارج برڈ وڈ نے کیا ہے ۔ مذکور بالا قالینوں کی قیمت فی مربع گز سو پونڈ تھی ۔

سر جارج براڈ وڈ اپنی کتاب انڈسٹریل آرٹس آف انڈیا میں دو قالینوں کے حالات حسب ذیل لکھتے ہیں :-

پرنس آف ویلز (اڈورڈ ہفتم) کے ہندوستانی نوادرات میں ورنگل کا ایک قالین ہے مگر قدیم زمانہ کا بنا ہوا نہیں ہے اس کا رنگ بہت گہرا ہے ۔

پیرس کی نمائش ۱۸۶۷ء میں مسٹر دی رابنس نے بہت سے ہندوستانی قالینوں کے ساتھ ایک ورنگل کا قالین بھی پیش کیا تھا جو سولہویں صدی کے اواخر یا سترھویں صدی کے اوائل کا بنا ہوا تھا اور صنعت بافندگی کے عجائبات سے تھا اس کے ہر مربع انچ میں چار سو گرہیں دی گئی تھیں اور کل قالین

میں ۳۵ لاکھ گرہیں تھیں اور اس طرح پیچ در پیچ بنایا گیا تھا کہ ہر گرہ پر سوئی کا بدلنا لازمی تھا جب ان گرہوں کا حساب کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سات سال سے کم عرصہ میں یہ قالین تیار نہ ہوا ہوگا بلکہ دس سال مدت بھی صرف ہوئی ممکن ہے اس پر جو نقشے اتارے گئے ہیں وہ بھی عمدہ ہیں لیکن رنگوں میں گو ہنرمندی کے ساتھ تناسب کا خیال رکھا گیا ہے زیادہ خوشنما نہیں ہیں کہا جاتا ہے کہ کسی ایک ترکی سلطان کی لاش حمام سے جہاں وہ مارا گیا تھا اسی قالین پر باہر لائی گئی تھی خون کے دھبوں کی وجہ سے رنگ بگڑ گیا ہے۔

نمائش گاہ دہلی میں سرکار عالی کی جانب سے قالین روانہ کئے گئے تھے مذکورۂ بالا قالینوں کے ماسوا حیدرآباد میں شاہی محلسراؤں اور امراء کے پاس قابل تعریف اور عمدہ قالین موجود ہیں معمولی طور پر ریشمی قالین کی قیمت (۱۸) سے (۲۵) تک فی مربع گز ہوتی ہے۔ چند سال قبل یورپ تک ان کی مانگ تھی۔ مگر اب ان کی قدر کم ہوگئی ہے۔ کاریگر پوڑ یہ کا رنگ استعمال کرنے لگے ہیں جس سے نفاست اور پائیداری کم ہوگئی ہے ہمارے امراء اور معززین کو بیرونی اور شاہجہان کے کارخانہ کے قالینوں نے اتنا فریفتہ کر لیا کہ وہ اپنے محلوں کی زینت انہیں میں سمجھتے ہیں اور ورنگل کے قالین کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کرتے غالباً ورنگل۔ گلبرگہ کے ماسواے اور بھی مقامات تھے جہاں ریشمی قالین بافی کے کارخانے موجود تھے۔

ایک اور قالین کا پتہ چلا ہے جو دولت آباد کا بنا ہوا ہے سنہ ۱۶۳۲ یا اس سے پیشتر بعہد حکومت شاہجہاں بنایا گیا تھا اب جے پور کے میوزیم میں موجود ہے اور باوجود قدامت اس کی نفاست میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اس صنعت کے زوال کا سبب یہ ہے کہ پہلے قالین بافوں سے سرکاری مقابلہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب گلبرگہ۔ ورنگل کے محبسوں میں یہ کام نہایت زور و شور کے ساتھ ہو رہا ہے اس کی کامیابی کے تذکرے سرکاری رپورٹوں میں آتے رہتے ہیں اگر اب بھی ان پیشہ ور قالین بافوں کی مدد کی جائے تو بہت جلد یہ صنعت پھر دوبارہ زندہ ہو جائیگی اور ممکن ہے کہ پہلے سے بھی زیادہ کامیابی ہو۔

سنگتراشی } دکن کو پتھر اور مٹی کے مجسمے اور کھلونے بنا کر ان پر رنگ و روغن کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی اس کی شہادت اجنٹہ کے غار عالمپور اور بیدر کے بت دے رہے ہیں جب مسلمان دکن کے فرمانروا

ہوئے تو مذہبی موانعات کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہ کی گئی جس کی وجہ سے یہ صنعت معدوم ہو گئی اب بھی کہیں کہیں مٹی کے مجسمے تیار ہوتے ہیں مگر کام معمولی قسم کا ہوتا ہے۔

کاغذ زمانہ قدیم سے حیدرآباد میں کاغذ بنایا جاتا تھا۔ مگر دولت آباد اس صنعت میں زیادہ مشہور تھا۔ دولت آباد کے ایک محلہ موسوم بہ کاغذی پورہ نے اس میں خاص شہرت حاصل کی تھی یہاں کا بنا ہوا کاغذ کشمیری کاغذ کا مقابلہ کرتا تھا۔ اس کی کئی قسمیں ہیں شائستہ خانی۔ نظام شاہی۔ بہادر خانی۔ رحمان خانی۔ شربتی۔ مہرہ دار وغیرہ۔ سب سے زیادہ قیمتی کاغذ بہادر خانی تھا جس کی قیمت فی دستہ دو روپے تک ہوتی تھی اور سب سے ارزاں شربتی تھا جس کی قیمت فی دستہ (۱۲؍) تک ہوتی تھی تمام دفاتر امراء اور رؤسا یہی کاغذ استعمال کرتے تھے کتابیں اور دستاویزیں بھی انہیں کاغذات پر لکھی جاتی تھیں ان کی پائیداری کا یہ حال ہے کہ صدیاں گذرگئی ہیں ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دولت آباد کی ویرانی کے ساتھ ہی وہاں کی صنعت پر برا اثر پڑنے لگا۔ تاہم ساٹھ ستر سال پہلے وہاں سات سو گھر اس کی تیاری میں مصروف تھے اور اس کی بدولت خوشحالی سے بسر کر رہے تھے۔

دولت آباد کے علاوہ حیدرآباد۔ چٹگوپہ ضلع بیدر (جاگیر پائیگاہ نواب سرآسماں جاہ بہادر مرحوم) کریمنگر۔ محبوب نگر کے متعدد قصبات میں کاغذ بنایا جاتا تھا اور ادنی قسم کا ہوتا تھا حقیقت یہ ہے کہ کلوں کا بنا ہوا کاغذ نہایت کثرت سے اور ارزاں قیمت پر فروخت ہوتا ہے۔ ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ پہلے ادنی درجہ کا دیہی کاغذ حلوائی مٹھائی کی ٹوکریاں باندھنے کے لئے بہت کچھ خریدتے تھے مگر اب ان کا نعم البدل یورپ کے ردی اخبارات ہیں۔

کاغذسازی کی صنعت میں بہت ترقی کا امکان ہے اگر حکومت اس کی طرف توجہ کرے تو ملک کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

۔۔ اب عہد عثمانی کے زرین دور نے گرتوں کو سنبھال لیا ہے اور ہر طرف ملک میں صنعت کی مانگ ہو رہی ہے۔ چنانچہ صنعت و حرفت کی فروغ کیلئے کچھ عرصہ پیشتر دو کروڑ کا سرمایہ نکالا گیا ہے تاکہ بروقت ایسے صناعوں کی امداد کی جاسکے۔

ایک عرصہ بیشتر ہم دیا سلائی اور سگریٹ کیلئے جو ہماری معاشرت کا ایک لازمی جزو ہے باہر کے محتاج ہے لیکن ملک کے ایسے کارخانوں نے بڑی حد تک باہر سے بے نیاز کردیا ہے اور بیرون ملک میں بھی ہمارے یہاں کے سگریٹ کی مانگ روز افزوں ہے۔

بھُول جا!

(۱)

(جناب صاحبزادہ پیر محمد علی خاں صاحب)

اب دل بیتاب میں تاب شکیبائی نہیں
شوق نظارہ تو ہے آنکھیں تماشائی نہیں
مدعائے دل کو امید پذیرائی نہیں
مجھ سے یوں انجان بن جیسے شناسائی نہیں
بھول جا! اے بیوفا میری وفا کو بھول جا

(۲)

میں تڑپتا ہی رہوں گا بیقراری کو نہ دیکھ
اشک بہتے ہی رہیں گے اشک باری کو نہ دیکھ
دیدۂ بے خواب کی اختر شماری کو نہ دیکھ
گریہ خاموش کی بے اختیاری کو نہ دیکھ
بھول جا! اے بیوفا میری وفا کو بھول جا

(۳)

تیوریوں کے بل میں بل کہاتا رہے جوش عتاب

قہر آلودہ نگاہوں سے ٹپکتا ہو شباب
تمتما کر غیظ میں بن جائے چہرہ آفتاب
میری دنیائے محبت کو بنا دنیائے خواب
بھول جا! اے بیوفا میری وفا کو بھول جا

(۴)

آشنائے درد ہوں درد آشنائی پر نثار
ہر صدائے دل تری بے اعتنائی پر نثار
دین و ایمان تیری کافر ماجرائی پر نثار
ہر وفا تیری ادائے بے وفائی پر نثار
بھول جا! اے بیوفا میری وفا کو بھول جا

(۵)

ابتدائے عشق کا رنگین زمانہ ہو چکا!
ضبط احساسات کا خونیں فسانہ ہو چکا!
پردہ الفت میں مجھ کو آزمانا ہو چکا!
رہ گئی دل میں خلش سی دل لگانا ہو چکا!
بھول جا! اے بیوفا میری وفا کو بھول جا

(۶)

نامۂ خاموش رسوائے حکایت ہو نہ جائے
حالت غمگین مجبور شکایت ہو نہ جائے
شکوۂ بے التفاتی کی جسارت ہو نہ جائے
میں سناؤں داستان دل قیامت ہو نہ جائے
بھول جا! اے بیوفا میری وفا کو بھول جا

عہد عثمانی اور ورزش جسمانی

(جناب سید محمد ہادی صاحب بی اے کنٹب ناظم ورزش وغیرہ)

عہد عثمانی کا زرین دور جس میں ہر شعبہ نے ترقی کی اور افراد ملک کے نشو و نما میں ممکنہ کوششیں کی گئی ہیں کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو ان احسانات عظیمہ سے محروم رہا ہو۔ انہیں میں ایک ورزش جسمانی کا انتظام ہے جو اس سے پہلے ملک کے ہونہار نونہالوں کی تعلیم کے لیے اس وسیع سلطنت میں نہ تھا جوں جوں تعلیمی ترقیاں ہونے لگیں اوس کے ساتھ طلبا کے جسمانی نشو و نما کے لیے اس کا خیال پیدا ہوتا گیا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تاوقتیکہ کھیل کود اور جسمانی ورزش کا سامان فراہم نہ کیا جائے ہونہار طلبا کی صحت قایم نہیں رہسکتی۔

۱۹۱۸ء میں ابتداءً محکمہ ورزش جسمانی کا وجود عمل میں آیا اور یہ وائی۔ایم۔سی۔اے کی مدد سے چلتا رہا جس کو سالانہ ڈھائی ہزار روپیہ حکومت کی جانب سے دیا جاتا تھا اور جن کی ذمہ داری اسی قدر تھی کہ ڈرل ماسٹر کی ٹرینینگ اور ان کا معائنہ کیا جائے چونکہ کام زیادہ تھا ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کا بھی خاص محکمہ علیحدہ عمل میں آنا چاہیئے چنانچہ حکومت نے مجھے جو اس وقت کیمبرج میں زیر تعلیم تھا "ورزش جسمانی" کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے حکم دیا جب ۱۳۳۵ف میں بعد ختم تعلیم انگلستان سے واپس ہوا تو محکمہ اسکوٹس اور ورزش جسمانی کا صیغہ باقاعدہ میرے زیر نگرانی دیدیا گیا

باقاعدہ قیام محکمہ سے پہلے ڈرل ماسٹر عموماً فوجی وظیفہ خوار یا غیر تعلیم یافتہ ہوتے تھے جوں جوں محکمہ ترقی کرتا گیا ڈرل ماسٹر تعلیم یافتہ کو ترجیح دی جانے لگی جس کی وجہ سے روز افزوں غیر معمولی ترقی ہوتی گئی اور کام نہایت عمدگی سے رونق پانے لگا اور محکمہ نے غیر معمولی ترقی اختیار کی اس وقت (۱۲۵) ڈرل ماسٹر دارالسلطنت حیدرآباد میں اپنے فرائض نہایت دلچسپی سے انجام دے رہے ہیں ورزش جسمانی تمام مدارس وسطانیہ میں لازمی قرار دیگئی ہے چنانچہ مدارس کے صدر صاحبان کے اتحاد عمل سے ہر مدرسہ میں

کام بخوبی انجام پارہا ہے۔ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں طلبا کی صحت پر اس کا نمایاں اثر ہوا ہے۔
چونکہ ڈرل ماسٹروں کو موجودہ عہد سائنس میں ڈرل کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا جہاں وہ حالات حاضرہ سے واقف و آگاہ ہوتے اس لئے ان کی تعلیم کیلئے بھی خاص جماعتیں کھولی گئی ہیں جہاں اونہیں بالکل نئے طریقہ پر تیار کیا جاتا ہے کہ وہ آئندہ جب طلبا کی ذمہ داری اپنے دوش پر لیں تو وہ کافی ذمہ داری کا احساس کرنے لگیں۔

کھیل کود } ۱۹۲۰ء میں اس کا وجود عمل میں آیا۔ نواب مسعود جنگ بہادر سابق ناظم تعلیمات اس کے صدر مقرر کئے گئے تھے اور یہ کچھ نیم سرکاری حیثیت رکھتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ ہر مدرسہ سے (۵ع) روپیہ چندہ لیا جاتا تھا اور حکومت کی جانب سے تین ہزار سالانہ عطا کئے جاتے تھے اور مجلس انتظامی جس کے نو اراکین ہیں تمام کاروبار انجام دیا کرتے ہیں اور ہر سال انجمن انتظامی کے اراکین منتخب کئے جاتے ہیں ابتداءً ان کھیل کود میں صرف بلدہ کی حد تک مدارس کو حصہ لینے کی اجازت دی گئی تھی بعد میں اس کو وسعت دیکر سکندرآباد کے مدارس کو بھی اس کا موقع دیا گیا ہے۔

سالانہ اسپورٹس ہونیکے لئے ان کے علاوہ فٹبال۔ ہاکی۔ کرکٹ۔ ماس ڈرل کے باقاعدہ ٹورنمنٹ ہوتے ہیں۔ سال حال سے ٹینس ٹورنمنٹ کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ ٹورنمنٹس کے انتظامات کے لئے ہر مدرسہ کے مدرسین سے امداد لیجاتی ہے عنقریب محکمہ کی طرف سے (باکسنگ) اور کشتی کے ٹورنمنٹ بھی ہونیوالے ہیں چونکہ ایسے کھیل کود اور کاروبار کیلئے کوئی اپنا میدان نہ تھا اس لئے اس کو ملتوی رکھا گیا تھا۔ اب یہہ کوشش کی جارہی ہے کہ محکمہ کی جانب سے اسپورٹس کیلئے زمین حاصل کیجائے چنانچہ ہماری درخواست حکومت کی خدمت میں پیش ہو چکی ہے اور توقع ہے کہ عنقریب اس مبارک تقریب کے سلسلہ میں یہ شرف پذیرائی بھی حاصل کرلیگی۔ پھر ہم اپنی زمین پر نہایت منظم طور پر ان کی نمائش کرنے لگیں گے محکمہ کا خیال ہے کہ اس کو وسعت دیکر آئندہ اسپورٹس میں اضلاع والوں کو بھی دعوت دیں کہ وہ آئیں اور اپنے بادشاہ کے نوازشات شاہانہ سے مستفیض و متمتع ہوں۔

محکمہ اسکوٹس } سلطنت آصفیہ کی برکات میں ورزش جسمانی اور اسکوٹس بھی داخل ہیں اور ان محکمہ جات کی

ابتداء اسی عہد زریں میں ہوئی ہے اور اس وقت ترقی کے راستہ پر لگ چکی ہے چنانچہ حکومت نے جناب سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج اور مسٹر تاراپور پرنسپل سابق پرنسپل جاگیردار کالج کو کلکتہ اسکوٹس کانفرنس میں بحیثیت نمائندہ سلطنت بھیجا گیا تھا ان کی واپسی پر حکومت نے ۱۳۳۰ف میں محکمہ اسکوٹس کے قیام کی منظوری صادر کی اور مسٹر سید محمد اعظم بہمن ۱۳۳۲ف میں ڈائرکٹر اسکوٹس مقرر ہوئے اور نہایت خوش اسلوبی سے امرداد ۱۳۳۲ف تک آپ نے اپنے فرائض انجام دئے اس کے بعد یوسف مرزا صاحب کے ذمہ یہ کام کردیا گیا۔

۱۳۳۳ف میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور حیدرآباد اسکوٹس کے قواعد اور ضوابط ترتیب دئے گئے اور اساتذہ کو اس کی ٹریننگ کیلئے مدراس سے مسٹر کاسٹ کی خدمات حاصل کی گئیں اور آپ نے ہر طرح سے ہماری اعانت کی۔ بوائے اسکوٹس ہیڈ کوارٹر مقرر ہوا۔ پانچ ٹروپس قائم کئے گئے اس وقت جملہ اسکوٹس (۱۵۴) تھے۔

جب ۱۳۳۵ف میں میری انگلستان سے واپسی ہوئی اور نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات سرکار عالی جنھیں ورزش جسمانی اور کھیل کود سے بیحد دلچسپی تھی حکومت سے درخواست کی میرے زیر نگرانی محکمہ اسکوٹس۔ محکمہ ورزش۔ ورزشی تعلیم بھی دیدیا جائے چنانچہ یہ تحریک منظور ہو چکی اور میں نے یوسف مرزا صاحب اور مسٹر گڈون سے ان خدمات کا جائزہ حاصل کیا۔

اس وقت حیدرآباد میں ایکسو دس (۱۱۰) ٹروپس ہیں اور تین ہزار اٹھارہ اسکوٹس ہیں۔ اسکوٹس کے وجود نے ملک میں حب وطن اور ملک و مالک سے محبت کا ناقابل فراموش جذبہ پیدا کردیا ہے اور یہ جذبہ اطاعت اور وطن پرستی آنیوالی نسلوں میں بہترین اخلاق حب وطن اور جانثاری پیدا کردیگا۔

چنانچہ ہر سال ٹروپس کا معائنہ کیا جاتا ہے کئی اسکوٹس نے غیر معمولی بہادرانہ کام انجام دئے ہیں جس کے صلہ میں دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے اور ان کی ہمت بڑھانے کے لئے طلائی تمغے عطا کئے گئے ہیں ہر سال اسکوٹس ماسٹر کیلئے ایک کیمپ مقرر کیا جاتا ہے جہاں اسکوٹس ماسٹر کو ٹریننگ دیجاتی ہے چنانچہ ابتک اس قسم کے سالانہ دس کیمپس ہو چکے ہیں جب کسی اہم مسئلہ میں گفت و شنید کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لئے ایک کمیٹی ترتیب دیجاتی ہے اور مسئلہ مابہ البحث کا تصفیہ ہوتا ہے ورنہ عموماً میرے اور

و مددگار جناب علی موسیٰ رضا صاحب اور جناب وارا ناسی صاحب تمام کام انجام دیتے ہیں۔
اس طرح برکات عثمانیہ کے ظلّ عاطفت میں ہونہار نسلوں کی ارتقا میں کامیابی ہو رہی ہے اور یقین ہے کہ مستقبل قریب چمک اٹھیگا اور ملک کا ہر فرد جذبہ وطن پرستی اور جانثاری میں مشہور ہو جائیگا۔

اعلیٰحضرت حضور نظام اور معدلت

(جناب نواب مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس حیدرآباد دکن)

تمہید اعلیٰحضرت قدر قدرت مظفر الممالک والممالک نظام الدولہ نظام الملک لفٹننٹ جنرل ہز اکزالٹیڈ ہائی نس سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خان بہادر فتح جنگ آصفجاہ سابع یار وفادار حکومت برطانیہ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ جی۔ بی۔ ای۔ فرماں روائے دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے عہد با برکت کو بتاریخ ۲ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء پورے پچیس سال ہوتے ہیں۔ اس ملک کا رقبہ جو اس شاہ عالی نژاد کے زیر نگین ہے (۸۲۶۹۸) مربع میل یعنی انگلستان و ویلز کے مجموعی رقبے سے زیادہ ہے اور اس کی آبادی ایک کروڑ چوبیس لاکھ نفوس ہے۔ دو سو برس سے زائد عرصہ گزرا کہ اس خاندان گرامی کی بنیاد حضرت آصفجاہ اول نظام الملک میر قمر الدین چین قلیچ خان بہادر نے سنہ ۱۷۲۴ء میں ڈالی تھی۔ موجودہ فرماں روائے دکن خانوادۂ آصفی کے ساتویں حکمراں ہیں۔

اس مختصر مضمون کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ گذشتہ سو برس میں اس ریاست ابد مدت کے نظم ونسق عدالت میں کس طرح نشو ونما ہوئی اور اس کو موجودہ درجہ اصلاح وارتقاء تک پہنچانے میں ہمارے بادشاہ ظل اللہ نے کس حد تک توجہات بے غایات مبذول فرمائیں۔

حیدرآباد کی عدالتوں کی صد سالہ تاریخ

عدالتہائے تحت۔ ان کا قیام وارتقاء۔ اسکیم انتزاع اختیارات عدالتی وعاملانہ۔ اس کا نفاذ وعمل۔ دیگر اصلاحات

منجملہ دیگر فوائد کے جو ہندوستان کو برطانیہ عظمیٰ سے تعلق کی وجہ سے حاصل ہوئے ہیں ایک بڑا فائدہ مغربی اصول قانون ومغربی طرز انصاف رسانی کا ہندوستان میں رواج پانا ہے جس سے برٹش انڈیا کی طرح تمام دیسی ریاستیں مستفید ہوئی ہیں اور ہمارا حیدرآباد بھی متمتع ہوا ہے۔

سنہ ۱۲۲۳ھ سے قبل شہر حیدرآباد کے دیوانی مقدمات ایک عہدہ دار فیصل کرتے تھے جس کو صوبہ صاحب کہا کرتے تھے۔

فیصل کیا کرتا تھا اور فوجداری مقدمات کوتوال بلدہ کے پاس پیش ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح اضلاع میں انفصال مقدمات کا کام صوبہ داران مال اور ان کے مددگار کیا کرتے تھے جو عملدار کہلاتے تھے۔ پہلے پہل ۱۸۲۲ء میں بلدہ حیدرآباد کے دیوانی مقدمات کے تصفیہ کیلئے ایک دیوانی عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا نام "دیوانی بزرگ" تھا۔ اس کے بعد ۱۸۳۸ء میں بلدہ کے فوجداری مقدمات کیلئے "فوجداری بزرگ" کے نام سے ایک دوسری عدالت فوجداری قایم ہوئی ۱۸۵۳ء میں ایک اور عدالت "عدالت بادشاہی" کے نام سے بلدہ میں قایم کیگئی جس کو بجز سزائے موت و حبس دوام کے تمام فوجداری و دیوانی مقدمات میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ خاص عربوں کے مقدمات کیلئے بلدہ میں ایک عدالت دیوانی "محکمہ قضایائے عرب" کے نام سے موجود تھی اور اسی طرح ایک عدالت شہر کے بڑے بڑے ساہوکاروں کیلئے "مجلس مہا ہوال" کے نام سے تھی۔ ان دونوں عدالتوں کا اختیار سماعت صرف بلدہ کے مقدمات کی حد تک تھا۔

۱۸۶۶ء میں جب ممالک محروسہ سرکار عالی اضلاع و تعلقات میں تقسیم ہوا اور ضلعبندی ہوئی تو بعض ضلعوں میں بھی مستقل دیوانی عدالتیں قایم کردی گئیں۔ اضلاع میں سب سے پہلا مقام اورنگ آباد ہے جہاں اب سے تقریباً پچاس سال قبل بجائے صوبہ دار مال کے عدالتی کام کی انجام دہی کیلئے ایک مستقل "حاکم عدالت صوبہ" مامور کیا گیا تھا۔ بایں ہمہ عہدہ داران مال بھی ان مقامات پر جہاں باقاعدہ دیوانی عدالتیں نہ تھیں خصوصاً ہر ضلع و تعلقہ میں عموماً دیوانی و فوجداری اختیارات حسب سابق عمل میں لاتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں عہدہ داران مال سے دیوانی اختیارات عموماً علیحدہ کردئے گئے لیکن پھر بھی ان مقامات پر جہاں باقاعدہ دیوانی عدالتیں نہ تھیں تحصیلدار برابر دیوانی مقدمات کی سماعت کرتے رہے اور فوجداری اختیارات عہدہ داران مال و عدالت دونوں کو بدستور حاصل رہے اول تعلقدار ضلع مجسٹریٹ ضلع بھی ہوا کرتے تھے۔ بہت سے مقامات پر پولس پٹیلوں کو بھی تین روپیہ تک جرمانہ کرنے اور چار روز تک قید بلامشقت کی سزا دینے کے اختیارات فوجداری حاصل تھے۔ عدالت ہائے تحت کی یہ تنظیم ۱۹۱۱ء یعنی حضرت اقدس واعلیٰ کے جلوس کے سال اول تک قایم رہی۔ اگرچہ اس طریقہ انصاف رسانی سے صیغہ عدالت ایک حد تک ترقی کرسکتا تھا لیکن اس درجہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا جس کے آگے ترقی کی گنجائش

باقی نہ رہے۔ اس تنظیم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ بعض اوقات ایک تحصیلدار ربیع کو جس باقیدار مال گزاری کے مقابلہ میں جمعبندی کی غرض سے اپنے تمام اقتدارات تحصیلداری عمل میں لاتا تھا دوپہر کو بحیثیت حاکم عدالت اس کے دیوانی و فوجداری حقوق و فرائض کا تصفیہ کرنے بیٹھ جاتا تھا اس بات کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس آسامی کے متعلق کارروائی مال کے ضمن میں تحصیلدار کے دل پر جو اثرات مترتب ہوتے ہوں گے ان کا عکس عدالتی کارروائی میں کہاں تک پڑتا ہوگا۔ تحصیلداروں سے بالا تر عہدہ دار دوم وسوم تعلقدار ہوتے تھے جن کے تحت کئی کئی تحصیلیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ اول درجہ کے اختیارات فوجداری عمل میں لاتے تھے ان عہدہ داروں کا اکثر و بیشتر وقت اپنے فرائض مال کی انجام دہی میں دورہ پر گزرتا تھا اور بیچارے ملزمین ان کے پیچھے پیچھے پا بجولاں دور دراز فاصلوں پر گاؤں گاؤں کھچے کھچے پھرتے تھے جہاں ان کو نہ کوئی قانونی امداد مل سکتی تھی اور نہ کوئی وکیل میسر آسکتا تھا۔ علاوہ ازیں ان عہدہ داروں کو عدالتی فرائض کے مقابلہ میں قدرتی طور پر اپنے فرائض محکمہ مال کو مقدم رکھنا پڑتا تھا جس کی کوتاہی کی صورت میں ان کو فوری بازپرس کا اندیشہ تھا۔ برخلاف اس کے عدالتی کام کے تساہل کی صورت میں ہائیکورٹ ان کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا ان کے تقرر و ترقی و عزل و نصب کے بارہ میں ہائیکورٹ کو کوئی اختیار نہ تھا۔ جنھیں مقدمات فوجداری کے دوران پڑھنے کی کوئی پروا بھی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہائیکورٹ کی ہدایت و انتباہ کی ان کو چنداں فکر تھی۔ اول تعلقدار مال مجسٹریٹ ضلع بھی ہوتا تھا اور ناظم پولس ضلع بھی۔ بالفاظ دیگر اس کی حیثیت ایک ہی وقت میں پیروکار پولس کی بھی ہوتی تھی اور جج کی بھی جس کی وجہ سے ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی تھیں کہ بعض اوقات رعایا ایسے جج پر مطلق اعتماد نہیں کرتی تھی۔

ہر عہدہ دار مال کے پاس جس کو فوجداری اختیارات حاصل تھے دو عملے ہوتے تھے ایک مال کا اور دوسرا عدالت کا۔ اس عہدہ دار کو اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ ہائیکورٹ کی گشتیات و احکام و قواعد اٹھا کر بھی دیکھے اس بات کا تو کیا ذکر ہے کہ وہ اپنے عملہ عدالت کی یا محافظ خانہ کی نگرانی کرتا یا کتب ورسائل قانونی کا مطالعہ کرتا اس دوعملی کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ عہدہ داران مال اپنے فرائض عدالت

کو کافی طور پر محسوس کرتے تھے اور نہ عہدہ داران عدالت - یہ ایسی حالت تھی کہ عدالت کے وقار کو صدمہ
پہنچائے بغیر اس کو زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

ضرورت اس کی تھی کہ علو ہمت و جسارت سے کام لیکر کوئی ایسی زبردست تدبیر اختیار کی جائے
جو تمام خرابیوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ ڈالے - ۲۱ مئی ۱۹۲۱ء (۳ خورداد ۱۳۳۰ف) حیدرآباد کی تاریخ
عدالت میں ایک قابل یادگار دن ہے - اس تاریخ کو وہ فرمان واجب الاذعان شرف صدور لایا جس کی
رُو سے عاملانہ اور عدالتی اختیارات علیحدہ علیحدہ کردیے گئے تنظیم عدالت کی بنیاد از سر نو ڈالی گئی اور
ممالک محروسہ سرکار عالی کے ہر تعلقہ یا تحصیل میں پورا وقت صرف کرنیوالا ایک ایک عدالتی عہدہ دار مامور
کردیا گیا - جو دیوانی مقدمات کے تصفیہ کے وقت بہ حیثیت منصف اور فوجداری مقدمات کے وقت بحیثیت
مجسٹریٹ اپنے فرائض انجام دیتا ہے - اب اول و دوم تعلقداروں اور تحصیلداروں سے بجز ان اختیارات
کے جو بروئے ضابطہ فوجداری قیام امن کیلئے ضروری ہیں اور انتظامی نقطہ نظر سے جن کا باقی رکھنا لازمی ہے
دوسرے تمام اختیارات عدالتی کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا - ہر ضلع میں ایک ایک ناظم عدالت دیوانی مقرر
کردیا گیا جو مجسٹریٹ ضلع کے بھی فرائض انجام دیتا ہے - اور اپنے ضلع کے پورے عدالتی کام کا ذمہ دار
ہے - وہ تعلقدار جو ناظم پولس ضلع کی حیثیت سے کسی ملزم کے چالان کا حکم دیا کرتے تھے اب ان کی قسمت
کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں نہیں رہا - اب ملزموں کو عہدہ داران مال کے پیچھے پیچھے کئی کئی دن تک
تکلیفیں اٹھاتے اور مصیبتیں جھیلتے مقامات دورہ پر جانا نہیں پڑتا۔

اب ہر سمت میں جو کئی کئی اضلاع پر مشتمل ہے ایک ایک ناظم صوبہ مامور ہے جس کو فوجداری مقدمات
میں سشن کے اختیارات حاصل ہیں - اسکیم انتزاع اختیارات کے بعد سے اب ہماری عدالتہائے تحت
منصف - زائد نظمائے ضلع و نظمائے ضلع - زائد ناظم سشن و ناظم سشن تین درجہ کے عہدہ داروں پر
مشتمل ہیں اور عدالت عالیہ کے زیر نگرانی دیوانی و فوجداری ہر قسم کے فرائض انجام دیتی ہیں - اس
تمام رد و بدل کا نتیجہ یہ ہے کہ سابق میں مال و عدالت کے (۲۵۲) عہدہ دار مل کر جو تمام کام کیا کرتے
تھے اب وہی کام انتزاع اختیارات کے بعد صرف (۱۳۶) خالص عہدہ داران عدالت انجام دے رہے ہیں۔

جن کو اپنے فرائض و وقار کا پورا پورا احساس ہے۔ اس تنظیم جدید کے حقیقی اثرات و نتائج جو سات سال بعد پیدا ہوئے وہ جوڈیشل رپورٹ ۱۳۴۷ف (۲۰-۱۹۲۷ء) میں درج ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ تحصیلداروں کی عدالتوں میں مقدمے رجوع کرنے سے گریز کرتے تھے وہ لوگ اپنے حقوق کے تصفیہ کے لئے دوڑ دوڑ کر جدید قائم شدہ عدالتہائے منصفی میں آنے لگے۔ ان سات سال میں دیوانی مقدمات کے مرجوعہ میں صدفی صدر اور منفصلہ میں ۲۳ فیصد اضافہ ہوگیا اور دوران مقدمات ۳۲ فیصد گھٹ گیا رپورٹ مذکور میں اعداد و شمار سے بحث کرنے کے بعد خالص نتیجہ اسکیم ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"باوجودیکہ عدالتی کام کی اور خصوصاً دیوانی کام کی مقدار دوچند ہوگئی مگر کم عہدداروں نے زیادہ کام کیا اور کم دقت میں کیا۔"

۱۳۴۸ف میں صیغہ عدالت نے بااظہار اعداد و شمار عدالتہائے اپنی کارگزاری پر جو دہ سالہ تبصرہ پیش کیا ہے اس سے صیغہ کی ترقیات کا ثبوت ملتا ہے اور ان متعدد اصلاحی اسکیموں کا نتیجہ ہے جن کو اس دور میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے شرف منظوری عطا فرمایا۔ رپورٹ مذکور سے یہ واضح ہے کہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ء تک مقدمات دیوانی کے ادخال و تصفیہ شدہ کی تعداد میں (۸۰) فیصد کا اضافہ ہوگیا منفصلہ (۳۲ء۲۳) فیصد بڑھ گیا دیوانی و فوجداری مقدمات کے دوران میں علی الترتیب فیصد (۲۲ء۱۵) اور (۲۵) یوم کی کمی ہوئی اور آمدنی عدالت میں (۳۳ء۴۶) فیصد اضافہ ہوا۔ درحقیقت ان نتائج کے پیدا کرنے میں اسکیم انتزاع اختیارات کو بہت بڑا دخل ہے۔ رعایا نے اس اسکیم کا زیادہ خیر مقدم کیا۔ مقامی اخبارات نے اس کی پر زور تائید کی اور طبقہ وکلاء نے اس کے متعلق اعتماد کامل کے رزولیوشن پاس کئے۔ ۱۳۴۸ف کی جوڈیشل رپورٹ میں درج ہے۔

"اگر عدالتوں کی موجودہ تنظیم نے ان لوگوں کو مطمئن کردیا جن کیلئے یہ عدالتیں قائم کی گئی ہیں تو گورنمنٹ کا مقصد حاصل ہوگیا۔ عدالتوں پر اعتماد قائم ہونے ہی سے انصاف رسانی کا نصف منشاء پورا ہو جاتا ہے۔ وہ عدالت گستری جس پر رعیت کو اعتماد کلی

ہو۔ رعایا و بادشاہ کے درمیان رابطہ و اتحاد کی ایک زبردست دستاویز ہوتی ہے ۔"

آٹھ سال تک اسکیم مذکور پر عمل ہونے کے ابعد گورنمنٹ نے دریافت فرمایا کہ کس حد تک یہ کامیاب ہوئی اس کی کامل تحقیقات کیلئے ایک کمیشن منعقد ہوا جس کے ایک رکن مسٹر ڈی بجے ٹاسکر آئی۔سی۔ایس بھی تھے جو اس وقت صدر ناظم محکمہ مال تھے کمیشن نے بالاتفاق اسکیم کی تائید فرمائی اور سرکار میں رپورٹ پیش کی کہ کوئی وجوہ نہیں پائے جاتے کہ اس طریقہ کو منسوخ کرکے سابقہ طریقہ پر عود کیا جائے اس طرح گورنمنٹ نے اس اسکیم پر اپنی قطعی پسندیدگی کی نسبت مہر توثیق ثبت فرمائی ۔ اس کو ظہور میں آئے پورے چودہ سال ہوگئے اب اس کے فوائد عام و خاص سب کے نزدیک مسلّم ہیں بہت سے وہ اصحاب جن کو ابتداء میں اس کی کامیابی میں پس وپیش تھا اب وہ اس کے مفید و سود مند ہونے کے قائل ہیں ۔بعضوں کا خیال تھا کہ اسکیم کی وجہہ سے مصارف مزید عائد ہوں گے مگر یہ خیال بھی بے بنیاد نکلا ۔ بات یہ ہے کہ کام تو اتنا ہی رہا۔ سوال زیادہ تر جائدادوں کی ردّ و بدل اور تقسیم کار تھا نہ کہ اضافہ اخراجات کا۔ چنانچہ چند عہدہ داران مال کم کردئے گئے اور عدالتی عہدہ داروں میں کسی قدر اضافہ کردیا گیا ۔ اگر کسی مشین کے پرزے اچھی طرح بٹھائے جائیں تو وہ صفائی سے چلسکتی ہے ۔ اسکیم کے کثیر فوائد کے مقابلہ میں اخراجات کا قلیل اضافہ قطعاً قابل لحاظ نہیں ہے آئندہ جب کبھی حیدرآباد کی تاریخ لکھی جائیگی تو اس کے صفحات پر حضرت بندگان عالی کا نام نامی ہمیشہ اس عظیم الشان عدالتی اصلاح کا زینت عنوان رہیگا ۔

عدالتہائے بلدہ

شہر حیدرآباد کی بعض ماتحت عدالتیں خاص خصوصیات رکھتی ہیں مثلاً دارالقضائے بلدہ ۔ مسلمانوں کے مقدمات ازدواج ۔ طلاق ۔ وراثت ۔ وقف ۔ ہبہ وغیرہ ۔ کا تصفیہ خالص شرع شریف کی رو سے کرتی ہے ۔

بلدہ میں دیوانی اور فوجداری عدالتیں علیحدہ علیحدہ قایم ہیں جو علی الترتیب بلدہ کے صرف دیوانی و فوجداری مقدمات کے تصفیے کرتی ہیں برخلاف ان کے اضلاع کی عدالتہائے تحت دیوانی و فوجداری دونوں اختیارات ساتھ ساتھ عمل میں لاتی ہیں۔ شہر حیدرآباد میں حال ہی میں ایک علیحدہ اور مستقل

عدالت خفیفہ قائم ہوئی ہے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں حیدرآباد کا نمبر چوتھا ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ساڑھے چار لاکھ ہے۔ یہاں کا کاروبار اور لین دین روز بروز بڑھ رہا ہے۔ عدالہائے تحت کی تنظیم میں از سر نو اصلاح و ترمیم کی جا چکی تھی۔ عہدہ داروں کا معیار قابلیت بڑھادیا گیا اور وہ وقت آگیا تھا کہ ان کو اختیارات خفیفہ دیدئے جائیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۲ء میں قانون عدالت مطالبات خفیفہ نافذ ہوا جس کی رو سے جہاں جہاں ضرورت ہوئی وہاں کے ناظم عدالت کو اختیارات خفیفہ عطا کردئے گئے اس انتظام نے پبلک کو اپنی طرف بطور خاص رجوع کرلیا۔ انصاف رسانی کی تیز رفتاری۔ تجارت لین دین۔ اور کاروبار کیلئے بہت ہی تقویت بخش اور موجب ترغیب ہوئی۔ عدالت مطالبات خفیفہ کے مقدمات کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ یہیں اور آگے قدم بڑھانیکی ضرورت ہوئی یہاں تک کہ ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے ترمیم قانون مطالبات خفیفہ کو شرف منظوری بخشا جس کی بناء پر بلدہ حیدرآباد میں ایک جداگانہ عدالت خفیفہ قائم کیگئی جو اس وقت پندرہ سو روپیہ تک مقدمات خفیفہ کی سماعت کر رہی ہے اور بصورت ضرورت دو ہزار تک اس کے اختیارات میں توسیع کی جاسکتی ہے۔ اس عدالت میں ایک جدید عہدہ دار جس کا درجہ ناظم سمت کے مساوی ہے مامور کیا گیا ہے۔

زرنقد کے مقدمات جو سابق میں برسوں نہیں تو مہینوں تک ضرور چلتے رہتے تھے اب وہ ہفتوں میں فیصل ہو رہے ہیں اس عدالت کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور عوام الناس کے اعتماد کی رو تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ سنہ ۱۹۳۵ء میں مقدمات خفیفہ کی تعداد اس درجہ بڑھ گئی کہ ایک ناظم کیلئے اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہوگیا اور حضرت بندگان عالی نے بکمال مرحمت ایک زائد ناظم خفیفہ کے تقرر کی منظوری صادر فرمائی اب شہر حیدرآباد کی عدالت خفیفہ میں دو جج کام کر رہے ہیں اضلاع میں جہاں کہیں ضرورت تھی عام ناظما اور بہت سے منصفوں کو بھی اختیارات خفیفہ دیدئے گئے ہیں۔ (باقی)

شہاب

جلد (۴) تیر ۱۳۴۵ف مطابق مئی سنہ ۱۹۳۶ء نمبر (۸)

عوام سے (۱۱ﻟ) گورنمنٹ سے (۱۱۵)

مرتبہ:
محمد عبد الرزاق بسمل

رہبر دکن برقی پریس میں طبع ہو کر بیرون دبیرپورہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ھ

رُباعی

مولانا امجد

کس وقت، ہوا و حرص کا جوش نہیں
کس وقت، خدا ہم کو فراموش نہیں
اک وہ ہیں، کہ جن کی نیند بیداری ہے
اک ہم ہیں، کہ بیداری میں بھی ہوش نہیں

قطعہ

کیونکر کہیں دوسروں کو امجدؔ!
یہ بدصورت ہے، وہ حسیں ہے
کچھ اپنے ہی حق میں کہہ سکیں ہم
افسوس اتنا بھی حق نہیں ہے

یا معین

غزل

جناب امیر اکبر نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر (امیر پائیگاہ)

(۱)

شبِ وعدہ کہانی روزِ فرقت کی بیاں کیوں ہو
جو دل سے لب تک آ جائے وہ اپنی داستاں کیوں ہو

جو بُت ہوں مہرباں ہم پر خدا نا مہرباں کیوں ہو
جگر صرفِ تپش کیوں ہو زباں گرمِ فغاں کیوں ہو

مرے سینے پہ کیوں رکھے کوئی دستِ حنا بستہ
الٰہی رحم کے قابل مرا سوزِ نہاں کیوں ہو

وہ کیوں آکر ملیں مجھ سے کلیجہ کیوں کریں ٹھنڈا
مرا سوزِ تپِ فرقت نصیبِ دشمناں کیوں ہو

ہمارے جذبۂ دل میں اثر آئے تو کیوں آئے
خدا ناکردہ محنت دشمنوں کی رائگاں کیوں ہو

یہ مانا داستانِ ہجر پُر آشوب ہے لیکن
نہ ہو سننے کی طاقت جس میں اپنا راز داں کیوں ہو

خموشی میں کروں اظہارِ سوزِ دل سرِ محفل
زباں شمع کی صورت میرے منہ میں زباں کیوں ہو

نہ آنے دو سرِ محفل مگر انصاف سے کہہ دو
ہمارا مدعی آخر تمہارا پاسباں کیوں ہو

نزاکت میں اثر پیدا ہوا ہی کیا نگاہوں کا
بسے ہو میری آنکھوں میں تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

رہینِ منتِ اغیار کیوں ہو آپ کے ہوتے
مسیحائے مریضِ عشق مرگِ ناگہاں کیوں ہو

جو تم آؤ شبِ وعدہ تو اندازِ حیا کیسا
ہٹ جائے جو خلوت کی تو دشمن درمیاں کیوں ہو

اگر کچھ پاس ہو اہلِ وفا کا او وفا دشمن
معینؔ سے عرضِ مطلب پر نہیں غیروں سے ہاں کیوں ہو۔

مہاتما گوتم بدھ کے مختصر حالات

(۱)

جناب نواب میر عباس حسین خاں صاحب بزمؔ

ہندوستان میں راجہ رامچندرجی۔ سری کرشن جی۔ مہاتما بدھ کی ہستیاں نہایت ممتاز مشہور گذری ہیں۔ اہل اسلام یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں بھی فسق و فجور و مظالم و نیز دیگر بداعمالیوں کی کمی نہ تھی ایسے امور سے ہندوستان کی مخلوق بھی جدا نہیں ہوسکتی تھی اس لئے یہاں بھی ایسے نفوس قدسی کی ضرورت تھی جو اپنی ذات سے بہرہ ور کر مخلوق کو بداعمالیوں کی تاریکیوں سے نکالیں اور نیکی کے روشن میدان میں لانے کی سرگرم کوششوں میں مصروف رہیں۔

ان مقدس ہستیوں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانہ میں گمراہوں کے لئے مشعل راہ بنا ہوا تھا اور ہر ایک توحید کا نغمہ الاپنے والا تھا اسلامی نقطہ نظر سے اگر ان لوگوں کو درجہ پیغمبری حاصل نہ ہو لیکن ان کا طرز عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ ضرور منجانب خدا مخلوق کی ہدایت پر مامور تھے اگر اس کا ثبوت نہ ملے تو یہ ماننے میں تامل نہیں ہوتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروردگار عالم نے ان لوگوں کے دلوں میں اس قسم کا مادہ ودیعت کر دیا تھا اور اسی وجہ یہ اپنے اپنے رنگ میں مخلوق کے لئے تادم زیست ہادی بنے رہے ہم ان تین بزرگ ہستیوں سے ایک ہستی مہاتما گوتم بدھ کے مختصر حالات جو کتابوں میں دیکھے اور ثقات سے سنے گئے اس وقت تحریر کرنا چاہتے ہیں۔

تحقیق کرنیوالوں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ یہ خدا کا نیک بندہ حضرت مسیح سے پانسو اسٹھ سال قبل پیدا ہوا تھا ان کے والد ذات کے چھتری اور ایک راجدھانی کے مالک تھے جس کا نام کپل واستو تھا اور خود راجہ کا نام شدھودن تھا۔

اس راجہ کی دو رانیاں تھیں مگر چوالیس سال کی عمر تک کوئی اولاد نہ ہوئی پینتالیس سال کی عمر میں خدا نے بڑی رانی پر فضل فرمایا اور آثار حمل نمودار ہوئے۔ دستور کے موافق حمل کے زمانہ میں ایام ولادت کے قریب یہ بڑی رانی مہا مایا دیوی اپنے میکہ کی طرف روانہ ہوئی تاکہ پہلی زچگی والدین کے گھر ہو۔ اثناء راہ میں لمبنی نام گاؤں کے قریب ایک باغ میں فروکش ہوئی اور یہیں دردِ زہ شروع ہوا۔ اور یہیں صدفِ بطن سے یہ انمول موتی روحانی و نورانی چمک لئے ہوئے عالمِ وجود میں آیا۔ مگر افسوس ہے کہ ساتویں روز ہی مہا مایا دیوی کا انتقال ہوگیا اور اس بچہ کی پرورش راجہ کی چھوٹی رانی کے ذمہ ہوئی جو کہ رشتہ میں بچہ کی خالہ بھی تھیں

چند روز کے بعد راجہ کے سامنے کسی نجومی نے یہ حکم لگایا کہ یہ راجکمار دنیا کے مصائب دیکھ کر فقیر ہو جائیگا اور جنگلوں میں زندگی بسر کریگا۔ راجہ نجوم کا معتقد تھا اس خبر سے نہایت مغموم ہوا۔ اور تقدیر سے مقابلہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ بچہ کو محل سے باہر نہ جانے دیا جائے تاکہ کسی شخص کی مصیبت یا تکلیف اس کو نظر ہی نہ آسکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کو محل ہی میں خفیہ طور پر علوم و فنون کی تعلیم بھی دلائی گئی تھی۔ ایک روز ریاست کی رعایا نے راجہ کے روبرو یہ استدعا کی کہ راج کمار کو فنون سپہ گری کی تعلیم دلائی جائے ورنہ جنگ کے وقت دشمنوں سے ہم کو کیا بچا سکیگا۔ اس پر راجہ نے ایک دن مقرر کرکے رعایا کو محل میں طلب کیا اور راجکمار کو بلوا کے سب کے روبرو فنون سپہگری دکھانے کا حکم دیا۔ راج کمار نے اوسی وقت ایسے کرتب دکھائے کہ لوگ مطمئن ہوگئے۔ معتقد حضرات بطور یقین یہ کہتے ہیں کہ راجکمار کو تعلیم نہیں دلائی گئی تھی بلکہ وہ پیدائشی جامع الکمال تھے۔

راجکمار کی شادی جسو دارا جی کے ساتھ ہوئی جو راجکمار کی ماموں زاد بہن تھی۔ یہ نسبت اس طرح ہوئی کہ راجہ نے ایک تقریب کے حیلہ سے قرب و جوار کے چھتری

خاندان کی لڑکیوں کو اپنے محل میں بلوایا تاکہ راجکمار اپنی زندگی کا شریک بنانے کے لئے کسی کو ان میں سے انتخاب کرے۔ راجکمار نے سب کو دیکھا اور رخصت کے وقت ہرایک کو تحفہ دیکر رخصت کردیا۔ مگر جب جسو دہ بائی کی نوبت آئی تو اس کو زر و جواہر تحفہ دینے کے عوض ایک پھول دے کے رخصت کیا اور بالآخر اسی کے ساتھ شادی ہوئی۔ دونوں میاں بیوی میں بڑی محبت والفت تھی شب و روز ہنسی خوشی میں بسر کرتے تھے۔ تھوڑے زمانہ کے بعد بیوی میں آثار حمل نمودار ہوئے جس سے دونوں کی مسرت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ مگر دیکھئے اب تقدیر رنگ لاتی ہے اور امر شدنی پیش آتا ہے۔ ایک روز راج کمار کا بے اختیار جی چاہا اور رتھ بان کو رتھ حاضر لانے کا حکم دیا رتھ بان نے رتھ حاضر کی راج کمار سوار ہوا۔ اور محل کے باہر نکل کے آبادی شہر کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک بوڑھا نظر آیا جس کے دانت گر گئے تھے بال سفید ہوگئے تھے۔ بصارت خراب ہوگئی تھی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگیا تھا چلنے میں دو دو قدم پر سانس پھولتی تھی راج کمار اس بوڑھے کو دیکھ کر حیرت میں پڑگیا۔ رتھ بان سے پوچھا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہے اوس نے کہا کہ ہر انسان ضعیفی میں ایسا ہی ہوجاتا ہے ایک زمانہ ایسا آجائیگا کہ مہاراجہ بھی بلکہ خود راجکمار بھی ایسے ہی ہوجائینگے یہ سنتے ہی راجکمار کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اب رتھ آگے بڑھی تو ایک کوڑھی نظر آیا جس کا تمام جسم سفید ہوگیا تھا۔ دریافت پر رتھ بان نے کہا کہ دنیا میں ہزاروں قسم کی بیماریاں ہوتی ہیں اون میں سے ایک بیماری یہ بھی ہے اور اس مرض کا نام "کوڑھ" ہے لوگ ایسے بیمار سے دور دور رہتے ہیں کیونکہ جو شخص اس کے نزدیک رہیگا وہ بھی مرض کے اثر سے ایسا ہی ہوجائیگا۔ راجکمار نے پوچھا کہ کیا اور لوگ بھی شہر میں بیمار ہوتے ہیں تو رتھ بان نے کہا کہ ہزاروں آدمی بیمار ہیں اور ہر بیماری ایک علیحدہ قسم کی ہے دنیا میں کوئی ایسا آدمی نہ ملیگا جو کبھی بیمار نہ ہوا ہو۔ راج کمار کے دل پر یہ دوسری چوٹ تھی۔ پھر رتھ آگے بڑھی تو ایک جنازہ نظر آیا۔ چار آدمی کاندھوں پر ایک میت کو لیجا رہے تھے اور کچھ لوگ روتے ہوئے آگے پیچھے چل رہے تھے راجکمار نے پوچھا کہ یہ کیا ہے اور یہ لوگ کیوں رو رہے ہیں اس پر رتھ بان نے

غرض کی کہ جو شخص مرجاتا ہے کہ اوس کو اسی طرح لیجاتے ہیں۔ بعض لوگ مردہ کو دفن کرتے ہیں اور بعض جلا دیتے ہیں جو لوگ رو رہے ہیں وہ اس میت کے قرابتدار ہیں اور کچھ دوست بھی ہیں مرنے والا دنیا سے منھ موڑ کے سب کو چھوڑ کے چلا گیا ہے۔ اسی لیئے یہ لوگ رو رہے ہیں یہ جدائی ایسی ہے کہ پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی موت کے سخت پنجہ سے بچہ جوان بوڑھا کوئی بھی نہیں چھوٹ سکتا ہے یہ دن ہر شخص کو پیش آنیوالا ہے مگر کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ یہ دن کب آئیگا موت کا کوئی زمانہ یا وقت معین نہیں ہے۔ رتھ بان کے اس بیان نے راج کمار کے دل پر بجلی کا کام کیا۔ ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ جب دنیا ایسی چیز ہے تو اس سے دل لگانا ٹھیک نہیں ہے اسی سوچ میں راج کمار ایک ندی پر گیا اور غسل کر کے غور و فکر میں مصروف ہوگیا او تیسرے پہر تک انہیں خیالات میں غرق ایک درخت کے نیچے بیٹھا رہا اور یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ ترک دنیا کر دینا چاہئے۔ سر مغرب محل کی طرف جانے کے لیئے رتھ میں قدم رکھا تھا کہ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور فرزند ارجمند پیدا ہونیکی خوش خبری سنائی راج کمار کے منھ سے بیساختہ یہ جملہ نکلا کہ ایک نئی زنجیر میرے پاؤں میں پڑی ہے لیکن میں اس کو بھی توڑ دوں گا۔ غرض انہیں خیالات کو لیئے ہوئے محل میں گیا یہاں ایک رشتہ دار لڑکی نے مبارکباد گایا۔ راج کمار نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار نکال کر کے اوس کو دیدیا۔ لوگ سمجھے کہ محل بنانے کی نیت سے ہار پہنایا ہے لیکن راج کمار کی یہ نیت نہ تھی وہ دنیا کی چیزوں کو اپنے سے جدا کرنا چاہتا تھا۔ اوس کے بعد فرزند کی ولادت کی خوشی میں جو محفل نشاط آراستہ ہوئی تھی اوس میں دوپہر رات تک شرکت کی اور اس کے بعد صحرا نوردی کے ارادہ سے رتھ لانیکا حکم دیا۔ اب بیوی اور فرزند کی محبت نے قدم پکڑ لیئے دل نے نہ مانا کہ بے ملے چلے جائے۔ بیوی کے کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ بچہ پر ہاتھ رکھی ہوئی آرام کر رہی ہے اگرچہ محبت نے بہت جوش مارا کہ بیوی کو بیدار کر کے ملے مگر ضبط کیا فقط بیوی کے حسین پاؤں کو بوسہ دیکر اور بچہ کی نازک پیشانی کو چوم کر روانہ ہوگیا اور صبح ہوتے ہوتے بہت دور نکل گیا اور ایک ندی کے کنارے پہنچ کر رتھ بان کو بھی رخصت کر دیا۔ اب اس کے بعد بیکہ و تنہا

سات دن تک یہ سوچتا رہا کہ اب مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ اولاً علم کی روشنی سے سینہ کو منور کرنا ضروری ہے اسی دھن میں راج گدہ گیا اور یہاں پنڈتوں سے تحصیل علم کر کے ندھیاچل کے جنگل میں گیا اور یہاں مجاہدہ نفس شروع کیا اور یہاں اسی رنگ میں چھ سال بسر کئے اس کے بعد یہاں سے نکل کے بحالت ضعف و ناتوانی مرنجادہ ندی کے کنارے پہنچا۔ کمزوری کا یہ عالم تھا کہ چار قدم چلنا مشکل تھا۔ یہ حالت دیکھ کے ایک دیہاتی لڑکی نے راج کمار کو میٹھا بھر دہی کھلادی۔ اس کھانے کے بعد راجکمار نے سات دن تک روزہ رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں ایام میں پردہ حجاب اٹھ کے عرفان حاصل ہوا۔ اور غیب سے یہ تلقین ہوئی کہ "ریاضت بیکار ہے" نجات حاصل کرنی ہو تو رحم و محبت کے راستہ پر چلو"۔ اب راجکمار مہاتما ہو گیا تھا اپنے فلسفہ و عقائد کی اشاعت کے لئے بنارس پہنچے اور مواعظ حسنہ سے لوگوں کے دلوں کو منور کرنا شروع کیا۔ صدہا لوگ ان کے مرید بن گئے اور دن بدن تعداد میں زیادتی ہونے لگی۔ موسم سرما کا آغاز ہوا تو مہاتما نے اپنے چیلوں کو مختلف ممالک میں اشاعت مذہب کیلئے بھجوایا اور خود اپنے وطن کیطرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک آتشکدہ ملا۔ کہتے ہیں کہ اس آتشکدہ میں ایک زہریلا سانپ رہتا تھا جو رات کو نکل کے وہاں سوئے ہوئے آدمیوں کو ڈستا تھا۔ مہاتما نے باوجود ممانعت کے رات آتشکدہ میں بسر کی صبح کو جب لوگوں نے صحیح و سلامت دیکھا تو ان کی کرامت کے قائل ہوگئے۔ یہاں سے بعد طے منازل اپنے وطن پہنچے ان کی گذر بسر خیرات پر ہوتی تھی مگر دستور یہ تھا کہ ان کے چیلے بڑے آدمیوں کے گھروں پر جا کے سوال نہیں کرتے تھے بلکہ غریبوں کے گھروں پر جا کے خاموش کھڑے رہتے تھے اور وہ کچھ دیتے تو لے لیتے۔ یہ خبر ان کے باپ راجہ کو معلوم ہوئی تو وہ آیا اور ان کو جبر کر کے محل میں لے گیا دیکھنے کے لئے تمام رشتہ دار و عزیز جمع ہوئے۔ مگر غم نصیب جسودا بائی یعنی ان کی بیوی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ زبان سے معلوم ہوگیا تھا کہ شوہر فقیر ہوگیا ہے۔ اس لئے اس نے بھی دنیا کا عیش ترک کر دیا تھا۔ انتہائی خوشی کے وقت جب کہ بیٹا پیدا ہوا تھا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ یہ بات اس کو یاد تھی کہ کوئی

خطا کوئی قصور مجھ سے نہیں ہوا تھا۔ باوجود اس کے میرا سرتاج مجھ سے بے بے چلا گیا تھا اس لئے شوہر سے ملنے نہ گئی اب وہ اس کا حسن و جمال بھی رنج و غم کے باعث باقی نہ رہا تھا مہاتما خود بیوی کے پاس گئے جسبودا اپنے جان و مال کے مالک کے قدموں پر گر گئی اور خود کو بھی چیلوں میں شریک کرنے کی استدعا کی مگر فقیروں کے گروہ میں عورت نہیں رہ سکتی تھی اس لئے مہاتما نے انکار کر دیا

ایک روز مہاتما محل میں اپنے چیلوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور شہر بت دیدار کی پیاس جسو را بائی دور سے دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں اس کا لڑکا جس کا نام "راہل" رکھا گیا تھا سامنے آیا۔ جسودا نے کہا دیکھ تیرا باپ وہ جوگی ہے جو سب میں تارہ کی طرح چمک رہا ہے اب تو جا کے مل اور اپنی میراث مانگ۔

راہل سامنے گیا اور میراث مانگی باپ نے منظور کیا اور راس کو بھی اپنی منڈلی میں شریک کر لیا یعنی یہی میراث تھی۔ اس کے بعد جسبودا بھی برتن مانجھنے کی خدمت انجام دینے کے لئے اس گروہ میں شریک ہو گئی۔

اس عرصہ میں راجہ کا انتقال ہو گیا اور مہاتما باپ کی راجدھانی سے نکل کے بمقام پاوا تشریف لائے اور یہاں بمرض پیچش ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ مہاتما کی شریعت کیا تھی یہ چیز ہمارے بحث سے علیحدہ ہے ہم کو صرف اون کے حالات زندگی ظاہر کرنا مقصود ہے ان کے پاس عبادت کا کیا طریقہ تھا یہ بھی کچھ ظاہر نہ ہوا۔ ان کے قدیم مجسمے یا سنگی قصاویر پرانے مندروں میں اس قسم کے دیکھنے میں آتی ہیں کہ گویا مراقبہ میں مصروف ہیں اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ شاید ان کے پاس عبادت کا یہی طریقہ تھا۔

گوتم بدھ کی اخلاقی تعلیم نہایت عمدہ ہے ہم نبطور اختصار کچھ اوس کے اجزاء لکھتے ہیں (۱) والدین کی اطاعت کرو اہل و عیال کے خبر گیراں رہو (۲) مستحق عزت کی عزت کیا کرو۔ (۳) علم حاصل کرو (۴) دانشمندوں کی خدمت کیا کرو۔ نادانوں کی صحبت سے بچے رہو (۵) خیرات کرو (۶) سچ بولا کرو (۷) اقرباء کی مدد کرو (۸) معصیت سے بچے رہو۔ قناعت اختیار کرو۔

اور مصیبت برداشت کرنے کی عادت ڈالو (۹) اپنی عصمت کی حفاظت جان سے بھی زیادہ کرو۔(۱۰) دل پر اتنا قابو حاصل کرو کہ غم و غصہ کا اوس پر اثر نہ ہونے پائے (۱۱) تمام عالم سے محبت رکھو۔ بغض و عناد کو دل میں جگہ نہ دو (۱۲) اخلاق حسنہ اختیار کرو اس سے آخرت میں بھی اعلیٰ درجہ ملتا ہے۔

مکتوبات جمیل

مجسمہ ہمدردی: دلی دعائیں!!

تمہارے خط نے اس مردہ دل کو کسی قدر زندہ کردیا۔ اس مشورہ کا شکریہ کہ مطالعہ کتب سے اپنے رنج بہلاؤ لیکن پڑھی ہوئی کتابیں پڑھنا چبائے ہوئے لقمہ کو پھر چبانا ہے کسی اچھے کتب خانہ سے نئی کتابیں منگوانیکا ارادہ ہے لیکن ابتک منگوائے نہیں۔

تم نے . . . . کے کتابوں کی تعریف کی ہے کیا مستعار بھیج سکتی ہیں؟ میں نے تمہارے خط میں . . . کے نام ایک مکتوب نیاز ملفوف کیا تھا شاید بھیجدیا گیا ہوگا بیچاری میری ہی طرح قابل رحم ستم رسیدہ ہستی ہے خدا اپنا رحم فرمائے۔

اشعار دلچسپ ہیں لیکن یاد رہے خیال کا درجہ ملاقات سے کہیں۔ بڑھ چڑھکر ہے ملاقات ایک ختم ہوجانے والی ناپائیدار چیز کا نام ہے مگر خیال ایک برگزیدہ اور لازوال شئے خیال کا درجہ بلند ہے بلاشبہ بلند۔ میں ہمیشہ عالم خیال میں پڑی ہوئی رہتی ہوں جی چاہتا ہے غالب کی طرح عرش سے پرے کوئی مقام بنالوں۔ سہ۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔

خطوط لکھنا مجھ سے نہیں ہوسکتا اس کے یہ معنی نہیں کہ بالکل نحیف و ناتوان ہوں۔ جی نہیں۔ صحیح و سلامت ہونیکے باوجود اندنوں کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ مجھے اتنے لمبے چوڑے خطوط لکھو اور جلد جلد کہ میں گھنٹوں لطف اٹھا سکوں۔ لیکن مجھ سے یہ توقع فضول ہے کیونکہ لکھنے سے بھی اب نفرت ہوگئی ہے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی!　　موت آتی ہے پر نہیں آتی!

بزم کہکشاں

کس قدر خاک ہوا ہے دل مجنوں یا رب
نقش ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا غالب

ہے نزاکت بسکہ فصل گل میں معمار چمن!
قالب گل میں ڈھلی ہے خشت دیوار چمن غالب

برق نے اک طرز بیتابی مرا سیکھا تو کیا
سینکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں تسلیم

نہ تجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد!
نکل کر کیا کروں میں آشیاں سے مومن

فانی فسوں موت کی تاثیر دیکھنا
ٹھیرا وہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا فانی

جاتا ہوں جدھر اٹھتی ہے سب کی ادھر انگشت
یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت غالب

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ سانحہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب آ نہ سکا سیماب

سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہوگیا ذوق

گریباں آستیں رومال سب اشکوں میں ڈوبے ہیں
یہ کس نے ان کے آگے جا کے میری داستاں کہدی آرزو

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پہ اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے مومن

مرسلہ ج نقوی

سراپا

عارض گلگوں لالہ حمرا خال نمایاں داغ سیاہش
ہیئت ہیبی غنچہ نرگس نقطہ نرگس غنچہ خنداں
رشتہ مریم لعل لبا و نازک و رنگین ہمچو برگ گل
با دنفس چوں باد مسیحا نطق در وچوں نکہت بہار
گوہر دنداں قطرہ شبنم رنگ تبسم آئینہ از وے
راست چو اندر قطرہ شبنم عکس شعاع مہر درخشاں
لالی پان و رنگ مسی ہم طرفہ بہاری ساختہ پیدا
برگ بنفشہ بر گل احمر یا شفقی در شام غریباں
سادہ زنخ را عنبر سارا ہر دو طرف در حلقہ گرفتہ
راس و ذنب را آمدہ گوئی گوی عطارد در خم چوگاں
زیر زنخداں غب غب سیمیں سیب آبی آبدہ توام
سیب نہ سیمی آبی چہ آبی ہر دو یکی از روضۂ رضواں

(باقر ایرانی)

بھائی کی یاد میں

پریم بخشی

دن بہت رستے ہیں۔ اور رات کی دراز خاموشیاں۔ دن کی چہل پہل مرے لئے دونوں یکساں ہیں

مگر بھائی تو کہاں؟

صبح کوئل کی کوک سے دل میں ہوک اٹھتی ہے پپیہے کی پی کہاں سے قلب پر چوٹ لگتی ہے بھانت بھانت کی چڑیاں اپنے سریلے نغموں سے مری طویل خاموشی توڑ رہی ہیں ان کے معصوم ترانوں میں مجھے ترے گنگنانے کی آواز آتی ہے تو میں اچانک چونک اٹھتی ہوں اور جب یہ خیال آتا ہے کہ آہ تو کہاں؟ تو پھر مجھ پر طویل خاموشی چھا جاتی ہے۔

مگر بھائی تو کہاں؟

جب آفتاب گوشہ مشرق سے دنیا والوں کو پیغام بیداری سناتا ہے اور اپنی نورانی کرنیں زمین کے ذرہ ذرہ پر پھیلا کر "بیدار بھی ہو کچھ کام بھی کر آخر تو تجھے سوتا ہی ہے"

تو میں چونک پڑتی ہوں اور میری مدہوشی غائب ہو جاتی ہے اور فوراً مجھے یاد آجاتا ہے کہ آہ تو تو سویرے سب کو جگایا کرتا ہے۔

مگر بھائی تو کہاں؟

مطلع شفق آلود ہو رہا ہے۔ چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ستارے پریشان نظر آرہے ہیں تو مجھے یاد آجاتا ہے کہ آہ تیرے بال بھی تیری لاپروائی سے یوں ہی پریشاں رہا کرتے تھے تو دل پر ایک سخت چوٹ لگتی ہے۔

مگر بھائی تو کہاں؟

جاڑوں کی طویل راتیں مجھے بیدار کر دیتی ہیں اور مجھے تیری تلاش ہوتی ہے مگر تیرا بستر ا خالی۔ تیرا ٹھکانا اداس نظر آتا ہے پھر آپ ہی آپ یہ خیال آتا ہے کہ تو نہیں آئیگا کبھی نہیں آئیگا وہاں گیا ہے جہاں سے پلٹ کر آج تک کوئی نہیں آیا۔ تو اس کے ساتھ ہی مرے دل سے ایک چیخ نکلتی ہے

مگر بھائی تو کہاں

تنہائیوں میں روتی ہوں جب کہ تیری چیزیں نظر آتی ہیں اور میرے دل کا زخم اندر ہی اندر ہرا ہو جاتا ہے کہ آہ تو نے بھی مجھے بہلا دیا۔ میرے دن بغیر تیرے کیسے کٹیں گے۔ اس دنیا کی کل کائنات جب کہ محض دو حرف رنج و الم ہیں تو پھر کیوں نہیں مجھے اپنے پاس بلا لیتا کہ میری بتیاب ساعتیں تیری معیت میں خوشگوار ہو سکیں گی تو یہ دیکھ کر تو مجبور ہے اور لاچار" خاموش رہجاتی ہوں اور دل سے ایک آہ نکل جاتی ہے۔

سلام

جناب مرزا محمد بہادر صاحب یاور ناظم عدالت

گہر ریز و گہر افشاں تجھے ای چشم تر جانا
بندھا جب آنسوؤں کا تار اسے نظم گہر جانا

غضب تھا کربلا سے شام تک تفتہ جگر جانا
کسی کا پا برہنہ اور کسی کا ننگے سر جانا

کیا جب کوچ دنیا سے تمہیں کو راہبر جانا
محبت کو تمہاری یا علی رہ زاد سفر جانا

محرم کا مہ نو دیکھکر ہوتا ہے دل ٹکڑے
اسی نشتر نے سیکھا ہے کلیجہ میں اتر جانا

غم شبیر نے دل پر کیا ہے وار خنجر کا
یہی وہ زخم ہے آساں نہیں ہے جس کا بھر جانا

ادھر دل تھام لینا بانوئے ناشاد کا رو کر
ہمک کر گود میں حضرت کی اصغر کا ادھر جانا

علی اکبر کے غم میں چل گئی ہے دل پہ ایک برچھی
یہ گہرا گھاؤ ہے ممکن نہیں اب اس کا بھر جانا

بھلا یاور یہاں آئیگا اے کوثر کے متوالو
نجف کا رند ہے ہرگز نہ اس کی بات پر جانا

اپالو کی ایک ساعت

اپالو کی ہر رنگین شام حسن کی شہر آشوبیوں کیلئے مشہور ہے۔ جہاں قدم قدم پر نظارہ کا تپ اوٹھتا ہے اور ایک رمز شناس محبت۔ دلاویز تبسم۔ دیباچہ حسن و رعنائی۔ سیلاب قوس قزح میں اپنے وجود کو کچھ عرصہ کیلئے بھول جاتا ہے۔

ایسی کئی شامیں کسی کے لئے وقف انتظار رہیں آخر تھک کر یہی کہنا پڑا۔ "اے کاش وہ آجاتے" مگر کہاں؟

اس مجمع محشر سے گھبرانے لگا ہی جی — خلوت میں کہیں لے چل اے جذبۂ تنہائی
یہ حسن کی دنیا ہے معمور اداؤں سے — اک کیف برستا ہی رنگین فضاؤں سے
سو فتنہ خوابیدہ بیدار ہیں ٹھوکر سے — ہر گام نئی آفت ہر خوبی پیکر سے
یہ نازکی محفل ہی محفوظ رہے کیوں کر — جاتی ہی نگہ حسن رخ کانپ اوٹھتی ہی تھرا کر
سو بجلیاں گرتی ہیں ہر شوخ نگاہوں سے — کچھ کام نہیں چلتا دن رات کی آہوں سے
اللہ رے وفور حسن یہ شوق جبیں سائی — ہوشیار یہاں آکر بن جاتا ہے سودائی

اے کاش! وہ آجاتا دل جس کا ہی شیدائی
قدرت نے جسے بخشی دنیا کی ہے رعنائی

الف لیلہ

جناب اقبال علی خاں صاحب

دنیا کی مقبول ترین کتابوں میں شاید الف لیلہ ہی وہ کتاب ہے جو حسن قبول کی اولین صف میں جگہ پاسکتی ہے۔ ہر دور و ہر عہد میں اس پر کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی ضرور ہوئی ہے اور دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ایسی ہوگی جس میں اسکا ترجمہ نہ ہوا ہو۔

حال ہی کے الاہرام مصر میں شیخ الظنون الجمیل نے اس کی نسبت یوں ظاہر کیا ہے الف لیلہ جو چوتھے قرن ہجری میں مرتب ہوئی ہے اس کی ترتیب سے عالم ادب پر بہت بڑا اثر پڑا ہے کیونکہ لغت عربیہ میں الف لیلہ کی تدوین سے پہلے اس قسم کے قصص پائے نہیں جاتے تھے اس قسم کا تخیل کبھی عالم وجود میں نہیں آیا ہے البتہ اس کے بعد اسی قسم کے قصص ان میں اضافہ کئے گئے ہیں اور اسکی تقلید میں دوسرے قصص ظہور میں آنے لگے بعض حضرات کا خیال ہے کہ الف لیلہ دراصل فارسی ہے اور یہی رائے مسعودی ابن ندیم کی ہے۔ مروج الذہب میں سلفستر الفرنسوی نے یہی بیان کیا ہے الف لیلہ کے فارسی ہونے پر کامل سولہ سال تک بحث ہوتی رہیں متعدد مقالے لکھے گئے اور یہ آراد ایک حد تک درست معلوم ہوتے ہیں کیونکہ نفس کتاب میں اسماء ملوک فارسی ہیں جیسے شہزاد۔ دنیازاد۔ شاہ زماں جا بجا موجود ہیں ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ایک بادشاہ تھا جو ہر شب عقد کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے اوس کو قتل کردیا کرتا چنانچہ اس ہنگامہ قتل وخون کے مسدود کرنے کیلئے شہزاد جو اوس بادشاہ کے وزیر کی لڑکی تھی بادشاہ سے عقد کی خواہش کی اور بعد نکاح اوس نے شب میں ایک دلچسپ و پرلطف داستان شروع کی حتی کہ صبح ہوگئی مگر داستان ختم نہ ہوئی اور بادشاہ کو بقیہ حصہ سننے کی تمنا رہگئی اسلئے تکمیل داستان کیلئے دوسری شب قرار پائی اور اوس صبح کا قتل موقوف رہا چنانچہ شہزاد نے مسلسل داستان کو سنانا شروع کیا اس طرح الف لیلہ عالم وجود میں آئی۔ ایک گروہ ایسا ہے جو الف لیلہ کے اصل کو ہندی بتاتا ہے اور یہ استدلال کرتا ہے کہ اس میں بیشتر قصے ہندی جیسا کہ "مرزا و شیاس" ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ ہندی اور فارسی کے آمیزش سے اس کا وجود ہوا ہے۔ ایک جماعت اوس کو عہد عباسی کی پیداوار کہتی ہے اور یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ اس میں عربی۔ ہندی۔ فارسی قصص شامل ہیں۔ ایک اور بیان یہ ہے کہ یہ قصص مختلف

قسم کے حضرات نے بیان کئے ہیں، اور جب انہیں یکجا ترتیب دیگئی ہے تو الف لیلہ کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے جس کو ہم آجکل دیکھ رہے ہیں۔ لیکن پروفیسر سولر نے ان قصوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول وہ جن میں فارسی قصص ہیں جس میں آثار فارسی کا ظہور اس کی خبریں اور بادشاہوں کے حالات ہیں کہتا ہے کہ یہ اصل کتاب ہے جو ہزار افسانہ ہے جو فارسی میں مشہور ہے جس کا ترجمہ عربی میں ہوا ہے۔ دوم۔ وہ قصص ہیں جو بغداد میں لکھے گئے ہیں اور اس میں صورہ حیاۃ اجتماعیہ اور عقلیہ ہیں۔ سوم۔ اس میں وہ حکایات۔ مزاحات اور نوادرات ہیں جس کو ہم روز آنہ سنتے آئے ہیں چنانچہ اس میں اکثر ومشتبہ اسرائیلیات ہیں جن سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ مصر میں لکھے گئے ہیں جس کو یہود نے بیان کیا یا کم از کم وہ حضرات اسرائیلیات سے واقف تھے جیسا "مسٹر شوفان" المستشرق البلجیکی کا خیال ہے۔

بہرحال ان تقسیموں کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ یہ قصے فارسی ہیں، اور ان میں ہندی ترکیبیں اور ہندی نام ہیں اور انہیں قصوں سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ فارسی تخیل اور ترکیبوں کے باوجود عام مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چند مختلف کتابوں کے قصوں کا مجموعہ ہے جو رفتہ رفتہ شریک ہوتے گئے ہیں اور اس میں خلط ملط ہوئی ہے وہ نسخوں کی ترتیب کے وقت عمل میں آئی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ان قصوں میں افکار عالیہ۔ ہندیہ۔ مصریہ اور بغدادیہ کے اثرات نمایاں ہیں اس لئے یہ مباحثین اس کی کتاب کے تنوع۔ اختلاط۔ اسالیب اور افکار کا اظہار کرتے ہیں۔

مگر ان مباحث کے ساتھ ساتھ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج اس کا ترجمہ ہر زبان میں موجود ہے یورپ نے اس سے استفادہ کرکے اس کو مختلف جلدوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر جلد میں دقیق بحثیں کی ہیں۔

آج ہم، ہمارے اور اساتذہ مدارس مصریہ کے ہاتھوں میں اسی قبیل کے انگریزی قصص علی بابا، والقندیل المسحور، سندباد البحری اور رابنسن کروسو" وغیرہ موجود ہیں۔

الف لیلہ کی نسبت مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "الف لیلہ عربی ادب میں بہترین کتاب ہے۔"

ن ۰ ۰ کے نام

(جناب صاحبزادہ محمد علی خاں صاحب)

—(۱۱)—

فرمائیے کہ —

"آپ کو میں زیادہ چاہتا ہوں یا آپ مجھ پر زیادہ لطف ارزانی فرماتے ہیں۔ میں ستم ہائے پیہم کی تاب نہ لاکر گزارشِ احوال واقعی پر مجبور ہوں یا کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ"

الحاصل کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ یا تو آپ نے اپنی جفاؤں سے مجھے سراسیمہ حال و پریشان خیال بنا دیا ہے یا میں آپ کی مہربانیوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ میری کیا مجال کہ اظہار واقعہ میں اپنی جنبش لب بھی گوارا کروں۔ آپ ہی سوچئے کہ —— آیا میں غلطی پر ہوں یا آپ نا انصافی پر۔

—(۱۲)—

میری رگ رگ میں طوفان شباب کروٹیں لے رہا ہے۔ جوانی کی راتیں ہیں اور امنگوں کے دن۔ لیکن خاموش و اداس اپنی زندگی کی گھڑیاں کاٹ رہا ہوں۔ طبیعت کی یہ افسردگی مجھے فطرت سے نہیں ملی ہے۔ بلکہ اس کے موجب آپ ہیں۔ میں ملول و رنجور۔ میری زندگی پریشانیوں سے معمور۔ میری گفتار سے قنوطیت کا اظہار میرے کردار جذبات الم کے آئینہ دار۔ معاف فرمائیے آپ نے کیوں میرے آئین زندگی کو الٹا دیا ہے۔

میرے گریہ پیہم کے لئے رات دن کی قید نہیں میرے نالوں کیلئے خلوت وجلوت کا خیال نہیں روتا ہوں۔ آہیں بھرتا ہوں۔ آپ کو دنیائے تصور میں مست خرام دیکھ کر بعض اوقات چلا اٹھتا ہوں

شبابیات کی یہ عریانی میری کافر جوانی کا طفیل ہے جس نے میرے بے خطا دل کو آپ کی کارفرمائی کے ہاتھ بے دام دیدیا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اضطراری کیفیت اس

خاموش جذبۂ محبت کو رسوائے اظہار نہ کرے جس کی پرورش سکونِ جذبات میں ہوتی رہی ہے۔

(۱۳)

میرے دل کی دھڑکن بڑھتی ہی جا رہی ہے میری تڑپ روز افزوں ہے۔ میری گھبراہٹوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

مجمعوں سے گھبرانے لگا ہوں۔ تنہائی پسندی دل و دماغ پر چھائی جا رہی ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں فطرت انسانی سے ہٹتا جا رہا ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ آپ کی یاد سکون طلب ہے۔

اگر یہ جنون اسی طرح برسرِ کمال رہا تو میری زندگی اور ایک تپسیا کرنیوالے سنیاسی کی زندگی میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ دیکھئے آئندہ کیا ہوتا ہے۔

(۱۴)

زمانہ کے بعد گرامی نامہ ملا مختصر لیکن میرے لئے ہر لفظ میں ایک ناقابلِ بیان کیفیت لئے ہوئے۔ خوشی بھی ہوئی اور غم بھی۔ خط پہنچنے کی مسرت اور عتاب آمیز عبارت کی الم انگیزیاں۔ دونوں نے دل میں عجیب متضاد احساسات کا ہیجان برپا کر دیا۔ تاہم اسے "کبھی آنکھوں سے لگایا کبھی سر پر رکھا"

آپ نے مدت کے بعد مجھ پر احسان کیا، تو بھی عتاب کی صورت میں۔ اسے آپ کی عادت کہوں یا اپنی تقدیر۔

(۱۵)

سنا کہ کل آپ غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ زہے نصیب۔ لیکن اپنی محرومی کا کیا علاج کہ محروم ملاقات ہی رہا۔ میں کچھ ہجوم حسرت سے گھبرا کر بستی سے دور نکل گیا تھا۔ اس لئے نہ مل سکا۔
افسوس کہ آپ کی تکلیف فرمائی میرے لئے باعث مسرت نہ بن سکی۔ بلکہ میرا غم دہرا ہو گیا۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح آپ سے معذرت اور معافی چاہوں۔
اب تو آپ کو موقع ہی مل گیا ہے جو چاہے فرمائیے۔ لیکن ——— اگر بارِ خاطر

گرامی نہ ہو تو اپنی اچانک تشریف ارزانی اور میری مجبوریوں کا بھی خیال رکھیئے ۔

—(۱۶)—

کس منہ سے کہتے ہو مجھے فرصت نہیں تھی۔ دوستوں میں رنگ رلیاں رچانے کیلئے، جمنا کی سیر کیلئے، تاج محل میں چاندنی منانے کے لیئے تو وقت نکل ہی آیا۔ مگر فرصت نہیں تھی تو خط لکھنے کی میں ان باتوں میں آنیوالا نہیں۔ یہ بہانے بنایئے کسی اور کے سامنے ۔

آج الماری میں سے آپ کی وہ تصویر نکلی جو آپ نے خاص میرے لئے کھچوائی تھی۔ اس میں نہ وہ اگلا سا خلوص نظر آتا ہے نہ پہلی سی محبت دکھائی دیتی ہے ——— اس پر ——— ہاں ... اب چھپانے سے حاصل؟ صرف ایک ہی سرسری نگاہ ڈالی ——— حالانکہ ایک زمانہ تھا پہروں نگاہیں نہیں ہٹتی تھیں ———

نہ آپ کو مجھ سے شکوہ ہونا چاہیئے۔ نہ مجھے آپ سے گلہ۔ کیونکہ یہ انقلابات ہیں زمانے کے۔

غزل

جناب صفیہ صاحبہ قمر

مجھ سا دیوانہ بھی دنیا میں نہ ہوگا کوئی
اپنی ہستی کی رہی مجھ کو نہ پروا کوئی
آج کیوں ہو نہ مجھے قید سے دنیا کے نجات
آرزو دل میں ہے کوئی نہ تمنا کوئی
جیتے جی تک یہ غم دہر کے جھگڑے ہیں قمر
بعد مرنے کے نہ رہ جائیگا جھگڑا کوئی

مزاح[1] نگاری اور ناکارہ

(جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی)

مزاح نگار مختلف طریقوں سے ظرافت کی چاشنی پیدا کرسکتا ہے۔ یا تو وہ اشخاص افسانہ کو مرکز توجہ بنائیگا اور اُن سے ایسے حرکات و اقوال پیش کرائیگا کہ قارئین انہیں پڑھکر ہنس پڑیں۔ مثلاً عظیم بیگ چغتائی کا کردار مرزا جنگی۔ ایم اسلم کا مرزا جی اور تاج کا چچا چھکن کہ ان کی سیرتیں عام لوگوں سے علیحدہ ہیں ان کے حرکات و افعال دوسروں سے جدا ہیں اور ان کے اقوال عام طرز سے ہٹے ہوئے۔ انہیں اصطلاحاً کیریکچرز (Caricatures) کہا جاتا ہی۔ افسانہ ہو یا ناول انہی کے نام سے زندہ رہتا ہی اور قارئین کی نظریں سارے افسانہ میں اسی کردار کے واقعات پر پڑتی ہیں۔ اور وہ اسی سے محبت کرتے ہیں۔

اس قسم کے کردار کی نشو و نما کیلئے مصنف میں قوت تخلیق کا ہونا لازمی ہی کیونکہ وہ قدرے ما فوق الفطرت ہوتے ہیں اور محض مصنف کی قلمکاری کے سہارے پر جیتے ہیں۔ ناکارہ کے ہاں ہمیں کوئی کردار ایسا نظر نہیں آتا جس کی صورت شکل ہماری یا آپ کی سی نہ ہو یا وہ ایسے حرکات و افعال کا مرتکب ہوتا ہو جو ہم یا آپ خوشی یا رنج کے وقت نہ کرتے ہوں۔

البتہ اسی قسم میں بعض کردار مافوق الفطرت تو نہیں ہوتے لیکن "نمونے" (Types) ہوتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہی کہ ہر پیشے ہر فرقے اور ہر جتھے سے متعلق چند خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً وکیلوں کا خیال کیجئے تو فوراً ہی ایک نمونہ پیش نظر آئیگا جس کی خصوصیتیں حرص و آز۔ چالاکی۔ مصروفیت۔ ظاہرداری اور بناوٹ ہونگی۔ اسی طرح ایک فوجی کا تصور کیجئے تو ایک مجسمہ جاہلیت۔ بیرحمی۔ بے تکلفی اور لڑائی جھگڑے کا آنکھوں کے آگے دکھائی دیگا۔ ناکارہ کے کردار جلیم کا

---

[1] اس مضمون میں ناکارہ کی تازہ تصنیف "صمدانی" پیش نظر ہے جو مجرمین "پینجر صمدانی ۱۳۴۶ف نظام شاہی حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

ناشتہ کے معاملہ میں بے تکلفی برتنا۔ ماما کریم بی پر رعب گانٹھنا شجاعت مرزا کے آگے جنگ و جدال قتل وخون کے قصے خواہ مخواہ طول دیکر بیان کرنا اور ریوالور کو کھلونا بنانا اور عشق بازی کے میدان میں اپنے شہسوار نہ ہونیکا اعلان انتہائی سادگی سے کرنا۔ اسکول میں بہترین فوجی نمونہ بناتا ہے مصنف نے بڑی چابکدستی سے تعلیم کی ساری حرکتوں کو حتی کہ تہذیب نشست و برخواست میں فوجی تمکنت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اظہار خیال کیلئے مخصوص فوجی لہجہ اور اسلوب کو آخر وقت تک باقی رکھا۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کی ٹکر میں مسٹر آغا محمد کامل ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کا کردار ایک ولایت پلٹ مغرب زدہ کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کا تعارف کس مزے سے کرایا ہے۔ انگریزی آمیز اردو بولتے تھے۔ غالب کے اشعار کی طرح ان کے جملوں میں فقط ایک فعل اردو ہوتا تھا . . . . . میں ان کا چھیلا چھالا منہ تک رہا تھا اور وہ بغیر دم لئے چرچرا رہے تھے۔" اپنے پدر بزرگوار کی شان میں "اولڈ فیلو" کہنا اور اپنے مہمان کی بیوی صمدانی کے متعلق پوچھنا کہ "بچہ وچہ دیا اس نے" اور خود اس کے منہ پر کہنا "تو آنٹی بیوٹی فل (خوبصورت) ہوگئی ـــــ شفاعت! لکی روگ (خوش نصیب بدمعاش)" دیسی مربہ کی شکایت اور دیسی سگریٹ میں گوبر ملے ہوئے ہونے کا اعلان مغرب زدگی کی کتنی دلچسپ علامات ہیں۔ اس افسانہ کی جان در اصل آغا کا شراب مانگنے کا طریقہ اور مہمان کی تواضع کیلئے میزبان کی عجیب وغریب انداز کی سربراہی اور آخر میں آغا کو بھگانے کی تجویز ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں مزاح نگار پلاٹ پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے اور ایسا واقعہ پسند کرتا ہے جو خود ہنسانیوالا ہو البتہ کہیں کہیں نمک مرچ چھڑک کر لطف کو دوبالا کر دیتا ہے اس میں مصنف کی نظر انتخاب کو زیادہ دخل ہے۔ ایک عام انسان کی طرح وہ دنیا کے سارے حالات کو دیکھتا ہے لیکن صرف انہی واقعات کو اپنا موضوع بناتا ہے جس میں ظرافت کی جان نظر آتی ہے بعض دفعہ ہر آنکھ واقعات میں دلچسپی کا رنگ دیکھ نہیں سکتی اور بعض دفعہ ہر شخص مزاحیہ واقعہ سے خود تو محظوظ ہوتا ہے لیکن اظہار کیلئے زبان نہیں رکھتا جس طرح عمدہ شعر کی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ

جب وہ کسی کے سامنے پڑھا جائے تو سننے والا فوراً کہے کہ یہ خیال اس کے لئے نیا نہیں بلکہ اس کے دماغ میں بھی ہے اور اس کی آنکھوں نے مشاہدہ بھی کیا اور اس کے دل نے اس جذبہ کو محسوس بھی کیا۔ لیکن اظہار حقیقت کیلئے طرز ادا اسلوب بیان اور ترجمانی خیال مفقود ہونے کی وجہ سے شاعر سے پہلے بیان نہ کرسکا۔ بالکل اسی طرح دنیا میں قدم قدم پر کتنے لطیفے نہیں ہوتے اور کون سا دماغ ان سے حظ نہیں اٹھاتا لیکن کتنے ہیں جو ان کی ترجمانی صحیح نفسیاتی اصول پر کرسکتے ہیں اس طرح کہ دوسرے بھی انہیں سن کر یا پڑھ کر اسی طرح لطف اندوز ہوں جس طرح کہ خود مسرور ہوتے تھے۔

ناکارہ کا افسانہ بی اے بی بی اور تماشے پر تماشہ اس قسم کی بہترین مثال ہے۔ پلاٹ خود مذاقیہ ہے ایسا کہ اگر آپ صرف حقیقت واقعہ ہی سن پائیں تو ہنس پڑیں۔ "بی اے بی بی" لڑکے کا لڑکی پر جانا اور پھر اپنے ایک دور گذشتہ کے ساتھی سے شادی کا مقرر ہونا اور آخر وقت میں غیر مجلہ عروسی میں یکایک پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ جانا بجائے خود ہنسنے ہنسانے کیلئے بہترین ذخیرہ ہے لیکن مصنف نے اس کو افسانوی رنگ میں اس طرح ڈبویا ہے اور حقیقت کا انکشاف کچھ اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے دوہرا ہو جاتا ہے "تماشے پر تماشہ" طرفہ تماشہ ہے۔ موضوع گو کہ روندا ہوا ہے اور کون نہیں جانتا کہ بیسیوں دفعہ بعض بدنیت اشخاص کسی تانگہ کا پیچھا کرکے منہ کی کھائے ہیں لیکن پلاٹ کی ترتیب میں ندرت یہ کی گئی ہے کہ تانگہ میں زنانی لباس پہنے ہوئے ایک مرد ہے جو کسی ڈرامہ میں ہیروئن کا پارٹ کرکے گھر واپس ہو رہا ہے۔ فاضل نہ صرف اس کو آسانی سے ہاتھ آنیوالی سونے کی چڑیا سمجھ کر مغالطہ کا شکار ہوتا ہے بلکہ جنس کی شناخت میں بھی دھوکا کھاتا ہے۔ شاہ مرزا (زنانی لباس میں مرد ایکٹر) فاضل کو ستانے اور گوشمالی دینے کی ترکیب سوچ کر اپنے دوست اور ساتھی شفاعت سے طے کرتا ہے کہ جب تنہائی میں فاضل پینگیں بڑھانے لگے تو وہ فوراً موقع واردات پر پہنچ کر فاضل کی خوب خبر لے۔ معاہدہ کے موافق سارے واقعات ظہور میں آتے ہیں لیکن آخر میں مصنف نے نہایت خوبی سے ظرافت کے ذخیرہ کو ادنیٰ سی جنبش میں بہت بڑھا دیا۔ ہوتا یہ ہے کہ شفاعت موقع پر نمودار تو ہوتا ہے

لیکن شاہ مرزا کو بجائے اپنی بیوی بتلانے اور فاضل کی خبر لینے کے اس کو طوائف (اختر جان) بتاتا ہے اور الٹا فاضل کو دست درازی کا موقع دیکر منظر سے ہٹ جاتا ہے۔ درحقیقت افسانہ میں یہی وہ موقع ہے جب پڑھنے والا بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔

تیسری قسم ظرافت کی وہ ہے جو الفاظ سے پیدا کیگئی ہو۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض واقعات ہی ایسے مذاقیہ ہوتے ہیں کہ ان کا بیان ہی پرلطف ہوتا ہے لیکن ان پر اگر ظریفانہ انداز میں نمک مرچ چھڑکا گیا ہو تو پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں لیکن یہاں ایک خطرہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہنسانے کی فکر میں کہیں رکیک الفاظ اور بھونڈا انداز بیان پیش نہ کیا جائے۔ بہت سے مزاح نگار ذرا سی بے احتیاطی میں بے راہ ہوگئے ہیں اور انہوں نے ظرافت کے گلدستہ کی بجائے کثافت کا انبار پیش کیا ہے۔

الفاظ کی ظرافت کی بھی کئی ذیلی قسمیں ہیں مثلاً وہ جیسے انگریزی میں Malaprop man.) کردار بزعم خود اپنے علمی تبحر کی نمائش کیلئے ثقیل اور موٹے موٹے الفاظ فقرے اور محاورے استعمال کرتا ہے اور وہ سب کے سب غلط ترکیب، مہمل بندش اور بے محل استعمال پر مبنی ہوتے ہیں اسی لئے حد درجہ ہنسی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جسے انگریزی میں Play upon words یعنی الفاظ کی الٹ پھیر سے مزاح کا پیدا کرنا کہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ دوسروں کے شعر، مصرعہ یا فقرہ کو حسب ضرورت موقع اور محل کے لحاظ سے بدل کر اس طرح اپنا لینا کہ ہنسی رک نہ سکے۔ چوتھے یہ کہ نو معنی الفاظ سے ظرافت پیدا کرنا۔

اس قسم کی ظرافت ناکارہ کے ہاں زیادہ نظر آتی ہے درحقیقت بڑی حد تک یہ کہنا جائز ہے کہ ناکارہ کی زیادہ نمایاں خصوصیت یہی ہے۔ انہی الفاظ پر ہر طرح سے عبور ہے ان کے ماخذوں پر۔ ان کے معنوں پر اور ان کے استعمال پر۔ ذیل میں چند مثالیں درج کیجائیں گی جن سے ہمارے اس بیان کی وضاحت ہوگی۔

"انتساب لاجواب" ہی کو لیجئے۔ منعت خور شائقین کی علم دوستی اور ادب نوازی نے

اردو مصنفین کو" بندۂ بے دام" بنا رکھا ہے۔ کہنا کتنا بلیغ اشارہ ہے مفت خور اور بندہ بے دام کی مناسبت کتنی موزوں ہے۔" سنگسار صاحب کی طرح خدا آپ کو بزرگانہ چشم پوشی سے کام لینے کی توفیق عطا فرمائے" کا فرض ناشناسی کا کنایہ کس قدر پرلطف ہے۔ سنگسار کی سہو نظری کو بزرگانہ چشم پوشی کہنا کس قدر دلنشین طعن ہے۔

ناکارہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افسانہ کا پلاٹ عموماً معاشرتی ہوتا ہے اور مقصد معاشرت کے نقص کی اصلاح ہوتا ہے۔ چنانچہ" مس شہاب ثاقب" اور "صمدانی" اسی قماش کے افسانے ہیں۔ ہمارے ہاں کی شادی بیاہ کے رسومات جس قدر مضحکہ خیز روپیہ برباد کرنے والے اور فضول ہوتے ہیں ہر شخص واقف ہے۔ ان افسانوں میں مصنف نے حد درجہ دلچسپ اور تفصیلی خاکہ کچھ اس قدر دلنشین انداز میں کھینچا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اسم نویسی کے متعلق لکھا ہے" اخبار کے اجرا کیلئے درخواست دینا اور اسم نویسی بھیجنا! دونوں کا حشر ایک ہوتا ہے۔ وہاں پولیس سرگرم تحقیقات ہوتی ہے اور یہاں لڑکی والے! وہاں ایڈیٹر کا چال وچلن معرض تحقیق میں آتا ہے اور یہاں لڑکے کا! جن اصحاب نے اخبار کے اجراء کیلئے بھی درخواست کی ہو اور اسم نویسی بھی بھیجی ہو وہ اس موازنہ سے خوب لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

مشاطہ ہماری معاشرت میں اور شادی بیاہ کے موقع پر ایک عجیب شخصیت نظر آتی ہے مشاطہ جس لڑکی کی نسبت کے متعلق گفت وشنید میں مصروف ہو اس کا مشاطہ سے پردہ کرنا ہماری تہذیب میں لازمی ہے۔ اس سے متعلق سنئے" منہ دھو رہی تھی کہ صمدانی بھاگی بھاگی آئی۔ وحشت اثر مگر دل خوش کن خبر لائی" آپا بھاگو! بھاگو! وہ سانولی بی (مشاطہ) آرہی ہے" اوئی اللہ میں اور میرا دل دونوں اچھل پڑے۔ میں چبوترہ پر اور وہ سینہ میں! کمرہ کی طرف منہ کرکے چوکڑیاں بھرنے لگی۔ مگر قصداً اتنی دیر کرگئی کہ وہ ماما دیکھ چکی تھی۔ کہ میں اس کو دیکھ کر بھاگ رہی ہوں"

تقریب جلوہ کا نظارا قابل دید ہی ایک لال چادر ہم دونوں پر اڑھادی گئی۔ حکم ملا کہ آئینہ دیکھو اور سورہ اخلاص پڑھ کر دم کرو۔ دھڑکتے ہوئے دل۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور نہ جھکنے والی آنکھوں سے ہم نے آئینہ میں اپنی دلہن کی صورت دیکھی۔ اس کے ہونٹوں پر مستی تھی آنکھوں میں آنسو اور ناک میں نتھ۔ ۔ ۔ ۔ سلامی کا سلسلہ شروع ہوا۔ روپیے۔ اشرفیاں ڈبیاں۔ گھڑیال۔ انگوٹھیاں۔ عطردان۔ خاصدان اور خدا معلوم کیا کیا چیزیں ہمارے حصہ میں آئیں جن کو دیکھکر طلائی و نقرئی سامان کی دوکان کھولنے کا شوق ہوا۔ ۔ ۔ ہمارے بھائی صاحب ساتھ ساتھ ایک فہرست مرتب کر رہے تھے کہ اور غالباً (یقیناً نہیں) اندازہ لگا رہے تھے کہ سلامی کی رقم تقریب ولیمہ کے اخراجات کیلئے کافی ہو سکتی ہے یا نہیں؟"

شمیم سخن

جناب نبی الحسن صاحب شمیم بی۔ اے

یہ نزع کی مصیبت کاٹوں گا میں ہنسی میں
ہے اک یہی تو حسرت نکلی جو زندگی میں

دل مست ہے ازل سے نغمات سرمدی میں
آنکھیں کھلی ہیں میری جلووں کی روشنی میں

الفت کا راز میں نے ہر طرح سے چھپایا
دیوانہ بن کے کچھ دن کچھ روز بیخودی میں

دل میں ہجوم غم ہو ہونٹوں پہ ہو تبسم
یہ بات ہم نے دیکھی اب تک نہیں کسی میں

بیمار ہجر سنبھلا پھر اپنی جان دیدی!
اللہ جانے آئی کیا بات اس کے جی میں

اب شوق امتحان کا انجام دیکھ ظالم
میرے سوا نہیں ہے کوئی تری گلی میں

مجھ سے شمیم اکثر وہ آکے پوچھتے ہیں
آنکھوں پہ ہر بتاؤ کیا سوچتے ہو جی میں

محبّت

جناب خورشید احمد صاحب جامی حیدرآبادی

کہر میں دہند میں لپٹی ہوئی تصویر عالم ہے
جہاں میں ہر طرف تاریکیوں کی حکمرانی ہے
ہوائیں سنسناتی چل رہی ہیں قلب ویراں میں
بساط خاک پر حرص و ہوا کی ہی عملداری
تمنا عیش فانی کی دل خود بین میں پلتی ہے
جہاں میں خاک اڑتی ہی قیامت خیز منظر ہے
بنائے حرص ہی لیکن سراب کامرانی پر
یہاں انسان پر انسان ایسے ظلم ڈھاتا ہے
کہیں، تہذیب کے پردے میں بربادی غلط کامی
کبھی قوموں میں دولت کیلئے زور آزمائی ہے
عبادت نام ہی مکر و ریا کا بندگی زر کی
یہ تیری چند سانسیں اس پہ عادت خود نمائی کی
مسلسل کاوشوں سے پرشکن دنیا کی پیشانی
سرشک غم میں یاں تعمیر ہوتی ہے تبسم کی!
یہ منظر دیکھ کر جب روح شاعر تلملاتی ہے
یہ دنیا چند دیوانوں کی نادانوں کی بستی ہے
یکایک مہر تاباں ہو گیا صرف ضیا باری
بہاریں لوٹتی ہیں صبح روشن مسکراتی ہے

بنائے قصر ہستی مضمحل آہوں پہ قائم ہے
ہوائے تند میں لرزاں چراغ زندگانی ہے
غبار آلود سائے ظلمتوں کے بزم امکاں میں
خمیدہ پشت ہستی پر گناہوں کی گراں باری
اندھیرے راستوں پر زندگی کی سانس چلتی ہے
یہ دنیا جرم و عصیاں کا سیہ کاری کا دفتر ہے
غرور و ناز ہوتا ہی فریب زندگانی پر
لرزتا ہی وقار آدمیت کانپ جاتا ہے
کہیں تیغ جفا کی کروٹوں سے خون آشامی
کسی کے دل کی بیتابی میں شہرت کی سمائی ہے
خم طاعت میں پوشیدہ ہی گمراہی مقدر کی
ملی ہی ذرۂ ناچیز کو طاقت خدائی کی
شعور زیست پر تلخ و گراں اوہام نادانی
صدائے نالہ محروم نے خواہش ہی ترنم کی
تو کانوں میں کسی کی غیب سے آواز آتی ہے
ادھر آ اے متحیر تو ناشناس راز ہستی ہے
دل خوابیدہ پر کھلنے لگے اسرار بیداری
محبت ایک پیغام مسرت بن کے آتی ہے

یہ دنیا ہی محبت کی مسرت ہی مسرت ہے
جہاں ہر سانس کی کروٹ میں اک فردوس راحت ہے

جہاں ہر صبح عشرت کے نئے غنچے چٹکتے ہیں
جہاں ہر شام صہبائے طرب کے جام چلتے ہیں

دل گمراہ پھر آسائش منزل کو پاتا ہے
بنائے آرزو جذبات الفت سے بناتا ہے

یہاں ہنگامۂ ہستی سکون انگیز ہوتا ہے
یہاں جلوہ حقیقت کا تبسم ریز ہوتا ہے

نسیم روح پرور ہے بہار زندگانی ہے
لہو کی گردشوں میں ایک رقص شادمانی ہے

فضائے عشرت سرمد حیات قلب انسانی
چمکتی ہے عمل کی حسن سے دنیا کی پیشانی

سرور ساز الفت ہے رگ احساس پر طاری
غم و آلام کی دل پر نہیں ہے کچھ گراں باری

محبت کے ترانے روح پرور گائے جاتے ہیں
رموز لذت باطن یہاں سمجھائے جاتے ہیں

گذر اوہام باطل کا نہیں اس [illegible] راحت میں
یہاں عقل و خرد مصروف ہیں تعمیر جنت میں

دل ناشاد کو جامی محبت شاد کرتی ہے
محبت درد و غم کی قید سے آزاد کرتی ہے

غزل

جناب میر توفیق علی خاں صاحب وحشت

دعائیں دیتے ہیں میرے دل و جگر دونوں
نظر کے تیر کو قاتل تیرے نشانے کو

نہ پوچھ اس دل صد چاک پر جو کچھ گذری
جگہ ملی تیری زلفوں میں جب بسانے کو

غضب کی چرخ کو عشاق سے عداوت ہے
تلا ہوا ہے ستمگر ہمیں مٹانے کو

دیا کئے جو مجھے زندگی میں داغ پہ داغ
وہ آئے پھول میری قبر پر چڑھانے کو

عجب نہیں کہ گرے پھر جو طور پر بجلی
نقاب آج وہ چہرے سے ہیں ہٹانے کو

نہ جیتے جی کبھی پوچھا کہ حال کیسا ہے
وہ پھول لائے ہیں مرقد پہ اب چڑھانے کو

ہے داستان میری اک داستان غم وحشت
نہ سن سکیگا زمانہ میرے فسانے کو

غلط فہمی

(جناب پیارے موہن لال صاحب)

ساون کا مہینہ تھا۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ باریک باریک پھواریں پڑ رہی تھیں۔ شام کے وقت رمیش اور میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ رمیش ان تمام خصوصیات و محاسن کا مالک تھا جو ہندوستانی تہذیب کا سرمایہ افتخار خیال کئے جاتے ہیں۔ بہت دیر تک تو ان دوستوں کا ذکر ہوتا رہا جن کی صحبت میں ہم نے کالج لائف کی سنہری گھڑیاں گذاری تھیں ان میں سے تو اکثر لاپتہ تھے اور جن کا پتہ معلوم تھا وہ ہم سے پرانے تعلقات برقرار نہ رکھنے پر مجبور تھے۔ اس کے بعد اس نے یہ موضوع بدل دیا اور ادبی مشاغل کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔

"یار۔ تم نے ایک عرصے سے کوئی افسانہ نہیں لکھا" رمیش نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جواب دیا "کوئی دلچسپ پلاٹ ذہن میں نہیں آتا۔ کیا تم کوئی اچھا سا پلاٹ بتا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟ میری آپ بیتی خود بہترین پلاٹ بن سکتی ہے"

"خوب۔ تو پھر آپ بیتی شروع کرو"

رمیش نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے اپنی بیوی کو ایک رشتہ دار کی شادی میں دیکھا تھا۔ میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے میری شادی اسی لڑکی سے چند ماہ بعد ہو گئی۔ ہمارا بیاہ محبت کا بیاہ تھا۔ شادی کے بعد ہم دونوں نہایت خوش گوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک دن میں نے تمہاری بھابی سے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے؟"

وہ جھینپ گئی۔ اوس نے اپنی نرگسیں آنکھیں نیچی کر لیں۔ "میں آج پوچھ کر رہوں گا" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا "تمہیں بتانا ہی پڑیگا"

"نام معلوم کر کے کیا کرو گے؟" اوس نے آہستہ سے کہا اور جھک گئی بالکل اس طرح جیسے پھولوں اور پھلوں سے لدی ہوئی شاخ جھک جاتی ہے

"کیا کروں گا . . . . سب لوگ کیا کرتے ہیں" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ خاموش ہوگئی گویا لاج نے اس کے لب بند کردیئے ہیں۔

" نہیں بتاتی ہو تو نہ بتاؤ۔ سچ سے تمہارا نام بملا ہے" میں نے اس کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ بات آئی اور گئی۔ اس واقعہ کو گزرے ایک عرصہ گزر گیا۔ ہم ایک دوسرے کے شریک زندگی ہوکر شادمانی و مسرت سے دن گزار رہے تھے۔ ایک دن دوستوں کے ساتھ پک نک کرنے جارہا تھا۔ بملا کام کاج میں مصروف تھی۔ کسی ضرورت کی بنا پر میں نے بملا کا صندوق کھولا۔ اس میں مجھے ایک لفافہ ملا طرز تحریر کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں نے خط کو لفافہ سے نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں پڑھتا گیا میرے حواس بگڑتے گئے۔ غصہ کے مارے تھر تھرانے لگا۔ میرے دل میں رقابت وحسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

لکھنؤ۔

پریم پیاری!

. . . . . معلوم ہوتا ہے کہ بیاہ کے بعد تم نے مجھے بالکل بھلا دیا ہے۔ تمہارے خط کے انتظار میں کئی مہینے گذر جاتے ہیں۔ تمہاری یاد بہت آتی ہے دو ماہ کے بعد میں کلکتہ چلا جاؤں گا پھر نہ معلوم کب ملاقات ہوگی۔ عنقریب تحفہ روانہ کروں گا۔ قبول کرلینا۔ . . . . . .

تمہارا۔ پریتم۔

میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ عورتوں کی بیوفائی اور تریا چرتر کے متعلق میں نے کئی قصے اور افسانے پڑھے اور سنے تھے مگر بملا سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔ لیکن خط کی تحریر نے مجھے عجیب کرب واذیت کی کیفیت میں مبتلا کردیا۔ اس روز سے میں نے بملا سے بات چیت بند کردی کیونکہ میری خودداری کو زبردست صدمہ پہنچ چکا تھا۔ غم اور غصہ کی حالت میں میں نے بملا کو بلا کر کہا "کل یہاں سے تم لکھنؤ چلی جانا!"

" کیوں؟" بملا نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"زچگی کا انتظام تمہارے میکہ میں بہتر ہو سکیگا۔ ماتاجی کی طبیعت بھی نا ساز رہتی ہے اس کے علاوہ ضعیفی ہیں ان سے زچگی کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو گا" میں نے اصلی وجہ کو چھپاتے ہوئے کہا

"اتنی عجلت کی ضرورت کونسی آن پڑی ہے۔ پرسوں ماں کہہ رہی تھیں کہ زچگی یہیں پر ہوگی" بملا نے آزردہ ہو کر کہا

"میرے حکم کی تعمیل لازمی ہے" میں نے تیزی سے کہا

"کم از کم ماتاجی سے آگیا تو لے لیتے" بملا سنجیدگی سے بولی۔ تھوڑی دیر تک تو وہ خاموش رہی پھر اس نے کیف انگیز آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "اُف۔ آپ ناراض کیوں ہیں۔ آخر مجھ سے کونسی ایسی خطا سرزد ہوئی ہے کہ آپ اتنی سرد مہری سے پیش آ رہے ہیں"

خاموشی کے ساتھ میں کمرہ سے باہر نکل گیا دوسرے روز بملا لکھنو بھیجدی گئی۔

(۲)

بملا کو مجھ سے جدا ہوئے چھ سات ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ مجھے کسی طرح کی تکلیف نہ تھی۔ اس درمیان میں بملا کے متعدد خطوط وصول ہوئے ہر ایک خط میں وہ اپنا دل کھول کر رکھدیتی تھی۔ جدائی کی تکلیف کا کہیں ذکر تو کہیں میری بے رخی کا سبب دریافت کرتی الغرض اس کے خطوط منتوں اور التجاؤں سے پُر رہتے۔ پہلے پہل میرے غصہ کی وہی حالت رہی لیکن رفتہ رفتہ میرا غصہ کم ہونے لگا۔ طبیعت اچاٹ سی رہنے لگی۔ کبھی کبھی جی ڈوب ڈوب جایا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے کسی خط کا جواب نہ دیا میری حمیت نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ میں ایک بے وفا عورت سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھوں۔ محبت میرے دل کے نا پید ید تاروں کو چھیڑ رہی تھی دل کہہ رہا تھا کہ بملا سے بیوفائی کی امید ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس کی محبت بھری آنکھیں دعا ہیں دے سکتیں لیکن اس خط کی یاد ان تمام پر پانی پھیر دیتی تھی۔

موسم گرما کی شام تھی۔ بازاروں میں دوبارہ چہل پہل نظر آ رہی تھی آفتاب کی زرد کرنیں صرف اونچی عمارتوں پر رقصاں تھیں۔ میں ورانڈے میں بیٹھا ہوا مغربی افق کی سرخی کو ٹکٹکی

باندھے دیکھ رہا تھا کہ اماں نے آکر کہا " بیٹا رمیش۔ لکھنو جاکر بہو کو واپس لے آؤ۔ میں پوتے کو دیکھنے کیلئے بیقرار ہوں۔ گھر کا کام کاج بھی اب مجھ بڑھیا سے اکیلے نہیں سنبھلتا "۔ میں نے جھوٹ موٹ کہا " ماتاجی۔ ابھی چھ ماہ تک مجھے رخصت نہیں ملسکتی چھٹی ملنے پر دیکھا جائیگا "۔

دوسرے روز خبر آئی کہ لڑکا بیمار ہے۔ میں زیادہ ضبط نہ کرسکا۔ بے چینی و اضطراب کے عالم میں میں نے اماں کو خط پڑھکر سنایا تو انھوں نے کہا " کیوں یاد ہے۔ میں اکثر کہا کرتی تھی کہ بیٹا جب تمہارے بال بچے ہوں گے تو پتہ لگے گا کہ والدین کو اپنے لڑکے سے کس قدر محبت ہوتی ہے "۔ پھر طنزاً کہنے لگیں " میں بھجن کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تم پھر کسی وقت چلے آنا۔ اگر ایشور کی مرضی ہوئی تو لڑکا بہت جلد اچھا ہو جائیگا۔

میں نے کہا " ماتاجی۔ میری طبیعت گھبرا رہی ہے۔ میں آج لکھنو جاؤں گا۔ آپ بھی چلنے کی تیاری کیجئے۔

اسی شام کی ٹرین سے ہم لوگ لکھنو روانہ ہو گئے وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ لڑکے کی طبیعت اطمینان بخش ہے۔ دل کو سکون حاصل ہوا۔

(۳)

رات ہو گئی تھی۔ دنیا کے پرشور ہنگامے خاموشی میں گم ہو چکے تھے میں پلنگ پر لیٹا ہوا بملا کی بیوفائی پر افسوس کر رہا تھا کہ بملا اپنے بیٹے کو گود میں لئے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی۔ لڑکے کو گود میں لیکر میں نے کھلانا شروع کیا لیکن بملا کی طرف بالکل توجہ نہ کی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا " ناتھ "

اس کی آواز سنتے ہی غصہ کی ہلکی لہر میرے سینہ میں پیدا ہو گئی اور میں نے کرخت آواز میں کہا " کیا ہے؟ "

اس نے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو میری طرف اٹھاکر اداس لہجہ میں کہا " ناتھ یہ ناراضگی کیسی؟ "

میں خاموش رہا۔

اس نے پھر نڈھال ہوکر کہا۔" ناتھ آپ رنجیدہ کیوں ہیں؟"

"کچھ نہیں" کہکر میں خاموش ہوگیا۔

"بتانا پڑیگا" اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہاکہ میرا ضبط جاتا رہا۔ ادھر بملا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ڈھلک ڈھلک کر فرش پر گرنے لگے۔

میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھاکہ بملا کو میری بیرخی کی وجہ کا پتہ نہ لگنے دوں گا لیکن اب مجبور تھا۔ میں نے اس خط کو اس کی جانب پھینکتے ہوئے کہا" یہ ہے تمہاری بیوفائی کا ثبوت اور میری اداسی کا سبب"

میری حیرانی و پریشانی کا ٹھکانا نہ رہا جب میں نے دیکھاکہ اس کے چہرے پر ندامت وشرم کے بجائے مسرت وانبساط کی لہریں تڑپنے لگیں اور اس نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا" بڑے متشکی ہیں آپ۔ اتنی سی بات پر آپ میری زندگی کو عذاب بنا ئیوالے تھے۔ یہ خط میرے بڑے بھائی تیج لال کا ہے۔ وہ ہمیشہ خطوط میں میرا نام لکھتے ہیں۔ پریم پیاری میرا نام ہے۔ ستیاناس ہو اس غلط فہمی کا جو انسان کی خوش وخرم زندگی کو تاریک ومضطرب بنادیتی ہے "

میں اپنی باتوں پر خود پشیمان ہوگیا۔ میں نے بات بنانے کی غرض سے کہا" تم نے اپنا نام پہلے ہی کیوں نہ بتایا۔ ایشور نے اس کی سزا دی ہے اور. . . . .

رمیش کچھ اور کہنا چاہتا تھاکہ بھائی نے کمرہ کے اندر آکر کہا

" رمیش بابو۔ کیا آپ کھانا نہ کھائیں گے ؟

" کیوں نہیں بھائی" میں نے جواب دیا" آئیے۔ آپ ہی کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔ رمیش بھائی آپ کا قصہ سنا رہے تھے" بھائی نے مسکراکر رمیش کیطرف دیکھا اور مجھ سے کہا" تم بھی اپنی بیوی کا نام پوچھ لینا کہیں تم بھی کوئی بیوقوفی نہ کر بیٹھو۔

——(ش)——

اکبر اعظم اور اردو

(جناب ضمیرالدین صاحب ہاشمی)

رسالہ شہاب کے فروری ۱۹۶۵ء کے پرچہ میں غلام دستگیر محمود گاوانی صاحب نے "دربار اکبری کے نورتن" پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں اردو رائج تھی چنانچہ موصوف نے لکھا ہے کہ

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا "زبان اردو" کی پیدائش شہنشاہ اکبر کی آغوش میں ہوئی یا اوس کے پوتے شاہجہاں؟ جہاں تک میرا علم ہے اور جن تواریخ کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اردو نے اپنا جنم شاہجہاں کی دور میں لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بیحد ممنون ہونگا کہ اگر میرے نادیدہ محترم دوست محمد عبدالکریم صاحب کسی تاریخ یا کوئی اور مستند کتاب کا حوالہ دے کر شہاب کی کسی آئندہ اشاعت میں یہ ثابت فرمائیں کہ زبان اردو اکبر یا اس سے قبل کے دور میں رائج تھی تو نہ صرف میں بلکہ دوسرے بھی مستفید ہوں گے"

تعجب اور حیرت ہے کہ محمود گاوانی صاحب آج سے پندرہ بیس سال کے معلومات پر اپنے خیالات کو منطبق کرتے ہیں اور غالباً آزاد کی آبحیات کو پیش نظر رکھا گیا ہے حالانکہ وہ زمانہ گزر گیا جب کہ آزاد کی آبحیات اردو زبان کی تنہا تاریخ تھی، اب جدید معلومات اور تحقیقات کے لحاظ سے آبحیات کی تحقیقی نقش بر آب ثابت ہوگئی ہے۔

گذشتہ پندرہ بیس سال میں، اردو زبان کے متعلق جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے لحاظ سے اردو کی ابتدا شاہجہاں اور اس کے دادا اکبر کے زمانہ کی منت پذیر نہیں بلکہ اس سے دو سو سال پہلے مروج اور نہ صرف مروج تھی بلکہ نظم و نثر کی صورت میں آگئی تھی۔ اگر مولانا محمود گاواں صاحب تاریخوں کا حوالہ دریافت کرتے ہیں تو ان کو حسب ذیل کتابوں کی طرف رجوع ہونا چاہئے۔

۱- تاریخ ادب اردو مصنف ڈاکٹر ٹی جے بیلی	انگریزی
۲- تاریخ ادب اردو مصنف رام بابو سکسینہ	انگریزی
۳- ترجمہ تاریخ ادب اردو مترجم مسٹر محمد عسکری ،	اردو
۴- شعر الہند مصنف مولانا عبد السلام ندوی	اردو
۵- اردوئے قدیم مصنف حکیم سید شمس اللہ قادری (حیدر آباد)	اردو
۶- اردو شہ پارے مصنف ڈاکٹر زور (حیدر آباد)	اردو
۷- تاریخ نثر اردو مصنف احسن مارہروی	اردو
۸- مغل اور اردو مصنف نصیر حسین خاں خیال	اردو
۹- دکن میں اردو مصنف راقم	اردو
۱۰- یورپ میں دکھنی مخطوطات مصنف راقم	اردو

غالباً محمود گاوانی صاحب کو ان کتابوں کے بعد مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔

اب مجھے محمد عبد الکریم صاحب کے مضمون کے متعلق بھی کچھ لکھنا ہے

آپ نے صراحت کی ہے کہ "اہل علم کی صحبت نے اس (بیربر) میں ریختہ اور فارسی میں بھی شعرگوئی کا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ ایک دفعہ اکبر بادشاہ اپنے قلعہ کی کھڑکی سے دریائے جمنا کا نظارہ کر رہا تھا دیکھا کہ چراغ کا عکس دریا میں پڑ رہا ہے اسی وقت یہ مصرع موزوں کیا۔

آج ہم نے لب دریا پہ چراغاں دیکھا ۔

دوسرے روز بیربر نے بادشاہ کے حکم پر اس طرح گرہ لگائی :-

آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا   آج ہم نے لب دریا پہ چراغاں دیکھا

اس کے متعلق حسب ذیل امور قابل بحث ہیں :-

(الف) اکبر کے زمانہ میں اردو کا رواج تھا یا نہیں ؟

(ب) کیا بول چال کے ساتھ نظم و نثر کا بھی وجود ہوگیا تھا ؟

(ج) کیا اکبر اردو میں شعر کہا کرتا تھا؟

(د) کیا بیربرنے فارسی اور ریختہ میں شاعری کی ہے؟

ان چاروں امور کے متعلق مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اس امر کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ہے کہ اردو کی ابتدا اکبر کے پہلے ہو چکی تھی اور اکبر کے زمانہ میں اردو کا رواج تھا۔ اس کے متعلق اب عام طور سے گویا تصفیہ ہو گیا ہے کہ اس زمانہ میں اردو شمال اور دکن میں عام طور سے مروج تھی۔

"ب" کے متعلق یہ عرض کرنا ہے اب تک جو کچھ تحقیقات شمال اور دکن میں ہوئی ہے اس کے لحاظ سے اکبر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی شمالی ہند میں اردو نظم و نثر کا رواج نہیں تھا البتہ وہ صرف بول چال میں کام آتی تھی مگر اس کے برخلاف دکن میں وہ بول چال سے گزر کر نظم و نثر کی صورت اختیار کر چکی تھی اور ایک نہیں بلکہ کئی شعرا اور مصنفین نے اپنی کتابیں مرتب کر دی تھیں۔

شمالی ہند میں اردو نظم کا رواج ولی اورنگ آباد کے سفر دہلی کے بعد ہوا ہے اور یہ سفر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ہوا تھا اس کے متعلق کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز کب ہوا ہے؟ ڈاکٹر سید محی الدین نے تفصیل کے ساتھ اپنے ایک مقالہ میں روشنی ڈالی ہے جو ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے جانب سے شائع ہو چکا ہے۔

تیسری بحث یہ ہے کہ کیا اکبر اردو یا ریختہ میں شعر کہا کرتا تھا؟ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شمالی ہند میں اردو نظم کا آغاز زمانہ مابعد میں ہوا ہے اس کے علاوہ نواب خیال نے مغل اور اردو میں جو نہایت مبالغہ کے ساتھ مغل سلاطین کی اردو نوازی کی سرپرستی کی تفصیل کی ہے وہاں اکبر کی اردو شاعری کا کوئی ذکر نہیں ہے جس شخص نے مغل سلاطین کی چھوٹی چھوٹی اردو نوازی کو نظر انداز نہیں کیا ہے وہ کس طرح اکبری شاعری کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ ان امور کے قطع نظر مولوی عبد الکریم صاحب نے جو شعر پیش کیا ہے وہ اپنی صفائی اور زبان کی ارتقائی ترقی کے مدنظر اس زمانہ کا ہو ہی نہیں سکتا۔ محقق زبان کبھی اس شعر کو اکبری عہد کا تصور نہیں کر سکتا۔ غرض کہ یہ

بالکل غلط ہے کہ اکبر اردو میں شعر کہا کرتا تھا یا مذکورہ شعر اس کا ہے۔
چوتھی بحث یہ ہے کہ بیر بر فارسی اور ریختہ میں شعر کہا کرتا تھا۔ ہم کو اس کی فارسی شاعری سے کوئی بحث نہیں ہے البتہ ریختہ کے متعلق یہ لکھنا ہے کہ جس طرح اکبر کی اردو شاعری افسانہ ہے اسی طرح بیر بر کی شاعری بھی افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اہل علم اس کو قبول کرنیکے لئے سر دست تیار نہیں ہیں۔ مولوی عبد الکریم صاحب نے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے کیا اچھا ہوگا وہ اپنے دعوٰی کو بہ دلائل ثابت کریں گے۔

نقد و تبصرہ

رموز خانہ داری مصنفہ ج۔ نقوی صاحبہ بی۔اے اس وقت پیش نظر ہے۔ جس کے بنسبت بلا تامل کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے حقیقی طور پر تعلیم نسواں کے فرائض کو سمجھا ہے۔ ہمارے گھرانوں میں کتنی بچیاں ایسی ہیں جو تعلیم کے ساتھ اپنے گھریلو فرائض سے آگاہ ہیں۔ کتنی لڑکیاں ایسی ہیں جو واقف ہیں کہ صحت اور صفائی کیلئے کن امور کو پیش نظر رکھنا چاہئے تعلیم سے زیادہ تربیت مقدم ہے اور یہ ایک ایسی کمی تھی کہ اس میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں محترمہ کی یہ سعی لائق صد ستائش ہے کہ انہوں نے نئی پود کو اپنے فرائض سے آگاہ کیا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ لڑکیوں پر اپنے گھر کی کس قدر ذمہ داریاں ہیں۔ سلیقہ۔ صفائی کیا چیز ہے؟ اور کس طرح ہمارے گھر درست ہو سکتے ہیں ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں زنانہ نصاب میں شامل ہوں تاکہ بچیاں ابتدا ہی سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنے لگیں اور مستقبل میں اپنے گھر کی ملکہ کہلائیں۔ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیاسیات و تعلیمات کا ایک مفید دیباچہ ہے۔ لکھوائی چھپوائی دیدہ زیب ہے۔ قیمت ۸ر
دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن سے طلب کیجئے۔

نوروز کی حقیقت

جناب نورالدین خاں صاحب نوؔر

ہمارے ملک میں عہد غفراں ماب نواب نظام علی خاں سے عہد غفراں مکاں نواب محبوب علی خاں تک نوروز کے دربار بڑے تکلف اور اہتمام سے منعقد ہوتے رہے ہیں۔ امرائے دولت نوروز کے دن اپنے اپنے محلات میں محفل عیش و طرب منعقد کیا کرتے تھے عوام کو بھی اس سے کافی دلچسپی تھی اس مضمون میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نوروز کی نسبت عام روایات اور معتقدات کیا تھے اور اس کی حقیقت کیا ہے سب سے پہلے عید نوروز کی ابتداد شہنشاہ جلال الدین اکبر نے کی سلاطین تیموریہ اس کو بڑی دھوم دھام و تزک و احتشام کے ساتھ مناتے رہے۔ عام طور پر مسلمان اس کو مثل دوسری عیدوں کے اہمیت دیتے رہے اور اس دن کو مقدس خیال کرتے رہے۔ باالآخر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے اس کو حکماً بند کرا دیا۔

نوروز فی الحقیقت پارسی قوم کا ایک تہوار ہے اور نوشیروان عادل کی تخت نشینی کی یادگار۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ نظام شمسی میں جس راستہ سے سورج اور چاند گزرتے ہیں اوس راستہ پر ستارگان ثوابت کی کیفیت وقوع سے بارہ شکلیں متصور ہوئیں انہیں شکلوں کا نام "برج" ہے اور ہر شکل میں (۳۰) حصے فرض کئے گئے ہیں جس کو "درجہ" کہتے ہیں اس دائرہ میں دو مقام یعنی درجے ایسے ہیں کہ اون کے محاذ میں جب آفتاب ہوتا ہے تو گرمی و سردی رات و دن کا اعتدال ہو جاتا ہے ایک جس کو "اعتدال ربیعی" کہتے ہیں وہ اس برج کا پہلا درجہ ہے جس کی شکل مینڈھے کی سی ہے جس کو عربی میں "حمل" اور ہندی میں "میکھ" کہتے ہیں دوسرا نقطہ "اعتدال خریفی" ہے جو برج "میزان" کا پہلا درجہ ہے۔ فصلوں کا تغیر آفتاب کی بلندی و پستی کی بناء پر ہوتا ہے اور تاروں سے جو شکلیں پیدا ہوتی ہیں وہ نہ آفتاب کے ساتھ وابستہ ہیں نہ آفتاب اون کا پابند ہے۔ آفتاب کے شکل "حمل" کے محاذ میں پہنچکر نقطہ اعتدال ربیعی میں چمکنے کی تاریخ نوروز ہے۔

اس کا وجود صرف پارسی قوم میں ہے دیگر اقوام نے جو نقطہ اعتدال کے تعین سے بحث کی ہے اور اس کو سب کا مرکز قرار دیا۔ اس لئے کہ ہر ذی روح اور موالید میں نشاط و تازگی روئیدگی اور بالیدگی اسی زمانہ میں ہوتی ہے مذہباً نو روز کی فضیلت کے وجوہ حسب ذیل تصور کئے گئے تھے۔

۱۔ اسی روز بعثت رسالتمآبؐ ہوئی۔

۲۔ اسی روز خانہ کعبہ کو بتوں کی آلائش سے حضور رسالتمآبؐ نے پاک فرمایا

۳۔ اسی روز غدیر خم کے مقام پر حضور رسالتمآبؐ نے حضرت علی رضؓ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔

۴۔ اسی روز حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کا خاتمہ اور حضرت علی رضؓ کی خلافت کا آغاز ہوا۔

حسابی جانچ سے ثابت ہے کہ یہ وجوہ مبنی برحقیقت نہیں ہیں۔

۱۔ حضرت رسالتمآبؐ کی ولادت باسعادت دوشنبہ ۲۰/اپریل ۵۷۱ء اور بعض تحقیقات کے مطابق ۴/مئی ۵۷۱ء کو ہوئی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے اس قدر متفق علیہ ہے کہ ربیع الاول مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا۔ پہلی تاریخ سے لیکر بارہ تاریخ تک انحصار کیا گیا ہے۔ قواعد ہیئت سے ثابت ہے کہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲/اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی اور ٹھیک چالیس سال کی عمر پوری ہونے پر اکتالیسویں سال کے پہلے روز منصب نبوت عطا ہوا۔

اب چونکہ چالیس سال قمری کے دن ۱۴۱۷۵ ہوتے ہیں اس لئے ۲۰/اپریل ۵۷۱ء سے اتنے دنوں کی تعداد ۹/فروری ۶۱۰ء روز یکشنبہ اور ۴/مئی ۵۷۱ء ۲۳/فروری ۶۱۰ء روز یکشنبہ کو پوری ہوتی ہے پس ثابت ہوا کہ آغاز نبوت ۱۰/فروری ۶۱۰ء خواہ ۲۴/فروری ۶۱۰ء روز دوشنبہ کو ہو یہ ہرگز نوروز کی تاریخ نہیں ہے کیونکہ نوروز ۲۶/مارچ ۶۱۰ء کو پڑتا ہے۔

۲۔ خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنیکی تاریخ میں اختلاف ہے صرف ۱۰/سے ۲۰/تاریخ تک محدود ہے فتح مکہ کی تاریخ کو حجۃ الوداع کی روشن تاریخ سے مقابل کرکے جانچا جائے تو حجۃ الوداع یوم جمعہ ۹/ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو محمدؒ بن موسیٰ خوارزمی منجم کے حساب سے مطابق ۶/مارچ ۶۳۲ء تھی۔

ں ۱۰ رتا ۱۷ ار رمضان ۸ھ مع ۹ ار ذیحجہ ۱۰ھ روز جمعہ کے۔ (۶۵۸ یا (۴۹۴) دن
رتے ہیں اور ۶ ار مارچ ۶۳۲ء سے گذشتہ زمانہ کی طرف اتنے دنوں کی تعداد ۲۳ ار یا ۳۰ ار
سمبر ۶۲۹ء پر پوری ہوتی ہے اور اس تاریخ سے نوروز تک پوری سہ ماہی کا تفاوت ہے۔

۳۔ اب غدیر خم کو بیچے جمعہ کے بعد حضور رسالتماب ۴ پورے ایام تشریق مکہ میں رونق افروز
۱۴ ار ذیحجہ کو بقصد مدینہ طیبہ مراجعت فرمائی ہوئی۔ محمد ۲ بن موسیٰ خوارزمی منجم کے حساب کے
ابق جمعہ ۹ ار ذیحجہ کو ۶ ار مارچ تھی تو ۱۴ ار ذیحجہ کو ۱۱ ار مارچ ہوئی اس رو سے آپ ۱۸ ار یا ۱۹ ار
ارچ ۶۳۲ء کو مدینہ میں جلوہ افروز ہو چکے تھے۔

۴۔ حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کا اختتام اور حضرت علی رضؓ کی خلافت کا آغاز بھی کسی
ح آفتاب کے نقطہ اعتدال ربیعی پر پہنچنے یعنی نوروز کے دن ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخ الخلفاء
ں علامہ سیوطی رحمۃ نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت جمعہ ۱۸ ار ذیحجہ ۳۵ھ کو واقع
ئی اور شب شنبہ کو مغرب وعشا کے درمیان سپرد خاک فرمائے گئے۔ صبح کو حضرت علی رضؓ کی
فت پر بیعت ہوئی تو جب مارچ ۶۳۲ء یعنی ۱۰ ار ذیحجہ ۱۰ھ ماہ حجۃ الوداع سے ذیحجہ ۳۵ھ
ے پچیس سال قمری کے ایام بمطابقت روز محسوب کرتے ہیں تو ۸۸۶۰ دن آتے ہیں جس کے
سی سال (۲۴) دن ہوتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی رضؓ کی بیعت خلافت کی تاریخ
روز سے ایک سہ ماہی بعد پڑتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ آل تیموریہ کو ہندوستان کی آب وہوا نے عیش پسند مضمحل اور آسودہ کر دیا
ا۔ انہیں داد عیش دینے کیلئے کسی نہ کسی حیلہ و بہانہ کے ہاتھ آنیکی دیر تھی۔ اس سے بڑھ کر اور
موقع عقاد مانی ہو سکتا تھا کہ ایک ساتھ چار مسرت آگیں مواقع جن میں معتقدات مذہبی کی
مس نے چار چاند لگا دیئے تھے ایک ہی روز میں یار لوگوں نے جمع کر دئے تھے چونکہ حیدرآباد
یشہ سے آئین و رسوم عہد مغلیہ کا مقلد رہا ہے اس لئے یہاں بھی نوروز منایا جاتا رہا بالآخر
لمگیر اورنگ زیب آصفی شاہ ذیجاہ حضرت سلطان العلوم مدظلہ العالی نے ایک فرمان مورخہ

یکم شعبان ۱۱۲۹ھ کے ذریعہ بدیں الفاظ اس تقریب کے مسدود کرنے کا حکم فرمایا کہ "نوروز کو اسلام سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ یہ آتش پرست اور مجوسیوں کی عید ہے"
نوٹ :۔ ماخوذ اکبرنامہ و تزک جہانگیری و تاریخ ریاست حیدرآباد و گلزار آصفیہ وغیرہ

محبّت

"جنس" ایک ولولہ ہے۔ ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ دل محبت ہے اور محبت ابدی (اہنگم)

جو محبت سے واقف نہیں وہ خدا سے واقف نہیں کیونکہ خدا محبت ہے (ملوز لٹن)

درجنت کو وا کرنیوالی چیز محبت ہے نہ کہ عقل جہاں محبت ہے وہاں علم کا گذر نہیں (رینگ)

جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ اپنی نظریں نیچی کر لیتی ہے لیکن جب کہیں اور دیکھتا ہوں تو وہ میری طرف دیکھتی ہے اور ایک ہلکا سا تبسم اس کے لبوں پر ہوتا ہے (کورل)

وہ دیکھتے ہیں جب کہ نہ دیکھے کوئی ان کو دیکھے کوئی ان کو تو وہ دیکھا نہیں کرتے

مقدس ترین محبت وہ ہے جو ممنون اظہار نہ ہو (کارلائیل)

عشاق کے دل کی دھڑکن کائنات سنتی ہے اور سن کر دم بخود رہ جاتی ہے (برنس)

نئی مسرتیں پیدا ہو سکتی ہیں ایام بہار و نشاط بھی آسکتے ہیں مگر ان سب کی محبت کے خواب شیریں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں (تھامس مور)

میں پوچھتا ہوں محبت کیا ہے؟ عقل جواب دیتی ہے "محض جذبہ بیکار" کیا میں اس کو تسلیم کر لوں؟ فطرت کہتی ہے "نہیں" —— اے ناصحو اپنی نصیحت ختم کرو۔ کیونکہ خشک زندگی نے تمہارے دل کو برف کی قاش کے مانند سرد کر دیا ہے۔ کیا میں تمہاری نصیحت سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتا ہوں؟ فطرت جواب دیتی ہے "نہیں!" (کمبرلینڈ)

حالی کی قومی شاعری

(جناب سید مہدی حسین صاحب)

(۱)

قومی شاعری، فرعونیت مآب بادشاہوں کی بیجا ستم گاریوں اور اغیار کی دست درازیوں کا نتیجہ ہے جس سے ملک کے ہونہاروں کے دلوں میں تمام قومی گرمجوشیاں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔ قومیت اور وطنیت کا دریا موجزن ہوتا ہے اور وہ ملک و قوم کی خدمت گزاری کے لئے اپنی بساط سے زیادہ ایثار و قربانی پر اتر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مغربی سیاسیات میں قومی شاعری کی غیرمعمولی اہمیت ہے مگر لسانیات ہند میں اس جوش انگیز شاعری کا سن آغاز۔ تاریخ ہند کا وہ واقعۂ فاجعہ ہے جس کی ہلاکت باریوں اور خون آشامیوں کو سن کر "محفل عشرت" آج بھی "ماتم کدہ" بن سکتی ہے اس سے میری مراد غدر ۱۸۵۷ء کی حشر سامانیاں ہیں جو تاریخ بین حضرات سے مخفی نہیں یہ زمانہ من حیثیت المجموع اہل ہند پر اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص عذاب الہی تھا۔ وہ قوم جس نے زر و جواہر کے انبار کو ٹھکرا کر "بت فروشی" پر "بت شکنی" کو ترجیح دی تھی۔ صدیوں سے ہندوستان کے راج پاٹ کی مالک تھی۔ "حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر" جس کا ایمان تھا۔ اتفاق یکجہتی خلوص محبت۔ اور جوش عمل کو جس پر ناز تھا۔ فلک تفرقہ انداز کی کج ادائیوں اور مظالم تراشیوں سے افلاس و نکبت کے "بحر متلاطم" میں "صورت خس" بہ رہی تھی اس کا آفتاب اقبال گہنایا ہوا تھا سلطنت مٹ چکی تھی۔ امراء و شرفا تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ جہاں طبل و نقارے کی صدا سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی وہاں سکوت مبہم طاری تھا۔ آبادی ویران ہو گئی تھی۔ ماضی کی بزم آرائیاں اور طرب سامانیاں گونگے کا خواب ہو گئی تھیں۔ ہر طرف جہالت کی گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں اخلاق و عادات بگڑ چکے تھے۔ بٹیربازی۔ پتنگ بازی اور اسی قبیل کی بیسیوں بازیاں من بھاتے شغل بن گئے تھے اور حسد، غیبت، تکبر اور خود پسندی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے۔

الحاصل گردش روزگار نے اس باعظمت قوم کو قعر ذلت میں ڈھکیلنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا جس نے چار دانگ عالم میں علم و تہذیب کی روشنی پھیلائی تھی۔ مگر جب کارکنان قضا و قدر کو کسی قوم کی کشتیٔ حیات کا برباد تلاطم کرنا مقصود نہیں ہوتا تو پردہ غیب سے ایسے امید افزا حالات رونما ہوتے ہیں جو بقائے قومی کیلئے لابدی ہیں چنانچہ ملت بیضا کی ناؤ کو منجدھار فلاکت سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچانے کیلئے چند فرض شناس غمگساران قوم نامزد کئے گئے۔ جنھوں نے "حق ناخدائی" بہ احسن الوجوہ ادا کیا اور قوم کو اس وقت خواب غفلت سے جگایا جبکہ وہ گھوڑے بیچے سو رہی تھی

اس اصلاحی مشین کے "خضر" سر سید علیہ الرحمہ تھے اور مولنا حالی اس کے روح رواں جو جدید اردو شاعری کے اولین نقیب اور رو فارشعار علمبردار ہیں۔

(۲)

حالی دراصل "قدیم شاہد رعنائے سخن" کے پرستار تھے۔ راز و نیاز حسن و عشق کی ترجمانی میں ان کے توسن طبع کی جولانیاں اور طائر خیال کی بلند پروازیاں ہماری زبان کے مسلم الثبوت اساتذہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کی غزلیں زبان کی صفائی، طرز بیان کی برجستگی، اور ندرت خیال کی نفیس مثالیں ہیں۔ ان کی یہ شاعری تقلیدی اور انجذاب گدایانہ کے اصول عمومی کی پیداوار ہے۔ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ مولنا کی شاعرانہ قابلیتوں کے متعلق سوئے ظن پھیلایا جائے ہمیں اعتراف ہے کہ ان میں استعداد شاعری فطری اور خداداد تھی لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر شاعر کا کلام اس کے ماحول کا آئینہ ہوتا ہے۔ مولنا حالی نے ایک ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب کہ گل و بلبل کی شاعری کا لپکا گھر گھر تھا۔ مولنا کوئی مافوق الفطرت انسان تو تھے نہیں کہ بغیر کسی محرک کے ہوا کا رخ بدلنے کی کوشش کرتے آغا حشر نے کیا خوب کہا ہے "دماغ خیال کا گنجینہ ہے۔ لیکن اس گنجینہ کے کھلنے کے لئے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے" تاریخ ہند کے ناقابل فراموش محشر زا ہنگامے

کے بعد جب ولائتی توپ و تفنگ کے آگے "ہندی تلواریں" بیکار ثابت ہوئیں اور سلطنت مغلیہ کے آخری بدنصیب تاجدار کو جلا وطن کر دیا گیا تو اہل ہند پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص افلاس و جہالت کی گھٹائیں طاری ہو گئیں کہ زبان قلم ان کے بیان کرنے سے قاصر و عاجز ہے بقول اقبال "شاعر رنگین نوا، دیدۂ بینائے قوم" ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ قومی عزت و حکومت کا گلستان اجڑ جائے اور وہ خون نشانی نہ کرے۔ قوم پر آفات و مصائب کی بجلیاں گریں اور وہ ٹس سے مس نہ ہو! حالی کا دل قومی الفت کا گنجینہ تھا۔ وطنیت و قومیت کی چنگاریاں اُن کے قلب میں مستور تھیں جس سے وہ اندر ہی اندر پھنک رہے تھے اس پر ستم ظریفی یہ کہ سرسید نے قومی تنزل و انحطاط کی ڈراؤنی تصویریں دکھائیں اور اپنی شعلہ بیانی سے ان کی شراب الفت کو دو آتشہ بنا دیا۔ یا جلتی ہوئی آگ پر تیل ڈال دیا۔ اب حالی کی سمجھ میں آیا کہ حسن و عشق کی فریب کاریاں، اور فراق و وصال کی رنگین داستانیں دور بہجت و نشاط کی روح ہیں۔ لیکن جب قومی ناؤ گرداب میں پھنسی ہو محبت و اخوت کی جگہ نفسی نفسی کا طوطی بول رہا ہو اور حیات قومی پر جمود و خمود کی سی کیفیت طاری ہو یہ سہانے راگ "میٹھی لوریوں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ انہوں نے عشق و الفت کی بانسری توڑ پھینکی اور قوم کی عظمت رفتہ پر نوحہ خوانی کو اپنی شاعری کا دائمی موضوع قرار دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت عزت کبھی
تھیں سخنور کے لئے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

(۳)

حالی کی قومی شاعری پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید اردو شاعری کے وجوہ آغاز پر روشنی ڈالی جائے جس کی تشکیل میں اردو کے بے غرض محسن کرنل ہالرائڈ اور آزاد مرحوم کے مساعی قلم انداز نہیں کئے جا سکتے کیونکہ ان بزرگوں نے اپنی پر خلوص کوششوں مثلاً (مختلف عنوانات پر مسلسل نظم نگاری کی تحریک اور غیر طرحی مشاعروں کا انعقاد وغیرہ) سے اردو شعر کو دوراز کار تشبیہوں۔ استعاروں اور لفظی الٹ پھیر سے معرا کیا۔ مبالغہ پرستی اور عرش پیمائی کو جو جان تغزل سمجھے جاتے تھے مرفوع القلم کرکے سادگی اور اصلیت سے اس کی تزئین کی۔ ان جلسوں میں حالی بھی شریک ہوا کرتے تھے مگر مقدمہ شعر و شاعری کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نظریہ شاعری کے بدلنے میں انگریزی شاعری کے اثرات کو کافی دخل ہے اس لئے کہ مولانا کو بحیثیت ناظر ادبی لاہور بک ڈپو، انگریزی شاعروں کی منظومات کے اردو ترجمے دیکھنے کا موقع ملا تھا جن میں جوش، صداقت اور اثر آفرینی کی کچھ ایسی جھلکیاں نظر آئیں کہ مولانا ڈنکے کی چوٹ پکار اٹھے۔

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں — بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اسی خیال کو پروفیسر سلیم مرحوم کسی قدر وضاحت سے یوں بیان کرتے ہیں۔

ہر خیال کہنہ کو دل سے مٹانا چاہئے — اک نیا عالم تصور کا بسانا چاہئے
لالہ و سوسن کی تصویروں سے جی اکتا گیا — اک مرقع تازہ رنگوں کا سجانا چاہئے
جام و مینا ہوں نئے رندان مئے کش ہوں نئے — اک نئے پیر مغاں کو ڈھونڈھ لانا چاہئے

یہ بھی ممکن ہے کہ جدید شعری نصب العین کی پیدائش میں مولانا کی "کبر سنی" کو بھی دخل رہا ہو کیونکہ عالم پیری میں جذبات عشق سرد پڑ جاتے ہیں۔ ثبوت میں ہم انہیں کا ایک قطعہ نقل کرتے ہیں

ہوئی ویران جوانی کی بہار آخر حیف — طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

اپنی روداد تھی جو عشق کی کرتے تھے بیاں ۔۔۔ جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر خالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ ۔۔۔ سر سے ہے سودا ہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر ۔۔۔ نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی جو نہ ہو ہی وہ کہانی بے لطف ۔۔۔ گرچہ ہو لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں ۔۔۔ لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر ۔۔۔ کیجئے درد جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح ۔۔۔ وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل ۔۔۔ عجب چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

اب مولانا کے نزدیک سچی شاعری وہی قرار پائی جو کیف صداقت سے مملو ہو یا بقول اقبال "جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے"۔ چنانچہ شعر سے خطاب کرتے ہوئے وہ انہی تاثرات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

اے شعر دلفریب نہیں تو تو غم نہیں ۔۔۔ پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم تمام اگر ۔۔۔ ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں ۔۔۔ تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری ۔۔۔ قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجیو نماز تو
اہل نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز ۔۔۔ جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ ساز باز تو
اے شعر راہ راست کو جب تک پڑھ لیا ۔۔۔ اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد ۔۔۔ اس کی تلافی ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

جب تک مولانا زندہ رہے ان خیالات کی پابندی سے سرمو انحراف نہیں کیا چنانچہ ان کے آخری دور کی شاعری تصنع اور بے پر کی گپ بازیوں سے یکسر پاک ہے۔

اقبال نے کہا ہے "کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو" یہی احساس تھا جس نے حالی کو "نگار خانہ تغزل" سے باہر نکالا اور ایک نئی محفل کا ڈول ڈالنے پر آمادہ کیا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اگرچہ مولانا کے رگ وپے میں شباب کا گرم خون نہ تھا اور بقول شخصے وہ لحد میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے تاہم آدمی تھے جہاں دیدہ اور تجربہ کار، اقتضائے وقت کو تاڑ گئے۔ قومی الفت نے اکسایا اور وہ خم ٹھوک کر شاعری کے نئے میدان میں کود پڑے۔ عامۃ الناس نے مخالفت کی۔ تمسخر واستہزا کا نشانہ بنایا پھبتیاں کسیں۔ کفر وارتداد کے فتوے صادر کئے۔ مگر وہ دھن کے پکے۔ زبان کی طرح بتیس ۳۲ دانتوں میں رہ کر اپنے مقصد کی ترویج وتلقین میں مصروف رہے وہ جانتے تھے کہ "چشم محفل" جب آشنائے لطف بے خوابی" نہیں ہوتی تو شاعر کی "صدائے نیم شب" بارگوش ہوتی ہے۔ کیا یہ حالی کا وقیع اور زندہ جاوید کارنامہ نہیں ہے کہ انہوں نے نامساعد حالات اور ہمت شکن ماحول میں رہنے کے باوجود قدیم اصنام خیالی کی شکست وریخت کا بیڑہ اٹھایا۔ اردو شاعروں کو صنم کدۂ تغزل سے نکال کر فطرت کے وسیع میدان کی سیر کرائی اور ملک کے نوجوانوں کے قلوب میں قومی الفت کا بیج بویا جس سے ایک وطن پرست متعلم ادب کے دل میں ان کی عظمت دوبالا ہو جاتی ہے۔ قوم کی ماتم گساری کو ایکبار جب انہوں نے اپنے آپ پر فرض گردانا تو پھر غزل کے رنگین داستانوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگر کوئی غزل سنانے کی خواہش کرتا ہے تو یہ رباعی سناتے ہیں۔

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو — کچھ چشم جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس وکوہکن یاد نہیں — چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

اور ایسا کہنے پر وہ مجبور بھی تھے اس لئے کہ حالات حوصلہ افزا نہ تھے۔ زمانہ پر آشوب تھا۔ سماجی زندگی میں انقلاب رونما تھا اور ملک میں عام طور پر بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ دیکھئے شاعر نے ذیل کے اشعار میں اس دور کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا — ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زورمند ضعیف — بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و لیقتو سے — گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے — گھائلوں پر ہیں ہیز، تیر انداز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس — اور یاروں کے یار ہیں غماز
ہوگا انجام دیکھئے کیا کچھ! — ہے پُر آشوب جب کہ یہ آغاز
وقت نازک ہے اپنے بیڑہ پر — موج ہائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے — یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز
کام آئے اپنے سونپ دو حالیؔ — نہیں جس کا شریک اور انباز

یہ انتشار بے وجہ نہ تھا۔ سلطنت دہلی کا شیرازہ بکھر گیا اور دلی جو شاہان مغلیہ کے جاہ وحشم کی یادگار۔ باکمالوں کا مسکن اور مرجع خلائق تھی۔ تباہ و برباد ہوگئی۔ حالیؔ کے حساس دل پر اس جان گداز سانحہ عظیم کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اگر بر سبیل تذکرہ بھی کوئی اس حرماں نصیب راجدھانی کا چار حرفی نام لیتا ہے تو وہ بیتاب ہوجاتے ہیں گویا اگلی رنگین صحبتوں کا وجد آفریں مرقع پیش نظر ہوجاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"تذکرہ دہلی مرحوم کا ای دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا ے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئینگی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینہ پہ بہت ای سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط — نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دہلی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو — یاد کر کرکے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق — اب دکھائیگا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لیگا کوئی دانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانہ ہرگز

چشم تصور سے کام لیجئے جب یہ دردناک مرثیہ زخم خوردہ احباب کے گوش گزار کیا گیا ہوگا تو ان پر کیا گذری ہوگی۔ اس مرثیہ کا ہر مصرعہ یاس آفریں اور سوز و گداز سے مملو ہے۔

عروج و زوال ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہیں۔ ملک کے اجڑ جانے اور سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے پر شاعر یہ کہکر اپنے دل کو تسلی دے سکتا تھا کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں" اور اگر قوم بھی تباہ ہوجائے تو اس کی آرزوئیں مٹ جاتی ہیں اور جوش قومی حزن و ملال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی اور وہ آشفتہ حال گلی کوچوں میں پڑے پھرتے تھے آپ انہیں کی زبانی قوم حالت سنئے۔

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم — بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
روتے ہیں چار رہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر — یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ان ہمت شکن حالات میں انسان کا مایوس ہوجانا خلاف فطرت نہیں ہے مولٰنا کو قطعی طور پر یقین ہوگیا تھا کہ اب شجر اسلام سرسبز و شاداب نہیں ہوگا لیکن یاس آفریں انداز میں فرماتے ہیں:

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

(باقی)

زمانۂ اسلام میں فارسی کا اولین شاعر

جناب فاطمہ لیاقت حسین صاحب (ہردوئی)

مورخین اور ارباب تذکرہ کی ایک اہم جماعت نے اس امر پر بحث کرتے ہوئے کہ ایران میں اشاعت اسلام کے بعد سب سے پہلا شاعر کون ہوا ہے؟ ابو حفص حکیم راحوص کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ زمانۂ اسلام میں فارسی کا سب سے اولین شاعر ہے۔ ابو نصر فارابی (متوفی ۳۳۹ھ) نے ابو حفص کے متعلق اس امر کی بھی تصریح کی ہے کہ وہ فن موسیقی میں بھی کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ ابو نصر فارابی کی تحقیق کے مطابق وہ سنہ ۳۰۰ھ میں گزرا ہے۔ ذیل کا فارسی شعر اسی سے منسوب ہے۔

آہوے کوہی در دشت چگونہ دودا	چو ندارد یار بے یار چگونہ دودا

کتاب المعجم میں بھی صفحہ ۱۸۰ پر اس کی تائید کی گئی ہے کہ یہ شعر ابو حفص ہی کا ہے لباب الالباب کے مولف نے خواجہ زادہ عباس نامی شخص کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ فارسی کا اولین شاعر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

جس زمانہ میں خلیفہ عباسی مامون کی حکومت کا پرچم اسلامی ممالک کی بلندیوں پر لہرا رہا تھا اور اپنے اوصاف اعلیٰ کی بدولت لوگوں کے قلوب مسخر کر رہا تھا۔ مرو میں عباس نامی ایک شخص تھا جو شاعری کی دولت سے مالا مال تھا۔ فارسی و عربی میں مہارت تامہ رکھتا تھا جب سنہ ۱۹۳ھ میں خلیفہ مامون وارد مرو ہوا تو شخص مذکور نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھکر پیش کیا۔ جس کا مطلع یہ تھا۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین	گستر انیدہ بجود و فضل در عالم بدین
مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را	دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین

اسی قصیدہ کے ضمن میں آگے چل کر لکھتا ہے۔

کس بریں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت — مرزبان فارسی راہست تا ایں نوع بہ بین
لیکن از اں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت — گیرد از حمد و ثنائے حضرت تو زیب وزین

اس کے صلہ میں ماموں نے ایک ہزار دینار عطا کئے اس کے بعد شاہی مستقل وظیفہ مقرر کردیا مجمع الفصحاء کے مصنف نے لکھا ہے کہ خواجہ زادہ عباس کی وفات سنہ ۲۰۰ھ میں ہوئی اور صاحب لباب الالباب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ماموں سنہ ۱۹۳ھ میں مرو آیا اور یہ قصیدہ پیش کیا گیا۔

یہاں پر اس قصیدے کے آخری دو شعر پیش کئے گئے ہیں جس میں شاعر اس کا اظہار کرتا ہے اس سے پہلے فارسی میں شعر نہیں کہے گئے بعض مستشرقین نے لباب الالباب کے مولف کی اس حکایت کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن ایک ایسی جماعت بھی ہے جو اس کے خلاف ہے غور سے دیکھنے سے موخر الذکر جماعت کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قصیدہ کا اسلوب سخن بتا رہا ہے کہ یہ دوسری تیسری صدی کا کلام نہیں بلکہ چوتھی صدی کا بھی نہیں ہوسکتا اگر ہوسکتا ہے تو پانچویں صدی کا اس کے علاوہ الفاظ کی مطابقت جیسے "شائستہ" "بائستہ" اور ترکیبیں جو اس کلام میں موجود ہیں اس کی تائید نہیں کرتیں کہ یہ کلام سنہ ۱۹۳ھ کا ہے۔

۲۔ ماموں جمادی الاول سنہ ۱۹۳ھ میں وارد مرو ہوا۔ اور جب امین ذوالیمین کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اور ماموں کی بیعت کی گئی یعنی سنہ ۱۹۸ھ تک ماموں مرو میں رہا۔ اس کو زمانہ امین تک خلیفہ نہیں بلکہ امام کہتے تھے اس لئے شعر میں "مر خلافت را تو شائستہ" کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ یہ قصہ مصنوعی ہے۔

۳۔ قصیدہ کا یہ شعر "کس بریں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت" یقینی مصنوعی ہے کیونکہ زمانہ اسلام میں پہلے شاعر کا مصنوع نہایت اہمیت رکھتا تھا اور واقعی طور پر یہ کہنا کہ فلاں شخص فارسی کا پہلا شاعر ہے بہت مشکل تھا اس لئے اس داستان طراز نے اس کو عباس کی طرف منسوب کر دیا غالباً ان لوگوں کا مقصد یہ ہوگا کہ اس کا سہرا عباس مروزی اور ماموں کے سر باندھیں۔ ایسی شخصی اختراعات ایران کی اسلامی تاریخ میں اکثر پائی جاتی ہیں۔

"مجمع الفصحاء" کے مولف نے بایزید بسطامیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے فارسی میں سب سے پہلے شعر لکھا اس کا ثبوت چند رباعیاں ہیں جس کے متعلق کسی کو یہ صحیح علم نہیں کہ کس کی کہی ہوئی ہیں لیکن مولف مذکور ان کو بایزیدؒ ہی کی طرف منسوب کرتا ہے حالانکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی کی تصنیف ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ زمانۂ اسلام میں فارسی کا پہلا شاعر کون تھا کیونکہ ایرانی مزارعین تک کا کاشانہ دل ذوق شاعری سے معمور تھا وہ کاشتکاری کے وقت زمزمہ سنجی نغمہ پیرائی میں مصروف رہتے اس لئے صحیح طور پر یہ کہا نہیں جاسکتا کہ جس شخص کی زبان پر پہلا فارسی شعر ہوا وہ کون تھا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ایران کی موجودہ شاعری اور موسیقی کی بنیاد ساسانی شاعری اور موسیقی پر ہے جو زمانہ کے تغیرات کیساتھ بدلتی رہی۔ (ماخوذ)

رنگ رضا

جناب آل رضا صاحب (لکھنو)

جو مانگا ہے کسی قابل سمجھ کے
تو رکھنا بھی رضا کا دل سمجھ کے

دعائیں دینے والا بےغرض ہے
جھڑکتے ہو کسے سائل سمجھ کے

عطا مجھکو ہوئی مرنے کی حسرت
اسی امید کے قابل سمجھ کے

اسی حیرت میں ہوں دنیا میں آکر
مجھے بھیجا ہے کس قابل سمجھ کے

مری آنکھوں کے رنگ دل اڑ ایا
نشانہ تاک کے غافل سمجھ کے

اسی مجلس سے اٹھوائے گئے ہم
جہاں بیٹھے تری محفل سمجھ کے

کٹھن ہے راہ کہدو صور پھونکیں
مسافر سوئے ہیں منزل سمجھ کے

تمہیں اس زندگی کو ختم کردو
جیوں کیں اور تمہیں قاتل سمجھ کے

مٹا ڈالا شپک کر آنسوؤں نے
لکھا تھا کچھ ترے قابل سمجھ کے

وہ ہیں اب اپنی ہی مجلس سے غافل
رضا کی ماتمی محفل سمجھ کے

تعلیم اور عورتوں کی شجاعت

(جناب ابو الحسنات حبیب اللہ بن خاں صاحب)

وہ زمانہ جس کو اب ہم زمانہ جاہلیت سے منسوب کرتے ہیں عورتوں کا طبقہ علمی دنیا کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش رہا ہے جب آفتاب اسلام کی شعاعیں روئے زمین پر پڑنا شروع ہوئیں تو تعلیم نسوان میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا رسول مقبول صلعم نے روحانی زندگی و روحانی ترقیوں میں عورتوں اور مردوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا ہر وہ نیک کام جس سے مرد استفادہ کرسکتا تھا عورت بھی اس سے محروم نہیں رکھی گئی عورت گھر کی ملکہ اور مختار سمجھی جاتی تھی عورتوں کی تعلیم پڑھی لکھی عورتوں اور نیک طینت بڑے بڑے مردوں کے ذریعہ اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی ہزاروں مسلمان عورتیں ایسی مل سکتی ہیں جو اس زمانہ کی یکتائے روزگار خیال کی جاسکتی ہیں اس زمانہ کے مرد بھی ان کے شرف تلمذ کو فخر سمجھتے تھے اس طبقہ اناث نے نہ صرف حصول علم میں کمال کو حاصل کیا بلکہ فن سپاہ گری میں بھی بڑے بڑے شجیع اور سورماؤں کو نیچا دکھا دیا باوجود اس کے پردہ جو عورتوں کا فطری حق ہے اس زمانہ میں کبھی بھی زیر بحث نہیں رہا اور نہ آزادی کا کوئی سوال اٹھایا گیا یہ ایک بالکل جداگانہ موضوع ہے میرے مضمون کا مقصد صرف عورتوں کی شجاعت اور ان کی عالمانہ زندگی پر تبصرہ کرنا ہے اس لئے پردہ کے متعلق بحث غیر ضروری ہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ ایسی عالمہ اور فاضلہ تھیں کہ آپ کے ظاہری اور باطنی کمالات ہی کا سبب تھا کہ اس زمانہ میں آپ کا لقب (طاہرہ) ہوگیا تھا رسول اللہ صلعم نے آپ کو کبریٰ کے معزز خطاب سے ممتاز فرمایا اور آپ کی اولو العزمی کا وہ عالم تھا کہ آپ نے ترقی اسلام کے لئے اپنی دولت کو صرف کرنے میں دریغ نہیں فرمایا بانی اسلام کا سب سے پہلے ہاتھ

جس نے بنایا وہ بھی حضرت خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔

حضرت فاطمہ زہرا رضہ بھی کمال درجہ کی عالمہ تھیں آپ کے علم کا وہ شہرہ تھا کہ عرب کے بڑے بڑے ادیب آپ رضہ کی قابلیت و فراست پر سر تسلیم خم کرتے تھے اسی طرح شجاعت میں بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتوں نے قدم بڑھایا۔ مخدرات میں لکھا ہے کہ ایک خاتون ام ربان اپنے بہادر و شجاع باپ اور رجال بازغیلہ والوں کی تربیت میں اسلحہ جنگ اور آلات گیر و دار کے استعمال کرنے میں اچھی مہارت حاصل کی تھیں فنون جنگ نے اس خاتون کی شجاعت میں اور بھی جان ڈال دی جب لشکر اسلام شام کے قدیم اور مشہور شہر دمشق کی طرف بڑھا اس میں یہ دو چار روز کے بیاہے ہوئے میاں بی بی بھی تھے دمشق کے محاصرہ کے شروع ہوتے ہی تقدیر نے جو ہمیشہ اچھے لوگوں کے لئے ذریعہ آزمائش ہوتی رہی ہے یہ کرشمہ دکھایا کہ کسی رومی کے زہر آلود تیر نے ام ربان کے نوجوان شوہر کو جام شہادت پلا دیا اور وہ قبل اس کے کہ عروسی کی مہندی کا رنگ چھٹنے پائے بیوہ ہوگئیں اس واقعہ پر یہ دین کی مضبوط تعلیم یافتہ نیک بی بی نہایت ہی استقلال و ثابت قدمی سے کام لیا اور مشیت الٰہی کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کی شکایت کا ایک جملہ بھی اس نوجوان خاتون عرب کی زبان سے نہ نکلا اس دل خراش و جانکاہ موقع پر ام ربان نے جو کارروائی کی یہ تھی کہ مرحوم و شہید شوہر کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر عجیب شکر و صبر کے لہجہ میں کہا۔

"پیارے شوہر تمہیں مبارک ہو اور خدا نے تمہیں آغوش رحمت میں لے لیا تم اوسی خدا کے پاس گئے جس نے ہمیں تمہیں ملایا تھا اب جدا کر دیا اب میں تمہاری موت کا انتقام لوں گی اور اس کوشش میں اپنی جان لڑا دوں گی اور جہاں تم ہو وہاں میں بھی آپہونچوں گی۔ اس لئے کہ مجھے تمہارے ساتھ عشق ہے بس اب اس کے بعد میرے جسم میں کسی اور شخص کا ہاتھ نہ لگے گا۔ کیونکہ اب میں نے اپنے آپ کو خدا کی خدمت بجا لانے کے لئے وقف کر دیا ہے"

یہ کہکر شوہر کی لاش کو خود اپنے ہاتھوں غسل دیا اور رسوم اسلام کے مطابق دفن کردی اس سے فراغت پاتے ہی ام ربان نے جنگی لباس زیب بدن کیا۔ ہتھیار لگائے اور دشمنوں کے مقابلہ کو تیار ہوگئیں اس زمانہ میں دمشق کی حکومت ٹامس نامی ایک بہادر شہسوار کے ہاتھ میں تھی۔ ٹامس نہایت بہادر اور شجاع شخص تھا اور میدان جنگ میں استقلال سے لڑ رہا تھا کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوئے جاتے تھے اس خونریز میدان میں ام ربان ہتھیار باندھے ہوئے کودیں جس جگہ سب سے زیادہ سخت لڑائی ہو رہی تھی کہتی اور ہلتی ہوئی پہنچیں اور کمان کو ہاتھ میں لیکر دشمنوں پر تیر برسائے اس کا پہلا تیر رومیوں کے علمبردار کے ہاتھ پر پڑا۔ اور صلیبی علم گر گئی۔ عیسائی جھنڈا اٹھانے کو بڑے جوش کے ساتھ بڑھے مسلمانوں نے روکا۔ اور پہلے سے زیادہ سخت لڑائی ہو رہی تھی کہ ایک اور تیر خاص ٹامس کی آنکھ پر پڑا اور پیوست ہوگیا یہ بدحواس بھاگا اور آناً فاناً میدان سب دشمنوں سے صاف ہوگیا۔ اس کے بعد ایک رات کی لڑائی میں ام ربان جدھر دیکھتی کہ سخت لڑائی ہو رہی ہے جا پہنچیں ایک ایک سے دریافت کراتیں کہ میرے شوہر کا قاتل کون ہے اور تیروں سے جو قضائے مبرم کا پیام لیجاتے تھے دشمنوں کو مار مار کر گرا دیتیں اس قسم کے سینکڑوں مستورات قدسی صفات کے حالات بیان ہوسکتے ہیں۔ اللہ! اللہ! کیسی جانباز دلیر عصمت اور عفت کی دیویاں تھیں۔ یہ کیا تھا محض تعلیم نبوت کے برکات تھے افسوس کہ حقیقی تعلیم کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہم میں حمیت۔ غیرت۔ صداقت۔ شجاعت سے کوسوں دور ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ جل شانہ یہ صفات پھر ہم میں ودیعت فرمائے۔

ادیب

جناب حجاب

(۱)

آنسہ زلیخا فاطمہ دور حاضرہ کی مشہور افسانہ نگاروں میں تھیں۔ اس کے معجز نگار قلم سے جو بھی مضمون نکلتا۔ رسائل ہاتھوں ہاتھ لے لیتے۔ دنیائے صحافت میں اس کی سحر نگاری جادو طرازی کا تہلکہ مچا ہوا تھا۔ یوں تو وہ ہر اچھے اچھے رسالہ میں مضامین دیتی تھی مگر "تسنیم" کی وہ خاص مضمون نگار تھی اس کے مضامین عموماً حسن و عشق سے لبریز ہوتے۔ افسانہ کا پلاٹ بھی قریب قریب یہی ہوتا۔ "تسنیم" لے خرید ار ہمیشہ پہلے آنسہ زلیخا فاطمہ کا مضمون پڑھتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دُر نایاب جس کے ہاتھ لگا وہ ایک خوش قسمت شخص ہوگا۔ اس کی نظم و نثر کا ہر شخص دل کھول کر داد دیتا تھا۔ اچھے اچھے ادیب کہا کرتے تھے کہ اس لڑکی کو ایسا دل و دماغ قدرت کی طرف سے ملا ہے۔

ایک بار ایک مضمون "جویائے حق" شائع ہوا۔ جسے پڑھکر لوگ بیخود ہوگئے۔ غرض زلیخا کہ ہر طرف سے عقیدت کی بارش ہوتی اکثر خود زلیخا اپنی تحریر دیکھ کر آپ مست ہو جاتی منحوس تھا وہ دن جب کہ اس کی تعریف کا کوئی خط نہ آتا ہو ہر شخص اس کی نیرنگیوں کی مدح سرائی کرتا مگر زلیخا تھی کہ اپنی ڈاک کو دیکھ کر ایک شان بے نیازی کے ساتھ پرزہ پرزہ کر دیتی لوگوں کو زلیخا کا آئندہ خوشگوار مستقبل نظر آ رہا تھا۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

(۲)

تسنیم جولائی میں زلیخا کا ایک مضمون رموز عشق شائع ہوا۔ اس کی اشاعت پر یہ حال تھا کہ لاہور کے ہر شخص کے ہاتھ میں تسنیم جولائی نظر آتا تھا۔ اڈیٹر کو دوسرا اڈیشن جلد شائع کرنا پڑا۔ رموز عشق کیا تھا ایک تصویر [illegible] ہر شخص اسے پڑھ کر گھنٹوں [illegible] سوچتا تھا۔

ریاض اک نوجوان ڈپٹی مجسٹریٹ نیا نیا لاہور آیا ہوا تھا۔ بھلا کیسے ممکن تھا کہ "رموز عشق" کے مطالعہ سے محروم رہتا! پڑھا اور بہت متاثر ہوا۔ دل سے دعا نکلی کہ "اے کاش یہ ادیبہ مجھے ملجاتی" اکثر زلیخا کا مضمون پڑھ کر کہا کرتا۔ سے

تم ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم میرے لئے ہوتے

زلیخا کے شناساؤں سے ملکر کسی طرح زلیخا کے والدین سے بھی ملا اور بڑے شوق سے زلیخا کے لئے پیام دیا نہ جانے کیسے کیسے رشتہ جوڑ کر زلیخا کا بھائی بھی نکل آیا۔ انہوں پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں" کسی کو خبر بھی نہ تھی قسمت کی بات یا بقول بزرگوں کے جوڑا لکھا تھا آنسہ زلیخا فاطمہ مسز ریاض ہوگئیں۔ ہر طرف سے مبارک باد کی دھوم مچ گئی۔ اخباروں کے کالم پر کالم صرف تذکرہ شادی سے سیاہ ہو رہے تھے۔

(۳)

نئی نئی شادی ہوئی زلیخا جس کی دنیا ہی محبت تھی جو ہمیشہ محبت کی دنیا میں سانس لیا کرتی تھی اب حقیقی معنی میں محبت سے ہم آغوش تھی۔ اس نے دنیائے تخیل میں کتنی ہی راتیں اپنے خیالی محبوب کے ساتھ گزاری تھیں۔ بہار کی حسین صبح میں وہ اپنے خیالی دوست کے ساتھ محو سیر چمن رہ چکی تھی ——— اس کے نزدیک مقصد زندگی محبت اور صرف محبت تھا لیکن اب جب اسے واقعی ایک دوست ملا تو اس پر یہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ سے

زندگی کو طرب آمیز سنا کرتے تھے یہ تو اک قصہ پُر درد پُر ارماں نکلا

زلیخا کو معلوم ہوگیا کہ "محبوب" اور "شوہر" میں بہت فرق ہے۔ اکثر جب ریاض زلیخا کی بلور جیسی پیشانی کا بوسہ لیتا تو وہ ایک ناقابل بیان اذیت محسوس کرتی۔ ریاض کو خدا جانے کیوں حسن و عشق سے نفرت تھی زلیخا کے مضامین اب کبھی نہ پڑھتا تھا۔ اسے حسن و عشق کے افسانے سے چڑھ ہوگئی تھی اس کا خیال تھا عورت کو اظہار محبت نہ کرنی چاہئے مگر اب وہ اسے بھول گیا تھا کہ زلیخا سے اس نے صرف اسی لئے شادی کی تھی کہ وہ " دور حاضرہ کی بہترین ادیبہ

تسلیم کی جاتی تھی۔ ریاض اکثر زلیخا سے کہتا کہ "حسن و عشق کو چھوڑ کر کسی دوسرے پہلو پر مضمون لکھو۔ زلیخا نے بھی اس کی بہت کوشش کی کہ وہ کوئی ایسا افسانہ لکھے جو اس عنصر سے پاک ہو لیکن ایسا کوئی مضمون کبھی بھی مکمل نہ ہو سکا۔ ایکبار بہت کوشش سے اس نے ایک افسانہ "خلوص" لکھا اور اپنی ساری لیاقت اس کے اختتام میں صرف کر دی لیکن جب اس کا دوبارہ مطالعہ کیا تو خود مضمون کی بے ربطگی پر ہنس پڑی اسے یقین ہو گیا کہ وہ دنیا میں صرف حسن و عشق کے لئے پیدا ہوئی ہے۔

(۴)

ریاض کی غفلت، دن بدن بڑھتی گئی اسے شکایت تھی کہ زلیخا اس کی بات کیوں نہیں مانتی وہ زلیخا کی مجبوری ذرا نہ سمجھا بلکہ "نافرمانی" کہتا تھا۔ خود ریاض کو کبھی بدقسمتی سے مضمون لکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا وہ بھلا طرز نگارش کی باریکیوں کو کیا خاک سمجھتا؟ ساخت کی نزاکت کو وہ "بگڑی شاعری" سے تشبیہ دیتا تھا۔ خدا جانے "رموز عشق" کے لئے اس کے دل کا درد کس طرح جاگ گیا تھا ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وہ ہر شخص سے اس کی تعریف سن چکا تھا۔ اور اس وقت وہ زلیخا کو عنقا خیال کرتا تھا۔ لیکن جب وہ خیالی چیز یا اسے مل گئی تو پھر ریاض کے لئے بد سے بدتر ہو گئی۔ زلیخا جو محبت کی بھوکی تھی جو افسانہ میں محبت تلاش کرتی تھی مجاز میں حقیقت کی متلاشی تھی اپنے شوہر کی بے اعتنائیوں سے بیحد دلگیر تھی اس نے اپنی تمام تر کوشش ریاض کو خوش رکھنے کے لئے صرف کر ڈالی اپنے کتابیں اور رسالے جلا دیے صرف اس لئے کہ ریاض کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی اپنے مضامین چاک کر ڈالے کیونکہ یہ حسن و عشق سے بھرے پڑے تھے۔ ریاض پر زلیخا کے اس ایثار کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ لاہور کے علم دوست ریاض کو اس لئے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ اسے زلیخا ایسی انیس زندگی ملی لیکن خود ریاض اپنے کو بدقسمت خیال کرتا۔ آخر ایک روز لوگوں نے "تسنیم" کے صفحات پر ایک اعلان پڑھا۔

برادران ادیب کی خدمت میں آخری سلام

میں نے اب فسانہ نگاری قطعی چھوڑ دی ہے براہ کرم کوئی صاحب مجھ سے مضامین کی فرمائش نہ کریں اور اب دنیائے ادب کے لئے اس خاکسار کو مردہ سمجھیں۔

زلیخا فاطمہ

لوگ انگشت بدندان رہ گئے اس تغیر کا یقین بھی نہیں کرتے تھے اور بات بھی ایسی ہی تھی۔ بھلا زلیخا جس کے دم سے "تسنیم" کی انجمن آباد تھی آخر کیوں گوشہ گمنامی میں روپوش ہو رہی ہے کوئی اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا تھا۔ خوشدل جوانوں نے زلیخا کو خط لکھ کر اس کا سبب دریافت کیا مگر وہ بالکل خموش رہی "اڈیٹر تسنیم" کو خط لکھکر لوگوں نے پریشان کر دیا کہ وہ تفتیش کر کے کہ واقعی یہ اعلان زلیخا ہی کا تھا یا کسی کی شرارت تھی۔ خود اڈیٹر تسنیم" سخت متفکر تھا۔ زلیخا کی تحریروں کا "تسنیم" کی اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ اس نے حد درجہ اصرار کے ساتھ وجہ دریافت کی تو مجبوراً زلیخا نے اتنا جواب دیا۔

میں نے مضمون نگاری کیوں چھوڑ دی اسے سن کر آپ کیا کریں گے۔ انسان کی طبیعت ہی ہے میرے خیالات مثل سیماب ہیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ اس میں استقلال کہاں سے آئے۔ آپ کا شکریہ اگر آپ لوگ میرے جذبات کی قدر کرتے ہیں لیکن شاید اسے نہیں سمجھے ہیں کہ انسان جو مضمون میں نظر آتا ہے دراصل ویسا نہیں ہوتا ہے آپ کے خیالات کے مطابق میں انشا پرداز ہوں۔ سحر طراز ہوں حسن و عشق کی زندہ تصویر ہوں لیکن حقیقت کیا ہے اسے آپ سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ لاہور میں کتنی ہی خواتین موجود ہیں خدا کرے "تسنیم" کے صفحہ قرطاس پر گوہر خیالات کی بارش کریں۔ البتہ زلیخا فاطمہ کو بھول جائیے!"

اس خط نے اڈیٹر تسنیم" کو بالکل مایوس کر دیا اور اس نے آخری صورت یہی سمجھی کہ زلیخا کا خط تحفہ نادر کی طرح شائع کر دیا۔

زلیخا کی خموشی نے لوگوں کو بالکل مایوس کر دیا زلیخا کی دنیائے شعریت اجڑ گئی اس نے اپنا سب کچھ ریاض پر نثار کر دیا لیکن ریاض اسے وحشی جاہل کہا کرتا۔ ریاض اب بھی خوش نہ تھا۔ بیچاری زلیخا اکثر یہ شعر حسرت بھرے لہجہ سے گایا کرتی تھی۔

وہ بھی ہوگا کوئی امید بر آئی جس کی　　اپنا مطلب تو نہ اس چرخ کہن سے نکلے

ریاض چاہتا تھا کہ زلیخا خوش رہے لیکن زلیخا کو تفکرات نے ایسا گھیرا کہ اس کی صحت پر اس کا بہت برا اثر پڑا وہ بیمار رہنے لگی لیکن ریاض کو اس کی علالت کی خبر بھی نہ تھی وہ ضرورت کے علاوہ زلیخا سے بولنا بھی پسند نہ کرتا۔ اور ادھر زلیخا کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنی حالت سے ریاض کو آگاہ کرنا وہ نسوانیت کی توہین خیال کرتی تھی۔ ممکن ہے ریاض اگر توجہ کرتا تو وہ بھی سنتی لیکن دونوں ایک دوسرے سے نالاں نظر آتے تھے۔ آخر ایک دن زلیخا نے پھر ایک افسانہ لکھا۔ یہ افسانہ افسانہ نہیں بلکہ آپ بیتی تھی۔ زلیخا نے اپنی پوری کیفیت تحریر کر دی جس میں اس نے اپنی اک سہیلی کو لکھا کہ "میرے بعد میرا افسانہ شائع کر دینا" افسانہ کے اختتام کے ساتھ زلیخا کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ آخر موسم گرما کی ایک شب زلیخا مسہری پر پڑی دم توڑ رہی تھی چہرہ نزع کی تکلیف سے زرد تھا۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔ پانی کو ترس رہی تھی اور مسٹر ریاض سینما ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بیوی مر رہی تھی۔ لاہور کی مایۂ ناز ادیبہ کے حلق میں پانی ٹپکانے والا بھی کوئی نہ تھا اور شوہر ہیمو ینڈ کے گلاس پر گلاس اڑا رہا تھا۔

پڑھنے والے اس افسانہ کو صرف افسانہ خیال نہ کریں بلکہ یہ واقعی اک ادیبہ کی سرگزشت ہے۔ بہار کی نوخیز کلی کھلنے سے پیشتر اپنے شوہر کی لاپرواہی سے کملا گئی۔ ہائے زلیخا! میری پیاری سہیلی زلیخا! دیکھ میں صرف نام بدل کر تیری داستان غم شائع کر رہی ہوں۔ خدا کرے یہ ریاض کی نظر سے بھی گذر جائے!!

پریم

جناب خواجہ معین الدین صاحب انصاری ناتواں

مجاز :-

ظالم . . . بے رحم موت تونے اس کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ جہاں آج وہ ہزاروں من مٹی کے ڈھیر میں دبا ہوا ہے . . . . لیکن میرے تصور کی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے . . . . . . اور برابر دیکھتی رہیگی -

اے میری تاریک زندگی کی روشنی تیری ایک معصوم اور بیگناہ ہستی . . . چمن نو بہار کی ایک تازہ کونپل تھی . . . . . لیکن . . . . . بادِ سموم کے بے پناہ تھپیڑوں نے تیری سبزی کو چوس کر زرد کر دیا . . . . . وہ میرے لئے خزاں . . . . . اور تیرے لئے پُر سکون ابدی نیند تھی . . . . . میری شمع زندگی خاموش ہو چکی . . . . . .

میں اس تاریک فضا میں بھاگی جا رہی ہوں . . . . لیکن کہاں ؟ . . . . یہ خود میں نہیں جانتی . . . . . . سینہ میں غم کا ایک سیلاب اٹھا۔ اور وہیں رہ گیا . . . . . . انتظار . . . . . عالم انتظار . . . . محض بے سود . . . . آنسو خشک ہو چکے . . . . . . بیچینی . . . . . . کرب . . . .

نہیں . . . . . ہرگز نہیں - تم بیگناہ ہو . . . . . . اور میں گنہگار . . . . تم میرے دیوتا تھے . . . . . اور میں تمہاری پجارن . . . . . . تم سے عفو چاہتی ہوں . . . . . تمہارے چرنوں پر . . . ایک مرتبہ . . . صرف . . . . ایک مرتبہ . . . . . . میں اپنی پُرنم آنکھیں ملنا چاہتی ہوں . . . . مجھے معاف کر دو .

کس سے کہوں ؟ میرا کوئی پیامبر نہیں جو میری آہوں کو تم تک پہنچا سکے . . . .

. . . . میری مجلس۔ سوائے تنہائی۔ یاس۔ مجبوری کے اور کوئی نہیں . . . . اور یہی میرے ہمراز ہیں . . . سنتے سب کچھ ہیں لیکن قوت گویائی سے محروم . . . .

موسم بہار کی مدہوشی . . . . اور مہتاب کی ضو فشانی . . . . وہ سہرے کا عطر بیز ہوا میں لہریں لینا . . . . . . میرے ہوا سے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو تمہارا بوسہ دینا۔ اس کو اپنی سخت انگلیوں میں مسلنا۔ کبھی محبت سے تمہارا بیتاب ہو کر میرے نرم آغوش میں سر رکھدینا۔

پیارے! وہ کیسے دلفریب لمحات۔ اور خوبصورت راتیں تھیں۔ سو

وہ ہنسی کے دن وہ خوشی کے دن گئے حسرتا دیتی گئی   کبھی جام بادہ ناب تھا اب میں اس کا اتار ہوں

آپ یہ میری منت اور . . . . آخری آرزو یہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ تمہیں اور دیکھ لیتی . . . . . .

اس کے کمزور اور ناتوان جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی اور وہ تڑپ کر رہی۔

تارے ڈھل چکے اور اپنی پھیکی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ چاند کی مدھم روشنی میں مرغزاروں کے شجر حیرت اور تعجب میں ساکن کھڑے تھے . . . . . . رات اپنی آخری سانس لے رہی تھی۔

غم و الم کی ایک تصویر تھی جو صحرا کے خوفناک راستوں پر سے گزر رہی تھی . . . . . . عالم خموشاں۔ جہاں چند ٹوٹی قبریں تھیں . . . . وہاں سکوت . . . . کامل سکوت کے سوا کچھ نہ تھا صرف ایک سایہ موہوم۔

حقیقت :-

وہ آگے بھاگ رہی ہے اور دنیا اس کے پیچھے . . . . . وہ کہتی ہے حقیقی محبت صرف یہی ہے . . . وہ خواب تھا اور یہ عالم بیداری . . . . ابدی مسرت

وسکون صرف یہی ہے - دل کی چاہت اور آنکھوں کی تلاش - وہ یہی ہے . . . . اس کا آغاز زہر ہلاہل سے زیادہ کڑوا اور انجام شہد سے زیادہ شیریں . . . . کسی نے نہ سمجھا . . . دنیا نے ایک بے معنی قہقہہ لگایا اور اس کو ذلیل سمجھا . . . . . اور وہ اس کو اپنی عزت . . . . زمانہ اس کا قدمبوس ہوتا . . . . اور وہ ہنسکر کنارہ کش ہو جاتی ہے . . . . کیونکہ وہ بادہ محبت سے بیخود و سرشار ہو چکی تھی -

اس کا ضمیر محبت کے چراغ سے روشن ہو چکا تھا . . . . اس کا دل نور سے معمور ہو کر ضیا پاشی کر رہا تھا . . . . وہ نیکی تھی . . . . وہ اپنی خودی کو آپ دیکھ رہی تھی . . . . . وہ قدرت کا ایک راز تھا . . . . جسے دنیا دیکھ سکتی اور نہ سمجھ سکتی ہے . . . . شہر و آبادی سے متنفر . . . . . . وہ تھی اور لق و دق صحرا . . . . . . جنگلی و وحشی جانور اس کے دوست اور ہمجنس تھے . . . . انسان کی بے بصر آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی . . . . . وہ نور میں ضم ہو چکی تھی - یہ اس کے جذبہ محبت کی غایت - اور یہی اس کا روشن اور ابدی پریم تھا -

غزل

جناب خداداد خاں صاحب برقؔ

پس فنا آرزو ہے میری ادھر گذر ہو جو اس حسین کا
لپٹ کے کہہ اے غبار مدفن مزار ہے یہ دل حزین کا

دکھائی اس نے جو سرد مہری تو ہو گئے سبز داغ دل کے
برس پڑا بن کے ابر سارا دھواں جو تھا آہ آتشین کا

یہ میری ہستی ماسوا کو جلا دے بڑھ بڑھ کے دل کی سوزش
دراز ہو تیری عمر ساقی دو جام دے آب آتشین کا

اٹھایا جاؤں جو روز محشر گو لاکھ اکسائے قلب مضطر
زباں بھی کھلیگا نہ پیش داور نہ شکوہ ہوگا کسی حسین کا

اگرچہ اک مشت خاک ہوں میں تری محبت میں پاک ہوں میں
فلک سے رکھتا ہے بڑھ کے وسعت یہ ذرہ ذرہ میری زمین کا

کسی کی نیچی نگہ کہتی ہے وصل کی شب یہ برقؔ مجھ سے
کمال شوخی سے ہر گھڑی ہے لبوں پہ نغمہ نہیں نہیں کا

یادِ رفتگان

حضرت زکا نے شعر و شاعری کے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور آپ کو بہ حیثیت ہجو گوئی کے کافی شہرت حاصل تھی اور حیدرآباد میں اب بھی بیسیوں ایسے ہوں گے جنھیں زکا کا کچھ نہ کچھ کلام یاد ہوگا۔ سنجیدہ طبیعتوں نے ہجو گوئی کو مذموم قرار دیا ہے لیکن اسی ہجو میں جب انتہائی مبالغہ پیدا ہو جاتا ہے تو شاعر کے فکر رسا و زور طبیعت کا پتہ چلتا ہے اور پڑھنے والا چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ کاش اور طویل ہوتا اگرچہ مبالغہ نگاری عہد جدید میں قابل ستائش نہیں سمجھی جاتی اور یہ ایک حد تک درست ہے لیکن اس میں بعض پہلو ایسے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ وہ حسن بن جاتے ہیں۔

پھینکے کنوئیں میں بھاڑ میں جھونکیں ہزار بار
بھولا نہیں وہ قصہ کہ ایک دوست ہیں میرے
اوچھے کچھ اس قدر ہیں کہ دینے کے نام پر
کڑوے کچھ اس قدر ہیں کہ لگتی ہے جس کے منھ
ہلکے یہ پیٹ کے ہیں کہ ان کو سنا کہیں
پیشاب طرح سلسلۃ البول والے کے
ان زور ل دستگاہ اونہیں بڑھ گئی جو کچھ
پایہ نہیں گدھا اوسے گھوڑا اگر کہیں
کھونٹا اکھاڑ ڈنک اجاڑا رجل آنسو ڈھال
خوگیر میں نکلے ہوئے سب اوس کے ایک جا
اور اوس کے زیر بند کے بدلے بندھی ہوئی
تسمے لگام کے وہ گرہ دار جا بجا
وہ بھی پرانے ایسے کہ راکب سے کہہ رکھیں
در ونیش پاشے لنگ بھی نیوے نہ اس کو مفت
راتب نہیں اس کو کہاں خواب میں نصیب
جاشے نہ جو گھاس ہے خوگیر میں بھری
کسب سوال کیلئے گرفی المثل کوئی
اور یہ عراقی اس کے سواشے میں ہو تو پھر
اس پہ خلق کو کرہ خاک کا گماں

پر سفلوں سے نہ ڈالے خدا کام زینہار
ایسے کہ جن کا نام نہ لے شوم بھی نہار
گر... دیں تو لوگوں سے کہتے پھریں پکار
اوس نے شکر بھی پھانکی ہے تو تھوکدے کہنکار
منظور اپنے بھید کا ہو جس کو اشتہار
ہر بات میں سنک پڑیں بے قصد و اختیار
پایا ہو رکھا ہے ایک سو ایسا خراب و خوار
گھوڑا کہاں کہ شکل میں ہو الحمار
یہ جتنے عیب سنتے ہیں سب اس میں آشکار
چمڑے سڑے گلی میں جنھیں پھینکدے چمار
میلی کچیلی ہو جو پرانی کوئی ازار
ہوں رشتہ ہائے سالگرہ جس سے شرمسار
کھینچو تو ٹوٹ جائیں گے پھر آگے اختیار
قزاق راہ رو بھی نہ مانگے اسے ادھار
ان دونوں کے تو ذکر کو رہنے دو درکنار
خوگیر سونگھ کے ہو جائے بے قرار
میت کے ساتھ ہوئے کبھی باضطرار
پہنچے وہم کو مردہ کے وہ تالب مزار
از بسکہ جلد پہ ہے جا تو بتو غبار

اوس کے تو دانے چارے کی رکہیں کبھی نہ فکر
مرکب کا... صاف ملالیں وہ ہاں میں ہاں
ایک روز مجہ سے کوئی سواری نہ بن پڑی
اوس دوست سے کہا کہ سنو مہربان من
ہنڈوائی جائیگا ہو بلاے سبہوں کو دہم
کہنے لگے کہ یا بو تو کیا مال ہے اگر
زاں پیشتر کہ مہر کند از افق طلوع
میں نے کہا کہ کرچکے اقرار تو سہی
کہیانے تو ہوئے پہ بناوٹ کی راہ سے
اس کی قسم ہے سورہ والعادیات میں
اوس کی قسم ہے جس کی براق سبک خرام
اوس کی قسم ہے صاحب دلدا جسے کہیں!
اوس کی قسم ہے جس کی خرابی کے قصد سے
اوس کی قسم ہے جس کی نہوت کے زور سے
جب آئے ہم آگئے قسم اقتام درمیان
گھڑیوں کا کیا حساب کہے صاف دو پہر
یا تو کیا نہ آیا ادہر سے پیام تک
دل بول اٹھا کہ واہ تعجب ہے اے عزیز
سفلوں کا قاعدہ گوز شتر ہے بعینہ
گھوڑے کا یہ مقام نہیں جائے شکر ہے
بچ جاتے گوڑے کٹنے سے یہ دونوں ہاتھ شل
اس پہ علاوہ یہ کہ جو وہ گھوڑے والے ہیں
ان کی تو ہو ہے مونچھیں پڑھا کر بیان کریں
منت اٹھا چکے ہی تو اوس کی اوٹھائیے
سعدی کا حکم ہے کہ نہ کر اوس سے کچھ سوال
الحق مرکے معنی سے ہے کچھ خیر تو ہے

اور آپ زہر مار کیا کرکے ہوں سوار
راکب جو اپنے معدہ سے دیوے اگر ڈکار
جانا ضرور تہا مجھے تڑکے ہی ندی پار
ہوں ناتوان قدم کا اٹھانا ہی مجہ کو بار
یابو جو دو تو جاؤں وہاں ہوکے میں سوار
تو مجہ پہ بھی چڑھا تو نہیں مجہ کو ننگ و عار
میں پاپیں تیرے بیحد ہیں وہ اسپ راہوار
جھوٹے ہیں آپ آئے مجھے کیوں کر اعتبار
کہا کہا کے قسمیں کرنے لگے عہد استوار
گھوڑے کے وصف ذکر کئے جس نے تین چار
کر آئے دم میں فرش سے لے عرش تک گذار
چلتی ادہی کے ہاتھ تھے میدان میں ذوالفقار
اصحاب فیل آئیں تو ہو جائیں سنگسار
پتھر کو چیر ناقہ نکل آئے بے مہار
باور ہوا مجھے بھی کیا سچ انتظار
موقوف رکہہ کے بیٹھ رہا اپنے کاروبار
یعنی تعذر بیت در بیتم معاف دار
کہنے پہ جائے ایسوں کے اور تجہ سا ہوشیار
نہ آسمان کا نہ زمین کا ہو دہ بخار
یابو نہ آیا خیر ہوئی ورنہ سنبلے پار
ہو جاتے اپڑ کرنے سے یہ پاشنے فگار
منت رگہیں گے ایسی کہ ہو دل کو ناگوار
اتنا بھی لیویں سر سے کہیں گے اگر اتار
منت سے ہو نہ جس کو غرض غرض اقتدار
گرفی المثل ہے سفلہ فسر ... ...
تاریخ اس قصیدے کی ہے ... ...
۱۲۸۰ھ

ملا - غالباً یہ مقام کا نام ہے مصرعہ صاف پڑھا نہیں جاتا۔





شاہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر مرحوم شہید

شہابؔ

جلد (۴) مہر ۱۳۴۵ف م اگست ۱۹۳۶ء نمبر (۱۱)

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسملؔ
(دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد دکن)

عوام سے (للعہ) — گورنمنٹ سے (عہ)

مطبوعہ [illegible] پریس میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون دبیرپورہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ذرّات

ادام اللہ اقبالہٗ

شہاب کیلئے یہ باعث تفاخر موجب امتیاز ہے کہ وہ عالیجناب حضرت شاہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر کے "تخیلات عالیہ" کو شائع کرنیکا شرف حاصل کر رہا ہے اگر نظر کیمیا اثر کی ادنیٰ توجہ شہاب کی جانب مبذول ہو جائے تو اس کا مستقبل "خذف سے الماس" خاک سے اکسیر بن جائے ۔

گذشتہ پرچہ میں کنٹراکٹ برج کے حالات معہ تصویر کے شائع کئے گئے ہیں جو کلکتہ میں حیدرآبادی ٹیم کو پیش آئے تھے۔ موجودہ نمبر میں کنٹراکٹ برج سے متعلق کچھ مباد یات ہیں چونکہ آجکل یورپ بھر میں اس کی مقبولیت ہے اس لئے کوئی عجب نہیں کہ یہ سلسلہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا مسٹر عبد القوی وکیل نے جو اس کے ایک کامیاب کھلاڑی ہیں وعدہ کیا ہے کہ بشرط فرصت ادھر) مضامین لکھیں گے کہ ایک کامیاب کھلاڑی کو کن کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئیے ظن غالب ہے کہ وہ اسی ... "شطرنج" کے منصوبوں کیطرح کنٹراکٹ برج کے منصوبوں پر بھی روشنی ڈالیں گے تاکہ اس کے حل سے کھلاڑیوں کا معیار اور بلند ہو سکے

سررشتہ ٹپہ ہماری حکمنہ امداد کر رہا ہے کہ پرچہ خریداروں تک بلاشکایت پہنچ جائے تاہم جن خریداران کرام کا پرچہ ہر مہینہ کے ۱۵ تک نہ پہنچے وہ براہ کرم دفتر کو مطلع فرمائیں تاکہ ہم جناب ناظم صاحب ٹپہ کو توجہ دلا سکیں۔

نیز آپ اپنے ملازمین کو بھی تاکید فرما دیں کہ آپ کی عدم موجودگی میں جب کبھی پرچہ وصول ہو تو نہایت احتیاط سے اس کو پیش کر دیا جائے۔ اکثر ملازمین کی غفلت اور لاپروائی سے پرچہ تلف ہو جاتا ہے اور ہم اوس کے ذمہ دار ٹھیرتے ہیں کہ پرچہ پہنچا ہی نہیں گیا حالانکہ پرچہ نہایت احتیاط سے پوسٹ کیا جاتا ہے ۔

تخیلاتِ عالیہ

عالیجناب شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر شجیع

اک تماشا تھا وہ جلوا کیا پوچھتا یہ ہوں کہ دیکھا کیا تھا

اس کو وعدہ شکنی کون کہے مجھ سے کہتے ہیں کہ وعدا کیا تھا

جان دینی تھی مجھے ایک ہی دن پھر یہ رہ رہ کے تقاضا کیا تھا

زندگی میری نہ دیکھی تم نے میرے مرنے کا تماشا کیا تھا

ناگہاں جیسے اجل آجائے یوں ترا سامنے آنا کیا تھا

دل بتاتا تھا کوئی درد کوئی یہ محبت میں معمّا کیا تھا

پوچھتے کب ہیں کہ جب یاد نہیں کیا کہیں حرف تمنا کیا تھا

تھا فقط آنکھ کا پردا ورنہ میرا اور آپ کا پردا کیا تھا

وہ تو انجام سمجھتے تھے شجیع
تو مگر عشق میں سمجھا کیا تھا

(شجیع)

یا معین

غزل

عالیجناب امیر اکبر نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ

مدّت ہوئی تصورِ جاناں کیے ہوئے
گذری ہے عمر نذرِ دل وجاں کیے ہوئے

ابرو پہ بل جبیں پہ شکن تیغ ہاتھ میں
آتے ہیں میرے قتل کا ساماں کیے ہوئے

کس دھوم سے اٹھا ہے جنازہ رقیب کا
ہمراہ ہیں وہ بال پریشاں کیے ہوئے

کہیے نہ قتل گاہ کا افسانہ بار بار
لاتے نہیں زبان پہ احساں کیے ہوئے

کہتا ہے رنگِ رُخ کہ ابھی آرہے ہیں آپ
دشواریاں رقیب کی آساں کیے ہوئے

پھر خارزارِ عشق میں لے چل ہمیں جنوں
عرصہ ہوا ہے دشت کو ویراں کیے ہوئے

پھر لے اُڑی اُدھر کو درِ یار کی ہوا
برسوں ہوئے خوشامدِ درباں کیے ہوئے

چھوڑا نہ ساتھ وحشتِ دل نے پسِ فنا
پہنچے لحد میں چاک گریباں کیے ہوئے

چھائی ہے بیخودی دمِ زینت کچھ اس طرح
بیٹھے ہیں آئینے کو وہ حیراں کیے ہوئے

اُٹھ اُٹھ کے کہہ رہی ہے قیامت یہ ہر قدم
وہ آرہے ہیں خونِ شہیداں کیے ہوئے

مدت سے کس کی یاد میں بیٹھے ہو اے معینؔ
مجموعہ خیال پریشاں کیے ہوئے

کنٹراکٹ برج

جناب میر عبدالقوی صاحب وکیل

کنٹراکٹ برج کی دنیا میں ایسا کون شخص ہے جو "کلبرٹ سن" کے نام سے واقف نہیں۔ ہر وہ شخص جس کو برج سے کچھ بھی دلچسپی ہے اس نام سے ضرور گوش آشنا ہوگا البتہ اس امر سے واقفیت لازمی نہیں ہے کہ کنٹراکٹ برج کا وجود کس طرح اور کس حالت میں ہوا اور موجد کون ہے اور وہ کیا اسباب تھے جس نے موجد کو اس کی ایجاد پر آمادہ کیا یہ چند امور ایسے ہیں جو کنٹراکٹ برج کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اس لئے اوس کا جاننا اور معلوم کرنا ہر برج کے کھلاڑی کے لئے ضروری ہے۔

فیشن ایبل دنیا میں مثل دوسرے اشتغال کے ڈانسس کی کثرت ہونے لگی تو ڈانسرز اپنی مصروفیات میں اس قدر منہمک رہنے لگے کہ تمباکو نوشی کو بھول جاتے تھے اور یوں بھی اثنائے ڈانس میں تمباکو کا استعمال جائز نہیں سمجھا جا سکتا تھا اس طرح امریکہ جیسے مقام میں ہر ڈانسنگ ہال میں کئی کئی سو اشخاص کے مجمع کا گھنٹوں بلا تمباکو نوشی کئے گزارنا ایک امریکن تمباکو کمپنی کے ناگوار خاطر ہوا۔ کمپنی مذکور نے اس کو اپنا کثیر نقصان تصور کر کے بدل ماتحلل یا تلافی مافات کی غرض سے اعلان کیا کہ جو شخص ایسا کھیل ایجاد کرے جس کے کھیلتے وقت تمباکو نوشی میں کثرت ہو جائے تو اس کے موجد کو کئی ہزار پونڈ انعام میں دئے جائینگے اس شہرہ کنٹراکٹ کی بنا پر جو شخص میدان مسابقت میں بازی لیگیا اور کنٹراکٹ برج ایجاد کیا وہ ایک امریکن تھا جس کا نام "کلبرٹ سن" ہے اس ایجاد سے ایک طرف کلبرٹ سن نے موعودہ انعام حاصل کر کے دنیائے برج پر ناقابل فراموش احسان کیا تو دوسری طرف تمباکو کی آمدنی میں کئی گناہ اضافہ ہوا یہ واقعہ اور آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ تقریباً سو فیصدی یاران تاش جب تک برج کھیلتے وقت کمرہ برج کو دھواں دھار بنانے میں فیاضی نہ دکھائیں اوس وقت تک جرات آزمائی ہی کر سکتے ہیں اور نہ حوصلہ افزا کھیل ہی کھیل سکتے ہیں اس دماغ پاشی وجگر سوزی کی وجہ یہ نہیں ہو کہ یاران

طریقت اوس قدر فیاض ہوتے ہیں بلکہ کنٹراکٹ برج کی خصوصیت میں غور وخوض داخل ہے اور اصول یہ ہے کہ ہر مشاغل سوچ بچار کی نوبت پر اگر مشغول [illegible] نہ رہے تو اچھا نتیجہ برآمد نہیں کر سکتا۔

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ کنٹراکٹ برج کوئی مشکل کھیل نہیں ہے اس خیال کی تائید کرنا بہت دشوار ہے اس کے متعلق آئندہ کبھی اظہار خیال کیا جائیگا۔ فی الوقت تو یہ بتلانا مقصود ہے کہ کلبرٹ سن اس کھیل کا موجد ہی نہیں بلکہ ایک زبردست لٹریچر کا حامل اور مؤید ہے اس وقت تک کلبرٹ سن نے متعدد کتب بھی اس کھیل سے متعلق لکھ ڈالے ہیں جن کے منجملہ ایک کتاب بلو بک کے نام سے موسوم ہے اور جس کا تعلق زیادہ تر کال سے ہے اور نہایت ضخیم ہے اس کا پڑھنا ہر ایک کھلاڑی کے لئے لازمی ہے۔ بغیر اس کے کوئی کھلاڑی ترقی کرنا تو درکنار مبادیات برج سے تک واقف نہیں ہو سکتا۔ دوسری کتاب رڈ بک سے موسوم ہے یہ بھی نہایت ضخیم اور کھیل کے نزاکتوں کی حامل ہے۔ اس کے پڑھنے سے کھلاڑی صحیح کھیل کھیل سکتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ بلو بک کو اچھی طرح پڑھنے اور سمجھنے کے بعد رڈ بک کو پڑھا جائے اگرچہ کنٹراکٹ برج کی ایجاد کے بعد مختلف اشخاص نے [illegible] اسی کھیل پر لکھی ہیں اور اشارات مشتہرہ میں تبدیلیاں پیدا کیں لیکن جو مقبولیت کلبرٹ سن [illegible] وہ کسی اور [illegible] نصیب نہیں ہوئی اس کی وجہ بھی کہ اس سسٹم میں نہایت آسان طریقے [illegible] کئے گئے ہیں جس کو اختیار کر کے کھلاڑی باسانی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے مثل مشہور ہے [illegible] نیکو کند بیان" اس سسٹم کی کامیابی کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بین الاقوامی مقابلہ میں جو انگلستان میں منعقد ہوا تھا امریکن ٹیم (جس میں کلبرٹ سن شریک تھا) کو ہزارہا نمبر سے کامیابی ہوئی کلبرٹ سن نے اس مقابلہ میں ہزاروں پونڈ کی منفعت بنائی۔ یہ برج میں یکہ و تنہا نہیں ہے بلکہ اس نے اپنی رفیقۂ حیات کو اپنا شریک کار بنایا ہے اور وہ شریک زندگی کے ساتھ مل کر خوب اتحاد عمل کرتی ہے اس وقت کلبرٹ سن اور مسز کلبرٹ سن کی آمدنی شعبہ برج میں کم و بیش پچاس ہزار پونڈ سالانہ ہے کنٹراکٹ برج میں چونکہ کامیابی کا مدار زیادہ تر خوبی کال پر منحصر ہے اور کال میں خوبی اوس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ بلیٹن برج یعنی (اشارات مشتہرہ) سلیس نہ ہوں اور بہ سلاست زبان بھی کلبرٹ سن کے کسی

اور کو نصیب نہیں ہوتی۔ واقعہ ذیل سے آپ کو کلبرٹ سن سسٹم اور دوسری سسٹم کا بیّن فرق معلوم ہوگا۔
حیدرآبادی ٹیم جب گذشتہ ڈسمبر میں آل انڈیا ٹورنمنٹ کھیلنے کی غرض سے کلکتہ گئی تھی سب سے پہلا مقابلہ یوروپین ٹیم سے ہوا تھا (جیسا کہ ماہ شہریور کے پرچہ شہاب میں اظہار کیا گیا ہے) حیدرآبادی ٹیم نے کھیل کے آغاز سے قبل یوروپین ٹیم سے استفسار کیا کہ آپ کی ٹیم کا کھیل کس سسٹم پر ہوگا تو جواباً کرین سسٹم کا اظہار کیا گیا یہ معلوم ہونے کے بعد کھیل شروع ہوا پہلے میز پر حیدرآبادی ٹیم نے کلبرٹسن سسٹم سے کھیل کر سولہ ڈیل میں ۲۵۰۰ نمبر بنائے اور جب یہی تاش جس سے حیدرآبادی [illegible] راس کو رکھا دوسری میز پر فریق مخالف کو دیگئے تو اصولاً یوروپین ٹیم کو بھی کم و بیش اسی قدر بنانا چاہئے تھا اور یہی توقع پہلے میز کے اراکین ٹیم کو بھی تھی لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ دوسری میز پر بجائے یوروپین ٹیم کسی اسکور کرنے کے الٹے حیدرآبادی ٹیم نے (۵۰۰) نمبر بنائے اس طرح حیدرآبادی ٹیم کا اسکور چار ہزار ہوگیا یہ کیا تھا صرف خرابی سسٹم کے اور کوئی وجہ نہیں تھی حیدرآبادی ٹیم نے خود محسوس کیا کہ فریق مخالف کی ناکامی سسٹم کی خرابی کا باعث تھی۔ چنانچہ یوروپین ٹیم نے بھی اعتراف کیا اور آئندہ کرین سسٹم کو چھوڑ کر کلبرٹ سن سسٹم اختیار کرنیکا وعدہ کیا۔ غرض کلبرٹ سن سسٹم کی مقبولیت کا پتہ اس سے بھی چل سکتا ہے کہ بمبئی کلکتہ وغیرہ میں اب عام طور پر کلبرٹ سن سسٹم اختیار کر لیا گیا ہے اور دوسرے سسٹمس سے حتی الامکان احتراز کیا جاتا ہے۔ لہذا ہم بھی کنٹراکٹ برج کے فدائیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بجائے کسی اور سسٹم کے روزآنہ کے کھیل میں کلبرٹ سن سسٹم ہی کو اختیار کریں۔
ہاں عام طور پر دوسری سسٹم سے واقفیت رکھنا ایک برج کے کھلاڑی کیلئے کبھی کبھی کارآمد ضرور ثابت ہوگا۔

بارہا عرض کیا گیا ہے کہ ہمارا ملازم خود چندہ کے وصول کرنیکو آپ کے وعدہ پر حاضر ہوا کرتا ہے اور جب حسب وعدہ حاضر ہوتا ہے تو آپ یہ فرما کر واپس کر دیتے ہیں کہ "اپنے ملازم سے بھیج دیا جائیگا" براہ کرم اتنی زحمت گوارا نہ کیجئے ہمارے ملازم ہی کو دیدیجئے کہ وہ آتا بھی ہے تو اسی غرض کیلئے۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا ملازم زحمت برداشت کرے۔

مکتوبات جمیل

تم دل اسے سمجھ لو یا جان آرزو کی — سینہ میں اب سے پہلے اک بوند تھی لہو کی

سلمیٰ ——— !

آج میں اپنی قدیم سلمیٰ سے پھر مخاطب ہوں ہاں وہی بھولی ہوئی۔ روٹھی ہوئی۔ جھٹ خفا، زود رنج بے مروت!

احسان تو میں نے کیا نہیں جو "محسن کش" بھی کہوں۔ ہاں محبت کرتی تھی جو سب سے زبردست احسان ہے۔ مگر انہوں نے چھوٹی چھوٹی باتیں کب یاد رکھیں جو یہ انمول و اچھوتے انداز کے تحفہ کو یاد رکھیں گی ——— ؟

اس وقت ساری کائنات مجھے درہم و برہم کرنے، میرے خیالات میں ہلچل ڈالنے ادھار کھائے بیٹھی ہے، ہو کا عالم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا سنسار محو خواب ہے، در و دیوار، زمین آسمان، باغ درخت، باہر کی سڑک، غرض سب چیزوں پر ایک خاموشی اور اداسی برس رہی ہے ——— بجز ہوا کے خوفناک خراٹوں کے اور کوئی آواز نہیں آتی ——— اور مجھے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ ہوا نہیں بلکہ ایک خوفناک درندہ ہے جو پھنکاریں مار رہا ہے۔ اس وقت ہاں عین اس عالم سکوت میں میری تخیلی دنیا میں ایک حشر برپا ہے سمند تخیل مجھے میری زندگی کے پچھلے واقعات کی دنیا میں رواں دواں لئے جا رہا ہے۔ اور معاً مجھے اپنا وہ فقرہ یاد آتا ہے جو میں نے تمہیں لکھا تھا:۔

"سلمیٰ ——— میں تو اس ایک ہی انداز کی صبح و شام، یہ روزآنہ پابندی کے ساتھ نکلنے والے سورج، ان تاروں بھرے آسمان سے اکتا سی گئی ہوں۔ میں اس یکسانیت کو ایک بلائے آسمانی سے کیوں نہ تشبیہ دوں؟ زندگی میں ہلچل ہو۔ انقلاب ہوں۔ طمانیت و یکسوئی نہ ہو تو زندگی کا لطف ہے یہ کہاں کا سلسلہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہو چکتا"

اس پر تمہارے ہیجان الفاظ سے بھری ہوئی خامہ فرسائی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ہاں وہی ہنسی جو کبھی حال دل پر آتی تھی اور اب کبھی پاس بھی نہیں پھٹکتی۔ تمہاری مضحکہ خیز دوستی کے موہوم تصور سے چلی آتی ہے تم نے کیوں لکھ مارے تھے وہ الفاظ جن میں جان ہی نہ تھی؟

"ارے تم تو محبت اور دوستی کے بالکل قابل نہیں ہو۔ جب قدرت کی یہ منظر کیا نیت تمہیں ناپسند ہے تو کل کے دن تم ان دونوں سے بھی اکتا جاؤگی جواب تم سے محبت کرتے ہیں؟ کہیں تم مجھ سے بھی تو اکتا گئیں؟ یا کبھی کسی زمانہ میں اکتا جاؤگی؟ ارے تو پھر میں کہاں کی نہ رہوں گی۔ تم کو میں نے بڑی دقتوں سے پایا ہے" وغیرہ وغیرہ ————

اور "آج" وہی تم ہو کہ تمہاری محبت طوطے کی آنکھوں میں تحلیل ہوگئی ہے محبت تو رہی ایک طرف، کسی کونے میں، کسی سمندر کے کنارے، مگر ——— اف بلند معبود! یہ کیسی کایا پلٹ ہوگئی ہے تیری دنیا میں؟

آج ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی نکل جاتی ہے اور فضائے بسیط کے اس محیط سکوت میں ایک طیارہ دیکھکر میرا پرواز تخیل کہیں دور وادیوں میں بھٹک جاتا ہے۔ اور معاً خیال آتا ہے کہ جس کو اپنے دل پر بھروسہ نہیں۔ اپنا دماغ جس کے قابو سے باہر ہو طیارہ کیوں کر چلائیگی؟ آخر اس کے لئے بھی تو دل و دماغ کی ضرورت ہے؟ اور مجھے تو وحشت سی طاری ہے کہ کہیں "طیارہ" میرے آہوں سے نہ ٹکرائے جو بہت بلندی کی خبر لاتی ہیں۔ اب سے دور ——— مجھے یہ خیال کیوں آگیا؟ نہ معلوم بیٹھے بیٹھے پرانے دوست اور پرانی گئی گذری صحبتیں کیوں یاد آتی ہیں۔ "قلمی دوستی" تھی اور اس میں وہ پینگ بڑھے تھے کہ دنیا محو حیرت تھی کہ دیکھنا یہ دوستی کسی دن

"دیکھئے کیا ہو جائے گی" ——— تعجب ہے کہ موجودہ "مصروفیتوں" میں گذری ہوئی دلچسپیاں تمہیں یاد کیسے آئیں، زمین ہی پر "خرام ناز" کے نقش کیا کم تھے کہ اب فضائی پرواز سے خلا کو بھی پامال کرنے کی ٹھان لی ہے حالانکہ "زمین سخت اور آسمان دور ہے" کہاں تو وہ تمہارا، نرم و نازک دل جو ایک پتی کی حرکت سے پہروں لرزاں رہتا تھا اور ایک چھینک سے دو دنوں بیہوشی کا دورہ پڑتا تھا۔ اب

پرواز پر کیوں آمادہ ہوا؟ تمہاری وہ مہین صندلی کلائیاں جس میں دو دو کانچ کی چوڑیاں، بھی بار تھیں اب ایروپلین کی کیسے متحمل ہوئیں۔ کہیں یہ بھی تمہاری 'محبت' کی طرح کاغذی جمع وخرچ تو نہیں؟ اللہ بلند پروازی اور نصیب کرے اور تمہارے ارادوں میں برکت دے اگر وہ حقیقت کے سرمایہ دار ہیں اور جب تم آنیوالی سردیوں میں ایک طویل ہوائی سیاحت کا قصد کر رہی ہو اور وہ بروئے عمل آئے تو میں ابھی سے یہ دعا کیوں نہ مانگ لوں کہ دوران پرواز میں تمہیں عین میرے مکان کے صحن کے اوپر ہی ایسی ضرورت پیش آئے کہ لامحالہ طیارہ اُتارنا پڑے اور تمہاری بلند پروازیوں کے حوصلہ کی داد کا مجھے موقع ملجائیگا اور میں ایک پیران ہستی کی خدمت میں یہ شعر پیش کردوں گی۔

توکارے زمیں رانکو ساختی ۔۔۔۔ کہ برآسماں نیز پرداختی

سلمٰی! یہ جھوٹی نمائشیں ہیں۔ انہیں چھوڑو جس قدر بلند پروازی کرو اسی قدر نظر نیچی رکھو کہ یہی عین معیار بلند پروازی ہے اور اپنے بھولے ہوؤں کو یاد ہی رکھو تو کہوں گی کہ :-

'کارے کردی' مگر اللہ تم !!

جب یہ حال ہے تو کیسے یقین آئے کہ "گذری ہوئی دلچسپیوں" پر تم نظر باز پسین ڈال سکتی ہو! قسم ہے "ذوناش" کے متحرک سرکی تم اس بلند پروازی سے اوسی عالم ہستی میں پھر اکبھر نہ آجاؤ جہاں، بلند آسمان، دراز سایے، جاپانی دریچہ ہوں۔ یوں "پلینٹ" ہونا کوئی نفع بخش سودا نہیں تاوقتیکہ تم "پلٹ" کر جب تک اپنے 'ماضی' پر نہ آجاؤ۔ تم بوکھلا جاؤگی کہ یہ کہاں کہاں میری گرفت کے لئے تاک میں بیٹھی رہتی ہے۔ مگر تمہاری بوکھلاوٹ بے معنی ثابت ہوگی اگر تم اس کے نتیجہ پر غور کروگی۔

آج میں دنیا کو یہ یقین دلانے کے لئے آگے بڑھ رہی ہوں کہ دنیا میں دوستی اور محبت بے معنی سی باتیں ہیں اور محض تضیع اوقات۔ وقت گزارنے 'دل بہلانے کے کھیل' اور بس ——— توقعات کا پیدا ہونا بجائے خود ایک مایوسی ہے اور "متوقع" رہنے والے سے بڑھکر بیوقوف دنیا میں شاید ہی کوئی ہو اور جس پر کسی کا یہ شعر ہر آن چسپاں ہوسکتا ہے ؎

باندھی ہی کیوں تھیں اتنی امیدیں ۔۔۔۔ ناکامیوں کا رونا عبث ہے

تم بہت اترا جاؤ گی کہ میں نے اپنا موضوع بحث ہی تمہیں بنالیا ہے اور تمہاری بے رخی کا مجھے انتہا درجہ ملال ہے اور یہ کہ بس دنیا میری تم ہی پر ختم ہو گئی۔ تمہاری بیوفائی نے ایسے زخم ڈالے ہیں جن کا اندمال مشکل ہے۔ نہیں بلکہ میں ایک دنیا کو تمہاری فطرت کا لوہا منوانے بیٹھی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ سانپ ایک خوبصورت سا جانور ہے جس کی رفتار سے دل پر ایک کیف سا طاری ہوتا ہے لیکن اس کے ہر پیچ و تاب میں زہر سرایت کر گیا ہے۔ کیا تصنع و بناوٹ کے کھیل اس کمال فن کے ساتھ بھی کھیلے جا سکتے ہیں جیسے کہ تم نے کھیلے ہیں؟ کیا صرف تفریح کی خاطر ایسے خونچکاں شغلے بھی اختیار کئے جا سکتے ہیں؟ جیسے کہ تم نے اختیار کئے ہیں۔

——— یاد رکھو کہ تمہاری محبت کا ایک چھینٹا بھی اب میرے دل میں نہیں۔ تمہارا خیال بادِ نسیم کے ایک جھونکے کی طرح میرے دل سے نکل گیا ہے۔ تمہاری طوطا چشمی نے تمہیں میری نظروں سے گرا دیا ہے اور اب تم کتنی ہی اونچی ہو جاؤ۔ طیارہ رانی سے ہی کیوں نہ بلندی کی لو مگر اب ؎

وہ اگلی سی درازیٔ شب ہجراں میں نہیں

شاید اس زمانہ میں جب [illegible] تمہاری موہوم محبت کے دا[illegible] آگئی تھی عقل کی رہنمائی سے محروم تھی۔ اور قدرت نے کچھ دنوں مجھے تجربہ سکھانے اس شعر کے مص[illegible]ق بنا دیا تھا۔ ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اس دن سے میں نے جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھا اور اسے صبح کاذب جانا ——— حقیقتوں کو میں نے جھٹلا دیا عقل کی رہنمائی سے کترانے کی مجھے عادت ہو گئی۔

میری کتاب نکلی۔ میں نے بڑی توقع سے تمہیں بھی بھیج دی۔ حالانکہ اس وقت تقدیر کی دیوی کھڑی مجھ پر ہنس رہی تھی۔ میرا مخطوطہ کر رہی تھی۔ لیکن میں نے اس کی جانب سے تجاہل برتا۔ آخر وہی ہوا نا جس کے ہونے کی مجھے امید نہ تھی ——— انہہ ؎

ہم کو ان سے وفا کی کیا امید ——— !!

"تبصرہ" تو رہا ایک طرف "تذکرہ" تک نہیں کیا گیا۔ تذکرہ بھی جائے چولہے میں وصولی کی رسید

تک نہیں ـــــ واہ رے اخلاق اور واہ ری بلند نظری !! دوستی میں کوئی دنیا کسی کو دے نہیں دیتا لیکن ایسے معمولی واقعات ہی دوستی کی دنیا کو آباد کرتے ہیں اور ان سے خلاف توقع واقعات اس دنیا کو اجاڑ دیتے ہیں۔

خیر تم نے تو ایک قلمی دوستی کی تھی۔ مگر جن کی وجہ سے ہماری دوستی ہوئی تھی انہوں نے کب سلیقہ سے نباہ کی! آخر سمجھا کیا تھا دولوں نے؟ کیا "دکن کی سرزمین" میں بسنے رہنے والوں کے پہلو میں دل نہیں ہوتے؟ دل ہوتے ہیں کہ ایک آئینہ کے ٹوٹ جانے کے بھی متحمل نہیں ہوتے۔ لیکن ان میں کوہ کی سی استقامت ہوتی ہے۔ ان میں دوسروں کے جذبوں کی قدر ہوتی ہے۔ وہ پرایا کام اپنا کام سمجھتے ہیں اور بعض وقت خدمت خلق کیلئے اپنا بھی نقصان کر بیٹھتے ہیں مگر تم تو "ہوا کھا رہی ہو"۔ بلندی کی لنبتی ہو۔ مگر نظر کی پست ہو۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ مگر خیر، جو ہوا اچھا ہوا۔ اگر تم فطرتاً اچھی ہوتیں تو آج میرا موضوع بحث ہی کیا ہوتا خط لکھنے کیلئے؟ اور مجھے تجربہ کس سے اٹھانا پڑتا؟ ایسے اشعار میرے بیاض کی رونق کو دوبالا کیوں کرتے جن میں دنیا کی بے ثباتی کا مفہوم بھرا پڑا ہے؟ جن کا اعادہ اپنے ہی تفریح طبع کیلئے بیان کرنے پر قلم مچلا ہوا ہے۔ ؎

ہمارے دل سے یہ دنیا اتر جاتی تو اچھا تھا   "ہوس" انجام کی سختی سے ڈر جاتی تو اچھا تھا
ذرا کچھ اور بھی گہری "نظر" جاتی تو اچھا تھا   یہ مانا حسن میں پائی نشاط زندگی میں نے

او ہنہ ـــــ تمہارے آگے یہ سب دکھڑا رونا ایک تحصیل حاصل کارنامہ ہے میری زندگی کا۔ خداوند عالم کی بھی یہ عجیب مصلحت ہے اس کے رموز سے ہماری سطحی نظریں کیا آشنا ہو سکتی ہیں۔ انسان وہی ہے جس میں انسانیت کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ جو ذرا بھی امارت ملجانے پر اپنی ہستی کو نہ بھول جائے جو اس مقولہ کو کبھی فراموش نہ کرے کہ غرور کا سر ہی نیچا ہوتا ہے جس کلیہ کا کوئی مستثنیٰ ہی نہیں۔ جس پر شعرائے قسم قسم سے سر دھنا ہے۔ مشتے نمونہ از خروار۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں ؎

جاب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہو اگذرا   تماشا تھا ہوا نے اک گرہ دیدی تھی پانی میں

میرے اوسان ہی جاتے رہتے ہیں۔ جب کبھی میں اس کے معنی خیز عبارت پر غور کرتی ہوں میں تو

دنیا کو اس طرح دیکھتی ہوں ـــــ مگر نہ معلوم "دنیا" مجھے کن نظروں سے دیکھتی ہے۔ ؎

کاشس اللہ نے قدرت یہ ہمیں دی ہوتی کہ ہم آپ اپنے کو غیروں کی نظر سے دیکھیں

چلو بس ختم کروں گی اس داستان کو جس سے شاید تمہاری نیند اچاٹ ہوگئی ہے یا نہ معلوم اس غفلت کے خواب سے کبھی تم بیدار بھی ہو گی۔ حالانکہ مجھے ابھی بہت کچھ کہنا سننا ہے۔ لیکن سب نقش برآب ہے۔ ؎

ابھی ہے صدمۂ ہجراں کی گفتگو باقی خدا کرے نہ رہے یہ بھی آرزو باقی

اپنی ہمشیرہ معظمہ سے میرا اسلام کہنا۔ جن کے نزدیک میرا شمار مردوں میں ہو چکا تھا لیکن انہوں نے مسیحائی کے چار چھینٹے ڈال کر گفت و شنید کیلئے تھوڑی سی روح پھونک دی تھی۔ زندہ سمجھ کے راہ و رسم جاری رکھی۔ اب پھر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ شاید یہ بادحوادث کا شکار ہوگئی ہے اور پھر سکوت کی لیلیٰ ـــــ" چاند کی افسردگی اپنے اندر ایک منجمد اداسی رکھتی ہے۔ پھولوں کی خاموشی حوصلوں کو پست و سرد کر دیتی ہے۔ سبزہ کی پائمالی دیکھکر بلند نظری ایک بے حقیقت سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ بلبلوں کے نواسنجیوں سے دل کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ بادصبا کی اٹھکھیلیاں، کالی کالی گھٹائیں منڈلاتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ غرض اب تک میری آدھ موئی زندگی ادنہیں لغزشوں و ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہوئی نہ منزل مقصود کا پتہ نہ شاہراہ منزل پر قدم ـــــ گذری ہوئی زندگی ایک غبار یا ایک راکھ کا ڈھیر ہے جس پر جس کا جی چاہے جی بھر کر آنسو بہائے۔ قصہ مختصر ؎

میں تیری کم نگہی کا رہین منت ہوں میرا نظام تمنا خراب ہو نہ سکا۔

ھ

ہمدم

غم دیدہ پہ کون رحم فرماتا ہے
اس تن کے سیہ خانہ میں کون آتا ہے
لے دیکھے بس ایک دم ہے ہمدم اپنا
وہ بھی کبھی آتا ہے کبھی جاتا ہے

اس دم کو ہم اپنا دم وخم کہتے ہیں
سر رشتہ اسرار قدم کہتے ہیں
دم کے دم سے ہی ساری ہم ہم کی صدا
یہ اک دم ہی کہ جس کو ہم کہتے ہیں

امجد

صرف ایک نظر

جناب رضا تحسینؔ صاحب بی، اے

کیا اچھے ستارے نکلے ہیں کوئی اچھی ساعت آئی
وہ آئے ہیں میرے گھر میں خدا کیا دل کی تمنا پائی ہے

کیا حسن ہے تیرا ماہ لقا کیا دلکش صورت پائی ہے
اک دنیا تجھ پہ مرتی ہے اک خلق تیری شیدا ہے

انداز تکلم لطف بیاں جاں بخش تبسم جانِ جہاں
تعریف کرے کیا میری زباں جب ایک خدائی ہے

بے عیب ہیں تیرے ناز و ادا بے مثل ہے تیری مست نگاہ
ہے حالِ غضب کی ہوش رُبا ہر شان میں اک یکتائی ہے

ہم عشق و وفا پر مرتے ہیں تم جور و جفا کے خوگر ہو
اک دل ہے اپنے پہلو میں اک تم نے طبیعت پائی ہے

آ جاؤ فرشتو مل بیٹھیں کچھ اپنی کہو کچھ ہم سے سنو
کچھ وقت خوشی سے گزریگا یہاں مرقد کی تنہائی ہے

صرف ایک نظر! صرف ایک نظر! مست آنکھوں ایک نظر!
تحسینؔ کے دل پر ایک نظر! تحسینؔ تیرا شیدائی ہے

غزل

جناب حکیم بہبود علی صاحب صفیؔ

گئے وہ دن کہ آتی تھی محبت تیری صورت پر
ہماری اب تو یہ صورت ہے مرتے ہیں محبت پر

نہیں وہ ناتواں بھی صدقہ کروں کیا درد فرقت پر
الٰہی تھک گیا ہیں زور دے دے کر طبیعت پر

یہ دنیا ہے یہاں آفت رسیدوں کی کمی کیا ہے
بہت ایسے ہیں رو دیتے ہیں جو نام محبت پر

کن آنکھوں سے کسی کے دیکھنے پر دل دیا ہم نے
یہ لعل بے بہا بیچا ہے ادنیٰ پونی قیمت پر

دل آیا بھی تو آیا ہائے کس بے درد پر اپنا
طبیعت آئی بھی تو آئی کیسے بے مروت پر

تیری محفل کی باتیں اس طرح عشاق سنتے ہیں
کہ جیسے نیک بندے کان رکھیں ذکر جنت پر

کسی کی یاد آئی ہم کو اپنا دل بھی یاد آیا
بہت سچ ہے کہ ہر شئے یاد آتی ہے ضرورت پہ

خبر کیا تھی لہو ہو ہو کے بہ جائیگا آنکھوں سے
کیا تھا ہم نے تیرا دوستانہ دل کی ہمت پر

نہیں دیکھا تھا جب تک آپ کی رفتار کا عالم
بڑی مشکل سے میرا اعتقاد آیا قیامت پر

کیا جس نے مجھے برباد کس دل سے اُسے کوسوں
الٰہی کاش میری خاک پڑ جائے محبت پر

محبت میں تو ذلت اے صفیؔ ہے نام عزت کا
وہ کیوں جیتے ہیں جو مرتے ہیں اپنی شان و شوکت پر

برادرانِ کرم جب کبھی مضامین بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائیں وہاں اتنی زحمت اور برداشت کیجئے کہ مضمون صاف لکھا رہے۔ اگر آپ کو فرصت نہیں تو اپنے کسی منشی یا دوست ہی سے جو خوشخط ہوں لکھوا دیا کیجئے۔ جہاں آپ اپنے الطاف سے ہماری قلمی اعانت فرما رہے ہیں وہیں اتنی زحمت برداشت کریں تو یہ اور بھی کرم ہوگا ورنہ زشت خطی سے اندیشہ غلط نویسی باقی رہجاتا ہے جس کی وجہ مضمون کا حسن جاتا رہتا ہے کیا آپ توجہ فرمائیں گے؟

حکیمانہ دماغ

جناب محمد علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

(بسلسلۂ گذشتہ)

تمام اشیاء لافانی موت کے ذریعہ
دور ہوں یا نزدیک
نامعلوم طور پر۔

ایک دوسرے سے مربوط ہیں
ایک پھول کو تو چھو نہیں سکتا۔

ایک ستارے کو دکھہ دئے بغیر

اسی بلند صوفیانہ خیال کو **ذوق** نے کس ہنر انداز میں ادا کیا ہے۔

توڑنا گل کو ذرا سوچ سمجھہ کر گلچیں   جان بلبل کی ہے پھولوں میں پڑی بو ہو کر

وہ شخص جو ہمیشہ اس خیال کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے اور اوس اصول ہمدردی کو سمجھتا ہے جو اس میں مضمر ہے کبھی اپنے آپ کی یا دوسروں کی تحقیر کا باعث نہیں ہو سکتا۔ لیکن نہ یہ اصول نہ سعی عظیم کے لئے کوئی محرک (یا مہیج) فلسفہ اخلاق میں کوئی اہمیت رکھتا ہے جب تک کہ اوس پر عمل نہ کیا جائے یا جب تک وہ عمل کے لئے تیار نہ کردے۔ نور غیر مرئی ہے تا وقتیکہ وہ کسی مادی شیئے سے نہ ٹکرائے اور اسی طرح اخلاقیات کا ایک اصول بے معنی ہے جب تک حیات انسانی میں وہ منعکس نہ ہو کسی مسلک کی قطعی آزمائش وہ اثر ہے جو وہ اپنے پیرؤوں میں پیدا کرتا ہے اور اوسی کسوٹی پر پرکھے جانے کے لئے اسپرٹ آف سائینس بھی تیار رہے۔ آیئے اور دیکھئے کہ وہ شخص جو عیسائیت کی نمائندگی اوس کی اعلیٰ وارفع شکل میں کرتا تھا کن الفاظ میں اون اشخاص کے اوصاف کی تصدیق کرتا ہے جو سائینس کے وفادار طلبا رہیں۔

"بھلے، دیانتدار، مدقق (accurate) نیک، صابر، متقی، انصاف پسند۔ منکسر المزاج۔ وہ لوگ جو واقف ہیں اپنے جہل مطلق سے علم کی اوس لا متناہی مقدار کے

مقابلہ میں جسے اس قسم کی کائنات میں حاصل کرتا ہے۔ لوگ جو مسئلہ کے دونوں رخ دیکھنے کے عادی ہیں، لوگ جو متر فض اور متعصب (bigots and fanatics) اشخاص کی طرح عجلت میں رائے قایم کرنے کی بجائے مزید واقعات کے متعلق مزید تفکر کے لئے عقلمندوں کی طرح انتظار کرتے ہیں مختصر یہ کہ لوگ جنہوں نے دماغ کی یہ وہ عادت حاصل کرلی ہے جو علوم فطرت کے مطالعہ سے حاصل ہوسکتی ہے اور لازماً ہونی چاہئے کیونکہ بغیر اس کے علوم فطرت کا مطالعہ بیکار رہے اور وہ شخص جس میں دماغ کی یہ عادت موجود نہیں ہے اگر سائینس میں بیجا مداخلت کرے تو وہ محض ایک دجال بازاری یا نمائشی حکیم بنکر رہجائیگا۔ اپنی روٹی صرف مخاطبۃ الارواح (spirit rapping) روحوں کے ذریعہ کام لینا) یا "ناقابل خطا" گولیوں کی ایجاد کے ذریعہ کمانے کے قابل"

چارلس کنگسلی

جب شاہ جارج سوم نے ہرشل کو ۲۰۰ پونڈ سالانہ وظیفہ پرشاہی ہیئت داں مقرر کیا تو باتھ (Bath) میں ہرشل کے دوست سر ولیم واٹسن نے استعجاباً کہا "کسی شاہ نے شرف اتنا ارزاں کبھی نہیں خریدا" لیکن انگلستان میں بادشاہوں کا حکیمانی (سائنٹفک) علم آموزی (sludmx) کے لئے کسی قسم کی علمی اعانت کرنا اتنا غیر معمولی فعل ہے کہ یہ جملہ کچھ غیر منصفانہ معلوم ہوتا ہے بالخصوص اسلئے بھی شاہ جارج کی امداد نے ہرشل کو موسیقی کی تدریس چھوڑ دینے۔ علم ہیئت پر اپنی توجہ مرکوز کرنے اور دوربین بنانے کے قابل بنادیا جس کی اعانت میں مابعد اوس نے دو دو ہزار پونڈ کے دو گرانقدر عطیہ حاصل کئے ایک مرتبہ لالانڈے (Lalande) نے شاہ جارج کا شکریہ اس بات پر ادا کیا کہ وہ علم ہیئت کی مساعدت (حوصلہ افزائی) کرتا ہے۔ شاہ نے جواب دیا "جنگ کے لئے میں روپیہ صرف کرتا ہوں اس لئے کہ یہ ضروری ہے۔ لیکن اور چیز یعنی (سائنس) پر صرف کرنا میرے لئے باعث مسرت ہے۔ اس نصب العین کی قیمت آنسو نہیں ہیں بلکہ یہ تو انسانیت کے لئے باعث شرف ہے"

حکمیات (سائنس) کی فتوحات صرف اوس شخص کے ازدیاد علم کو ظاہر نہیں کرتیں جو اونہیں

حاصل کرتا ہے نہ صرف اوس ملک یا وطن کے ازدیاد علم کو بھی جس کا وہ باشندہ ہے۔ بلکہ تمام نوع انسان کے ازدیاد علم کو بھی۔ جنگ میں فتح و نصرت کے ذریعہ طاقت و شکوہ تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اپنے جلو میں مفتوحین کی تسخیر و تذلیل اور بربادی بھی لاتے ہیں اور دونوں جانب سے ایسے اسباب کی خاطر انسانی زندگیاں جنگ کے دیوتا پر قربان کیجاتی ہیں جو اکثر و بیشتر حق سے کوسوں دور ہوتے ہیں لیکن حکمیات (سائنس) کی فتوحات کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک ملک یا قوم کی فتح دوسروں کے نقصان سے ہو بلکہ یہ سمجھے ہیں جس کا جی چاہے اونہیں قبول کرلے۔ جس ملک پر فوج کشی کرنا ہے وہ جہالت ہے اور جہاد اوس جسمانی اور ذہنی موت کیخلاف کرنا ہے جو اوس (جہالت) کا نتیجہ ہے حکمیات (سائنس) کے سورما اپنا نمبر مختتم جہاد ظلمت کے عوض نور۔ باطل کی جگہ حق اور علوم خیر و شر کے درخت کے پھلوں کے جاری رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی غرانیتی (Granite) ستون یا کتبہ پر اون کے اعمال کندہ نہ کئے جائیں یا کوئی مرمریں مجسمہ (Manument) اون کے کارناموں کی شہرت یا عظمت کا اعلان نہ کرے لیکن ساتھ ہی اون کے جوش اور ولولوں میں بیواؤں اور یتیموں کی آہ و بکا کی وجہ سے جو ہمیشہ فوجی کمانداروں کی فتوحات کے ساتھ ملزوم ہیں خلل بھی پیدا نہ ہوگا۔

دنیا کی تباہی اور نئے [illegible] کی آبادی کے بعد جب شمالی ساگا کے دیوتاؤں کی آرامگاہ "کوہ اسگرڈ" پر ایک نیا شہر عالم وجود میں آیا تو اس شہر میں "محافظہ" کے جنگل سے آدمیوں کی ایک نئی قوم آئی اور امن دشمنوں شکن "لوکی" اور تباہ کار "فینس بز" (Fenris) کو کوئی جگہ نہ ملی یہ نئی نسل ایک مخصوص مثال ہے "سائنٹفک اسپرٹ" کی جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور اُن کی جو علم جدید کے لئے جد و جہد کرتے ہیں:-

"وہ فخر عالم ہیں جو نسل انسان کو بربریت کی طرف لوٹنے سے باز رکھتے ہیں وہ نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ بارگاہ ایزدی میں مقبول ہیں اور یہ شرف صرف چند ہی منتخب شرفا یا اغنیاء اور طاقتوروں کو حاصل ہوتا ہے اون میں بیشتر مفلس تھے۔ اکثر خود اپنے زمانہ میں قطعاً غیر معروف تھے۔ بہت سے مر گئے اور اپنی کاوشوں کو بار آور ہوتے نہ دیکھ سکے۔

چند کو اذیت و تکلیف پہنچائی گئی، چند کی گردنیں ماردی گئیں یہ الزام لگا کر کہ وہ گمراہ بدعتی اور نوجوانوں کو بگاڑنیوالے تھے۔ چند کے تو نام بھی فراموش ہو چکے ہیں۔ لیکن اون کے نام مٹ گئے تو کیا، اون کے کام زندہ ہیں۔ ترقی کر رہے ہیں اور نوجوانوں کی ہر تازہ نسل میں پھیل رہے ہیں اور اونہیں فراست کے اوس معبد کی جانب نئی نئی راہیں تیار ہیں جو علم ہے۔ اشیاء کی حقیقت کا۔ علم اون دائم قوانین کا۔ جن کے ذریعہ قادر مطلق، زمین و آسمان، اشیا فانی و ابدی، جسمانی و روحانی دیدہ و نادیدہ پر۔ طاقتور قوموں کے عروج و زوال سے لیکر زمین میں گھانس کی نمو اور موت تک ۔ حکمرانی کرتا ہے "۔ چارلس کنگسلی

حکیمانہ دماغ ہمیشہ رازہائے فطرت کو منکشف کرنے کی کھوج میں لگا رہتا ہے پھر فنون اور صنعت و حرفت میں اون سے استفادہ کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے۔" لذت تعاقب میں ہے اور وہ تسخیر کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے "۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیمکش کو ۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا۔ غالبؔ

ایک وقت آکسفورڈ کے کسی پروفیسر نے کہا تھا کہ نصف قطر سمتی (کواٹرنیئن) میں جس بات کی وہ قدر کرتا تھا وہ یہ یقین تھا کہ کسی افادی استعمال کے ذریعہ اوسے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ اس بیان (ریمارک) کا محرک غالباً قدامت پرستانہ و مخالفانہ جذبہ تھا اور پیشگوئی غلط بھی ثابت ہو چکی ہے لیکن یہ بہت سے حکمیاتی محققین کے احساسات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے جو علم کی توسیع کرنے اور اسرار کائنات کو اور زیادہ سمجھنے کے لئے نہایت جدوجہد کرتے ہیں اور اونہیں ہرگز اس کا خیال تک نہیں آتا کہ آیا اون کے مشاہدات اور دریافتیں بہ کار بھی آسکتی ہیں؟ اس نوعیت کی ذہنیت رکھنے والے اشخاص کے نزدیک حکمت (سائینس) مقدس ہے۔ یہ افراد "نا معلوم" کی وسعت اور گہرائی کے سامنے اپنی گردنیں یہ محسوس کرتے ہوئے جھکا دیتے ہیں کہ مستقبل میں نسل انسانی کو جو فاصلہ طے کرنا ہے اوس کے مقابلہ میں اونہوں نے ابھی بہت ہی کم منزلیں طے کی ہیں وہ ذیل کی سطروں کی سچائی کا اعتراف کرتے ہیں۔

نہ حاصل ہی تجھہ کو حقیقی بلندی ——————— (نہ پائی ہی تونے حقیقی بلندی)
نہ نزدیک تر تجھ سے ہے روشنی　　ہے کیونکہ یہ زینہ ہی لامنتہی

ٹینی سن

عجز و انکساری فی الحقیقت ہر حکیمانہ دماغ کی امتیازی خاصیت ہے ۔ عجز، انسان اور انسانی ساخت کی مورتیوں کے سامنے نہیں بلکہ اس عجیب کائنات کے سامنے جس کے مقابلہ میں زمین ایک ذرہ محض ہے فطرت کی اس پرستش کے ذریعہ ایک حکیم (سائنس داں) اون سطحوں سے بلند ہو جاتا ہے جن پر فطرت سے غافل انسان بستے ہیں اور اوس بلند مقام سے پیش نظر منظر کی عظمت اوس میں عجز لازماً پیدا کر دیتی ہے۔

"خدا کی فراست و عقلمندی، کور مغزوں کی بے معنی نظارہ بازی یا اوس کی کبریائی تو اون سے ہوتی ہے جن کی حکیمانہ جستجو اوس کے افعال میں اور بارادہ تحقیقات اوس کی مخلوق میں ایک حقیقی اور عالمانہ فرض شناسی کی مظہر ہیں۔" سرتھامس بردن

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را　　تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

فراست کا مقدس شعلہ ایک حکیمانہ دماغ میں تیز روشنی کے ساتھ جلتا ہی اور اوس کی شعاعیں بنی نوع انسان کے لئے منتشر ہوتی ہیں یہ اعتقاد کہ مطالعہ فطرت میں انہماک خالق کی بڑائی ہے ۔ اعتقاد رکھنے والوں میں جرارت اور طاقت پیدا کرتا ہے یہ الہام الٰہی ہی جو سائنس میں اعلیٰ و ارفع کام کرنے کے لئے جوش دلاتا اور قابلیت پیدا کرتا ہے ۔ علوم فطرت کی درسگاہ میں نو داخل اپنے اساتذہ سے اپنے پیشہ کا یہ اصل اصول سیکھتے ہیں۔ سنئے اور غور سے سنئے وہ بلند خیالات جو بزنیات کے ایک پیشرو نے اپنے طلباء کے سامنے ایک خطبہ میں ظاہر کئے تھے ۔

صرف یہ یقین، فراست کے ساتھ مخلصانہ پر جوش محبت پیدا کر سکتا ہے کہ علم کے ساتھ ہماری محبت "تلاش ہی ایک سچی حقیقت کی اور یہ کہ یہی حقیقی زندگی ہے اور فطرت کے ساتھ حقیقی ہم آہنگیت ۔ تم صرف اس یقین کے ذریعہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی، ایک بلند تر روشنی اور رفیع تر علم کی طرف راہبری کرنیکی ایک حقیقی اور بے لوث خواہش

حاصل کر سکتے ہو کہ علم کی اشاعت کے ذریعہ تم زمین پر خدا کی بادشاہت کی بنیاد پر مضبوط اور استوار کرنے کا فرض ادا کر رہے ہو۔ یہی اہم نصب العین ہے جس کیلئے تم نے اپنی تعلیم و تربیت شروع کی ہے اپنی کوششیں تقدس آمیز سنجیدگی کے ساتھ جاری رکھو اور تم ایک ایسی سرور و شادمانی حاصل کرنے پر قادر ہو جاؤ گے جو تمہیں دنیا ہرگز فراہم نہیں کر سکتی اور تمہارے کام تمہاری مادر وطن کے لئے ایک نعمت ثابت ہوں گے اور تمام انسانوں کی بہبودی و عطائی کا باعث۔ [illegible]

وحشی اپنی لکڑی اور پتھر کی مورتیوں کو صفات الہیہ سے متصف کرتا ہے اور ان کی پرستش کرتا ہے۔ تمام انسانوں اور زمانوں کے دیوتا ان لوگوں کے خیالات اور تمناؤں کا آئینہ ہوتے ہیں جو انہیں سجدہ کرتے ہیں۔ زینوفینس نے کہا تھا کہ "انسان خداؤں کو اپنی ہی شبیہ کے مانند بناتا ہے۔" اور اس کی یہ رائے تھی کہ دیوتاؤں کو انسانی قالب میں پیش کرکے ہومر اور ہیسوڈ براہ راست اس زمانہ کے اخلاقی منزل کا حقیقی باعث ہوئے۔ انسان دیوتاؤں کو جس شبیہ میں بناتا ہے اس کا تعین زیادہ تر کائنات کے علم کی وسعت سے ہوتا ہے وہ شکل جو ایک عامیانہ دماغ کو مطمئن کر سکتی ہے ایک ایسے دماغ میں احترام کا جذبہ پیدا نہیں کرتی جو [illegible] تک پرواز کر سکتا ہے یا [illegible] عضویاتی ہستیوں کی حیات کے عمیق عجائبات کا مطالعہ کرتا ہے۔

صرف حکمیات (سائنس) کے ذریعہ ہی ہم اپنا اور اسرار وجود کے ساتھ اپنے تعلق کا صحیح تصور قائم کر سکتے ہیں صرف ایک مخلص حکیم (سائنس داں) ہی۔ اور اس سے ہمارا مطلب محض فاصلوں کی پیمائش کرنیوالا یا مرکبات کی تحلیل کرنیوالا یا جنسوں کی شناخت کرنے والا نہیں ہے بلکہ وہ جو پست تر حقائق [illegible] بالآخر بلند ترین حقائق کی جستجو کرتا ہے۔ صرف حقیقی حکیم [illegible] جان سکتا ہے کہ نہ صرف انسانی فہم بلکہ [illegible] قوت موجود ہے جس کا عکس فطرت حیات اور خیالات میں جلوہ فرما ہے۔

ہربرٹ اسپنسر

وہ دماغ جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد صدیوں اور قرنوں پر غور و فکر کرنیکا عادی ہے اور مابین النجوم فضا کی گہرائیوں کی پیمائش کرتا ہے بھلاکب تنگ مذہبی عقائد کی حدود میں مقید کیا جا سکتا ہے تاہم وہ اوصاف منعبد ہوتا ہے اور جس کسی سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے اوس پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔ج۔ف۔ واٹس کو اپنی رفعت زا شخصیت کی وجہ سے دوسروں پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ ایک لڑکا اپنے والد کے گھر کی بدکار، فاجرانہ صحبت کی وجہ سے ذلیل اور فاسقانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ایسی شب میں جب آسمان کا لاجوردی گنبد ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ لندن کے کسی چمن میں وہ واٹس کے ساتھ سیر کر رہا تھا۔اوسی زمانہ سے اوس لڑکے کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اور جب چند سال بعد اوس سے سوال کیا گیا کہ وہ کیا بات تھی جس نے اوس میں یہ علو خیالی پیدا کر دی تو اوس کا جواب مختصر تھا" ہماری گفتگو ستاروں سے متعلق تھی"۔ انوار قدسی کے ذریعہ وہ اوس راستہ کی غبار دیکھنے جس پر وہ چل رہا تھا اور انسانیت کی طرف اپنے سفر کیلئے مستقیم راستے منتخب کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

حکمت (سائنس) کا مطالعہ افادی نقطہ نظر سے کیا جائے یا خالصاً علم میں اضافہ کرنے کے لئے بہرحال وہ ایک بیداری پیدا کرتا ہے جو زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے نہ حکمت نہ فلسفہ اس 'عالی' کے دینی احساسات کی تشفی کر سکتا ہے جو پرستش کے لئے ایک شخصی اور عمرانی ہستی چاہتا ہے لیکن اگرچہ کہ دین (مذہب) بغیر حکمیات کے وجود رکھتا ہے۔ بغیر دین کے کسی علم الحکمت (سائنس) کا وجود نہیں ہے۔ قوانین قدرت کا مطالعہ اپنے (قوانین کے) لئے عزت اور اپنے خالق کے لئے احترام پیدا کرتے ہیں۔ بہت عمیق احترام جو عامیانہ دماغ کے تصور سے بہت بلند و بالا تر ہے۔

اعتقاد اور حکمیات (سائنس) کے درمیان مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ حکمیات اور اعتقاد باہم ایک دوسرے کے وجود کے مانع ہیں اس معنی میں نہیں کہ ایک کا وجود دوسرے کے وجود کو ایک ناممکن امر بنا دیتا ہے یا بالعکس؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن حدود کے اندر حکمیات کی وسعت ہے وہاں اعتقاد کا وجود نہیں ہے اور اعتقاد کی حدیں اوس مقام سے شروع ہوتی ہیں جہاں حکمیات کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس

حد سے پرے ممکن ہے حقیقی اشیا موجود ہوں جن کا ادراک اعتقاد کے ذریعہ ہوتا ہے اس لئے حکمیات کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ اعتقاد کی بیخ کنی کرے بلکہ اوس کا کام اقلیم علم کی حدود کا تعین اور اون کے اندر ایک ہم رنگ نظام قائم کرنا ہے - روڈولف فرشو۔

درحقیقت دین اور حکمیات کے درمیان کوئی نزاع نہیں ہے۔ پہلا اظہار ہے کہ اک جبلیت کا اور دوسرا نچوڑ ہے کائنات کی تمام اشیا، مرئی اور غیر مرئی کی نوعیت اور غرض کی تحقیق کا۔ لارڈ کیلون نے کہا ہے "اخلاق کے دائمی قانون کے ذریعہ حکمیات (سائینس) ہر اوس مسئلہ پر بے باکانہ غور کرنے کے لئے پابند ہے جو جائز طور پر اوس کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے" وہ کسی خاص عقائد یا مخصوص دین کو قائم کرنے یا اون کی بیخ کنی کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ فطری دنیا میں جو کچھ اوس کے سامنے آتا ہے اس کی وہ تنقیدی نظر سے جانچ کرتا ہے اور جو کچھ وہ دیکھتا ہے سچائی کے ساتھ اوس کی شہادت دیتا ہے اس طرح جو علم حاصل ہوتا ہے ممکن ہے کسی وقت وہ کسی اعتقاد کی بیخ کنی کرتا نظر آئے لیکن اس سے پریشان خاطر نہ ہونا چاہئے کیونکہ وہ اپنے وقت پر بالآخر حق کی فتح اور باطل کی شکست ہو کر رہیگی۔ اب یقین کے ذریعہ ہو یا مشاہدہ کے۔

پیروان سائینس اور مذہب دونوں کی چند نسل قبل کی عقیدہ پرستی اب زیادہ آزادانہ طرز عمل کو جگہ دے رہی ہے اور وہ تمام لوگ جو حق کی مخلصانہ جستجو میں سرگرداں ہیں ایک ہی معبد کے پجاری مانے جاتے ہیں۔ لیکن روایتی مافوق الفطری عقائد کو عرضی (مادی) حقیقت کا لباس پہنانے یا جدید حکمیات (سائینس) کو کتابی (انجیلی) بیان کی حدود میں لانے کی کوشش بے سرمایہ نصف معقول۔ (Semi-reasonable) - کے لئے ایک گندی جائے پناہ تیار کرنا ہے۔ عقائد نہ اصول میدان تحقیقات کی حد بندی کر سکتے ہیں۔ "حکمیات" کارل ارنسٹ فان بیئر نے کہا ہے "باعتبار منبع ازلی ہے، باعتبار عمل زمان اور مکان کی قیود سے آزاد، باعتبار وسعت ناقابل پیمائش، باعتبار مسائل غیر مختتم اور باعتبار نصب العین ناقابل حصول" حکمیات کا مطالعہ اوس کے ہر پیرو میں غیر متنہی عظمت کا یہ احساس پیدا کر دیتا ہے اور اگرچہ یہ ممکن ہے کہ یہ غیر مکمل (تکمیل پذیر) تعبیروں تک رہنمائی کرے لیکن اوس کی نیت مخالف دین نہیں ہو سکتی۔

ایک آزادانہ جوشِ تحقیق اور بیتاب تمنا کو اہم اصول تسلیم کرکے وہ (حکمیات) دماغ کو ہر قسم کے تعصبات سے آزاد کر دیتا ہے اور صرف جوشِ محض اور خود فریبی سے محفوظ رکھتے ہوئے ناقدانہ تحقیقات کے ذریعہ اوس کو اون اعلیٰ وارفع ارتسامات کے لئے کھلا و آزاد چھوڑ دیتا ہے جنھیں وہ قبول کر سکتا ہے پست ہمت کرنے کی بجائے ہر اوس امر میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے جو موجودہ تاریک اور غیر اطمینان بخش صورت حالات کے ماورا ایک مطمح امید پیش کر سکتا ہو۔ ایک حقیقی فلسفی وہی ہے جو یہ امید رکھے کہ تمام اشیا غیر ممکن نہیں ہیں اور یہ یقین رکھے کہ تمام اشیا غیر معقول (خلاف عقل) نہیں ہیں وہ شخص جس نے ریاضیات اور طبیعیات میں ایسے ابہامات جو ناقابل حل معلوم ہوتے تھے چشم زدن میں دور ہوتے دیکھا ہے اور جس نے تحقیقات کے سبب زیادہ غیر بارور اور امید نا افزا میدان ہائے عمل کو صرف زاویہ ہائے نگاہ میں تبدیلی کی وجہ سے یا اون پر کوئی اصول عائد کرنیکی وجہ سے پہلے کبھی جس کی آزمائش کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔ "زرخیز" اور ناقابل اختتام چشمہائے علم و طاقت میں گویا الہام کے ذریعہ تبدیل ہوتے دیکھا ہے وہ شخص حقیقت میں سب سے آخر ہوگا جو بنی نوع انسان کی موجودہ یا آئندہ قسمت کے متعلق کسی ہمت شکن مطامح نظر پر راضی ہو جائے۔ بلکہ اس کے برخلاف ذہنی و اخلاقی اور مادی رشتوں کے متعلق غیر محدود نظرے جو ان مطالعوں کے دوران میں ہر طرح خلقت کے درجات میں اوس کے حقیر مقام کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ اور اُس عظیم الشان کل (مشین) کی جسے وہ اپنے گرد مصروف عمل دیکھتا ہے خفیف سی حرکت میں ترمیم کرنے یا اوسے روک دینے پر قادر نہ ہونیکا مسلسل جڑ پکڑتا ہوا احساس ضرور موثر طور پر اوس کو قابل کر دینگے کہ عجز دعویٰ ہی ہے جو امید پر تیقن کے ساتھ مساویاً طور پر اوس کے کردار کی بہترین زینت ہے۔ سرجان ہرشل۔

"سعادت اور اعزاز ناموری اور قوت" عام طور اوس ہستی کے انعامات نہیں ہیں جو حکمیات

کے لیئے وقف ہے۔ جدید تہذیب کے تمام استفادات حکمیات کی کامیابیوں یا اون پر منحصر ایجادات کی وجہ سے ہیں۔ مگر رعایا نہ راعی اون اشخاص کے ناموں سے واقف ہیں جن کی کاوش نے موجودہ زمانہ کے آرام مہیا کیئے ہیں اگر تمہیں شہرت اور دولت کی تلاش ہے تو حکمیاتی (سائینٹفک) زندگی مت اختیار کرو کیونکہ وہ سیاسیات یا تجارت یا زندگی کے دوسرے کئی پیشوں کے ذریعہ بہ آسانی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر تم اوس تمکن و اطمینان پر قانع ہو سکتے ہو جو بیلوث وفادارانہ کام کے ذریعہ ہمیشہ حاصل ہوتا ہے تو فطرت ایک زرخیز میدان پیش کرتی ہے جس میں تم اپنے ذہن کو بروئے کار لا سکتے ہو۔

حکمیات (سائینس) کے معبد میں داخل ہونیکا پروانہ خیال کرنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ علم کی قربان گاہ پر قربانیاں کی جائیں اور صرف اونہی اشخاص کی قربانی قبول کی جائیگی جو سچائی کے ساتھ مخلصانہ محبت رکھتے ہیں۔ فطرت سے محبت صرف محبت کی خاطر کیجانی چاہئیے نہ کہ اوس کے جہیز کی خاطر۔ انعامات جو دنیا دسیکتی ہے ممکن ہے ملجائیں لیکن وہ انکشافات جن کے ذریعہ وہ (انعامات) حاصل ہوسکتے ہیں صرف ترقی علم کیلیئے حقیقی اور بے غرضانہ تلاش کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتے ہیں۔ شاہ آرتھر کے فارسین (Knights) میں سے صرف ایک "سرگیلے ہڈ" کو "مقدس طبق" کا رؤیا نصیب ہوا اور وہی ایک فارس تھا جو کہہ سکتا تھا کہ

میری قوت اس کی قوت ہے۔ کیونکہ میرا دل صاف ہے۔ (ٹینی سن)

علی ہذا اسرار فطرت اون اشخاص کے لیئے محفوظ ہیں جو محض حق سے محبت اور ادراک کی خواہش کی وجہ سے اون کی تلاش کرتے ہیں عادل اور وفادار فارس فطرت کو بے پردہ دیکھ سکتا ہے اور حکمیات کے روحانی شہر میں داخل ہو سکتا ہے جہاں خالص تر سرور و شادمانی اوس کا انعام ہوں گے اوس سے نسبتاً بہت زیادہ جو دنیا کی تمام شہرتیں عطا کر سکتی ہیں۔

ماہ لقا بائی

(جناب عطارد)

دکن کے پچیس مشاہیر شعرا کے مختصر حالات اور ان کے منتخب کلام کا مجموعہ "سلسلہ ادبیات اردو" کی زیر سرپرستی "مرقع سخن" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے ان پچیس شعرا کی محفل میں ماہ لقا بائی (چندا جی) بھی موجود ہیں۔ دکن میں ماہ لقا بائی ایک ذہین شاعرہ اور طباع رقاصہ گزری ہے جس کی حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کی روایتیں بہت کچھ مشہور ہیں۔ اختر حسین صاحب اختر نے بڑی تلاش و جستجو سے اس کے حالات ایک غیر مطبوعہ تاریخ سے فراہم کئے کہا جاتا ہے کہ ماہ لقا بائی کے ایما سے یہ کتاب کسی منصبدار صاحب نے لکھی۔ کلام کا انتخاب بھی ایک قلمی نسخہ سے حاصل کیا گیا۔ ماہ لقا بائی راج کنور کی دختر اور مہتاب جی کی ہمشیرہ زادی تھی معلوم نہیں یہ رشتہ بطنی اور نسبی ہے یا لطفی۔ رکن الدولہ مدار المہام وقت نے مہتاب جی سے عقد کر لیا اس طرح وہ ان کی منکوحہ بیوی تھی اختر صاحب لکھتے ہیں "مہتاب جی کے اولاد نہ تھی اس لئے چندا جی کو اوس نے گود لیا۔ یعنی ماہ لقا بائی مہتاب جی کی یا بالفاظ دیگر رکن الدولہ کی لے پالک دختر تھی"۔ ایوان وزارت میں اس کی پرورش ہوئی تعلیم و تربیت کے لئے بڑے بڑے باکمال مقرر ہوئے فن موسیقی کی تعلیم بھی اساتذہ فن سے دلائی گئی"۔ یہاں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لڑکی مدار المہام وقت کے منکوحہ کی متبنیٰ یا لطفی دختر ہو اور ایوان وزارت میں خاص اہتمام سے اوس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے اوس کا رقاصہ ہونا کیسے جائز رکھا گیا۔

ماہ لقا بائی کمسنی میں اپنی خالہ کے پاس زیادہ آتی جاتی ہوگی یہ بھی ممکن ہے کہ چندا کے حسن و جمال اور قابلیت دل و دماغ کی وجہ رکن الدولہ بھی اوس پر لطف و عنایت کی نظر رکھتے ہوں گے۔ جس کے سبب یاروں نے پروردہ دختر بھی بنا دیا۔

ماہ لقا بائی (چندا جی) ۱۱۸۱ھ میں پیدا ہوئی کہا جاتا ہے کہ حضرت غفران مآب نواب

نظام علیخاں آصف جاہ ثانی نرمل کے معرکہ پر تشریف لیگئے تو چندا بھی ساتھ تھی۔ سنہ ۱۱۹۷ھ میں ظفرالدولہ نے بغاوت کی تو ان کی سرکوبی کے لئے حضرت غفراں ماب خود نرمل تشریف لے گئے اگر ماہ لقا بائی کا اس سفر میں ہمراہ رہنا صحیح ہی تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ سولہ سال کی عمر میں ماہ لقا بائی تعلیم و تربیت سے فارغ اور اس کے قبل ہی ایوان وزارت سے باہر ہوچکی تھی کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ چندا کے تعلقات راجہ راؤ رنبھا سے قایم ہوچکے تھے اسی سال سوائی مادھوراؤ والی پونہ کی شادی کی دعوت میں شریک ہونے کے لئے حضرت غفراں ماب نے نواب سکندر جاہ کو روانہ فرمایا اس سفر میں دوسرے طوائف کے علاوہ ماہ لقا بائی بھی حضرت مغفرت منزل کے ہمراہ پونہ گئی تھی ان واقعات سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ماہ لقا بائی نہ تو مہتاب جی کی پروردہ دختر تھی اور نہ ایوان وزارت میں خاص اہتمام سے اوس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔

چنداجی ماہ لقا بائی کا انتقال سنہ ۱۲۴۰ھ میں بعمر ساٹھ سال ہونا کہا گیا ہے۔ مقبرہ پر یہ مصرعہ تاریخ کندہ ہے۔ ع "راہی جنت شدہ ماہ لقاے دکن" قاعدہ جمل کے لحاظ سے اس مصرعہ کے اعداد (۱۲۳۹) ہوتے ہیں بخلاف اس کے صاحب گلزار آصفیہ کہتے ہیں "درسن یکہزار و دوصد و سی و شش ہجری بعارضہ وبا بعالم باقی خرامید"۔ تاریخ گلزار آصفیہ کے مصنف خواجہ غلام حسین خاں المخاطب بہ خان زماں خان مرحوم حضرت غفراں ماب آصفجاہ ثانی کے معالج خاص تھے اس لئے حضرت غفراں ماب اور حضرت مغفرت منزل کے زمانہ کے حالات جو کچھ انہوں نے لکھے وہ ان کے چشم دید اور قابل اعتماد ہیں۔ گلزار آصفیہ کی تصنیف سنہ ۱۲۶۰ھ میں ختم ہوئی۔

اس سے ظاہر ہے کہ ماہ لقا بائی کا انتقال مصنف گلزار آصفیہ کی زندگی میں ہوا۔ مقبرہ پر جو مصرعہ تاریخ کندہ ہے ممکن ہے وہ بصنعت تخرجہ کہا گیا ہو بہرحال پورا قطعہ لکھا جاتا تو یہ گتھی سلجھ سکتی۔

ماہ لقا بائی کو مبدء فیاض نے ہر قسم کی دولت عطا کی تھی حسن صورت کے ساتھ طباعی لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی نے اس کو مشہور عوام اور محبوب خواص بنایا۔ شاعرہ بھی تھی خوشنویس بھی تھی۔

موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔

مرقع سخن میں اس کے اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس سے طبیعت کی روانی اور تخیل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اختر صاحب نے اس کو مولٰنا روم، عمر خیام، مولوی جامی اور میر سوز وغیرہ کے دوش بدوش کھڑا کر دیا بلکہ دو قدم آگے بڑھا دیا میر سوز چندا کے معاصرین اور ملا جامی تو اساتذہ متقدمین میں سے ہیں ان دونوں کے اشعار کا مقابلہ چندا کے اشعار سے کر کے چندا کے شعر کو ترجیح دیگئی ہے اختلاف مذاق مسلم ہے لیکن قیاس یہاں یہ کہنا ہے کہ چندا کے اشعار اور اس کے عام حالات سے اختر صاحب ایسے متاثر ہوئے کہ قوت ممیزہ سے کام نہ لے سکے۔ ہم یہاں صرف انہیں دو شعروں سے بحث کرتے ہیں جن کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اس کا تصفیہ سخن فہم اور سخن داں حضرات پر چھوڑتے ہیں۔

جلوہ گران دنوں کچھ اشک ہیں کم آنکھوں میں　　اسلئے خون رہا آن کے جم آنکھوں میں　　چندا

اشک خون آنکھوں میں آکر جسم گئے　　دور کے بھی دیکھنے سے ہم سم گئے　　میر سوز

سوز کے کلام کی خصوصیت زبان کی صفائی سادگی اور محاورہ کی چاشنی ہے ان کی نسبت آزاد کی رائے ہے کہ اردو غزل کے وہ سعدی ہیں لیکن اختر صاحب چندا کے شعر پر سر دھنتے اور فرماتے ہیں کہ "سوز کا آخری مصرعہ بے ضرورت ہے۔ چندا نے آنکھوں میں خون جم جانے کی شاعرانہ توجیہہ بھی کر دی ہے اور سامع کے ذہن میں ایک وسیع میدان چھوڑ دیا ہے۔ سوز نے نتائج وعواقب کی تفصیلات میں پڑ کر اپنے شعر کو پوری ایک حکایت اور داستان بنا دیا" چندا جی نے آنکھوں میں خون جم جانے کی وہ کون سی شاعرانہ توجیہہ کر دی ہے اور ذہن سامع میں کون سا وسیع میدان چھوڑ دیا ہے ہم تو اوس کے سمجھنے سے قاصر ہیں اگر اس کی صراحت فرمائی جاتی تو دوسروں کو بھی مستفید ہونیکا موقع ملتا مگر ہم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اختر صاحب نے دونوں شعر کے معنی و مفہوم اور زبان و محاورہ پر کافی غور نہیں فرمایا۔

خالی اشک اور اشک خون میں فرق ہے شعرا کے پاس عاشق کی آنکھ میں خون جمنے یعنی منجمد ہونے کا سبب کثرت گریہ ہے آنکھ میں آنسو فرط غم سے آتے ہیں جو اضطراب دلی اور غم جدائی کے شاہد ہیں۔ فقد محبوب یا فوت مطلوب کے باعث روتے روتے عاشق کی آنکھوں میں اشک خون آنے لگتے ہیں

جو بالآخر جم جاتے ہیں اور وہ بینائی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ غم ایک نفسیاتی کیفیت ہے جہاں مطلوب یا محبوب حاصل ہو۔ وہاں یہ حالت طاری نہیں ہوتی بلکہ مسرت محسوس ہوتی ہے غرض مسرت و غم دو متناقض جذبات حسّی ہیں ایک کا عدم دوسرے کے وجود کا باعث ہوتا ہے جب آنکھ میں آنسو نہیں آتے تو خون جم جانے کی آخر کوئی وجہ رونا اس وقت موقوف ہو سکتا ہے جب کہ مطلوب و محبوب حاصل اور غم زائل ہو۔ علت کا عدم اور معلول کا وجود کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اگر یہ معنی قرار دئے جائیں کہ کثرت گریہ کی وجہ آنکھوں میں اشکوں کا ذخیرہ کم ہو گیا اس لئے بعوض آنسو خون آرہا ہے تو ایسی حالت میں یہ ماننا پڑیگا کہ ذہن سامع میں فی الحقیقت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا جب تک وہ اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا اضافہ نہ کرے یہ مفہوم شعر سے پیدا نہیں ہوتا۔ ان دنوں اشکوں کے کم ہونے کے الفاظ سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ مطلوب حاصل ہو رہا ہے کیونکہ اشکوں کے قلت کی وجہ مذکور نہیں۔ اس تصریح کی روشنی میں ماہ لقا بائی کے شعر پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ آنکھ میں خون جمنے کی توجیہہ مہمل ہے۔ سوز کے شعر میں سبب اور مسبب دونوں موجود ہیں۔ آخری مصرع ہی پر اعتراض ہے اور اس کو غیر ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہی مصرع شعر کی جان ہے۔

چندا عشق میں ننگ سے مطلب ہے نہ ہے نام سے کام کچھ کہے کوئی سدا اپنے ہمیں کام سے کام

جامی بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

فرماتے ہیں۔ دونوں شعر کا فرق ظاہر ہے جامی کا شعر معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظریہ ہے جو بہت سوچ سمجھکر قایم کیا گیا ہے۔ چندا کے شعر میں جو سادگی اور بے ساختگی ہے وہ اس کو جامی کے شعر سے بلند کر رہی ہے" اس میں شک نہیں کہ چندہ کا شعر بھی صاف اور اچھا ہے مگر جامی کے فصیح و بلیغ شعر سے اس کو کیا نسبت ع وائے بر جان سخن گر بہ سخنداں نہ رسد۔ ظاہری معنی کے علاوہ حقائق و معارف کا رمز بھی اس میں پوشیدہ ہے جس کی صراحت کا یہاں موقع نہیں کہہ سکتے ہیں کہ چنداجی نے اسی شعر کے ظاہری مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر اصل مضمون پر کوئی ترقی نہ ہو سکی یہ بھی سرقات شعریہ کی ایک قسم ہے۔

نیرنگ قسمت

(جناب سراج فاطمہ صاحبہ)

سعیدہ ـــــ کون؟ وہی جو اپنی ماںباپ کی اکلوتی تھی۔ . . . . . ہاں! وہی نازوں کی پلی سعیدہ جس کے ہر قدم پر ماںباپ کی نگاہیں سو بار نثار ہوتی تھیں۔ خدا نے اس کو حسن بھی عطا کیا تھا۔ دھن دولت کی بھی کچھ کمی نہ تھی اور اس کی بے مثل طبیعت نے ان اوصاف کو چار چاند لگا دیے تھے وہ بیحد متین تھی۔ اس کی شرارتیں بھی تمیز کی تھیں اس نے بچپن سے کسی کا دل نہیں دکھایا اور سب ہی کی دعائیں لیں لیکن ـــــ اس کی قسمت بری تھی۔ . . . . . اس کی خوشی وراحت کے دن عارضی تھے کون جانتا تھا کہ ایسے خوشحال گھرانے کی ایسی باصفت لڑکی۔ اپنی نازوں کی پلی سخت مصیبتوں اور ناقابل برداشت صدموں کا ایکدم شکار ہو جائیگی۔

جب وہ چودہ ـــــ صرف چودہ برس کی کنواری تھی اس کے ماںباپ پلیگ ـــــ ہاں ـــــ مرگ ناگہاں کے نذر ہوگئے ان کے ساتھ ان کی ساری آرزوئیں بھی تہ خاک ہوگئیں۔

لڑکی کے چچا ـــــ یعنی ـــــ گردش زمانہ کے ایلچی ـــــ اور سعیدہ کی آئندہ دردناک زندگی ـــــ خوفناک گھڑیوں ـــــ اور دلخراش واقعات کے علم بردار ـــــ شیطان بہ شکل انسان مع اپنی بیوی کے بلائے آسمانی کی طرح سعیدہ کے مکان پر نازل ہوئے چکنی چپڑی باتوں سے کمسن ـــــ ناتجربہ کار ـــــ اور قسمت کی ماری سعیدہ کو سمجھایا منایا اور اس کو اپنے گھر لے آئے سعیدہ چلنے سے انکار کر دیتی لیکن اس کو اپنی چچی سے حقیقی محبت تھی اور جب چچی نے بھی بیحد اصرار کیا تو (اس نے اپنی بیکسی۔ تنہائی ومجبوری پر آنسو بہائے) ساتھ چلی گئی۔ آخر بیچاری کرہی کیا سکتی تھی۔

سعیدہ کا مکان کرایہ پر دیدیا گیا اور اس کی ساری جائداد کا انتظام چچا کے ذمہ ٹھیرا۔ چچی کا حسن سلوک سعیدہ سے ہمیشہ ہی اچھا تھا کیونکہ انہیں بھی سعیدہ سے دلی لگاؤ تھا ـــــ

اور کیوں نہ ہوتا جب سعیدہ خود بہت پیاری اور ہر دلعزیز لڑکی تھی۔ لیکن چچا صاحب ـــــ جو اس کو ہمیشہ حریص نگاہوں ـــــ انہی جادوبھری نگاہوں سے جن کا احساس بہت جلد گائے کو قصاب سے آنکھیں دوچار کرنے پر ہو جاتا ہے ـــــ دیکھا کرتے تھے اب اس کے نہ صرف گرویدہ تھے بلکہ زر خرید غلام۔ وہ کیا جانتی تھی کہ ان اخلاق اور خوشامد کے پردوں میں اس سے کج خلقی اور دشمنی کیجا رہی ہے۔ چچا کی اس مبالغہ آمیز محبت کا راز و مقصد صرف یہی تھا کہ سعیدہ کو اپنے لڑکے ریاض سے شادی کرنے پر راضی کرلیں اور اس طرح اس کی ساری جائداد اپنے قبضہ میں آجائے۔ لڑکا اگر پڑھا لکھا اور نیک چلن ہوتا تو اس حریص چچا کا طرز عمل کچھ زیادہ قابل اعتراض نہ ہوتا۔ گو اس کی حرص و خود غرضی کا داغ نہیں تو دھبہ ضرور رہجاتا۔ لیکن ریاض تو "پسر نوح با بداں بنشست" پکا شرابی و عیاش تھا۔

ایک رات کا واقعہ ہے جب سعیدہ کھانے سے فارغ ہوکر اپنی آرامگاہ میں بستر پر لیٹنا چاہتی تھی کہ ایکدم دروازہ کھلا اور وہ ساتھ ہی چونک سی گئی۔ دیکھتی کیا ہے کہ چچا اور چچی دونوں اپنی طرف آ رہے ہیں وہ پلنگ سے اوٹھ کھڑی ہوئی۔ چچا نے مسکراتے ہوئے نہایت نرم لہجہ میں کہا ـــــ

"بیٹی! اٹھو مت۔ ہم بھی وہیں بیٹھ جائیں گے۔"

"ہاں"، چچی نے بھی کہا "یہیں بیٹھ جاؤ۔"

اس مختصر گفتگو کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر چچی نے مسکراتے کہا ـــــ

"دیکھو سعیدہ! آج تمہارے چچا ایک اہم مسئلہ پر تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ذرا توجہ سے سننا۔ . . . . . . "

"ہاں بیٹی! میں ایک بات عرصہ سے تمہیں کہنا چاہتا تھا"، چچا نے رکتے رکتے کہا "لیکن بھائی مرحوم کا صدمہ تمہارے اور میرے دونوں کیلئے تازہ تھا۔ خیر وہ داغ تو کبھی مٹ ہی نہیں سکتا۔ مگر کارخانہ قدرت پر کب کسی کو اختیار حاصل ہے! . . . . . یہ تم جانتی ہو کہ بھائی صاحب کی

وفات کے بعد تمہاری شادی کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہے۔ بھائی مرحوم نے اپنی زندگی میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میری بہو بنوگی۔ اگر تمہیں ریاض پسند ہو تو میری اور مرحوم دونوں کی خوشی پوری ہوسکتی ہے۔ لیکن میں تمہیں ریاض سے بیاہ کرنے پر ہرگز مجبور نہیں کرتا۔ یہ تمہاری خوشی کا سودا ہے۔ اتنا کہکر وہ تو چلتے ہوئے۔ چچی نے کچھ تامل کے بعد اس طرح گفتگو شروع کی۔

سنو پیاری سعیدہ! میں سچ کہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہو اور تم جیسی پیاری بہو تو مجھ کو خواب وخیال میں بھی نصیب نہ ہوگی اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاض نے ذرا رنگیلی طبیعت ضرور پائی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم سے شادی ہونے پر وہ بالکل درست ہوجائیگا۔ خون تم دونوں کا ایک ہی ہے پھر کوئی وجہ نہیں جو وہ اس رنگ کا ہوجائے۔ کچھ نہیں۔ اس کو صحبت بری ملی ہے میں نے شروع ہی سے لاکھ بار تمہارے چچا سے کہا کہ لڑکے پر کافی نگرانی رکھیں سختی کریں۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور ضرورت سے زیادہ لڑکے کو آزادی دیدی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب میں اپنے گھر کو آباد اور اپنے لڑکے کو راہ راست پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ ممکن نہیں جب تک تم جیسی عقلمند لڑکی میرا ہاتھ نہ بٹائے۔ مجھے یقین ہے کہ جس دن ریاض نے اپنی ملاقاتیں دوستوں سے ترک کیں اس کی ساری برائیاں سمجھو حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ گئیں . . . . اس سے قبل میں نے جب کبھی ریاض سے اس کی شادی کے بارے میں تذکرہ کیا اس نے کبھی دل لگا کر میری باتیں نہ سنیں۔ لیکن پرسوں پھر شادی کی گفتگو چھیڑتے ہوئے تمہارا نام میں نے جو لیا تو وہ اچھل پڑا میرے قدموں پر اپنا سر رکھ کر اپنے قصوروں کی معافی چاہی اور وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ سے بُری صحبتوں کو ترک کردیگا۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے مجھ سے درخواست کی کہ اپنی محبت کا پیام تم تک پہنچا دوں۔ کہہ رہا تھا کہ تم سے اس کو صرف محبت ہی نہیں بلکہ وہ تمہاری پرستش کرتا ہے۔ اس نے بہت کچھ اور بھی کہا لیکن تم ہی کہو میں کہاں تک یاد رکھتی . . . . !

پیاری سعیدہ! تم اگر راضی ہوجاؤ تو اس کی زندگی بن جائے۔ صرف تمہارے "ہاں" یا

"نہ" پر اس کی قسمت ـــــ اس کی زندگی اور میری ارمانوں ـــــ میری خوشی کا دار و مدار ہے کہو! کہو! . . . . شرماؤ نہیں پیاری سعیدہ! . . . . . . میری ساری امیدیں اب صرف تم ہی سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ کہو میری بیٹی! جلد جواب دو۔"

سعیدہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو اس پر عشق و محبت کا اظہار کیا گیا۔ شرم و حجاب سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا ـــــ وہ حسن و حیا کی بہترین تصویر بنی ہوئی تھی۔ چچی نے جواب پر جب بہت اصرار کیا تو وہ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ چچی خوش ہو گئیں۔ ـــــ

"تو میں یہ سمجھوں کہ تم راضی ہو۔" ... "جیسی آپ کی مرضی" سعیدہ نے بہ مشکل الفاظ ادا کئے اور خاموش ہو گئی۔ چچی شاد ہو گئیں۔ یہ سمجھ کر کہ لڑکی بالکل راضی ہو گئی لیکن حقیقت میں سعیدہ کا یہ نہ تو اقرار تھا اور نہ انکار۔ سعیدہ کی شادی ریاض سے ہو گئی۔

تین چار ماہ ہر شب سعیدہ کے لئے گویا شب برات تھی اور ہر دن گویا عید۔ بسا اوقات سعیدہ کو اپنی بیاہی زندگی پر خود رشک آجاتا۔ حقیقت میں وہ بہت خوش تھی۔ لیکن ـــــ اس کی قسمت نے پھر کا پلٹا۔

اس کے چچا کا انتقال ہو گیا۔ اور تمام جائداد ریاض کے ہاتھ لگی۔ روپیہ کوڑیوں کی طرح خرچ ہونے لگا۔ دوستوں کی محفلیں پھر گرم ہونے لگیں۔ شراب کے دور پر دور چلنے لگے۔ بازاری حسن دفریب کے شیدا روشنی پر پروانوں کی طرح نثار ہونے لگے۔ اب ریاض دن تو کیا رات میں بھی شاید ہی کبھی مکان آجاتا . . . . اس کا سارا وقت ان ہی لغویات میں گزرنے لگا۔

سعیدہ ـــــ بیچاری سعیدہ رات رات بھر ریاض کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ پلک سے پلک نہ جھپکاتی۔ دسترخوان بچھتا اور اسی طرح رکھا رہتا۔ ریاض کبھی آجاتا تو کھالیتی ورنہ انتظار میں اس کی کئی راتیں بھوکے ہی گزرتیں۔

اب ریاض کا طرز عمل بیوی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ ـــــ اس کو سعیدہ سے نفرت ہو چلی تھی۔ وہ تو پھر اب بازاری حسن اور اداؤں کا دیوانہ ہو چکا تھا۔

ایک رات جب کہ قریب دو بجے وہ گھر لوٹا۔ بیوی کو اپنا منتظر پاکر پوچھنے لگا۔ ــــــ

"تم سوئی نہیں؟"

"آپ کا انتظار دیکھ رہی تھی۔"

"کھانا بھی نہیں کھایا؟"

"آپ کا انتظار رہتا!"

"خوب! انتظار کی تو ایک ہی رہی۔"

وہ ہنستا ہوا کھانے پر بیٹھ گیا۔

"آؤ کھانا کھالیں" اس نے بیوی سے نرم لہجہ میں کہا۔"

دونوں کھانے سے فارغ ہوئے۔ ریاض بستر پر جا لیٹا اور صرف یہ کہتے ہوئے۔

"آج تو سارے بدن میں درد ہو رہا ہے۔"

آنکھیں بند کرلیں وہ ساری رات بیٹھی اس کا جسم دبایا کی ــــــ دبایا کی۔

ریاض کی ماں سعیدہ سے بہت شرمندہ رہنے لگی تھی۔ ریاض کو زیادہ کہتی تو ڈر تھا کہ وہ کہیں خود اس کو گھر سے نہ نکال بیٹھے چپ تھی۔ سعیدہ کے ساتھ خود بھی صدمے اٹھا رہی تھی۔ صبر کئے جا رہی تھی۔

ریاض کی دولتمندی تھوڑے ہی عرصہ میں غربت میں تبدیل ہوگئی دوستوں کی محفلیں جو دن رات گرم رہا کرتی تھیں ایکدم خاموش ہوگئیں۔ شراب کی بوتک باقی نہ رہی صرف بہت سی خالی بوتلیں رہ گئیں۔ لیکن ــــــ ریاض کے سر میں ابھی بازاری حسن کا جنون باقی تھا۔ پہلے کی طرح مکان بہت رات چڑھے لوٹا کرتا۔ مگر کبھی اپنی اصلاح کا خیال نہ آتا۔ ایک روز حسب معمول پھر بازار حسن میں پہنچا۔

"کیوں۔ آج بھی تم نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا؟" ایک بازاری عورت نے خفگی سے پوچھا۔

"میرے پاس ابھی روپیہ نہیں آیا۔ جلد کوئی صورت نکل آئیگی میں تمہاری پائی پائی ادا کر دوں گا۔" ریاض نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جبھی آنا۔"

لیکن مجھے تم سے محبت ہے۔ سچا عشق! . . . . . کچھ تو رحم کرو" ریاض نے بیحد مایوسی سے کہا۔ ہم کسی سے عشق وشق کرتے تو ہیں نہیں۔ پھر تمہاری اس بکو اس سے حاصل؟ جاؤ! یہاں سے دُور ہو" بازاری عورت نے جھڑک کر کہا۔ ریاض غصہ کو پی نہ سکا۔ ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اس پر دے مارے لیکن کسی نے پیچھے سے اس کی گردن پکڑی اور وہ آن واحد میں کمرہ سے باہر دھکیل دیا گیا۔

ریاض کی صدمہ سے اس وقت عجب حالت تھی دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیری ہوتی جاتی تھی۔ نہ معلوم وہ کہاں تھا اور کیا کرتا رہا۔ لیکن رات کے قریب تین بجے وہ اپنے گھر آیا۔

بیوی آج سوگئی تھی ——— بیچاری سعیدہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی ریاض اس کے قدموں پر گر پڑا۔ اور بچہ کی طرح گڑ گڑا کر رونے لگا۔

سعیدہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دیکھتی کیا ہے کہ ریاض اوس کے قدموں پر پڑا ہے وہ اس منظر کو دیکھ نہ سکی اور فوراً کرسی سے اٹھا ہی چاہتی تھی کہ ریاض نے اپنا سر اُس کے قدموں سے اونچا کیا۔ اور اس کو پھر کرسی پر بٹھا دیا "تم مجھے معاف کردو۔ للہ معاف کردو۔ میں تمہارا گنہگار ہوں تمہیں بیحد رنج میں نے پہنچایا ہے" ریاض کی آنکھیں اشکوں کی لڑیاں بنگئی تھیں۔

سعیدہ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں لیکن فرط مسرت سے خفیف سی مسکراہٹ اس کے پتلے سرخ ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ بڑھائے اور ریاض کے گلہ میں ڈال دئے۔

سعیدہ کی باقی زندگی بھی عزبت و افلاس ہی میں گذری لیکن ——— وہ خوش تھی۔

. . . . ریاض اس کو چاہتا تھا۔

یورپ کے مُصنف اور ہمارے موٴلف کی سرگشت

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

یورپ اور ہندوستان کا مقابلہ دشوار ترین امر ہے وہاں کی علمی اور تمدنی ترقی، تجارتی فروغ،
دولت کی فراوانی، ہر حیثیت کو تفوق حاصل ہے اسی طرح ہمارا مصنف یورپ کے مصنف کا مقابلہ
نہیں کرسکتا، اگر یہاں مختصر طور پر ان کی حالت کو پیش کیا جائے تو اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ
ان کے لئے کیا آسانیاں ہیں اور ہمارے لئے کن دشواریوں کا سامنا ہے۔

یورپ کا مصنف صبح آفتاب نکلنے پر نیند سے بیدار ہوتا ہے شیونگ کرکے منہ ہاتھ دھوکر جب
ناشتہ کے لئے آتا ہے توبی بی کو ناشتہ پر منتظر پاتا ہے۔ دوران ناشتہ میں اخبار کا بھی مطالعہ ہوتا ہے
اور بی بی سے ہنسی مذاق بھی جاری ہے۔ آدھ پون گھنٹہ میں ناشتہ سے فارغ ہوتا ہے۔ ناشتہ کے بعد
اپنے مطالعہ کے کمرہ میں چلا جاتا ہے ایک بجے تک مطالعہ اور تصنیف میں مصروف رہتا ہے ایک بجے
کھانے کے لئے پھر کھانے کے کمرہ میں آتا ہے دو بجے سے پھر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ سہ پہر میں
چاء سے فارغ ہوکر تفریح کی تیاری ہوتی ہے۔ میاں بی بی تفریح کیلئے چل دیتے ہیں۔ رات کو سات
آٹھ بجے ڈنر سے فارغ ہوکر اخبار بینی ہنسی مذاق میں مصروف رہنا اور رات کے دس گیارہ بجے
سو جاتا ہے۔

ہفتہ کے سات دن کے منجملہ چھ دن اور کبھی پانچ دن اس طرح محنت ومشقت سے کام کرنے کے
بعد یکشنبہ کے دن صبح سویرے میاں بی بی اور اگر اولاد ہو (مگر خیال رہے ایک دو سے زیادہ نہ ہونگے)
تو مع اولاد ساحل سمندر، جنگل یا باغ وغیرہ کو چلے جاتے ہیں اور تمام دن جنگل میں منگل مناکر اپنی
محنت ومشقت کو آرام و راحت میں تبدیل کرکے پھر چھ دن مستعدی سے کام کرنے کے لئے تیار ہو
جاتا ہے۔ اگر کبھی کسی کتاب کی ضرورت داخلہ وغیرہ کے لئے ہو تو صبح کے آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے
تک کسی وقت بھی برٹش میوزیم وغیرہ چلا گیا، کتاب کی خواہش کی دس منٹ کے اندر کتاب آگئی استفادہ کرلیا۔

اس طرح ہفتہ دو ہفتے۔مہینہ دو مہینے میں تصنیف وتالیف کا مسودہ مکمل ہوگیا اب اس م
صاف کرنے کے لئے کسی ٹائپ خانہ کو روانہ کردیا۔ دوتین پونڈ میں مسودہ ٹائپ ہو کر آگیا۔ ا
مسودہ کسی پبلیشر کمپنی کو ارسال ہوگیا۔ وہاں کے منتظمین نے اس کا مطالعہ کیا۔ قیمت کا تع
اور اس سے مصنف کو مطلع کردیا گیا۔ مصنف نے اپنی رضا مندی ظاہر کی چلو سودا ہوگیا، سو
چار، پانچ سو، بلکہ ہزار دو ہزار یا اس سے زیادہ پونڈ کا چک مصنف کے نام آگیا۔ اس طر
کی محنت کا ثمرہ مل گیا، اور وہ دوسری تصنیف میں مصروف ہوگیا۔

پبلیشر نے اس مسودہ کو کسی پریس میں دیدیا۔ وہاں طباعت کا کام تصحیح کا مرحلہ، فہ
اور انڈیکس کی ترتیب سب کچھ ہوگئی اور کتاب تیار ہوکر دوتین ہفتہ میں پبلیشر کے پاس
پبلیشر کی جانب سے اشتہار ہوگیا۔ اخبارات میں ریویو کے لئے کتاب دیدی گئی۔ ریویو ہو
کتاب کی قدر وقیمت اس کے نفس مضمون کی پوری تفصیل آگئی۔ کتب فروشوں نے صدہا نسخ
آرڈر پبلیشر کے پاس بھیجدیا۔ کتاب کے پانچ چھ، دس بیس ہزار بلکہ لاکھوں نسخے چار چھ ماہ
ختم ہوگئے۔

اب پھر اس کے دوسرے ایڈیشن کے لئے پبلیشر نے مصنف کو اطلاع دی۔ بعد ترمیم واض
دوسری طباعت کا معاہدہ ہوگیا۔ یہ ہے مختصر روئداد یورپ کے مصنف کی۔

اب ہمارے مولف کی حالت پر غور کرو۔ وہ صبح ہی بیدار ہوا۔ منہ ہاتھ دھوکر لکھنے کے
بیٹھا۔ دو چار سطر لکھے تھے کہ صاحبزادی بیدار ہوکر رونے لگیں۔ بی بی نے آواز دی۔ لڑکی کو ا
وہ چیخ رہی ہے اور تمہارے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ ایسے لکھنے پڑھنے پر خدا کی مار! ! حکم
تعمیل میں ہمارے مولف صاحب قلم میز پر رکھ اپنے آپ بڑ بڑاتے ہوئے صاحبزادی کو ا
ہیں۔ آیا کے آنے پر ان کو نجات ملتی ہے (اگر اس کی مقدرت ہو تو) میز کرسی پر پہنچ کر خیالات
مجتمع کرکے لکھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ دو چار سطریں لکھی تھیں کہ اطلاع ملی اصلاح ساز حاضر ہے سو
چھوڑ داڑھی صاف کرانے چلے جاتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہاں سے فرصت ملی اب

لکھنے کیلئے تیار نہیں ہوئے تھے کہ اطلاع ہوئی ناشتہ تیار ہے۔ اگر ناشتہ کیلئے جانے میں کسی قدر دیری ہوگئی تو صاحبزادی سر پر سوار ہونگیں۔ آخر لکھنے کو ملتوی کرکے ان کے ساتھ چلتے بنتے ہیں۔ ناشتہ کے بعد کبھی دو چار سطر لکھنے کا موقع ملتا ہے کبھی کوئی دوست وغیرہ آجا ئیں کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ کہیں جانے کا ہو جاتا ہے ورنہ ساڑھے آٹھ بجے ہی چلنے کی تیاری کرنی ہوتی ہے لڑکے کو مدرسہ لیجانے کے لئے نو بجے کے پہلے روانگی ضروری ہوتی ہے۔

دفتر میں چار بجے تک مصروف رہنے اور وہاں کے آلام اور مصائب سے دو چار ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ غریب مولف کے لئے روزی کا ذریعہ سوا ملازمت کوئی اور نہیں ہوتا۔ ایسے نصیب کہاں کہ وہ اپنے تالیفات سے قوت بسری حاصل کرسکے۔ کیونکہ یہ انگلستان یا یورپ نہیں ہے۔

دفتر سے واپسی کے بعد دماغ کو آرام دینے اور دل بہلائی کے لئے کہیں تفریح یا دوست احباب کے ملاقات کی کوشش میں کبھی تو کامیابی ہوتی ہے اور کبھی ناگزیر اسباب کی بناء پر گھر میں بسر ہوجاتی ہے۔ اس طرح ہفتہ کے سات دن گذرتے ہیں اس عرصہ میں تالیف یا مضمون کے ایک دو صفحے بمشکل ختم ہوتے ہیں۔ سال چھ ماہ بلکہ کبھی اس سے زیادہ مدت میں کتاب تمام ہوتی ہے اس کیساتھ ایک اور بھی مشکل ہے داخلہ اور مواد کیلئے کسی کتاب کی ضرورت ہو تو کتب خانہ کے اوقات اس کے تعطیل اور غیر تعطیل سے واقف رہنے کی شدید ضرورت ہے۔ اپنی فرصت اور کتبخانہ کے اوقات کا جمع ہونا ضروری ہے جب کہیں کتب خانہ کی زیارت ہوسکتی ہے مگر اس کے بعد بھی کافی انتظار لازمی ہے تاکہ کتاب دستیاب ہو۔ ورنہ اکثر اس میں بھی ناکامی ہوتی ہے اور نامراد واپس ہونا پڑتا ہے۔

مسودہ کو صاف کرنے کے لئے عرصہ درکار ہے اس کے بعد بیچارے مولف صاحب کو مطابع کی خبر لینی ہوتی ہے۔ نرخ دریافت کرنے اور اخراجات کا اندازہ کرنے میں ہفتہ عشرہ ہوجاتا ہے۔ اب فراہمی رقم کی دشواری پیش آتی ہے۔

سب سے زیادہ اہم اور سخت ترین مرحلہ یہی ہوتی ہے اکثر و بیشتر سودی قرضہ سے اس کا انتظام ہوتا ہے۔ اب تالیف کی کتابت شروع ہوجاتی ہے۔ مولف صاحب ہی کا کام ہے کہ کاپی کی صحت کریں۔

اس کے بعد پروف کی اصلاح کیجائے مگر اس کے باوجود سنگساز اپنی مہربانی سے کچھ نہ کچھ اضافہ اور ترمیم کر دیتے ہیں کتاب کے ختم ہونے پر فہرست اور اشاریہ کا مرتب کرنا بھی مولف کے ذمہ ہے۔

یہ سب مراحل طے ہو کر دو چار کبھی چھ ماہ میں کتاب پریس سے نکل آتی ہے اب غریب مولف کو چند اور زحمتیں پیش آتی ہیں۔

دوست احباب جو سینما وغیرہ میں بیسیوں روپیے صرف کرتے ہیں مگر ان کو یہ گوارا نہیں کہ ڈھائی روپیہ میں اپنے دوست کی کتاب خریدیں۔ البتہ اگر کتاب نہ ملے تو گلہ ضرور ہوگا۔ اس طرح مولف کی ۱/۴ کتابیں ختم ہو جاتی ہیں اخبارات کیلئے ریویو کو کتابیں دی گئی تھیں مگر انہوں نے دو چار ہفتے بلکہ اس سے زیادہ مدت کے بعد بھی ریویو کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی اب مولف کو اڈیٹر صاحبوں کو متوجہ کرنے کیلئے کئی مرتبہ ان کے دفتر کی زیارت کرنی ہوتی ہے اس کے بعد کہیں ریویو ہوتا ہے مگر افسوس اکثر ریویو ایسا ہوتا ہے اس سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے نفس مضمون کی پوری اطلاع ہوتی ہے۔ البتہ اس کی خامیاں ضرور بتلائی جاتی ہیں۔

اس کے بعد کتابوں کی نکاسی کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ اخبارات میں اشتہار دینا اس کا مسودہ اور اخراجات مولف ہی کے ذمہ ہیں۔ اس کے باوجود نکاسی نہیں ہوتی۔ اب کتب فروش اصحاب کی خدمت میں پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پچیس تیس بلکہ اکثر چالیس فیصد کمیشن پر معاملہ کا تصفیہ ہوتا ہے اور کتابیں فروخت کیلئے لیلی جاتی ہیں مگر مہینوں بلکہ برسوں حساب کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس طرح مولف کو ایک کوڑی مہینوں کے بعد بھی نہیں ملتی بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کتب فروش اپنی دکان برخواست کر دیتے اور مولف کی امانتی کتابیں اپنے ذاتی مال کی طرح دوسرے کتب فروشوں کو اپنے باقیماندہ حساب میں دیدی جاتی ہیں۔

جب اس طرح کتابوں کی قیمت وصول نہیں ہوتی اور سودی قرضہ کے ادائی کی سبیل نہیں ہوتی بلکہ سود میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو بدرجہ مجبوری مختلف جگہ پیروی شروع ہوتی ہے۔

جب ہمارے مولف کی یہ حالت ہے تو بھلا یورپ کے مصنفین سے کیا نسبت دیجا سکتی ہے

پرستش خاموش

ثریا

نہیں تاب ضبط مجھ کو تمہیں آنکھ بھر کے دیکھوں یہ ہے خوف کھل نہ جائے کہیں راز دلنوازی

میں حیران ہوں —— متعجب ہوں —— پریشان ہوں۔ —— کہ سبھوں نے یہ کیسے تصور کرلیا کہ میں تمہیں پوجتی ہوں —— پیار کرتی ہوں —— چاہتی ہوں —— جب کبھی تم آتے ہو —— کرم کرتے ہو —— تو میں کھنچی کھنچی رہتی ہوں —— اور کبھی نظر بھر کر تمہیں دیکھتی بھی نہیں —— اس ڈر سے کہ میری آنکھیں الفت کا راز افشاء کر دینگی۔ —— تم سے باتیں نہیں کرتی —— اگر کبھی کوئی بات کی بھی تو —— شرمائی ہوئی —— لجائی ہوئی —— اجنبیوں کی سی —— سب تمہاری تعریف کرتے ہیں —— مدح کرتے ہیں —— ثنا کرتے ہیں —— تمہاری بہادری کے افسانے سناتے ہیں —— تمہارے حسن کے تذکرے کرتے ہیں —— میں سنتی ہوں۔ —— خوش ہوتی ہوں —— مسرت ہوتی ہے —— لیکن —— زبان ہلا نہیں سکتی —— بلکہ انجان بنتی ہوں —— بیزاری ظاہر کرتی ہوں —— تیوروں پر مصنوعی بل ڈال لیتی ہوں —— تو —— کیا میری آنکھیں میرا راز افشاء کر دیتی ہیں؟ —— مجھے بدنام کرتی ہیں —— رسوا کرتی ہیں —— کہنے والوں کو کہہ لینے دو —— میری چاہت کا چرچا کرنے والوں کو کرنے دو —— میں تمہاری سیوا کروں گی —— اور ضرور کروں گی۔ ؎

چوری نہیں کسی کی مزاحم نہیں کوئی جو کچھ ہوا وہ خوب ہوا برملا ہوا۔

جنگلی گلاب

(جناب شیخ حسین صاحب بی۔ اے)

جامن کے درخت کے قریب آتے ہی یک لخت کملا رک گئی کیونکہ درخت کے سایہ میں ایک شخص لیٹا ہوا تھا جو کملا کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ بدن پر ایک میلا کرتا تھا۔ گھٹنوں تک ایک پرانا تہ بند چہرہ پر جھریاں۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ بال بکھرے ہوئے کپڑے مٹی میں لت پت تھے جسم اتنا لاغر تھا کہ سینہ کی موٹی موٹی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کئی دن سے فاقہ کاٹ رہا ہے یا فاتر العقل ہو گیا ہے جس کی وجہ اس کو اپنے بدن کی آرائش کا خیال تک نہیں۔ کملا نے خیال کیا کہ یہ کوئی دیوانہ ہے غالباً کچھ مانگنے کے لئے کھڑا ہے اس نے اپنا پرس کھول کر جس کو وہ اپنے بائیں ہاتھ میں لٹکائے ہوئے تھی دو پیسے اس کی طرف ڈال دئے اس نے پیسوں کی طرف دیکھا تک نہیں۔ صرف کملا کو گھورے جا رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھل رہے تھے لبوں پر ایک انوکھی مسکراہٹ تھی۔ کملا کو ذرا خوف محسوس ہوا۔ جلد جلد قدم بڑھانے لگی۔ گھر پہنچی۔ دروازہ بند کیا۔ کھڑکی میں آ کھڑی ہو گئی۔

دیوانہ بھی آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ کھڑکی سے کچھ فاصلہ پر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے لبوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔ پھر ذرا تامل کیا اور ایک طرف چلا گیا۔

کملا مدرسہ نسوان کی صدر معلمہ تھی۔ بیس پچیس کا سن تھا۔ بہت ہی حسین تھی۔ گھنگر یالے لمبے لمبے بال۔ بڑی بڑی سیاہ کسی قدر نیلی آنکھیں۔ دیکھنے والے کو مسحور کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سارے اس کے خواہاں تھے لیکن اس نے ان سب کو اس وجہ سے انکار کیا کہ ان میں کوئی بھی اس کا رفیق حیات ہونے کی قابلیت نہ رکھتا تھا۔ مدرسہ کے قریب ہی ایک چھوٹا سا نفیس مکان کرایہ پر لیکر رہا کرتی تھی۔ مکان میں صرف وہ اور اس کی خادمہ۔

شام ہو رہی تھی۔ مدرسہ کی لڑکیاں کتابیں بغلوں میں لئے ہوئی اپنے اپنے مکانوں کو واپس ہو رہی تھیں۔ کملا باہر نکلی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے گھر پہنچی۔ کپڑے بدلے۔ کھڑکی کے پاس آئینہ والے میز کے قریب گئی وہ اپنے بالوں میں کنگی کرنا چاہتی تھی چونک پڑی میز پر ایک گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ اٹھا کر دیکھا جنگلی گلاب تھے۔ خیال کیا شاید خادمہ نے خریدا ہے۔ پوچھا "ماما یہ پھول یہاں کیسے ؟" ماما کی بیوقوفی پر اسے ہنسی آ رہی تھی۔ رنگ نہ بو۔ جنگلی گلاب۔ خادمہ اس سے لاعلم تھی۔ بولی "بی بی۔ میں کیا جانوں؟" "پھر یہ کیسے آئے ؟" کملا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ بال کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ سوچ رہی تھی۔ آخر یہ آئے کہاں سے۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ایک کالج کا لڑکا میرے پیچھے بار بار آیا کرتا تھا انہیں کو ایسے حرکات سوجھا کرتے ہیں۔ خادمہ نے چار لاکر میز پر رکھدی۔ اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔

اتوار کا دن تھا۔ مدرسہ کو تعطیل تھی۔ کملا پلنگ پر لیٹی ہوئی ایک رسالہ کی ورق گردانی کر رہی تھی بدن پر نیم آستین۔ کاسنی رنگ کی ساڑی زیب تن تھی۔ بالوں کے جوڑے میں روپہلی پن لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کاجل سی رات میں آسمان پر تارے چمک رہے ہوں۔ رسالہ پر سایہ سا نظر آنے لگا۔ کھڑکی کی طرف دیکھا تو کوئی ہاتھ دریچہ میں سے میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ کملا نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا بند کہ سامنے والے کو یہ معلوم ہو کہ وہ سو رہی ہے مگر آنکھوں سے سب چیز دکھائی دے۔ ساتھ ہی ایک مجسمہ کھڑکی میں نمودار ہوا۔ کملا جھٹ اٹھ کھڑی ہو گئی۔ دیکھا تو وہی دیوانہ تھا۔ اس نے گلدستہ میز پر رکھدیا اور دور جا کھڑا ہو گیا اور مسکرا رہا تھا۔ کملا اس کو دیکھ کر لال پیلی ہو گئی بولی "دیوانے یہ کیسی حرکت ہے ؟ پھر خیال کیا۔ شائد کسی نے اس دیوانہ کو اپنا ذریعہ نہ بنایا ہو۔ اگر پھر کبھی تو دکھائی دیگا تو سخت سزا دوں گی۔"

دیوانہ اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کی گہری گہری سیاہ آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ کملا نے

جھٹ کھڑکی بند کرلی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔
موسمی تعطیلات کے ساتھ کملا کے تبادلہ کے احکام وصول ہوئے۔ مدرسہ کی تمام معلمات نے ودائی تقریب میں ایک گارڈن پارٹی مقرر کی۔ پہاڑی کے قریب آموں کے باغ میں جھولے ڈالے گئے صبح سے باغ میں سب جمع ہوئے چند جھولے جھول رہی تھیں اور چند چٹانوں کی طرف جانکلیں ایک معلمہ دوڑی ہوئی آئی اور کملا کو چٹانوں کی طرف بلالیگئی دیکھا تو دیوانہ چٹان کے دامن میں بیٹھا ہوا کوئلہ سے پتھر پر کچھ لکیریں کھینچ رہا ہے۔ دو چار عورتیں اور جمع ہوگئیں دیوانہ کی اس حرکت پر ان کو ہنسی آئی۔ دیوانہ نے مڑکر دیکھا اور لیلا لیلا کہتا ہوا کملا کی طرف لپکا۔ سب کی سب گھبرا کر دوڑنے لگیں۔ دیوانہ بھی ایک طرف چلا گیا۔ تمام عورتیں پھر چٹان کے قریب آئیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ کہ دیوانہ نے وہاں کیا لکھا ہے چٹان پر کچھ لکیریں تھیں۔ غور سے دیکھا تو ایک تصویر سی معلوم ہونے لگی جو ادھوری رہگئی تھی۔ چٹان کے پاس ایک قلمی تصویر رکھی ہوئی تھی تصویر ہوبہو کملا کی سی تھی۔ سب متحیر تھے اور کملا بھی ایک عورت نے ذرا غور سے تصویر کو دیکھا اور کملا کے چہرہ کو بھی۔ پھر بولی یہ کملا کی تصویر نہیں ہے۔ تصویر کے رخساروں پر خال ہے لیکن کملا کے رخساروں پر نہیں۔ آنکھوں میں بھی کسی قدر فرق پایا جاتا ہے۔ تصویر کے نیچے لیلا لکھا ہوا تھا۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ مویشی چراگاہوں سے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے کملا دہلیز میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ رہ رہکر گذشتہ واقعات کا خیال آتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نو وارد کو شام کی مدھم روشنی میں شہر کے درودیوار مدھم دکھائی دیتے ہوں
ایک ضعیفہ اور ایک لڑکی کملا کے قریب آکر کھڑے ہوگئے
لڑکی کو دیکھکر کملا متوجہ ہوئی اور ان دونوں کو مکان میں بلالیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
ضعیفہ نے کہا " بی بی یہ لڑکی میرے بیٹے کی اولاد ہے آپ ہی کے مدرسہ میں تعلیم پارہی ہے۔
ہاں ہاں۔ یہ میں بھی جانتی ہوں۔ بہت ہی ذہین لڑکی ہے۔ اب یہاں کیسے آنا ہوا "

"بی بی کیا کہوں" ضعیفہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے بدن میں رعشہ تھا۔
"اس کی ماں کو انتقال کئے ہوئے چھ مہینے ہو گئے ۔بعینہ آپ ہی کا سا ناک نقشہ تھا۔یہی سیاہ آنکھیں۔ بھرے بھرے رخسار۔ اور کھڑا چہرہ۔ بالوں کا سنگار بھی آپ ہی کا سا تھا"

کملا مسکرانے لگی۔ بڑھیا کی باتوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ بولی "اس کا باپ تو زندہ ہے نا"

"ہاں زندہ ہے۔ نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ افسوس اس دن سے جب سے کہ اوس کی بیوی نے انتقال کیا ہے وہ دیوانہ ہو گیا ہے وہ اپنی بیوی پر بہت فریفتہ تھا وہ ہمیشہ اس کی دلجوئی کیا کرتا تھا۔ وہ مصور تھا۔ اپنی بیوی کی تصویر کھینچتا اور شام سے پہلے اپنے ہاتھوں سے اس کی چوٹی میں پھول ڈالا کرتا تھا۔ مکان میں اسی غرض سے ایک جنگلی گلاب کا پودا پال رکھا ہے تاکہ اس کے پھول ضرورت پر کام آئیں اس کے انتقال کے بعد سے وہ گھر آنا ترک کر دیا۔ وہ دیوانہ وار پھر رہا ہے" کملا کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک نظر آنے لگی۔ اس کا سینہ ابھر رہا تھا پسینہ کے موٹے موٹے قطرے پیشانی پر جمع ہو گئے۔

" میں بوڑھی ہو گئی ہوں زندگی کی آخری ساعتیں کاٹ رہی ہوں۔ رنج اس بات کا ہے کہ میرے بعد اس لڑکی کا حشر کیا ہو گا آپ کی خدمت میں اتنا عرض کرنے حاضر ہوئی تھی کہ اس لڑکی کو آپ اپنے پاس رکھیں۔ بڑی ہونے کے بعد کسی سے بیاہ دیں۔ اس دنیا میں اب میرا کوئی نہیں رہا"

کملا ضعیفہ کی باتوں کو سن رہی تھی اس کا دماغ معطل ہو رہا تھا اور ذہن گذشتہ واقعات کی طرف عود کر رہا تھا۔ کہنے لگی "میں اس کو ضرور اپنے پاس رکھوں گی" اور اپنی لڑکی کی طرح پرورش کرونگی۔ جنگلی گلاب کا پودا بھی مکان میں ہو گا۔ اس کو بھی میرے پاس بھیجدو۔ اس کو بھی اپنے ساتھ رکھوں گی۔

صبح ہوئی کملا سفر کی تیاریاں کر رہی تھی دور سے دیوانہ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اشارہ سے قریب بلایا اپنا اوور کوٹ اس کو دیا۔ اور ایک روپیہ کے پیسے ہاتھ میں رکھدئے۔ دیوانہ نے ایک قہقہہ مارا۔ اور اچھلتا کودتا شاہ راہ کی طرف کھڑا ہو گیا۔ موٹریں آ جا رہی تھیں۔ دیوانہ پیسے گن رہا تھا۔ کرارسی آواز آئی جیسے کہ پہیئے گھسیٹے جا رہے ہوں۔ کسی نے پکار کر کہا " ٹھیرو۔ ٹھیرو۔ کوئی دیوانہ موٹر کے جھپٹ میں

گیا ہے۔

لڑکی جنگلی گلاب کا پودا لئے ہوئے کملا کے پاس آئی۔ کملانے اس کو جھٹ اپنی گود میں اٹھا لیا اور
پٹ گئی۔ کملا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے لڑکی کے کندھوں پر گرنے لگے۔

نقد و تبصرہ

آئینہ ادب ماہوار } مدیر مونس احمد صاحب سلطان پورہ حیدرآباد دکن چندہ سالانہ للعہ حجم ۴۷ صفحات
نہ شائع ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے تین نمبر نکل چکے ہیں۔ مسائل اردو پر بھی مضامین ہیں جس سے بہت
م کی باتیں معلوم ہو رہی ہیں اس عرصہ میں اچھے قلمی معاونین پیدا کر لئے ہیں پہلے اور دوسرے نمبر میں
ہور انشا پرداز مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے دو مضمون نکل چکے ہیں۔ خمریات ریاض۔ قاضی تلمذ حسین صاحب
۔ اسے مستقل طور پر لکھ رہے ہیں۔ آخر میں چند اوراق طرحی غزلوں کیلئے وقف ہیں۔ لکھوائی چھپوائی
مذ بہت ہی اچھا ہے۔

زہرا } مصری شاہ لاہور سالانہ چندہ دو روپیہ۔ ش۔ا۔ شمیم جالندھری کے
۔ ادارۃ شائع ہو رہا ہے۔ شمیم صاحبہ ہندوستان کی مشہور لکھنے والیوں سے ہیں ایک عرصہ تک
ن میں مقیم رہکر اب ہندوستان سے اپنے طبقہ کی اصلاح اور سنوار کے لئے اس کو جاری کیا ہے
جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں وہ طبقہ نسواں کیلئے مفید اور کارآمد ہیں۔ پرچہ کی رفتار حوصلہ افزا
مستقبل قریب میں یہ اپنی جگہ آپ پیدا کر لیگا۔

رخیال مصنفہ ج نقوی صاحب بی اے کے دہ مضامین کا نفیس مجموعہ ہے جس کی نسبت انجمارات
اشش کی ہے۔ قیمت (عالہ) دفتر شہاب بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن۔

بزم کہکشاں

(ث)

سناتے ہیں انہیں افسانۂ قیس — طریقے ہیں یہ عرض مدعا کے — حسرت موہانی

فسانہ سن کے میری زندگی کا — قیامت تھا کسی کا مسکرانا — سعادت

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے — آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے — یاس عظیم آبادی

تری موجودگی کا مجھ پہ ہوتا ہے اثر اتنا — کہ اپنے آپ کو کھویا ہوا محسوس کرتا ہوں — جوش ملیح آبادی

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے — تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے — حفیظ جالندھری

مری داستان فراق نے شب وصل طرفہ مزا دیا — کبھی میں نے رو کے ہنسا دیا کبھی اس نے ہنس کے رلا دیا — جلال

بھولے بنکر حال نہ پوچھو اشک بہیں تو بہنے دو — جس سے بڑھے بےچینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو — آرزو

دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم — میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں — شاد عظیم آبادی

میں جو غمگین ہوا بلا سے ہوا — تم تو خوش ہو گئے ستا کے مجھے — ناشاد

ہوں جادۂ ناکامی الفت میں سبک گام — شاید کبھی اس راہ سے امید گزر جائے — نازش بدایونی

نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا — رلا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے — نظم طباطبائی

تھپیڑے کھا کے پلٹی ہے کشتی امید — نہ ہاتھ آتا ہے ساحل نہ ڈوبتا ہوں میں — راز

ڈرایا اس قدر طوفان بحر زندگانی نے — کہ ہم ساحل کو بھی موج لب ساحل سمجھتے ہیں — جلیل قدوائی

بڑھتی ہیں امواج حوادث جتنا انساں ڈرتا ہے — میں نے اک بیخوف ہنسی میں غرق کیا طوفانوں کو — رسا

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا — غالب

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی — اقبال

ہر صبح ہوئی شام کو اک خواب فراموش — دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی — یاس عظیم آبادی

مرسلۂ میر عزیز الحق شاکر

مغالطہ

جناب سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی

بسلسلۂ گذشتہ

(۷)

دوسرا ایکٹ پہلا سین

(لیلا کا کمرہ - اخبار پڑھ رہی ہے قیصر داخل ہوتا ہے)

قیصر - میں ـــــ میں حاضر ہو سکتا ہوں -

لیلا - (اخبار سے نظر اٹھا کر کپڑے درست کرتے ہوئے) آیئے -

قیصر - آداب عرض ہے -

لیلا تسلیمات (قیصر کھڑا رہتا ہے) تشریف رکھئے -

(قیصر بیٹھ جاتا ہے معنی خیز نگاہوں سے لیلا کی طرف دیکھتا ہے لیلا بھی رہ رہ کر قیصر پر نگاہ غلط انداز ڈالتی ہے پھر اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتی ہے - بظاہر اس کی نظریں اخبار پر ہیں لیکن گوشہ چشم قیصر کی طرف - تھوڑی دیر سکوت - قیصر کچھ پریشان اور سراسیمہ)

لیلا (بلند آواز سے اخبار پڑھتی ہے) پونا کالج کے ایک لڑکے کی خودکشی کا سنسنی خیز سانحہ - کل پونا کالج کے ایک لڑکے نے خودکشی کر لی - صفدر بی - اے میں تعلیم پا رہا تھا اور ایک شریف خاندان کا چشم و چراغ تھا - مسموع ہوا کہ اس کو کالج کی ایک لڑکی پروین سے عشق تھا - کئی موقع پر اس نے اظہار عشق کیا اور شادی کی خواہش کی لیکن لڑکی نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا - اس نا امیدی کے بعد ہی اس نے پوٹاشیم سائنائڈ کھا لی -

(اخبار اٹھا کر) قیصر صاحب یہی ہے نا آپ کا اسم شریف -

قیصر (دفعتاً چونک کر) جی - جی ہاں مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں -

لیلا - تو سنا آپ نے بیوقوفی کا نتیجہ

قیصر - بیوقوفی ؟

لیلا - جی ہاں - بیوقوفی - کیونکہ عشق کا دوسرا نام بیوقوفی ہے آپ نے وہ تو سنا ہی ہوگا - ع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

قیصر۔ مگر

لیلا۔ مگر کیا؟

قیصر۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں عشق سے بوالہوسی مراد ہے۔

لیلا۔ یہاں کیا ہر جگہ عشق سے مراد۔ بوالہوسی اور بوالہوسی بیوقوفی کے مرادف۔

قیصر۔ لیکن عشق صادق کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

لیلا۔ یہ عشق صادق اور عشق کاذب کی بھی ایک ہی رہی۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ عشق صرف ایک ہی قسم کا ہوتا ہے اور اسی کو دوسرے الفاظ میں بوالہوسی اور بیوقوفی کہتے ہیں۔ ہر شریف آدمی کا فی زمانہ یہی خیال ہے تعجب ہے کہ آپ کو اس بارے میں اختلاف ہے۔

قیصر۔ بات یہ ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ لوگوں نے آج کل عشق کو بدنام بہت کیا ہے۔

لیلا۔ اچھا۔ لوگوں نے عشق کو بدنام کیا ہے؟ کیا خوب؟ میں تو یہ سمجھ رہی ہوں کہ عشق نے لوگوں کو بدنام کیا ہے؟

قیصر۔ جی۔ جی۔ آپ یوں بھی کہہ سکتی ہیں۔ مگر عشق کیا کہوں عشق کیا چیز ہے۔

لیلا۔ فرمائیے۔ فرمائیے۔

قیصر۔ عشق ایک بری بلا ہے۔

لیلا۔ یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ جس طرح شش و جگر کی خرابی تیسرے درجہ پر پہنچ کر دق کی شکل اختیار کر لیتی ہے اسی طرح دماغ کی خرابی بھی تیسرے درجہ پر پہنچ کر عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

قیصر۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) عشق۔

لیلا۔ جی ہاں عشق بڑا مہلک مرض ہے۔

قیصر۔ اور دوا بھی —— لیکن۔

لیلا۔ ہاں تو لیکن کیا۔

قیصر۔ میں —— میرا مطلب یہ ہے کہ بالکل لادوا ہیں۔

لیلا۔ خوب۔

قیصر۔ جی بات یہ ہے کہ اس کا علاج بعض خاص طریقوں پر ممکن ہے۔

لیلا۔ آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ لادوا مرض کا علاج خاص طریقوں پر ممکن ہے! جب علاج ممکن ہے تو مرض لادوا کیسے ہوا۔

قیصر۔ جی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عشق لاعلاج نہیں۔

لیلا - بہت بہتر عشق لا دوا بھی ہے اور لاعلاج نہیں بھی۔

قیصر- جی آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ معاف فرمائیے! بات یہ ہے کہ اگر کسی نے مسیحائی کی تو عشق لاعلاج نہیں

لیلا۔ کسی نے ؟

قیصر۔ جی ہاں جس سے عشق ؟

لیلا - او ہو۔ میں سمجھ رہی تھی کہ کسی حکیم نے یا خود حضرت مسیح نے۔

قیصر۔ جی۔

لیلا - اور پھر یہ مسیحائی کیا شئے ہے۔ کیا کسی سنوٹوریم کا نام ہے جہاں عشق کے مریضوں کو شفا ہوتی ہے۔

قیصر۔ مسیحائی۔ جی اب آپ اس کو یوں سمجھے کہ اگر عشق کا جواب عشق سے دیا گیا تو ـــــ

لیلا - بالکل ایسے جیسے کہ پتھر کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے۔

قیصر۔ مثال کے طور پر۔ یہی واقعہ لے لیجئے۔ اگر پروین نے صفدر کا پیام منظور کر لیا ہوتا تو ـــــ

لیلا - مسیحائی کی ہوتی اوس نے ؟

قیصر۔ جی ہاں بیشک۔ اگر اس نے رضامندی کا اظہار کیا ہوتا تو ایک ہونہار کی جان خواہ مخواہ نہ جاتی

لیلا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ صفدر کا مرض عشق تیسرے درجہ سے گذر چکا ہے اور وہ بجائے کسی ڈاکٹر کے ہاں رجوع ہونے کے اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

قیصر۔ لیکن جب صفدر نے اظہار عشق کیا تھا۔ اور شادی کا پیام بھی دیا تھا تو پروین کو چاہئے تھا کہ اس کو منظور کر لیتی۔

لیلا۔ کیا خوب ـــــ خواہ مخواہ کوئی صاحب کسی شریف لڑکی سے اظہار عشق کریں اور شادی کا پیام دیدیں تو لڑکی کو مجبوراً انہیں قبول کر لینا چاہئے۔ کیا آپ کا مطلب یہی ہے۔

قیصر۔ جی ہاں۔ بات یہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ـــــ عشق کے ہاتھوں انسان مجبور ہو جاتا ہے۔

لیلا۔ مجبور ہونا دوسری بات ہے اور بیوقوفی کرنا دوسری بات اور پھر خودکشی تو بہ کیجئے کس قدر مذموم اور لغو فعل ہے۔

قیصر۔ ٹھیک تو ہے۔ لیکن ناکام الفت جو کچھ بھی کر بیٹھے تھوڑا ہے۔

لیلا - یہ تو زبردستی ہے کہ خواہ مخواہ کسی کو شادی کا پیام دیدیں۔ اور اگر وہ انکار کرے تو اپنے آپ کو ناکام الفت سمجھ کر خودکشی کر لیں۔

قیصر۔ عاشق اندھا ہوتا ہے اسلئے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

لیلا۔ تو گویا آپ کا منشا یہ ہے کہ اگر عاشق صاحب خودکشی سے بھی زیادہ بھیانک حرکت کر بیٹھیں تو ان کا فعل قابل اعتراض نہیں۔

قیصر۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عاشق نامراد زندہ نہیں رہ سکتا۔

لیلا۔ یہ تو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز خیال ہے۔

قیصر (ذرا جھینپتے ہوئے) آپ نے میرا مفہوم غلط سمجھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عاشق صدمہ ناکامی برداشت نہیں کر سکتا۔

لیلا۔ اس کا مفہوم تو بالکل ویسا ہی ہے جو آپ نے پہلے کہا تھا۔

قیصر (کھسیانا ہو کر) مگر ——

لیلا۔ مگر کیا؟

قیصر۔ کیا کہوں عشق سے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

(پروفیسر حارث کمرہ میں داخل ہوتے ہیں اور دونوں کی گفتگو سنتے ہیں۔

لیلا۔ جی۔

قیصر۔ عشق ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

لیلا۔ افوہ۔

قیصر۔ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ ہے۔ (پروفیسر باہر چلے جاتے ہیں۔)

لیلا۔ خدا محفوظ رکھے اس آگ کے شعلہ سے۔

قیصر۔ جی نہیں۔ معاف کیجئے۔ بغیر اس کے زندگی بے لطف ہے۔ وہ دل ہی کیا جس میں عشق کی چنگاری نہ ہو۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ بی بی آپ کو پاپا بلاتے ہیں۔

(لیلا کھڑی ہو جاتی ہے اور قیصر کی طرف دیکھتی ہے)

قیصر۔ (اٹھتے ہوئے) اب اجازت چاہتا ہوں۔

لیلا۔ لیکن آپ نے بھی نہیں بتایا کہ تشریف آوری کس سلسلہ میں ہوئی تھی۔

قیصر۔ (پریشان ہو کر) آپ نے —— یوں ہی حاضر ہوا تھا۔

(لیلا چلی جاتی ہے)

دوسرا ایکٹ۔ دوسرا سین

(پروفیسر کا کمرہ - پروفیسر اخبار پڑھنے میں مصروف ہے)

(غازی داخل ہوتا ہے)

غازی - آداب عرض -

پروفیسر - کون؟ (منہ پھیر کر) کپتان غازی؟

غازی - جی ہاں - جناب نے خوب پہچانا۔

پروفیسر - لیکن جناب . . . . میں پہلے ہی آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں کہ میرے ہاں کوئی گھوڑی قابل فروخت نہیں ہے -

غازی - جی بجا - مگر میں آج ایک نہایت اہم معاملہ کی نسبت کچھ عرض کرنے حاضر ہوا ہوں -

پروفیسر - لیکن جناب اگر آپ نے دریدہ دہنی سے کام لیا تو . . . . . .

غازی - بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ہونے والے خسر سے بے ادبی اور گستاخی کروں -

پروفیسر - (کھڑے ہو کر) ہائیں - کیا کہا ہونے والا خسر؟

غازی - مطلب یہ ہے کہ میں آپ کا عنقریب داماد بننے والا ہوں -

پروفیسر - لاحول ولا - مجھے اس کا کامل ایقان ہے کہ آپ کو ضرور اس بارے میں حد درجہ مغالطہ ہوا ہے -

غازی - میں لیلیٰ سے شادی کی درخواست کرنے حاضر ہوا ہوں اور اس میں مغالطہ کو ہرگز دخل نہیں -

پروفیسر - او - جاہل محض - مجہول العقل - ضعیف الفطرت - تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ایسے ناشائستہ کلمات اپنی زبان نجس پر لا سکے -

غازی - میں بھی دیکھوں کہ آپ مجھے اپنی فرزندی میں کیسے نہیں لیتے - آپ اگر میرے کیرکٹر کا گہرا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ میں جو کچھ زبان سے کہتا ہوں اس کو سچ کر دکھاتا ہوں اور یہی وہ میرا طرۂ امتیاز ہے جس کی وجہ سے جنگ کے زمانہ میں ساری فوج پر میری دھاک بیٹھ گئی تھی چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن میں اپنی دھن کا پکا اور کام کا پورا ہوں -

پروفیسر - لیکن او - تہی مغز -

غازی - جناب خاموش رہئے میں جب تک کہہ رہا ہوں بیچ میں نہ بولئے ہم فوجی سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن بدتمیزی نہیں برداشت کر سکتے ——— ایک واقعہ بیان کرتا ہوں - اس سے اندازہ کر لیجئے کہ میں کس بلا کا نڈر ہوں - ایک رات - اوہ کس قدر دلچسپ رات تھی - وہ جب کہ ہماری فوج دشمن کے کیمپ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر

مقیم تھی۔ ہمارا ارادہ شبخون مارنیکا تھا۔ اسلئے افسر نے پوچھا ہے کوئی تم میں ایسا جو اس وقت جاکر دشمن کی خبر لا سکے کہ وہ اس وقت کیا کر رہا ہے؟ فوج میں چٹے کٹے مستنڈے تھے تو بہت لیکن کوئی آگے نہ آیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ نامرد کہیں کے۔ میں۔ میں آگے بڑھا اور کہا "حاضر ہوں" افسر نے مجھے ہدایتیں دیں اور میں چلتا بنا۔ دشمن کے کیمپ کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دشمن خواب خرگوش میں ہی۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور یہ خبر پہنچانے کے لئے سر پر پاؤں رکھکر دوڑنے لگا۔ دفعتاً ایک سنتری نے شبہ پاکر "Who goes there" میں دیکا اور بھوڑی دیر اس کی آنکھ بچاکر لگا پھر دم بنانے اپنی قیامگاہ پہنچکر۔ . . . . .

پروفیسر۔ (متاثر ہوکر کہانی سنتے ہوئے) لاریب! لاریب! ایسے واقعات قتال وجدال میں اکثر و بیشتر وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

غازی۔ ہاں۔ صرف میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اگر آپ کو دوسرے واقعات جو مجھے جنگ میں پیش آئے سناؤں تو آپ . . . . . .

پروفیسر۔ (کانوں پر ہاتھ دھرکر) بس بس رہنے دے تیری دماغ پاشی میں نے بھی جنگ عظیم کے ہولناک کارناموں کا حد درجہ غائر نظروں سے مطالعہ کیا ہے۔

غازی۔ پروفیسر صاحب آپ تو جنگ کے نام سے آدھ موئے ہوئے جاتے ہیں۔ اوہ آپ تو کانپ رہے ہیں۔ لاحول ولا۔ ایسی بھی بزدلی کس کام کی۔ کوئی فوجی ایسی حرکت کرے تو آپ کو معلوم ہے اس کی سزا کیا دیجاتی ہے —— (پستول سے نشانہ لیکر) خیر آپ تو خسر ٹھیرے میرے اس لئے آپ کی جان محفوظ ہے کہیئے جو کچھ آپ کہیں اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔

پروفیسر۔ لاریب! لاریب! آپکے اخلاق کریمانہ و الطاف نوازشانہ سے یہی توقع تھی کہ . . . . . خیر اب تو معاملہ طے ہوگیا نا ——

غازی۔ مگر یہ کہاں طے ہوا کہ آپ مجھے لیلا کا سرتاج بنانیوالے ہیں۔ نہیں؟

پروفیسر۔ او ناہنجار۔ فاترالعقل۔ میں نے کتنی دفعہ کہا تجھ سے کہ میں کبھی لیلی کی شادی نہ کروں گا۔

غازی۔ (سوچکر) تین دفعہ۔

پروفیسر۔ بس! بس! اگر تو نے مجھ سے ایسا

فرسودہ مذاق کیا تو یاد رکھو کہ تجھے بعد میں کف افسوس
ملنا پڑیگا۔ میں۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ ۔
غازی۔ ہاں! ہاں کہئے تا کہ میں اپنی اصلیت
پر اتر آؤں گا۔ کہئے کیوں نہیں ——
یہی آپ کا مطلب تھا نا؟
پروفیسر! او بیہودگی کا جامہ پہنکر مذاق
کرنیوالے سن کہ میرا خون کھولنے لگا ہے۔ اور اب
مجھ میں ضبط کی قوت باقی نہیں رہی۔ اگر اب
بھی باز نہ آیا تو میں برس پڑوں گا۔
غازی۔ تو بسم اللہ کیجئے۔ میں حاضر ہوں۔
پروفیسر صاحب پھر ایکدفعہ کہتا ہوں کہ آپ ناراض نہ
ہو جائیں آپ کو مجھ جیسا داماد چراغ لیکر ڈھونڈنے
سے بھی نہ ملیگا۔ دیکھئے ایک رازکی بات کہتا ہوں
آپ کیا جانیں۔ مجھے لیلیٰ سے عشق ہے عشق
پروفیسر۔ عشق! قہ قہ قہ! عشق! بوالہوسی
کہو بوالہوسی۔ او جاہل مطلق عشق بھی کوئی چیز ہے۔
بوالہوسی کا نام تجھ جیسے زبوں طبیعت لوگوں نے
عشق رکھ لیا ہے۔ کہتا ہے لیلیٰ سے عشق ہے قہ قہ
قہ! حد درجہ مخبوط الحواس [illegible]
غازی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے [illegible]
نکلے ہوئے ہیں مگر اس سے پہلے میں آخری دفعہ

آپ سے [illegible] کافی سمجھتا ہوں کہ مجھے لیلیٰ سے محبت
ہے محبت ہے اور وہ میری ہو کر رہیگی۔
پروفیسر۔ اور میں جناب غازی صاحب ابھی
بھی آپ سے آخری دفعہ یہ کہنا کافی سے زیادہ
خیال کرتا ہوں کہ میں اپنی لیلیٰ پیاری لیلیٰ کو ایک
حد درجہ نامعقول اور ایک حد درجہ بدتمیز شخص
سے [illegible] کی اجازت نہیں دے سکتا۔
(میز پر [illegible] ہوئے)
غازی۔ ہا! ہا! افوہ! اب تو آپ مجھ پر
رعب گانٹھنے [illegible] ہیں مگر مجھ جیسے خرانٹ
[illegible] پروفیسر کا کیا رعب جم سکتا
ہے [illegible] اس قسم کی نمائشی چیزوں سے
[illegible] اور اب تو یہ سمجھنے لگا ہوں
کہ آپ [illegible] رہے ہیں تو آپ نے نامیدان
میں (میز پر ہاتھ مار کے) اس طرح کام نہ چلیگا۔
[illegible] ہوا جاتا ہے۔
(پروفیسر [illegible] ہو کر سر کھجاتے ہیں)
[illegible] (تھوڑی دیر بعد) لیکن میرے
[illegible] ہے جس کی وجہ سے میں
[illegible] کو کالعدم کرسکتا ہوں
روپیہ! مجھے آپ میرے ہاں روپیہ ہے اور اسی

کی بدولت میں آپ کو سرنگوں کر کے رہوں گا۔ کپتان صاحب اس کے آگے ریوالور کی نہیں چلتی۔

غازی۔ ۔ تو۔ ۔ تو۔ ۔ ۔ ہاں۔ اس وقت تو بڑی مشکل ہے۔

پروفیسر (خوش ہو کر) مشکل ہے کیوں؟ (قہقہہ لگا کر) اب آئے آپ راہ راست پر؟

غازی (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں۔

(پروفیسر صاحب ہنستے ہوئے اخبار اٹھا کر یوں پڑھنے لگتے ہیں گویا کہ ملاقات ختم ہو گئی ہے)

غازی۔ تو میں اس پر مجبور ہو گیا ہوں کہ۔ ۔

. . . . .

(جیب سے ایک ریوالور نکال کر کھیلنے لگتا ہے)

پروفیسر۔ او شیطان صفت انسان (حیران و پریشان ہو کر) یہ کیا کر رہا ہے۔

غازی۔ اپنی جنگ کی یادگار سے دل بہلا رہا ہوں۔ پروفیسر صاحب آپ کو یہ سن کر بڑی مسرت ہوگی کہ میں نے اس سے جنگ میں دشمن کے بیس آدمی مارے ہیں۔ بیس چلتے پھرتے۔ ہنستے بولتے انسان اس کی نذر ہو گئے ہیں بیس نے

پروفیسر۔ اس کو علیحدہ ہی رکھ دیجئے ورنہ اس کا ہر لحظہ امکان ہے کہ کہیں دوست بھی اس کی نذر نہ ہو جائیں۔

غازی۔ کیا معلوم؟ (ریوالور آہستہ آہستہ اٹھاتا ہے اور پروفیسر پر نشانہ جماتا ہے) پروفیسر صاحب بڑا اچھا ہتھیار ہے۔ کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ دوست اور دشمن کو خوب پہچانتا ہے۔

پروفیسر۔ (غصہ سے کانپتے ہوئے) جناب آپ اپنے اس ہولناک کھیل سے باز آئیے۔ فوج کی اس شاطری اور عیاری سے یہاں کسی اچانک سانحہ جانکاہ کا احتمال ہے۔ قتل کی وارداتیں یونہی آپ جیسے حد درجہ عقل کے معذوروں سے ظہور میں آتی ہیں (غضبناک لہجہ ہو کر اور کپکپاتے ہوئے) جناب آپ اس روح فرسا ہتھیار کو ہٹاتے ہیں یا نہیں؟

(غازی ریوالور ہٹا لیتا ہے اور بغور دیکھتا ہے)

ایسے تجھے ہو کیا گیا ہے پاگل تو نہیں ہو گیا تو؟

غازی۔ لیلیٰ کے عشق میں پاگل ہو گیا ہوں (زری سے) پروفیسر صاحب میں خیال کرتا تھا کہ آپ جیسے بہادر شخص کو اس ریوالور سے بہت دلچسپی ہوگی۔ آہ! میں نے اس کی مدد سے بیس آدمیوں کا کام تمام کیا ہے۔

پروفیسر۔ حتی الامکان! اس کو یہاں سے

دور کرنیکی جلد از جلد فکر کرو۔

غازی۔ پروفیسر صاحب کیا کبھی آپ نے فلسفہ ریوالور پر بھی غور کیا کہ اس وقت سینکڑوں آدمیوں کے پاس ریوالور ہیں اور وہ اس کو چلانا جانتے ہیں لیکن افسوس کہ ان کو اس کا موقع نہیں ملتا۔

پروفیسر مجھے ان حد درجہ لغو خیالات پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ (کرسی سے اٹھتے ہوئے) میں نہیں جانتا اس پاگل پن سے کیا مطلب ہے۔

غازی جب ایک افسر سے بات کرو تو تم سیدھے کھڑے ہو جاؤ (فوجی آواز میں کڑک کر) ہالٹ۔ اٹن شن!

(پروفیسر گھوم کر تن کر کھڑا ہو جاتا ہے)

ٹھیک! جا ہو تو اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔ (ریوالور سے کرسی کیطرف اشارہ کرتا ہے)

پروفیسر۔ (ڈرتے ڈرتے کرسی کی طرف رخ کرتا ہے) اس مذاق کے کیا معنی؟

غازی۔ مذاق وزاق نہیں بالکل سنجیدہ کام ہے (ریوالور پروفیسر کی طرف دکھا کر) تشریف رکھیئے۔

پروفیسر (بیٹھتے ہوئے) دھمکیاں این!

غازی۔ جی نہیں ترغیب۔

پروفیسر۔ ریوالور کی نوک پر اپنا کام دماغ کی مدد کے بجائے زور بازو کی مدد سے کرتے ہو۔ لاحول ولا یہی تو وہ چیز تھی جس کے انسداد کیلئے ہم نے جنگ کی تھی۔

غازی۔ "ہم" نے جنگ کی تھی۔ ہم۔ ہم۔ واللہ پروفیسر صاحب آپ بھی مذاق کی حد کرتے ہیں۔

پروفیسر۔ چاہتے ہو تو تم کہہ لو۔ کسی کا اس میں کیا جاتا ہے! گو وہ لوگ جو جنگ میں شریک نہ تھے۔

غازی۔ بس۔ بس یہ آپ شیخی مت بگھاریئے مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم نے جنگ کس لئے کی۔ ہم نے اپنی قوت کو ایک دوسری قوت کے توڑنے کے لئے استعمال کیا۔ اور اس وقت بھی میں یہی کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی ابھی آپ کہہ رہے تھے میں مبلغ علیہ السلام کی قوت کو کام میں لاؤنگا اور میں اس قوت کے خلاف اس کی قوت کو استعمال کرنا چاہتا ہوں (ریوالور سے نشانہ لیتا ہے)

پروفیسر۔ کیا۔ کیا۔ تو خواہ مخواہ ایک حد درجہ بے گناہ کے خون میں اپنے ہاتھ رنگیگا۔؟

غازی۔ کیوں نہیں؟ کیا میں نے جنگ میں کئی بیگناہ کی جان نہیں لی؟

پروفیسر۔ مگر تو نے اعداء پر گولیاں برسائی ہیں۔ دوستوں پر نہیں۔ میرا ضمیر کبھی تجھے اس جرم کے ارتکاب کی اجازت نہیں دیگا۔

غازی۔ مگر خیال تو کیجیے۔ چار سال میدان جنگ میں رہنے کے بعد کسی شخص کے خیالات انسانی زندگی کی تقدیس کے متعلق وہی نہیں رہتے جو پہلے تھے ہے کہ نہیں؟

پروفیسر۔ مگر کیا تجھے اتفاق نہیں ہے کہ اب تک جج اور جیوری کے خیالات وہی ہیں جو پہلے تھے۔

غازی۔ یہ درست ہے۔ لیکن ریوالور اکثر اتفاقاً چل جاتے ہیں آپ ہی نے تو تھوڑی دیر پیشتر یہ کہا تھا اور انشاء اللہ عنقریب ہونیوالی واردات محض اتفاقیہ ہوگی۔

پروفیسر۔ مجھے سچ معلوم تو ہو کہ تمہارا منشاء کیا ہے؟

غازی۔ بات اصل یہ ہے کہ اس وقت آپ کو اپنے ہاتھ سر سے بلند کئے ہوئے کھڑا ہونا چاہئے تھا۔ تاہم ہونیوالے خسر ہونیکی حیثیت سے میں رعایت سے کام لوں گا۔ بس۔ آپ لیلی کو ــــ آپ جانتے ہیں میرا مطلب ــــ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

پروفیسر۔ اور میں اگر نفی میں جواب دوں تو مجھے قتل کرڈالئے گا۔

غازی۔ ٹھیک! آپ میرا مطلب سمجھ گئے لیکن پروفیسر صاحب خوف بری چیز ہے بعض دفعہ آپ جیسے ادھیڑ عمر والوں کی روح خوف کی وجہ سے پرواز کرجاتی ہے۔

پروفیسر۔ ہشت میں ایسی باتوں سے ڈرنیوالا تھوڑا ہی ہوں۔

غازی۔ ٹھیک! واقعی میں نے بڑی غلطی کی۔ (ریوالور سے نشانہ لیتے ہوئے) تو مجھے آخر فائر کرنا ہی پڑیگا۔ مجبوری انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔

پروفیسر۔ (گھٹنوں کے بل جھک کر اور ہاتھ جوڑ کر) کپتان غازی صاحب رحم رحم۔ . . . . اس حقیر کو جملہ شرائط منظور ہیں اور میں بہ رضا و رغبت اپنی دختر نیک اختر کی شادی خانہ آبادی آپ سے کرنے کے لئے بدل و جان تیار ہوں۔ اب تو جان بخشی فرمائیے غازی صاحب للہ میری حالت پر رحم فرمائیے۔ کم از کم لیلی کی خاطر۔

غازی۔ (پروفیسر کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے) یہ ہے کام کرنیکا طریقہ آپ آرام سے تشریف رکھئے اور میں ضروری انتظامات کرنے جاتا ہوں۔ ریوالور کا خیال دماغ سے نکال لئے اور دل کی حرکت بھی باقی رکھئے۔

(جاتا ہے)

پروفیسر۔ توبہ۔ الٰہی توبہ۔

ایکٹ تیسرا۔ سین پہلا

(پروفیسر کا کمرہ ۔ لیلیٰ داخل ہوتی ہے)

پروفیسر۔ کون؟ لیلا! خوب آئی ۔ آؤ بیٹی تم سے ایک اہم ترین معاملہ کی نسبت گفت وشنید کرنی ہے۔

لیلا۔ جی میں حاضر ہوں!

پروفیسر۔ نہیں آج میں ایک مبارک و مسعود خبر سنانی چاہتا ہوں۔

لیلا۔ کیا کالج سے میری کامیابی کی کوئی خبر آئی ہے؟

پروفیسر۔ نہیں بلکہ میں تمہیں شادی کی خبر سنانی چاہتا ہوں۔

لیلا۔ شادی؟ کس کی شادی؟

پروفیسر۔ لیلا۔ معصوم لیلا۔ میں تمہارا عقد عنقریب کرنیوالا ہوں (لیلا شرم سے گردن جھکا لیتی ہے لیکن ساتھ ہی چہرہ پر استعجاب کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں) بیٹی تم تعلیم یافتہ ہو اور ماشاء اللہ صاحب فہم وذکا ۔ اس کے علاوہ میں بھی دقیانوسی خیالات اپنے دماغ میں پرورش نہیں کرتا اس لئے چاہتا ہوں کہ جس شخص کا میں نے تمہارے لئے انتخاب کیا ہے اس کے متعلق تمہارے خیالات بھی معلوم کر لوں۔ (لیلا شرمائی ہوئی خاموش بیٹھتی ہے) دیکھو شرم ایک حد درجہ دلچسپ رسم تو ہے لیکن غیر ضروری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہاری شادی خانہ آبادی کپتان غازی سے کرنا چاہتا ہوں۔

لیلا۔ (تعجب سے) کپتان غازی؟

پروفیسر۔ ہاں وہی کپتان غازی جو میرے ہاں دو دفعہ آئے تھے۔ مجھے اس کا ایقان ہے کہ تم دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر حد درجہ خوش وخرم رہوگے (لیلا شرماتی ہے لیکن چہرہ سے غم وغصہ سے اظہار ہوتا ہے) لیلا! تم کو یہ معلوم کرکے حد درجہ مسرت ہوگی کہ کپتان کو تم سے الفت ہے اور وہ بدل وجان شادی میمنت آبادی کا خواہاں بھی (لیلا کے چہرہ کا رنگ بدلتا ہے) اس تم خاموش ہو! اغلباً شرم وحیا نسوانی فطرت کا تقاضا ہے کیا میں تمہاری اس خاموشی کو نیم رضامندی سمجھوں۔

لیلا۔ لیکن ——

پروفیسر۔ ہاں ہاں کہو۔

لیلا۔ آپ نے اکثر لڑکیوں کی شادی کے متعلق آزاد خیالی کا اظہار فرمایا ہے۔ اپنی تقریر وتحریر میں جا بجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور لڑکیوں کو اپنے شریک حیات کے انتخاب کا پورا حق دیا ہے۔

پروفیسر۔ لاریب! لیکن بیٹی تیرا اس سے کیا مطلب؟ کیا تو بھی انتخاب کا آزادانہ حق چاہتی ہے (لیلا گردن نہوڑائے خاموش ہے) بولتی کیوں نہیں؟ کیا تو اپنے شفیق باپ کے انتخاب کو سردمہری سے ٹھکرانا چاہتی ہے؟

لیلا۔ لیکن میں آپ ہی کے خیالات دہرا رہی ہوں۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ دوسروں کے والدین سے یہ خواہش کریں کہ وہ اپنی لڑکیوں کو انتخاب کا پورا حق دیدیں اور خود اس کے خلاف عمل کریں۔

پروفیسر۔ لیلا تو ناداں ہے مجھے اپنی ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کا کامل ایقان ہے کہ تو غازی کی رفیق حیات بنکر چین چان اور امن وامان سے زندگی کے دن گزارے گی۔

لیلا۔ مگر میں کہنا چاہتی ہوں کہ یا تو آپ اپنا نظریہ ہی بدلدیں یا مجھے اس سے مستثنیٰ نہ کریں۔

پروفیسر۔ او کمزور الفطرت ہستی خوب سمجھ لے کہ تو اپنے شفیق باپ کے ——— تجربہ سے فائدہ مند نہیں ہورہی ہے۔

لیلا۔ میں پہلے ہی عرض کرچکی۔ مزید کچھ کہنا اس بارے میں بے ادبی سمجھتی ہوں۔

پروفیسر۔ سن اور کان کھول کرسن او ضدی لڑکی تجھے بعد میں کف افسوس ملنا پڑیگا۔

لیلا۔ مجھے اس معاملہ میں معذور سمجھئے۔

پروفیسر۔ الہٰی تو بہ عجب آفت میں گرفتار ہوں۔ ادھر کپتان اٹل ادھر لڑکی ضدی۔ . . . . . .

پناہ بخدا ——— کہیں قیصر والا معاملہ تو نہیں؟ ——— اچھا تمہارا خیال قیصر کے متعلق کیا ہے؟

قیصر۔ کون قیصر؟

پروفیسر۔ تمہارا ہم جماعت قیصر!

لیلا۔ جی ——— میرا خیال قیصر کے متعلق

لیلا۔ مگر آپ کا اس سے کیا مطلب؟

پروفیسر۔ مطلب وطلب کچھ نہیں۔ بس معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تو قیصر کی نسبت کیا رائے رکھتی ہے۔

لیلا۔ میں کچھ نہیں سمجھی۔

پروفیسر۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تجھے قیصر سے محبت ہے؟

(لیلا خاموش ہوجاتی ہے)

لاریب! اس کے چہرہ سے الم نشرح ہورہا ہے کہ وہ ضرور بالضرور قیصر سے محبت کرتی ہے اور میں نے بھی بچشم خود اس کو راز و نیاز میں منہمک دیکھا ہے غالباً اسی وجہ سے غازی سے متنفر ہے ——— لیلا اگر تیرا

ضعیف العمر باپ تجھ سے خواہش کرے تو کیا تو اپنی ابلہانہ ضد سے باز نہ آئیگی؟

لیلا۔ پاپا اگر آپ کی اکلوتی بیٹی آپ سے درخواست کرے تو کیا آپ اصرار کریں گے۔

پروفیسر۔ میری جان حد درجہ معرض خطر میں ہے۔

لیلا۔ اور میری بھی یہی حالت ہے۔

پروفیسر۔ فوجی کپتان سے کسی خدشہ جانکاہ کا ہر لمحہ امکان ہے۔

لیلا۔ تو پھر پاپا آپ ایسے شخص سے میری زندگی وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر۔ تو نے میرا مدعا غلط سمجھا اگر تو نے نفی میں جواب دیا تو کپتان میرا درپئے آزار ہوگا۔

لیلا۔ نہیں اگر میں نے اثبات میں جواب دیا تو میری جان کے لالے پڑ جائینگے۔

پروفیسر۔ او کج فہم ناعاقبت اندیش لڑکی دور ہو میری نظروں سے —— کیا کیا تو نہیں جائیگی۔ —— اچھا میں خود تیرے نجس و پلید چہرہ سے دور ہوتا ہوں۔ (جاتا ہے)

(لیلا منہ ڈھانپ کر سسکیاں لیتے ہوئے صوفہ پر گر پڑتی ہے)

(باقی)

غزل

جناب امین الحسن صاحب بسمل ناظم عدالت خفیفہ

ترسے ہوئے کیوں نہ مسکرائیں
میخانہ پہ چھا گیئں گھٹائیں

جادو کیا چیز ہے دکھادوں
مجھ سے آنکھیں تو وہ ملائیں

دل اور کہیں ہو خود کہیں اور
یارب وہ اس طرح نہ آئیں

ساقی کی نگاہ رُوح پرور
لیتی ہے رندوں سے دعائیں

اللہ رے یاس اب نہیں شوق
افسانہ درد دل سنائیں

بگڑے ہیں کہ ہم کریں خوشامد
رُوٹھے ہیں کہ ہم اُنھیں منائیں

بسمل ہے عشق جان کے ساتھ
آئیں گر آتی ہیں بلائیں

عورت

(جناب مُلّا عباس صاحب)

(۱)

تجھے معلوم ہے تو جانتا ہے راز حیات
لطف کیا زیست کا جب کوئی نہ ہو پہلو نشیں

جو رفیقہ نہیں رکھتا ہے وہ ہے ننگِ جہاں
قابل عزت و توقیر وہ دنیا میں نہیں

زندگی کیا ہے نہ ہو جبکہ شریکِ غم و عیش
موت وہ کیا کہ نہ ہو جس کا کوئی سوگ نشیں

روح عشرت کا ہے مقلوب یہ حور جنت
خاتم زیست کی یہ حور ہے تابندہ نگیں

حاصل خلد بریں حور ہے ورنہ کیا ہے
ہے وہ جنت بھی جہنم کہ جہاں حور نہیں

جسم مردہ ہے حقیقت نہیں اس کی افزوں
روح میں جس کے نہیں اور کوئی روح مکیں

لاکھ شعلے ہوں فلک بوس پہ ٹھنڈے ہو جائیں
رکھدے گر سینۂ بریاں پہ یہ دست رنگیں

گھر میں آتے ہی نظر آئے جو ہنستی صورت
غنچہ کیطرح وہ کھل جائیگا ہو لاکھ حزیں

منصور بھی ہوتی ہے بچشم شاعر
ہوتی ہے اس سے ہی شاعر کی طبیعت رنگیں

ہوگا جس وقت مصور کو تصور اس کا
ہوگی شہکار تصاویر وہ تصویر حسیں

بادشاہ جنگ اگر فتح کوئی کرتا ہے
چومتا ہے بتبرک وہ عذار سیمیں

خون سرعت سے مفکر کی رگوں میں ہو رواں
جنبش لب سے نکلجائے جو اس کے تحسیں

ایک قدم آگے وہ دنیا سے بڑھا رہتا ہے
جس کی آنکھوں میں بسی رہتی ہے یہ شکل حسیں

نام اس کا ہے خردمندوں میں جان فطرت
فطرت اس کی ہے قریب اور یہ فطرت کے قریں

اس کی آغوش میں آسودہ ہے راز قدرت
بزم فہمیدہ میں نام اس کا ہے روح رنگیں

عیش میں ساتھ مصیبت میں رفیق جانسوز
ہم جو خوش یہ بھی ہے خوش ہم جو حزیں یہ بھی حزیں

ہم نفس گلشن ہستی کی ہے بے خار کلی
روح اس کی ہے طلائی یہ مجسم سیمیں

ہم نفس سے سبق درد و وفا ملتا ہے — درد جس دل میں نہیں گویا وہ انسان نہیں
جس کی تحریک سے انسان جواں مرد بنے — لاؤ میں چوم لوں اس گوہر بیضا کی جبین
دی ہے قدرت نے زمانہ کو جو فیاضی سے — ہے یہی نعمت عظمیٰ وہ نہ چرخ بریں
جس کا گھر اپنی شریکہ سے ہو رشک کیواں — اس کو عباس نہ کیونکر کہے فردوس بریں

غزل

جناب الحاج ابوالاشرف صاحب مجید آغائی ابوالعلائی

گر ہے شوق دید پیدا دیدۂ بینا کریں — خاک کے ذروں میں سیر عالم بالا کریں
دیکھنے والے ترے اے برق وش کیا کیا کریں — دل کو تھامیں یا سنبھالیں خود کو یا دیکھا کریں
چشم صورت آشنا ہر رنگ میں ہی کامیاب — آپ بے پردہ رہیں عالم میں یا پردا کریں
حسن واقف عشق سے ہی عشق واقف حسن سے — کس کے جلوہ کیلئے آخر نظر پیدا کریں
بڑھ کے ہے کونین سے ہر گوشہ زندان عشق — لیکے پابند جنوں آزادیوں کو کیا کریں
خوگر درد محبت بے نیاز لطف ہے — شادمانی جن کو حاصل ہے غم فردا کریں
تم بقدر حسن تو بدنام و رسوا کر چکے — ہم بسجدِ عشق تم کو بھی اگر رسوا کریں؟
روز نذر برق و باراں آشیاں ہوتا ہے — ہم قفس کی تیلیوں سے باغباں دیکھا کریں

ان کے کوچہ میں یہی اپنی صدا ہتی اے مجید
دل کا سودا کرنے والے جان کا سودا کریں

تلاش حق

(جناب۔ ا۔ ب میر سردار خان صاحب)

میں نے اس کی تلاش شروع کی۔ میرے وسعت تخیل نے اس کو آسمانوں میں تلاش کیا۔ زمینوں میں ڈھونڈھا۔ پہاڑوں کی سر نعلک چوٹیوں سے پوچھا۔ صحرا نوردی کی۔ دشت و بیاباں کی خاک چھانی سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگایا۔ دریا کی شفاف موجوں سے دریافت کیا۔ میری دریافت پر موجیں ایک شان استغنار کے ساتھ اور ایک اظہار تعجب کے ساتھ ساکت ہو گئیں۔ نیلگوں سمندر نے انداز حیرت کیساتھ اپنی پر نور روانی پر مہر سکوت لگا دی ــــــــ

میرے شوق وارفتگی نے میرا رخ عبادت گاہوں کی طرف پھیر دیا۔ میں نے خانقاہوں میں تلاش شروع کی۔ مسجدوں کا جائزہ لیا دیر و حرم دیکھے حشرات الارض سے دریافت کیا چمکدار آفتاب سے پوچھا۔ پہلے تو اس نے اپنی سنہری خیرہ کن کرنیں نگاہ حیرت سے مجھ پر گرا دیں اور اپنی آتشیں جلوہ ریزیوں کے ساتھ چمکتا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی زرد شعاعیں مدھم پڑ گئیں اور حیرت و استعجاب کے ساتھ اس نے اپنا پر جمال چہرہ شام کی تاریکیوں میں چھپا لیا ــــ

شفق آلود افق سے نور افشاں چاند ایک دلفریب شان اور ایک انداز دلربائی کے ساتھ مصروف جلوہ نمائی ہو گیا۔ منور و رقصاں ستارے جگمگا اٹھے۔ میں نے چاند کا پیچھا کیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ پہلے تو وہ ٹکٹکی باندھے حیرت آمیز نگاہوں سے مجھے تک رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی روشنی بھی پھیکی پڑ گئی اور طلوع سحر کی معرفت خیز اور دلکش سحر آفرینیوں نے شوق بیخودی میں میرے قدم گلستان کی طرف بڑھا دئے۔ عطر بیز نسیم صبح شوخ رفتاری کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ سرسبز و شاداب درختوں پر طائران خوش رنگ و خوش نوا محو ترنم ریزیاں تھے بلبل شیریں اور ترنم آفریں راگ الاپ رہی تھی۔ سارے باغ پر عجب پر کیف اور نورانی فضا چھا رہی تھی اس روح پرور نظارے نے میرے پر شوق دل کیساتھ پھر وہی کام کیا اور میں نے گلوں

دریافت شروع کی۔میری نادانی پر گلوں نے مسکرا دیا۔غنچے کھل کھلا کر ہنس پڑے نرگس نے نگاہ تعجب کے ساتھ دیکھا۔سبزہ نے سر جھکا لیا۔بلبلوں نے سرگوشیاں شروع کردیں۔آخر میں نے اپنی سعی لاحاصل سے تنگ آکر دل کی آنکھوں سے اپنے قلب کی گہرائیوں پر نظر ڈالی۔یہ گوشہ تاریک مجھے کچھ منور سا نظر آنے لگا۔ایک کیفیت شیریں۔ایک پرخلش رقت سی محسوس ہوئی اس وقت کسی کہنے والے نے میرے کان میں کہہ دیا۔او بیوقوف نادان تو جسے ڈھونڈ رہی ہے وہ تیری شہرگ سے زیادہ قریب ہے۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں ہم نہ ہوتے جو اگر حسن نہ ہوتا خود بین

غزل

جناب محمد حبیب اللہ صاحب صغیر خطیب

محبت اوس کی مرے دل نشین معلوم ہوتی ہے
ہر اک شکل گماں شکل یقیں معلوم ہوتی ہے

مری صورت کو صنعت کہتے ہیں صانع کی سب لیکن
مجھے تو شکل صورت آفریں معلوم ہوتی ہے

یہ سب فیض اثر ہے اوس کے سنگ آستاں ہی کا
جو مثل آئینہ۔میری جبین معلوم ہوتی ہے

ازل ہی سے یہ ہستی و عدم کی مملکت ساری
جناب عشق کے زیر نگیں معلوم ہوتی ہے

ہمیں اوس سے محبت جس قدر ہوتی ہے اوس کی بھی
نہیں ہیں ہاں کبھی۔ہاں میں نہیں معلوم ہوتی ہے

تیری صورت کو میں کس طرح دیکھوں خود مری صورت
نظر آتی نہیں گرچہ قریں معلوم ہوتی ہے

عدم میں ساتھ تیرا جس طرح دی تیری ہستی نے
یہاں بھی تیری ہی وہ ہم نشیں معلوم ہوتی ہے

خرابی ہے یہ سب کچھ اس خراب آباد ہستی کی
میری صورت جو غمگیں دحزیں معلوم ہوتی ہے

محبت علوی و ملکیش کی بس۔حق میں صغیر اپنے
حقیقی نعمت دنیا و دیں معلوم ہوتی ہے

انبیاء کرام اور فلاسفہ

معیارِ یقین اور حصولِ یقین کے ذرائع

(از مولانا محمد عثمان فارقلیط دہلوی رکن مجلس ادارۂ جاوید)

جب انسان روحانی و مادی محسوس اور غیر محسوس چیزوں کی حقیقت دریافت کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو اس کے سامنے دو قسم کی چیزیں آتی ہیں پہلی قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں جو ہمارے ادراک اور محسوسات کی سرحد سے باہر نہیں اور جن کا علم ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ حقایق داخل ہیں جو محسوسات کی سرحد سے باہر اور مرتبۂ عقلی سے ماورا ہیں۔ اور جن کا ادراک ہم محض عقل کے زور سے نہیں کر سکتے۔ مثلاً ذات و صفات باری تعالیٰ۔ فرشتوں کا وجود۔ حیات بعد الموت۔ عذاب و ثواب اور تخلیق کائنات کے اسباب وعلل وغیرہ یہ تمام حقایق عقل انسانی کی دسترس سے باہر اور ادراک وفہم کی سرحد سے ماورا ہیں۔ اگر انسان ان اشیاء کی کنہ اور حقیقت تک محض عقل کے زور سے پہونچنا چاہے تو وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوگا کیونکہ اس کی عقل علت و معلول اور سبب و مسبب کی الجھنوں میں پھنس کر صحیح اور یقینی نتیجہ کا ادراک نہیں کر سکے گی۔ وہ جب کبھی اپنے فہم پر اعتماد کر کے ان امور کی عقدہ کشائی کریگا یقیناً علت و معلول کے سنگ گراں اسکا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس کو قدم قدم پر ٹھوکریں لگیں گی۔ اس کا اقدام اس اندھے کی مانند ہوگا جو محض اندازہ سے کسی راستہ پر قدم رکھدے اور چپ و راست کا تذبذب اس کو لاحق ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اندازہ کوئی یقینی چیز نہیں ہے جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے اور جو اذعان کے کسی درجہ میں بھی جگہ پا سکے۔

امور ماورائے عقل کے لئے ایسے ذرائع اور وسائل کی ضرورت ہے جو یقین و اذعان کی پوری کیفیت اپنے اندر رکھتے ہوں اور ریب و تذبذب اور ظن و تخمین کے لئے ان میں کوئی گنجائش نہ رہے۔ یہ ذرائع جس قدر زیادہ یقینیات پر مبنی ہونگے اسی قدر نتائج بھی صحت اور اعتماد کے قابل ہونگے جنکو علم و یقین اور عقل و برہان کی بنیاد قرار دیا جا سکے گا۔ اگر ہمارے پاس امور ماورائے عقل کے ادراک کے لئے ایسے ذرائع موجود نہیں ہیں تو صرف ظن و تخمین اور اندازہ کے سہارے حقیقت تک کسی صورت میں بھی رسائی حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اذعانی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جس پر یقین کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اس لئے باری تعالیٰ نے اٹکل پچو بھروسہ کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے۔ کیونکہ ان کو ریب و شک اور تذبذب کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جس کا "ایمان" سے کوئی تعلق نہیں۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا	یہ لوگ تو محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن کبھی بھی حق اور یقین کی قائم مقامی نہیں کر سکتا۔

فلاسفہ کا گروہ بھی ظن و تخمین سے کام لیتا ہے کیونکہ اس کے پاس الٰہیات کے مسائل کی کنہ تک پہونچنے کیلئے صحیح ذرائع

موجود نہیں ہیں ۔ لے دیکھے اس کے پاس صرف عقل ہے جو امور مابعد الطبعیات میں ان کی رہبری کرنے سے قاصر ہے گروہ فلاسفہ نے اپنی تمام عمر آلہیات کے میدان میں عقل کے گھوڑے دوڑائے اور اپنے تمام اوقات حقائق اشیاء کی تحقیق اور امور مافوق الادراک کی تفتیش میں صرف کئے مگر ظن اور اٹکل سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے بلکہ عقل محض کی رہبری نے اس کو ایک ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں ریب وتذبذب اور شک وارتیاب کے سوا کچھ نہیں کیونکہ مشاہدہ اور قیاس میں فرق یہی ہے ۔ پہلا یقین اور ایمان کی روشنی پیدا کرتا ہے اور دوسرا شک وگمان کی دلدل میں پھنسا دیتا ہے۔

فلاسفہ کی مثال ان اندھوں کی سی ہے جن کے سامنے ایک ہاتھی پیش کیا گیا تھا اور ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ بتاؤ یہ کیا چیز ہے۔ ایک اندھے نے ٹٹول کر ہاتھی کا پیر پکڑ لیا اور کہا کہ یہ تو ایک ستون ہے ۔ دوسرے اندھے نے ٹٹول کر دم پکڑ لی اور کہا کہ ستون نہیں بلکہ ایک بہت بڑا سونٹا ہے ۔ تیسرے نے پیٹ پر ہاتھ رکھکر کہا کہ یہ تو کسی مکان کی چھت ہے جس کو بے وقوف معماروں نے بے ڈول اور غیر موزوں شکل میں بنایا ہے ۔ آخر ایک آنکھوں والے نے بتایا کہ یہ ہاتھی ہے جس کے چار پیر ہیں۔ ایک دم اور ایک خرطوم ہے ۔ اب غور کرو ہاتھی کی شناخت میں اندھوں نے ٹھوکر کیوں کھائی ؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے کبھی ہاتھی کو دیکھا نہیں تھا۔ انہوں نے اندازہ سے بعض اعضاء کو چھو کر اپنی اپنی متضاد آراء کا اظہار کر دیا۔ لیکن آنکھوں والے کبھی ہاتھی کے وجود اور اس کی شکل وہیئت میں اختلاف نہیں کر سکتے کیونکہ وہ قیاس نہیں بلکہ مشاہدہ کر رہے ہیں اور اسی مشاہدہ نے اُن کو یقین کے آخری مرتبہ میں پہونچا دیا ہے۔

خود فلاسفہ سے دریافت کرو کہ آلہیات کے جن مسائل میں ان کی تحقیقات ختم ہو چکی ہیں کیا خود اُن کو بھی اپنی تحقیقات پر کامل اعتماد ہے ؟ کیا عقل ودانش کی بلند پروازیوں نے ان کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ اپنی تحقیقات میں صائب ہیں ؟ اور کیا ایمان و اذعان کی غیر متزلزل کیفیت ان میں پیدا ہو گئی ہے ؟ ان کی طرف سے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے بہت سے معتقدات سے رجوع کیا ہے اور اس طرح اپنی عقل کی خامی پر مہر لگا دی ہے ۔ غرض فلاسفہ بھی علوم عقلیہ میں یقین کا دعویٰ نہیں کر سکتے ۔

اس گروہ کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ انبیاء کرام کا ہے جو علم وبصیرت اور ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال ہے ۔ اس گروہ کو اپنے سفر میں کبھی چپ وراست کا تذبذب لاحق نہیں ہوا اور نہ شک وارتیاب نے ایک لمحہ کیلئے اس کے دماغ میں جگہ پائی کیونکہ اس نے ظن وتخمین اور خرص واٹکل سے ہمیشہ ابا کیا اور یقین وایمان پر اپنے دعاوی کی بنیاد رکھی ۔ یہ ان ہی پاک نفوس کا دعویٰ تھا کہ وہ لوگوں کو بصیرت کی طرف بلاتے ہیں اور جس راستہ پر وہ گامزن ہیں وہ بصیرت اور یقین کا ہی راستہ ہے ۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ،	اے نبی کہدو یہ میرا راستہ ہے اور میں بصیرت کے ساتھ اللہ کے راستہ کی طرف بلاتا ہوں اور جو میرے پیرو کار ہوں گے وہ بھی بصیرت ہی کی دعوت دیں گے ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

یَا قَوْمِ أَرَأَیْتُمْ إِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ ○ | اے میری قوم! کیا تو نہیں دیکھتی کہ میں بینہ پر قائم ہوں جو میرے رب کی طرف سے عطا ہوا ہے۔

انبیاء کرام کا دعویٰ تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے جو چیز پیش کرتے ہیں اس کا ظنون واوہام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ حجت وبرہان کی روشن تعبیر ہوتی ہے۔

یَا أَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ○ | اے لوگو تمہارے رب کا برہان تمہارے پاس آگیا ہے اور تم کو روشنی عطا کی گئی ہے۔

اسی لیے قرآن کریم اعداء حق سے بھی برہان طلب کرتا ہے کیونکہ ظن وتخمین کا انبار تو ہر شخص کے پاس موجود ہے۔

هَاتُوْا بُرْهَانَکُمْ إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ○ | اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو کوئی برہان پیش کرو۔

قرآن کریم نے خدا کی مخلوق کو بتایا کہ تمام ہلاکتوں کا سرچشمہ اور حقیقت سے دوری ومہجوری کا سبب یہی ظن ہے۔ جس کی اکثر لوگ پیروی کرتے ہیں۔

وَمَا یَتَّبِعُ أَکْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ○ | اکثر لوگ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ○ | ان کے پاس سوائے اندازہ اور اٹکل کے کوئی علمی بات نہیں ہے۔

جس بات کی بنا جہل اور ظن پر ہو اس کی پیروی کرنے سے اسلام نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ | جس بات کا تم کو علم ویقین حاصل نہیں اسکے پیچھے مت پڑا کرو۔

اس آیت کی شرح میں امام راغب اپنی مفردات میں لکھتے ہیں ای لا تحکم بالقیافة والظن یعنی اگر علم نہیں ہے تو محض قیافہ اور گمان سے کوئی حکم نہ لگایا کرو۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں۔

لا تتبع ما لم یتعلق به علمك تقلیدًا ورجمًا بالغیب ○ | اگر کسی بات کا علم نہ ہو تو نقال بنکر اس کی پیروی نہ کیا کرو۔

پس جہاں علم ویقین ہوگا وہاں ظن اور ریب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی اور نہ اختلاف کا کوئی شائبہ پایا جائیگا کیونکہ اختلاف کا منشا ظن اور اٹکل ہے اور اتحاد ویکسانیت کا سرچشمہ علم وبصیرت! مشاہدہ اور قیاس میں فرق بھی یہی ہے کہ مشاہدہ میں کبھی اختلاف جگہ نہیں پاسکتا۔ مگر قیاس اور اندازہ کا سب سے بڑا نتیجہ تضاد واختلاف ہی ہے۔

ایک مثال

مشاہدہ اور قیاس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہاں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ہم کسی مکان میں بیٹھے ہیں۔ آفتاب غروب ہو چکا

ہے مکان کی وسعت و فراخی کے اعتبار سے جا بجا بجلی کے قمقمے لگے ہوئے ہیں یہ تمام قمقمے دفعتاً روشن ہو جاتے ہیں اور مکان کا گوشہ گوشہ جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے۔ دفعتاً سینکڑوں قمقموں کا روشن ہو جانا کس قدر حیرت انگیز ہے؟ مگر کیا آج تک کسی کو اس روشن حقیقت میں شبہ ہوا؟ اور کیا لاکھوں انسانوں میں سے کسی ایک نے بھی اس برقی روشنی کے اسباب میں اختلاف پیدا کیا؟ آخر یہ اتحاد آرا کیوں ہے اور کس لئے معمولی سا اختلاف بھی نہیں پایا جاتا؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر شخص بجلی کی حقیقت اور اسکی عملی تاثیر کا علم رکھتا ہے ہم کو معلوم ہے کہ قمقموں کا تعلق ایک باریک تار سے ہے اور اس تار کا تعلق ایک بجلی گھر سے ہے جہاں بجلی بنائی جاتی ہے۔ بجلی گھر میں بجلی کے ماہرین کام کرتے ہیں اور ان کی نگرانی میں بجلی تقسیم کی جاتی ہے۔ گویا یہ ہمارا مشاہدہ ہی ہے جس نے اختلاف پیدا نہیں ہونے دیا اور لاکھوں انسانوں کو ایک ہی حقیقت پر متحد کر دیا۔

لیکن اگر اس عظیم الشان مکان میں ایسے دس بیس آدمیوں کو لا کر بٹھا دیا جائے جنہوں نے کبھی نہ بجلی کا نام سنا ہو اور نہ اس کے کارخانوں کا کوئی تصور ان کے دماغ میں آیا ہو اور نہ کبھی انہوں نے کسی قمقمہ کو اپنی زندگی میں روشن ہوتے دیکھا ہو اور پھر ان کے سامنے بیک وقت سینکڑوں قمقمے روشن ہو جائیں تو کیا پھر بھی ان میں یہ اتحاد پایا جا سکے گا؟ اگر ایسے بیس شخص ہوں گے تو برقی روشنی کے اسباب و علل میں بیس ہی آرا ظاہر کریں گے۔ اور ایک کی رائے دوسرے کی رائے سے ٹکرائے گی۔ یہ اختلاف صرف اس لئے پیدا ہوا کہ بجلی کی روشنی اور اس کے اسباب و علل کے متعلق ان کا ذاتی مشاہدہ نہیں ہے ان کو نہیں معلوم کہ قمقمہ کا تعلق ایک باریک تار سے ہے وہ نہیں جانتے کہ تاروں میں بجلی گھر سے روشنی تقسیم ہوتی ہے۔ وہ ہرگز واقف نہیں کہ بجلی گھر میں کیا ہوتا ہے اور اس کا وجود بھی ہے یا نہیں کیونکہ وہ اس تمام گورکھ دھندے سے خالی الذہن ہیں اور علت و معلول کی تلاش محض اندازہ کے سہارے کر رہے ہیں۔

یہی چیز ہے جو انبیاء کرام اور فلاسفہ کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے۔ انبیاء کرام علوم ماوراء عقل کے باب میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ ان کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے ان میں اختلاف نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلہ میں فلاسفہ محض اٹکل اور اندازہ سے بات کرتے ہیں جس سے خود بھی ان کے اندر اذعان و یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اس لئے ان میں اختلافات کی بھرمار ہے اور ایک فلسفی دوسرے فلسفی کے دلائل کو توڑنے کی قسم کھائے بیٹھا ہے۔

میں نے جو کہا کہ انبیاء کرام اندازہ سے بات نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کا اپنا مشاہدہ ہوتا ہے اس حقیقت کو خود قرآن کریم نے واضح فرمایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عذاب و ثواب جنت و دوزخ حیات بعد الموت اور دیگر فوق العقل امور کی تبلیغ کی تو کفار اور جاحدین نے ان سب حقائق کا انکار کیا۔ اس پر باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

اَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى | کیا تم اس بات میں شک کرتے ہو جس کو پیغمبر عیاناً دیکھ رہا ہے؟

یعنی مشاہدہ کی تکذیب تو کسی حال میں نہیں ہو سکتی مگر تم عداوت میں اتنے آگے بڑھ گئے ہو کہ مشاہدہ کا بھی انکار کرنے لگے۔ ہاں اگر خود پیغمبر کی ذات میں تم کو شک ہو تو ان کی سیرت اور زندگی کے حالات پر غور کر کے اس کا فیصلہ کر سکتے ہو۔

یہ حقیقت کہ انبیاء کرام نے الٰہیات اور امور ماورائے عقل کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ ان کا مشاہدہ تھا جس میں ریب و شک کی کوئی گنجائش

زتھی اس بات سے ثابت ہے کہ ہزاروں انبیا رمختلف زمانوں اور مکانوں میں مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے ماحول میں پرورش پائی اور مختلف خیالات وادوارسے ان کو گذرنا پڑا لیکن باین ہمہ ان کی تعلیمات اور دعاوی میں جو شدید اتحاد پایا جاتا ہے وہ اپنی مثل آپ ہی ہے۔ کسی ایک نبی نے بھی انبیار سابقین کے کسی ایک دعوی کی بھی تکذیب نہیں کی اور نہ کوئی رسول کسی دوسرے رسول کی تعلیم کی بابت شک وشبہ میں گرفتار رہا۔ انبیار کرام کی تعلیمات کے اس حصہ کو یہاں نظرانداز کر دیجیے جس کا تعلق تزکیہ نفس ـ ضابطہ اخلاق اور قیام عدل وحقوق سے ہے۔ صرف اس تعلیم کو لیجیے جو فہم وادراک کی سرحد سے خارج ہے۔ کیا کسی پیغمبر نے بھی اس تعلیم کے کسی حصہ سے اختلاف کیا؟ کیا اس پاک گروہ میں بھی اصول وفروع میں جنگ وجدال کا ایسا ہی بازار گرم ہے جیسا آپ کو گروہ فلاسفہ میں نظر آتا ہے؟ کیا کسی نبی رسول نے اپنے کسی قول سے رجوع کیا یا اپنی تعلیم کے کسی حصہ پر شک وشبہ کا اظہار کیا؟ کون سا ایسا نبی گذرا ہے جس نے اپنے سے پہلے رسولوں کی تعلیم پر جرح وقدح کی ہو اور ان کی تنقیص کا کوئی پہلو نکالا ہو؟ شک وارتیاب عدل رجوع رد وقدح ـ ابطال واحقاق کی جو گرم بازاری آپ کو فلاسفہ میں نظر آتی ہے وہ گروہ انبیار میں ہرگز نظر نہ آئے گی۔ وہاں سب سے پہلی اور آخری چیز ایمان بالرسل اور اتحاد واتفاق ہی ہے۔ قرآن کریم نے گروہ انبیا کے اس اتحاد پر خود روشنی ڈالی ہو چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ہ

اے نبی آپ اپنے سے پہلے انبیار کی تعلیمات پر غور کیجیے کہ کیا ہم نے کسی نبی کو بھی یہ الہام کیا تھا کہ رحمٰن کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بنالو

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ہ

ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے اور ان کو یہی تعلیم دی کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کو معبود نہ بناؤ۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ ہ

ہم نے نوح ـ موسیٰ ـ وعیسیٰ علیہم السلام کو جو شریعت دی تھی اس میں یہی حکم دیا تھا کہ دین کو قائم کرو۔

خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی شرح میں فرماتے ہیں۔

اَنَا مَعْشَرُ الْاَنْبِيَاءِ دِيْنُنَا وَاحِدٌ

ہم سارے انبیا کا دین ایک ہی ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں فلاسفہ کی جدلیات اور خرافات کو دیکھیے کہ کسی ایک بات میں بھی اتفاق ہے۔ ہر فلسفی نے ایک نئی دنیا قائم کی اور ہر نئے فلسفی نے پہلے فلاسفہ کی تکذیب کو اپنا معاقرار دیا۔ ارسطو ـ افلاطون ـ فیثاغورث ـ بقراط ـ ابن سینا کے اختلافات آج بھی ہم کتابوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر فلاسفہ کو علوم عقلیہ میں یقین کا درجہ حاصل ہو گیا تھا تو پھر اشراقیین مشائیین اور رواقیین کی جماعت بندی کیسی؟ یہ تقسیم ہی بتا رہی ہے کہ اس گروہ کے اختلافات جہلا اور عامیوں کے اختلافات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اور ان کی یقینیات شک وارتیاب سے آگے نہیں بڑھتیں۔ یونان کے فلاسفہ کو چھوڑیے اور مغرب کے دانش فروش فلاسفروں کے "یقینیات" پر نظر کیجیے کہ ان غریبوں نے آپس ہی میں ایک دوسرے کی کیسی پگڑیاں اچھالی ہیں۔ کانٹ اور اسپینوزا ـ زینو اور نیوٹن ـ اولیور لاج اور ڈیکارٹ ـ ہیگل اور بیکن

بکیلے اور جیرڈکس کس کا نام لیا جائے ان میں کون سے ایسے دو فلسفی بھی ہیں جن کی تحقیقات کا مدار متفق علیہ ہے اور اول سے آخر تک ایک ہی بات ان کے منہ سے نکلی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ فلاسفہ کے اختلافات صرف اس لئے ہیں کہ ان کے پاس یقین حاصل کرنے کے ذرائع نہیں ہیں وہ محض باندازہ اور تخیل سے کسی راستہ پر قدم رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر ناکام رہتے ہیں اور کبھی اتفاق سے کسی مسئلہ میں صحت کے درجہ تک پہونچ جاتے ہیں مگر اذعانی اور یقینی کیفیت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔

ان کے مقابلہ میں انبیاء کرام آپس میں کس قدر متحد ہیں۔ امور غیبیہ اور طبعیات میں ان کی موافقت کتنی شدید ہے؛ ایک پیغمبر نے جو کچھ کہا اس کو دوسرے نے مدار یقین قرار دیا اور ذرہ برابر بھی اختلاف پیدا نہیں ہونے دیا۔ سچ فرمایا خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے "انا معاشر الانبیاء و دیننا واحد"۔ اگر ہزاروں پیغمبروں کا یہ اتفاق محض اتفاق ہے تو ایسے اتفاق کی کم از کم اس دنیا میں تو کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اگر وہ کہیں موجود ہے تو اس کی نشان دہی میں ہرگز بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

انبیاء کرام پر اگر اعتماد نہ کیا جائے اور ان کے مشاہدات کو بھی فلاسفہ کے ہم پلہ قرار دیا جائے تو پھر اذعان اور یقین کو دنیا سے مٹ جانا چاہیئے۔ کیونکہ پھر ارتیاب اور شکوک کے سوا اور کسی کی فرمانروائی نہ ہوگی جس کی امور غیبیہ میں مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ امور غیبیہ اور آلہیات میں فلاسفہ اور عوام میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ فلاسفہ فوق الادراک امور میں ایسے ہی پس ماندہ اور لاچار ہیں جس طرح عام لوگ۔ نہ فلاسفہ کے پاس یقینی ذرائع موجود ہیں نہ عوام کے پاس۔ اگر کچھ ذرائع میسر ہیں بھی تو اس میں عوام اور فلاسفہ کا درجہ برابر ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک گروہ ضبط و نظم اور تسلسل کے ساتھ اپنے تصورات کی عمارت کھڑی کر دیتا ہے اور دوسرا ان داؤں اور پیچوں سے واقف نہیں ہے۔

علمی معلومات۔ (از حکیم شریف الدین صاحب بقائی مالک دواخانہ بقائی دہلی)

مادۂ نومیہ پیرس کے مشہور ڈاکٹر ہنری بیرن کا بیان ہے کہ انسان جب سونے کیلئے اپنی دونوں آنکھیں بند کرتا ہے تو "مادۂ نومیہ" اس کے دماغ میں پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جب کافی مقدار میں یہ مادہ انسان کے دماغ میں پہونچ جاتا ہے تو وہ سو جاتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نہایت محنت و جانفشانی کے بعد دماغ سے اس مادہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور انجکشن کے ذریعہ سے بعض اشخاص پر اسکا تجربہ بھی کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انجکشن کرتے ہی ان پر غنودگی طاری ہو گئی بعض ایسے اشخاص پر بھی تجربہ کیا گیا ہے جو طویل خواب کے بعد بیدار ہوئے تھے۔ لیکن اس انجکشن کے بعد وہ فوراً ہی سو گئے۔

ضعفِ بصر عہد حاضر کے علمی مباحث ہمیں اس نتیجہ پر پہونچاتے ہیں کہ انسان میں ضعف بصر کا سب سے اہم سبب اسکی غذا میں مادہ کلیم کی کمی ہے مادہ کلیم کی اس کمی کا اثر انسان کی قوت بینائی پر پڑتا ہے جو ایک زمانہ تک اثر انداز ہوتے رہنے کے بعد بصارت کو یکسر زائل کر دیتا ہے۔

اہل ہند کی خوشحالی

دیہاتی اور شہری باشندوں کی مالی حالت

(از مولانا طفیل احمد علیگ)

"جاوید" کے گذشتہ نمبر میں اہل ہند کی ایک سو سال قبل کی مالی حالت کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا سید احمد صاحب بریلوی کی جیسی تواضع شہروں میں ہوئی ویسی ہی قصبات میں بھی ہوئی تھی۔ اور شہروں اور مفصلات کی حالت میں زیادہ فرق نہ تھا۔ مگر آج کل کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ شہروں کی آبادیوں میں بہت زیادہ ترقی ہے اور اسی نسبت سے قصبات اجڑ رہے ہیں اور جو کچھ خوشحالی ہے وہ صرف شہروں تک محدود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں شہری اور دیہاتی آبادی کی کیا نسبت ہے۔ اس وقت سے چند سال قبل جو حالت تھی اُس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

کل ہندوستان میں ۳۵ شہر ایسے ہیں جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔ ایسے کل شہروں کی مردم شماری ۸۵ لاکھ ہے۔

کل ہندوستان میں ۵۴ شہر ایسے ہیں جن کی آبادی ۵۰ ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان ہے اور سب کی مجموعی مردم شماری ۳۵ لاکھ ہے۔

کل ہندوستان میں جملہ شہر اور قصبات جن کی آبادی ۴ ہزار یا اس سے زیادہ ہے ان سب کی مجموعی مردم شماری ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے۔

اس حساب سے شہری اور قصباتی آبادی صرف دس فی صدی ہے اور باقی ماندہ ۹۰ فی صدی آدمی دیہات میں رہتے ہیں۔ ان دیہات کی تعداد ۵ لاکھ کے قریب ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دیہات کی حالت کیا ہے۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ گورنمنٹ کی طرف سے ہر سال ایک رپورٹ ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی، اور عام حالت کے متعلق مرتب ہو کر پارلیمنٹ میں بھیجی جاتی ہے۔ جس میں ہر امر کو گورنمنٹ کے نقطہ نظر سے لکھا جاتا ہے۔ سب سے آخری رپورٹ جو پبلک کے سامنے طبع ہو کر آئی ہے وہ "انڈیا ان ۱۹۳۰-۳۱ء" ہے۔ اس میں ہندوستانیوں کی مالی حالت کے بارہ میں حسب ذیل تحریر ہے۔

"ہندوستان کے دیہات کی خصوصیت خاص ان کا افلاس ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے عوام الناس

کی حالت قابل افسوس ہے" (صفحہ ۱۵۶)

"دیہاتی آبادی کی اکثریت کو محض قوت لایموت ملتا ہے۔ اور زراعت کے مزدور غالباً سب سے زیادہ بدقسمت ہیں" (صفحہ ۱۵۷)

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ ۹۰ فی صدی آبادی کی مالی حالت تو مسلّم طور پر بدترین ہے۔ اب رہے باقی ماندہ ۱۰ فی صدی اشخاص جو قصبات اور شہروں میں رہتے ہیں۔ ان میں سے جو قصبات میں رہتے ہیں ان کی حالت دیہاتیوں سے بھی بدتر ہے کیونکہ وہاں نہ زراعت ہے، اور نہ صنعت۔ اب صرف وہ شہر رہ جاتے ہیں جن کی آبادی ۵۰ ہزار سے اوپر ہے اور یہی وہ شہر ہیں جن میں کارخانے، ملیں اور منڈیاں ہیں۔ ایسے شہروں کی تعداد ہندوستان میں ۸۹ اور آبادی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ہے۔ اس آبادی کو اگر بڑھا کر دو کروڑ بھی کر دیا جائے تو کل ہندوستان میں ۶ فی صدی آبادی ایسی ہوگی جو شہروں میں رہتی ہے اور جسے صنعت و حرفت اور کاروبار میں حصّہ لینے کا موقع ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ شہروں میں رہنے والوں کی مالی حالت کیسی ہے۔ وہاں بالعموم مزدوروں اور کاریگروں کو کافی کام ملتا ہے مگر ان کی محنت کا بڑا حصہ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی جیبوں میں جاتا ہے۔ اور گرانی اور مکانات کی قلت کی وجہ سے وہ سخت ترین زندگی بسر کرتے ہیں۔ بالخصوص مکانات کی تنگی کا اثر غربا کی عورتوں اور بچوں پر بہت خراب پڑتا ہے وہاں وہ چاٹ کی چیزیں کھانے، اور شراب خوری اور رنڈی بازی میں مبتلا ہو جاتے ہیں سینما اور تماشے دیکھنا اور جوا کھیلنا سیکھ جاتے ہیں۔ تازہ ہوا انہیں نصیب نہیں ہوتی اور فی الجملہ دیہات کے کھیتوں کی کھلی ہوا میں کام کرنے والوں سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ شہروں کے ان مزدوروں اور کاریگروں اور تھوڑی تنخواہ پانے والے کلرکوں کو اگر منہا کر دیا جائے تو صرف بڑے رئیس، سرمایہ دار، اور عہدہ دار ایسے رہ جاتے ہیں جو اس زمانہ میں عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ہندوستان کی باقی ماندہ کثیر آبادی اس وقت افلاس اور پریشانی کی حالت میں ہے۔ ممکن ہے کہ میرا نظریہ صحیح نہ ہو اس لئے میں ناظرین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلہ پر غور کر کے اپنی اپنی آراء کا اظہار فرمائیں۔

(بقیہ مضمون بسلسلہ صفحہ ۲)

BerKeley کا خیال بھی علمیات کے لحاظ سے یہی ہے کہ جسم کی حقیقت مشاہدہ میں زائل ہو جاتی ہے۔ نظریہ علم کے ساتھ ساتھ اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔ جرمنی فلسفہ کی بنیاد بھی یہی ہے خاصکر جب سے کہ Kant نے نظریہ علم کی نوعیت پر دقیقہ سنجی سے بحث کی ہے۔ طبعی دنیا اسی حقیقت کا مظہر ہے جو روحانی دنیا میں اپنے حقیقی وجود کا اظہار کرتی ہے اس امر پر Schopenhauer- Hegel اور Beneke جیسے اختلاف رکھنے والے بھی متفق ہیں۔ نطرتی علوم کے دلدادگان کے نزدیک وحدانیت مادیت کی علامت کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن علمیات کا ماہر Kant کی پیروی کرتے ہوئے اس امر کا معتقد ہے کہ طبعی اور روحانی دنیا حقیقت کے مظہر کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ اس حقیقت کو گو ہم نہیں جانتے لیکن وہ اتحاد اور یکسانیت سے متصف ہے۔ یہ دہریت کی وحدانیت کا مطمح نظر ہے اور Herbert Spencer اسی خیال سے متفق ہے۔

مابعد الطبیعات کا تاریخی ارتقا

(از جناب سید مغنی الدین شمسی دہلوی)

"ذیل کا مضمون جرمنی کے مشہور و معروف عالم فریڈرش پاؤلسن (Firedrich Paulsen) کی مشہور تصنیف INTRODUCTION TO PHILOSOPHY (جسکا ترجمہ مفتاح الفلسفہ ہو سکتا ہے) کے ایک حصّہ کا ترجمہ ہے اس مضمون کا مطالعہ مسئلہ مابعد الطبیعات کے متعلق علمائے مغرب کے تازہ افکار و آرا قارئین کے سامنے پیش کر دے گا اور علمائے اسلام تعلیمات اسلام کی روشنی میں اس مسئلہ پر بحث و نظر کر سکیں گے" (ادارۂ جاوید)

حقیقت کی نوعیت پر غور کرنے سے سب سے پہلے عام تصور کی بنا پر جو اشیاء ہمارے زاویہ نظر میں آئیں گی وہ مرئی اور دائرہ لمس پر مشتمل ہوں گی۔ لامحالہ دل و دماغ میں یہ خیال پختہ ہوتا ہے کہ طبعیاتی دنیا ہی حقیقت اور حقیقت کی اصل ہے۔ کیا یہ تصور صحیح ہے؟ کیا ہمارا قلب اور دماغ کے منظم اجزا ہماری صحیح رہنمائی کر رہے ہیں؟ یہ سوال ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے ہم نے صرف حقیقت کی نوعیت کا ایک نظریہ سپرد قلم کیا ہے۔ اور ہمیں اتنا بھی معلوم ہے کہ یہ نظریہ مادیت کے نظریہ سے بالکل جدا ہے۔ یہ عام تصور کا نتیجہ ہے اور مادیت علمی غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ مادیت طبعیات کے ساتھ ہی دوسری حقیقت یعنی روح کو بھی تسلیم کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ جاندار اجسام میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو جسم یا کم از کم حقیقی جسم نہیں ہے یہ ایک عجیب امر ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں روح کے مترادف الفاظ موجود نہ ہوں۔ چنانچہ دنیا کی جملہ اقوام روح کی حقیقت اور وجود کو تسلیم کرتی ہیں۔

روح کے وجود ذاتی کا تصور کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس کی اصل کیا ہے؟ وہ مندرجہ ذیل حقائق سے واضح ہوتا ہے۔ ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدہ زندگی سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جاندار اور بے جان اجسام کے درمیان بیّن اور اہم فرق ہے اس فرق کو ہم صراحتاً محسوس کرتے ہیں۔ اول الذکر اپنی قوت ارادی کے ایک ادنیٰ اشارے پر حرکت کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف بے جان اجسام اس قوت اور اس کے ساتھ ہی حرکت سے محروم و قاصر ہیں۔ ان کی حرکت خارجی قوتوں کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ چنانچہ جمہور کی رائے ہے کہ یہ صرف اس بنا پر ہے کہ جاندار اجسام میں یقیناً کوئی ایسی شے مضمر ہے جو ارادہ کرتی ہے حرکت کرتی ہے۔ ذی احساس ہے۔ وہ شے کیا ہے؟ وہی روح ہے۔

یہ امر کہ روح ایک خاص جوہر ہے اور اپنا ذاتی وجود رکھتی ہے۔ صرف ایک قوت یا عرض نہیں ہے۔ ایک دوسری حقیقت سے واضح ہوتا ہے۔ وہ حقیقت موت ہے۔ وہ موت جس کا سکہ چار دانگ عالم پر بیٹھا ہوا ہے جس سے کوئی شخص منحرف

نہیں ہو سکتا۔ غور و فکر کی ابتدائی منازل پر اس حقیقت کا عمیق اثر پڑتا ہے۔ وہی امتیاز جو ابھی جاندار اجسام کو بے جان اجسام پر موت سے پہلے حاصل تھا۔ وہ موت کے بعد حرف غلط کی مانند معدوم ہو جاتا ہے۔ وہی جسم جس کو ابھی اپنی حرکت پر فخر تھا اب بے حس و حرکت پڑا ہے۔ یہ کیا ہوا۔ کیا سانحہ گزرا۔ موت نے کیا جادو کر دیا۔ جسم وہی ہے جو پل بھر پہلے تھا۔ خارجی حیثیت سے نہ اس میں کوئی نقصان واقع ہوا نہ کوئی تبدیلی۔ صرف حرکت ارادی کا فقدان ہے۔ اس سے لازمی طور پر یہی نتیجہ مرتب ہوگا کہ ذی حرکت شے یعنی روح اس جسم سے پرواز کر گئی۔ قریب اور بدیہی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ جزو تھی اس کا نقصان ظاہر ہوتا۔ اور یہ امر کہ وہ جوہر ہے یعنی ذاتی وجود کی مالک ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جسم سے علیحدہ ہو کر اپنا وجود قائم رکھتی ہے تجربہ کی بنا پر جملہ اقوام اس امر پر متفق ہیں کہ روح کیلئے موت نہیں۔ وہ پھر ظاہر ہو سکتی ہے اور موثر ہے۔ انسانی تاریخ کے صفحات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہمیشہ سے مردوں کی پرستش ہوتی آئی ہے یہ اس عقیدے کا ایک یقینی ثبوت ہے کہ جو روح جسم انسانی سے پرواز کرتی ہے وہ قائم و دائم رہتی ہے۔ غیر موجود شے کی کوئی شخص پرواہ نہیں کیا کرتا۔ مزید برآں بحالت زندگی روح کی جسم سے عارضی علیحدگی بھی تمدن کے ابتدائی دور کا ایک عام تصور ہے خواب کی حالت میں بھی جسم بے حس و حرکت ہوتا ہے لیکن روح خالی از عمل نہیں ہوتی۔ وہ دیکھتی بھی ہے سنتی بھی ہے۔ محسوس بھی کرتی ہے اور بعض اوقات تعجب انگیز واقعات کا مشاہدہ بھی کرتی ہے۔ اسی کو ہم خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ابتدائی تصور اس کی توضیح دوسرے پیرائے میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روح سونے کی حالت میں جسم کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور آزاد پھرتی ہے اس حالت میں جو سوانح اس پر گزرتے ہیں ان کو ہم اپنی زبان میں خواب کہتے ہیں۔

ابتدائی تصور میں روح کی حقیقت کیا تھی؟ اس کی تفصیل تقریباً درج ذیل ہے۔ وہ ایک بھاپ سے مشابہ۔ مرئی غیر محسوس جسم سے ملتا جلتا سایہ کی مانند ایک وجود ہے۔ کیونکہ زندگی کا انحصار بظاہر سانس پر ہے۔ لہٰذا بہت سی زبانوں میں اسے سانس سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن۔ بھوت اور ارواح سے ڈرنے والے روح کو خبر نہیں کیا کیا سمجھتے ہیں۔ کہیں اُن میں آسیبی تاثرات کی قابلیت موجود سمجھتے ہیں۔ کہیں روح کو ذی حس اور قوت حافظہ کا مالک سمجھتے ہیں۔

علم موجودات کے لحاظ سے اگر عام رائے کو مرتب کیا جائے تو نتیجہ نکلے گا کہ اجسام دراصل حقیقت ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری حقیقت بھی ہے جو درجہ ثانی کی حیثیت سے ہے۔ وہ دوسری حقیقت جسم کی مانند ایک وجود ہے لیکن جسمانی خواص سے بہتر ہے اور اجسام میں موثر قوت کی حیثیت سے عمل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جسم سے علیحدہ بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔

حقیقت فلسفیانہ نظریہ کے مطابق ہر جگہ وحدت کی جانب رجوع ہوتی ہے۔ حقیقت کا اصول واحد سے استنباط اور موجودات کی مختلف شکلوں کی ایک اصولی شکل سے تخلیق ہے۔ یہی امر فلسفیانہ غور و فکر کی اساسی تحریک کا باعث ہے۔ موجودات کی مختلف دو شکلیں ہیں۔ ایک تو وہ جو خارجی مرئی دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ باطنی ہے

تعلق رکھتے ہیں یعنی مادیت اور روحانیت۔ مادیت کہتی ہے کہ اجسام اور حرکت ہی حقیقت کی بنیادی شکلیں ہیں اور ان ہی سے احساس فکر اور ارادے کے حقائق واضح ہوتے ہیں اس کے برخلاف روحانیت یا (idealisim) کہتی ہے۔ کہ باطنی زندگی کے حقائق جیسا کہ ہم ان کو اپنی ذات میں محسوس کرتے ہیں۔ دراصل صحیح اور حقیقت اولیٰ ہیں خیالات کو مادہ کا حاصل نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ بالعکس مادہ فکر کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ جسمانی دنیا صرف ایک مظہر ہے۔

یونانی فلسفہ کی ابتدا میں ہمیں موجودات کے یہ دونوں نظریئے نظر آتے ہیں ان دونوں نظریوں کے زبردست مدعی دیمقراطیس اور افلاطون ہیں۔ دیمقراطیس کے نزدیک تمام حقیقت جزلاتیجزیٰ اور خلا پر مبنی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے لاتیجزیٰ ذوحجم اجزا حقیقت کے اساسی اجزا ہیں اور ان ہی کی حرکات سے فطرت وقدرت کے تمام مظاہر وواقعات کی توجیہ وتوضیح ہوسکتی ہے خواہ وہ مظاہر وواقعات آسمانی ہوں یا ارضی انہی میں زندگی کے مظاہر معہ احساسات وفکر کے بھی شامل ہیں یہ تو ہوا نظریہ دیمقراطیس۔

اس کے برخلاف افلاطون سب سے پہلا شخص ہے جس نے مغربی ممالک میں روحانیت کا ڈنکا بجایا۔ اور اس خیال کو بہ تمام وکمال ظاہر کیا کہ اجسام درحقیقت حقیقت ہی نہیں۔ بلکہ حقیقتاً وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ محض دوسری حقیقت کے مظاہر ہیں۔ حقیقت بذاتہ روحانی نوعیت رکھتی ہے۔ دنیا خود موجودہ خیالات کا ایک نظام ہے۔ عقل یا ذہن قیاسی غور وفکر کے قوانین کے مطابق اس اصلی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے اور قوت متخیلہ ومتصورہ عارضی وجود میں آنے والی اور فنا ہوجانے والی اور فضا میں پھیلی ہوئی خیالی دنیا کی ہم شبیہ اشیاء کو جسمانی اشیا اور مظاہر سے متعلق سمجھتی ہے۔

ارسطو رائے عامہ سے نزدیک تر ہے۔ وہ فلسفیانہ مسائل کے مباحث میں اکثر محاورہ زبان سے تمہید اٹھاتا ہے چنانچہ اپنے فیصلہ میں بھی اسی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ یکطرفہ ونا ہموار خیالات کو پسند نہیں کرتا جنکو کہ دیگر علما تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس کا فلسفہ اپنی کمزوری اور استحکام کے لحاظ سے وسطی فلسفہ ہے اس کی موجودات روحانیت کی طرف راجع ہے۔ وہ اپنی دوسری کتاب کی ابتدا میں روح کی حقیقت پر بحث کرتا ہے۔ کہ وہ ایک عضوی جسم کی شکل ہے۔ اس تعریف سے تصور عامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب بہت گہرا ہے۔ روح جسم کا خاکہ یا سایہ نہیں ہے۔ مرئی اور محسوس نہیں بلکہ باطنی اور کار پیدا شکل مراد ہے جو زندگی کے اصول کے لئے موثر ہے اور اس کی تشکیل کرتی ہے۔ وہ شے جس کی بنا پر ایک عضوی مردہ جسم اور بے جان جسم کے درمیان امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ وہ روح کا عمل ہے۔ ارتقا۔ حرکت ارادی۔ احساس۔ خواہش۔ غور وفکر وغیرہ وغیرہ۔ مادہ کے ان اجزا سے جن سے عضوی اجسام کی ساخت ہوتی ہے ان سے جسمانی اعضا کے کام کا سراغ نہیں ملتا۔ وہ ایک خاص اصول زندگی کے عمل کا اثر ہیں۔ اور وہ کیا چیز ہے۔ وہ روح ہے۔ وہی جسم کو جسم بناتی ہے۔ مادہ صرف زندگی کا امکان پیدا کردیتا ہے۔ جیسا کہ لکڑی سے کمان کا بننا ممکن ہے۔ اور سنگ مرمر سے ایک مورت بن سکتی ہے۔ لیکن صورت اور شکل اس ممکن مورت کو حقیقت کا جامہ پہناتی ہے اسی طرح روح عضوی مادے کو چلتا پھرتا جسم بناتی ہے۔ دونوں اصولوں سے ظاہر ہے کہ صورت وشکل حقیقی رشتے ہیں۔

اور مادہ محض اتفاقی اور درجہ ثانی کی حیثیت رکھتا ہے اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ کیا شے ہے۔ تو اس کا جواب صورت و شکل دیا جاتا ہے اور پھر یہ سوال کیا جائے کہ وہ کس چیز سے بنا تو اس کے جواب میں کہا جائیگا کہ مادہ سے بنا۔ مادہ بذات خود ایک معین اور غیر محسوس امکان ہے۔ صورت و شکل سے وہ ایک معین متشکل اور محسوس حقیقت بن جاتا ہے۔ خدا کے متعلق خیال کرتے جو کہ امکان کے دائرہ سے خارج ہے اور محض صورت ہے۔ یعنی خالص فکر ہے۔ مادہ کے خیال سے بالکل قطع نظر کر لی ہے۔ افلاطون کی طرح وہ سرے اس خیال کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ کوئی فلسفہ ایسا نہیں جو عام تصور کے اتنا قریب تر ہو اشیاء کی تخلیق۔ صورت و مادے قوت اور امکان سے ہوتی ہے۔ یہی توضیح رائے عامہ سے قریبی نسبت رکھتی ہے۔ افلاطونی کی ناہمواری اس وجہ سے غیر محسوس ہے کہ عام عقل اس کے نظریہ کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر اس خیال کو وسعت ہوتی ہے کہ افلا کے نظریہ کی کھپت فلسفہ میں صدیوں تک اسی وجہ سے ہوئی۔

جدید فلسفہ نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جو کہ بڑے یونانی فلسفیوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ مادیت اور روحانیت ا اساسی اصول ہیں۔

Cartesius کے نزدیک دوئیت شروع ہوتی ہے جسم اور روح حقیقت کی دو متضاد صورتیں ہیں جسم ایک وجود ہے جس کا مابہ الامتیاز جسم ہے۔ روح ایک وجود ہے جس کا مابہ الامتیاز فکر یا آگاہی ہے یہ rtesius کے فلسفہ کی اصولی تعریفیں ہیں۔

اجسام کا جدید مفہوم قدیم ہے Galilei نے فطرتی علوم میں ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔ حرکت نہ پیدا ہوتی ہے اور نہ ہوتی ہے جس طرح کہ ایک ساکن جسم بغیر خارجی اثر کے ساکن حالت میں رہتا ہے اسی طرح ایک متحرک جسم اپنی حرکت کو یکساں نہ سمت میں غیر متناہی زمانہ تک قائم رکھتا ہے زمانہ وسطیٰ کے فلسفہ ارسطو میں اجسام و دیگر اشیا کے فطرتی معمول کے مطابق۔ پیدا اور نہیں ہوتے۔ حرکت کے زائل ہو جانے کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوئے۔ اگرچہ عام عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی لیکن روزمرہ کا تجربہ تصدیق صاف طور پر کرتا ہے۔ لہذا وہ حرکت جو کہ پہلے موجود نہیں تھی وہ روح کے اثر و عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ scarte Galilei کے اس جدید خیال کو تسلیم کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ حرکت کی مقدار کائنات میں دائمی طور پر مقرر ہے اس میں نہ واقع ہوتا ہے اور نہ اضافہ۔ بلکہ وہ ایک دوسرے پر بذریعہ لمس منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یعنی دباؤ یا دھکے کے ذریعہ سے اس سے متعارفہ استنباط ہوتا ہے کہ تمام فطرتی واقعات بلا استثنا لمس پر مبنی ہیں۔ حتیٰ کہ عضوی اجسام میں زندگی کا عمل بھی اسی پر ہے۔ علم ترکیب اجسام حیوانات بھی زندگی کی کارروائی و عمل کی میکانیت کا نام ہے اسی سے متعلق ایک متضاد مقولہ ہے کہ ر فطرتی علوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصول آلہ توضیح قرار نہیں دی جا سکتی۔ ماہر طبعیات اس کے وجود کا منکر ہے کیونکہ اگر وہ اس کے متعلق اجسام کے تغذیہ۔ نشوونما حرکت و زندگی کا منبع روح کو سمجھ بیٹھے تو وہ اپنے علم سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہیں ہو میکانی طبعیات اور علم ترکیب جسم حیوانات کا عکس خالص روحانی نفسیات ہے مگر جسمانی زندگی کے اعمال کی

عمل سے توضیح نہیں ہوتی تو اسی طرح طبعی نوعیت کے اعمال سے فکر کی توضیح ناممکن ہے۔ حرکت سے حرکت ہی پیدا ہوسکتی ہے حرکت سے عمل آگاہی بطور نتیجہ کے برآمد ہونا ناممکن ہے ورنہ اسکو اس میں جذب ہوجانا چاہیئے یعنی اس کی طبعی نوعیت پھر باقی نہیں رہنی چاہیئے اور یہ طبعی متعارفہ کے خلاف ہے لیکن ساتھ ہی فکر کی حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یقیناً اس کا وجود ہے اسی لئے ضروری ہوا کہ یہاں ایک خاص اصول اختیار کیا جائے جو جسم سے بالکل مختلف ہو اور وہ روح ہے۔ یہیں سے جدید فلسفہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو میکانی طبعیات سے شروع ہوتی ہے اور دوئیت کی تعریف کے دائرہ کو بہت تنگ کر دیتی ہے۔

لیکن دوئیت جدید فلسفہ کی انتہائی اصطلاح نہیں ہے کیونکہ وہ آخرکار خود بخود وحدانیت میں تبدیل ہوجاتی ہے اب سوال صرف ان دونوں مختلف حقیقتوں کی آپس کی نسبت کا باقی رہتا ہے۔ ایک اور امر قابل لحاظ یہ ہے کہ جسم اور روح کے اعمال کے مابین باقاعدہ تعلقات ہیں۔ حرکت ارادی کے ساتھ ساتھ احساس اور ارادہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ذہنی آلات کی حرکت کے ساتھ ساتھ ادراک، جذبات اور فکر و توجہ بھی پیدا ہوتی ہے اس نسبت کو کس طرح قائم کیا جائے جبکہ جدید میکانی طبعیات کے اصول کے مطابق تبادلہ عمل کا خیال باطل ثابت ہوتا ہے۔ اس کا جواب Spinoza دیتا ہے۔ یعنی ان دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جسم اور روح ایک دوسرے سے بالکل مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایک ہی شے ہے جس کو دو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جارہا ہے۔ عمل حرکت اور عمل آگاہی حقیقت میں ایک ہی عمل ہے۔ ایک مرتبہ اس کو خارجی طور پر اور دوسری مرتبہ اسکو باطنی پہلو سے مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور یہی نسبت تمام حقیقت میں سرایت کی ہوئی ہے۔ حقیقت جو کہ ایک واحد وجود اور جوہر ہے اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک جسمانی اور دوسری آگاہی۔ اس سے واضح ہوا کہ طبعیات اور روحانیت میں باقاعدہ نسبت موجود ہے۔ طبعی اور روحانی دنیا کے درمیان متوازی نسبت ہے۔ جسمانی دنیا میں جو حرکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے وہ دوسری طرف روحانی دنیا میں ادراک یا تصور کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تبادلہ عمل کا بالکل بھی ذکر نہیں۔ دونوں کے متوازی عمل ہیں۔ نہ کہ مخلوط۔ دونوں طبعی اور روحانی دنیا اپنے اپنے دائرہ میں محدود ہیں۔ اور ان دونوں میں اتفاقی تعلق ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے۔ کوئی باطنی عمل ایسا نہیں جس کے ساتھ حرکت کو تعلق نہ ہو اسی طرح بالعکس قدرت کا کوئی عمل حرکت ایسا نہیں جس کا روحانی یا باطنی عمل سے تعلق نہ ہو۔ Spinoza اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تمام اشیاء روحانی ہیں۔ اس کا عکس یہ ہے کہ تمام روحیں جسم رکھتی ہیں۔

میں یہاں صرف ایک نکتہ کی طرف اور متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ متوازی وحدانیت کو بھی دو طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک پہلو مادیت کا اور دوسرا پہلو روحانیت کا۔ ماہرین علوم فطرت کی توجہ تمام تر جسمانی دنیا کی طرف مبذول ہوتی ہے اس لئے مادیت ان کے نہایت نزدیک ہوتی ہے۔ Hobbes کو ان کا فلسفی رہبر سمجھنا چاہیئے فلسفیوں کے نزدیک روحانیت عام طور پر زیادہ قریب ہے Leibniz کا خیال ہے کہ بے شک جسم اور آگاہی وجود کی دو بڑی صورتیں ہیں۔ لیکن ان دونوں سے حقیقت یکساں طور پر تشریح نہیں ہوتی۔ روحانی دنیا حقیقت کی اصلی نوعیت سے قریب تر ہے۔ حقیقت کے انتہائی اجزا یعنی جزو لایتجزیٰ بھی روحانی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ... [illegible] ... حقیقت کا ایک مظہر ہے ...

اسلام اور مساوات

(از مولانا محمد میاں صاحب استاذ جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد)

دنیا۔ وہ دنیا جس میں آج ہم زندگی بسر کر رہے ہیں کس کا نام ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس عجیب و غریب مخلوق کی تفسیر میں علماء نے مختلف الفاظ بیان کئے ہیں۔ مگر ہمارے خیال کے مطابق "دنیا" نام ہے انسانی افکار کی کشاکش اور طبائع امم کے انقلابات کا۔

یہ تفسیر وہ ہے جو دنیا نے ہمارے سامنے اپنا تعارف کراتے ہوئے بذات خود بیان کی۔ ضرورت تھی کہ ہم اپنی تفسیر کی تصدیق کے لئے کچھ دلائل پیش کرتے۔ مگر انسان کے خود ذاتی حالات۔ شئون قوم کے تغیرات۔ اور اقوام عالم کی تاریخ ہمیں اس ضرورت سے یعنی تمام دلائل سے بے نیاز کئے ہوئے ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہی انسانی افکار جن کے تموج کو ہم نے دنیا کہا ہے۔ دولت اور افلاس کی رنگا رنگی اور ... عجیب عجیب انقلابات پیدا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یورپ کی انوکھی تہذیب کو لیجئے۔

کیا یہ غلط ہے کہ انسانی افکار کے تموج اور ہیجان کا جب دولت اور سرمایہ داری سے اختلاط ہوا تو۔

(۱) یورپ کی سفید فام نسل اپنی بے نمک شلجمی اور بوزنوی شکل کو حسن جہاں آرا سمجھ کر دنیا پر تفوق کا مغرورانہ دعویٰ کرنے لگی۔

(۲) غلام اور آقا میں بلندی اور پستی کی بے شمار منزلیں قائم ہو گئیں۔

(۳) کالی قوم کا کوئی فرد یا کوئی جماعت۔ آقا سیمین بدن کی چشم التفات کی خاطر مذہب جیسی عزیز ترین دولت کو بھی قربان کر دے تو اس کی مثال اس پروانے سے زائد نہیں جس نے شمع کافوری کی تابانی پر خود کو نثار کر دیا۔ مگر شمع کی سوزاں ابرو میں چند شکن اور ایک چرچراہٹ کی زیادتی کے علاوہ کچھ بھی اثر قدر دانی نمایاں نہ ہوا۔

---

(۱) ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ یورپ کی سفید مورتیاں سرمایہ داری کے طاغوت اکبر کی خود بھی پجاری ہیں۔ تو طاغوت اکبر کے اشاروں کے بموجب کالے سرمایہ داروں سے چھوت چھات کا برتاؤ نہ کر سکیں۔ "ڈنر" اور "انٹرویو" بھی ہوتے ہیں شک ہیں ... مصافحے بھی۔

محض اس خوف سے کہ کہیں ... بگاڑ دیتا یعنی سرمایہ چھین نہ ہو جائے۔ قسمت نے اتنی شجاعت بھی نہیں عطا فرمائی کہ اس ... سے بے نیاز ہو کر اپنا غرور قائم رکھ سکیں۔ لیکن امریکہ کے قدیم باشندوں کی طرح ... کی ...

ہو جائے تو امریکہ کا غرور واضح دلیل ہے۔ اور کھلی نظیر پیش کر رہا ہے کہ۔ موجودہ تہذیب و تمدن میں غلام کی حقیقت مچھر کے پر کی برابر بھی نہیں۔

تفوق اور برتری کے اس غرور کو دیکھ کر تاریخ کے اوراق صفائی سے اعلان کر سکتے ہیں کہ غیر مسلم قومیں جب دولت کی مالک تھیں اور حکومت کے ساتھ شجاعت و ہمت اونکے چتر اقبال کے درخشاں موتی تھے۔ تو انکا غرور بھی اگرچہ شکم سیر تھا مگر یورپ کیطرح بوالہوسی میں مبتلا نہ تھا۔

دنیا کی قدیم قوموں میں۔ کسریٰ ایران قیصر روم۔ اور ان سے پہلے یونان اور مصر کی دولتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں مگر کیا یونان کے مظالم۔ اور فرعون مصر کی فرعونیت۔ آج تک انسانی نسل کو ازبر نہیں؟ تاریخ اپنے اوراق اور واقعات کو دہراتی رہی ہے۔ آج امریکہ اگر ریڈ انڈین کو ذرا سی لغزش پر قتل کر ڈالتا ہے تو وہ یونان کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ یورپ اگر ایشیا پر آقائیت نہیں معبودیت کا دعوے کر رہا ہے تو وہ فرعون کے خیالات دہرا رہا ہے۔ پاپا ر روم کیا خدا کا لاڈلا بیٹا نہ مانا جاتا تھا۔ کیا رومی لشکر اپنی نقل و حرکت کے دوران میں غریب دیہاتیوں کے جان و مال حتیٰ کہ عصمت کو بھی حلال نہیں سمجھا کرتے تھے جسکی نہ کوئی داد تھی نہ فریاد۔

ایران نے تو اباحیہ مذہب ہی بنا لیا تھا۔ اگر وہ کمیونسٹ کے اصول پر چلتا تو ممکن تھا ایک قابل داد جدت ہوتی۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ لبظاہر بالادست کے لئے کمزور کی ہر چیز حلال اور ہر عورت مباح کر دی گئی تھی۔ یہ تو دنیا کے خیالات ماضیہ کا نہایت مختصر خاکہ ہے۔ مگر ہمیں دنیا کے تمام ٹکڑوں میں سب سے زیادہ تعلق ہے۔ عرب اور ہندوستان سے۔ عرب سے اس لئے کہ وہ شریعت غرا کا پہلا گہوارہ ہے۔ نیز ہندوستانی مسلمانوں کی بعض نسلوں کا آبائی وطن۔

ہندوستان سے اس لئے کہ وہ ہمارا موجودہ وطن ہے۔ ہماری اصلاحات کا میدان ہے۔ ہماری دوازدہ صد سالہ تاریخ کا جولانگاہ۔

لیکن عرب کے بڑے بڑے متمدن اور ترقی یافتہ قبائل۔ عاد۔ ثمود۔ طسم۔ جدیس۔ اور پھر سبا۔ وغیرہ اس ہی غرور پر تباہ و برباد بھی کر دئے گئے۔ مگر تب بھی عام عرب نے غلام کو اچھوت ہی سمجھا۔ ہر ذلت کا وہ مستحق تھا۔ ہر ایک ظلم اس پر حق بجانب تھا۔

البتہ یہ ضرور تھا کہ (۱) غلام کی توہین اس کے آقا کی توہین مانی جاتی تھی۔ (۲) چھوت چھات کی وہ شکل نہ تھی جو ہندوستان میں ابتک ہے بلا (۳) اگر آقا اپنے غلام کو آزاد کر دیتا تو وہ انسانی حقوق میں آدمیوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا تھا۔ اگرچہ اوس سے تعلقات قرابت تب بھی ناممکن تھے۔

لیکن ہندوستان عرب سے بہت آگے تھا بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ اس غرور میں ساری دنیا سے آگے تھا۔ ایران سے
[illegible]

پٹہ لکھوادیا گیا۔ غلامی اور خواری کی زنجیریں کچھ اسطرح جکڑ بند کی گئیں کہ ان کی پیچیدگی دن بدن بڑھتی ہی رہی۔ کم نہ ہوسکی۔ یہاں غرور کے ساتھ اوہام پرستی بھی تھی جس کی برکت سے انسانی لعاب کو ناپاک قرار دیدیا گیا۔ اگرچہ کتے کا لعاب اسقدر ناپاک نہ تھا۔ اس زمانہ کے قانون نے ہندوستانی انسان کے چار طبقے مقرر کردیے۔ (۱) برہمن۔ (۲) کشتری۔ (۳) ویش۔ (۴) شودر۔ برہمن۔ پاپائے روم سے کم نہ تھا۔ بلکہ پاپائے روم صرف مقدس باپ تھا۔ مگر پاپائے برہمن کا حریم قدس شودر کے سایہ سے بھی مقدس رہتا۔ اس کے حریم تعلیم کا قدسی مرتبہ اسقدر بالا تھا کہ وید کا کوئی کلمہ اگر غلطی سے شودر کے کان میں پڑجائے تو ضروری تھا کہ پگھلا ہوا گرم پارا ڈال کر اس کو نکالا جائے۔

کھتری یا کشتری۔ سپاہی بھی تھا۔ راج کا مالک بھی۔ رعایا کا مالک بھی۔ اوسکی عصمت کا بھی مالک۔ اولاد پیدا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز کا مالک۔

ویش کے سپرد تجارت ہوئی تھی۔ لیکن شودر کے فرائض کیا تھے؟

راستے صاف کرنا۔ مردار اٹھانا۔ غلاظت اٹھانا۔ معاذ اللہ وہ ناپاک۔ اس کا کپڑا ناپاک۔ جس چیز کو چھوے وہ ناپاک جس چیز کے پاس سے گذر جائے وہ ناپاک۔ کیوں؟ اس کیوجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ وہ مفتوح تھا۔ محکوم تھا۔ غلام تھا۔ مفلس تھا۔ رنگ میں سیاہ تھا۔

لیکن فتح و نصرت کے پرچموں تلے۔ حکومت اور سلطنت کی آغوش میں۔ دولت و اقبال کے جلو میں۔ شان و شوکت کے سایہ میں۔ شجاعت و بسالت کی حمایت میں۔ جس قوم نے چھوت چھات کا نام و نشان مٹایا۔ شجرۂ غرور کا استیصال کیا۔ مفتوح اقوام سے نہ صرف مساوات بلکہ قرابت کے تعلقات قائم کئے وہ کون ہے؟

بلند آہنگی سے کہا جاسکتا ہے۔ وہ قوم مسلم ہے۔ اور صرف قوم مسلم۔ یقیناً نوع انسان کو ذلت و خواری کی گہری خندقوں سے ابدی نجات دلانے والا صرف اسلام تھا۔ اور صرف اسلام ہے۔

دنیا کے فاتحین کو جس نے مفتوح کے ساتھ مساوات کا حکم دیا وہ صرف اسلام ہے۔ دنیا کے حکمرانوں کی جس نے محکوموں کے ساتھ قرابت قائم کی وہ صرف اسلام ہے۔ دنیا کے فرمانرواؤں کو جس نے غلاموں کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ بنایا۔ وہ صرف اسلام ہے۔ دنیا کے قوانین میں جس نے مسلمانوں کیطرح غیر مسلم رعیت کی غیبت تک کو حرام کیا وہ اسلام ہے جس عدل و قانون کے احترام میں آدھی دنیا کا مالک شہنشاہ ایک غیر مسلم محکوم کا مدعا علیہ بنکر مجرمانہ حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں مدعی کی برابر کھڑا ہو وہ اسلام ہے۔

اور یہاں صرف اسلام ہی ہے جس نے غلام کی عبادت کا دگنا ثواب رکھا۔

صرف اسلام ہی ہے جس نے ایاز کو شہنشاہ محمود کا عزیز ترین محبوب بنایا۔
صرف اسلام ہی ہے جس نے مملوک کو "موالی القوم من انفسہم" کا مرتبہ دیا۔
اور ہاں صرف اسلام ہی ہے جس کے پیغمبر نے غلامی کی بے بسی میں وفات پانے کی تمنا کی۔

حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ مساوات میں اسلام کی خصوصیات کو اگر ایک ایک کر کے شمار کرایا جائے تو بہت سی ضخیم جلدوں کی ضرورت ہوگی یہاں وقت کی تنگی کے ساتھ میدان تحریر بھی تنگ مفصل بحث کو کسی دوسرے موقعہ کے حوالہ کرتے ہوئے ایک سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے بھنگی چماروں سے کیوں چھوت چھات اختیار کی۔؟ یہ ایک سوال ہے۔ جواب مختصراً یہ ہے کہ

"اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"

دنیا اس کا جواب کچھ بھی دے۔ مگر ایک کوتاہ خرد کا خیال تو یہ ہے کہ مساوات اور دلداری ہی کے غلط استعمال کا یہ خمیازہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اصول مساوات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جب نووارد مسلمانوں نے ہندوستان کی خواتین سے ازدواجی تعلقات قائم کئے۔ تو اون نو مسلم بیگمات کی دلداری اور ائتلاف کے لئے بہت سی وہ رسمیں بھی لے لیں جو اسلام میں نہیں تھیں شہنشاہ اکبر۔ اور اسکی رواداری۔ خدا کی پناہ۔ آج ایک شکل پنڈتوں جیسی نظر آتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ مغلیہ خاندان کا صاحبقران ہر دلعزیز فرمانروا۔ اکبر ہے۔

"الناس علیٰ دین ملوکھم" لوگ اقتدار کے تابع ہوتے ہیں۔

جب بادشاہ رواداری میں اس قدر تجاوز کر جائے تو عام رعایا کی کیا انتہا۔

بہرحال وجوہات کچھ ہی ہوں۔ مگر ایک قوم کے ساتھ رواداری۔ اور مساوات میں کچھ ایسا تجاوز کیا گیا جس سے دوسری قوم کے حقوق کچھ نظر انداز ہو گئے لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اچھوت اقوام کی پستی کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ ورنہ انکو مہتر (بڑا مہتر) اور حلال خور (جائز کمائی کھانے والا) وغیرہ خطابات شاہان مغلیہ کی تہذیب کے دربار سے نہ ملتے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اسلامی اصول کی پوری توجہ سے اشاعت کیجاتی تو یہ قوم پستی کے اس نشیب میں یقیناً نہ رہتی جس میں آج مبتلا ہے۔

کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ ملت حنیفیہ کے حلقہ بگوش کو بھنگی چمار یا کسی اشتقاق سے مروجہ چھوت چھات روا ہو سکتی ہے۔

جب کہ اسلامی اصول یہ ہیں۔

وہ رنگ نسل کی تفریق کے بغیر تمام انسان ایک دوسرے کی برابر ہیں۔ وہ سب ایک مرد اور ایک عورت

(۲) بزرگی کا مدار رنگ نسل۔ یا دولت پر نہیں۔ بلکہ خوف خدا پر ہے۔

(۳) انسان کی صرف دو قسمیں ہیں۔ مسلمان اور کافر۔ پھر مسلمان سب بھائی بھائی۔ کافر سب برابر۔ عیسائی ہو یا ہندو۔ انگریز ہو یا کرسچن۔ برہمن ہو یا شودر۔ ملاحظہ ہو ارشاد خداوندی ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی۔ الایۃ۔ ج ۲۶ ع ۱ سورہ حجرات۔

اے آدمیو ہم نے تمکو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے۔ اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس میں پہچان ہو۔ تحقیق عزت اللہ کے ہاں اس کو بڑی جس کو ادب بڑا۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند رح) یعنی ذاتیں اور قبیلے اس واسطے نہیں کہ فخر کیا جائے یہ تو کفر کی چیز ہے۔ (مسلم شریف ج ۱ ص ۵۸) مقصد صرف یہ ہے کہ آپس میں پہچاننے میں آسانی ہو۔ باقی اللہ کے ہاں عزت کا مدار ادب اور تقوی پر ہے۔ جو تقوی میں بڑھا ہوا وہ عزت میں بڑھا ہوا ہے ارشاد نبوی ہے۔ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو۔ اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے۔ (ابو داؤد ج ۲ ص ۳۵۰) پھر ارشاد نبوی۔ الکفر ملۃ واحدۃ۔ یعنی کفر سب کا سب ایک ہی ہے۔ اور آیت قرآنی بعضھم من بعض۔ وغیرہ۔ نے تمام کفار میں ایسی ہی مساوات قائم کر دی۔ جیسے قرآن پاک کی آیت انما المومنون اخوۃ (ج ۲۶ سورہ حجرات) نے تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دے کر۔ اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔

ترا المومنین فی توادھم و تعاطفھم کجسد واحد اذا اشتکی منہ بعض تداعی لہ سائر الجسد بالسھر و الحمی۔ او کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری شریف ص ۸۸۹)

نے تمام مسلمانوں کو ایک بدن کے مختلف اعضا قرار دے کر ان میں مساوات۔ یگانگت اور اتحاد کا غیر فانی رابطہ قائم کر دیا۔

(۴) اسلام کا چوتھا اصول۔ انسان پاک اس کا لعاب بھی پاک۔ برہمن ہو یا بھنگی۔ کھتری ہو یا چمار۔ (ملاحظہ ہو ھدایہ وغیرہ کتب فقہ۔ باب السور)

(۵) کافر کی ناپاکی عقیدہ میں ہے۔ کہ خدا کا انکار کرتا ہے۔ یا غیر خدا کو خدا سمجھتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں نہیں۔ (ملاحظہ ہوں کتب فقہ۔ ھدایہ باب السور)

(۶) کوئی پیشہ بھی عیب نہیں۔ بشرطیکہ ناجائز نہ ہو۔ چنانچہ لکڑیاں چننا اور بیچنا۔ اصحاب صفہ کا عام دستور تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ لکڑیاں چنکر بیچنا بھیک مانگنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ (بخاری شریف ص ۱۹۹ واجب الاحترام صحابیات۔ خود چکیاں پیسا کرتی تھیں۔ اپنا جوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود درست کر لیا کرتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے واقعات کتب احادیث و سیر میں بے انتہا ملتے ہیں۔

(۷) سلسلہ مساوات میں اسلام کا ساتواں اصول یہ ہے کہ۔ شہری حقوق میں تمام انسان آپس میں برابر ہیں یعنی رفاہ عام کی چیز مثلاً کنواں۔ تالاب۔ دریا وغیرہ سے۔ جیسے ایک خنزیر خور۔ شراب خور عیسائی یا برہمن یا یہودی فائدہ اٹھا سکتا ہے

بھنگی یا چمار کا حق بھی اس کے برابر ہی ہے۔

اگر ایک برہمن یا ویش کو تجارت کا حق ہے۔ اس کی دوکان سے ہر قسم کا مال حتیٰ کہ کھانے کی ترچیز مثلاً مٹھائی وغیرہ بھی مسلمان خرید سکتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ بھنگی یا چمار کو اس کے حق سے محروم کیا جائے۔ یقیناً اس کو بھی وہی حق حاصل ہے جو برہمن یا ویش کو۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام نے بھنگی چمار یا اونچی ذاتوں میں ایک کو ناپاک دوسرے کو پاک نہیں کہا۔ بلکہ اصول اسلام کے لحاظ سے وہ سب کفر کی ایک سطح پر ہیں۔ اگر ناپاک ہیں تو سب۔ اور اگر پاک ہیں تو سب بھنگی یا چمار ہونا اسلامی اصول کے بموجب ناپاکی کا موجب نہیں۔ اگر کوئی چیز ناپاکی کا سبب بن سکتی ہے تو وہ کفر ہے۔ مگر کفر سب میں مشترک ہے۔

مذکورہ بالا مدلل اصول شمار کرا دینے کے بعد ضرورت نہ تھی کہ مزید توضیح یا تائید کی جائے لیکن حق یہ ہے کہ صرف اصول کا شمار کرا دینا اسلام کی اعلیٰ اور بالاتر شان کے مناسب نہ ہوگا۔ وہ بالاتر خصوصیات جو خلّت نار خلیل۔ رزمگاہ موسیٰ (علیہ السلام) خلوتگاہ عیسیٰ علیہ السلام میں دھندلی نظر آتی ہے۔ اور کرشن کا یدھستان۔ رامچندر کا بن باس۔ اور بودھ کا گیان۔ جس کا خاکہ کھینچنے سے بھی قاصر ہے۔ اور جو اسلام کی مقدس شان کا طغرا امتیاز رہی ہے وہ یہ ہی خصوصیت ہے کہ ہر ایک اصول اور قانون کا پورا پورا عمل اس کے مقدس داعی مبلّغ اوّل۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں اس طرح تاباں ہے کہ اس کی کرنیں ارضی ذرات کو جگمگائے ہوئے ہیں۔

اب آؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ سے چند علمی جواہر پارے دیکھو۔

(۱) ظاہر ہے کہ غلام سے بڑھ کر کوئی ذلیل نہیں۔ عرب اس خیال میں کسی سے کم نہ تھا حضرت زید پسر حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد فرما دیا تھا لیکن رحمت عالم کی شفقت اپنے غلام پر اس درجہ ہے کہ لوگ انکو پسر حارثہ کے بجائے پسر محمد صلی اللہ وسلم کہنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ لقب اس درجہ مشہور ہو جاتا ہے کہ عموماً یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ حقیقی بیٹے کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث حضرت زید ہونگے۔ اور باپ بیٹے کی طرح حرمت کے تمام تعلقات یہاں چسپاں ہونگے۔ مثلاً حضرت زید کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام ہوگی۔ اور پھر یہ خیالات شفقت نبویہ کے زیر سایہ اس درجہ شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ وحی الٰہی کو ان خیالات اور عقائد کے برخلاف ناطق ہونا پڑتا ہے۔

(۲) حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپی زاد بہن تھیں اور یتیم ہونے کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تولیت میں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا نکاح اپنے ہی آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دیتے ہیں۔

(۳) عموماً جہاد اور غزوات میں حضرت زید کو سپہ سالار بنایا جاتا ہے۔ وہ مشہور اور معرکۃ الآرا غزوہ جس میں حضرت

کہا جاتا ہے۔ جو اسلام کی عیسائیت کے ساتھ سب سے پہلی ٹکر تھی جب اس کے لئے سپہ سالار کی نامزدگی ہوتی ہے تو پہلا نام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا ہوتا ہے۔

(۴) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ۔ ان پر شفقت کی یہ حالت ہے کہ حِبّ رسول اللہ کے لقب سے مشہور ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسامہ حضرت زینب کے بطن سے نہیں۔ کہ حضور کے بھانجے ہوں۔ بلکہ اتفاق سے انکی والدہ ماجدہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ باندی ہیں۔ یعنی ام ایمن رضی اللہ عنہا۔

(۵) حضرت اسامہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت پر اس درجہ ناز ہے کہ بعض اوقات ان سفارشوں کے پیش کرنے کی جرأت کر لیتے ہیں جو بڑے بڑے اکابر صحابہ نہیں پیش کر سکتے۔

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لخت جگر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو ایک زانو پر بٹھا لیتے ہیں اور حضرت اسامہ کو دوسرے پر۔ اور فرماتے ہیں کہ اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی محبت فرما۔ (بخاری ص۵۲۹ ص۸۸۰ وغیرہ)

(۷) ۸ھ۔ فتح مکہ کے موقع پر جب کو کبہ نبویہ فاتحانہ انداز سے مکہ معظمہ میں داخل ہو رہا ہے۔ اور شمشیر زنان اسلام کا دس ہزار کا جرار لشکر (جو عرب کی کسی طاقت کے پاس نہ تھا) جلو میں ہے تو دنیا نے دیکھا کہ اس فاتح اعظم کی اونٹنی پر جو برابر میں سوار تھا وہ اسامہ بن زید تھا۔ رضی اللہ عنہ۔

اس قسم کے واقعات بہت سے ہیں۔ جو کسی دوسرے موقع پر انشاء اللہ تفصیل سے بیان کئے جائیں گے۔

(۸) (باندیوں سے نکاح) اگر یہ خصوصیت حضرت اسامہ یا ان کے باپ کی نہ تھی۔ بلکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت عمومی کے وسیع آغوش میں ہر غلام۔ ہر غریب۔ دنیا کا ہر ذلیل۔ نہایت ناز سے چھپا ہوا تھا بشرطیکہ وہ ایمان کا پابند ہو۔ تقویٰ کا شیدائی۔

حضرت صفیہ حضرت جویریہ۔ آخری باندی کی حیثیت سے گرفتار ہوئی تھیں۔ مگر انکو کہاں جگہ ملی؟ شاہ دوعالم کے کاشانۂ قدس میں۔ جو مساوات کا گہوارہ تھا۔

(۹) ازواج مطہرات میں سے ایک نے جو عرب کے اعلیٰ خاندان کا مبارک ثمرہ تھیں ایک مرتبہ معمولی طنز کا کلمہ ادا کر دیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پر عتاب ارشاد صادر ہوا۔

تم نے ایسا کلمہ کہا کہ اگر سمندر میں پڑ جائے تو تلخ ہو جائے۔

دوسری مرتبہ کسی اور زوجہ سے ایسا ہی ہو گیا۔ تو وہ اس درجہ معتوب ہوئیں کہ کئی روز تک رسالت کے تخاطب سے بھی محروم رہیں۔

(۱۰) وہ تمہیں کیا بتاؤں کہ اسلام کیسی مساوات چاہتا ہے۔ غور کرو اور سمجھو۔ ارشاد نبوی ہے۔

جو شخص اپنی باندی کو اچھی طرح تعلیم دے اور اس کو اچھی تہذیب سکھائے پھر آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے۔ تو اوس کو دوگنا ثواب ہو (بخاری ص۲۲ ج۲ ص۹۷)

(۱۱) ارشاد ہے دو چیزیں عموماً لوگوں میں ہیں مگر وہ کفر کی چیزیں ہیں۔ دیگر نسب میں طعن کرنا، اور دوسری میت پر بین کرنا (مسلم ص۵۸ ج۱)

(۱۲) صرف یہی نہیں بلکہ ارشاد ہے۔ کہ زرخرید غلام کو اوس کی عبادت کا دوگنا ثواب ملتا ہے۔ اوس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر جہاد اور حقوق قرابت کے وہ فرائض نہ ہوتے۔ جو غلامی کی حالت میں ادا نہیں ہو سکتے تو میں تمنا کرتا کہ زرخرید غلام ہو کر دنیا سے اٹھوں۔ بخاری ص۳۴۶ مسلم ص۵۵ ج۲۔

(۱۳) اسلام اور چھوت چھات؟ معاذ اللہ۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ اسلام اور کفر۔ حضرت بریرہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی آزاد کردہ باندی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔ اُن کے گھر تشریف لیجاتے ہیں۔ ہنڈیا میں گوشت پک رہا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرمائش فرما کر گوشت منگاتے ہیں اور بلا تکلف تناول فرماتے ہیں۔

(۱۴) عام ارشاد ہے کہ جب تمہارا غلام یا خادم کھانا پکا کر لائے تو اوس کو اپنے پاس بٹھا کر ساتھ کھلاؤ نہ کھائے تو کم از کم دو تین لقمے تو ہاتھ پکڑ کر دے ہی دو (مسلم ص۵۲ ج۲)

(۱۵) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو کچھ ناگوار کلم دیا۔ تو ارشاد ہوا۔ ابوذر۔ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ پھر ارشاد ہوا تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارا زیردست بنایا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ جو تم کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ جو تم پہنو وہی اون کو پہناؤ، برداشت سے زائد کام اون پر مت ڈالو۔ اگر کوئی مشکل کام آن پڑے تو ان کے ساتھ ملکر کام کرو۔ (بخاری ص۳۴۶ مسلم ص۲۵ ج۲)

قانونی مساوات اس کو کہتے ہیں۔

قبیلہ بنو مخزوم کی اعلیٰ خاندان والی ایک عورت چوری کر لیتی ہے اس کے قبیلہ کے آدمی مشہور و معروف شرافت اور سیادت کی بنا پر ہزار کوشش کرتے ہیں کہ ہاتھ کٹنے کے عام قانون سے یہ شریف زادی بچ جائے۔ لیکن جب رسول اللہ۔ حضرت اسامہ بن زید کے ذریعہ سے جب دربار رسالت میں سفارش پہونچتی ہے، تو رحمت نبویہ جوش میں آتی ہے۔ اور ارشاد ہوتا ہے۔ اُسامہ! خداوندی قانون کے برخلاف سفارش کرتے ہو خدا کی قسم فاطمہ بنت محمد بھی (صلے اللہ علیہ وعلی اصحابہ) چوری کرے تو میں علی اعلان اُسکا ہاتھ کاٹ ڈالوں (بخاری ص... مسلم ص۶۴ ج۲) حد سے زیادہ اختصار کو ملحوظ رکھا مگر پھر بھی طوالت ہوگئی یہ مسئلہ پورا باقی رہ گیا کہ صحابہ کرام۔ یا بعد کے مسلمانوں کا کیا طرز عمل اور مساوات کو متعلق فقہ کا قانون کیا ہے اس تمام بحث کو توفیق ایزدی تصنیف رسالہ "مساوات اسلام" کے مطالعہ پر حوالہ کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ جب فاروق اعظم کی زبان سے بلال حبشی کے متعلق سنا جاتا ہے۔ یہ بھی ہمارے آقا ہیں انکے آزاد کرنے والے بھی۔ بخاری ص۵۳۱ اور جب تخت سلطنت پر محمود کی برابر ایاز کو بیٹھے ہوئے دیکھا جاتا ہے، اور پھر عالمگیر کے پر جبروت شاہی خیمہ کے برابر سیمباجی پسر سیواجی کے شاندار خیمہ کو نصب پاتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ مفتوح دشمن کے نابالغ لڑکے کے ساتھ شاہزادوں کی برابر سلوک ہو رہا ہے، اور پھر جب دور حاضرہ کی تحریک ہریجن پر نظر ڈالتے ہیں تو بے اختیار آنحضرت صلعم کا یہ شعر زبان پر آتا ہے۔ آج اون ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے۔ اثر سجدہ تیرے در کا جن کی پیشانی پہ ہے۔

جمالی

افسانہ

(از پروفیسر مولانا ابوالجلال سعید احمد اکبرآبا

اے کاش کہ دولت و ثروت دنیا کی تمام مصیبتوں کا علاج اور زمانہ بھر کی بیماریوں کا مداوا ہو سکتی! اگر ایسا ہوتا تو جمالیؔ حیات اس قدر پر درد نہ ہوتی جتنی کہ اب ہے۔

جمالیؔ کے گھر میں دولت و امارت کی کمی نہ تھی۔ اوس کا باپ عثمانی حکومت میں سرکاری فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ خدمت کرنے تین تین چار چار ملازم اور خادمائیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ اور چونکہ اپنے باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس لئے خود ماں باپ کو بھی اوس بہت زیادہ محبت تھی۔ اوس کی ہر خواہش ذرا سے اشارہ پر پوری کی جاتی تھی۔ اوس کے ہر امر کی تعمیل گھر کے سب لوگوں کا فرض بہترین مکان۔ بہترین فرنیچر۔ عمدہ غذائیں۔ پر تکلف لباس غرض کہ راحت و آسائش ظاہری کے لئے جتنی چیزیں درکار ہیں وہ سب کے لئے ہر آن موجود و مہیا تھیں۔ مگر افسوس کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت، عالم انسانی کی سب سے اہم ضرورت، یعنی قوت بینائی سے وہ محروم تھا۔ جمالیؔ مادر زاد اندھا تھا، اور اگر اوس کی ماں کا قول صحیح مان لیا جائے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ پیدائش کے دو ہفتہ تک جمالی کی آنکھوں میں قوت بصارت تھی، وہ عام بچوں کی طرح ماں کی آغوش میں لیٹ کر آنکھیں کھولتا اور بند کرتا۔ جس سے خیال ہو سکتا تھا کہ وہ دیکھتا ہے ۔ ۔ ۔ !۔ ۔

جمالیؔ کے والد نے اپنی بیشمار دولت جمالیؔ کے علاج کیلئے وقف کر دی۔ جرمنی۔ اٹلی۔ اور انگلینڈ۔ فرانس ان میں کوئی جگہ نہ تھی کہ وہاں کے مشہور و معروف ڈاکٹروں سے جمالی کے علاج کے لئے مشورہ نہ کیا گیا ہو۔ لیکن وہ جہاں لیجایا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہکر مایوس کر دیا کہ "مریض مادر زاد اندھا ہے اس لئے علاج ناممکن ہے"۔ بالآخر جمالی اور اوس کے ماں باپ صبر کرکے بیٹھ رہے۔

حاسۂ باصرہ کے علاوہ حواس خمسہ کی لذت و آسائش کے لئے جتنی چیزیں درکار ہو سکتی ہیں۔ باپ نے اون کے مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا وہ عمدہ سے عمدہ کھاتا تھا۔ بہترین سے بہترین گانا سنتا تھا۔ اور ایک نہایت پر فضا مکان میں جس کے ساتھ ایک بڑا باغ بھی ملا ہوا تھا۔ جمالیؔ اس باغ میں اپنے اوقات کا اکثر حصہ گذارا کرتا تھا۔ یہاں کے شگفتہ پھولوں کی بھینی خوشبو اور صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ جمالی کے لئے بہترین سامان تفریح تھا۔ لیکن پھول کیسا ہوتا ہے؟ باغ کی کیا صورت ہوتی ہے؟ آدمی کس شکل کا ہوتا ہے؟ باغ میں بلبل و قمری کی بارہا صدائیں سنی تھیں۔ مگر یہ کس وضع و قطع کی ہیں! یہ تمام سوالات جمالی کے لئے لاینحل تھے۔ وہ آفتاب کو جانتا تھا۔ مگر صرف اوس کی گرمی سے! وہ اپنے ماں باپ اور ایک چھوٹی بہن کو پہچانتا تھا لیکن صرف اوس

سے پھول کو خوشبو سے ۔ اور پھلوں کو چکھنے سے پہچانتا تھا۔ اور بس سیاہ و سپید سرخ و سبز خوبصورتی و بدصورتی ۔ طول و عرض ۔ موٹا پا اور دبلا پن ۔ روشنی و تاریکی یہ سب اوس کے لئے ایسے الفاظ ہیں جن کے کچھ معنی نہ تھے

جمالی فطرتاً بہت خوش طبع اور ظریف مزاج تھا ۔ وہ دن بھر ماں بہن اور خادماؤں کے ساتھ ہنستا اور کھیلتا رہتا تھا ۔ لیکن شادی و مسرت کے ان ہنگاموں میں اوس کو اگر کبھی اپنی نابینائی کا خیال آجاتا تو وہ بیساختہ ہو کر رونے لگتا تھا ۔ ماں اوس کو سینہ سے لگا لیتی اور جمالی سسکیاں بھرتے ہوئے کہتا "اماں اگرچہ خدا مجھ سے میری تمام بقیہ زندگی لے لے ۔ اور اوس کے عوض صرف اتنی دیر کے لئے مجھکو بصارت عطا فرما دے کہ میں تم کو اور پیاری بہن نزہت کو ایک نگاہ ۔ ہاں صرف ایک نگاہ دیکھ سکوں تو خدا کی قسم میں اس سستے سودے پر بالکل تیار ہوں ۔ اے کاش کہ ایسا ہو جائے ۔ اماں دعا کرو کہ خدا مجھ سے میری زندگی لیلے اور صرف ایک نگاہ ۔!" جمالی یہ کہتا اور پھر زار زار ماں کے سینہ سے لپٹ کر رونے لگتا ۔ بہن بھی اس ہنگامۂ ماتم میں شریک ہو جاتی جمالی دریا کے کنارے ایک عالیشان مکان میں رہتا تھا ۔ کبھی شہر کی سیر کرنے کو جی چاہتا تو اپنے ملازم کے ساتھ آہستہ آہستہ چلا آتا ۔ لیکن قدم قدم پر غریب کو ٹھوکریں لگتیں ۔ جگہ جگہ اوس کا سر کبھی کسی دیوار سے ٹکرا جاتا یا اوس کا پاؤں کہیں نشیب و فراز میں جا پڑتا تھا ۔ جمالی سخت رنجیدہ ہوتا ۔ اور کہتا تھا کہ "الہی کیا تمام دنیا تکلیف ۔ سخت ۔ اور ٹھوس چیزوں سے ہی بھری ہوئی ہے کیا اوس دنیا میں جس کو میں نہیں دیکھ سکتا ۔ گڑھوں ۔ دیواروں ۔ اور پتھروں اور ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں ؟" جمالی یہ کہتا اور حسرت زدہ مایوس خاموشی کے ساتھ پھر اپنے کاشانہ میں آ کر بیٹھ جاتا تھا ۔

دن گذرتے گئے ہفتے ... مہینے اور مہینے سال بن گئے ۔ یہاں تک کہ جمالی نے شادی و غم کی دوگونہ کیفیات میں اپنی عمر کی پچیس منزلیں طے کر لیں یہ پندرہ برس کا تھا اُس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا ۔ لیکن مرحوم نے دولت اس قدر چھوڑی تھی کہ اون کے بعد بھی جمالی کے امیرانہ طرز زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ اب اوس کا شغلہ بس یہ تھا کہ ذرا زیادہ آزادی کے ساتھ اپنی ماں بہن اور خادماؤں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا تھا اس کی دنیا انہیں میں محدود تھی ۔

ایک دن انگورہ میں اچانک خبر پہونچی کہ ایک جرمنی کا ایک ڈاکٹر مسٹر شر لے اندھے پن کا علاج کرتا ہے اور اس کا علاج بہت کامیاب ہو رہا ہے ۔ جمالی غریب تو اپنی صحت سے بالکل مایوس ہو چکا تھا ۔ اور اس قسم کے دیسیوں ڈاکٹروں کے اعلانات کا عملی تجربہ بھی کر چکا تھا ۔ اس لئے اوس نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی ۔ مگر اوس کی بہن نزہت نے کہا کسی آدمی کو جرمنی بھیجکر اس خبر کی تحقیق کرانی چاہیئے ۔ کیا عجب ہے کہ خدا نے اوسی کے ہاتھوں سے شفا مقرر کی ہو ۔ یہاں دولت کی کیا کمی تھی اور بھیجنا کیا تھا جمالی کے لئے ہی تھا ۔ جمالی کی والدہ نے خود آج جرمنی ایک آدمی بھیجدیا اور اوس سے تاکید کر دی کہ اوس ڈاکٹر کی متعلق پوری تحقیق کر کے آئے اس شخص نے آ کر کہا کہ ڈاکٹر نے جرمنی میں کئی ایک اندھوں کا کامیاب علاج کیا ہے اور اس بنا پر وہ وہاں بہت مشہور ہو گیا

اور مادر زاد اندھا ہونا دنیا کا ایک بہت ہی نادر واقعہ ہو سکتا ہے! اس کو سنتے ہی جمالی کے ماں بہن کے بشاش اور امید سے چمکتے چہروں پر اداسی کی سلوٹیں پڑ گئیں مگر پھر ماں بولی۔ "تو ہاں ہمارا جمالی خدانخواستہ مادر زاد اندھا تھوڑا ہی ہے؟ میں نے اوس کی پیدائش کے کئی روز بعد تک اوس کی آنکھوں میں نور دیکھا!" جمالی اس امید و بیم کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا کہ "اماں رہنے بھی دیجئے۔ اب کیا ہو سکتا ہے میں تو ڈاکٹر کو صرف دھوکہ باز سمجھتا ہوں!" لیکن ماں نے کہا کہ "ڈاکٹر کو آج ہی تار دے دینا چاہئے۔ بہرحال نتیجہ جو کچھ بھی ہو، کوئی نقصان تو ہوگا نہیں!" ڈاکٹر کو فوراً تار دے کر بلا لیا گیا! ڈاکٹر نے بڑے غور و خوض کے جمالی کا معاینہ کیا، اور کہنے لگا جمالی کا علاج ممکن ہے اس کا اندھا پن مادر زاد نہیں ہے! لیکن علاج کے لئے دو شرطیں پیش کیں! ایک یہہ کہ فیس تین ہزار پونڈ ہوگی۔ جو بہرحال پیشگی ادا کرنی پڑیگی دوسرے یہہ کہ ڈاکٹر اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا کہ آنکھوں کی بینائی تا دیر باقی رہیگی! ہو سکتا ہے کہ چند ایام کے بعد اندھا پن عود کر آئے جمالی اور اوس کی ماں اور بہن چار و ناچار سب ان شرطوں پر رضامند ہو گئے اور ڈاکٹر نے علاج کی تیاری شروع کر دی علاج کی صورت یہہ تھی کہ ایک بالکل تاریک کمرہ میں جمالی کو پشت کے بل لٹا دیا گیا۔ اوس کے پپوٹے پلاسٹر سے ڈھک دیئے گئے اور اوس کی ابروؤں پر ترپٹیوں کی موٹی موٹی تہیں لپیٹ دی گئیں اور جمالی کو تاکید کر دی گئی کہ اوس کا علاج اسی طرح پر کامل چھ ہفتہ تک جاری رہے گا اور اتنے دنوں تک جمالی کو بلا کسی طرف ہلے ہوئے پشت کے بل پڑا رہنا پڑے گا اور خوراک بھی سخت دیجاتی تھی جمالی نے ان تمام سختیوں کا مقابلہ نہایت دلیری سے کیا۔ اس نے پلاسٹر کرتے وقت نہ کبھی ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑا اور نہ کبھی اس سے یہ دریافت کیا کہ اب علاج کے ختم ہونے میں کتنے دن باقی ہیں۔ ڈاکٹر نے جمالی کے گھر میں ہی قیام کیا تھا ہر وقت نگرانی کرتا تھا اور چھ ہفتہ تک برابر جمالی کے پاس مقیم رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔

علاج کو جاری ہوئے چھ ہفتے ہونے ہی والے تھے کہ بالکل آخری دن ڈاکٹر نے تمام گھر میں ایک کہرام بپا کر دیا۔ جمالی کی خادمہ صبح کے وقت ڈاکٹر کو ناشتہ کے لئے بلانے گئی تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کا کمرہ بالکل خالی پڑا ہوا ہے اور ڈاکٹر مع اپنے سامان کے وہاں سے غائب ہے۔ اس اندوہناک خبر کو سنتے ہی جمالی کی ماں اور بہن دونوں پر غشی طاری ہو گئی۔ اور فرط اندوہ کی وجہ سے دونوں دم بخود ہو کر رہ گئے۔ نزہت نے کہا کہ اس کے کمرے میں جاکر دیکھنا چاہئے۔ شاید کوئی رقعہ رکھ گیا ہو۔ وہاں کمرے میں جاکر نزہت نے دیکھا کہ میز پر قلمدان کے اندر ایک خط لکھا ہوا رکھا ہے۔ نزہت نے بڑے اضطراب کے ساتھ اس خط کو اٹھا لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ خط ڈاکٹر کے قلم کا لکھا ہوا تھا اور جمالی کی والدہ کے نام لکھا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"جمالی کا علاج مکمل ہو چکا ہے، اب میرے یہاں قیام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج صبح میرے گھر سے ایک تار آیا جس میں لکھا ہے کہ میری لڑکی سخت بیمار ہے۔ مجھکو فوراً وہاں پہونچ جانا چاہئے۔ افسوس ہے کہ میں اب زیادہ قیام نہیں کر سکتا جمالی کی پٹی خود اپنے ہاتھوں سے کھول کر جاتا۔ تاہم پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پٹی کھولنے میں صرف ایک بات باقی رہ گئی ہے پلاسٹر خشک ہونے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خود بخود اتر جائے تو پٹی کھول دینی چاہئے اس کے بعد چند ضروری ہدایتیں [illegible] لکھی گئی تھیں۔ اور آخر میں اسی کا پھر اعادہ کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر اس کا ذمہ دار نہیں ہے کہ یہ صحت دائمی اور مستقل ہوگی۔ ہو سکتا

دنوں کے بعد اندھا پن پھر عود کر آئے"۔

اس خط کو دیکھ کر ماں اور بہن اور خود جمالی ان کے مایوس چہروں پر امید کی ایک روشنی چمکنے لگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں ڈاکٹر دھوکہ باز اور محض فریب دینے والا نہ ہو۔ بہرحال یہ سب لوگ اب اس وقت کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگے جبکہ پلاسٹر خشک ہو کر گرنے لگے اور جمالی کی پٹی کھولی جائے"۔

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا۔ پلاسٹر خشک ہو گیا اور خود بخود جھڑنے لگا۔ اب صرف پٹی کے کھولنے کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ وقت جمالی کو اس کی ماں اور بہن دونوں کے لئے عجیب و غریب وقت تھا۔ دل امید و بیم کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے کبھی علاج کی کامیابی کا خیال مسرت و شادمانی کا جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔ اور کبھی ڈاکٹر کے دھوکہ باز ہونے کا اندیشہ یاس و نامرادی کی افسردگی طاری کر دیتا تھا۔ نزہت اور اسکی ماں پٹی کھولنے کے لئے بے چین تھیں۔ لیکن جمالی نے کہا کہ۔

"تم سب میرے کمرہ سے باہر چلی جاؤ۔ میں تمہارے سامنے پٹی نہیں کھولوں گا"۔ ماں اور بہن نے ہر چند اصرار کیا لیکن جمالی ہرگز راضی نہیں ہوا۔ اوس نے کہا۔ "خدانخواستہ اگر میرا علاج ناکامیاب ہوا تو اس کی وجہ سے پٹی کھولنے کے بعد مجھکو جو ندامت اور خفت ہوگی وہ بہت زیادہ سخت اور بے انتہا صبر آزما ہوگی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میں سے کوئی اس خفت میں میرا شریک ہو یا میرے چہرے پر اس خفت کے آثار کا تماشہ دیکھے"۔

جبراً و قہراً ماں اور بہن دونوں کمرہ سے باہر آ گئیں۔ جمالی نے اندر سے تاریک کمرہ کی کنڈی لگا کر اس کو بالکل بند کر دیا اب جمالی اپنی آنکھوں کی پٹی کھولنی چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ بڑھائے۔ آنکھوں تک لے گیا لیکن اچانک کسی خیال سے متاثر ہو کر اس نے اپنا ہاتھ پھر لوٹا لیا۔ جمالی سوچ رہا تھا کہ اگر میرا علاج کامیاب ہو گیا تو پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟

"اڑتے ہوئے ہوائی جہاز، زمین پر دوڑنے والی ریل، سمندروں کا طوفان خیز پانی، عالیشان مکانات، خوبصورت پرندے، تناور اور اونچے اونچے درخت، طلوع اور غروب ہوتا ہوا آفتاب، آسمان، اور اس پر جگمگاتے ہوئے ستارے"۔ اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اپنی ماں اور اپنی پیاری بہن۔ اور خادمائیں۔ اپنا گھر۔ اپنا باغ۔ اپنی کرسی۔ اپنی میز۔ اپنے کپڑے۔ اور اپنا سامان۔ ان تمام چیزوں کو وہ آج اپنی پچیس سالہ عمر میں پہلی مرتبہ اور بالکل پہلی مرتبہ دیکھیگا تو کیا ان تمام چیزوں کا نظارہ اس کے لئے ناقابل برداشت تو نہیں ہوگا؟ کہیں دہشت کی وجہ سے اس کا دم تو نہیں نکل جائے گا؟ کہیں ماں اور بہن کو دیکھکر "شادی مرگ" تو نہیں ہوگی؟ ایسا تو نہیں ہوگا کہ میں رنگ و لباد خوبصورتی و رنگینی کے عالم میں یک لخت پہونچ جانے کی وجہ سے مر جاؤں؟

"یہ خیالات تھے جو بڑی سرعت کے ساتھ بالکل بجلی کی طرح۔ انسانی سانس کی مانند جمالی کے دل و دماغ میں گذر رہے تھے۔ جمالی بار بار پٹی کھولنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا تھا۔ مگر پھر جھجکا کر۔ لرز کر اور کانپ کر واپس لے لیتا تھا انجام کار اس نے اپنا دل مضبوط کیا اور آنیوالی سختی کے لئے آمادہ و تیار ہو گیا"۔ اس دفعہ اس نے پتھر کی چٹان کی طرح سخت اور مضبوط عزم کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا اور پٹی کھولنے لگا جب

اور اب اس نے دیکھا ———— واقعی دیکھا۔ اس کی آنکھ میں نور تھا۔ بصارت کی روشنی چمک رہی تھی پٹی کے کھولتے ہی سب سے پہلے اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے سیاہ دھواں سا معلوم ہوا۔ پھر یہ دھواں غبار کی صورت میں منتقل ہوگیا۔ اسکے بعد اسی غبار میں کچھ چمکتے ہوئے ذرے نظر آئے۔ اور پھر انھیں ذروں نے آخر میں چند چیزوں کی صورت اختیار کرلی۔ اسوقت جمالی پر خوشی کی عجیب کیفیت طاری تھی! ماں اور بہن نے باہر سے آواز دی کہ "جمالی پٹی کھولدی؟ جمالی نے کہا کہ ہاں کھولدی۔ اب وہ کمرہ کی کنڈی کھولنے کے لئے اٹھا مگر پھر بیٹھ گیا اس نے سوچا کہ اس کی ماں اور بہن کس شکل کی ہوں گی۔ مگر ہاں میں نے آج تک شکل ہی کونسی دیکھی ہے ابا کہا کرتے تھے کہ نزہت بیٹی بڑی خوبصورت ہے! ہیں۔ خوبصورت کسے کہتے ہیں وہ بھی تو آدمی ہیں نا مگر آدمی کیسا ہوتا ہے!

اچھا میں نے اگر اب اماں اور بہن کو دیکھا تو میں کہیں ڈر کے مارے مر تو نہیں جاؤں گا! یا اللہ میں کیا کروں! میں اب ایک نئی دنیا میں آرہا ہوں جہاں کی صورتیں اجنبی ہیں۔ جہاں کی گلیاں نامعلوم ہیں۔ اور جہاں کے راستوں سے میں بے خبر ہوں۔ آہ میں اب اس دنیا میں قدم رکھوں تو کس طرح؟ ۔ جمالی ان خیالات میں ڈوب گیا اور ڈوبتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور اماں سے کہدیا کہ "ذرا اور ٹھیرو میں ابھی کواڑ نہیں کھولتا۔"

جمالی جس کمرہ میں تھا اس کی ایک کھڑکی جو ایک بڑے دریا کی طرف کھلتی تھی ۔کھلی ہوئی تھی ۔ یہ وقت شام کا وقت تھا آفتاب کے غروب ہونے میں آدھے گھنٹہ کی دیر تھی۔ سامنے دریا میں کشتیاں چل رہی تھیں۔ جمالی کی نظر وہاں جا پڑی تو لرز گیا۔ کانپ اٹھا وہ سمجھا کہ دیو کا نام کئی مرتبہ سنا ہے شاید وہ یہی ہے۔ ایک چڑیا اڑ کر اس کے کمرے میں آپہونچی تو اس نے کہا۔ ایں کیا یہ گھوڑا ہے۔ یہاں کیوں آگیا! ایک کاغذ کا پرزہ اڑ کر اس کے کمرہ میں آپڑا تو وہ ڈر گیا! وہ سمجھا کہ شاید ہوائی جہاز اسی کو کہتے ہیں۔ پاس میز پر ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ جمالی نے کہا کہ "کیا اچھا پھول ہے۔ مگر ارے اس میں خوشبو تو ہے ہی نہیں سامنے دریا کے کنارے ایک لڑکا بھاگا ہوا جا رہا تھا۔ جمالی سمجھا کہ شاید ہرنی اسی کو کہتے ہیں سنا تھا کہ ہرنی بہت تیز بھاگتی ہے

جمالی کی ماں اور بہن جو بے چینی کے ساتھ کمرے کے باہر انتظار کر رہی تھیں انہوں نے پھر آواز دی! جمالی نے کہا ہاں میں بالکل اچھا ہوں مگر ذرا ٹھیرو ابھی نہیں! جمالی نئی دنیا کے انہیں تخیلات میں غرق تھا بار بار کمرہ کے کواڑ کھولنے کے لئے اٹھتا تھا مگر پھر بیٹھ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہونا شروع ہوا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا روشنی کم ہونے لگی، جمالی جو اب تک اپنے کمرہ کے در و دیوار کو اور کمرہ سے باہر کی چیزوں کو صاف دیکھ رہا تھا اب وہ آہستہ آہستہ اس کی نظر سے اوجھل ہو کر تاریکی کے پردہ میں چھپنے لگیں۔ جمالی کی آنکھوں میں اندھیرا آرہا تھا ———— یہاں تک کہ آفتاب بالکل غروب ہوگیا تمام چیزیں تاریک ہوگئیں۔ ہر چیز اندھیرے میں پوشیدہ ہوگئی، جمالی جو اب تک روشنی اور اندھیرے سے بے خبر تھا اچانک چیخ اٹھا، غش کھا کر کرسی سے زمین پر گر پڑا۔ ایسی حالت میں جلدی سے کنڈی کھول کر زار زار رونے لگا۔ وہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اے اماں، ارے بہن جلدی آؤ، خدا کے لئے جلدی آؤ۔ میں (ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق) پھر اندھا ہو رہا ہوں۔ میری روشنی پھر

سلب ہو رہی ہے، ارے جلدی آؤ، تاکہ تمہیں تو ذرا دیکھ لوں، ماں اور بہن دونوں کمرے کی طرف لپکے۔ جھٹ جمالی کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ جمالی سبک سبک کر رو رہا تھا اور اس کی ماں اور بہن تسلی دے رہے تھے کہ نہیں بھائی یہ اندھا پن نہیں ہے بلکہ آفتاب غروب ہوا ہے یہ اس کا اندھیرا ہے۔ اچھا ذرا سر تو اٹھاؤ۔ وہ دیکھو روشنی ہو رہی ہے۔ بتاؤ تم دیکھتے ہو۔ دیکھ رہے ہو نا۔!!

دورِ حیات

م ے قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ؛ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں ؟

(سید یوسف بخاری دہلوی)

محمود ابھی ایک کمسن بچہ تھا۔ اس کی ماں نے اسے ایک مدرسہ میں بھیجدیا۔ وہ دن رات ایک ظالم بوڑھے مدرس کی نگرانی میں رہتا تھا۔ اس کا چہرہ سخت اور بدنما تھا آواز بھی نہایت بھاری اور کرخت تھی۔ محمود اپنا سبق بڑی محنت اور توجہ سے یاد کرتا۔ لیکن اس کا معلم اس کو معمولی سی غلطی پر بھی کافی سزا دیتا۔ روزمرہ چٹکیاں توڑنے سے اس کے کان اور بیدوں کی ضرب سے دونوں ہاتھ ورم کر آئے تھے۔ وہ اس ظالم استاد کی مار پیٹ سے بچنے کی خاطر خدا سے ایک نوجوان آدمی بننے کے لئے شدت سے دعا کرتا تھا۔ آخر ایک روز اس کی یہ التجا پوری ہو گئی۔

تحصیل علم کے بعد وہ ایک مشہور تجارتی آدمی بن گیا۔ شب و روز کاروبار میں مصروف رہتا اسے اکثر دور و دراز ملکوں میں سفر کرنا پڑتا۔ غیر ممالک کی آب و ہوا اسے ناموافق ثابت ہوتی وہ خرید و فروخت کے معاملات طے کرنے کے لئے ہم پیشہ آدمیوں سے ملتا تھا۔ ہر روز نئی طبیعتوں اور نرالے دماغوں سے الجھنا پڑتا تھا۔ وہ سب اس کے مذاق سے کوسوں دور ہوتے تھے۔ اس لگاتار محنت و مشقت کے باعث اسے اپنے جسم میں درد و تکلیف محسوس ہونے لگی۔ زندگی آلام و مصائب کا نمونہ بن گئی۔ اب اسے ہر وقت یہ آرزو ستانے لگی کہ وہ ایک بوڑھا امیر بنکر اپنی باقی زندگی عیش و راحت کے ساتھ بسر کرے۔ اس کی یہ آرزو بھی بہت جلد پوری ہو گئی۔

کاروباری انہماک سے فراغت پانے کے بعد وہ ایک مستقل رئیس کی زندگی بسر کرنے لگا۔ دن عید اور رات شب برات منانے لگا اسے کوئی دنیاوی فکر نہ رہی۔ ہر وقت عیش و مسرت کی حالت میں رہتا۔ کچھ مدت یہی عملدرآمد رہا۔ آخر دماغ ناتوان اور اعضا مضمحل ہو گئے۔ ایک روز اپنے انجام کا خیال آیا۔ آغاز خوشنما اور انجام دردناک دیکھکر وہ تڑپ اٹھا۔ اس روحانی تکلیف نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ گریہ و زاری کرنے لگا اس کے دل میں یہ تمنا موجزن ہوئی کہ اسے اسکی پہلی زندگی حاصل ہو اور وہ پھر کسی طرح ایک کمسن بچہ بن جائے!

میں نے محمود کی حالت پر ایک لمحہ ذرا غور کیا اور یہ دیکھکر کہ وہ ـــــ ایک انسان ـــــ کس طرح بچے سے نوجوان، نوجوان سے بوڑھا اور بوڑھے سے بچہ بننے کے لئے بیقرار ہے میں کئی بار بیساختہ ہنسا۔

خیالاتِ عزیز

(از مولانا نصر اللہ خان عزیزؔ رکن مجلس ادارۂ "جاوید" ــــــ مدیر مدینہ)

واقفِ راز کوئی ہے ہی نہیں ‖ موت ڈرنے کی ورنہ شے ہی نہیں
جلوۂ حق ہے ہر طرف پیدا ‖ اور کوئی جہاں میں ہے ہی نہیں
ہے محبت میں بھی عجیب سرور ‖ نشہ آور جہاں میں مے ہی نہیں
کفر کے واسطے ہو نغمہ سرا ‖ ساز دل میں مرے وہ لے ہی نہیں
ہو حمایت میں کفر کی جو بلند ‖ پاس اپنے مگر وہ نے ہی نہیں
چھیڑ اس شوخ سے چلی جائے ‖ قصہ یہ مستحق طے ہی نہیں
لذتِ گریۂ سحر یعنی ‖ بہتر اس لے سے کوئی لے ہی نہیں
اب وہ تسکین کس کو دیں گے عزیزؔ ‖ میرے سینے میں دل تو ہے ہی نہیں

مشرق و مغرب کا مستقبل

ماضی و حال کے آئینہ میں

(از جناب جلال احمد زبیری صاحب بی۔اے مدیر تحقیق)

آج کل ایشیائی ممالک میں یورپ کے تسلط اور مغربی تہذیب کے نفوذ و اثر کو دیکھکر بعض کمزور طبیعتیں اس درجہ متاثر ہوتی ہیں کہ ان پر مستقبل کے متعلق یاس و ناامیدی کے جذبات طاری ہو جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ صورت حالات ہمیشہ اسی طرح رہیگی اور ایشیا کا روحانی تمدن آہستہ آہستہ مغرب کی مادی تہذیب کے استیلا سے پوری طرح مغلوب و فنا ہو جائیگا لیکن جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کسی قدر غور و خوض کے ساتھ کیا ہے اور نسل انسانی کی طویل داستان سے نتایج مستنبط کرنے کی سعی کی ہے ان کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ یہ جانتے ہیں کہ دنیا میں تہذیب و تمدن کے آغاز سے لے کر آج تک ایسے دور بہت سے گذر چکے ہیں کہ بے شمار مایوسیوں اور ناکامیوں کے بعد آخر امید کا آفتاب طلوع ہوا ہے اور مشرق نے اپنی خصوصیات کو سیکڑوں اور ہزاروں سالوں کی پستی اور پسماندگی کے بعد پھر ایک مرتبہ نمایاں کیا ہے۔ اور زمانے یہ دیکھ لیا ہے کہ بالاخر نسل انسانی کو اپنے دنیاوی اطمینان و سکون اور نشو و ارتقا کے لئے بھی روحانی اثرات ہی کا مرہون منت ہونا پڑا ہے۔ اور انسانی وحشت و بربریت کی چند صدیاں جب گذر چکی ہیں تو حقیقی تہذیب و تمدن کے سرچشمے ایشیا ہی سے ابلے ہیں اور ایشیا ہی کے باشندوں نے دنیا کے تمام معلوم حصوں کو قوانین فطرت کا صحیح اور قابل عمل سبق دیا ہے۔

نینوا اور مصر کی تہذیبیں مورخین محققین اس امر پر متفق ہیں کہ تہذیب و تمدن کے آثار سب سے پہلے مشرقی ممالک میں پیدا ہوئے۔ عراق و مصر کی تہذیبیں متفقہ طور پر دنیا کی سب سے زیادہ پرانی تہذیبیں تسلیم کیجاتی ہیں۔ عراق میں دجلہ و فرات کے درمیان سوشل زندگی کی سب سے پہلی چہل پہل شروع ہوئی بابل و نینوا کی سلطنتیں یہیں قائم کی گئیں۔ اشوریوں کا عروج یہیں ہوا جنھوں نے عراق سے لے کر مصر تک کے علاقہ کو فتح کیا۔ حضرت نوح حضرت یونس حضرت ابراہیم جیسے جلیل القدر انبیاء اسی سرزمین میں مبعوث ہوئے اور انھوں نے تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور میں انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے وحی الٰہی کی تعلیم دی یہیں کے باشندوں نے فن تحریر کی بنیاد ڈالی جو انسانی تہذیب کی توسیع کے لئے مفید ترین ایجاد ثابت ہوئی فن عمارت میں انھوں نے بہترین کمال کی۔ انھوں نے پختہ مکانات بنانے کے معیار تعمیر کئے اور تمدنی زندگی کے لوازم و خصوصیات کے ساتھ سب سے پہلا قوم شاہراہ ترقی کی طرف اٹھایا اور [illegible]

طرف تقریباً اسی زمانہ میں مصری تہذیب کا آغاز ہوا۔ مصریوں نے دریائے نیل کی زرخیز وادی میں اپنا سفر بالکل علیحدہ شروع کیا۔ فراعنۂ مصر کے دربار، ان کے قصور و محلات اور اُن کا جاہ و جلال، اور اُن کا سامانِ تعیش مصر میں اس دور کے تہذیب و تمدن کا پتہ دیتا ہے اور اہرامِ مصری تو اُن کے فنِ انجینیری کے کمال کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں ہیں کہ آج انہیں دیکھ دیکھ کر دنیا کے تمام انجینیر ششدر و حیران ہیں۔ یہی دو مشرقی ممالک ایسے ہیں جنہیں انسانی تہذیب کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے۔ تہذیب کے یہی سرچشمے تھے جنہوں نے سب سے پہلے عرب کے سامی النسل باشندوں کو متمدن کیا جہاں سے تہذیب و تمدن فنیشیا، شام، فلسطین، عرب میں پھیل گیا۔ ان ممالک کے متمدن ہو جانے سے ہزاروں سال بعد تہذیب فنیشیا سے سفر کرتی ہوئی یورپ میں بحرِ ایجین کے کناروں تک پہنچی۔ اسی طرح ایشیا کے ایک تیسرے مرکزِ تہذیب یعنی چین میں جو تمدن پیدا ہوا وہ بھی برابر نشو و نما پاتا رہا چونکہ اس چینی تہذیب کے ابتدائی دور میں تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں رہا اس لئے وہ ہمارے نزدیک خارج از بحث ہے۔

یورپ کی وحشت و جہالت

جس وقت ایشیا میں تہذیب و تمدن کی بیس صدیاں گذر چکی تھیں یورپ میں کوئی روشنی موجود نہ تھی۔ اور یہ تمام خطہ گنجان اور گھنے جنگلوں سے بھرا ہوا تھا ممکن ہے کہ انسان اپنی منتشر حالت میں ان گنجان جنگلوں کے درمیان نیم وحشی مخلوقات کی طرح چکر لگا رہا ہو۔ مگر یہ امر یقینی ہے کہ سوشل زندگی کا کوئی نام و نشان بھی نہ تھا۔ بحرِ ایجین چونکہ ایشیا سے قریب ترین سمندر تھا اور یہ سمندر اپنی وسعت کے اعتبار سے کچھ زیادہ بڑا بھی نہ تھا اس لئے صرف اس سمندر کے کنارے بسنے والوں نے فنیشیا کے تاجروں سے تہذیب و تمدن کے سبق لئے اور چار ہزار سال قبل مسیح ایک سلطنت قائم کی جو یورپ کی تاریخ تمدن میں ابتدائی سلطنت کہی جا سکتی ہے، اور جو بغیر کسی دیرپا نتائج کے پیدا بھی ہوئی اور ختم بھی ہو گئی۔ یہاں کے باشندوں نے (یہی علاقہ بعد میں یونان کے نام سے موسوم کیا گیا) ایشیا سے فنِ تحریر سیکھا۔ اور فنیشیوں سے اپنی زبان کے حروف حاصل کئے۔ اور انہیں سے سمندر میں کشتیاں چلانا سیکھا اور انہیں سے مکانات کی تعمیر اور تمدن کے دوسرے لوازم اختیار کئے۔ اور ممکن ہے کہ انہیں سے انبیاء بنی اسرائیل کی دی ہوئی روحانی ہدایت بھی حاصل کی ہو۔ ایجین تہذیب کی بربادی کے بعد بھی صدیاں گذر گئیں اور یورپ میں کسی قسم کی مہذب اور متمدن زندگی پیدا نہ ہو سکی۔

یونان کا تمدن

ایشیا میں سامی النسل قوموں کی تہذیب کے بعد آریوں کا دور شروع ہوا اور بحرِ خضر سے یہ قوم ایران افغانستان، اور وہاں سے ہندوستان میں آئی، بابل کی آخری سلطنت آرین قوم کے حملوں سے دو ٹکڑوں میں منقسم ہوئی۔ پہلے دیریہ سلطنت قائم ہوئی اور اس کے بعد اسی سلطنت نے اپنے اندر عراق، شام اور مصر کو جذب کر لیا اور ایرانیوں کا دور عروج آیا۔ اور دارا کی وہ عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی کہ جس کی کوئی مثال اس سے قبل کی تاریخ میں نہ پائی جاتی تھی اور دریائے سندھ سے لے کر دریائے نیل تک کا تمام علاقہ باستثنائے ریگستانی عرب اس سلطنت میں شامل رہا۔ آریوں ہی کی ایک جماعت یورپ میں گئی۔ اور اس نے زرخیز دریاؤں کے کنارے بستیاں بسائیں اور ان کے

وحشی باشندوں کو بھی تمدن سے آگاہ کیا۔ کیونکہ بحر ایجین کے کنارے ایشیا کے اثرات سے ایک تہذیب پہلے قائم ہو چکی تھی اور بحر متوسط کے مشرقی و جنوبی سواحل سے تہذیب کی کرنیں برابر یورپ کے سواحل پر پڑ رہی تھیں اس لئے ہم سب سے پہلے یونان ہی کا ذکر ایک متمدن مملکت اور قوم کی حیثیت سے یورپ کی تاریخ میں پاتے ہیں اور مشرق و مغرب کے درمیان سب سے پہلی کشمکش بھی یونان ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ایرانی سلطنت کے فرمانرواؤں دارا اور کسریٰ کے یونان پر حملے اور انکی فتوحات اور یونان پر قبضہ اور اس کے بعد پسپائی ایسی داستانیں ہیں کہ انھیں تاریخ کا مطالعہ کرنے والے بارہا پڑھ چکے ہونگے۔ یہی وہ واقعات ہیں جو مشرق اور مغرب کی کشمکش اور تنازع للبقا کے سلسلہ میں اساس و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔

اسکندر اعظم کی فتوحات

ایرانیوں کے حملوں اور ان کی فتوحات کا جواب یونان کی جانب سے جب دیا گیا تو وہ نہایت سخت اور ہمت شکن تھا۔ اسکندر اعظم نے یونان سے نکل کر ایک جرار فوج کی امداد سے ایشیائے کوچک، شام، فلسطین، مصر، عراق، ایران، افغانستان اور ہندوستان میں دریائے سندھ تک کے علاقہ کو فتح کر ڈالا اور دارا و کسریٰ کی وہ سلطنت جو نہ صرف بابل و نینوا کی پرانی سلطنتوں کے کھنڈروں پر تعمیر کی گئی تھی بلکہ جس میں دور دراز کے علاقے شامل تھے اسکندر اعظم کے سامنے سرنگوں ہو گئی، مگر یہ فتح محض عارضی و ہنگامی فتح تھی۔ سکندر کی فوجوں نے بیشک مشرقی افواج کو شکست دیدی، مگر جہاں تک مشرق کی اسپرٹ کا تعلق تھا وہ ہرگز فتح نہ کیجا سکی ہر جگہ ایشیا کا تہذیب و تمدن اسی طرح باقی رہا جس طرح کہ پہلے تھا۔ سکندر کی یونانی سلطنت تو اسی وقت ختم ہو گئی جبکہ ہندوستان سے واپس ہوتے ہی اچانک اسکی قضا ایک بخار کی شکل میں آئی۔ اور اس کے ساتھ یونانی سلطنت کے تصور کو بھی فنا کر گئی۔ مگر اس کے یونانی جرنیلوں نے بھی مشرق میں جو حکومتیں قائم کیں وہ کچھ زیادہ عرصہ تک اپنا اثر قائم نہ رکھ سکیں اور ان کی مغربی و اجنبی نوعیت تو پہلے ہی دن سے قائم نہ ہو سکی اس کے برعکس یونانیوں ہی نے اپنی ان فتوحات میں ایشیا سے سب کچھ حاصل کیا۔ اور یونانی علوم و فنون کی کمی میں ہندوستانی و ایرانی معلومات سے انھیں بہت زیادہ امداد ملی۔ سکندر کی افواج میں جو یونانی ہندوستان آئے تھے وہ یہاں سے علوم و فنون کے اکثر شعبوں میں اہم ترین ذخیرے اپنے ہمراہ لے گئے۔

رومی سلطنت

یونانیوں کے بعد مشرق و مغرب کی کشمکش کے لئے رومیوں کی سلطنت اسٹیج پر آئی۔ پہلے تو یہ کشمکش روم اور کارتھیج کی مسلسل و پیہم جنگوں کی صورت میں جاری رہی جن کا انجام کارتھیج کی مکمل تباہی و بربادی پر ہوا۔ اور رومیوں نے اس شہر کی ڈھائی لاکھ آبادی میں سے دو لاکھ انسانوں کو تہ تیغ کر کے دم لیا۔ اور اس کے بعد شہر کو آگ لگا کر اس پر ہل چلوا دئے۔ کارتھیج کے مقابلے میں فتح و کامرانی سے رومیوں کے حوصلے بڑھے اور ان کی سلطنت ایشیائی ممالک میں بڑھنی شروع ہوئی حتیٰ کہ انھوں نے ایشیائے کوچک شام اور عراق میں دریائے فرات تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اور افریقہ کے شمالی سواحل بھی رومیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ رومیوں کی یہ سلطنت بالکل جدید طرز کی تھی، اب تک تو یہ ہوتا رہا تھا کہ مختلف فرمانرواؤں نے بڑے بڑے شہروں اور علاقوں کو فتح کیا اور انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا لیکن یہ تمام علاقے ان فرمانرواؤں کی سلطنتوں ہی میں شمار

کئے جاتے رہے۔ رومی سلطنت میں جس کی ابتدا جمہوریت سے ہوئی تھی اور جس کی انتہا بدترین قسم کی شہنشاہیت پر ہوئی مرکز سے حکومت کرنے کا التزام کیا گیا۔ اور رومی سردار اور رومی جنرل بڑے بڑے شہروں میں بھیجے گئے جنہوں نے انتہائی وحشت و بربریت کے ساتھ مظالم کئے۔

رومیوں کی بربریت اگرچہ رومیوں نے اپنے عہد میں اس کی بہت کوشش کی کہ وہ ایشیا کے تہذیب و تمدن کو بالکل تباہ و برباد کردیں۔ اور صدیوں تک برابر انکی یہ کوشش جاری رہی۔ مگر وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ بلکہ ایک معنی میں مغلوب ہوکر رہے۔ انھوں نے ایشیا کے بڑے بڑے شہروں کو جلایا اور تباہ و برباد کیا، اور معابد کو اور پبلک عمارتوں کو منہدم کرتے رہے۔ انھوں نے ایشیا کے لٹریچر کو دنیا سے فنا کردینے کا فیصلہ کیا۔ یہودیوں کی توریت اور عیسائیوں کی انجیل کے تمام نسخے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر انھوں نے تلف کرڈالے۔ اپنے دیوتاؤں کے مندر ہر جگہ بنائے اور ان کی جبراً پرستش کرائی۔ اور اپنے شہنشاہوں کے بت نصب کراکر فراعنۂ مصر کی طرح ان کی پرستش کرائی۔ مگر ان کوششوں کے باوجود مشرق میں نہ رومیوں کے مذہب کو مقبولیت حاصل ہوسکی اور نہ ان کی لاطینی زبان مشرق میں بولی گئی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں جو مظالم کئے وہ ضرور تاریخ میں یادگار ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ انسانوں کے جان و مال اور ان کے جسم و روح کی توہین و تذلیل جتنی رومیوں کے عہد میں ہوئی اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہی اٹلی جو ایک زمانہ میں جمہوریت کا گہوارہ تھا غلامی کا بدترین مرکز ہوگیا۔ انسانوں کو غلام بناکر انھوں نے اس درجہ بدسلوکیاں کیں کہ ان کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی بعثت رومیوں ہی کے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ شام رومیوں کے قبضہ میں تھا اور انکی درندگی، بربریت اور غلاموں پر انکے زہرہ گداز مظالم کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم نے لوگوں کے دلوں میں از سر نو امید کی جھلک پیدا کی۔ اسوقت یورپ انتہائی جہالت و تاریکی میں مبتلا تھا مگر ایک عرصہ کے بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم یورپ گئی تو وہ مسخ ہوچکی تھی۔ کیونکہ ان رومی درندوں ہی نے اصل انجیل کو غارت کردیا تھا۔ اور اب جو کچھ باقی تھا وہ لوگوں کی سنی سنائی باتیں تھیں جنھیں بعد میں یکجا کرلیا گیا تھا۔ بہرحال یہ روشنی بھی یورپ کو ایشیا ہی سے ملی اور اسکو یورپ نے غنیمت سمجھا۔ اگرچہ اس عالمگیر تاریکی کے لئے جو اسوقت یورپ پر چھائی ہوئی تھی ایک اور آفتاب کی ضرورت تھی جو آئندہ ایک ایسے افق سے طلوع ہونے والا تھا جس کے متعلق کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ وہ تمام عالم کے لئے روشنی کا سرچشمہ بن جائے گا

ایشیا کی غلامی چھٹی صدی عیسوی میں یورپ کا انتشار اور اس کی بدنظمی و ابتری اسقدر مکمل تھی کہ مورخین مغرب اس عہد کو بدترین عہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ خود رومی سلطنت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوچکے تھے۔ روم کے زوال کے بعد مختلف ممالک میں غیر مہذب باشندوں کی کچھ تھوڑی حکومتیں قائم تھیں۔ رومی سلطنت میں سے صرف قسطنطنیہ مشرقی سلطنت کا پایۂ تخت رہ گیا تھا۔ یہ سلطنت جو بازنطینی سلطنت کے نام سے بھی مشہور ہے ایشیا میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کئے ہوئے تھی

اور اس نے ایشیا ہی کے مذہب یعنی مسیحیت کو اختیار کر لیا تھا۔ ایشیائے کوچک، شام اور فلسطین پر اس کا تسلط تھا۔ ایران کی ساسانی سلطنت سے اس سلطنت کی جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ مگر وہ فیصلہ کن نہ تھیں اور کبھی ایک فریق کو فتح اور دوسرے کو شکست اور کبھی دوسرے کو فتح اور پہلے کو شکست ہو جاتی تھی۔ ان جنگوں اور نبرد آزمائیوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ایشیا کا وہ تمام حصہ جو یورپ کے قبضہ میں تھا فوجوں کی آمد و رفت اور آئے دن کے کشت و خون سے تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اور چونکہ اس علاقہ کو تقریباً ایک ہزار سال سے زائد عرصہ رومیوں اور یونانیوں کی غلامی میں گذر گیا تھا۔ اس لئے مستقبل کی طرف سے مایوسی ہو چکی تھی۔

ظہورِ اسلام

عین اس وقت عرب کے ریگستان میں ایک محیر العقول روشنی نمودار ہوئی۔ اور وہ خطۂ زمین جس نے آج تک تاریخ میں کوئی کارنمایاں نہیں کیا تھا اور جس سے متمدن دنیا ہمیشہ بے تعلق و بے خبر رہی تھی ایک ایسی عجیب و غریب تہذیب کا مرکز و منبع بن گیا جس نے نہ صرف ایشیا کو صدیوں کی غلامی سے آزاد کرا دیا۔ بلکہ یورپ کو بھی وحشت و بربریت کی پستی سے نکال کر علوم و فنون کی بلندی پر لا کھڑا کیا۔ اور اسے عروج و ترقی کے تمام راستے اس طرح بتا دئے کہ وہ ان پر گامزن ہو کر تمام دنیا میں مہذب و متمدن کہلانے کا مستحق بن گیا۔ چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں بادیہ عرب کے ایک غیر مشہور و غیر معروف شہر مکہ میں نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور ان کے توسط سے بنی نوع انسان کی رہنمائی و ہدایت کے لئے ایک جامع و مانع کتاب قرآن حکیم نازل ہوئی جس کی انقلابی تعلیم نے چند سال کے اندر ہی دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ تمام دنیا کے مورخین بلا امتیاز مذہب و ملت جب تاریخ کے اس باب پر آتے ہیں جس کا تعلق نبی کریم کی بعثت اور عرب قوم کی اصلاح و تعلیم اور اسلام کی ترقی اور صحابہ کرام کی فتوحات سے ہے تو ان کا قلم بے اختیار ہو کر حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے لگتا ہے اور وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ نسل انسانی کی تاریخ میں کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ اسقدر قلیل مدت میں ایک ایسی جاہل و غیر متمدن قوم علم و تہذیب کا سرچشمہ بن گئی ہو اور اس کی فتوحات نے صرف ایک صدی کے اندر کرۂ زمین کا جغرافیہ یکسر بدل ڈالا ہو۔ مگر خواہ کسی کو کتنی ہی حیرت کیوں نہ ہو اور خواہ اس کے لئے کوئی ظاہری و قابل فہم سبب سمجھ میں آئے یا نہ آئے حقیقت یہی ہے کہ ایسا ہوا۔ اور ایشیا کے ایک تاریک ترین ریگستان سے اس آفتاب نے طلوع کیا جس کی شعاعیں تمام ایشیا و تمام یورپ میں پھیل گئیں۔

ایشیا کی آزادی

جس وقت بازنطینی سلطنت کا شہنشاہ ہرقل شام میں قیام امن کے لئے گیا ہوا تھا اسے ایک پیغام ملا کہ وہ اسلام قبول کرے۔ اور اسی قسم کے پیغامات ایران اور چین میں بھی گئے جو ایشیا میں اس وقت کی تہذیب و تمدن کے مراکز تھے۔ ان شہنشاہوں اور حکمرانوں کے دماغ میں یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ حالات کس قدر جلد منقلب ہونے والے ہیں۔ چند ہی سال کے بعد عرب اپنے ریگستانی علاقہ سے نکل کھڑے ہوئے اور مشعل ہدایت کو اپنے ساتھ لیے کہ جس نے ان کے سینوں کو منور کر دیا تھا۔ تمام عالم کو تہذیب و تمدن کے نور سے منور کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا۔ خلیفہ اول کے عہد میں جنگ یرموک کے بعد شام کے دروازے کھل گئے اور آہستہ آہستہ یہ روشنی آگے بڑھنے لگی اور

ہرقل نے اپنی زندگی میں ایشیائی ممالک کو رفتہ رفتہ یورپ کے تسلط سے نکل کر عربوں کے اقتدار میں جاتا ہوا دیکھ لیا۔ شام کی جنگ کے لئے ہرقل خود بھی گیا تھا اور اس نے رومیوں کی افواج قاہرہ کو حمس سے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ باوجود ان منظم و مرتب افواج کے جو رومیوں کے حصہ میں آئی تھیں اور ان وسیع ذرائع و وسائل کے جو صدیوں کی قدیم سلطنت میں رومی شہنشاہ کو حاصل تھا۔ مسلمانوں کی صرف چالیس ہزار فوج نے حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں دو لاکھ چالیس ہزار رومیوں کو سب سے پہلی معرکتہ الآراء شکست دی جس کے بعد اُن کے قدم اکھڑتے ہی گئے۔ خلیفہ دوم کے زمانہ میں اسلام کے مشہور جنرل حضرت ابوعبیدہ نے دمشق، حماد، حلب، اور دوسرے شہر فتح کئے اور مسلمانوں کی فوجیں انطاکیہ تک پہنچ گئیں۔ جو اس زمانہ میں رومیوں کا مشرقی دارالحکومت تھا۔ اس کے بعد ہی بیت المقدس بھی فتح ہوا۔ اور مسلمان مصر کی طرف بڑھے۔ اور اس کی فتح میں بھی کامیاب ہو گئے۔ اس طرح سات سو سال کے بعد شام اور فلسطین اور مصر رومیوں کی سلطنت سے نکل کر ایشیا کے قبضہ میں دوبارہ آ گئے۔ عراق اور ایران کو بھی عربوں نے فتح کر لیا۔ صرف ایشیائے کوچک باقی رہ گیا۔ جس کو رومیوں کے مکمل اخراج کا انتظار تقریباً چار صدیوں تک اور کرنا پڑا جبکہ ترکوں نے تمام ایشیائے کوچک پر قبضہ کر کے رومیوں کو ایشیائی براعظم سے تقریباً ایک ہزار سال کے بعد بالکل نکال دیا۔

یورپ پر قبضہ ترک رومیوں کا تعاقب کرتے ہوئے اُن کے یورپین دارالحکومت تک پہنچ گئے۔ اور قسطنطنیہ کو فتح کر کے یورپ میں پیشقدمی کی اور اسٹریا ہنگری تک انکی فوجیں پہنچیں۔ اور انھوں نے ایک بہت بڑی سلطنت قائم کی۔ جو اپنے پورے عروج و اقبال کے ساتھ سات آٹھ سو سال تک جاری رہی۔ اور دوسری طرف مسلمانوں نے تمام شمالی افریقہ کو فتح کر کے اسپین پر حملہ کیا اور اسے فتح کیا۔ اور فرانس تک اسلامی و ایشیائی حکومت کی حدود قائم کیں۔ اسپین پر مسلمانوں کا اقتدار آٹھ سو سال تک رہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایشیا نے یورپ کے ممالک میں سالہا سال تک اپنی سلطنتوں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا اور اپنی ایسی یادگاریں قائم کیں کہ انھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی چھٹی صدی عیسوی کی بدترین حالت سے یورپ کے نکلنے اور تہذیب و تمدن کے اثرات سے متمتع ہونے کے مواقع اور اسباب و علل پر جب کبھی بحث کی جائے گی تو ہمیشہ ایشیا کی اس بادیہ نشین قوم کا ذکر جسے عرب کہتے ہیں سنہری حرفوں میں اس بحث کا عنوان جلی قرار پائیگا۔

عربوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں یورپ کو مہذب و متمدن بنانے کے لئے جو کچھ کیا اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل باب کی ضرورت ہے اسے ہم جاوید کی آئندہ اشاعت میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

جگر پارے

فطرت مجبور پر قابو ہی کچھ چلتا نہیں
ورنہ ہم تو تجھ سے بھی تجھکو چھپا کر دیکھتے

(جگر مرادآبادی)

مامون الرشید کا مذہب

(از پروفیسر مولانا ابوالجلال سید احمد اکبرآبادی رکن مجلس ادارہ جاوید)

مامون کے مذہب سے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی کہ آیا وہ سنی تھا یا شیعہ اور یا معتزلی تھا۔ اس کے دربار میں مختلف مذہبوں کے بڑے بڑے علماء اور افاضل موجود رہتے تھے، اور مامون کی وسعت ظرفی نے ان سب کو اپنے اپنے عقائد و خیال کے اظہار کی کامل آزادی دے رکھی تھی، وہ ہر ایک کے دلائل و براہین کو سنتا تھا۔ اور چونکہ خود بھی ایک وسیع النظر عالم تھا۔ اس لئے ان سب محاکمہ کر کے جو بات اُسے پسند آتی تھی اس کو بلا خوف لومۃ لائم اختیار کر لیتا تھا۔

مامون کا اتالیق جس نے بچپن سے مامون کی تربیت کی تھی یحییٰ ابن مبارک تھا۔ اور یہ معتزلی المذہب تھا۔ علامہ یاقوت الرومی اپنی کتاب معجم الادبا کی جلد سابع میں لکھتے ہیں کہ مامون کو اعتزال سے متہم کیا جاتا ہے۔ اور یہ کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ کیونکہ مامون کا استاد یحییٰ بن مبارک تھا۔ تو اگر شاگرد استاد کے خیالات سے متاثر ہوا ہو تو کیا تعجب ہے؟ مذہب اعتزال کے اکثر و بیشتر مسائل بلکہ حق تو یہ ہے کہ اعتزال کی تمام بنیاد ہی عقلی فلسفہ پر قائم ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مامون نے نقل کے مقابلہ میں عقل کو ایک بڑی حد تک ترجیح دی ہے۔ اور اس کا یہ رجحان قدرتی نتیجہ تھا فلسفہ و عقلیات یونان کی کتابوں کے تراجم کا۔ اس بنا پر یہ قیاس کرنا مشتبہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مائل بہ اعتزال تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اگر مامون کے دوسرے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شیعہ تھا۔ حضرت علیؓ کو تمام صحابہ سے افضل سمجھتا تھا۔ اگرچہ کسی صحابی کی توہین بھی نہیں کرتا تھا۔ متعہ کے جواز کا اعلان عام کر دیا تھا اس اعلان کے خلاف اظہار بیزاری کرنے کے لئے جب قاضی یحییٰ ابن اکثم مامون کے پاس گئے تو دیکھا کہ مامون حضرت عمرؓ کا یہ قول پڑھ رہا ہے۔ "دو متعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں حلال تھے۔ میں انکو حرام کرتا ہوں" مامون اس حدیث کو بار بار پڑھتا تھا اور ہر بار اس کا چہرہ فرط غضب سے متغیر ہو ہو جاتا تھا حضرت یحییٰ اندر پہنچے۔ تو مامون نے انکے چہرہ سے آثار حزن و الم معلوم کر کے پوچھا۔ خیر تو ہے؟ یحییٰ نے کہا کہ آج زنا حلال کر دیا گیا ہے؟ مامون نے پوچھا کس طرح؟ یحییٰ نے جواب دیا کہ متوعہ عورت نہ تو زوجہ شرعیہ ہے اور نہ وہ ما ملکت ایمانکم میں داخل ہے۔ تو اب اس سے تمتع کرنا ان دونوں حلال عورتوں کے علاوہ ایک حرام عورت سے تمتع کرنا ہوا۔ اور یہی زنا ہے۔ متوعہ عورت کے شرعی بیوی نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ میراث کی مستحق نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون مذہباً علوی شیعی تھا۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اس کا یہ رجحان نتیجہ تھا خاندان برامکہ کے ساتھ اختلاط و ارتباط کا۔

علامہ ابن اثیر نے کامل میں لکھا ہے کہ مامون علویوں کی طرف بہت مائل تھا۔ ان پر احسانات بھی بہت زیادہ کرتا تھا۔

لے شیخ عبدالوہاب نجار نے اس واقعہ کو قاضی یحییٰ بن اکثم کے بجائے احمد ابن ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے۔!

اور ایسا کرنا اس کی طبیعت کا تقاضا تھا۔ وہ تکلفاً ایسا نہیں کرتا تھا۔ انھیں واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مامون کے زمانہ میں یحیٰ ابن الحسین بن زید بن علی ابن الحسین العلوی کا انتقال ہوا تو مامون انکی نماز کے لئے بنفس نفیس حاضر ہوا۔ اور لوگوں نے اس دن اس کے چہرہ پر حزن وغم کے ایسے آثار دیکھے جو کبھی اسپر نہ دیکھے گئے تھے۔ اس کے بعد ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ زینب بنت سلیمان بن علی بن عبداللہ بن عباس کے ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا۔ (یہ زینب منصور کی چچازاد بہن تھیں) مامون نے اس لڑکے کے لئے اپنے پاس سے کفن بھیجا۔ اور صالح سے کہا کہ تم جاکر اس کی نماز پڑھاؤ۔ اور ماں کی تعزیت کرو۔ کیونکہ زینب عباسیوں کے نزدیک بڑی معززہ محترمہ تھیں۔ صالح زینب کے پاس آئے۔ اور مامون کی طرف سے جنازہ میں حاضر نہ ہوسکنے کی معذرت کی، اس پر زینب خفا ہوگئیں۔ اپنے پوتے سے کہا کہ تم نماز پڑھاؤ۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

سبکناہ ونحسبہ لجینٌ فابدی الکیر عن خبث الحدید

ترجمہ:۔ہم نے مامون کو کسوٹی پر پرکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک خراب لوہا تھا۔ اور ہم اس کو چاندی سمجھ رہے تھے۔

اس کے بعد صالح سے کہا کہ وہ اے ابن مراجل مامون سے کہنا کہ اگر یہ جنازہ یحیٰ ابن الحسین بن زید کا ہوتا تو تو اپنے دامن کو اپنے منہ پر رکھتا اور اس کے پیچھے بھاگتا ہوا ہوتا۔

ابن اثیر کی اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مامون کا طبعی رجحان علوی شیعوں کیطرف تھا اور اس بات کی شکایت سنی لوگ کرتے بھی تھے۔ لیکن اگر اسی کے ساتھ حضرت علی رضا کے دردناک قتل کے واقعہ کو ملا لیا جائے تو مامون کی شیعیت بھی قابل اعتماد و یقینی نظر نہیں آتی۔

مولانا شبلی مرحوم نے اسی بنا پر بالکل صحیح فرمایا ہے کہ مامون مذہب کے لحاظ سے اس شعر کا مصداق تھا ؎

کس کی لت میں گنوں آپ کو تبلاے شیخ ✦ تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھکو

لیکن ان تمام واقعات سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ مامون کا حال اکبر کا سا تھا۔ اور عقلی تفلسف نے اسپر اس درجہ استیلا پالیا تھا کہ وہ مذہب کے معاملہ میں کسی خاص طریق کا یا کسی خاص مشرب کا پابند نہ تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ اور مذہبی فرائض و اعمال کا بڑی سختی کے ساتھ پابند تھا۔ مذہبی احترام کی حالت یہ تھی کہ اس کے ایک معاصر ابوحشیشہ محمد بن علی ابن امیہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سب دمشق میں مامون کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں علویہ نے یہ دو شعر گائے ؎

برئت من الاسلام ان کان ذالذی اتاک بہ الواشون عنی کما قالوا
ولکنہم لما راؤک سمایعۃ الی تواصوا بالنمیمۃ فاقتالوا

مامون نے دریافت کیا علویہ یہ کس کے شعر ہیں؟ اس نے کہا قاضی کے۔ مامون کون قاضی۔ علوی۔ قاضی دمشق۔ مامون نے اسحاق کو حکم دیا کہ اسے عہدہ قضا سے معزول کردو۔ ابواسحاق نے اسی وقت فرمان شاہی کی تعمیل کی۔ اس کے بعد مامون نے

حکم دیا کہ قاضی صاحب کو فوراً حاضر دربار کیا جائے۔ قاضی آئے تو دیکھا کہ ایک بڈھا شخص ہے۔ اور پست قامت ہے۔

مامون —— تم کون ہو؟

قاضی —— فلاں ابن فلاں۔

مامون —— شعر کہتے ہو؟

قاضی —— ہاں امیر المومنین میری بیویوں پر طلاق ہو۔ اور میرا تمام مملوکہ سامان فی سبیل اللہ وقف ہو۔ اگر میں نے اب تیس برسوں سے زہد یا کسی دوست کی شکایت کے علاوہ کسی اور مفہوم کا شعر کہا ہو۔

مامون نے کہا اسے ابو اسحاق اسے معزول کر دے۔ میں ہرگز ایسے شخص کو مسلمانوں کی گردنوں کا والی بنانا نہیں چاہتا جو اپنی ہزلیات میں اسلام سے اپنی برأت کا اظہار کرتا ہو۔ اس کے بعد علویہ سے کہا کہ کھڑا ہو اور اس شعر کو بجائے برئت من الاسلام کے یوں پڑھے

حرمت منای منک ان کان ذا الذی   اتاک بہ الواشون عنی کما قالوا

اس سے مامون کے ذوق شعری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ (عصر المامون جلد اول)

اس کے علاوہ مامون نے ایک دفعہ قاضی یحییٰ ابن اکثم سے کہا کہ لا اترک قاضیاً یشرب النبیذ (میں نبیذ پینے والے قاضی کو معاف نہیں کروں گا۔

تفسیر قرآن کریم اور اسرائیلیات

(از مولانا ادریس میرٹھی)

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ (الآیۃ) "ہم نے سلیمان علیہ السلام کو امتحان میں ڈالا اور ان کے تخت پر ایک جسم ڈالدیا پھر انہوں نے رجوع کیا۔"

بعثت و رسالت ارتقاء بشری کا سب سے آخری اور رفیع ترین درجہ ہے اور یہ مسلم ہے کہ منصب و مقام کی رفعت ذمہ داریوں کو زیادہ سے زیادہ اہم اور نازک بنا دیتی ہے۔ "مقربان را بیش بود حیرانی"۔ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ میں اسی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ لہٰذا انبیا علیہم السلام کے واجبات و لوازم اور ان کی ذمہ داریاں عامۃ الناس سے بالکل مختلف اور بہت سخت ہیں۔ ان کا ابتلا و آزمائش خلاف اولیٰ اور غیر مستحسن امور میں ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان سے بازپرس ہوتی ہے جائز مگر خلاف منشاء الٰہی امور پر عتاب ہوتا ہے سب سے زیادہ سخت مصیبتوں اور بلاؤں میں ڈالکر ہر قسم کی شدید ترین جسمانی و روحانی تکالیف میں مبتلا کر کے ان کے صبر و استقلال کو آزمایا جاتا ہے۔ دولت و حشمت اور نعمت و راحت دیکر ان کے اعمال و عواطف کو پرکھا جاتا ہے۔ وعن سعد قال سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الناس اشد بلاءً قال الانبیاء ثم الامثل فالامثل۔

حضرت سعد سے مروی ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ سب سے زیادہ شدید آزمائش کس کی ہے۔ آپ نے فرمایا انبیا کی پھر جو ان سے قریب ہیں پھر جو ان سے قریب ہیں (علیٰ ہذا)

انبیا علیہم السلام معصوم ہیں لہٰذا ان سے کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا صدور محال ہے مگر بتقاضائے بشریت ہر نبی سے بعض ایسے بعید از استحسان امور کا ارتکاب ہوا ہے جو معصیت و نافرمانی نہیں مگر منشاء الٰہیہ کے خلاف ہونیکی وجہ سے ان کیلئے فتنہ اور موجب ابتلا بن گئے ہیں چنانچہ آیت مسطورہ عنوان میں اسی قسم کے ایک ابتلا کا ذکر ہے جس کی تفصیل میں عام طور پر ایک طویل قصہ اسرائیلیات سے نقل کیا جاتا ہے اول ہم اس کو بیان کرتے ہیں اور اس پر مفصل کلام کرنے کے بعد صحیح قصہ اس ابتلا کا قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کریں گے۔

قصۂ ابتلاء سلیمان علیہ السلام

وہب بن منبہ کی روایت کے بموجب اس ابتلا کا سبب یہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو صیدون نامی ایک جزیرہ کی اطلاع ملی جس کا بادشاہ عظیم الشان ملک و سلطنت کا مالک تھا اور سمندر میں ہونیکی وجہ سے لوگوں کی دستبرد اور حملوں سے محفوظ تھا۔ اللہ پاک جل شانہ نے سلیمان علیہ السلام کو عظیم الشان طاقت و شوکت عطا فرمائی تھی بر و بحر کا کوئی حصہ آپ سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ہوا پر سوار ہو کر ہر جگہ پہونچ سکتے تھے چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے اس جزیرہ کو فتح کرنے کیلئے کوچ کیا ہوا پر سوار ہو کر بحری سفر مع عساکر جن و انس کے طے کیا اور جزیرہ میں پہونچے جنگ ہوئی بادشاہ قتل اور باقی لوگ گرفتار ہوئے گرفتار قیدیوں میں ایک بادشاہ کی جرادہ نامی لڑکی بھی تھی حسن و جمال میں کسی نے اس کی نظیر نہیں دیکھی تھی حضرت سلیمانؑ نے اس لڑکی کو اپنے واسطے انتخاب کر لیا اور اسے اسلام لانے کی ترغیب دی جرادہ بغیر کسی یقین و بصیرت کے بظاہر اسلام لے آئی حضرت سلیمانؑ نے اسے اپنے

حرم میں داخل کرلیا تمام بیویوں میں سب سے زیادہ محبت اسی سے کرتے تھے اور دل سے چاہتے تھے مگر اس بڑھتے ہوئے پیار و محبت اور جاہ و جلال کے باوجود اس کا رنج و غم نہیں جاتا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمتے تھے ہر وقت دل بریاں اور چشم گریاں رہتی تھی۔ حضرت سلیمانؑ کو یہ بہت شاق گذرا ایک دن آپ نے تنگ آکر اس سے پوچھا کہ آخر یہ رنج و غم اور آہ و بکا کب تک رہیگا۔ یہ کیسا غم ہے کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا یہ کیسے آنسو ہیں جو تھمنے میں نہیں آتے جبجرہ نے کہا کہ باپ کی یاد اور اس کی سلطنت و حکومت کی تباہی و بربادی کا خیال ہر وقت میرے دل پر سوار اور سوہان روح بنا رہتا ہے حضرت سلیمانؑ نے فرمایا تمہیں تو اللہ نے اس ملک و سلطنت سے بھی زیادہ عظیم الشان ملک و سلطنت اور جاہ و جلال عطا فرما دیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہیں اسلام لانیکی توفیق دی جو تمہارے حق میں سب سے بڑی نعمت ہے پھر کیوں رنج و غم کرتی ہو۔ اس نے کہا کہ یہ سب کچھ ہے لیکن میں کیا کروں جب مجھے اپنے باپ کی صورت یاد آجاتی ہے تو میرے دل پر رنج و غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اور اس کے سوگ میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو آپ دیکھتے ہیں۔ اس کا ایک علاج ہے کہ اگر آپ شیاطین کو حکم فرمائیں کہ وہ میرے رہنے کے محل میں میرے باپ کا بت بناکر نصب کردیں صبح شام میں اسکو دیکھ لیا کروں تو شاید یہ اضطراب و بےچینی کچھ کم ہو جائے۔ حضرت سلیمانؑ نے شیاطین کو حکم دیا کہ حرم شاہی میں جبجرہ کے باپ کا مجسمہ ایسا ہو بہو بنائیں کہ وہ خود بھی فرق نکر سکے۔ شیاطین نے بت بناکر نصب کردیا جبجرہ نے جب اسے دیکھا تو وہ بجز روح کے اور کوئی فرق محسوس نہیں کرسکی، جب جن بت کو مکمل نصب کرچکے تو جبجرہ نے اپنے باپ کی وہی پوشاک جو زندگی میں پہنا کرتا تھا اس بت کو پہنائی اور یہ معمول کرلیا کہ ہر روز صبح و شام حضرت سلیمان کے تشریف لیجانیکے بعد اپنی رازدار کنیزوں کی معیت میں اس بت کے سامنے جاتی اور اپنی قدیم بت پرستی کے موافق خود مع کنیزوں کے اس بت کو سجدہ کرتی بیت نبوت میں روزانہ صبح و شام بت پرستی شروع ہوگئی چالیس روز تک یہ سلسلہ جاری رہا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو بالکل خبر نہیں ہوئی۔ آصف حضرت سلیمان علیہ السلام کا مخلص دوست تھا ان کے دروازوں پر اس کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی وہ جسوقت چاہے اور جس گھر میں چاہے جا سکتا تھا حضرت سلیمان موجود ہوں یا نہوں آصف کو کسی طرح اس بت پرستی کا حال معلوم ہوگیا وہ حضرت سلیمان کے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے نبی! میری عمر بہت ہوگئی ہڈیاں بوسیدہ ہوگئیں زندگی ختم ہوچکی کوچ کا وقت آگیا میرا جی چاہتا ہے کہ میں عام مجمع میں ایک تقریر کروں اور اپنے علم کے مطابق انبیاء سابقین علیہم السلام کے حالات اور ان کے اوصاف و کمالات بیان کروں اور لوگوں کو بہت سی ایسی باتیں بتلاؤں جن سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا بہت خوب! چنانچہ حضرت سلیمانؑ نے اعلان کرادیا لوگ جمع ہوئے آصف نے تقریر شروع کی جتنے انبیا اس وقت تک گذرے تھے ان کے احوال اور فضائل و کمالات ذکر کرکے ہر ایک نبی کی وہ خاص فضیلت بیان کی جس کیلئے اللہ پاک نے اسے ممتاز فرمایا تھا۔ سلسلۂ بیان حضرت سلیمانؑ تک پہونچا تو آپ کے متعلق اس نے بیان کیا کہ آپ بچپن میں کسقدر اچھا علم رکھنے والے کسقدر پرہیزگار کسقدر صحیح فیصلہ کرنیوالے تھے آپ کی حالت بچپن میں کسقدر مستحکم تھی آپ کو بچپن میں اللہ نے ان باتوں سے کسقدر دور رکھا جن کو وہ پسند نہیں کرتا تھا۔" اتنا کہنے کے بعد منبر سے اتر آئے" اور تقریر ختم کردی۔ حضرت سلیمانؑ پر اس کا بہت اثر ہوا غصہ کے مارے لال ہوگئے محل میں پہونچتے ہی آصف کو بلوایا اور کہا کہ اے آصف تم نے ہر نبی کے ہر زمانے اور ہر حالت کی تعریف اور خوبیاں بیان کیں اور جب میرا ذکر آیا تو میرے بچپن کے کمالات و فضائل تو بیان کئے مگر جوانی اور بڑھاپے کی تمام خوبیاں نظر انداز کردیں میں نے اس آخر عمر میں ایسا کونسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے تم نے اس کو بیان نہیں کیا۔ آصف نے عرض کیا ایک عورت کی محبت و پیار میں چالیس روز سے غیر اللہ کی پرستش آپ کے گھر میں ہو رہی ہے۔ سلیمانؑ نے فرمایا میرے گھر میں؟ آصف نے عرض کیا جی ہاں آپ کے گھر میں۔ سلیمانؑ نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون! مجھے یقین ہے کہ تم جو کچھ کہتے [illegible] پر

بنی ہوگا۔ فوراً حرم میں آکر بت کو توڑ ڈالا اور اس عورت کو مع اس کی کنیزوں کے سخت سزا دی اور پھر آپ نے دو پہر کا لباس منگوایا اس لباس کا سوت صرف کنواری لڑکیاں کاتتی تھیں وہی بنتی تھیں وہی دھوتی تھیں کوئی نجس عورت اسے ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی،

بہرحال اس لباس کو پہنکر بیابان کی طرف چلدیئے اور راکھ کا ایک بچھونا کرنیکا حکم دیا اور تائب ہوکر خدا کی طرف متوجہ ہوئے اس راکھ کے ڈھیر میں بیٹھکر عجز وانکساری کے ساتھ سر پر خاک ڈالنا اور لوٹنا شروع کیا آہ وزاری اور توبہ واستغفار میں مصروف ہوگئے اپنے گھر میں غیر اللہ کی پرستش ہونے پر توبہ واستغفار میں سارا دن ختم کر دیا اور شام کو گھر لوٹ کر آئے۔ امینہ نامی ان کی ایک ام ولد تھی جب خلا میں جانا چاہتے تھے یا بیوی سے مباشرت کا ارادہ کرتے تھے تو اپنی انگوٹھی اتار کر اس کے پاس رکھدیتے تھے تا آنکہ پاک ہو جائیں کیونکہ بغیر طہارت اس انگشتری کو نہ چھوتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کی یہ بر وبحر اور جن وانس کی عظیم الشان حکومت اسی انگشتری میں تھی اس کو پہن لینے سے ہر چیز ان کے لئے مسخر اور مطیع ومنقاد ہو جاتی تھی۔ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام انگوٹھی امینہ کے پاس رکھکر خلا میں گئے۔ صخر نامی ایک شیطان موقع کا منتظر تھا اس نے فوراً حضرت سلیمانؑ کا روپ بھرا اور ہوبہو ان کی شکل بنکر امینہ کے پاس آیا اور کہا کہ امینہ انگوٹھی لا امینہ نے دیدی اس نے فوراً انگشتری کو ہاتھ میں پہن لیا اور حضرت سلیمانؑ کے تخت پر جا بیٹھا حسب دستور تمام پرندے اور وحشی جانور جن وانس صف بستہ آکر کھڑے ہوگئے اور بجائے سلیمان علیہ السلام کے حکومت کرنے لگا۔ ادھر حضرت سلیمان علیہ السلام جب ضرورت سے فارغ ہوکر تشریف لائے اور امینہ کے پاس گئے (انگشتری جاتے رہنے کی وجہ سے) حضرت سلیمانؑ کی شکل وصورت اور حالت بدل گئی تھی آپ نے امینہ سے انگوٹھی مانگی امینہ نے کہا تم کون؟ آپ نے فرمایا سلیمان بن داؤد امینہ نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو سلیمان تو انگشتری لے بھی گئے اور تخت پر بیٹھے ہوئے حکومت کررہے ہیں، سلیمان علیہ السلام سمجھ گئے کہ ان کی خطا نے انہیں آگھیرا بالآخر مکان سے چلے گئے جس کسی اسرائیلی کے دروازے پر جاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں سلیمان بن داؤد ہوں تو وہ ان کے منہ پر مٹی پھینکتا اور کہتا کہ دیکھو اسے دیوانے کو کیا ہو گیا ہے کہتا ہے میں سلیمان بن داؤد ہوں جب حضرت سلیمان نے بستی والوں کا یہ حال دیکھا تو دریا کی طرف چلدیئے ماہی گیروں کے پاس پہونچے،

دریا سے منڈی میں مچھلی لاکر لانے پر ایک مچھیرے کے ہاں نوکر ہوگئے وہ دو مچھلیاں روزانہ انہیں دیتا یہ ایک مچھلی کے بدلے میں تو روٹیاں خرید لیتے اور دوسری بھون لیتے اور اس طرح مزدوری کرکے اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ چالیس روز اسی طرح بسر کئے راتنے ہی دن ان کے گھر میں بت پرستی ہوئی تھی، ادھر وہ شیطان تخت نبوت پر مسلط نظام سلطنت ونبوت تباہ وبرباد کر رہا تھا۔ علماء بنی اسرائیل نے اس کے نافذ کردہ احکام کو خلاف شرع محسوس کیا آصف نے سنجیدہ لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ اے جماعت بنی اسرائیل! ابن داؤد کے احکام کا اختلاف وفساد آپ دیکھ رہے ہیں؟ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہاں ہم بھی دیکھتے ہیں آصف نے کہا اچھا ذرا ٹھہرئے میں سلیمان کی بیویوں سے دریافت کرتا ہوں کہ جس طرح ہم عام لوگوں کی حالات میں خلل وفساد محسوس کرتے ہیں کیا وہ بھی اسی طرح ذاتی معاملات وحالات میں کچھ خلل پاتی ہیں،

چنانچہ آصف حرم شاہی میں گئے اور سلیمانؑ کی بیویوں سے دریافت کیا کہ کیا تم بھی ہماری طرح کچھ ان کی حالت میں خلل وفساد پاتی ہو انہوں نے کہا ہم تم سے بھی زیادہ ان کی حالت میں خلل وفساد پاتے ہیں۔ آصف حرم سے باہر آئے اور کہنے لگے کہ اندر کی باتیں تو باہر سے بھی زیادہ سخت ہیں غرضیکہ اسی حالت پر جب چالیس روز گذر گئے تو وہ شیطان تخت نبوت کو چھوڑ کر بھاگا راستہ میں دریا سے گذرا اور خاتم نبوت کو دریا میں ڈالدیا

ایک مچھلی اس کو نگل گئی اتفاقاً کسی شکاری نے اس مچھلی کو پکڑ لیا حضرت سلیمانؑ نے اسی کے ہاں تمام دن کام کیا تھا شام کو مچھیرے نے وہی مچھلی ایک دوسری مچھلی کے ساتھ دیدی حسب معمول ایک کے بدلے میں روٹی لیلی دوسری کو بھوننے کے واسطے چیرا تو اس کے پیٹ سے انگشتری نکلی حضرت سلیمانؑ فوراً سجدہ میں گرگئے اور انگشتری ہاتھ میں پہن لی انگشتری کے پہنتے ہی تمام جن وانس چرند و پرند آپ کے پاس پہونچ گئے آپ نے شروع سے لیکر آخر تک تمام قصہ سنایا اور باآخر گئی ہوئی سلطنت لوٹ آئی اور آپ نے اپنے گناہ سے توبہ کی ۔ روح المعانی کی روایت میں اس قصہ میں اتنا اور اضافہ ہے ۔

جب شیطان نے دیکھا کہ اس کا راز فاش اور معاملہ دگرگوں ہوگیا تو اس نے شیطانوں کو حکم دیا اور ان سے ایک کتاب لکھائی جس میں جادو اور مکر کی تعلیم تھی (خفیہ طور پر) اس کتاب کو حضرت سلیمانؑ کی کرسی کے نیچے دفن کردیا اور پھر سب کے سامنے اسے کھود کر نکالا اور پڑھ کر سنایا اور بتلایا کہ سلیمان اس سحر و مکر کی وجہ سے لوگوں پر غالب آئے ہوئے تھے لوگوں نے یہ سن کر حضرت سلیمان پر کفر کا فتویٰ لگایا" (از خازن کبیر روح المعانی)

یہ واقعہ متعدد وجوہ سے اصول شریعت اور عقل ونقل کے بالکل خلاف سراسر غلط اور بہتان ہے ۔ نبوت و رسالت کی سب سے بڑی دشمن قوم یہود جس نے اولو العزم انبیا کو مختلف طریقوں پر نہ صرف ذلیل وخوار اور بدنام کیا ہے بلکہ ایسے دردناک طریقوں پر انہیں قتل کیا ہے جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ شرمناک الزام اور اتہام ان پر لگائے ہیں اسی قوم یہود کی تراشی ہوئی یہ داستان ہے جس کا مقصد صرف جماعت انبیاو رسل اور نبوت و رسالۃ کو بدنام کرنا اور شریعت ومذہب کا استیصال ہے اور بس ،

چنانچہ علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں اس واقعہ کی سند پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔ "ونسبۃ الخبر الی ابن عباس رضی اللہ عنہما لانسلم صحتہا وکذا لانسلم دعوی قوۃ سندہ الیہ وان قال بہا من سمعت (ابن حجر والسیوطی) وجاء عن ابن عباس بروایۃ عبدالرزاق وابن المنذر ماہو ظاہر فی ان ذلک من اخبار کعب ومعلوم ان کعبا یروی عن کتب الیہود وہالایوثق بہا علی ان اشعار مایاتی بان تسخیر الشیاطین بعد الفتنۃ یابی صحۃ ہذہ المقالۃ کمالایخفی" ترجمہ "اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں اسی طرح قوت سند کا دعوی بھی قابل تسلیم نہیں اگرچہ مذکورہ بالا حضرات (ابن حجر وسیوطی) اس کے قائل ہیں (کیونکہ) بروایت عبدالرزاق وابن المنذر جو روایت ابن عباس سے مروی ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کعب احبار کی روایتوں میں سے ہے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ کعب کی روایتیں یہود کی کتابوں سے ہوتی ہیں اور وہ کسی طرح قابل اعتماد نہیں علاوہ اس کے قرآن کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطین اور ہوا وغیرہ کو زمانہ فتنہ کے بعد مسخر کیا گیا ہے (اس آیت کے بعد کی آیات تلاوت کیجئے) ہم اس قصہ کے مفاسد پر مستقل عنوانات قائم کرکے کلام کرتے ہیں اور اس کے بعد آیۃ کریمہ کی صحیح تفسیر اور مابتلا کا مستند واقعہ مفصل بیان کریں گے "

نبی معصوم اور اس کی نبوت محفوظ ہے نبوت و رسالت نظام دینی کا سنگ بنیاد ہے اس کا تزلزل مذہب وملت کی تعمیر کے انہدام کا باعث ہے اور اس کا تحفظ واستحکام تمام تعمیر کے بقا کا کفیل ہے ، اہل اہواء اور باطل پرستوں کی رخنہ اندازیاں اس کو متزلزل نہیں کرسکتیں ۔ شیاطین جن وانس حریم نبوت میں در اندازی نہیں کرسکتے "

یہ وہ موہبت عظمیٰ اور عنایت الٰہیہ ہے کہ اس کے ساتھ سرفراز کرنے کیلئے وقت کا سب سے زیادہ نجیب الطرفین الکریم الطبع سلیم الفطرۃ

صحیح العقل صائب الرائے اور بہترین جسمانی و روحانی طاقتوں کا مالک انسان انتخاب ہوتا ہے اس کے قلب و دماغ عقل و حواس ہر قسم کے ظاہری و باطنی خطرات اور آفات سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اس کے امیال و عواطف، جذبات و خواہشات عزائم و معتقدات ہر طرح کی لغزشوں اور خامیوں سے مصون ہوتے ہیں وہ ہر قسم کے فواحش اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے ملائک کی طرح معصوم ہوتا ہے اس کا ہر قول و فعل من اللہ و تعلیم الٰہی کا ایک عظیم الشان باب اس کی زندگی کا ہر شعبہ امت کے لئے نمونۂ عمل اور اسوۂ حسنہ ہوتا ہے۔

وَلَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	رسول اللہ کی ذات گرامی تمہارے واسطے بہترین نمونۂ عمل ہے
وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ	آپ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتے وہ سب کچھ وحی ہوتی ہے جو آپ تک پہنچی جاتی ہے

نبی کی نبوت کو محفوظ و مستحکم کرنے کے لئے رفتار زمانہ کے مطابق اس نبی کے ہاتھ پر آیات و معجزات اور خوارق عادات ظاہر کئے جاتے ہیں تاکہ جھوٹے مدعیان نبوت کے لئے دعویٰ نبوت کا دروازہ مسدود ہو جائے اور سچے نبی کی نبوت اور مبعوث من اللہ ہونے پر یقین کامل اور اذعان واثق ہو جائے مخالفین کے تشکیک و شبہات اور ان کے اعتراضات کو ہر پہلو سے دور کیا جاتا ہے اور دلیل و برہان امثلہ و شواہد غرض ہر ممکن طریق تفہیم سے سمجھا کر اسکی ہستی کو قابل اعتماد و وثوق بنا دیا جاتا ہے چنانچہ حکم ہوتا ہے

مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ؕ	جو کچھ رسول تمہارے پاس لائیں اسے قبول کرو اور جس چیز سے تمہیں منع کریں اس سے باز آجاؤ

نبی اور اس کی نبوت کا محافظ نبوت کا عطا کرنے والا رب العالمین ہوتا ہے نہ وہ خود کسی نبی کو اس مقام رفیع پر فائز کرنے کے بعد معزول کرتا ہے اور نہ کوئی دوسری طاقت نبی سے اس کی نبوت و رسالت کو چھین سکتی ہے نہ اس کے قلب و دماغ ہوش و حواس جسمانی و روحانی قوتوں کو کوئی ایسا نقصان پہونچایا جا سکتا ہے جس سے اس کی نبوت و رسالت پر کوئی اثر پڑے۔"

غیرت الٰہیہ نے کبھی بھی کسی جھوٹے مدعی نبوت کو موقع نہیں دیا کہ وہ لباس نبوت میں آکر دنیا کو گمراہ کرے وحی آسمانی اور احکام الٰہیہ میں رخنہ اندازی کے تمام راستے مسدود ہیں۔ شیاطین جن و انس میں سے کسی کی مجال نہیں کہ وہ ان میں کوئی رخنہ اندازی کر سکے۔ ایک خدائی کے دعویٰ کرنیوالے کا استیصال قدرت کی طرف سے اتنی جلد نہیں ہوتا جس قدر جلد ایک جھوٹے مدعی نبوت کا استیصال ہوتا ہے قرآن کریم صاف و صریح لفظوں میں اعلان کرتا ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ؕ	اور اگر یہ ہمارے ذمہ کچھ باتیں لگا دیتے تو ہم انکا داہنا ہاتھ پکڑتے اور انکی رگ دل کو کاٹ ڈالتے

مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں یہ قصہ قطعاً کذب و افترا ہے نبوت و رسالت کے متعلق صحیح علم رکھنے والا شخص نہیں بلکہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان بھی اس قصہ کی تصدیق کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا یہ کیسے ممکن ہے کہ سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی جو نہ صرف نبی بلکہ صاحب ملک و سلطنت بھی اور سلطنت و اقتدار نہ صرف انسانوں پر بلکہ جن و انس بحر و بر غرض تمام کائنات پر، اور ان کا مخصوص اور امتیازی خصوصیت ہی یہ ہے کہ ان کو اللہ پاک نے ایسی محیط حکومت دی تھی کہ ایسی نہ کسی کو دی گئی اور نہ دی جائے گی ایسے نبی کی نبوت اس سے چھن جائے اور ایک جنی شیطان ان کے بجائے اور ان کی ہی شکل و صورت میں آکر مسند نبوت کو گندہ اور احکام الٰہیہ کو درہم برہم کرے بنی منکرات و فواحش کا ارتکاب کرے اور نبوت و رسالت کو بدنام کرے اور اللہ کا برگزیدہ نبی دروازوں پر دھکے کھاتا مانگتا پھرے لوگ اس کے

منہ پر تھوکیں سٹری سودائی بنائیں شیاطین اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر سحر و مکاری کی تعلیم کو اللہ کے نبی کی طرف منسوب کریں اور لوگوں سے اسے کافر کہلائیں اور غیرت الٰہیہ جوش میں نہ آئے۔ مانا کہ سلیمان علیہ السلام مورد عتاب تھے ان کے لئے یہ ابتلا تھا مگر یہ کیسا ابتلا جس میں عصمت نبوت تباہ و برباد ہو اور ایک جن کا مسند نبوت و رسالت پر استیلاء و تسلط اور شرائع الٰہیہ کی بیخکنی ہوتی ہو امام رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

واعلم ان اہل التحقیق استبعدوا ہذا الکلام من وجوہ۔ الاول ان الشیطان لو قدر علی ان یتشبہ بالصورۃ والخلقۃ بالانبیاء فحینئذ لا یبقے اعتماد علی شیئ من الشرائع فلعل ہولاء الذین رأوہم الناس فی صورۃ محمد وعیسے وموسی علیہم السلام ما کانوا اولئک بل کانوا شیاطین تشبہوا بہم فی الصورۃ لاجل الاغواء والاضلال ومعلوم ان ذلک یبطل الدین کلہ۔

"محققین اس واقعہ کو متعدد وجوہ کی بنا پر مستبعد سمجھتے ہیں۔ پہلی تو یہ کہ شیطان رجیم اگر صورت و شکل میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مشابہت پیدا کرسکتا ہے اور ایک نبی کی صورت میں ایک شیطان رونما ہوسکتا ہے تو احکام الٰہیہ اور شرائع آسمانی پر بالکل اعتماد باقی نہیں رہتا چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ لوگ جن کو دنیا محمد و عیسی و موسی علیہم السلام سمجھتی تھی فی الحقیقۃ یہ حضرات نہ تھے بلکہ شیاطین ان کی صورت میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے آگئے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ خیال دین و مذہب کی پوری پوری بیخکنی کرتا ہے" علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں،

قال ابوحیان وغیرہ ان ہذہ المقالۃ من اوضاع الیہود والزنادقۃ السوفسطائیۃ ولا ینبغی لعاقل ان یعتقد صحۃ ما فیہا وکیف یجوز تمثل الشیطان بصورۃ نبی حتی یلتبس امرہ عند الناس ویعتقدوا ان ذلک المتصور ہو النبی ولو امکن وجود ہذا لم یوثق بارسال نبی نسأل اللہ سلامۃ دیننا وعقولنا

ابوحیان فرماتے ہیں کہ یہ قصہ یہود اور زندیق سوفسطائیوں کی گھڑی ہوئی داستان ہے کسی سمجھدار آدمی کو اس کی صحت کا اعتقاد نہ کرنا چاہئے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شیطان نبی کی شکل و صورت اس طرح اختیار کرلے کہ لوگوں پر اس کی حقیقت مخفی ہوجائے اور اس بہروپیے کو نبی یقین کرتے رہیں اگر نبی کے لباس میں اس طرح شیطان کا متمثل ہونا ممکن ہو تو کسی نبی کی بعثت پر بھی اعتماد نہیں ہوسکتا ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک ہمارے دین و عقل کو سلامت رکھے۔"

ازواج انبیاء فواحش سے محفوظ ہیں

نبی کائنات عالم میں سب سے زیادہ محترم ہستی ہے اللہ تعالٰی نے اپنی طاعت کو اسکی طاعت کے ساتھ اپنی رضا کو اس کی رضا کے ساتھ اپنی حرمت کو اس کی حرمت کے ساتھ اپنی اذیت کو اسکی اذیت کے ساتھ وابستہ کردیا ہے امت کا تعلق نبی کے ساتھ اس کے نفس سے بھی مقدم اور قوی تر ہے ازواج نبی کو امہات المومنین قرار دیا ہے

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ	مومنین کیلئے نبی خود ان کے نفوس سے بھی مقدم اور اولیٰ ہے اور اسکی بیویاں انکی مائیں ہیں

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

کل نبی اب لامتہ	ہر نبی اپنی امت کا باپ ہے

نبوت اور نبی کی عزت و احترام کا محافظ اور ہر قسم کی توہین و تذلیل سے بچانیوالا اور تمام شیطانی حملوں کی اس سے مدافعت کرنیوالا رب العالمین ہے جو قادر مطلق ہونے کے ساتھ ہی سب سے زیادہ غیور بھی ہے وہ کبھی بھی اپنے نبی کی آبروریزی اور بے حرمتی کو برداشت نہیں کرسکتا وہ کبھی کسی شیطانی طاقت کو انبیا کی ازواج مطہرات یا اس کے متعلقین پر مسلط کرکے ان کی عصمت و عفت کو تباہ نہیں کراسکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ حضرت سارا کو جب ظالم بادشاہ کے سپاہی جبراً پکڑ کر لے گئے اور اس لعین نے نبی کی بیوی کو اپنی خواہشات نفسانی کا شکار بنانا چاہا تو قدرت کا غیبی طمانچہ اس کے منہ پر لگا۔ تین مرتبہ اس بوالہوس نے عصمت دری کا قصد کیا۔ ہر مرتبہ قدرت کی قہرمانی طاقت نے اسے مقہور کر دیا آخر تنگ آکر واپس کر دیا۔ رب العالمین نے اپنے نبی کی زوجہ مطہرہ کی عصمت وعفت کو صرف اپنی قدرت سے بچایا ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت سارا تو کیا کر سکتے تھے"

حرم نبی کی عصمت دری تو بجائے خود ہے اگر کسی مفتری نے کبھی جھوٹی تہمت بھی لگائی ہے تو بہت جلد اس کے افترا کو طشت ازبام کر دیا گیا اور اسے اس کے کیفر کردار کو پہونچا دیا گیا" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب راس المنافقین نے متہم کیا تو فوراً قصہ افک کے متعلق آیات نازل ہوئیں اور اپنے مقدس نبی کی محترم زوجہ کو اس تہمت سے بری کیا اور تہمت لگانیوالوں کے کوڑے لگوائے۔

حضرت مریم پر جب یہود نے بغیر باپ کے بچہ پیدا ہونیکی وجہ سے زنا کا الزام لگایا تو چند ساعت کے مولود کی زبان سے بطور معجزہ اس الزام کی تردید فرمادی اور اپنے محترم نبی کی والدہ ماجدہ کی عصمت وعفت کو محفوظ کر دیا"

یہ نظائر وشواہد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ازواج انبیا کو ہر قسم کے فواحش سے محفوظ رکھتے ہیں کوئی شیطانی طاقت ان کی عصمت وعفت پر حملہ نہیں کر سکتی اگر کوئی ملعون ان پر افترا بھی کرتا ہے تو فوراً انہیں اس افترا سے بری کر دیا جاتا ہے اور مفتری کو اس کے افترا کا بدلہ مل جاتا ہے۔ سنۃ اللہ یہ ہے اب اس کی موجودگی میں کیا کوئی عقل وہوش رکھنے والا انسان ایک سکنڈ کے لئے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کی بیویوں پر ایک شیطان کو قدرت دیدی جائے وہ چالیس روز تک العیاذ باللہ نہ صرف انکی عصمت وعفت کو تباہ کرے بلکہ انسانیت سے گذر کر حیوانوں کا سا معاملہ ان کے ساتھ روا رکھے۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔

تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ خطا ہوئی تھی کہ انہوں نے متجردہ کو بت بنوا کر دیا اور بت پرستی کا سبب بنے مگر اس خطا کی یہ کیسی سزا ہے کہ ان کی بیویوں کی عصمت وعفت چالیس روز تک خراب کرائی جائے حالانکہ بجز متجردہ کے اور کسی کا حضرت سلیمان کے اس فعل سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں بیان فرماتے ہیں۔

ومن اقبح ما فیہ زعم تسلط الشیطان علی نساءہ حتی وطئہن ومن حیض اللہ اکبر ہذا بہتان عظیم وخطب جسیم

اور سب سے زیادہ بری بات جو اس قصہ میں ہے وہ یہ کہ شیطان کا اللہ کے نبی کے بیویوں پر مسلط ہونا اور ان سے وطی کرنا، اللہ اکبر، یہ بہت بڑا بہتان اور زبردست افترا ہے" امام رازی کبیر میں فرماتے ہیں۔

کیف یلیق بحکمۃ اللہ دا بانہ ان یسلط الشیطان علی ازواج سلیمان واشک انہ قبیح۔

اللہ کی حکمت اور اس کے احسان عظیم کے اعتبار سے کیسے ممکن ہے کہ وہ شیطان کو حضرت سلیمان کی بیویوں پر مسلط کر دے۔ بیشک یہ بری بات ہے" یہ اور اس قسم کے حیا سوز قصے ازواج انبیا کو بدنام کرنے کے لئے اسی جماعت نے گھڑے ہیں جس نے انبیاء کرام کے خون سے ہاتھ تک بھرنے میں دریغ نہیں کیا

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ | اور وہ (یہود) انبیا کو ناحق قتل کرتے تھے

نبی کے گھر میں بت پرستی محال ہے!

نبی کا گھر وحی آسمانی اور علوم الٰہیہ کا گہوارہ، انوار و تجلیات اور ملائکہ کا مہبط، شریعت و طریقت کا سرچشمہ، طاعت و عبادت کا مرکز ہوتا ہے تعلیمات الٰہیہ اور برکات روحانیہ کا فیضان ہر وقت جاری رہتا ہے کس طرح ممکن ہے کہ نبی کے گھر میں شرک و بت پرستی فسق و فجور کا گذر ہو سکے۔ نبی کے گھر میں تو ایذا رسان اور ناگوار چیز کا وجود بھی متحمل نہیں شرک و بت پرستی تو بڑی چیز ہے۔ لہذا کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ چالیس روز تک نبی کے گھر میں صبح و شام شرک و بت پرستی ہو اور نبی کو پتہ نہ چلے۔ سلیمان علیہ السلام نبی تھے ایک نبی کا تعلق ہر وقت عالم بالا سے رہتا ہے وحی و الہام اور ملائکہ کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے مغیبات پر اس کو برابر مطلع کیا جاتا ہے اگر اتفاقاً نبی سے کسی خلاف استحسان امر کا صدور ہو جاتا ہے تو فوراً اس کو مطلع کیا جاتا ہے یہ شان نبوت ہے قدرت کا اس برگزیدہ جماعت کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور نبی بھی سلیمان علیہ السلام جن کی حکومت نہ صرف انسانوں اور حیوانوں پر تھی بلکہ جن اور ہوا بھی جو ہر وقت ہر جگہ پہونچتے ہیں آپ کیلئے مسخر تھے پرندے آپ کے پاس بڑی بڑی دور کی خبریں ذرا کی ذرا دیر میں لاتے تھے اور مخفی حالات سے آپ کو مطلع کرتے تھے اس قدر ذرائع خبر رسانی وسیع ہونے کے باوجود خود اپنے گھر کے اس قدر مہلک حالات سے بیخبر رہیں جنکا انجام حکومت و نبوت دونوں کا زوال ہو" یقیناً یہ کذب و افترا ہے اور شان نبوت سے بعید از بعید۔"

بیوی کو خوش کرنے کیلئے بت بنوانا اگر طبعی محبت کے باعث بیوی کو خوش کرنے کیلئے بت بنوایا تجویز کر لیں اسکے کافر باپ کے غم و الم کو دور کرنے کے لئے بت بنوا کر دینا بجائے خود شان نبوت سے مستبعد ہے اول تو اس کی ہی کوئی دلیل نہیں کہ امم سابقہ میں تصویر بنانا جائز تھا محض ایک احتمال ہے اور وہ بھی اسی باطل روایت پر مبنی اور اس الزام کو دور کرنے کے لئے ہے کہ کس طرح سلیمان علیہ السلام نے ایک کافر کا مجسمہ بنوایا حالانکہ تصویر کی حرمت کے دلائل بالکل صاف و صریح بلا تخصیص وارد ہیں اور اس کے قبائح و مفاسد کسی خاص وقت اور زمانہ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کی حرمت کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہو لیکن اگر ذرا دیر کے لئے بفرض محال اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی فحوائے قصہ کو دیکھئے اور ایک جلیل القدر نبی کی ہستی کو دیکھئے، ایک ایسی بیوی کی محبت میں دیوانہ ہو کر اس کے رنج و غم کو دور کرنے کے لئے اس کے باپ کا بت بنوا دینا جو ابھی توحید سے اچھی طرح روشناس بھی نہیں ہوئی ایک معمولی دیانتدار آدمی سے بھی مستبعد ہے چہ جائیکہ ایک اولوالعزم نبی، نبی امت کا حکیم ہوتا ہے اس کی حکیمانہ باریک بین نظر امراض کو بہت دور سے شناخت کر لیتی ہے وہ مریض کے بیان پر نہیں جاتا بلکہ حالات کی تہ میں چھپے ہوئے اسرار کو دیکھتا ہے اور اس کے مطابق طریق کار اختیار کرتا ہے لہذا نبی کی شان اس مذکورہ داستان سے بہت بلند و بالا اور وراء الوراء ہے "

اس روایت کو صحیح تسلیم کر لینے کی صورت میں سوال ہوتا ہے کہ اس بت پرستی کی اجازت حضرت سلیمان علیہ السلام نے دی یا مجردہ نے خود ہی ان کی بلا اطلاع یہ بت پرستی کی ؟

بصورت اول بت پرستی کی اجازت دینا کفر ہے سلیمان علیہ السلام اور اس کے مرتکب ہوں ؟ العیاذ باللہ

بصورت ثانی گناہ کیا بیوی نے اور پکڑا جائے شوہر یہ کونسا اصول ہے ؟

لاتزر وازرة وزر اخری

کل نفس بما کسبت رہینة

لہٰذا حضرت سلیمانؑ بالکل بری تھے اور قدرت کا یہ معاملہ ان کے ساتھ صریح ظلم تھا۔

بہر صورت روایت کی صحت یا ایک جلیل القدر نبی کو کافر قرار دیتی ہے یا قدرت کو ظالم (العیاذ باللہ) اور یہ دونوں امر باطل اور ممتنع ہیں لہٰذا یہ روایت غلط ہے۔

ابتلاء سلیمان علیہ السلام کا دوسرا قصہ

یہ دوسری روایت جس کو امام رازی نے ان وجوہ میں سے قرار دیا ہے جو اہل تحقیق کے نزدیک قابل قبول ہوسکتی ہیں۔ فرقہ امامیہ کی ہے علامہ سید محمود آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں

"روی الامامیۃ عن ابی عبداللہ رضی اللہ عنہ انہ ولد لسلیمان ابن فقالت الجن والشیاطین ان عاش لہ ولد لنلقین منہ مالقینا من ابیہ من البلاء فاشفق علیہ السلام منہم فجعلہ وظرہ فی السحاب من حیث لایعلمون فلم یشعر الا وقد القی علی کرسیہ میتا تنبیہا علی ان الحذر لاینجی من القدر وعوتب علی ترکہ التوکل اللائق بالخواص من ترک مباشرۃ الاسباب وروی ذلک عن الشعبی ایضا ورواہ بعضہم عن ابی ہریرۃ علی وجہ لایشک فی وضعہ الا من یشک فی عصمۃ الانبیاء علیہم السلام"

"ابو عبداللہ رضی اللہ عنہ سے امامیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں ایک لڑکا ہوا تو جنوں نے آپس میں کہا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہ گیا تو ہم اس کے ہاتھ سے بھی ایسی ہی قید و بند اور مصائب میں مبتلا ہوں گے جیسے سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے بلائیں سہتے ہیں لہٰذا اس کا خاتمہ کر دینا چاہیے) حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنوں کی طرف سے خطرہ محسوس ہوا آپ نے اس بچہ کو مع اس کی دایہ کے ایک بادل میں ایسی جگہ پوشیدہ رکھا جس سے جن بے خبر تھے۔ حضرت سلیمانؑ ایک روز اپنے تخت پر بیٹھے تھے کہ اچانک وہ بچہ مردہ تخت پر آپڑا یہ بتلانے کے لئے کہ احتیاط قضا و قدر سے نہیں بچا سکتی اور عتاب کیا گیا کہ اپنے اللہ کے خاص بندوں کی طرح (وہ) توکل اور اعتماد علی اللہ کو کیوں چھوڑا؟"

ابتلا کا یہ قصہ مقام نبوت سے کچھ مستبعد نہیں مگر اس کے باوجود علامہ سید محمود آلوسی اس کو صحیح نہیں تسلیم کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"وانا فی صحۃ ہذا الخبر لست علی یقین بل ظاہر الآیۃ ان تسخیر الریح بعد الفتنۃ وہو ظاہر فی عدم صحت الخبر لان الوضع فی السحاب یقتضی ذلک"

"مجھے اس روایت کی صحت کا بھی یقین نہیں بلکہ آیات کا ظاہر بتلا رہا ہے کہ ہوا وغیرہ کی تسخیر آزمائش کے بعد ہے لہٰذا یہ واقعہ غلط ہے کیونکہ بغیر ہوا اور بادل ہوا کی تسخیر کے بچہ اور اس کی دایہ کو اس میں رکھنا ناممکن ہے۔" پھر اس کی سند کے متعلق کلام کرتے ہیں۔

وروی ذلک عن الشعبی ایضا ورواہ بعضہم عن ابی ہریرۃ علی وجہ لایشک فی وضعہ الا من یشک فی عصمۃ الانبیاء علیہم السلام،

یہ روایت شعبی سے بھی مروی ہے اور بعض لوگوں نے اسے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے مگر ایسے طریق پر کہ اس کے موضوع (گھڑا ہوا) ہونے میں اسی شخص کو شک ہوگا جس کو انبیاء علیہم السلام کی عصمت میں شک ہے۔"

بہر حال بسند صحیح شان نزول منصوص موجود ہے پھر اس مخدوش صورت کو کیوں اختیار کیا جائے۔

ابتلاء سلیمان علیہ السلام کا تیسرا صحیح اور مستند واقعہ

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال سلیمان یوما لاطوفن اللیلۃ علی تسعین امرأۃ وفی روایۃ بمائۃ امرأۃ کلہن تاتی بفارس یجاہد فی سبیل اللہ فقال لہ الملک قل ان شاء اللہ فلم یقل ونسی وطاف علیہن فلم تحمل منہن الا امرأۃ واحدۃ جاءت بشق رجل وایم الذی

نفس محمد بیدہ لو قال انشاء اللہ لجاہدوا فی سبیل اللہ فرساناً اجمعون۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک روز سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ میں آج اپنی نوّے (۹۰) (اور ایک روایت میں سو (۱۰۰)) عورتوں سے ہم بستر ہوں گا اور ان میں سے ہر ایک سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا سوار پیدا ہوگا، فرشتے نے ان سے کہا کہ انشاء اللہ کہہ لیجئے مگر آپ بھول گئے اور انشاء اللہ نہیں کہا چنانچہ آپ رات کو سب کے پاس گئے مگر ان میں سے بجز ایک عورت کے اور کوئی حاملہ نہیں ہوئی اور اس کے بھی ایک ناتمام لڑکا ہوا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کہ اگر سلیمان انشاء اللہ کہہ لیتے تو سب کے سب پیدا ہوتے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے (مسلم)

اور بعض روایت میں آتا ہے کہ آپ اپنے امراء لشکر پر ناراض ہو رہے تھے اور اس سلسلہ میں ان کو مخاطب کرکے یہ فرمایا ہے۔

روح المعانی میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وغایۃ ترک الاولی فلیس بذنب وان عدہ علیہ السلام ذنباً فالمراد بالجسد ذلک الشق الذی ولدلہ ومعنی القاۂ علی کرسیہ وضع القابلۃ علیہ لیراہ

(ترجمہ) "زیادہ سے زیادہ اس میں ایک مستحسن امر کا ترک ہے لہٰذا یہ گناہ نہیں اگرچہ سلیمان علیہ السلام اس کو گناہ سمجھیں لہٰذا جسد سے مراد وہ ناتمام بچہ ہے جو پیدا ہوا تھا اور کرسی پر ڈالنے سے مراد دائی کا اس بچہ کو ان کے سامنے رکھنا ہے۔"

توفیق الٰہی اور مشیت ایزدی تمام امور کا آخری اور حقیقی سبب ہے لہٰذا جب تک وہ میسر نہ آئے کوئی کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچ سکتا۔ نیز تمام اسباب ووسائل قدرت کے پیدا کئے ہوئے ہیں جس نے ان میں یہ تاثیر اور سببیت رکھی ہے وہ سلب بھی کرسکتا ہے لہٰذا صرف اسباب ووسائل اور اپنے عزائم قلبیہ کی بنیاد پر کسی کام کا ارادہ یا وعدہ نہ کرنا چاہئے بلکہ توفیق ومشیت الٰہی کو اس کے ساتھ ملالینا چاہئے اولیٰ اور مستحسن تو یہ ہے کہ زبان سے انشاء اللہ کہہ لیا جائے اور کافی یہ بھی ہے کہ دل میں یہ مضمون ہو۔

سلیمان علیہ السلام نے جس عزم کا اظہار کیا تھا اس کے ساتھ مشیت الٰہی ضرور ملحوظ ہوگی ایک نبی کی نظر سے کبھی بھی یہ حقیقت جدا نہیں ہوسکتی خاصکر جب فرشتے نے ٹوکا تو اسوقت تو ضروری دل میں یہ مضمون آگیا تھا باقی زبان سے نہیں کہا جس کے لئے دو معقول سبب تھے۔

پہلا سبب امراء عسکر اور مجاہدین کی کوتاہیوں پر غصہ آرہا تھا دل میں اس مضمون تفویض وتوکل پر اکتفا کیا زبان سے کہنے کی طرف فرط غضب کی وجہ سے توجہ نہ کی اور بعد میں یاد نہیں رہا۔ غصہ کی حالت میں بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ غیر ضروری امور کو چھوڑ دیا کرتے ہیں کہ بعد میں کرلئے جائیں گے اور پھر اس وقت کی باتیں یاد نہیں رہتیں۔"

لہٰذا اس کوتاہی پر جو بالکل طبعی اور فطری امر تھا عتاب ہوا کہ شان توکل اور اعتماد علی اللہ کا مقتضٰی یہ ہے کہ چشم زدن کے لئے بھی اس کو دل سے تو کیا زبان سے بھی نہ چھوڑا جائے مستحسنات اور مستحبات سکون اور اطمینان کی حالت میں سب کے لئے قابل عمل ہوتے ہیں نبی کی قوت ملکیتہ اور روحانیت کا غلبہ چاہتا ہے کہ ہیجان واضطراب کے حالات میں بھی وہ ان پر عمل کریں ان کی روحانیت امیال طبیعہ اور جذبات نفسانیہ پر حاوی ہونی چاہئے وہ اسوقت بھی پرسکون اور حاضر الحواس رہنے چاہئیں۔ جب لوگ ہیجان اور فرط غضب میں آکر سب کچھ بھول جاتے ہیں عام لوگ جن حالات میں معذور سمجھے جاتے ہیں انبیاء اسوقت بھی ماخوذ ہوتے ہیں اور ان کے لئے مستحبات ومندوبات کا ترک کسی حالت میں بھی ہو موجب عتاب ہے

دوسرا سبب حضرت سلیمان علیہ السلام مجاہدین کو تبلانا چاہتے تھے کہ جہاد اللہ کا کام ہے وہ ان کی مساعی کا رہین منت نہیں وہ اپنا

رہین منت نہیں وہ اپنا کام ہر طرح لے سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ دِیْنَہٗ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ	اللہ پاک اپنے دین کی تائید فاسق و فاجر سے کرا لیتے ہیں۔

اوّل تو وہ اسباب و وسائل عادیہ سے بے نیاز ہیں علاوہ ازیں عالم اسباب میں بھی مجاہدین نہ سمجھیں کہ ہمارے سوا مجاہد سوا نہیں مل سکتے۔ میں آج ہی اپنی تمام بیویوں سے ہم بستر ہوں گا اور ہر ایک کے بطن سے ایک غازی سوار پیدا ہوگا اور خدا کے راستہ میں جہاد کریگا اور اس طرح سرفروشان حق کی ایک نئی جماعت کی طرح پڑ جائے گی اور وہ جماعت تمہاری طرح سست اور کاہل نہ ہوگی لہٰذا میں تم سے مستغنی ہوں۔ قرآن حکیم میں اسی قسم کے ایک موقع پر اللہ پاک جل وعلیٰ مسلمانوں کو مخاطب کرکے اپنے استغنا کا اظہار فرماتے ہیں۔

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لایکونوا امثالکم	اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ پاک تمہارے بدلے ایک دوسری قوم پیدا کریں گے پھر وہ تمہاری طرح نہ ہونگے۔

لب ولہجہ ایسے موقع پر طبعاً سخت ہو جاتا ہے لاپرواہی ظاہر کرنے کے لئے مکمل استغنا اور اپنی تدابیر پر پورا وثوق واعتماد ظاہر کیا جاتا ہے تب ہی اثر مرتب ہوتا ہے مگر ایک نبی کی شان اس سے برتر ہے اس قسم کا جزم اور اسباب وتدابیر پر وثوق اس کی زبان سے موزوں نہیں وہ دنیا کو یہ تبلانے کے لئے آیا ہے کہ تدابیر واسباب کسی حالت میں بھی قابل اعتماد نہیں۔ مشیت ایزدی ہر وقت پیش نظر اور توفیق ربانی ہر حالت میں قابل وثوق ہونی چاہئے۔ ایک نبی کی زبان سے اس قسم کے جزم کے ساتھ انشاء اللہ نہ نکلنا سننے والوں کے لئے اسباب ووسائل پر اعتماد کرنیکا درس ہے اگرچہ دل میں ہو مگر اسے کون جانتا ہے نبی کی ذمہ داری بہت سخت ہے اسے مستحبات ومستحسنات پر عمل کرنا چاہئے تاکہ لوگ واجبات پر عمل کریں اور خلاف استحسان اسے غیر اولیٰ اور خلاف استحسان امور بھی ترک کرنے چاہئیں تاکہ لوگ محرمات ومکروہات کو ترک کردیں۔

اسی قسم کا ابتلا ایک مرتبہ خاتم النبیین (فداہ ابی وامی) صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بھی پیش آیا ہے یہود نے بطور آزمائش آپ سے روح، اصحاب کہف، ذوالقرنین کے متعلق سوالات کئے آپنے وحی کے بھروسہ پر وعدہ فرمالیا کہ کل تبلاؤں گا اور انشاء اللہ نہ کہا۔ اس جزم اور وثوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ روز تک وحی نہیں آئی آپ سخت پریشان اور وعدہ خلافی کی وجہ سے حد درجہ نادم اور یہود کی شماتت کے خیال سے بیحد غمگین ہوئے آخر پندرہ روز بعد وحی آئی تینوں سوالات کے جوابات تبلادئے گئے اور اس تقصیر پر تنبیہ کیا گیا

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَیْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۙ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ	آپ کسی کام کے بارے میں یہ نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کردوں گا مگر یہ کہ انشاء اللہ کہا کریں اور جب آپ بھول جائیں تو جسوقت یاد آئے اسوقت اپنے رب کو یاد کرلیا کیجئے یعنی انشاء اللہ کہہ لیجئے۔

یہ ہے صحیح واقعہ سلیمان علیہ السلام کے ابتلا کا جو سراسر شان نبوت کے شایان اور نیابت الٰہیہ کے مناسب، مقام رسالت ونبوت کی عظمت وجلالت کا کامل ترین درس اور امت کے لئے عظیم الشان موعظت ونصیحت کا ایک کھلا ہوا باب ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ سند کے لحاظ سے بھی زیادہ سے زیادہ صحیح۔ شیخین اور ان کے علاوہ تمام محدثین نے اتنی کثرت سے روایت کیا ہے کہ حد شہرت کو پہونچ چکا ہے۔ آیات کے سیاق وسباق سے بالکل مناسب اور اس سلسلہ کے باقی قصص کے ساتھ مربوط ہے۔ نیز اس سورۃ کے باقی انبیا علیہم السلام کے ابتلا کے واقعات مفصل بیان کرنے کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور مذکورہ بالا واقعہ اس کے لئے قوی تر استشہاد اور صریح نظیر ہے لہٰذا اس کی موجودگی میں اس قسم کے خرافات اور موضوعات کو تسلیم کرنا دین وایمان کے لئے کھلا ہوا خطرہ اور انبیا علیہم السلام پر بہتان عظیم ہے۔ عافانا اللہ منہا۔

انسان کا عہدِ طفولیت

(از حضرت مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ)

"یہ آج سے کوئی بیس اکیس برس کا ذکر ہے کہ حضرت سلیمؒ مجھے اردو لکھنے کی تعلیم فرما رہے تھے۔ ایک بار انہوں نے "سخن پارے" لکھانے پر بہت زور دیا اور اس سلسلہ میں متعدد "سخن پارے" مثالاً لکھ کر مرحمت فرمائے۔ یہ انہیں میں کا ایک پارہ ہے جو میں جاوید میں اشاعت کے لئے دے رہا ہوں۔

"سخن پارہ" سے حضرت مرحوم کی مراد ایک مکمل چند سطری مضمون سے ہوتی تھی اور یہ پارے اس طرح لکھے جایا کرتے تھے کہ پہلے عنوان قائم کر لیا۔ پھر اردو زبان کا کوئی لفظ (اسم) یا تو دریافت کر لیا گیا یا بتا دیا گیا (جیسی صورت ہوئی) وہی لفظ پارہ کا پہلا لفظ قرار پایا۔

مندرجہ ذیل پارہ کا پہلا لفظ سمندر ہے۔ یہ لفظ میں نے بتایا ہوگا۔" (فہیم الدین نوری)

سمندر میں جزر و مد ہوتا ہے۔ مد میں سمندر کا پانی بڑھتا اور چڑھتا ہے جزر کے وقت گھٹتا اور اترتا ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ انسان کا عہدِ طفولیت تھا، لوگ خیال کرتے تھے کہ جب سمندر کا دیوتا اپنا بھاری بھرکم پاؤں سمندر کے پانی میں رکھتا ہے تو پاؤں کے چاروں طرف سے پانی اچھل کر چڑھ جاتا ہے اور خشکی پر دوڑتا اور ساحلوں کو ڈبو دیتا ہے۔ چند گھنٹے بعد جب وہ اپنا پاؤں پانی میں سے نکال لیتا ہے تو پھیلا ہوا پانی پھر سمٹ آتا ہے اور ساحلوں سے ہٹ کر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم کے لوگ اس دیوتا سے ڈرتے تھے اور اس کے غصہ کو فرو کرنے کی کوشش کرتے تھے اور انسانوں کے ایک گروہ کو قربانی پر چڑھاتے تھے تاکہ اس کے جلال کو سکون ہو۔ اور وہ باقی انسانوں سے رضامند ہو جائے۔

صحرا میں تیز و تند اور گرم ہوا چلتی ہے۔ درختوں کو جڑ سے اکھیڑ پھینکتی ہے جانور ریت میں اپنا سر دھنسا دیتے ہیں اور اس کے زہریلے جھونکوں سے اکثر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس ہوا کا بھی ایک عجیب الخلقت دیوتا مانا جاتا تھا اور اس کے راضی کرنے کیلئے بھی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔

اب دنیا اس زمانہ سے بہت آگے نکل آئی ہے لیکن ہر ملک و ہر قوم میں اب بھی بہت سے انسان ہیں جو اس عہدِ طفولیت کی یادگار ہیں اور باوجود علم و عقل میں ترقی کرنے اور تعلیم یافتہ ہونے کے اب بھی ہزاروں اوہام انہیں جاری ہیں۔ کوئی نظر کی تاثیر کا قائل ہے۔ کوئی چھینک سے شگون لیتا ہے۔ کوئی سفر کے وقت دساسول کا رخ دیکھتا ہے۔ کوئی تعمیر شروع کرنے کیلئے زحل کے طلوع کا منتظر ہے کوئی بچہ کی ولادت کا زائچہ طیار کراتا ہے۔ کیا یہ وہی عہدِ طفولیت نہیں ہے جس میں اب سے ہزاروں سال پہلے انسان زندگی بسر کرتا تھا۔

دنیا اب جوان ہے اور علم و عمل کے لحاظ سے پورے شباب پر ہے۔ تو کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ اب بھی انسان جوانی کی عقل و دانش کے ساتھ بچپن کے خرافات و اوہام میں مبتلا ہیں؟ اے تعلیم یافتہ اور روشن خیال جوانو! ہوش میں آؤ اور دنیا کے عہدِ طفولیت سے آگے قدم بڑھاؤ، ورنہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے! (غیر مطبوعہ)

صبح صادق

(از حضرت مسلم سیوہاروی)

وہ عرب جس میں تھی وحدت کی بنائے محکم   لہلہاتا تھا جہاں علم و حکم کا پرچم
جس کا ہر ذرہ تھا طغیاں کو قضائے مبرم   ارض خلت کے سما کا تھا جو عرشِ اعظم
دیکھتے دیکھتے یکبارگی ایسا بدلا
گویا ان چیزوں کا اسمیں کبھی چرچا ہی نہ تھا

اور عرب ہی نہیں جتنا تھا جہانِ ملی   سب میں الحاد کی ہر سمت سے آئی آندھی
چپے چپے میں ہوئیں جہل کی رسمیں جاری   عصبیت تھی کہیں اور کہیں فخرِ قومی ہی
باپ خود بن گئے اولاد کے حق میں جلاد
بک گئے بردہ فروشی میں ہزاروں آزاد

آئے دن رہنے لگے جنگ و دغا کے جھگڑے   جاگ اٹھے ایک نہیں بلکہ ہزاروں فتنے
قتل و غارتگری "دو" زیست کے ٹھیرے شعبے   راستے بند ہوئے ظلم و ستم کے ڈر سے
کوئی تہذیب رہی اور نہ تمدن باقی
ہاں اگر تھا تو فقط ایک تلون باقی ہی

جتنے پتھر تھے وہ سب ان کے خدا تھے گویا   آگ کا کوئی پجاری تھا کوئی سورج کا
مشغلہ لہو و لعب کے سوا کچھ اور نہ تھا   خون بہانے کو سمجھتے تھے فریضہ اپنا
یہ تھی نوبت جسے دنیا کے مٹانے کیلئے
تھا یہ لازم کہ کوئی مصلح اعظم آئے

آخرش ہو کے رہی غیرتِ حق کو حرکت   بڑھا اصلاح کے میدان میں دستِ قدرت
یعنی بھیجا اسے اسلام کا لے کر رایت   تھا لقب جس کا فرشتوں میں نبیٔ رحمت
جس کے آتے ہی نگاہوں سے اٹھا جب پردہ
شب دیجور میں اک نور کا تڑکا دیکھا

جس نے قائم کیا بندوں سے خدا کا رشتہ   آتے ہی توڑ دیا جس نے جفا کا رشتہ
جس نے مضبوط کیا رب کی رضا کا رشتہ   جوڑا انسانوں میں یوں جس نے وفا کا رشتہ

جس نے دنیا کو پڑھایا وہ اخوت کا سبق
کر دیے ایک جگہ بکھرے ہوئے جتنے ورق

بجلیاں طور پہ جس نور کی کوندی تھیں کبھی　　کعبے میں دیکھی تھی مومن نے تجلی جس کی
قلبِ موسیٰ پہ گری تھی کبھی جس کی تجلی　　ارنی کا جو حقیقت میں بنا تھا داعی

ہم نے وہ نور تہامہ پہ چمکتا دیکھا
مہرِ توحید کی صورت میں دمکتا دیکھا

قاف تک پہونچا جو فاراں پہ چمک کر وہ نور　　جس کی تنویر تھی خود روزِ ازل کو منظور
خلقتِ خلق تھی جس نور کی تہ میں مستور　　شانِ لولاک لما جس کی تھی گھر گھر مشہور

صحفِ سابقہ میں جس کا تھا ذکرِ پیشیں
جس نے حاصل کیا قرآں سے خراجِ تحسین

چمکا ایک روز وہی ماہِ رسالت بنکر　　نکلا مشرق سے حرا کے مہِ وحدت بنکر
عرش تک پہونچا مگر نیّرِ رفعت بنکر　　سامنے آیا ضیا بارِ حقیقت بنکر

ظلمتِ کفر کی چھائی تھی جو گھنگھور گھٹا
سر سے دنیا کے ہٹی شب میں اجالا پھیلا

صفِ ماتم بچھی کثرت کے صنم خانوں میں　　حشر کا شور اٹھا شرک کے ایوانوں میں
شمع روشن ہوئی توحید کے پروانوں میں　　روح وحدت کی پھنکی دین کے دیوانوں میں

چاندنی پھیل گئی چاروں طرف حکمت کی　　بھولے بھٹکوں کو رہِ راست نظر آنے لگی

صنمستان میں جاری ہوا حکمِ تعزیر　　لاالٰہ کے برسنے لگے ہر سمت سے تیر
الاماں کہتے ہوئے آئے بتانِ بے پیر　　نفخۂ صورِ قیامت بنی صوتِ تکبیر

تاجِ عزت کا گرا عزیٰ کے خود سر سر سے
نکلے لات اور ہبل عز و جل کے گھر سے

پھر سے تاریخ نے دہرایا وہ دیرینہ سبق　　جس سے وابستہ تھا اک سیرتِ آدم کا سبق
جس میں لکھا تھا کہ ہے ایک خدائے مطلق　　اور محمد ہے نبی اور رسولِ برحق

دائما باد بر او رحمت و تسلیم و درود
نیز بر آلِ عبایش ز خداوندِ ودود

ترانۂ حمد

(از حضرت مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ)

گاؤ تم اے ستارو! حمد و ثنا خدا کی — سقفِ زمرّدیں یہ جس نے کہ ہے بپا کی
اے آفتاب تو بھی کر سجدہ اس خدا کا — کی ہے عطا یہ شوخی جس نے تری ضیا کو
اے ماہتاب تو بھی کر شکر اس خدا کا — نقّاش ہے جو تیرے اس حسنِ دلربا کا
گا اس کی عظمتوں کو ظاہر تو اے سمندر — شانِ جلال جس کی پنہاں ہے تیرے اندر
جھک جاؤ اے پہاڑو اس کے حضور میں تم — جس کے شکوہ سے ہیں ہوش آسماں کے بھی گم
تصویرِ قہرِ حق کی اے صاعقہ دکھا تو — اسکی صدائے ہیبت اے رعد پھر سنا تو
دوشِ ہوا پہ چڑھکر اے بادلو! تم آؤ — پیغامِ رحمت اسکا مخلوق کو سناؤ
گاؤ تم اے پرندو! وہ حمد کے ترانے — جنکی سنی نہیں ہے سرگم ابھی ہوا نے
اے جلوہ ریز پھولو! جھلکی دکھاؤ اس کی — اے باغ کی ہواؤ! خوشبو سنگھاؤ اسکی
اے ننّھے ننّھے ذرّو! اے شاندار تارو! — تم اسکی صنعتوں کے چربے ذرا اتارو
حکمت بتاؤ اسکی عظمت جتاؤ اسکی — پھر حال کی زباں سے تم حمد گاؤ اس کی

جذباتِ بیتاب

(از حضرت مولانا حکیم بشارت اللہ صاحب بیتاب رامپوری)

پاتا ہوں مندمل سا جو زخم جگر کو میں
حسرت سے دیکھتا ہوں کسی کی نظر کو میں
سرسبز آبیاری غم سے تھا نخلِ عشق
روتا ہوں اب تراوشِ زخم جگر کو میں
اللہ رے فرطِ بیخودی جستجوئے شوق
دشمن سے پوچھتا ہوں تری رہ گذر کو میں
مسجودِ چشم شوق ہے ہر نقشِ پا ترا
آنکھوں سے طے کروں گا تری رہ گذر کو میں
پھر سو جبیں نواز محبت ہے لطفِ دوست
قبلہ ادھر ہو سجدہ کناں ہوں جدھر کو میں
ہیں مانع سجود نقوشِ سجودِ غیر
حسرت سے تک رہا ہوں تری سنگ در کو میں
ذرہ میں آفتاب ہے قطرہ میں بحر ہے
کیا کیا دکھاؤں چشم حقیقت نگر کو میں
سرمایۂ حیات ہے یہ کاوشِ دروں
آرام جاں سمجھتا ہوں دردِ جگر کو میں
وہ آرہے ہیں آج مسکراتے ہوئے
کرلوں دراز دامنِ زخم جگر کو میں
اس کے سوا ہے حسرت دیدار کا فزوں
کر چکا ہوں وقفِ تماشا نظر کو میں

کیفِ تغزل

(از حضرت ... رامپوری)

مرتے تو ہیں لیکن ہمیں مرنا نہیں آتا
دشواریٔ تعلیم فنا دیکھ رہے ہیں
اے پوچھنے والو تمہیں کیا خاک بتائیں
ہم خود بھی نہیں جانتے کیا دیکھ رہے ہیں
چھائی ہوئی گھنگھور گھٹائیں ہیں الم کی
ہم حاصلِ دنیائے وفا دیکھ رہے ہیں
بیگانۂ شکوہ ہیں ہم ارباب وفا ہیں
ہر جبر کو راضی برضا دیکھ رہے ہیں
شکوہ نہ تمہارا نہ عدو کا، نہ فلک کا
جو ہم کو دکھاتا ہے خدا دیکھ رہے ہیں
کاشانۂ دل اور مصائب کی گھٹائیں
یا رب ہم ان آنکھوں سے یہ کیا دیکھ رہے ہیں
ہم لذتِ دیدار کو کیا خاک بتائیں
ان کی نظرِ ہوش ربا دیکھ رہے ہیں

کلمہ:- عہد قدیم کے ایک تاجدار کی لوح مزار پر
... یہ عبارت ...
مجھے دشمنوں کی قوت نے نہیں بلکہ دوستوں کی خیانت نے ہلاک کیا۔

جاوید ارباب علم کی نظر میں

جانشین شیخ الہند رح

"حضرت علامہ سید حسین احمد مدنی جانشین شیخ الہند رح رئیس الاساتذہ دارالعلوم دیوبند اپنے ایک گرامی نامہ میں "جاوید" کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار فرماتے ہیں" (مدیر)

رسالہ جاوید کا پہلا پرچہ میری نظر سے گذرا - مضامین کی بلند پائیگی - الفاظ کی فصاحت و شستگی محررین کی اعلیٰ قابلیت و آزاد خیالی کارکنوں کی مہارت اور حسن کارکردگی وغیرہ اس پرچہ میں ایسے امور جمع ہوگئے ہیں جن سے قوی امید کی جاتی ہے کہ دنیائے صحافت میں یہ پرچہ نہایت درخشندہ ستارہ ہوگا - قوم و وطن اور مذہب و سیاست کے لیے بہترین رہنما اور خادم ثابت ہوکر باعث ازالہ ضلالت و مصائب بنے گا - بنابریں میں نہایت اخلاص اور محبت کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہوں مجھکو قوی امید ہے کہ مسلمانان ہند بھی ہر طرف سے اس کے ساتھ بہت زیادہ گرمجوشی اور توجہ کا معاملہ اور استقبال فرمائیں گے ۔"

مولوی سید محمد احمد کاظمی صاحب بی - ایس - سی (علیگ) ایڈوکیٹ بہرائچ

اردو زبان میں علمی رسالوں کی بہت کمی ہے بعض رسالے جو ابتداً علمی مقاصد سے جاری کئے گئے افسوس ہے کہ مذاق عمومی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور علمی پایہ سے گر کر ناول نویسی اور افسانوں پر اتر آئے نتیجہ یہ ہوا کہ علمی رسالوں کی جگہ بدستور خالی رہی حال میں رسالہ جاوید دیکھنے کا موقع ملا اس کے مطالعہ سے مسرت ہوئی اسکے مضامین نہایت دلچسپ اور علمی مباحث پر ہیں - چھپائی نہایت عمدہ ہے اور قیمت بھی نسبتاً نہایت معتدل - امید ہے کہ یہ رسالہ مستقلاً جرأت کے ساتھ اپنے اعلیٰ معیار کو قائم رکھکر لوگوں میں اعلیٰ علمی مذاق پیدا کرنے اور ان میں صحیح خیالات پھیلانے میں کامیاب ہوگا۔

اس اعتبار سے رسالہ جاوید ہر قسم کی ہمت افزائی کا مستحق ہے - میں مدیر "جاوید" کو اس رسالہ کے لئے مبارکباد دیتا ہوں —

محمد احمد کاظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشاہدات

زیر نظر اشاعت میں جناب آغا محمد اشرف بی۔اے دہلوی کا مضمون "دہلی یونیورسٹی اور اردو" اہل دہلی کی عموماً اور ارکان یونیورسٹی کی خصوصاً توجہ چاہتا ہے۔ شاہجہاں کی گذشتہ اشاعتوں میں اس سے قبل اسی سلسلہ کے دو مضمون شائع ہو چکے ہیں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آغا صاحب کی تحریک پر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد غور کر رہے ہیں (اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ غور نہ کریں)۔ جو مطالبہ یونیورسٹی سے کیا جا رہا ہے وہ اس قدر آسانی سے پورا کیا جا سکتا ہے کہ اس پر زیادہ غور و خوض کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ دہلی یونیورسٹی کی خصوصیت آخر کیا ہے؟ اس میں درس و تدریس کا آخر ایسا کونسا نوکھا باب کھلا ہوا ہے کہ طلبا ذوق و شوق سے اس میں شامل ہوں؟ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ان سوالات کا کوئی معقول جواب پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دہلی یونیورسٹی ایک اردو ہی کا شعبہ ایسا قائم کرے جس کی سند ملک میں قدر کی نظر سے دیکھی جائے۔ تو یہ اس کی نمایاں خصوصیت سمجھی جائے گی۔ دلی اردو کی جنم بھومی ہے۔ اس لئے اس کا حق ہے۔ آغا صاحب ... اس طرح کا مطالبہ کرتے

اور ان کی حمایت میں دلی کا ہر فرد اپنی آواز بلند کریگا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر عبد الرحمٰن اور السنہ شرقیہ کے چیرمین استاذی شمس العلما مولوی عبد الرحمٰن صاحب اس مطالبہ کو جلد از جلد پورا کرکے عند اللہ ماجور و عند الناس مشکور ہوں۔

اس اشاعت سے جناب محمد صادق ضیا کا ڈرامہ "من کی پکار" شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ یہ ڈرامہ پانچ اشاعتوں میں مکمل ہو جائے گا اس کے صفحات کے نمبر جدا گانہ ڈالے گئے ہیں تاکہ مکمل ہونے کے بعد جو حضرات چاہیں اسے رسالوں میں سے علیحدہ کرکے کتابی صورت میں مرتب کر لیں۔ مستقل خریداروں کو ڈرامہ کی تکمیل کے بعد ٹائیٹل چھپوا کر بھیجدیا جائے گا۔ اس طرح رسالوں سے علیحدہ انہیں ایک عمدہ کتاب بھی مل جائے گی۔ جناب عمر احمد عثمانی کا مضمون اس اشاعت میں ختم ہوتا ہے مضمون تحقیق و کاوش سے لکھا گیا ہے اس لئے بہت قابل دید ہے۔ امید ہے کہ صاحب مضمون چغتائی صاحب کے دیگر اعتراضات کا جواب بھی ... مشکور ... گے۔

فہرست مضامین

جلد ۴ — نمبر ۲

(بسلسلۂ گذشتہ)

شعرائے اکبر آباد

میر تقی میر

ہندوستان کا مسلّم الثبوت شاعر میرؔ آگرہ کی سرزمین پر پیدا ہوا جس نے اُردو زبان کے پودے کو درخت تناور کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے شہ پارے اکثر سخن فہم سیاح دور دور تحفتاً لیجایا کرتے تھے۔ جو لوگ میرؔ و غالبؔ کا موازنہ کرتے اور ان دونوں کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں وہ حقیقتاً تبصرہ نہیں ہوتا، بلکہ خود اس ضمن میں وہ اپنی شہرت چاہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ میر و غالب کے رنگ میں اور زبان میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا زمین و آسمان میں۔ میرؔ کی زبان غالبؔ کے پاس کہاں؟ اور غالبؔ کا رنگ میرؔ کے پاس کہاں؟ میرؔ درحقیقت شاعرِ اعظم تھا، غالبؔ شاعر کے علاوہ فلسفی بھی تھا، بہر نوع مجھے دونوں کا تقابل منظور نہیں ہے بلکہ میر صاحب کا تذکرہ چھیڑنا ہے۔

اگرچہ میر صاحب کی عمر ناداری و فلاکت میں بسر ہوئی لیکن یہ انتہا درجہ کے نازک خیال اور بلند پایہ شاعر تھے۔ آگرہ سے جب دہلی پہونچے۔ تو شاہ عالم کے دربار میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے لیکن افلاس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جب ۱۱۹۰ھ میں دہلی سے لکھنؤ کا سفر کیا، اس حال میں کہ ان کے پاس پورا ریل کا کرایہ تک نہ تھا۔ چنانچہ ایک ہمسفر نے جو ان کو پہلے سے جانتا تھا امداد کی لیکن دوران سفر میں جب ان کے معاون نے شعر و شاعری کے متعلق کچھ ذکر شروع کیا، تو آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کچھ وقفہ کے بعد پھر وہ شخص میر صاحب کی طرف متوجہ ہوا، اور بات کرنے لگا۔ میر صاحب چیں بجبین ہو کر بولے کہ "حضرت! آپ نے کرایہ دیا ہے، نہ کہ میرا دماغ خریدا ہے، بھلا ان باتوں سے کیا تعلق"۔ اس نے کہا جناب میر صاحب! یہ راستہ کا شغل ہے سفر جلد کٹ جائیگا۔ اب آپ کے غصہ کی انتہا نہ تھی بگڑ کر بولے "آپ کا شغل ٹھیرا لیکن میری زبان خراب ہوگی"۔

لکھنؤ پہونچکر ایک سرائے میں قیام کیا۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں مشاعرہ ہے، چنانچہ اسی وقت ایک غزل لکھی اور شریک جلسہ ہوگئے کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا پائجامہ ناگ پھنی کی انی دار جوتی پہنکر، سر پیٹے ہوئے اپنی قدیمانہ طرز وادا کے ساتھ جس وقت داخل مجلس ادب ہوئے، تو لکھنؤ کے ٹیڑھے بانکے نوجوان جو وہاں جمع تھے۔ میر صاحب کو دیکھکر ہنسنے اور مسکرانے لگے۔ میر صاحب چونکہ پہلے ہی سے شکستہ دل تھے، اور اس پر غریب الوطنی میں یہ مضحکہ۔ اس نظارہ سے میر صاحب بہت متاثر ہوئے، اور چیں بجبیں ہو کر ایک اجنبی کی طرح ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ جب تمسخرانہ انداز کے ساتھ شمع ان کے روبرو لائی گئی تاکہ یہ بھی اپنی غزل سنائیں غزل سنانے سے پیشتر ایک قہقہہ کی آواز بلند ہوئی۔ اور بعض نے مذاقیہ انداز میں پوچھا کہ سرکار کا وطن؟ جواب میں فی البدیہہ یہ اشعار سنانے لگے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنوں	ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب	رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا	ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

یہ سنکر تمام شعرائے حیرت زدہ انداز کے ساتھ سرنگوں ہوگئے، اور سمجھ گئے کہ یہ وہی میرؔ اکبر آبادی ہیں جو کچھ مدت سے دہلی میں رہتے ہیں، سب نے معذرت کی اور یہ اب عزت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ نواب آصف الدولہ نے ان کی یہ قدر افزائی کی کہ دو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ سو سال کی عمر میں ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔ اُستاد ناسخ نے تاریخ لکھی کہ

"واویلا مرد شہ شاعران"

چھ دیوان مرتب کئے، مگر انتخاب کے بعد ایک دیوان قابل قدر و لائق ستائش سمجھا گیا۔ غزل کے اُستاد تھے۔ اور زبان میں وہ فصاحت و بلاغت پیدا کی جو اپنے رنگ میں یکتا تھی۔ قصیدے بہت کم کہتے تھے۔ اس لئے کہ تنگ مزاجی حد سے تجاوز کئے ہوئی تھی۔ ساہو

[illegible]

مجھکو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں ۔۔۔ میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں
کل جا کے ہمنے میر کے در پر سُنا جواب ۔۔۔ مدّت ہوئی کہ یاں وہ غریب الوطن نہیں

واسوخت کے موجد تھے، مناقب میں حسن اعتقاد کی وجہ سے حق گو، مثنوی کے اُستاد غزل کے شہنشاہ اور زبان کے معاملہ میں ہی نوع میں اُردو کے آدم تھے۔ میر صاحب نے اکثر فارسی کی ترکیبوں کو اردو میں استعمال کرکے اس میں چار چاند لگادیئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اہل زبان ہونے کی حیثیت سے ان سے بڑھکر آج تک کوئی نہیں ہوا۔

اندازِ کلام

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا ۔۔۔ پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
یہ چشمِ شوق طرفہ بے جگہ ہے دکھاؤ کی ۔۔۔ ٹھہرو نقدرِ یک مژہ تم اس مکان میں
دل کہ یک قطرۂ خون نہیں ہے بیش ۔۔۔ ایک عالم کے سر بلا لایا
یاد ایام کہ یاں ترکِ شکیبائی تھا ۔۔۔ ہر گلی کوچہ مجھے کوچۂ رسوائی تھا
جاتی ہے نظر حسن پہ گو چشم پر بدن ۔۔۔ یاں ہم نے پرِ کاہ بھی بیکار نہ دیکھا

ذیل کا شعر عمر بھر سر دھننے کے لئے کافی ہے۔ اس شعر پر اُستادوں کے دیوان قربان کردینے چاہئیں۔

اے خوشا حال اُس کا جس کا وہ ۔۔۔ حال عمداً تباہ کرتے ہیں
ابر اُٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانہ پر ۔۔۔ بادہ کشوں کا جھرمٹ ہےگا شیشہ اور پیمانہ پر
عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا ۔۔۔ دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

میرؔ کی شان میں اُستاد سوداؔ لکھتے ہیں۔ کہ

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ ۔۔۔ ہونا ہے تجھکو میرؔ سے اُستاد کی طرف

میرؔ۔ اے ناقۂ لیلا دو قدم راہ غلط کر ۔۔۔ مجنون زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے
جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے ۔۔۔ اس زندگی کرنیکو کہاں سے جگر آوے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ ۔۔۔ کیا دوانے نے موت پائی ہے

میر صاحب کے ذیل کے اشعار غیر فانی ہیں اور بغیر پئے لطف سرور موجود ہے۔

دل پر خون کی اک گلابی سے ۔۔۔ عمر بھر ہم رہے شرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ۔۔۔ اُن کی آنکھوں کی نیمخوابی سے
جی ڈھا جائے ہے سحر سے آج ۔۔۔ رات گذرے گی کس خرابی سے
اس کے ایفائے عہد تک نہ جئے ۔۔۔ عمر نے ہم سے بے وفائی کی
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ ۔۔۔ جب تک بس چل سکے ساغر چلے

یہ زندگی کے فلسفہ کا وہ شعر ہے جس میں سرور انبساط کا سبق دیا گیا ہے یعنی زندگی ایک حیات عارضی ہے بس جو لمحہ خوشی و مسرت کے ساتھ گذر جائے وہی غنیمت ہے۔ آج یورپ کی حکمران قومیں اسی فلسفہ پر قدم زن ہیں[1]

جُز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر ۔۔۔ ایک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

میر صاحب کے یوں تو اکثر اشعار غیر فانی ہیں لیکن ان میں بعض شہ پارے ایسے ہیں کہ جنکو پڑھ پڑھ کر انسان عمر بھر سر دُھن سکتا ہے اشعار کی فصاحت و بلاغت سوا سو سال کے بعد بھی ایسی ہے۔ کہ اس سے زیادہ آج تک کوئی شاعر یہ بات پیدا نہ کرسکا ایک ایک شعر جذبات سے لبریز ہے ایسا کہ جس پر ایک ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ مندرجہ صدر اشعار پر ہی اکتفا

کیا جائے، لیکن کیا کیا جائے کہ دماغ میں یہ پروانہ ہی نہیں کہ میر صاحب کے اشعار کے شاعرانہ محاسن بیان کر سکے۔

نکات الشعرا میر صاحب کے عہدِ شباب کی تالیف ہے لکھتے ہیں کہ مولفِ این نسخہ متوطن اکبر آباد است۔ بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہان آباد است" اندازِ بیان سے ظاہر ہے کہ میر صاحب عہدہ جوانی تک آگرہ میں رہے۔ اس کے بعد دہلی چلے گئے۔ اپنے تذکرہ میں اپنے ہمعصر شعرائے اکبر آباد کے متعلق نام بنام لکھتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے یہ تمام بلند پایہ شاعر تھے مثلاً سجاد کے متعلق لکھتے ہیں "کہ سجاد اکبر آبادی بسیار آدمی خوب بیت سخن ادب پایہ اُستادی رسیدہ ہر بیت خفیفش بر جگر نشتر زدہ" سجاد کی تعریف میر صاحب نے بہت کی ہے اور اس شعر کی داد بے انتہا دی ہے۔

عشق کی ناؤ پار کیا ہوئے جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

خان آرزو کی نسبت لکھتے ہیں کہ چراغِ دودمانِ صفائی گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خان آرزو" اسی طرح آبرو و مضمون وغیرہ وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ میر جیسا بلند پایہ شاعر جب اپنے معاصرین کی تعریف کرے تو کس کی مجال ہے کہ ان کی اس تعریف سے روگردانی کر سکے۔ حقیقتاً یہ تمام شعرائے اکبر آباد اساتذہ میں سے تھے جنھوں نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی اور جو بُھلا دینے کے قابل نہیں۔ مگر چونکہ آجکل کی صحافت میں ان کے نام شائع نہیں کئے جاتے اس لئے عام طور سے ان سے ادبی جماعت بے خبر ہے۔

مرزا غالب

چاہتا تھا کہ مرزا غالب کے متعلق سب سے آخیر میں لکھوں کیونکہ اس کے بعد کسی شاعر کا رنگ نہیں جم سکتا لیکن سلسلہ منقطع ہونے کے خیال سے سلسلہ وار ہی لکھنا مناسب ہوا اس لئے لکھتا ہوں۔

غالب کے خاندان کا تعلق افراسیاب بادشاہ توران سے ہے۔ جب تورانیوں کیانیوں اور سلجوقیوں کی حکومتوں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ ہو چکا تو کئی پشتوں کے بعد سمرقند سے مرزا غالب کے دادا ہندوستان آئے۔ اس وقت جبکہ یہاں شاہ عالم کی حکومت کا چراغ بجھ رہا تھا اور طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا۔ پانچ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اور ان کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں نے جو مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ اس دُرِ یتیم بہا کو اپنے دامنِ پرورش میں لے لیا۔ جرنیل لیک صاحب نے ۱۸۰۶ء میں نصر اللہ بیگ خان کو چار سو سپاہیوں کا افسر مقرر کیا مگر افسوس کہ اس حقیقی چچا کا سایہ بھی مرزا غالب کے سر سے اُس وقت اُٹھ گیا۔ جبکہ مرزا صاحب کی عمر نو برس کی تھی۔

کچھ دن تعلیمی سلسلہ آگرہ میں جاری رہا۔ ہرمزد نامی جو فارس کا رہنے والا تھا اور ژند و پاژند کا ایک جید عالم تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا اس کا اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا۔ یہ سیاحت کا دلدادہ تھا، چنانچہ دورانِ سیاحت میں اتفاقاً ہندوستان پہونچا، اور مرزا غالب سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت مرزا صاحب کی عمر ۱۴ سال کی تھی اور ان کو فارسی زبان سے بیحد محبت تھی۔ اس لئے یہ موقع غنیمت سمجھ کر عبدالصمد نو مسلم کو ۲ سال اپنا مہمان رکھا اور فارسی میں کمال حاصل کیا۔

غالب کے بزرگوں نے جو لاکھوں روپیہ کی جاگیر چھوڑی تھی وہ باہمی تنازعہ کے سبب یا کسی دوسری وجہ سے ضبط ہوگئی۔ اور یہ امیرزادہ اب غریبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ تاہم ملک سخن کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی اس لئے اس غمزدہ یتیم نے واجد علی شاہ کی شان میں مدح سرائی کی جس سے اس کا پانچسو روپیہ سالانہ مقرر ہو گیا۔ لیکن افسوس کہ واجد علیشاہ دو برس سے زیادہ نہ جئے کہ اس کے بعد مرزا صاحب کو دہلی آجانا پڑا۔ دہلی میں سات سال قیام کر کے ۱۸۲۶ء میں کلکتہ چلے گئے۔ لیکن جب کلکتہ سے ناکام واپس ہوئے تو پھر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ جب دہلی تباہ ہوئی تو رامپور چلے گئے۔ چونکہ نواب رام پور ۱۸۵۷ء میں انکے شاگرد ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کا سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا، اور فرمایا کہ اگر دہلی میں قیام رہے گا تو سو روپیہ ملیں گے لیکن رام پور رہنے کی حالت میں دو سو روپیہ دیئے جائیں گے۔ مگر چونکہ مرزا صاحب کو دہلی سے دلی نسبت تھی اس لئے دہلی ہی میں مستقل قیام رکھا، اور آخری وقت تک یہیں رہے۔

مرزا غالب کا وہ مکان جہاں وہ پیدا ہوئے، اور پندرہ سولہ سال تک زندگی بسر کی، آگرہ محلہ گلاب خانہ سے ملحق ہے اگرچہ امتداد زمانہ کے ساتھ مکان میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو چکا ہے اور اس میں ایک برادر وطن رہتے ہیں۔ لیکن کاش کہ اس میں غالب کی یادگار قائم کی جاتی۔ اگر آگرہ کے ادیب اپنے گروہ سے اور بڑوسلے وطن سے سفارش کریں، اور مکان مذکور کا اگر سب نہیں تو اس کا کچھ حصہ خرید کر یادگار غالب قائم کر دیں تو کوئی دشوار ترین بات نہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے عالی دماغ و نازک خیال طبقہ میں سے بعض نے شرح دیوان غالب لکھی ہیں۔ اور رسائل میں آئے دن مرزا غالب کا نام نامی لیا جاتا ہے۔ اور اس خدائے سخن پر کوئی مومن کو ترجیح دیتا ہے۔ کوئی ذوق کو۔ کوئی میر تقی کو سراہتا ہے اور کوئی کسی کو لیکن اصل یہ ہے کہ ان تمام تبصروں اور توازن کی حقیقت چاند اور ستاروں کی نسبت سے زیادہ نہیں۔ غالب در اصل غالب ہے اور اس کو اب تک کوئی مغلوب نہ کر سکا، اور نہ کر سکتا ہے۔

اُردو کلام ہی نہیں بلکہ فارسی کلام کے روبرو بھی کوئی بڑے سے بڑا شاعر نہیں ٹھہر سکتا۔ نظیری، خاقانی، قاآنی، کلیم اور بیدل وغیرہ وغیرہ غالب کے روبرو ہیچ نظر آتے ہیں۔ البتہ بیدل ایک ایسا شاعر گذرا ہے جس نے اپنے تخیل کے زور سے فارسی میں چار چاند لگا دیئے۔ اور اسیلئے غالب اور بیدل کا پایہ بلند ترین نظر آتا ہے لیکن پھر بھی تمام شعرا مرتے چلے جاتے ہیں، اور غالب زندہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب گذشتہ اور موجودہ تمام شاعروں کو مار کر مرے گا۔

اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے ایشیائی شاعر کو لے لیجئے، خواہ اردو کا شاعر ہو یا فارسی کا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کی جرأت کرونگا کہ دُنیا کے تمام شعرائے عظام کو غالب کے مقابلہ پر لایا جائے تو شاید وہ غالب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ کوئی شاعر ایسا نہیں گذرا جس کو دو زبانوں پر کامل دسترس اور پورا عبور حاصل ہو۔ اکثر ادیب و شاعر کئی کئی زبانیں جانتے ہیں لیکن کمال صرف اپنی مادری ہی زبان میں ہوتا ہے۔ لیکن غالب ان سب سے الگ ہے۔ میں حیران ہوں بلکہ عاجز ہوں کہ غالب کو فارسی کا اہل زبان کہوں؟ یا اُردو کا اہل زبان؟ میری رائے میں وہ دونوں زبانوں کا اہل تھا، ایسا کہ جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

یورپ زدہ فرقہ علمائے فرنگ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے، اور کہتا ہے کہ یورپ کے فلاں فلاں فلسفی نے فلاں مسئلہ پر ضخیم جلدیں لکھ ڈالیں، اور فلاں نے فلاں مسئلہ کو حل کیا۔ یونان کے فلاسفروں نے دُنیائے فیلسوفی میں تہلکہ مچا دیا، اور آج اُنکی زبان کا نکلا ہوا فقرہ، اور اُن کے قلم کا لکھا ہوا جملہ مقالاتِ زرّین کے تحت میں لکھا جاتا ہے۔ یہ فرقہ اپنے ہر قول و فعل کا موازنہ مغربی میزان میں کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے مقابلہ میں کوئی شیکسپیئر کو کوئی ٹینی سن کو کوئی ارسطو اور ہرکلے کو اور کوئی گوئٹے کو لاتا ہے۔ لیکن یہ گروہ نادم نہیں ہوتا کہ جن مسائل کو یورپ کے فلاسفروں نے ضخیم جلدوں کے ذریعہ حل کیا ہے۔ غالب نے وہی مسئلہ کہیں ایک شعر میں اور کہیں ایک مصرعہ میں حل کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس طرح ماہرین سائنس نے خدائے قدوس کے بے شمار راز ہائے سربستہ میں سے چند کو بروئے کار لا کر دنیا کو فیض پہونچایا ہے۔ اسی طرح غالب نے اپنے عمیق ترین فلسفۂ تخیل، اور فصاحت و بلاغت سے فلسفۂ ادب کی کانوں میں سے بیش بہا جواہر مختلف اللون گوہر اور شہ پارے پیدا کر کے اردو دُنیا کو مالا مال کر دیا ہے۔ مثلاً جواہر ریزے ملاحظہ ہوں۔

دعوت مژگان۔ خمارِ رسوم۔ حبیبِ خیال۔ آتشِ خاموش۔ جوہر اندیشہ۔ گلبانگ تسلی۔ دریائے مے۔ موجِ دریا۔ موجِ نگاہ۔ پیچ و چنگل نبضِ خس۔ خلوت ناموس۔ خودداریٔ ساحل۔ موئے آتش دیدہ۔ جوہر آئینہ۔ روزنِ دیوار۔ دامِ موج۔ دودِ شعلہ۔ گردشِ سیارہ۔ خندۂ دنداں موئے شیشہ۔ موجِ شراب۔ برگ اوراک۔ خس جوہر۔ لذتِ سنگ۔ معاشِ جنون۔ وادیٔ خیال۔ دامانِ خیال۔ قلزمِ خون۔ غبارِ وحشت۔ صحرائے وحشت۔ محشرِ خیال۔ شیرازۂ مژگان۔ طعنۂ نایافت۔ فردوسِ گوش۔ رنگِ فروغ۔ پہلوئے اندیشہ۔ پر خود ارستر وغیرہ وغیرہ۔

بہر نوع جسقدر زمانہ گذرتا جائے گا۔ غالب زندہ ہوتا جائے گا۔ حیرت ہوتی ہے جب خیال کیا جاتا ہے۔ کہ غالب نے نہ تو کسی درسگاہ میں فلسفہ کی ڈگری حاصل کی، اور نہ سائنس کی سند پھر یہ تمام دنیا کا فلسفہ اور سائنس کہاں سے یاد ہو گیا۔؟ معلوم ہوا کہ انسان کے دماغ میں مبدا فیاض نے سب کچھ رکھ دیا ہے۔ بشرطیکہ انسان اپنی رگ محسوسہ کو حرکت دے۔

اگر ذرہ آفتاب کی حقیقت، اور قطرہ دُنیا کا عمق بتا سکتا ہے تو میں بھی غالب کے علو خیال کو ظاہر کر سکتا ہوں مگر چونکہ حقیقت

اس کے خلاف ہے اور گو میں اپنی بے بضاعتی سے معذور ہوں کہ غالب کے کلام کو بالتشریح پیش کر سکوں۔ تاہم میں اپنے ذوق سے مجبور ہوں، اور اس لئے باندازۂ توفیق محض ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتا ہوں۔

اندازِ کلام

غالب کی شاعری درحقیقت ایک ایسی موسیقی ہے جس کا ہر شعر بربط کا تار۔ اور ہر لفظ مضراب ہے۔ دیکھئے کس بے تکلفانہ انداز میں کہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ خود بخود بول رہے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا		میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

علوِ تخییل کی مثال وحید کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ایسی نہیں، جیسی غالب کے اس شعر سے ظاہر ہے محض ایک شامِ تنہائی کے لئے کیسی کیسی منزلیں طے کی ہیں۔ ایک ہی دو مقام پر قیام نہیں کیا، بلکہ آپ کی پرواز اس مقام پر ہے۔ جہاں ایک شاعر کے خیال کے پر جلتے ہیں۔

بطوفان گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی		شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

معشوق کے قامت کی تعریف فتنۂ قیامت سے کرتے ہیں اور اس طرح کہ گویا فتنۂ قیامت تجھے فتنۂ قامت کے روبرو بے حقیقت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم		قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

عشق کا وہ صحرا جہاں بجز تپتی ہوئی ریگ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جہاں کے ذرات مثل جوہر تیغ آبدار کے چمکتے ہیں، اور جو تمازتِ آفتاب سے ہمہ وقت مرتعش رہتے ہیں۔ اس منزل کی وفا سراب سے کم نہیں بتلاتے۔

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال		ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

جو لوگ دنیوی علائق سے آزاد ہیں۔ وہ آلام و مصائب سے بھی بری ہیں۔ لیکن جب کبھی وہ انسانی ہمدردی میں مصیبت و اذیت کا شکار ہو کر تاریک زنداں میں پڑ جاتے ہیں۔ تو ان کو تکلیف تکلیف محسوس نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ نہ تو برق کی کڑک سے ڈرتے ہیں اور نہ قید خانہ کی تاریکی سے۔ بلکہ وہ برق کی چمک سے روشنی کا کام لیتے ہیں۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس		برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

ایشیا کے تمام شعرا حضرت عیسیٰ کی یہ صفت مخصوص طور سے بیان کرتے آئے ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ لیکن غالب ان سب سے الگ ہو کر کہتے ہیں۔ کہ

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی		قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

سائنسدان فرنگ کی یہ ایک جدید ترین تحقیقات ہے کہ اگر انسان فضا میں پرواز کرتا چلا جائے تو کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اوزون (ایک قسم کا گیس) اور اس کے بعد ستارے و سیارے برابر ملتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ آخری سیارے تک پہونچیگا تو اس سے دور بھی نظام ہائے شمسی کے تحت میں سیارے ملیں گے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ آخری سیارہ کہاں واقع ہوا ہے۔ لیکن غالب کی فضا پیما نگاہ کہتی ہے کہ

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے		عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

کعبہ و کلیسا اور کنشت کے پرستاروں کا مذہب جہاں پہونچکر ختم ہوتا ہے وہاں مرزا غالب کا مذہب شروع ہوتا ہے۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود		قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔

اگر آج کے تمام مقتدر رہنماؤں کی کتابیں جلا دی جائیں۔ اور قائدین عظام کے پند و نصائح مٹا دیئے جائیں تو غالب کا یہ شعر دنیا کو ایک سطح پر لا سکتا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم		ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

عالمِ سکرات و نزع کی تکلیف کا نقشہ کس جدید اور اچھوتی تشبیہ کے ساتھ کھینچا ہے یعنی کاغذ جب جل بجھنے کے قریب ہوتا ہے تو اس پر سُرخ و سیاہ نقطے مرتعش نظر آنے لگتے ہیں، اس ارتعاش کو سکرات کی تکلیف بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

برنگِ کاغذِ آتش زدہ ہم رنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک طپیدن پر

فلسفہ میں غالباً اس سے زیادہ کوئی مشکل سوال نہیں کہ آفرینش عالم کی وجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

ہرکلے کا بیان ہے کہ نرمی و سختی، ظلمت و روشنی، حرکت و سکون، حرارت و برودت، زندگی و موت یہ تمام خیالی چیزیں ہیں۔ اس پر اس نے کئی ضخیم جلدیں لکھ ڈالی ہیں لیکن غالب اپنے ایک شعر میں سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جادۂ عالمِ ہو منزلِ تحیّر کے بعد ہے۔ یعنی حیرتِ دوام کے بعد جب استغراق اور انہماک کا عالم انسان پر طاری ہوتا ہے تو انسانی دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ بیہوشی ہوش کا کام دینے لگتی ہے۔ اور دنیوی علم کی زیادتی بیکار ہو جاتی ہے۔ اس کے متعلق مرزا فرماتے ہیں۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

مرزا غالب جب سادگی پر آتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں گویا شعر کا ہر ہر مصرعہ بربط کا ایک تار ہے جو خود بخود بول رہا ہے۔ گھر کی ویرانی کے متعلق کہتے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خدا جانے یہ کس مقام پر پہونچکر کہا ہے۔ دنیا کی تمام حسرتیں اور مایوسیاں ذیل کے اشعار میں موجود ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جملہ مایوسیاں ان اشعار ہی کے لئے پیدا ہوئی تھیں۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

اس سادگی میں بلاغت کا کچھ ٹھکانا ہے۔ کہتے ہیں کہ

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

غالب کے دل میں ملک و قوم کا بھی درد تھا۔ غدر کے بعد جب انگریزوں کا تسلط ہو چکا، تو غالب کا دل بھی درد سے لبریز ہو گیا۔ اس موقع پر ایک غزل کہی جو درج ہے۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تمکو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غرضیکہ غالبؔ نے اُردو دُنیا کے لئے وہ سامان بہم پہونچا دیا ہے کہ جس کے بعد بڑے سے بڑا شاعر اس میں اضافہ کرنے سے عاجز نظر آتا ہے۔

(باقی آئندہ) (امام اکبرآبادی)

حُسن بیمار

کیا غضب ہے حُسن کے بیمار ہونے کی ادا
جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا

انکسارِ حُسن پلکوں کے جھپکنے میں نہاں
نیم وا بیمار آنکھوں سے مروت سی عیاں

جنبشِ مژگاں میں غلطاں سازِ غم کا زیر و بم
خامشی میں پرفشاں ایفائے پیماں کی قسم

احترامِ عشق کی رَو دلنشین آواز میں
ایک پھیکے پن کا سناٹا دیارِ ناز میں

الاماں آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسوں گری
ایک بجھتا سا تبسم، اک تھکی سی دلبری

ہلکی ہلکی جھلکیاں رخسار پہ یوں نور کی
جیسے بن میں صبحِ کاذب کی سہانی چاندنی

لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب
جیسے طوفانی سمندر میں ضیائے ماہتاب

حُسن یوں کھویا ہوا سا بزمِ محسوسات میں
جیسے دونوں وقت ملتے ہوں بھری برسات میں

یوں ہے اک مبہم سی چشمِ سحر انداز میں
صبح کو شبنم ہو جیسے معرضِ پرواز میں

سُرخیِ عارض میں اک ہلکی سفیدی کی جھلک
آسماں پر صبح جیسے خیطِ ابیض کی چمک

جیسے مکھڑے میں کوئی تابندہ منظر دور کا
جیسے بھیگی رات کے سینے پہ ڈورا نور کا

تجلیاتِ اختر

کوئی کہانتک سہے جفائیں یہ بارِ غم کس طرح اٹھائے
دُکھے ہوئے دل کی التجا سُن بجھی ہوئی روح کی دُعا لے

نہ چھیڑ مضطرب ترانۂ غم کہ ہے ابھی تک تو رات باقی
ابھی سے اندیشۂ سحر کیا، سحر کا تارا تو مسکرا لے

میں اُس کی گہری نظر کے صدقے جو رازِ ہستی سے باخبر ہو
میں اسکے حسنِ ادا کے قربان جو زیست میں لذتِ فنا لے

رہینِ پندارِ ہوش! خاکِ رہِ شبستانِ عشق ہو جا
کہ طالبِ عیشِ سرمدی ہے تو روح کو خواب سے جگا لے

حریمِ ہستی کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے میرے سوزِ غم کا
یہ اولین امتحان دل تھا اب اور چاہے تو آزما لے

یہ جانگداز رنجِ نامرادی کوئی کہانتک اٹھائے اخترؔ
میں اب تو یہ چاہتا ہوں دُنیا سے مجھکو میرا خدا اٹھا لے

۷۸۶

شہاب

جلد (۱) | شہریور ۱۳۴۲ف م جولائی ۱۹۳۳ء | نمبر (۶)

محمد عبدالرزاق بسمل مدیر

برقی پریس رہبر دکن میں چھپکر بیرون دبیر پورہ حیدرآباد دکن سے شایع ہوا۔

شہاب

کے توسیع اشاعت میں جو درد مند احباب دلچسپی لے رہے ہیں ان کے ہم کمال منت پذیر ہیں۔

آیندہ سے یہ ارادہ کرلیا گیا ہے کہ جو حضرات (۵۰) خریدار بہم پہونچائیں انکا بلاک شائع کیا جائے تاکہ دوسرے یہ اندازہ لگا سکیں کہ اردو ادب کے ابھار نے میں آپنے کس قدر گراں خدمات انجام دی ہیں۔

آپ چاہتے ہیں کہ آپکا بھی بلاک شائع ہو تو آج ہی خریدار دوں میں سعی کیجئے یہ کوئی اہم کام نہیں ہے۔ دلچسپی شرط ہے اور حرکت میں برکت کا راز پنہاں ہے۔ دیکھیں ہماری صدا پر سب سے پہلے کون!

عرب کا پہلا نامور مُغنّی

جناب غلام حسین صاحب آفاق ہاشمی

سنہ ۶۵ھ کا زمانہ ہے۔ دارالخلافت دمشق میں عبدالملک بن مروان سریر آرائے حکومت ہے جو بنی امیہ میں سب سے بڑا اولوالعزم اور بیدار مغز خلیفہ گزرا ہے۔ اس کے عہد حکومت میں بڑے بڑے نامور شعرائے عرب عراق و یمن حاضر دربار رہتے۔ شعرائے دربار اموی میں جریر۔ فرزدق۔ اخطل ان تین شاعروں کو امتیاز حاصل تھا اور اکثر شعر و شاعری کی مجلس گرم رہتی

شاعری اور موسیقی دونوں فن فطری جذبات کے تابع ہیں اور ہر ملک اور سرزمین میں خود بخود پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یوں تو دنیا کی ہر ترقی اور ہر فن فطرت کے تابع اور نیچر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہے۔ مگر ان فنون کو فطرت اور قدرتی جذبات انسانی سے بلاواسطہ بہت قریبی تعلق ہے لیکن باوجود اس کے ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ عرب کے ابتدائی دور جاہلیت کے سارے زمانہ میں جس قدر ترقی شاعری کو ہوئی تھی موسیقی کو نصیب نہیں ہوئی ہاں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربیہ عورتیں اکثر موقعوں پر دف بجا کر گا لیتی تھیں یا کسی غم کے موقعہ پر دلی صدمات کے اظہار کے لیے خود اپنے تصنیف کردہ مرثیوں کو سوز و گداز کے انداز میں گا کر سنا دیا کرتی تھیں۔ لیکن جس چیز نے ذوق شاعری کو بڑھا کے امراء القیس۔ زہیر۔ جریر۔ نابغہ ذبیانی جیسے باکمال شعراء پیدا کیے وہ چیز موسیقی کی دنیا میں نہ تھی کہ جاہلیت میں ایک بھی ایسا موسیقی داں پیدا ہو جاتا جس کا نام آج تک زندہ

اور باقی رہتا۔

موسیقی کے باضابطہ کمالات نے اسلام کے ابتدائی دور اور خلافت کے باوقعت دربارو
میں رونق پکڑی۔ زمانہ جاہلیت میں کہیں اس کا پتہ نہیں لگتا۔ موسیقی جسکی بدولت اسحٰق موصلی
جیسے صاحب کمال نے بغداد میں اور زریاب جیسے ماہر فن نے قرطبہ میں مقبولیت عامہ حاصل
کی اس کا مجتہد...... سعید بن مسجح مکی ہے۔ اس کا نام آج بھی اپنے زندہ جاوید ہونے کا
ثبوت دے رہا ہے۔ سعید بن مسجح ایک مکی نژاد شخص تھا۔ ابو عثمان کنیت تھی اور ان خوش
نصیب غلاموں میں تھا جو ابتداً اشرافِ عرب کی خدمت گزاری کو لائے گئے تھے مگر آخر میں
ترقی کرکے اور شہرت حاصل کرکے خود اپنے آقاؤں کے لیے موجب فخر و ناز بن گئے۔

عربی تاریخ میں یہہ بھی ایک خاص بات معلوم ہوئی کہ ابتداءً تو جب ترقی کے جوش میں
وہ اٹھے تو دنیا کے بڑے بڑے معزز لوگوں کو اپنا غلام بنالیا۔ مگر اس جوش کے فرو ہونیکے
بعد جب وہ اطمینان سے بیٹھے تو تمام لیاقتیں اور اکثر کمالات کا حامل ان غلاموں کو پایا اور ایک
دن ایسا آیا کہ اپنی ذاتی مستعدی و محنت کی بدولت وہی غلام ان کے قسمت کے بھی مالک بن گئے
سعید کو قسمت نے کس قبیلہ عرب کا غلام بنایا اس میں اختلاف ہے۔ بعض تو بنی جمح کو
بتاتے ہیں اور بعض بنی نوفل بن حارث بن عبدالمطلب۔ بعض بنی مخزوم کو غرضیکہ ان میں جو
قبیلہ یا جو شخص بھی ہو بڑا خوش نصیب تھا کہ ایسا غلام ملا جس کا نام قیامت تک نہ مٹیگا۔

عرب کے اس نامی گرامی اور پہلے مغنی کی نسبت کہتے ہیں کہ بچپن میں ایک خوش رو
شخص تھا۔ چہرہ کا رنگ زرد تھا جو عربوں کو بہت پسندیدہ تھا خدا نے ذہن بہت اچھا
دیا تھا وہ نہایت دانا۔ ذکی اور طبیعت دار شخص تھا ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے
آقا کو اس سے بڑی محبت تھی اور بچپن ہی میں اسکی طبع خداداد کے جوہر دیکھ کر اکثر کہا کرتا کہ
اس لڑکے کی یقیناً کوئی خاص شان ہونے والی ہے۔ اسی لیے میں اسے آزاد کرنا نہیں چاہتا۔ اگر
زندہ رہا تو اس کے ذریعہ سے میں ناموری حاصل کرونگا اور اگر مرگیا تو ابھی سے کہے دیتا
ہوں کہ میرے مرتے ہی یہہ آزاد ہے۔

ایک روز اتفاقاً اپنے اس ہنرمند غلام کو اس نے ابن رقاع عاملی جو بڑا شاعر تھا
اس کے یہہ شعر ترنم کے ساتھ گاتے ہوئے سنا۔ ؎

أَلَمَّ عَلىٰ طَلَلٍ عَفَا مُتَقَادِمٍ ... بَيْنَ الْكَلِيكِ وَبَيْنَ غَيْبِ النَّاعِمِ
لَوْلَا الْحَيَاءُ وَ إِنَّ رَأْسِي قَدْ عَفَا ... فِيهِ الْمَشِيبُ لَزُرْتُ أُمَّ الْقَاسِمِ

ترجمہ ۔ میں مقام لکیک اور غیب الناعم کے درمیان منہدم آثار اور کھنڈروں پر آکے فروکش ہو رہا ہوں۔ اور اگر شرم اور سر کے بہت سے بالوں کا سفید ہو جانا مانع نہ ہوتا تو ام قاسم (معشوق) کا جلوہ دیکھنے کو جاتا۔

سعید کا آقا: سعید اوہر آؤ۔ یہ تم کیا گا رہے تھے ذرا پھر سے گانا؟

سعید نے ذرا سنبھلکر اور نہایت لَے داری سے دوبارہ انہیں اشعار کو گایا اور آقا پر اس کا خاص اثر ہوا۔

آقا ۔ سعید تم نے اس فن کو کہاں اور کیونکر حاصل کیا۔

سعید: میں نے چند عجمیوں کو فارسی اشعار لیئے اور دھن سے گاتے ہوئے سنا تھا انکی دھن مجھ کو بھلی معلوم ہوئی میں نے کوشش کر کے اس دھن کو ان عربی اشعار میں قائم کیا ہے۔

آقا: یہ وہی بات ہے جس کی اکثر میں پیشین گوئی کیا کرتا تھا۔ خیر سعید اس وقت سے تو آزاد ہے تجھے اختیار ہے جو جی چاہے کر۔ جہاں جی چاہے رہ۔

ابن مسجح کو عجمیوں کا گانا سننے کا کب اور کیونکر موقع ملا اس کے متعلق دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب جناب امیر معاویہؓ بن ابی سفیان نے اپنے مکہ کے مکانات از سر نو تعمیر کرانے چاہے جن کا پورا احاطہ رقط کے نام سے مشہور تھا جو راستہ کہ خانہ کعبہ کی سجدے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسکن کو گیا ہے اسی کے کنارے بائیں جانب یہ عمارتیں واقع تھیں جن میں سب سے پہلا مکان "دار البیضاء" کھلا تھا اور دار الحمام پر جا کر یہ عمارت ختم ہوگئی تھی امیر معاویہ کو مسند خلافت نیز ارض شام کی سکونت نے یہ موقع دے رکھا تھا کہ ان خاندانی مکانوں کی تعمیر کا اہتمام جیسا چاہے کریں۔ چنانچہ حدود عراق کے فارسی معماروں کو اس کام پر معمور کیا تاکہ اس جدید عمارت کی خوشنمائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہو فارسی معماروں اور کاریگروں کا معمول تھا کہ کام کرتے گاتے جاتے تھے اسی وجہ سے مسجح کو فارسی نغموں کی طرف توجہ کرنیکا موقع ملا۔

دوسری روایت اس سے زیادہ مستند اور مشہور ہے وہ یہ کہ جب عبداللہ ابن زبیرؓ نے خانہ کعبہ

کو از سر نو تعمیر کیا ہے تو اس مقدس اور متبرک کام کے شروع کے وقت ابن مسجح کو موسیقی کا شوق کرنے اور عجمیوں کی دلچسپ اور دلکش دھنیں حاصل کرنیکا موقع حاصل ہوا۔

اس کار تعمیر میں زیادہ تر رومی و فارسی معمار تھے جو غالباً پہلے سے یہاں موجود تھے اور انھیں کی دلچسپ باتیں سنکر ابن مسجح نے اپنے ذوق و اجتہاد سے عربی موسیقی میں اصلاح کی یہ ظاہر ہے کہ ابن مسجح نے اس وقت تک جو کچھہ ترقی کی تھی وہ خود روطور پر اور بے اصول تھی مگر آقا سے سند آزادی ملتے ہی اس نے مکہ کو خیر باد کہا اور ارض شام جا کر بڑے بڑے مسیحی مغنیوں سے ملا۔ رومی زبان کی دھنیں سیکھیں۔ قدیم روما کے اصول موسیقی میں مہارت حاصل کی بربط و چنگ بجانے میں دستگاہ پیدا کی اور اچھی طرح اطمینان کر لینےکے بعد ارض عراق کی راہ لی ایران میں آیا یہاں کے باکمال ماہرین موسیقی کی شاگردی کی اور انکا مذاق موسیقی معلوم کیا۔ ان کی لیے اور دھن گلے میں اتاریں اور جب گانے بجانے میں پورا کمال حاصل کر لیا تو اپنے بادیہ پیما اونٹ کی گردن وطن اور ارض حجاز کی طرف پھیر دی اور پھر مکہ معظمہ آکے سکونت پذیر ہوگیا۔

اس وقت تک ابن مسجح کی تعلیمی ترقیوں کا زمانہ تھا یعنی مروجہ اور مختلف اقوام کی موسیقی اور انکی پسندیدہ دھنیں حاصل کر رہا تھا۔ مگر اب مکہ میں آکے اس کے کمالات کا دوسرا عہد اجتہادی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔ اب وہ جن دھنوں کو عربوں کے مذاق اور انکی طبیعت کے موافق پاتا ان کو عربی اشعار میں نہایت خوش اسلوبی سے قائم کرتا اور اس انداز دلکشی سے ادا کرتا کہ لوگ محو حیرت رہ جاتے۔

اب اہل حجاز اور خصوصاً جوانان مکہ کو ابن مسجح کے نغمات میں اس قدر انہماک ہو چلا تھا کہ ہر جگہ اسکی دھوم تھی اور ہر صحبت اسکی تانوں کے بغیر بے مزہ ہوتی۔ چاروں طرف یہ مشہور ہو گیا کہ یہ صاحب کمال مغنی مکے کے خاندانوں اور قریش کے نوجوانوں کو تباہ کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خبر دارالخلافت دمشق میں خاص خلیفہ وقت عبدالملک بن مروان کے کانوں تک پہونچی۔ فوراً وحمان الاشقر کے نام جو اس وقت وہاں کا عامل تھا یہ فرمان بھیجا کہ ابن مسجح کی تمام جائداد اپنے قبضہ میں کرلو اور اس کو فوراً میرے پاس بھیجدو . . . . . .

. . . .

فرمان کے پہونچتے ہی ابن مسجح کی تمام جائداد ضبط ہو گئی اور وہ خفیہ طور پر

فریادیوں کی حیثیت سے ملک شام روانہ ہوا۔ دمشق کی جامع مسجد میں اترا اور لوگوں سے دریافت کیا کہ امیر المومنین کے پاس کن لوگوں کی زیادہ آمد و رفت ہے اور کون کون لوگ ان کے مزاج میں درخور رکھتے ہیں۔ لوگوں نے چند معزز اور صاحب اثر قریشی اور اموی رئیس زادوں کے نام بتا دے۔ پتہ پاتے ہی وہ سیدھا ان کے پاس پہونچا۔ بعد صاحب سلامت کے کہا کہ آپ کو ایک حجازی غریب الوطن کو اپنا مہمان بنانے میں کوئی تامل تو نہ ہوگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ صدہا اور ہزارہا اہل حجاز اپنی غرضیں لے لیکے دمشق پہونچا کرتے تھے ایسی صورت میں کسی اجنبی اور نو وارد کو وہاں کئی معزز اور صاحب مرتبہ میزبان کا ملجانا کوئی آسان نہ تھا۔ اور خصوصاً ابن مسجح جیسے حقیر صورت شخص کو (جو بچپن کے خلاف اب نہایت ہی کمزور ہوگیا تھا) کسی میزبان کا ملنا بہت دشوار تھا۔

ابن مسجح نے تین قریشی رئیس زادوں سے اپنے مہمان بننے کی آرزو کی۔ لطف یہ جس روز جن رئیس زادوں سے اس بکلی مغنی نے مہمانی کی آرزو کی تھی اس روز وہ تینوں شخص دمشق میں ایک مشہور گانے والی "برق الافق" نامی عورت کے یہاں مدعو تھے۔ دو کو تو یہ درخواست ناگوار ہوئی اور انھوں نے صاف جواب دیدیا مگر تیسرے شخص نے مہمان کو واپس پھیرنا برا سمجھ کر حامی بھر لی اور اپنے دوسرے دو دوستوں سے معذرت چاہی کہ اب "برق الافق" کے یہاں آپ لوگ تشریف لیجایئے میں اپنے مہمان کے ہمراہ گھر پر رہونگا۔ دوستوں نے کہا۔ بغیر تمھارے صحبت سماع میں کچھ لطف نہ آئیگا تم ضرور چلو اور مہمان کو بھی ساتھ لیتے چلو اس میں مضائقہ نہیں ہے۔ اس طرح محض اتفاقی طور پر ابن مسجح جس روز دمشق میں پہونچا اسی روز ایک محفل رقص و سماع میں شریک ہوا۔

برق الافق کے گھر پہنچکر ابن مسجح نے اپنے میزبان سے کہا کہ میں ایک حقیر آدمی ہوں شاید لوگوں کو میرے ساتھ بیٹھنا ناگوار ہو لہٰذا میں الگ جوتوں کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ اور میرا کھانا بھی مجھ کو وہیں دیدیجئے۔ ابن مسجح اگر بیحد اصرار نہ کرتا تو اسکی یہ عجیب و غریب خواہش نہ مانی جاتی لیکن اس کے بیحد اصرار پر یہ درخواست منظور کر لی گئی اور وہ نہایت ذلیل حیثیت سے جوتوں کے پاس بیٹھ گیا۔ جب کھانے سے فراغت ہوئی تو دور شراب چلنے لگا اور دو خوبصورت عورتیں درمیان میں بچھی ہوئی چوکی پر آکر بیٹھیں اور گانے لگیں۔ ایک دو چیزیں گا کر وہ

عورتیں چوکی سے اتریں۔ اس کے بعد ایک اور نازنین نہایت حسین چوکی پر آکے بیٹھی ابھی اس نے گانا بھی نہیں شروع کیا تھا کہ ابن مسجح نے اسکی تعریف میں ایک عربی شعر پڑھا جس پر وہ نازنین بہت بگڑی اور کہا کہ کیا اب میں ایسی گئی گزری ہوں کہ ایک ذلیل غلام میری تعریف میں شعر پڑھے۔ ابن مسجح کی اس حرکت کو اور لوگوں نے بھی ناپسند کیا اور یہ بھی خاموش ہو رہے اب اس نازنین نے دوسری چیز چھیڑی اور گلے بازی کے نامکمل کمال دکھانے لگی۔ ابن مسجح جو اس علم میں باکمال ہی نہیں تھا بلکہ مجتہد تھا اپنی جگہ سے بطور پھبتی بولا۔ "واہ واہ کیا خوب گاتی ہو" یہ سنتے ہی "برق الافق" جو اس نازنین کی مالک اور گھر کی میزبان تھی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جھنجلا کر کہا ایسے غلام اور ذلیل لوگ میری اس دلربا لڑکی کی تعریفیں کریں گے تو بھلا میری کیا اصل حقیقت رہ جائیگی۔ میں تو شریفوں سے ملنے کے قابل ہی نہ رہونگی۔ آخر اس شخص نے جو کہ ابن مسجح کو اپنے ہمراہ لایا تھا مجبور ہو کے کہا کہ حضرت آپ نے تمام مزہ بے لطف کر دیا۔ مہربانی فرما کر آپ میرے مکان پر تشریف لیجائیے وہاں ٹھہریئے میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ جب ابن مسجح نے اپنے میزبان کی زبانی یہ الفاظ سنے تو فوراً وہاں سے اٹھ کر چلنے کا ارادہ کیا تو اور لوگوں نے اس بات کو خلاف اخلاق سمجھ کر ابن مسجح کو روکا اور کہا کہ آپ بیٹھیے مگر براہ کرم آداب صحبت کا خیال رکھیے۔ سب کے اصرار سے آپ پھر وہیں بیٹھ گئے۔ اب اس نازنین نے پھر گانا شروع کیا۔ دو ہی چار تانیں لینے پائی تھی کہ ابن مسجح سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے کھڑے ہو کر چلا کے کہا کہ۔ غلط بالکل غلط۔ حرامزادی تو گانا کیا جانے۔ یوں نہیں بلکہ یوں" اتنا کہکر آپ نے اسی چیز کو گانا شروع کر دیا جس کو نازنین گا رہی تھی۔ دلکش آواز پیاری دھن۔ رات کا وقت ہر ایک تان برچھی کی مانند دل میں گھس رہی تھی۔ مجلس میں ایک سناٹا چھا گیا لوگ سکتے کے عالم میں نیچی گردنیں کیے محو حیرت تھے۔ چیز ختم ہوئی نازنین اور برق الافق گھبرا کر کھڑی ہو گئیں اور کہا کہ "واللہ۔ قسم خدا کی یہ بات سوائے ابو عثمان سعید بن مسجح کے اور کسی میں نہیں ہو سکتی اور یہ سوائے سعید بن مسجح کے اور کوئی نہیں ہیں۔ لوگوں نے انکی صورت کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا کہ کیا حقیقتاً آپ وہی ہیں۔ آپ نے کہا کہ ہاں ہوں تو ضرور وہی مگر اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب کیا تھا لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ "برق الافق" منتیں کرنے لگی۔ ہر شخص خوشامد کرنے لگا کہ میرے یہاں

لم فروکش ہو جیئے۔ مگر ابن مسجح نے انکار کیا اور کہا کہ میں اس کا مہمان ہوں جو تم سب کا
ردار ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ تو فرمایئے کہ آپکا یہاں آنے کا کیوں کر اتفاق ہوا۔ آپ نے
نی مظلومی کی تمام داستان سنادی۔

اس کے بعد اس قریشی شخص نے کہا جبکہ یہ مہمان تھے کہ میں آج ہی رات کو امیر المومنین کی
ت میں جاتا ہوں اگر ان کو شگفتہ اور خوش مذاق پاؤنگا تو آپ کو بلوالونگا۔ انھوں نے
یا کہ بہتر۔ چنانچہ وہ اس وقت گیا اور عبدالملک کو خوش طبع پاکر ان کے پاس آدمی بھیجدیا۔
گئے اور محل کے نیچے ساربانوں کی دھن میں چند اشعار گائے جو خلیفہ کی مدح میں تھے۔
بدالملک نے قریشی رئیس زادہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اس نے کہا یہ ایک حجازی شخص
ہے جو میرے یہاں آکے ٹھہرا ہے عبدالملک نے کہا تو اس کو یہاں بلالو۔ چوبداروں نے
ورًا ابن مسجح کو خلیفہ کے سامنے بھی لیجا کر کھڑا کر دیا۔ گانے کی فرمائش ہوئی۔ کئی چیزیں
ئی نئی طرز اور دھنوں میں سنائیں۔ خلیفہ ہمہ تن گوش تھا۔ آخر میں جھوم کر بولا کہ واللہ تو
لوگوں میں خاص مرتبہ رکھتا ہے مگر یہ تو بتا کہ تو کون ہے۔ ابن مسجح کے لیے اس سے بڑھ کر اور
کون موقع ہو سکتا تھا۔ جواب دیا کہ یہ مظلوم ہے جس کا مال خلیفہ کے حکم سے ضبط ہوا ہے۔ اور
خانماں برباد اور وطن سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یعنی سعید بن مسجح عبدالملک نام سنتے ہی
ہنسا اور کہا کہ خیر یہ صاف معلوم ہو گیا کہ جوانان قریش جو اپنی دولت تیرے حوالے کیے دیتے
ہیں اس میں کہاں تک اور کس قدر معذور ہیں۔ یہ کہکر فورًا والی مکہ کو حکم بھیجا کہ سعید بن مسجح
کا مال و اسباب اور جائداد چھوڑ دیے اور اپنی طرف سے بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔

ابن مسجح کی نسبت یہ صاف طور پر نہیں معلوم ہوا کہ وہ کب تک زندہ رہا اور کس سنہ میں
مرا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ولید بن عبدالملک کے دور تک زندہ رہا جبکہ اسکی آخری عمر
میں ابن سریج نے اس کے شاگردی کی عزت حاصل کی اور نامور مغنی ہوا۔

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

کردیگی قتل مجھ کو مقرر نہیں نہیں
تلوار بن گئی تیری کافر نہیں نہیں

میں عرض حال کرکے پشیمان ہوگیا
آواز آرہی ہے برابر نہیں نہیں

ٹوٹے نہ دل کہیں کسی امیدوار کا —
ہاں ہاں کبھی کبھی ہو زباں پر نہیں نہیں

آخر یہ بات کیا ہے میری بات بات پر
نکلا تری زبان سے اکثر نہیں نہیں

کہنا کسی کا مان نہ کر ضد خدا سے ڈر —
اچھی نہیں تری ہٹ کافر نہیں نہیں

جب وہ کہے کہ دیجئے دل مجھ کو مفت ہی
یارب کہوں زبان سے کیونکر نہیں نہیں

خاموش ہوگئے میرے فقروں میں آگئے —
سمجھے تھے چھوٹ جائینگے کہکر نہیں نہیں

انکو یہ ضد کہ اب نہ کہیں گے زبان سے کچھ
مجھ کو یہ شوق سنئے مکرر نہیں نہیں

ہوتا ہے بے سبب کوئی اس طرح بدگماں
اے دل یہ جھوٹ ہے وہ ستمگر نہیں نہیں

جو میرا اشارہ فہم عزیز ان سے پوچھئے
ہاں ہاں سے تو زیادہ ہے بہتر نہیں نہیں

زود پشیماں

—— فسانہ ——

جناب مس مہر آرا ریاست اللہ

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا ——!!

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے ——!!

رشید محل کے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیگم رشید ایک صوفے پر نیم دراز ہیں۔ چہرہ سے رنج و غم کے آثار ہویدا ہیں۔ اور نرگسی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں۔ بیگم رشید اس وقت ایک میلی سی ہلکی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے ہیں۔ زلفیں بھی شانہ کی مرہون منت نہیں ہیں اور یوں ہی بے ترتیبی سے اسکی حسین پیشانی، شانوں اور نازک کمر پر لہرا رہی ہیں۔ قریب ہی انکی پیاری سہیلی برجیس بانو ایک کرسی پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی ہے کمرہ میں سکوت مطلق طاری ہے اور ان دو کے تنفس اور کلاک کی ٹک ٹک کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہا آخر اس نہ ٹوٹنے والے سلسلہ سکوت کو برجیس نے اپنے ان الفاظ سے توڑا۔

برجیس - پیاری ثریا ..... آخر تم نے اپنا یہ حال کیوں بنا رکھا ہے؟

ثریا - تم سب حال سے واقف ہونے کے بعد بھی مجھ سے ایسے سوال کرتی ہو۔ آخر ہوں تو میں بھی انسان۔ میرے سینہ میں بھی دل ہے کوئی پتھر نہیں ہے ایسی بے حس کس طرح بن جاؤں

دنیا بھر کے صدمے سہوں اور خاموش رہوں ..... فقرے کو ختم کرنے کے ساتھ ہی دو موٹے موٹے آنسو اسکی آنکھوں سے لڑھک کر پژمردہ رخساروں پر بہنے لگتے ہیں اور ساتھ ہی ایک آہ سرد کے ساتھ غالب کا یہ شعر اسکی زبان پر آجاتا ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

برجیس۔ (آنسو خشک کرتے ہوئے) مگر پیاری بہن میں پھر وہی کہونگی کہ ہمت اور استقلال سے کام لو اس طرح اپنی جان کو ہلکان کرنے سے تو کوئی فائدہ ہونے سے رہا۔ بلکہ تم کو اس طرح رنجیدہ دیکھکر اور بھی رشید صاحب تمھارے قریب رہتے ہوئے گھبرائیں گے۔

ثریا۔ آہ ..... اب انکی برہمی میں کسر ہی کونسی باقی رہی ہے ..... تم سنو تو معلوم ہو میری بہن جو مصیبتیں مجھ پر گزرتی ہیں میرا ہی دل جانتا ہے۔ کل انھوں نے دوران گفتگو میں کہا تھا۔ مجھے تمھاری صورت سے نفرت ہوگئی ہے (روتے ہوئے) کیا اب اس سے بھی زیادہ کوئی اور سخت الفاظ باقی ہیں جن کے سننے کا مجھے آئندہ کے لیے خطرہ ہو !

برجیس۔ اچھی ثریا۔ میری پیاری باجی اس قدر تو اپنے دل کو مت دکھاؤ ذرا یہ تو سوچو۔ یہ ہوا چند روزہ ہے رشید صاحب جیسے ہرجائی آدمی کا دل بہت جلد بھر جائیگا اور پھر وہی تم ہونگی اور وہی وہ !!

ثریا۔ نہیں برجیس تمھارا خیال غلط ہے مجھ کو اب اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ در اصل ان کو مجھ سے ذرہ برابر بھی محبت نہ تھی اور انکی لفاظی پر میرا یقین کرنا میری نادانی تھی ..... آہ اگر ان کو اس کا چوتھائی حصہ بھی محبت ہوتی جس قدر کہ شروع میں انھوں نے اپنے الفاظوں اور مکتوبوں سے ظاہر کی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ آج وہ میری صورت سے اس قدر بیزار نظر آتے !!

فقرہ ختم کرتے کرتے دوبارہ ثریا کی آواز بھرا جاتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے سر کو سہارا دیکر دوبارہ رونا شروع کر دیتی ہے۔ برجیس کھڑے ہو کر اپنے رومال سے اس کے آنسو خشک کرتی ہے۔ عین اسی وقت باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے جس سے یہ دونوں بہنیں چونک جاتی ہیں۔

برجیس۔ معلوم ہوتا ہے رشید صاحب آگئے۔

ثریا۔ جی ہاں آواز تو اپنے ہی موٹر کی ہے ..... مگر تعجب کی بات ہے کہ آج مجھ پر اور یہ عنایت

کچہری سے گھر ہی واپس آگئے۔
برجیس۔ (سر پر ساڑی درست کرتے ہوئے) اچھی ثریا کم از کم منہ ہی دھو ڈالو چہرہ بالکل
اداس نظر آرہا ہے...... ایسی حالت میں تم رشید کے سامنے نہ آیا کرو ورنہ اس سے ان پر اور
بھی زیادہ خراب اثر پڑیگا اس لیے کہ ہر ایک مرد کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ گھر کے اندر قدم
رکھیں بیوی ان سے مسرور اور بشاش نظر آئے۔
رشید صاحب۔ (دہلیز پر سے) اہو۔ آج تو بہن آگئیں۔
برجیس (کھڑے ہو کر) آداب عرض ہے۔
رشید صاحب۔ کیسے مزاج تو اچھا ہے۔
برجیس۔ آیئے بھئی۔
رشید صاحب۔ نہیں...... میرے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہے (ثریا کی طرف کن آنکھوں سے
دیکھ کر) ہاں میں اس لیے آیا تھا کہ آج میں شکار میں چند دوستوں کے ہمراہ جا رہا ہوں شاید
دو تین روز کے بعد واپسی ہوگی۔ گاڑی یہاں سے پانچ بجے جاتی ہے اس وقت چار بجے ہیں آپ
اپنی نگرانی میں جلد خانساماں سے ناشتہ وغیرہ طیار کرا دیں (واپسی کے لیے مڑکر) میں تو جا رہا
ہوں ناشتہ لیکر بیرے کو اسٹیشن بھیجدینا۔ برجیس بہن آداب عرض ہے۔
برجیس۔ تھوڑی دیر تو بیٹھیے۔ ابھی تو گاڑی جانے میں بہت عرصہ ہے۔
رشید صاحب۔ ارے آج برجیس قدر (برجیس کا لڑکا) نہیں آیا۔
برجیس۔ اس کو دو روز سے بخار ہے۔
رشید صاحب۔ اوہو ہم کو خبر ہی نہیں۔
برجیس۔ خبر کس طرح ہو...... اب تو آپ ہفتوں ہم لوگوں کی طرف کا رخ بھی نہیں کرتے۔
رشید صاحب۔ ٹالتے ہوئے۔ ہاں.. کام زیادہ رہتا ہے کئی مرتبہ ارادہ بھی کیا مگر آپ کی طرف
نہ جا سکا...... اچھا خدا حافظ..... ثریا...... اگر تنہائی سے گھبراؤ تو بہن کو روک لینا۔
ثریا۔ (رشید صاحب کے جانے کے بعد) غمگین لہجے میں کس قیامت کا فریبی آدمی ہے (صوفے کا کشن
اٹھا کر اس کے نیچے سے ایک پرچہ نکال کر برجیس کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے) ذرا اس کو تو پڑھو
برجیس پرچہ پڑھتی ہے۔

"میں کلیر شریف جا رہی ہوں۔ آپ نے ہمراہ چلنے کا وعدہ کیا تھا للہ اسہ پہر کو ساڑھے چار بجے مجھے اسٹیشن پر مل جائیں۔ میں منتظر رہونگی"

(راقمہ۔ آپکی زہرہ)

برجیس۔ پرچہ پڑھ کر واپس کر دیتی ہے۔ ثریا اس کو صوفے پر رکھ کر گھنٹی بجاتی ہے اور ایک ملازم لڑکا آ کر با ادب کھڑا ہو جاتا ہے!!

ثریا۔ شفیق خانساماں سے کہو وقت کم ہے تم صرف پراٹے اور انڈے پکا لو اور سردار سے کہو میرے سے کے روپیہ دیکر سائیکل پر بازار بھیجدے تاکہ مٹھائی وغیرہ بازار سے لے آئے.... مگر ذرا تاکید کر دینا کہ پانچ سے پہلے ناشتہ اسٹیشن جانا ہے۔ شفیق سر تسلیم خم کرکے چلا جاتا ہے۔ اور ثریا پھر ایک جسم بیجان کی طرح آنکھیں بند کرکے صوفے پر گر جاتی ہے۔!! برجیس خاموش بیٹھی اپنی پیاری بہن کے پژمردہ چہرے پر نظریں جمائے ہوئے عبرت کی نظروں سے دیکھ رہی ہے.... آخر دل بھر آتا ہے اور دوسری طرف کو منہ پھیر کر اپنے رومال میں آنسو جذب کر لیتی ہے

آہ جب کسی شریف خاندان کی کوئی بدقسمت لڑکی قسمت کے ہاتوں کسی شریف بدمعاش کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو پھر اس پر جو مصیبتیں اور صدمے گزرتے ہیں ان سے کچھ وہ ہی دل بخوبی واقف ہیں جن پر گزرتے ہیں یا جنھوں نے بہ نظر عبرت دیکھ کر اشک فشانی کی ہے برجیس بار بار سوچتی تھی کہ کسی طرح ثریا کو بہلائے مگر شدت رنج نے خود اسکی حالت ابتر کر رکھی تھی اور باوجود کوشش کے الفاظ زبان سے ادا نہ ہوتے تھے۔ اور اس وقت کے المناک سین نے تو گویا بالکل ہی اسکی طاقت گویائی صلب کر لی تھی۔ اس وقت وہ خاموش بیٹھی اپنی پیاری سہیلی...... آہ اس "بدنصیب ہستی" کو دیکھ رہی تھی جو آج سے چند ماہ قبل اس کی نظروں میں "خوش نصیب" تھی۔ اس لیے کہ ثریا خود بھی اپنے کو شادی کے ڈیڑھ سال بعد تک انتہا سے زیادہ خوش قسمت تصور کیا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا میں جہاں اس کو اور کسی چیز کی کمی نہیں وہاں خدا نے اس کو شوہر بھی چاہنے والا عطا فرمایا ہے۔ رشید اس کو بیحد چاہتا تھا اور وہ اکثر اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر اپنی پرمسرت زندگی اور رشید کی محبت کی تعریفیں کیا کرتی تھی۔ آہ یہ نادان رشید کی محبت پر اس درجہ نازاں تھی کہ ہمیشہ فخریہ طور پر رشید کی

خوش اخلاقی محبت اور زندہ دلی کے تذکرے کیا کرتی تھی اور اسی کی وجہ اسکی تمام سہیلیاں اسکو ایک خوش قسمت ہستی تصور کیا کرتی تھیں۔ بھلا اس معصوم اور نادان لڑکی کو کیا علم تھا کہ آج وہ جسکی محبت پر اس قدر نازاں ہے دوران قیام لندن میں ایک "زاہد فریب مغربی حسن" اور شادی سے قبل ایک اور بازاری حسینہ پر وہ اسی قدر مائل رہ چکا ہے..... آہ اس کو کیا معلوم تھا کہ عیش چند روزہ ہے..... اور اس مسرت اور شادمانی کے بعد..... پھر ایسے ایسے جانگسل صدمات سے دوچار ہونا پڑیگا -!!

وہ ماں کے گھر سے رخصتی کے وقت طرح طرح کے وہم اور پریشانیوں کا شکار بن کر سسرال گئی تھی اس لیے کہ شادی سے قبل اڑتے اڑتے اس نے رشید صاحب کے چال چلن کے مشکوک ہونے کی خبریں سنی تھیں مگر شادی کے بعد دو چار روز کے اندر ہی تمام توہمات اس کے دل سے حرف غلط کی طرح محو ہو گئے..... اور ایسے وقت جبکہ ثریا صرف محبت کی متلاشی تھی رشید کی محبت نے اس کو بہت جلد مسحور کر لیا.... ثریا کی تمامتر آرزوئیں اس وقت صرف اسی قدر تھیں کہ اسکی ازدواجی زندگی محبت اور شادمانیوں سے مالامال ہو اور جب رشید نے اپنی لغاظی سے اس کو اس بات کا یقین کامل دلا دیا کہ وہ اصلی معنوں میں اس کا پرستار ہے تو پھر جس قدر بھی مسرور ہوتی کم تھا۔ اور پھر وہ اس محبت میں اس درجہ سرشار ہوئی کہ اپنا بھی ہوش نہ رہا پھر اس شخص کی محبت میں غرق ہو جانا جو دراصل اس کا جائز حق بھی تھا کس قدر مطابق فطرت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محبت کے جواب میں "محبت دا لیس" پیش کیں لیکن اسکی طرح اس کی محبت بھی فریب اور تصنع سے پاک تھی مگر رشید کی محبت محض نمائش تھی اور چند روز بعد اس راز کا پتہ ثریا کو چلا تو..... غریب مرنے سے پہلے ہی مردہ ہو گئی ——!! یہ تھی بدنصیب ثریا کی روداد الم جس کو دوسرے الفاظ میں قسمت کی کھوٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ناعاقبت اندیش والدین نے رشید کی ظاہری خوبیوں اور دولت پر ثریا کو اپنی جلدبازی کی بدولت قربان کر دیا..... کاش ایسے نازک معاملوں کا کافی غور و فکر کے بعد انجام دیا جاتا تو آئے دن ایسے روح فرسا واقعات دیکھنے اور سننے میں نہ آتے مگر یہاں تو قصہ یہ ہے کہ خواہ ہندوستانی گھرانے کسی قدر تعلیم یافتہ اور روشن خیال کیوں نہ ہوں اس عیب سے خالی نہیں ہوتے کہ جہاں لڑکی کی عمر نے کسی قدر تجاوز کیا اور ان کو پریشانی لاحق ہوئی کہ جلد اس بار سے سبکدوش ہو جائیں اور ایسے وقت

جو کوئی گانٹھ کا پورا اور ظاہری خوبیوں سے آراستہ شخص نظر آگیا بس بغیر تعمل اس بار عظیم سے سبکدوشی حاصل کرلی جسکی بدولت ان کو رات کی نیند اور دن کا آرام حرام تھا اس وقت تو جس طرح ہوا اپنے شانوں کا بوجھ ہلکا کرہی لیا۔ پھر خواہ ساری عمر خود بھی لڑکی اسکی بدقسمتی کا رونا رو رو کر گزار دی۔!!

دنوں سے اور ہفتوں سے مہینے گزرتے چلے گئے مگر رشید کی حالت نہ بدلتی تھی نہ بدلی بلکہ دن بدن مدہوشی ترقی ہی کرتی گئی یہاں تک کہ اب شہر کی مشہور و معروف خوش گلو حسینہ زہرہ جان مستقل طور پر ان کے یہاں ملازم تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ان دوستوں کی فہرست میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا جو ایسے وقت جاں نثاری کا دعوی کیا کرتے ہیں۔ روپیہ اٹھانے کو کافی تھا لہٰذا ہر طرح رشید کی زندگی عیش و شادمانی سے مالامال تھی دن رات محفل نشاط جمی رہتی۔ دن عید تھا تو رات شب برات۔ بھر بھلا ان روح پرور ہنگامہ آرائیوں میں رشید کو اتنی مہلت کہاں ملتی کہ کبھی رشید محل۔۔۔۔ یا ثریا۔۔۔۔ بدنصیب ثریا کا خیال بھی آجاتا یعنی رشید محل تک جانیکی نوبت نہ آتی اور اگر کبھی کسی ضرورت سے جاتے بھی تو باہر ہی باہر سے ملازموں کو ہدایت کرکے واپس آجاتے زنانے محل میں جانیکی کبھی کوئی ضرورت درپیش نہ آتی تھی۔ یہ بھی ثریا کی بدبختی سمجھو کہ سسرال میں کوئی بزرگ بقید حیات نہ تھا جس کا کچھ تو ادب اور لحاظ رشید کو ہوتا۔ رہی سسرال سو وہ کسی گنتی میں نہیں۔ مثل مشہور ہے "بیوی پیاری سالیاں اور کانوں پیاری بالیاں" جب تک ثریا عزیز رہی سسرال کا بچہ بچہ پیارا تھا مگر اب تو انکا شمار بھی کسی گنتی میں نہ تھا۔!!

رشید کو محل سے جاتے وقت ویسے تو کسی خاص بہانہ کی ضرورت نہ تھی مگر فرنیچر لیجاتے وقت کچھ دل میں رحم آگیا ہوگا جو ثریا سے کہدیا گیا "یہاں وکالت کا کام ٹھیک نہیں چلتا اس وجہ سے دفتر کے لیے میں نے شہر میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے لی ہے"۔ پہلے پہلے وہ دفتر ہی رہی پھر بیٹھک بن گئی مگر اب مستقل طور پر پورا گھر ہی بن گیا تھا۔ پہلے کھانا رشید محل سے جایا کرتا تھا مگر اب اس میں یہ عذر پیش ہوا کہ راستہ میں کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور بدمزہ ہو جانیکی وجہ سے کھایا نہیں جاتا۔ لہٰذا ایک خانساماں بھی رکھ لیا گیا گویا دفتر پورا گھر بن گیا۔

رشید تھے محنتی اور ذہین آدمی وکالت میں تین چار سو روپیہ ماہوار پیدا کر بھی لیتے تھے

اسکے علاوہ والد صاحب قبلہ لخت جگر کی آسایش کے لیے گاڑھی کمائی کا پیسہ پیسہ جوڑ کر کافی جائداد بھی چھوڑ گئے تھے اور اسکی آمدنی بھی ڈیڑھ سو دو سو روپیہ ماہوار کے لگ بھگ تھی غرض خوب مزے میں گزر رہی تھی ثریا کی ضروریات کے لیے وہ روپیہ کافی ہوتا تھا جو اس کو اس جائداد سے ہر ماہ مل جایا کرتا تھا جو اس کو شادی کے وقت میکے سے ترکہ میں ملی تھی۔ اس لیے اس غیور عورت نے کبھی گوارا نہ کیا کہ رشید کے سامنے دست سوال دراز کرے جس طرح بھی ہوتا اسی روپیہ میں گزر کرتی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ رشید کو اسکی خاموشی نے بالکل ہی آزادی دیدی اسکو کبھی اس بات کا خیال بھی نہ ہوا کہ میری کمائی میں ثریا بھی حصہ دار ہے یا اس کو بھی کچھ خرچ کی ضرورت ہوتی ہوگی —!!!

جب رشید کی بے اعتنائیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو ثریا کے والدین نے بیٹی پر بہت زور دیا کہ اب وہ رشید محل نہ رہے بلکہ ان کے ہمراہ واپس آ رہے مگر غیور ثریا نے اس کو منظور نہ کیا والدین نے جس در پر اس کو اپنی خوشی سے بھیجدیا تھا اب وہ آخری وقت تک اسی گوشہ میں رہ کر زندگی گزارنے کی متمنی تھی۔ اور والدین کے اصرار پر ہمیشہ اس کا جواب یہی ہوا کرتا تھا جہاں آپ نے اپنی خوشی سے بھیجدیا اب میرا فرض ہے کہ اپنی قسمت پر شاکر رہ کر بقیہ عمر اسی گھر میں گذار دوں"!!

رشید کو ڈرانے دھمکانے اور زرمہر طلب کرنیکی دھمکیاں دینے کی بھی انھوں نے بیٹی سے اجازت چاہی مگر اس کا جواب بھی اسکی طرف سے نفی میں ملا اس لیے کہ اس کا خیال تھا اب زندگی چندروزہ ہے جس طرح گذاری جائے گذار دے اپنی وجہ سے کسی دوسرے کو کیوں تکلیف دے دوسرے رشید کی رسوائی اور بدنامی اس کے خیال میں اسکی اپنی توہین تھی —!! مگر دراصل یہ سب کچھ اس کے ماتحت تھا کہ رنج و غم کے داغوں کے ساتھ رشید کی محبت کی چنگاری بھی اس کے دل میں سلگ رہی تھی اور وہ انتقام لینا نہ چاہتی تھی —!! کاش اب بھی رشید راہ راست پر آجاتا تو یہ رحم و محبت کی دیوی اس کے تمام ناقابل عفو قصوروں کو بخوشی معاف کر دیتی —!!

چمن دہر میں مدام ہے شادی و غم
کون گل ہے جو رو دیا نہیں خنداں ہو کر

دولت . . بھی اسی وقت تک ساتھ دیتی ہے جب تک کہ اس کو جائز طریقہ پر صرف کیا جائے لیکن جب اندھا بن کر اس کو اڑایا جاتا ہے تو آنکھیں کھلنے سے پہلے ہی وہ رخصت ہو چکی ہوتی ہے یہی یہاں پیش آیا تین سال کے قلیل عرصہ میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی جائداد سود در سود کی نذر ہو کر نیلام ہو چکی تھی اس سے جو بدنامی ہوئی اسکی بدولت وکالت بھی گئی اور یہاں تک خراب اثر پڑا کہ ہفتے گذر جاتے اور کوئی مقدمہ ہاتھ نہ آتا میاں روز کچہری جاتے اور خالی ہاتھ واپس آجاتے تھے۔ "بی زہرہ" اور "جان نثار" دوستوں کے مصارف میں جب کمی ہوئی تو دوستوں نے بے التفاتی شروع کردی اور "بی زہرہ" کی محبت میں زوال آنا شروع ہو گیا مگر پھر بھی رشید خواب غفلت سے بیدار نہ ہوا اور سوائے اس کے اور کوئی نمایاں تبدیلی ان میں نہ آئی کہ ہر وقت عیش و نشاط میں محو رہنے کی بجائے کبھی کبھی فکروں کے بحر ذخار میں بھی ڈوبے رہتے تھے۔ اس طرح بھی کئی ماہ جوں توں گذر گئے مگر بدقسمتی دن بدن ترقی پذیر ہی ہوتی گئی۔ ادھر زہرہ کا مزاج دن بدن تیز ہوتا گیا۔ بات بات پر لڑائی کی نوبت آجاتی نوبت بایں جا رسید کہ ایک روز رشید سے خرچ کے اوپر خوب لڑائی ہوئی اور جب رشید کچہری سے واپس ہوئے تو زہرہ جان غائب تھیں اس پر ستم یہ کر گئیں کہ مع تمام فرنیچر مثلاً ہارمونیم۔ پیانو۔ گراموفون۔ پاندان۔ چاندی کے برتن وغیرہ کے غائب ہوئیں۔

رشید کی مالی حالت کے نقصان سے بیچاری "زہرہ" کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ صرف ان کے گھر ہی کو نہیں بلکہ اپنے وطن یعنی لکھنو کو بھی خیرباد کہہ گئیں اور کسی دوسرے شہر کو جا بسایا۔ دوست احباب بھی جو بات بات پر جان نثاری کا دعویٰ کیا کرتے تھے اب کہیں نظر بھی نہ آتے تھے اسکے علاوہ اور جہاں بیٹھتے رشید کی سو برائیاں کرکے اٹھتے کوئی کہتا بڑا ناعاقبت اندیش ہے کوئی کہتا باپ دادا کا نام ڈبو دیا کسی کا خیال تھا کہ اس سے زیادہ اس کے سارے خاندان میں کوئی لاپرواہ پیدا نہیں ہوا غرض اب اسکی حالت بالکل اس شعر کے مصداق تھی۔

بوقت بیکسی کس نیست جز از سایہ یار من
مگر آنہم ندارد طاقت شبہائے تار من

اب رشید نے آنکھیں کھولیں دل میں سوچا کہ کیا کر بیٹھا—!! مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا۔! نوکروں کی تنخواہیں کوٹھی کا کرایہ۔ درزی اور بزاز وں کا بل الگ پریشان کر رہے تھے۔

ان معمولی قرضہ کے علاوہ جو تقریباً دو ہزار تھا سات ہزار روپیہ اور بھی قرض تھا جو شہر کے مہاجنوں سے رقعوں کے اوپر لیا ہوا تھا کوٹھی کے مالک نے جب یہ نقشہ دیکھا کہ نہ پچھلا کرایہ ملتا ہے اور نہ اگلے کی امید ہے تو ایک ہفتہ کا میعادی نوٹس دیدیا جب مصیبت پر مصیبت پڑی تو رشید محل بھی یاد آیا... حالانکہ وہ اس کا اپنا مکان تھا ـــ مگر آج اس میں جاتا کس منہ سے ـــ !!

اس وقت رشید برامدے میں ایک آرام کرسی پر دراز ہیں آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی اور خیالات نہ معلوم کہاں منتشر ہیں اس کا دل اس کو اندر ہی اندر ملامت کر رہا ہے.... آج پہلی مرتبہ اس نے ۳۵ سال بعد اپنے آپ پر تنقیدی نظر ڈالی تو... اپنی کتاب زندگی کے تمام اوراق ظلم اور ریاکاری سے سیاہ نظر آئے ـــ !! ندامت اور انفعال نے اسکی شفاف پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار کردیے جن کو اس نے اپنے رومال میں جذب کیا عین اسی وقت ایک ملازم آیا چند منٹ تو وہ خاموش کھڑا اس توقع کا منتظر رہا کہ سرکار اس طرف دیکھیں تو عرض حال کروں مگر جب یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہ آئی تو مجبور ہو کر باادب بولا سرکار ہمارے بال بچے فاقے مر رہے ہیں... سات مہینے کی تنخواہ چڑھ رہی ہے۔ حضور ہم غریب آدمی ہیں تازہ کھودنا تازہ پینا ہم کہاں سے کھائیں بیٹھیں ـــ ؟

رشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند منٹ تک نوکر جواب کا منتظر رہا آخر بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ آج کل رشید کے پاس جس قدر ملازم تھے وہ سب نئے تھے پرانوں کو وہ برخاست کر چکا تھا۔ بظاہر ان ملازموں کو تنخواہ تک نہ ملنے کی شکایت تھی مگر در اصل ان ہی لوگوں نے رشید کا اور بھی دیوالہ نکال دیا تھا ایک روپیہ خرچ کرتے اور چار روپیہ وصول اسی لالچ میں تنخواہ نہ ملنے پر بھی پڑے ہوئے تھے ـــ !!

رشید کا آج سارا دن اسی طرح خیالات کے بحر ذخار میں غوطے کھاتے ہوئے گزر گیا اس وقت شام کے چھ بجے ہیں سورج کی آخری کرنیں باغ کی پر فضا زمین سے مل مل کر رخصت ہو رہی تھیں۔ رشید کی نظریں اس وقت سڑک پر چلنے والے اشخاص کی طرف متوجہ تھیں دور سے اس کو اپنا بوڑھا ملازم فجو آتا ہوا نظر پڑا۔ جس کو چار ماہ قبل "دُزیرہ" کی شکایت پر مار کر نکال چکا تھا "فجو" اس کے باپ کے وقت کا نوکر تھا اور اس نے اپنی

سال بھی عمران ہی کے در پر گزار دی تھی رشید نے جب نکال دیا تو ثریا کے در پر جا پڑا حالانکہ ثریا کی مالی حالت اسکی اجازت نہ دیتی تھی ایک نئے ملازم کا اور اضافہ کرے مگر اپنا دوست اور بھی خواہ سمجھ کر اس نے اس کو رکھ لیا تھا اور بطور پنشن اسکی ساری عمر کی خدمات کے صلہ میں اس کے خرچ کے موافق روپیہ اپنے ذاتی خرچ میں سے بچا کر دیدیا کرتی تھی۔ "فجو" کو آتا دیکھ کر رشید چونک پڑا۔ فجو نے قریب آکر ڈرتے ڈرتے لرزاں آواز میں کہا۔

"فجو" میں نے سنا تھا کہ کل دشمنوں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

رشید صاحب = ہاں..... اب تو اچھا ہوں..... کیسے آئے۔ آج کل کہاں ہو؟

فجو = چھوٹے سرکار ساری عمر تو حضور کا نمک کھایا اب اگر آپ نے ناراض ہو کر نکال بھی دیا تو کیا مرتے وقت نمک حرامی کرتا..... حضور میں دولہن بیگم کے در پر جا پڑا ہوں۔

رشید کا چہرہ خود بخود شرم سے جھک گیا..... آہ اس نے اس ضعیف اور بیچارے ملازم پر کیا ظالمانہ سلوک کیا تھا۔ "زہرہ" کے ایک ذرا سے اشارہ پر اس نے اس بے گناہ پر کس قدر ہنٹر برسا دیے تھے......... رہ رہ کر یہ خیال اسکو رنج دے رہا تھا۔

"فجو" چند منٹ خاموش کھڑا رہا آخر جاتے وقت اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

فجو = حضور دولہن بیگم کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے میں نے کہا اطلاع کر آؤں شاید آپ کو خبر نہ ہو۔"

رشید صاحب = ہیں..... کب سے بیمار ہیں

فجو = حضور ان کی بیماری کو تو پورے تین ماہ گزر گئے ہیں مگر اب دو روز سے حالت بہت زیادہ خراب ہے آپ کے خسر صاحب خوشدامن صاحبہ اور زہرہ جبین بیگم بھی کل سے آئی ہوئی ہیں حضور بیماری تو بیگانہ دعا ہے کہ اللہ پاک ان کو صحت عطا فرمائے ہم غریبوں کی تو وہ بڑی ہمدرد ہیں۔ غریب پرور بیگم کو اچھا کر دے۔"

رشید میں جواب دینے کی طاقت نہ تھی بوڑھا فجو چند منٹ کھڑا رہا آخر واپس چلا گیا

.... دن ڈھل چکا تھا اور دن کی روشنی پر رات کی تاریکی نے سیاہ پردہ ڈال دیا تھا رشید ہنوز خاموش اور سراسیمہ آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے ہوئے پڑا تھا

ملازم اس کی آج کی خاموشی سے حیران تھے کئی مرتبہ بیرے نے دبی زبان سے کھانے اور چائے کی طیاری کی اطلاع دی مگر جواب نہ پاکر واپس چلا گیا ـــــ ٹن ٹن ...... ٹن ٹن ٹن ٹن ...... ٹن ٹن ٹن کلاک نے و بجائے جس کے ساتھ ہی رشید بھی چونک پڑا ...... ساری کوٹھی میں سکوت طاری تھا تمام ملازم سو چکے تھے۔ جب رشید کے دل نے بہت ملامت کی تو اٹھا وضو کیا اور صمیم قلب سے نماز پڑھ کر خدا کی درگاہ میں دو زانو ہو کر گڑ گڑا کر دعائیں مانگیں ـــــ اور جب وہاں سے اٹھا تو دل بہت کچھ ہلکا ہو چکا تھا۔ اس کے قدم خود بخود اٹھے اور رشید محل کی طرف چل دیا...... خدا معلوم وہ کونسی کشش تھی جو ان سے کشاں کشاں رشید محل کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی ـــــ !! مکان کے اندر پہونچکر اس کا ماتھا ٹھنکا...... تمام دروازے اس طرح کھلے ہوئے تھے گویا اس کی واپسی کا انتظار ہو رہا ہے۔ کمرہ کے اندر آہستہ آہستہ باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ثریا کے بیڈ روم میں روشنی کی شعاعیں کواڑوں کی درازوں اور سبز شیشوں کے اندر سے چھن چھن کر برآمدے میں پڑ رہی تھیں۔ کمرہ کے دروازہ پر پہونچکر رشید رک گیا۔ ...... اندر قدم رکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اس کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا ہے اور ایک ایک قدم من من بھر کا ہو گیا تھا جو اٹھانا مشکل تھا۔ دریچہ کا پردہ سرکا کر اس نے آہستہ سے اندر کی جانب جھانک کر دیکھا۔ دریچہ کے بالکل مقابل ثریا کی مسہری تھی...... جس پر وہ بزجبیں کا سہارا لیے بیٹھی تھی۔ نزجس کے ہاتھ میں دوا کا گلاس تھا جسکو وہ بہشت پلانیکی کوشش کر رہی تھی۔ رشید نے بغور دیکھا ـــــ اور اس کے منہ سے حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی ایک ہلکی سی آہ نکل گئی۔ ثریا...... بالکل مردہ معلوم ہو رہی تھی...... اس کا نازک گداز جسم ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا تھا۔ تھوڑے فاصلہ پر ثریا کی ماں قالین پر متفکر صورت بنائے بیٹھی تھی اور کرسی پر ثریا کے باپ ہاتھ میں اخبار لیے لیٹے تھے۔ ایک مختصر سی ساعت میں رشید نے سارے کمرہ کا جائزہ لے لیا...... آہ ...... اس نے اسکی خود غرضی اور سنگدلی نے کس قدر آدمیوں کو غمگین اور افسردہ بنا رکھا تھا...... اس وقت وہ اپنی نظروں میں خود ہی مجرم معلوم ہو رہا تھا۔ کمرہ کے اندر جانیکی بجائے وہ یہاں سے کسی نا معلوم

جگہ بھاگ جانے کا متمنی تھا اس میں اتنی طاقت نہ تھی اپنا منحوس چہرہ کسی دوسرے کو دکھائے عین اسی وقت پرجبیں کسی ضرورت سے باہر نکل پہلے تو ایک مرد کو اس طرح دیوار سے لگا ہوا کھڑا دیکھ کر وہ ڈر گئی..... مگر پھر فوراً ہی پہچان کر قریب آ گئی۔ "ہیں بھائی رشید صاحب" تعجب سے اس کے منہ سے کسی قدر زور سے نکلا اور ساتھ ہی اس کا شانہ پکڑ کر کمرے میں لے آئی۔ رشید ایک جسم بیجان کی طرح پرجبیں کے سہارے سے کمرہ میں پہونچ گیا۔ اسکی نظریں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں...... پرجبیں کے کہنے پر وہ بجائے کرسی کے ثریا کے پلنگ کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ پرجبیں نے ثریا کا شانہ ہلا کر آہستہ سے کہا۔ "دیکھو... پیاری ثریا..... رشید صاحب آ گئے ——" ثریا نے آنکھیں کھول کر دیکھا ایک سکنڈ کے اندر دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ ..... رشید صاحب نے جلدی سے اپنی مجرمانہ نظروں کو زمین کی طرف متوجہ کر لیا.....

ندامت سے اس وقت اس کے چہرہ پر انفعالی رنگ چھا رہا تھا اور جسم پر لرزہ طاری تھا ثریا کی نظریں برابر رشید کے اوپر گڑی ہوئی تھیں گو رشید اس کی جانب دیکھ نہیں رہا تھا مگر محسوس کر رہا تھا۔ ثریا کی نظریں برابر اس کے اوپر جمی ہوئی تھیں چند منٹ کے بعد اس نے نظریں اٹھا کر ثریا کی جانب دیکھا اس کا خیال تھا۔ وہ اب اس کو دل بھر کر دیکھ چکی ہوگی مگر ثریا برابر اسی کو دیکھ رہی تھی —— چہرہ پر ایک تمسخر خیز خفیف سا تبسم تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا خاموش زبان سے کہہ رہی ہے۔

دل خون گشتہ باقی ہے نہ پہلو میں دل اما بر
سکیب اس بیدادگر کو چارۂ غم کا خیال آیا

چند منٹ سکوت طاری رہا..... آخر یہی سکوت نالہ و بکا اور گریہ و زاری میں تبدیل ہو گیا یوں ہی رشید کی طرف تکتے تکتے..... ایک ہچکی آئی اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں!!!

سنتے ہیں کہ اب رشید کی حالت میں زمین اور آسمان کا فرق آ گیا ہے۔ ثریا کی موت اس کے لیے ناقابل برداشت صدمہ ثابت ہوئی۔ کثرت رنج نے اس کی حالت بالکل دیوانوں کی سی کر دی ہے اور اکثر وہ اپنے آپ کو دیوانہ وار "مجرم مجرم" "قاتل قاتل" وغیرہ وغیرہ الفاظ کہہ کہہ کر سینہ کوبی کیا کرتا ہے..... مگر آہ اب تو سب کچھ بے سود ہے کیوں کہ

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غزل

جناب نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی ناظم امور مذہبی سرکار عالی

دل بچے کیوں کر نگاہ ناز سے — الاماں اس تیر بے آواز سے
خفتہ بختوں کی بھی سن لینا ذرا — تم کو فرصت ہو جو خواب ناز سے
غنچہ چٹکیں گل ہنسیں اے باغباں — ہم کراہیں بھی دبی آواز سے
منہ میں اسکے پھر زباں گویا نہ تھی — جو ہوا آگاہ تیرے راز سے
صبح کو کلیاں چٹک کر مار کی — ان کو چونکاتی ہیں خواب ناز سے
یاد گیسو میں اسیروں کی فغاں — مل گئی زنجیر کی آواز سے
سیر گلشن سے ہے کام اے بیخودی — باز آئے ہم پر پرواز سے
ناز کرتا ہوں کہ ہے مجھ کو نیاز — ایک بے پروا سراپا ناز سے
حیف ہے تجھ کو نہ دیکھوں عمر بھر — آشنا ہو کر تری آواز سے
جی میں آتا ہے کہ بخت خفتہ کو — رو دیئے حسرت بھری آواز سے

شکر ہے اختر کہ اس حالت میں بھی
لوگ لیتے ہیں تمھیں اعزاز سے

چند ایسے خطوط جو پوسٹ نہیں کیے گیے

جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی

میں اپنا یہ مضمون ڈاک والوں کے نام معنون کرتا ہوں جو اکثر میرے خطوط پر ڈاکہ ڈالا کرتے ہیں اور جن کے خوف سے میں بہت سے خطوط پوسٹ نہیں کرتا۔ (س۔ب۔ح)

پہلا خط

اڈیٹر کے نام

مکرمی! تسلیم!

میں نے مزاح کی نفسیات پر بارہا غور کیا ہے اور اب ایک مدت سے مسلسل غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہندوستان میں صحیح معنوں میں کوئی مزاح نگار نہیں ہے بعضوں کو سوجھتی نہیں اور بعضوں کو سوجھتی ہے لیکن بوجھنا نہیں آتا۔ اسی وجہ سے میں نے اردو ادب کی اس کمزور صنف کو طاقت ور بنانے اور ظرافت کا انبار لگانے کی ٹھان لی ہے۔ مجھے اپنے وسیع مطالعہ پر اطمینان اور قلم پر اعتماد ہے کہ میں ظرافت کے بہترین نمونے پیش کرونگا۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر مضمون ہذا مرسل ہے اس میں آپ مزاح کے بہترین اور مکمل ترین نمونہ کی جھلک دیکھینگے اس عنوان کے تحت آپ کے ایک نام نہاد مزاح نگار نے بھی پہلے لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی کو پڑھ کر یہ مضمون لکھنے کا فکر ہوا۔ وہ مضمون اس قدر لغو تھا کہ لاحول ولا۔ تعجب ہے کہ لوگ ایسا گندہ اور فرسودہ مذاق اپنے دل و دماغ میں کیوں کر پرورش کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کو منظر عام پر لانیکی جرأت بھی کرتے ہیں اس پر طرہ یہ ہے کہ اڈیٹر صاحب اس کو شائع کرتے ہیں۔ واقعہ ہے کہ دنیا کا مذاق بگڑتا جاتا ہے۔ سچ جانئے کہ اس کو پڑھ کر مجھے اس درجہ کوفت ہوئی کہ فوراً قلم اٹھایا اور یہ مضمون لکھ ڈالا تاکہ سند رہے۔

میرا مضمون پڑھ کر آپ یقیناً خوش ہونگے اور محسوس کرینگے کہ اردو میں مزاح نگار اگر کوئی ہے تو وہ خاکسار ہے۔ آپ اس کو خودستائی نہ سمجھیں بلکہ غائر نظر ڈالکر واقعات

کی تاہ تک پہونچکر معلوم کریں کہ اس میں دلی اور لکھنو والوں سے زیادہ فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیے گئے ہیں اور شاعرانہ ترکیبوں کے انتخاب میں پنجاب والوں کو بھی مات کر دیا گیا ہے نگاریت نسی کی جھلک بھی ہے اور مہاشہ سدرشن کا طرز بھی گورکھپور کے مجنوں کا انداز بھی اور ایبٹ آباد کے ادیبانہ اسلوب بھی۔ ابوالکلام کا آزاد طرز نگارش بھی اور ظفر علیخاں کا زمیندارانہ طریقہ کار بھی۔ انقلاب کا مسلک بھی۔ اور سرتیج کی شوکت تحریر بھی۔ غرض ان سب دریاؤں کو میں نے اپنے اسٹائل کے کوزہ میں بھر لیا ہے۔ ان کی ساری خرابیوں کو علیحدہ کر کے خوبیوں کو چن لیا ہے۔ کیوں کہ بزرگوں نے کہا ہے خذ ما صفا دع ما کدر اور پھر لطف یہ کہ جدت کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا۔ مختصر یہ کہ اپنے دماغ کی بلند پروازیوں اور دل کی گہرائیوں سے اس طرح دن دھاڑے فائدہ اٹھایا ہے کہ باید و شاید۔

سالنامہ میں میرے مضمون کو نمایاں جگہ دیجئے اور معاوضہ کی رقم فی صفحہ دس روپیہ کے حساب سے روانہ فرمایئے تاکہ میں صرف آپ ہی کے رسالہ میں لکھا کروں ورنہ قلم میرا لنگ نیست اور پرچہ ہائے ادب تنگ نیست۔ سب کام چھوڑ کر فوراً جواب دیجئے ورنہ میں دوسرے رسائل سے معاملہ طے کر لونگا اور آپکا بعد میں کف افسوس ملنا بے سود ہوگا

جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

آپ شاید میری تصویر کے لیے اصرار کریں کہ اسکے متعلق کہنا یہ ہے کہ پہلے آپ مصور کی اجرت میرے ہاں پیشگی بھیج دیجئے تاکہ میں حسب دلخواہ تصویر کھچوا کر روانہ کروں اور ہاں بلاک نہایت عمدہ بنوائیگا۔ اور دو چار سو تصویریں چھپوا کر میرے ہاں روانہ کر دیجئے تاکہ میں اپنے دوست احباب میں تقسیم کروں۔

خط بیرنگ بھیج رہا ہوں لے لیجئے آیندہ اگر آپ چاہیں کہ میں ٹکٹ چسپاں کر کے خط بھیجا کروں تو ہر مہینہ دو چار روپیہ کے ٹکٹ روانہ کر دیجئے۔

میرے نام دو رسالے مفت جاری کیجئے۔ اور میرے دس پانچ دوست احباب کے پتے بھیجتا ہوں ان کے نام بھی پرچے مفت بھیجا کیجئے۔ خیال رکھئے مر یہ سب کچھ آپ ہی کے فائدہ کے لیے ہے۔

باقی وقت ضرورت۔ والسلام

یہ خط میں نے پوسٹ نہیں کیا بلکہ جو خط پوسٹ کیا گیا وہ حسب ذیل تھا۔

محترمی و معظمی! اسلام مسنون و نیاز مشحون۔

میں آپ کے رسالہ سے غائبانہ عقیدت رکھتا ہوں اور اسکی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوں۔ ہر آن اسکی توسیع اشاعت کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ فی الحال پچاس خریدار دے رہا ہوں انشاءاللہ عرصہ قلیل میں بے حساب خریدار دونگا۔ اشتہارات وغیرہ کے لئے بھی لوگوں سے کہا ہے والد صاحب قبلہ بھی خریدار رہیں اور بھائی صاحب بھی سال بھر کا چندہ مع سالنامہ و عید نمبر کے منی آرڈر کر رہا ہوں میرا نام بھی خریداروں میں لکھ لیجئے۔

مضمون بھیج رہا ہوں۔ مزاح نگاروں کو منہ چڑھانا ہے۔ پہلی کوشش ہے اس لیے بے ساختہ منظر عام پر لانے سے جھجکتا ہوں۔ انشائی غلطیوں کو درست کر لیجئے اور سالنامہ میں نہیں بلکہ کسی معمولی نمبر کے ایک آدھ گوشہ میں جگہ دیجئے تو سمجھونگا محنت ٹھکانے لگی۔

میں یہ مضمون ٹائپ کروا چکا تھا کہ دفعتاً مجھے آپ کا وہ پرچہ ملا جس میں اسی عنوان سے ایک مزاحیہ مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مضمون مزاح نگاری کی جان ہے اور ایک بہترین کہنہ مشق ادیب کی فکر رسا کا نتیجہ۔ اسی وجہ سے میں نے خیال کیا کہ اپنے مضمون کو آتشدان کے سپرد کر دوں لیکن آپ کے اس اعلان نے کہ رسالہ کے صفحات جہاں کہنہ مشق ادیبوں کے لیے کھلے رہیں گے وہاں نو مشق مضمون نگاروں کے حوصلے بلند کرینگے میری ہمت بڑھا دی اور میں جرأت رندانہ سے کام لیکر یہ مضمون بھیج رہا ہوں کہ شاید آپ ایک مبتدی کی ہمت بڑھا کر اسے ہمیشہ کے لیے رہین منت کریں گے۔

مضمون بذریعہ رجسٹری مرسل ہے اور جواب کے لیے ٹکٹ بھی حاضر ہیں فقط

خاکپائے مضمون نگاران

دوسرا خط

مدیرہ کے نام

بہن تسلیم!

رسالہ پہونچا اور باعث سوہان روح ہوا۔ رسالہ سے زیادہ مضمون کے تقاضہ کا خط تکلیف دہ

حقیقت یہ ہے کہ میں نے عرصہ دراز سے مضمون لکھنا چھوڑ دیا ہے اس قدر عدیم الفرصت ہوں کہ رسالے پڑھنا تو درکنار خطوط کے جواب بھی وقت پر دینا بار ہے۔ خدا معلوم آپ کو یہ خط کیسے لکھ رہا ہوں۔ امید کہ آپ میری کثرت کار پر نظر رکھتے ہوئے آئندہ مضمون کا تقاضہ نہ فرمائیں گی۔ جی چاہے تو رسالہ مفت بھیج دیا کیجئے۔ کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اخلاقاً بھی اس کے معاوضہ میں مضمون کی توقع بیکار ہے۔ رہا توسیع اشاعت اور فراہمی مضامین کا سوال سو وہ بیکار ہے کیوں کہ جب مجھے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ ایک آدھ خط ہی لکھ ماروں تو بھلا دوست احباب سے مضامین لینا اور توسیع اشاعت کی کوشش کرنا کہاں؟

آپ نے جو مشورہ طلب کیا ہے اس کے بارہ میں عرض ہے کہ موجودہ کاروبار کی سرد بازاری کا لحاظ رکھتے ہوئے اور مضمون نگاروں کے معاوضے کے تقاضہ کا خیال کرتے ہوئے بہتر یہی ہے کہ آپ رسالہ موقوف کردیں۔ عمدہ مضامین حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں معاوضہ الگ دینا پڑیگا اور خوشامد علٰحدہ کرنی پڑیگی اگر آپ ان دشواریوں کا مردانہ وار (عورت ہو کر بھی) مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہیں تو بسم اللہ لنگر توڑ ڈالیے اور اپنے رسالہ کی کشتی منجدھار میں ڈالدیجئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حیدرآباد میں رسائل ہزاروں کی تعداد میں بکتے ہیں اور بہترین ادیبوں کی ایک بڑی جماعت آسانی سے فراہم ہوسکتی ہے لیکن آج کل کی گرمیوں نے میرا حال پتلا کر رکھا ہے اور اس پر عدیم الفرصتی طرہ ہے بس فی الحال اس سے زیادہ لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ ہاں آپنے جواب کے لیے ٹکٹ بھی نہ بھیجا۔

والسلام۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ میں نے یہ خط کیوں پوسٹ کیا اور حسب ذیل خط کیوں لکھا؟ آپ کو کیا مجھے خود بھی تعجب ہے۔

پیاری بہن! خوش رہو۔

کل خط ملا اور رسالہ پہونچا۔ شکریہ۔ سچ جانئے ہم رسالہ دیکھ کر اس درجہ خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر۔ اردو ادب کی خدمت کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ خصوصاً آپ جیسی شاعرہ

کے لیے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ خیال نہیں ہو سکتا۔ پہلا پرچہ ہی سراپا نور ہے اور ادبی سانچہ میں ڈھلا ہے ـــــ خدا نظر بد سے بچائے ـــــ مضامین تصاویر ٹائیٹل غرض ہر چیز عمدہ مذاق کی گواہی دے رہی ہے خصوصاً آپ کی نظمیں کیا کہوں بے خود کر رہی ہیں۔ سینکڑوں دفعہ انھیں پڑھا اور ہزاروں مرتبہ انہیں گنگنایا۔

میرا مضمون آپ نے مانگا ہے ـــــ زہے نصیب ـــــ میں کس قابل ہوں یوں ہی لشٹم پشٹم لکھ لیتا ہوں۔ اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے نہیں۔ بہرحال آپ اگر اس ناچیز کو کسی قابل سمجھتی ہیں تو ذرہ نوازی سے آپ کے حکم کی تعمیل میں نہ صرف اپنا بلکہ اپنے قلم کا بھی سر نیچا کرتا ہوں۔ مضمون بھیج رہا ہوں۔ رات کی رات میں لکھا ہے۔ انشاء اللہ آج دوسرا بھی لکھونگا۔ دوست احباب سے بھی عمدہ مضامین حاصل کرنیکا حتمی وعدہ کرتا ہوں۔ کل دن بھر دھوپ کو چاندنی سمجھ کر بامشکل پرپھیرتا رہا۔ یہاں اور وہاں بالآخر متعدد مشہور شاعروں اور ادیبوں سے نظمیں اور مضامین کا وعدہ لیکر لوٹا۔ انشاء اللہ دو ایک روز میں اسی طرح تگ و دو کے بعد آسانی سے بہت سے مضامین حاصل کر لونگا۔

یقین رکھیئے توسیع اشاعت کے لیے بھی جان توڑ کوشش کر رہا ہوں۔ پرچہ جو آپ نے میرے نام بھیجا ہے اسے دکھا دکھا کر تاجروں سے اشتہار کا وعدہ لیا۔ مضمون نگاروں کو مضامین لکھنے پر ابھارا اور شعراء کو شعر کہنے پر اکسایا۔ غرض وہ سب کچھ کیا اور کرنے کے لیے تیار ہوں جو امکان میں ہے۔

مضامین کے معاوضہ کے متعلق کچھ فکر نہ کیجیے کیوں کہ میں نے بغیر معاوضہ کے ہی لوگوں کو راضی کیا ہے اپنی خوشامد سو اس کا میں ذمہ دار۔ اور ہاں اگر آپ کے ہاں سٹاف کافی نہیں ہے تو میں تھوڑی بہت حسب ضرورت مدد کر سکتا ہوں۔ بہرحال آپ کسی چیز کی فکر نہ کریں بلکہ دیکھیں کہ میں سب کچھ کس طرح مہیا کرتا ہوں۔

زیادہ محنت نہ کیا کیجیے کیوں کہ صحت پر اثر پڑنیکا امکان ہے خصوصاً بڑی رات تک کاپیوں کی صحت اور مضامین کی درستی کا خیال نہ کیجیے۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں ان کا خیال مقدم ہے۔ بس اتنا کیجیے ہر روز ایک خط اپنی صحت کے متعلق لکھ دیا کیجیے۔ صحت گانی کی

ضرورت نہیں بیرنگ ہی لکھیئے۔
آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے انشاء اللہ عنقریب حاضر خدمت ہو کر بالمشافہ رسالہ کے کاروبار پر تبادلہ خیال کرونگا۔ فی الحال اپنی تصویر بھیج رہا ہوں اور امید کر رہا ہوں کہ آپ بھی اپنی کوئی تازہ ترین تصویر بھیجکر ممنون فرمائینگی فقط

آپکا

بوالیسی ڈاک اپنی خیر وعافیت سے ضرور مطلع فرمائیے طبیعت بے چین رہیگی۔

خدا حافظ

آپکا

قابل توجہ ابتدائے اشاعت سے بارہا عرض کیا گیا ہے کہ پرچہ وقت پر نہ ملے تو براہ مہربانی مقامی ڈاکخانہ سے دریافت فرمائیے پھر ہمیں مطلع کیجئے کہ مکرر پرچہ روانہ کر دیں۔ آپ اس قدر زحمت برداشت نہیں فرمانا چاہتے اور دو مہینہ کے بعد تحریر فرماتے ہیں فلاں فلاں مہینوں کے پرچے غیر وصول ہیں بھیجدے جائیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اس قدر مدت کے بعد پرچے کہاں باقی رہیں گے جو آپ کے فرمائش کی تکمیل کر سکیں۔ ہم جناب ناظم صاحب کو توجہ دلا رہے ہیں کیا عجب کہ مستقل قریب میں اس کا کافی انتظام ہو جائے۔ اس لیے براہ مہربانی آیندہ ایسا تساہل نہ فرمائیے جس کے سبب شہاب کی بیگناہی پر حرف آئے۔

جب آپ خریدار ہیں چندہ عنایت فرماتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پرچہ پابندی سے ارسال خدمت نہ ہو۔ لہٰذا یہ یاد رکھیے اور فوراً مقامی ڈاکخانہ سے استفسار کرنے کے بعد ہمیں لکھیئے۔

ہم واقف ہیں کہ آپ کے مصروفیتیں بڑھی ہوئی ہیں لیکن انہیں مصروفیتوں میں دو حرفی اطلاع کے لیے اتنا وقت درکار نہ ہوگا کہ آپ کے دوسرے کاروبار معطل ہو سکیں۔

اس کا انتظام کر لیا گیا ہے کہ آیندہ سے جو شکایتی خطوط وصول ہوں گے وہ براہ راست جناب ناظم صاحب ٹپہ کی خدمت میں بھیجدیے جائیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح سے ڈاکخانہ کی ستم ظریفی کا ارتفاع ہو جائے۔

اگر آپ کو شہاب کی ترقی کا کچھ بھی خیال ہے تو اس ماہ میں دو ایک خریدار اپنے پرچہ کو بھیجدیجئے گا۔

رباعیات

(جناب شبیر حسین خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی)

ہر عکس رخ یار ہے میرے دل میں
ہر سانس چمن راز ہے میرے دل میں
جو سینۂ کائنات میں ہے خفتہ
وہ زمزمہ بیدار ہے میرے دل میں

یہ لمحۂ خوش رسیدہ آہو تو نہیں
اس عیش میں کوئی غم کا پہلو تو نہیں
آنکھوں میں ہے پھر شرار عشرت غلطاں
ڈرتا ہوں کہ ان میں آنسو تو نہیں

دل ہوتا ہے روبراہ گاہے گاہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے کہیں خودی نہ بن جائے خدا
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

ہے مہد سے تا لحد برابر بچپن
صرف اتنا ہٹا ہوا ہے پیری کا چلن
نام اپنے کھلونوں کے بدل دیتے ہیں
اطفال بزرگ یعنی پیران کہن

مکتوبات جمیل

نگاہ قہر سے دیکھا یہی غنیمت ہے؟
ہمیں تو آپ سے امید التفات رہی تھی

محبت نامہ ملا۔ مگر خزاں کے پتے کی طرح اداس اور پژمردہ کسی شکستہ دل کی آرزو کی طرح پامال اور پریشان۔ اس شعر کو پڑھ کر خاموش رہجاتی ہوں۔

آپ زندگی کو پھر سمجھتی کیا ہیں؟ کشمکش کے دوسرے معنی زندگی کے ہیں پھر اس گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ؟

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنیکی خو کرلے

میں نے جواب دیر سے دیا تو اور بھی اچھا کیا۔ دیر سے دینے میں بڑا لطف ہے۔ ایک تو یہ کہ بہت سا مضمون لکھنے کو ملجاتا ہے۔ دوسرے دیر کی تلافی کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کر گذرتا ہو —— مگر اس کے باوجود آپ ہمیشہ میرے خطوط کے جواب جلد دیدیا کریں۔ کیوں کہ انتظار مجھے بڑا برا معلوم ہوتا ہے۔

انسان کا مستقبل ایک ایسا عجیب و غریب خواب ہے جسکی تعبیر قبل از وقت نہیں کی جاسکتی

مجھ سے وہ پوچھتے ہیں قسمت آیندہ مری
خواب نادیدہ کی کہنی پڑتی تعبیر مجھے

میں اور نگاہ قہر؟ وہ دوسرے لوگ ہیں جن پر نگاہ قہر ڈالی جاتی ہے ...... کی بیوفائی کسوٹی رہی ہے۔ خدا کرے ان کو بھی کوئی بیوفا خط کا جواب ترسا ترسا کر

دے پھر بیگم صاحبہ پر خوب گزریگی۔

جو چلاتا ہے کسی کو وہ بھی جلتا ہے ضرور

.... سے نہ کہیئے کہ ان کی طوطا چشمی اور بیوفائی کی قدردان ہوں۔ ع
باوفا انکو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم۔ آہ! ابر و بہار کا ذکر کرکے میرے ساغر کو چھلکا دیا۔
آہ! میرے گذرے ہوئے خواب پھر یاد آ گئے۔!

خدا سے میری دعا ہے کہ وہ آپ کو اطمینان قلب عطا فرمائے!! آیندہ آپکا ارادہ کیا ہے؟ آپ آخر کیا تصفیہ کرینگی؟ اپنی زندگی کے اس دور کو کیا یونہی ختم کر دینا چاہتی ہیں؟

آہ! انقلاب!! مگر مجبوریاں بھی زندگی میں کیسی عجیب ہوتی ہیں۔ آپ مجھے مفصل لکھئے زندگی کس قدر مشکل مسئلہ ہے! مجھ جیسی رومانوی عورت کے لیے تو زندگی اور اسکی کشمکش عجب عذاب ہے۔ جب میں اسکی فلاسفی پر کسی تنہا اور تاریک رات غور کرتی ہوں تو دل آمادۂ صحرا ہو جاتا ہے اور خود بخود وہ اشعار میرے ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں جو اس وقت اچھی طرح یاد نہیں مگر کبھی تھے۔

اکثر شب تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
"میرے دل صد چاک پر"

اس وقت دل پریشان ہو گیا ہے۔ لکھنے نہیں چاہتا۔ سب تو سب میں آپکے خوبصورت پیارے عید کارڈ کا کس قلم کس زباں اور کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں؟

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
آمین

آپ کا عید کارڈ جس وقت آیا ہم سب کے سب میز پر بیٹھے تھے۔ میرے بھائی کو آپ کی جدید وضع کی مبارکباد اور نئے وضع کا کارڈ بہت پسند آیا۔

ہم پیامی کو یہ دے دے کے قسم پوچھتے ہیں
پوچھتے ہیں ہمیں وہ بھی جنھیں ہم پوچھتے ہیں؟

آہ! آپ زندگی کا نام ہی کیوں لیتی ہیں؟ ع "زندگی نام ہے چھوٹا مگر دشوار ہے"
میں آج تک نہ سمجھ سکی "زندگی کیا ہے؟" "زندگی" آپ زندگی کے واقعات کو یاد کر کے
غمگین ہوتی ہیں میں صرف اس کا نام ہی سنکر لرز جاتی ہوں۔ مجھے دوسروں پر تعجب ہوتا ہے!
وہ کس خوش اسلوبی اور اطمینان سے زندگی کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں! کسی بدقسمت نے
میرے آٹوگراف میں لکھا ہے۔

زندگی در گردنم افتاد باید زیستن
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

اچھا ہے۔ اگر اس کا نام ہی نہ لیا جائے! یہ ایک کھلونا ہے شکستہ! ایک خواب ہے پریشاں
اور اک کہانی ہے بے لطف۔ زندگی کی نسبت کس قدر موثر کوٹیشن ہے۔

The most inportant thing in life to laen is how to live.

ہمارے

دلی شکریہ کے مستحق ہیں جناب قاضی مولوی زین العابدین صاحب اول تعلقدار
آصف آباد جناب مولوی احمد محی الدین صاحب اول تعلقدار عثمان آباد جناب مولوی
آغا شیخ علی رضا صاحب دوم تعلقدار جینور۔ جناب مولوی سید اعظم اللہ حسینی صاحب اظہر
جاگیردار وکیل۔ سید محمد ہادی صاحب جعفری طالب علم جنھوں نے مزید خریدار بھجوا کر
ہماری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ اسی طرح دوسرے حضرات توجہ فرمائیں تو ممالک محروسہ میں
آٹھ دس ہزار خریدار رسالہ کا فراہم ہو جانا کوئی مشکل امر نہیں آپ توجہ فرمائیں پھر دیکھئے
"انداز گل افشانی گفتار"

خطاب بہ علامہ ڈاکٹر سر اقبال

حضرت ساقی

خدا نے بخشا ہے وہ عز و افتخار تجھے — میرا اسلام بھی لینا ہے ننگ عار تجھے
مری مجال کہ میں تجھ کو خط شوق لکھوں — جواب نامہ کی زحمت دے ہرزہ کار تجھے
اگرچہ میں عبث ہیچکارہ ہوں لیکن — کیا ہے حق نے تو ذی خلق و ذی وقار تجھے
جواب کا مجھے کس حق پہ ہو گلہ تجھ سے — کریگا لطف و کرم تیرا شرمسار تجھے
فدا ہے دل سے تو اسلام پر بھلا کیوں کر — پسند آئیگی تحقیر خاکسار تجھے
رسول پاک کی الفت سے ہے تو سرفراز — کیا ہے عشق محمدؐ نے کامگار تجھے
میں تیری مدح کروں یہ بھلا مری قدرت — کرے صحیح مخاطب گنہگار تجھے
اسی کے نام پہ میں بھی ہوں جان و دل سے فدا — کیا ہے جسکی محبت نے بے قرار تجھے
اسی شراب سے ہوں مست میں بھی اے اقبال — کیا ہے کیف نے جس کی میگسار تجھے
برائے نام اسی میکدہ کا ہوں ساقی — پکارتے ہیں جہاں رند ہوشیار تجھے

پپیہا

(جناب مرزا سلیم بیگ صاحب)

پپیہا ہندوستان کا مشہور پرندہ ہے۔ بچہ۔ بوڑھا۔ ادنیٰ و اعلیٰ سب اس کے نام سے واقف ہیں۔ ہندوستان کے ہر شخص کو معلوم ہے کہ پپیہا کی کیا آواز ہے اور اس میں کیا درد ہے۔ لاکھوں اشعار سینکڑوں گیت اسکی آواز اور اس کی درد بھری پی پی سے منسوب کیے گئے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے پپیہے کو دیکھا ہے یا وہ اس کے رنگ و وضع صورت و شمائل سے واقف ہیں سندھ اور پنجاب کے علاوہ تمام ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ پھر بھی ہر ہندوستانی اس سے واقف نہیں ہے کیوں کہ بغیر کوشش کے یہ کبھی نظر نہیں آتا اور ہمیشہ پتوں کے جھنڈ میں بیٹھتا ہے۔ جوڑا ایک جگہ شاذ ہی ملتا ہے۔ سیلون۔ برما اور جاوا میں بھی ہوتا ہے مگر کہیں قد و قامت میں فرق ہے۔ کہیں ذرا ذرا سا رنگوں میں اختلاف ہے۔ کسی جگہ پپیہے کی چونچ نارنجی ہوتی ہے اور کسی جگہ سرخ۔ کسی کی ٹانگیں اور پنجے زرد ہوتے ہیں اور کسی قسم کے سبزی مائل بھورے ہوتے ہیں۔

ہندوستان یا یوں کہیئے کہ ہندی کے شاعر کا پپیہا کوئل سے ذرا چھوٹا اور تقریباً قمری کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے اوپر کے پر سرمئی۔ بازو ہلکے بھورے۔ دم کے اوپر کے پر دم کے کنارے زیادہ چوڑے اور کناروں پر ہلکی سفید دھاری ہوتی ہے۔ چونچ کے پاس سے نتھنوں تک ہلکی سفید لکیر۔ کان۔ ٹھوڑی اور رخسار بھورے۔ حلق زیادہ سفید۔ سینہ اور گردن کے اوپر تک کا حصہ سرخی مائل بھورا۔ پیٹ سفید ہوتا ہے۔ آنکھیں نارنجی اور انکا حلقہ زرد۔

چونچ زردی مائل زرد اور نوک کالی ہوتی ہے پنجے اور پاؤں نارنجی ہوتے ہیں۔ پپیہے کے بچے جو گھونسلوں سے نکل کر پرنہ کر چکے ہوں ان پر سفید چتیاں اور دم بڑی مگر سرخ ہوتی ہے دم کے نیچے حصہ میں بھوری سیاہی مائل چتیاں ہو جاتی ہیں۔

پپیہا ہر موسم میں ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ہی رہتا ہے اور ہندوستان ہی میں گھونسلا بنا کر انڈے دیتا ہے۔ انڈے بچوں کے زمانہ میں پپیہا ہر وقت بولتا رہتا ہے اور ہر لحظ اسکی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ تھک جاتا ہے اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر بولنا شروع کر دیتا ہے اس کی آواز صاف صاف پی۔ پی آہ سمجھ میں آتی ہے اسی کو عشاق اپنے شیون سے تعبیر کرتے ہیں اسی کو ہندی کا شاعر لکھتا ہے ۔ ع

اس کی آواز تیز اور درد بھری ہوتی ہے جو ہجرت نصیب عشاق کو متوجہ کر لیتی ہے گھنے درختوں سایہ دار جھاڑیوں میں رہتا ہے ایسی ہی جگہ گھونسلا بناتا ہے۔ بعض اوقات اس کے انڈے کوئل کوا اور کستورہ کے گھونسلے میں بھی پائے گئے ہیں اس کا انڈا وزن میں بھاری سخت اور چھلکا موٹا ہوتا ہے نیلا اور بھورا رنگ اس کے انڈوں پر جھلکتا ہے۔ انڈا چکنا تو ہوتا ہے مگر چمکدار کم ہوتا ہے۔ ایک گھونسلے میں دو تین جوڑے بھی انڈے دیتے ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دو جوڑے ملکر گھونسلا بنا لیتے ہیں یا کسی تیار گھونسلے میں انڈے دیدیتے ہیں۔

جب کوئی جوڑا انڈے سینے بیٹھ جاتا ہے تو دوسرے جوڑے اس گھونسلے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ مادہ جب ایک بچہ نکال لیتی ہے تو باقی انڈوں کو پھینکدیتی ہے اگر اتفاق سے انڈے پھینکنے سے قبل کوئی اور بچہ بھی انڈوں میں سے نکل آئے تو ایسے نوزائیدہ بچہ کو بھی انڈوں کے ساتھ ہی پھینک کر صرف ایک ہی بچہ کو پرورش کرتی ہے۔ یہی بچہ سب میں طاقتور اور عمدہ ہوتا ہے بعض کا خیال ہے کہ مادہ اپنے بچوں میں سے ایک بچہ پسند کر کے رکھ لیتی ہے اور دوسرے بچوں اور انڈوں کو پھینکدیتی ہے۔ چھوٹے کیڑے نرم اور خوش ذائقہ پھل اسکی غذا ہے چاندنی راتوں میں مسلسل بولتا ہے۔ نر عموماً باغ اور گھنے اور ٹھنڈے جنگلوں میں رہنا پسند کرتا ہے انڈے بچوں کے زمانہ میں خوب بولتا ہے اور اس کے بعد خاموش ہو جاتا ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پپیہا ہندوستان سے باہر چلا جاتا ہے حالانکہ وہ ہمیشہ ہندوستان ہی میں رہتا ہے یہ بہت تیز پرواز پرندہ ہے ایک جگہ سے اڑ کر فوراً دوسری جگہ نہایت

سبک روی سے چلا جاتا ہے۔

عام طور پر ہندوستان میں ماہ مئی اور جون مغربی جنوبی ہند اور شمالی وسط ہند میں ماہ اپریل اور بہار و بنگال میں ماہ مارچ اس کے انڈوں کا زمانہ ہے۔ ہمالیہ کے دامن اور ...۳۰ ہزار فٹ کی بلندی تک اس کے انڈے ماہ مئی اور جون میں دیکھے گئے ہیں اور یہی زمانہ اس کا انڈے بچوں کا عام زمانہ ہے ایسے موسم میں شوقین اس کے بچوں کو حاصل کرتے اور پالتے ہیں۔ جوان ہو کر بڑا خوبصورت پرندہ ہو جاتا ہے۔ انسان سے بہت مانوس ہو جاتا اور فصل پر خوب بولتا ہے۔ چنے کا پسا ہوا آٹا گھی اور گردے وغیرہ ملا کر اس کو کھلاتے ہیں میوہ بھی دیا جاتا ہے اس کے بچوں کو تیا بجا کر بولنا بھی سکھاتے ہیں۔ ایسے تیار کیے ہوئے پرند معقول قیمتوں پر فروخت ہوتے ہیں۔ جوڑا اگر اس خیال سے پالا جائے کہ گھر میں انسانوں میں رہ کر انڈے بچے دے تو اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوتی۔

انتظار

جناب معظم گل صاحبہ

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے نیم کش کو..........

آہ کیا پیارا لفظ ہے...... انتظار...... کاش تم نہ آتے..... کیسی لطیف اور روح نواز گھڑیاں تھیں..... جب میں تمہارا انتظار کر رہی تھی!! آہ وہ سوز و گداز۔ وہ چبھن و خلش جس میں تمہاری یاد مضمر تھی۔ انتظار کی گھڑیاں..... کوئی مجھ سے پوچھے ..... ہاں ایک دلگداز اضطراب۔ ایک بے تاب لطف۔ اے کاش میں پھر انتظار کروں۔

خدا کرے کہ وہی بے چینی پھر ایکبار دل کو نصیب ہو اور وہی خاموشی اور گھبراہٹ آنکھوں کو۔ دل پھر اسی طرح دھڑکے اور نگاہیں اسی طرح پھر بیرونی در کا طواف کرتی رہیں واے کیسا دلفریب منظر ہوتا ہے۔ منتظر آنکھ نگاہ لیلیٰ سے زیادہ حسین اور دل منتظر قلب قیس سے زیادہ مضطرب ہوتا ہے۔ اے کاش وہی لطف دوبارہ میسر ہو اور خدا کرے میں پھر انتظار کی کشمکش میں مبتلا ہو جاؤں۔

نعت

(جناب محمد کاظم علیخاں صاحب بی۔ اے دوم تعلقدار)

حبیب کبریا ہو رحمت اللعالمیں تم ہو نبوت ناز کرتی ہے کہ ختم المرسلیں تم ہو
شب معراج جانیکا کھلا آخر سبب ہم پہ جہاں میں ایک ہی زینت دہ عرش بریں تم ہو
نہ ہوتے تم نہ کرتا حق زمین آسمان پیدا شہ لولاک ہو شاہنشہ دنیا و دیں تم ہو
رہا اسلام تک محدود کب فیض رسول اللہ خدا خود کہہ رہا ہے رحمت اللعالمیں تم ہو
مزمل اور مدثر طٰہٰ یٰسین سے مخاطب ہو حبیب خاص ہو ممدوح قرآن مبیں تم ہو
کسے یہ رتبہ ملا ہے۔ قاب و قوسین ہاتھ آیا ہیں جہاں معبود ہی معبود ہو سجا ہا میں تم ہو
ہوئے منسوخ سب ادیان کاظم دین احمد سے خدا شاہد ہے فخر انبیاء و مرسلیں تم ہو

جوانی دیوانی

جناب غلام ربانی صاحب

بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا انسانی زندگی کی مختلف حالتوں کے نام ہیں جن سے انسان کے جسمانی نشو ونما دماغی کیفیت اور کردار کا پتہ چلتا ہے لیکن زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ان تمام حالتوں سے جدا ہے یہ ۱۸ سال سے ۲۱ سال کے قریب قریب کا زمانہ ہوتا ہے۔ اگرچہ سن بلوغ عنفوان شباب آغاز جوانی وغیرہ مختلف ناموں سے اس عمر کو تعبیر کیا جاتا ہے لیکن دراصل اسکی خصوصیات کے لحاظ سے اس سن کا کوئی نام نہیں ہے۔ شعرا نے اس پر بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے لیکن انھوں نے صرف ایک رخ کو بیان کیا ہے اور اظہار خیال میں سب کے سب ایک ہی استاد کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں

یہ ایک دور شادمانی ہوتا ہے جس میں انسان خود خوش رہتا ہے اور دوسرے کو بھی خوش سمجھتا ہے یہ زنگی کا خواب ہے کہ ہر وقت انسان خوش آیند خیالات میں محو رہتا ہے الجھن سے بچتا اور جھمیلے کے کاموں سے دور رہنا چاہتا ہے۔ رات کو نیند آنے سے پہلے کچھ اس قسم کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے ہیں کاش کہیں سے الہ دین کا چراغ ہاتھ لگ جائے، کوئی ایسی طلسمی طاقت حاصل ہو جائے کہ اس سے فوق العادت کام ظاہر ہو سکے۔ غرض وہ اپنے خیالات میں اس قدر مگن رہتا ہے کہ فکر و اندیشہ اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ حتی کہ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھتا ہے۔ شہر میں کیسی ہی سخت وبا پھیلی ہوئی ہو مگر اس کو ذرا تشویش نہیں ہوتی۔ اس کے خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ کبھی بچپن میں

اس قدر عاجز اور کمزور تھا کہ مشکل سے گھٹنوں کے بل چلا کرتا تھا۔ اس کے نزدیک بوڑھے اور ضعیف لوگ ہمیشہ سے ایسے ہی کمزور و ناتوان تھے۔ نوجوان حسین عورتیں اس کے خیال میں ہمیشہ ایسی ہی حسین رہینگی۔

حالانکہ نوجوانی بجائے خود حسن کی دلیل ہے لیکن اس زمانہ میں لباس اور بناؤ سنگار کا بہت خیال رہتا ہے۔ چال ڈھال میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے۔ قدم زمین پر اس قدر وزنی پڑتا ہے گویا کشش زمین میں کسی قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ ان میں جو لوگ ہاتھ پاؤں کے ذرا مضبوط ہوتے ہیں وہ بازوؤں کو پھیلائے ہوئے سینہ تان کر چلتے ہیں بعض بانکپن کے ساتھ جھومتے جھامتے بازاروں میں سے اس طرح گذرتے ہیں گویا سب لوگ انہی کو دیکھ رہے ہیں۔

ان سے زیادہ دلچسپ وہ نوجوان ہوتے ہیں جو ابھی کسی جامعہ کی سندلے کر نکلے ہیں یا ایک آدھ سال میں فارغ التحصیل ہونے والے ہیں ان کی چال میں وہ البیلاپن نہیں ہوتا بلکہ ایک قسم کا وقار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ "نظریہ اضافیت" پر غور کرتے چلے جا رہے ہیں۔ نوجوان ہوتے ہیں مگر سن رسیدہ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو بڑی متانت سے، گویا ایک ایک لفظ دماغ سے اتار رہے ہیں۔ انکا کوئی نصب العین نہیں ہوتا، کسی کام کو استقلال کے ساتھ پورا نہیں کرتے۔ جو کام ان سے ہو جائے وہی کرنیوالے تھے جدھر نکل گئے اسی طرف جانے والے تھے یہ سوچتے بہت ہیں مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہونچتے چونکہ انھوں نے قدیم علما فلاسفہ کے اصول و اقوال کو پڑھا ہے اور انکی سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا ہے اس لیے ان کے اصول بھی بہت ہوتے ہیں اور ان پر عمل کرنا بھی چاہتے ہیں مگر یہ دنیا محض علماء و حکماء کا مسکن نہیں ہے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے اور بات بات پر تلخ تجربہ اٹھاتے ہیں۔

پرانی طرز کے تعلیم یافتہ لوگوں کو یہ کچھ تعلیم یافتہ نہیں سمجھتے قدیم رسم و رواج اور طرز معاشرت سے ان کو نفرت ہوتی ہے حتی کہ شادی کرنا بھی ان کے نزدیک کوئی دانشمندانہ فعل نہیں۔ بچوں سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور جو لوگ ان کے سامنے چھوٹے بچوں سے تتلا تتلا کر باتیں کیا کرتے ہیں اس لیے کہ مضحکہ خیز ہوتے ہیں شادی سے پرہیز کرنے والے نوجوانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے لیکن انکا یہ سنیاس کسی اصول کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ اپنی مالی مشکلات سے دب کر قدرت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ شادی کے ذکر سے ان کو بڑی دلچسپی

ہوتی ہے مگر بیوی بچوں کی ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں ایسے نوجوانوں کو دیکھنے دکھانے کا بہت شوق ہوتا ہے اور یہ طبقہ سماج کے لیے خطرناک ہوتا رہتا ہے۔

انگریزی اخبار پڑھنا، انگریزی میں خط لکھنا انگریزی میں بات کرنا، انگریزی کی طرح رہنا غرض کہ انگریزی مذاق پیدا کرنا انکا پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے نمود و نمایش کا شوق اس قدر ہوجاتا ہے کہ تمام زندگی مصنوعی ہوجاتی ہے لیکن یہ کچھ تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی کا قصور نہیں ہے اس عمر میں تقریبًا ہر شخص مراقی سا بن جاتا ہے اور چونکہ تعلیم یافتہ لوگوں کے دماغوں میں مستعار خیالات زیادہ ہوتے ہیں اس لیے ان میں ایک قسم کی لٹک یا سنک پیدا ہوجاتی ہے۔ سینما میں جائیں گے تو وہاں ایکٹنگ پر ناک بھوں چڑھائیں گے اور بدقسمتی سے اگر وہاں کوئی ہندوستانی فلم ہے تو بیچارہ ملک بھی تنقید کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ ریل میں بیٹھیں گے تو باوجودیکہ گاڑی کھچا کھچ بھری ہوتی ہے مگر یہ بالکل تنہا ہوتے ہیں۔ بازار میں کچھ خریداری کے لیے جاتے ہیں تو یہ مضمون ان کے لیے بالکل نیا ہوتا ہے۔ اپنے مطالعہ یا علم کے زور سے دکاندار کی ذہنیت کو سمجھنا چاہتے ہیں مگر ان کو اپنی نفسیات دانی کا علم اس وقت ہوتا ہے جب سوداگر سے گھر واپس آتے ہیں۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد کیا بلکہ دوران تعلیم ہی میں انکی توقعات بہت زیادہ ہوجاتی ہیں اور وہ بڑی بڑی خدمتوں کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اس بارہ میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی ہیں کیونکہ عمر عزیز کا ایک بہت بڑا حصہ شبانہ روز کی محنتوں میں صرف کرتے ہیں تب کہیں جاکر سند کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ اب یہاں حکامان مقتدر بھی مجبور ہیں اور وہ جامعات کی اس بڑھتی ہوئی پیداوار کا خواب چالیس روپیہ کی اہلکاری یا مدرسی سے دیتے ہیں تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے۔

بعض نوجوان فطرتًا شرمیلے ہوتے ہیں اور اس لئے سوسائٹی میں بات کرتے ہوئے جھینپتے ہیں یہ ان کی طبیعت کی کمزوری ہوتی ہے جس کا ازالہ امتداد زمانہ کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسے لوگ زندگی میں عمومًا ناکام رہتے ہیں۔

نمود و نمائش کوئی بری چیز نہیں ہے دنیا خود ایک نمایش گاہ ہے یہاں ہر شخص کم و بیش نمایش پسند ہے یعنی عورتوں میں بھی ہوتی ہے اور بچوں میں بھی شہرت اور بزرگی

اسی کی شاخیں ہیں۔ عزت بھی نمائش کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے پھر اگر کوئی جاٹ گوجر رنگروٹ شام کو اپنا سفید کوٹ پہن کر کسی شاہراہ سے لفٹ رائٹ لفٹ کرتا ہوا گزرتا ہے تو قابل معافی ہے۔ نوجوان لوگوں میں نمود و نمائش جو غلو کے درجہ کو پہونچ جاتی ہے تو دراصل یہ ان کی ناتجربہ کاری اور نادانی ہے۔ کاش ہمیشہ ہم ایسے ہی نادان رہتے۔

بڑھاپے کی دانائی لیکر کوئی
بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

ہجری ایک رات

(نظم)

(جناب محشر عابدی صاحب بی-اے)

تاروں کی انجمن ہے فلک پر سجی ہوئی
ناہید پر بھی رقص میں چھائی ہے بیخودی

ڈوبا ہوا سکوں میں ہے ہر ایک ذی حیات
ڈوبی ہوئی سکوت میں ہے نبض کائنات

پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز تھم گئی
چڑیوں کے چہچہانے کی آواز تھم گئی

ساقی، سبو و جام بھی خاموش ہوگئے
پی-پی کے رند غافل و مدہوش ہوگئے

مانا کہ کل جہاں ہے ڈوبا سکون میں
لیکن سکوں نصیب کسے ہے جنون میں

ہنستا ہوں گاہ، گاہ میں ہوتا ہوں اشکبار
اے فرحتِ نگاہ ذرا دیکھ حال زار

ویراں ایک گھر ہے میں جس کا ہوں اک مکیں
مجبور و غمزدہ و پریشان اور حزیں

آتی ہیں یاد تیرے تبسم کی شوخیاں
نظروں میں کوندتی ہیں نگاہوں کی بجلیاں

آتی ہیں یاد عارض گلگوں کی مستیاں
تڑپا رہی ہیں کاکل شبگوں کی مستیاں

آتا ہے یاد روٹھنا تیرا وہ ـــــ باربار
آتا ہے یاد مجھ کو منانا وہ باربار

راتیں وہ حسن و عشق کی تڑپا رہی ہیں اب
باتیں وہ دل لبھانے کی یاد آرہی ہیں اب

کس طرح آئے چین کہ اب چین چھن گیا
کس طرح آئے کل کہ وہ کل ہی نہیں رہا

کروٹ بدل بدل کے مری کٹ رہی ہے رات
تیرے بغیر لطف سے خالی ہے کائنات

یاد آرہی ہیں بزم محبت کی ساعتیں
معصومیت خلوص و عقیدت کی ساعتیں

آتا ہے یاد تیرے چمن کا خرام ناز
اور بارگاہ حسن کا نذرانۂ نیاز

آتا ہے یاد چہرۂ انور کا اضطراب
جس پر پڑا تھا شوخی و طفلی کا اک نقاب

تیرے بہارِ حسن کی یادِ لطیف سے
اٹھتے ہیں دل میں سینکڑوں طوفان آہ کے

کر رحم اب کہ تاب تحمل نہیں رہی
جلد آ کہ اب تو زیست کی صورت نہیں رہی

لبریز صبر و ضبط کا پیمانہ ہوچکا
بیزار زیست سے تیرا دیوانہ ہوچکا

کفرانِ نعمت

جناب مرزا محی الدین بیگ صاحب جنابی بی اے

اگر انسانی زندگی کی اصلی دولت محبت ہے تو واجد اور سلمیٰ مالا مال تھے اور اگر یہ صحیح کلیہ نہیں کہ محبت مرد کو عورت کے روبرو کمزور بنا دیتی ہے اور عورت کو خاوند پر حاوی کر دیتی ہے تو یہ تصور کم از کم ان دونوں کی حالت پر ضرور صادق آتا تھا بالفاظ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ میاں واجد اپنی بیوی کے بن داموں کے غلام تھے۔ نہیں ہم بھولے ابھی انھوں نے سلمیٰ کا زرِ مہر ادا نہیں کیا تھا خیر اسے تو جانے دیجئے ہمیں کہنا یہ ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی نہایت انس اور اخلاص کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے کبھی ایک کو دوسرے کی شکایت کا موقع نہ ملتا تھا بعض کا خیال ہے کہ تعلیمیافتہ بیوی سے میاں کی بہت کم بنتی ہے مگر میاں ہمیں اس سے بھی اتفاق کرتے نہیں بنتی سلمیٰ مشرقی و مغربی علوم سے بہرہ ور تھی، انگریزی کتابوں کی بیحد دلدادہ تھی جب دیکھو کوئی انگریزی کتاب یا رسالہ اس کے ہاتھ میں ضرور نظر آئیگا لیکن بایں ہمہ انتظام خانہ داری اور خاوند کی دلجوئی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی تھی میاں واجد کا شہر کے ایک بڑے دفتر میں امتحاناً تقرر ہو چکا تھا اور انہیں امید دلائی گئی تھی کہ اگر انھوں نے محنت اور دلدہی سے کام کیا تو بعد مرور مدت مستقل کر دے جائیں گے اور مزید ترقی دور نہ ہوگی۔ غرض کچھ ذاتی شوق اور کچھ اس امید نے میاں واجد کو نہایت دردسری سے اپنے فرائض کی انجام دہی پر مجبور کر دیا اور وہ خوشی خوشی روزانہ وقت سے پہلے دفتر پہنچ جاتے اور سب سے

بعد وہاں سے واپس ہوئے۔

سلمیٰ کو کسی اور کی لیاقت پر کچھ ہی اعتراض کیوں نہ ہو مگر واجد کی قابلیت سے اسے کبھی انکار نہ ہوتا تھا۔ اس کی لیاقت کی وہ ہمیشہ مداح ہی رہتی تھی۔ ایک دن آپس میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔

سلمیٰ۔۔۔۔۔ یقیناً تم زیادہ کے مستحق ہو۔ مجھے تعجب تو یہی ہوتا ہے کہ تمھاری لیاقت کا آدمی اتنی کم تنخواہ پر کام کرے۔ دور کیوں جاؤ۔ لطیفہ خاتون کے میاں ہی کو دیکھو لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل مگر تنخواہ کے معاملے میں تو وہ تم سے بڑھے چڑھے ہیں۔ تمھاری جان کی قسم میری آج تک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جب ایسے دو کوڑی کی لیاقت والے آلے ٹلے بیتلے، اتنی اتنی بڑی تنخواہیں اٹھائیں تو تم کیوں اس سے کم رہو اتم کوشش کیوں نہیں کرتے ؟

واجد۔ کیا تم واقعی مجھے زیادہ کا مستحق سمجھتی ہو!

سلمیٰ۔ اے لو "واقعی" کی بھی ایک ہی رہی۔ گویا اس میں شک کی بھی گنجایش ہے۔

واجد۔ دیکھو تم جانتی ہو عبداللہ صاحب کتنے منصف مزاج اور شریف آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں دراصل ترقی کا مستحق ہوں تو وہ ضرور میرا خیال کریں گے۔ مجھے کسی طرح اور کوشش کرنیکی ضرورت نہیں۔ روپیہ آنی جانی شئے ہے۔ آج میرے پاس ہے کل دوسرے کے پاس اس کے لیے میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا پسند نہیں کرتا۔

سلمیٰ۔ (ذرا حقارت آمیز لہجہ میں) اونہہ جیسے ہاتھ پھیلانے ہی کی تو ضرورت ہے۔ تم کو کرنا صرف اتنا ہے کہ خیالات کو ذہنی طور پر یکجا کرو اور پھر ان کا اثر عبداللہ صاحب پر ڈالو لوٹنے بلانے ہاتھ جوڑنے، خوشامد کرنیکی ضرورت ہی کیا ہے۔

واجد۔ یعنے ؟

سلمیٰ۔ یعنے ؟ کیا تم نے سائنٹی فک جرنل" میں کن کسن ٹریشن" پر جو مضمون درج ہے نہیں پڑھا ؟ یورپ والے بھی کیا آسمان کے تارے توڑتے ہیں، یقین جانو مجھے تو ان کی کوشش اور ترقی پر بڑا رشک آتا ہے۔ بچپنے میں جادو ٹونے کے قصے سنا کرتے تھے مگر اب جا کر ان کی حقیقت کھلی، انسان ایک عجیب وغریب پوشیدہ قوت ہے اگر اس سے کام لیا جائے تو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ بخشے ابا جان (ان کی روح ادھر ہی رہے)

کہا کرتے تھے کہ پکا ارادہ ہی آدھی کامیابی ہے۔" تم ذرا اس مضمون کو تو غور سے پڑھو عجیب چیز ہے انسان صرف خیالات کی یکسوئی سے دوسروں کے دلوں میں گھر بنا لیتا ہے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ قوت خدا کی دین ہے۔ اس سے فائدہ نہ اٹھانا، کفران نعمت ہو گا۔ اس سلسلے میں میں تمھاری مدد کرونگی بھائیوں کو بھی سمجھا دونگی ہم سب ملکر تمھاری ترقی کی کوشش کریں گے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ہماری متفقہ کوشش سے عبد اللہ صاحب کی اعلیٰ ضمیر پر نہایت مفید اثر پڑیگا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کوئی مہینہ بھر میں تمھاری مدت ختم ہو جاتی ہے۔ کیوں، ہے نہ۔

واجد۔ ہاں۔

سلمیٰ۔ بس تو یہی موقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ صاحب کو تمھارے کام پر نظر ڈالنے کا کافی موقع نہیں ملا۔ اب ہمارا یہ کام ہوگا کہ ہم اپنی تحریکات ذہنی سے ان کے دماغ پر قابو پا لیں۔

واجد۔ وہ کس طرح ؟

سلمیٰ۔ سیدھا سادہ طریقہ ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، مطلب براری کے لیے دنیا میں اس سے بہتر اور کارگر نسخہ نہیں ہو سکتا۔ اب تم کو سو روپیے مل رہے ہیں لیکن لیاقت اسکی متقاضی ہے کہ تمھیں اس وقت کم از کم دو سو ملیں۔ دو سو نہیں تو ڈیڑھ سو کو تو کہیں آنچ ہی نہیں خیر۔ بس فی الحال ہمیں ڈیڑھ سو پر خیالات کی یکسوئی کرنی چاہئیے۔ میں اپنے خیال میں عبد اللہ صاحب کی تصویر کھینچونگی اور اس سے یہی کہتی رہونگی سمجھے بھی ؟ میں دل ہی دل میں عبد اللہ صاحب سے یہ کہے جاؤنگی کہ تمھیں ڈیڑھ سو ملنے چاہئیں۔ میں بھائیوں کو بھی سمجھا دونگی وہ بھی اس خیالی تصویر سے یہی کہا کریں گے۔ اب رہے تم، تم کو بھی یہی کرنا ہوگا۔ دفتر جاکر جب وقت ملے اسی طرح اپنے خیالات پر بار ڈالکر یقین کے ساتھ یہ کہتے رہو کہ میں ڈیڑھ سو کا مستحق ہوں۔

واجد۔ کو بیوی کی گفتگو میں ہمیشہ لطف آتا تھا۔ ترقی کے معاملہ میں کیونکہ یہ دونوں کی بھلائی کا مسئلہ تھا۔ انھوں نے زیادہ دلچسپی لی۔ اور آخر کار اس تجویز پر کاربند ہونے کا تہیہ کرلیا۔ دفتر جانے اور روزانہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر بیوی کی تحریک کے موافق نہایت

خاموشی کے ساتھ عبداللہ صاحب پر اثر ڈالتے بعض مرتبہ گھنٹہ گھنٹہ بھر وہ اپنی کرسی پر بلاحس و حرکت بیٹھے نہ معلوم کہاں نظر جمائے۔ دل ہی دل میں اپنے ناظم صاحب کی اعلیٰ ضمیر کو اس قسم کے فقروں سے متاثر کرتے رہتے۔

"میں ڈیڑھ سو کا مستحق ہوں" دفتر میں سب سے اچھا ہوں۔ میری وجہ سے دفتر کی شان بڑھی ہے۔ "مجھے ڈیڑھ سو ملنا بھی کم ہے" میں نکل جاؤں تو دفتر کی حالت ابتر ہو میں نے وہ کام کیا ہے کہ جو ہمیشہ یادگار رہیگا۔ "مجھے ڈیڑھ سو ملنے چاہئیں"۔

برادران نسبتی کے دلوں میں بھی اسی قسم کے جملے چکر لگا رہے ہیں۔

"دولہا بھائی ڈیڑھ سو کے حقدار ہیں" "دولہا بھائی دنیا میں یکتا ہیں"۔

دولہا بھائی سے دفتر کی عزت ہے" دولہا بھائی دفتر چھوڑ دیں تو دفتر بند ہو جائے۔ "دولہا بھائی کو ڈیڑھ سو ملنے چاہئیں"۔

سلمیٰ بھی اسی طرح عبداللہ صاحب کے دماغ کو مسخر کرنیکی کوشش کر رہی تھی۔

میاں واجد خوش تھے کہ کامیابی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں کیوں کہ ناظم صاحب غیر معمولی طور پر اہلکاروں کے کمروں میں چلے آتے اور اکثر واجد کی میز کے قریب آن کر ٹھہر جاتے اور نہایت خوش اخلاقی اور کشادہ پیشانی سے گفتگو کیا کرتے۔ اس بدلے ہوے طرز عمل نے واجد کو اور ہمت دلائی اور وہ خوش آئند امید کے ساتھ پہلے سے زیادہ عبداللہ صاحب پر اثر ڈالنے میں منہمک ہوگئے نوبت باینجا رسید کہ وہ دفتر کے وقت کا بڑا حصہ اسی فکر کی محویت میں صرف کرنے لگے۔ اور بعض وقت ان کے منتر کے الفاظ پاس والوں کے کانوں پر بھی پڑ جاتے۔

منصرمی کا آخری دن آگیا۔ ساتھیوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ مستقل سلسلہ دفتر میں موجود ہے مگر اس وقت تک مستقلی اور ترقی کا حکم نہ آنا انہیں تکلیف دے رہا تھا۔ غرض کہ آج وہ ہر آن ڈیڑھ سو کی خبر سننے کے منتظر تھے۔ بارہ بج گئے نہ ناظم صاحب نے انہیں بلایا نہ ان کے بارے میں کوئی حکم جاری کیا۔ ایک بجا دو بجے تین بج گئے مگر کوئی خبر نہیں ملی۔ اب تو میاں واجد کا دل دھکڑ پکڑ کرنے لگا فکر دامنگیر ہوا کہ کل کیا ہونے والا ہے معلوم نہیں آج کیوں کر قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی تشویش میں بیٹھے تھے کہ ناظم صاحب کے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب تو ان سے نہ رہا گیا اور آخر کار شیر کے منہ میں جانیکی ٹھان ہی لی۔ اجلاس کا

پردہ اٹھایا تھا کہ عبداللہ صاحب کا چہرہ نظر آیا اور یہ کچھ رکے۔

ناظم۔۔۔۔۔۔۔۔ آئیے آئیے خوب عجیب اتفاق ہے میں ابھی آپ ہی کو بلانے والا تھا، تشریف رکھئیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک ماہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں نے آپ کا نام اُن لوگوں کی فہرست میں لکھ لیا تھا جس کو میں ترقی کے قابل سمجھتا تھا۔ اس کے بعد جب میں نے آپ کے کام کی غور کے ساتھ جانچ پڑتال شروع کی تو مجھے آپ کی نسبت اپنا خیال بدل دینا پڑا۔

واجد۔ کیا؟ نہیں۔ آپ کا مطلب یہ نہیں کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ناظم۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں میں تصفیہ کر چکا ہوں۔ آپ کی کارگزاری سے ناواقف نہیں میں جانتا ہوں کہ ایک نیک طبیعت آدمی ہیں۔ میری نظروں کے سامنے آپ کا وہ کام بھی ہے جو آپ نے نہایت وردسری اور لیاقت سے انجام دیا۔ میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ مجھے کبھی یہ خیال بھی نہ گزرا تھا کہ آپ جیسا شخص اتنے عرصہ میں اپنی لیاقت اور قابلیت کی نسبت ایک نہایت پوچ رائے قائم کر لیگا۔ چند ہفتوں سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ گویا آپ اپنے جامے میں ہی نہیں سماتے۔ آپ کی بات چیت سے بھی آپکا یہ خبط ظاہر ہونے لگا ہے کہ آپ کے بغیر دفتر نہیں چل سکتا۔ اب مہربان بندہ، گھر تشریف لیجائیے اور تھوڑی کسر نفسی کی عادت ڈالیے اور جس وقت آپ کو اس کا یقین ہو جائے کہ کسی سررشتہ میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے بغیر وہ سررشتہ نہ چل سکے تو آپ نوکری کے لیے نکلئیے جو آپ کی قسمت میں ہے مل جائیگا۔ اچھا خدا حافظ

میاں واجد دفتر سے اٹھ کر گھر آئے بیوی منتظر بیٹھی تھی یہ منہ بنا کر کچھ سوچتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ سلمٰی نے چائے کی پیالی دیتے وقت کہا۔ آخر آج مصیبت کیا ہے کچھ کہتے کیوں نہیں؟ واجد نے قصہ سنایا سلمٰی سنکر کچھ سٹی سی بھول گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ میں سمجھی ہم نے زاید از ضرورت کوشش کی تھی

شہاب کے جب آپ خریدار ہیں اور اس کو عزت مطالعہ دیتے ہیں تو کیا وہ اس قابل نہیں ہے کہ دو ایک خریدار سے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی جائے۔

غزل

جناب ابو الاشرف مجید آغائی ابو العلائی

وفا دشمن جفا جو اور پھر دعویٰ محبت کا — بھلا کیا پوچھنا اس آفت جان بے مروت کا
رہا بعد فنا بھی تیرہ بختی کا اثر باقی — نہ نکلا کام داغ بیکسی سے شمع تربت کا
جمال مہوشاں غارت گر ایماں سہی لیکن — الٰہی چاک ہو جائے نہ پردہ چشم حیرت کا
سکون دل ہے وجہ زندگی ہے راحت جاں ہے — خدا رکھے بڑا احسان ہے درد محبت کا
الٰہی اب تو رکھ لے آبرو شرم معاصی کی — کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا اشک ندامت کا
جو دیتی ساتھ میرا عمر رفتہ بھی تو کیا ہوتا — کہ صبح حشر سے دامن بندھا تھا شام فرقت کا
میرے چاک جگر کو دیکھ کر رہ کے حیرت سے — سلیقہ دیکھتا ہے بخیہ گر بھی دست وحشت کا
ازل سے ساتھ ہے ابتک نہ چھوٹیگا قیامت تک — بہت ممنون ہوں اے درد دل تیری رفاقت کا
ہجوم بیکسی انبوہ غم سامان ناکامی — ہماری شام غربت ہے کہ یہ دن ہے قیامت کا
خبر کس کو ہے نیت کی نگہ تو اتنی کہتی ہے — اثر آئینہ دل میں نہیں گرد کدورت کا
مجید خستہ جاں سے تو زمانہ خوب واقف ہے — وہ دلدادہ مروت کا ہے بندہ ہے محبت کا

ذہین مرحوم

جناب ظفریاب خاں صاحب

حیدرآباد کے نیک نہاد و نیک کردار شاعر مولوی سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہین کی وفات کو کچھ کم (ڈھائی۲) سال ہوئے لیکن اس وقت تک ان کے احباب نے ان کے حالات کے اشاعت کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ چونکہ مرحوم سے مجھے بھی دلی انس اور تعلق تھا لہٰذا اس الزام سے میں خود بھی بری نہیں ہوں اب بعض احباب کے اصرار سے مختصر حالات ذیل میں حوالۂ قلم کیے جاتے ہیں۔

نام ونسب اور ولادت سید غلام مصطفےٰ نام "ذہین" تخلص۔ مولوی سید محمد ابراہیم مرحوم سررشتہ دار عدالت العالیہ کے فرزند ارجمند مولانا سید غلام نبی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے برادر عزیز اور حیدرآباد کے مشہور نقشبندی شیخ طریقت حضرت سکین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرابت قریبہ رکھتے تھے سنہ ۱۲۹۹ھ میں بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔

تعلیم و تربیت تسمیہ خوانی کے بعد ابتدائی تعلیم گھر کی چار دیواری میں ہوئی۔ معمولی استعداد کے بعد بلدہ کی مشہور درسگاہ قدیم "دار العلوم" میں عربی اور فارسی پڑھی اس کے بعد متعدد باکمال بزرگوں کے علاوہ نواب شاد الملک آقا سید علی شوستری اور مولانا ابوبکر شہاب سے بھی استفادہ کیا۔

شادی اور اولاد سن بلوغ کو پہونچتے ہی ننہالی خاندان میں شادی ہوئی اور تھوڑی ہی مدت میں اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے تین لڑکے اور تین لڑکیاں عطا فرمائیں جو بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔ لڑکوں میں سے بعض کی ناہمواری طبع سے اکثر

ملول رہتے اور پر درد لہجہ میں یہ قطعہ پڑھا کرتے تھے

زنان باردار اے مرد ہشیار — اگر وقتِ ولادت مار زائید

ازاں بہتر بہ نزدیکِ خردمند — کہ فرزندان ناہموار زائید

مرحوم کو اُن مصائب کا سامنا تادم زیست رہا جن کو وہ نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ جھیلتے رہے۔

ملازمت شادی اور اولاد نے سولہ یا سترہ سال کی عمر ہی سے فکر معاش میں مبتلا کر دیا۔ دفتر صدر محاسبی میں کچھہ دنوں امیدوار رہنے کے بعد ابتدائی جگہ پر تقرر ہوگیا جہاں ترقی کرتے ہوے نائب منتظم دفتر پیشی ہو گئے اور تاریخ وفات تک اسی خدمت پر مامور رہے۔ کثیر العیالی اور طبعی فیاضی کے باعث آمدنی چونکہ ناکافی ہوا کرتی تھی اس لیے دفتری کاموں سے فرصت ملنے پر خانگی کتابت یا تصنیف و تالیف کا کام اجرت پر انجام دیا کرتے تھے اور اس طرح ان کو ہر روز تقریبًا (پندرہ گھنٹے) دماغی کام میں مصروف رہنا پڑتا تھا اور یہ امر ان کے ضعیف قویٰ کے لحاظ سے لائق تعجب تھا۔

عام اخلاق و عادات اور ہمدردی خلق اللہ نہایت منکسر المزاج اور مجسم اخلاق واقع ہوئے تھے ہر شخص سے جھک کر ملتے اور اسکی دلجوئی میں مصروف ہوجاتے تھے اور اس میں اس قدر غلو کرتے تھے کہ بالآخران کو اس کا سخت خمیازہ اٹھانا پڑتا تھا۔ خلق اللہ کی ہمدردی اور حاجت براری ان کی گھٹی میں پڑی تھی جو شخص بھی آکر ان سے اپنی داستان مصیبت سناتا اور طالب امداد ہوتا امکان سے زیادہ اسکی تکمیل خود بھی کرتے اور اپنے مخلص احباب کو بھی اس میں حصہ لینے کے لیے مجبور کرتے جس میں ان کے اوقات عزیز کا بڑا حصہ صرف ہوجاتا تھا۔ اکثر اوقات یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ اشخاص جو کسی زمانہ میں ان کے ہمسایہ تھے بیمار ہو گئے یا ان پر افلاس و ناداری کی مصیبت آ گئی تو بلا تکلف اپنے پورے کنبہ کے ساتھ ان کے مکان میں آدھمکتے اور تاوقتیکہ اطمینان کی کوئی شکل نہ نکلے ان کے مہمان بنے رہتے تھے مہمانوں کی روزمرہ کی ضروریات کے علاوہ ان کی دوا۔ غذا اور پرہیز کا انتظام بھی انہی کو کرنا ہوتا تھا اور کئی مہینوں کے بعد مہمان جب اپنے گھر جانیکا قصد کرتے تو ان کو مجبور کرکے ایک مہینہ کا غلہ بھی ہمراہ لیجاتے تھے

حضرت ذہین نے ہمدردی خلق اللہ میں جو کچھ بھی نظم کیا ہے وہ ان کے حقیقی جذبات اور خیالات کا آئینہ ہے۔ جس قدر وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اس معاملہ میں دوسروں کو ترغیب و تحریص دلاتے اس سے زیادہ خود بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں

جس قدر ممکن ہو نیکی آج ہی کر لو ذہین
کل کو تم کیا کر سکو گے کل قیامت ہی تو ہے

صحتِ جسمانی افسوس ہے کہ حضرت ذہین کی غیر معمولی محنت اور مصروفیت کی وجہ سے صحت جسمانی ان سے ہمیشہ کوسوں دور رہی۔ وہ تبخیر معدہ میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اور یہ شکایت تا دم واپسیں قائم رہی۔ وہ ہمیشہ پرہیزی اور سادہ غذا استعمال کرتے اور بالکل ایک مرتاض فقیر اور نفس کش زاہد کی طرح زندگی بسر کرتے تھے جس کی وجہ سے بیحد لاغر ہو گئے تھے بایں ہمہ تندرست لوگوں سے زیادہ محنت اور کام کرتے تھے جس پر لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔

ذوقِ شاعری حضرت ذہین فرمایا کرتے تھے کہ انھیں ذوق شاعری زمانہ طالب علمی سے ہے۔ دس بارہ سال کی عمر میں وہ فارسی اور عربی کی نظمیں لکھا کرتے تھے لیکن یہ ذوق اخلاقیات کی حد تک تھا۔ انھوں نے شعراء کے خیالی معشوق کے کوچہ میں کبھی بھول کر بھی قدم نہیں رکھا۔ تحقیق کی جانب طبیعت بیحد مائل تھی اور ایک ایک لفظ کی تحقیق کے لیے انہیں متعدد کتب کی ورق گردانی کرنی پڑتی تھی۔ فارسی میں وہ نواب سنادالملک مرحوم سے اور اردو میں نواب حیدر یار جنگ بہادر "طباطبائی" سے مشورہ کرتے تھے

کلام کی کثرت باوجود اس کے کہ وہ حصول معاش کی خاطر سرکاری فرائض کے انجام دہی کے بعد کئی کئی گھنٹے اجرتی کاموں کی تکمیل میں مصروف رہا کرتے تھے بایں ہمہ ان کے منظوم کلام کے متعدد مجموعے مرتب اور شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی میں شمالی ہند کے ایسے بہت کم علمی رسائل تھے جو حضرت ذہین کے ناصحانہ اور اخلاقی کلام سے اپنے رسائل کو زینت نہ دیتے ہوں۔ اگر اس منظوم کلام کو ایک جا کیا جائے تو غیر معمولی ضخامت کا مجموعہ شائع ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ نثر کا معتد بہ حصہ ان کے نام سے شائع نہ ہو سکا اور مختلف فنون میں انھوں نے جس قدر دماغی کاوش اور غیر معمولی تحقیق سے کام لیا تھا وہ چند بیسوں اور ضروریاتِ زندگی کی خاطر دوسروں کی نذر ہو گیا۔

. . . .

. . . .

"اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے"

علالت اور بخار

وہ کئی سال سے تبخیر معدہ میں مبتلا تھے لیکن آخری زمانہ میں مرض بہت ترقی کر گیا تھا اس کے ساتھ ہی خانگی افکار اور تصنیف و تالیف کی غیر معمولی محنت کی وجہ سے ان کی رہی سہی طاقت جواب دے چکی تھی وہ دماغی مصروفیتوں سے اسی وقت کنارہ کش ہوے جب کہ بالکل فریش ہوگئے۔ ڈیڑھ دو مہینوں تک اس حالت میں مبتلا رہنے کے بعد افسوس ہے کہ دنیا کی سراپا خیر ہستی نے ۱۲ ماہ شعبان المعظم ۱۳۴۹ھ روز جمعہ کو دن کے بارہ بجے داعی اجل کو لبیک کہا اور احاطہ حضرت شاہ مہرالدین صاحب خلیفہ حضرت مولانا شاہ فخر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ واقع نام پلی میں سپرد خاک کیے گئے۔ حضرت امجد نے تاریخ وفات فرمائی جو لوح مزار پر کندہ ہے۔

غلام شفیع الوریٰ مصطفےٰ
سفر کرد سوے جناں از جہاں
دوئی برطرف گل فشاں امجدا
بہ قبر ذہین فصیح البیاں

۱۳ ھ ۴۹

آئندہ فرصت میں انشاء اللہ تعالیٰ حضرت ذہین کے اخلاقی اور ناصحانہ کلام سے ناظرین باتمکین کی ضیافت طبع کی جائیگی۔

شہاب

آپ کا ہے۔ پھر کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ وہ ترقی کرے۔ ترقی کا راز مضامین کی دلچسپی میں مضمر ہے تو پھر توسیع اشاعت کیجیے۔ اس لیے گزارش ہے خریداروں کے بھیجنے کی پابندی فرمائی جائے۔

اردو شاعری پر نقالی کا الزام

(جناب مرزا اسر فراز علی صاحب)

اردو ادب اور اس کے اصناف پر جہاں اور بے بنیاد اور بیجا الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ اسکی خاص صنف یعنی شاعری بھی کئی ناگہانی آفات سے دوچار ہوئی ہے کسی نے اسے عشقبازی اور بد تہذیبی کا ناپاک دفتر ٹھہرایا کسی کی کوتاہ اندیشی اس کے دامن کو قومی سرمایہ سے معرّا ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں برسوں سرگرداں رہی اور کوئی اسے فارسی شاعری کا مرکب قرار دینے پر مدتوں کمر بستہ نظر آیا۔ غرض یہ کہ ع

رنج لاکھوں ایک جی کے واسطے

ادبیات اردو ابتدا ہی سے جا و بیجا اعتراضات کی آماجگاہ بنی رہی حق بجانب اعتراض۔ معترض کی معاملہ فہمی دور اندیشی فطرتی ذکاوت اور ذوق صحیح کا سچا نمونہ ہی نہیں بلکہ وہ شاہراہ ترقی پر خضر راہ کی طرح کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے نام نہاد الزامات جو بغیر سوچے سمجھے عائد کر دیے جاتے ہیں نگینہ ہیں مگر جھوٹے اور عالیشان حویلیاں ہیں لیکن کاغذی اور سچ پوچھو تو بے بنیاد اعتراض دلیل ہے معترض کے خلل دماغ کی۔ ہمارا موضوع بحث۔ اردو شاعری پر نقالی کا الزام۔ جواب ہے اس اعتراض کا جس میں معترضین نے اردو پر ادبیات ایران کے نقبازنی کی فرد جرم لگائی ہے۔ اب ہم اردو اور فارسی شاعری کا مختصر سا موازنہ کرتے ہوئے ان دونوں زبانوں کے باہمی تعلق پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالینگے اور اگر ان کی خاص صنف شاعری

میں قابل لحاظ مشابہت کا پتہ چل جائے تو اس کی توجیہ و تشریح بھی کر دیں گے دونوں زبانیں مشرق کی سرزمین میں پیدا ہوئی ہیں اس لیے دونوں کے رجحانات مشرقی رسم و رواج اور تمدن و تہذیب کا مرقع ہیں۔ دونوں کو آبائی خاندان السنہ سے قریبی تعلق ہے لہٰذا یہ ہر صنف سخن میں ایک دوسرے کے ہم شبیہ نظر آئیں تو کیا عجب دونوں کی شاعری مختص ہے ایک ہی ردیف و قافیہ پر ایک ہی طرز و اسلوب بیاں پر اور دونوں میں ایک ہی نوع کی تشبیہات تلمیحات، کنایات، استعارات اور اوزان و بحور مستعمل ہیں۔ ہمارے اس بیان سے ایک اعتراض کا قرینہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ جب ان دونوں میں اس قدر مشابہت پائی جائے اور فارسی کی قدامت اردو کے مقابلہ میں مسلم ہو تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اردو کا تمام کا تمام سرمایہ نتیجہ ہے فارسی کی خوشہ چینی کا لیکن نہیں۔ ارباب ذوق ہرگز عجلت پسندی پر اصل حقیقت کی بھینٹ نہیں چڑھاتے وہ تصویر کے ہر رخ پر نظر ڈال لیتے ہیں تب کہیں اس کے متعلق کوئی خاص رائے قایم کی جاتی ہے اور اس کے حسن و قبح کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہم اس اعتراض کے جواب میں اردو کی ابتدائی تاریخ کو باختصار پیش کر سکتے ہیں اردو کا جنم بھوم ایشیا کا شہرۂ آفاق خطہ یعنے ہندوستان ہے اور جب یہ وجود پذیری ہوئی تو یہاں کی دو رائج الوقت زبانوں نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ میری مراد ہندی اور فارسی سے ہے جنھیں اردو کا مائی باپ کہا جائیگا تو بیجا نہ ہوگا۔ دونوں نے اسے پالا پوسا بڑا کیا اور اب یہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو ایک آزادانہ حیثیت کی حامل نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ہندی کی بہ نسبت فارسی کی زیادہ ممنون احسان ہے وجہ یہ ہے کہ اردو ہمعصر ہے اس عہد کی جب کہ فارسی کو نہ صرف ایران بلکہ ہندوستان میں بھی انتہائی عروج حاصل ہو چکا تھا۔ ملکی زبانوں میں سوائے اس کے کسی اور میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ اس نوزائیدہ زبان کے شعرا اور انشا پرداز ان کے اسلوب کی پیروی کرتے۔ ظاہر ہے کہ سنسکرت تقریباً مردہ ہو چلی تھی اور ہندی باوجود خاص خاص خوبیوں کے فارسی سے سربرا نہ ہو سکتی تھی۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اردو نے فارسی کی محض نقالی کی ہے بلکہ اس نے اس زبان سے جو کچھ بھی لیا ہے وہ خیانتاً نہیں بلکہ وراثتاً لیا ہے اور اسی حد تک جو باوثوق ذرائع سے جواز کی دعویدار ہو۔ فی زمانا

ہر زندہ اور ترقی یافتہ زبان نے بھی اس طرز عمل کو روا رکھا ہے۔ چنانچہ انگریزی ادب میں ادبیات یونان و روما کا جزو بخوبی ظاہر و واضح ہے۔ مغرب کے فطرت نگار شاعر اور انشا پرداز شکسپیر کے کلام پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس نے صنمیات یونان اور مذہبی روایات سے بے شمار مقامات پر کام لیا ہے! مندرجۂ بالا بیان سے ہم یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ اردو شاعری کی ارتقا میں فارسی کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن فارسی کی نقل کا دھوکہ نتیجہ ہے۔ معترضین کی غلط فہمی کا ظاہر ہے کہ نقل کا بہت دنوں تک کارگر ہونا ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے اور اردو جیسی زندہ زبان کا دامن اس عارضی دھبہ کو کبھی کا محو کر چکا ہے۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ ابتدا میں بعض شعراء نے فارسی شعراء کے خیالات کو اضعافاً مضاعفاً اردو میں متبدل کر دیا تھا اور ہندوستانی شاعری میں ایرانی فضا پیش کی تھی لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ چیزیں ابتدائی تھیں۔ اور اس تصرف کے قوی وجوہ قدیم شعراء کے ہاں موجود بھی تھے۔ پہلے تو یہ کہ اس زمانہ میں فارسی شاعری بدرجہ اتم ترقی پا چکی تھی دوسرے یہ کہ ہندوستان کی فضا میں فارسی بس چکی تھی اور اردو شعراء میں تین چوتھائی ایسے تھے جنھیں نہ صرف فارسی پر کافی عبور حاصل تھا بلکہ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ جتنے بھی مضامین انھوں نے ادبی دنیا میں چھوڑے ہیں مناسب موقعوں پر کبھی تو انھیں اردو کا جامہ پہنایا ہے اور کبھی فارسی کا۔ اگر اردو کا مطمح نظر نقالی ہوتا تو اس کی مقصد برابری کی قابلیت فارسی سے کہیں زیادہ عربی میں موجود تھی چنانچہ اس زبان کی وسعت و عالمگیری محتاج بیان نہیں ہے۔ خود فارسی شعراء نے عربی سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور اس وقت تک جب کہ ایرانیوں کو قدامت پسندی کا خیال پیدا نہ ہوا تھا فارسی بعد اسلام عربی کا مرکب نظر آتی تھی اور پہلوی یا قدیم فارسی ایرانی ادب سے محو ہوتی جا رہی تھی۔ فردوسی نے شاہ نامہ میں عربی الفاظ کے استعمال سے بہت کچھ احتراز کیا ہے لیکن باوجود اس احتیاط کے اسے مجبوراً ایسے کئی ہزار الفاظ کا منت کش ہونا پڑا۔ اردو اور فارسی شاعری کے توارد کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں زبانیں اپنی اپنی ابتدا میں ایک ہی قسم کے ماحول کو طے کرتے آگے بڑھی ہیں۔

جہاں فارسی نے اپنے عہد طفولیت میں ترکوں کی خون آشامی کا نظارہ کیا تھا اردو نے بھی مغلیہ سلطنت کے زوال مرہٹوں اور راجپوتوں کی ترک تازیوں اور فرنگیوں کی دست برد سے بہت کچھ سبق سیکھے تھے۔ یہی وجہ تھی جسکی بنا پر دونوں جگہ کی شاعری میں حسرت و ویرانی کے مضامین زیادہ دستیاب ہوتے ہیں اس پر آشوب زمانہ میں مناظر قدرت کی تصویر کشی شاعر کے حیطۂ امکان سے باہر تھی اپنے اشعار میں ان شعرا نے ترک دنیا کی تلقین کی ہے یا زاہدان خشک پر برس پڑے ہیں۔ یا معشوق کے سراپا اور اس کے اوصاف سے اپنا دل بہلایا ہے۔ ظاہر ہے نہ خواب عشق زندگی کے ہر منزل میں انسانی قبیل اور خصوصاً شاعروں کی رفاقت پر ہر لمحہ کمر بستہ نظر آتے ہیں۔ فارسی اور اردو شعرا نے بھلا اس زمانہ میں اپنے معشوق کو نہیں بھلایا چنانچہ انھوں نے اپنے ماحول کے مطابق محبوب کی بے توجہی اور حسن و عشق کے غارتگرانہ اثرات کو پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ امر انھوں نے اسے ایسا ہی پریشان کن بتلایا ہے جیسے چنگیز خانی حملے یا دہلی کا غدر۔

حافظ۔ فغان کیں لولیان شوخ و شیرین کار شہر آشوب / چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغمارا

غالب۔ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے / اسکی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

سودا۔ نہ کھینچو تیغ ہر اک دم تمھارے عشق سے گزرے / ملینگے اور سے جا کر جو اپنا سر سلامت ہے

تاباں۔ میں خواب میں دیکھا ہے اسے مہندی لگاتے / کیا جانے کس کس کا لہو آج بہے گا

گو امر اورنگ زیب کے وفات کے بعد دلی کی شان اور تبختر جاتا رہا اور وہ دلیرانہ باتیں اور متانت رخصت ہو چکی تھی تاہم اردو شاعری نے باوجود ان مشکلات کے جو کمال دکھایا ہے وہ اردو ادب کے لیے باعث ناز ہے۔ اردو شاعری پر ایک اور اعتراض عاید کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اس میں ناٹک کا فقدان ہے لیکن قبل اسکے ہم اس کا کوئی جواب دیں معترضین سے پوچھتے ہیں کہ انگریزی شاعری میں غزل قصیدہ اور رباعی جیسے اصناف سخن کیوں مفقود ہیں بحث طولانی ہے اور موضوع سے دور ہونے کے خیال سے اسے یہیں پر ختم کر دیا جاتا ہے اعتراضات کی بوچھاڑ نہ صرف اردو ادب پر ہوئی ہے بلکہ ہر ملک اور ہر قوم کے ادبیات کو اس سے سابقہ پڑا ہے۔ گولڈ اسمتھ اپنے مقالات میں تحریر کرتا ہے

کہ اس کے زمانہ میں چند افراد نے مشہور انشا پردازوں اور شعراء کو بدنام کرنا اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا اور وہ اس مقصد کے تحت دل کھول کر پیسہ خرچ کرلتے اور مشقت اٹھاتے تھے۔

غزل

جناب محمد حیدر حسن صاحب نشتر

تم اپنی آنکھ سے پوچھو جو اعتبار نہیں
یہ جام جب سے چلا کوئی ہوشیار نہیں

مٹا ہوں یوں کہ کہیں بھی مرا مزار نہیں
یہ یادگار ہے میری کہ یادگار نہیں

نگاہ مست کی بیہوشیوں میں راحت ہے
میں ہوش میں اگر آؤں تو ہوشیار نہیں

قسم ہے کوندتی بجلی کے بیقراری کی
وہ دل ہے سینہ میں جسکو کہیں قرار نہیں

نہ الٹے پاؤں چلی آئے جان بھی میری
کہو نہ قبر پہ آکر کہ بیقرار نہیں

تمھارے وعدہ پہ ٹھہری ہے زندگی میری
وہ وعدہ جس کا تمھیں خود بھی اعتبار نہیں

میں جان و دل تمھیں کہتا ہوں اور ڈرتا ہوں
یہ جانتا ہوں کہ دونوں کا اعتبار نہیں

شراب پیتا ہوں لیکن تمھارے ہاتھوں سے
گناہ کرتا ہوں پھر بھی گنہگار نہیں

تبسم لب وعدہ یہ صاف کہتا ہے
قسم خدا کی کوئی عہد استوار نہیں

طریق عشق میں نشتر امید لطف و کرم
خزاں کا دور ہے جا جا یہاں بہار نہیں

شانِ نزول

جناب مفسٹو

چند ہی روز قبل میرے ایک غالب پرست دوست نے احباب کی محفل میں یہ شعر مترنم آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئی
اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

میرے ایک مغرب زدہ دوست بھی تشریف فرما تھے وہ اس شعر کی گرانی کو برداشت نہ کرسکے اور بلند آواز میں کہا کیا واہیات شعر ہے۔ اس میں نہ تو زبان کی خوبی ہے اور نہ معنی کی۔ "اسد اِس جفا پر بتوں سے وفا کی" والا شعر اس سے کہیں بہتر ہے۔ ہمارے غالب زدہ دوست سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے جوش میں آکر کہا۔ "جناب آپ کیا جانیں اس شعر میں کتنی خوبیاں ہیں کچھ روز اردو ادب کا مطالعہ کیجئے پھر آپ غالب کو سمجھ سکینگے۔

یورپ زدہ دوست نے جواب دیا معاف فرمایئے میں اس مسئلہ کے معنی و مفہوم سے آپ سے زیادہ واقف ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی بتلا سکتا ہوں کہ شاعر نے کن حالات میں کس جذبہ کے تحت اور کس وقت یہ شعر کہا۔

غالب پرست دوست نے کہا اچھا فرمایئے تو اسکے کیا معنی ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ نہ بتا سکینگے اس لیے کہ آپ کو انگریزی شاعروں اور ادیبوں کی خدمت سے فرصت ہی کہاں جو آپ اردو فارسی کی طرف متوجہ ہوں"۔ یورپ زدہ دوست نے نہایت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ جناب عالی غالب کا یہ شعر ایک دقتی جذبہ کی پیداوار ہے۔ میرے معاشیات کے

پروفیسر نے زرکاغذی کی بحث کے دوران میں اس کی تشریح اس طرح کی تھی:۔
غالب نے ایک روز بھری محفل میں اپنے معشوق سے کہا تھا کہ اس کی "بزم ناز" غیر سے خالی ہونی چاہیئے۔ اس پر برافروختہ ہو کر اس ستم ظریف معشوق نے خود اس کو اٹھا دیا اور دربان کو تاکید کر دی کہ وہ پھر اس محفل میں داخل نہ ہونے پائے۔

غالب بڑا ہوشیار اور ذکی آدمی تھا اپنے کپڑے وغیرہ اتار کر ایک گدھے کا چمڑا پہن لیا اور دونوں ہاتھ ٹیکتے ہوئے جانور کی طرح چلکر معشوق کے دروازہ پر پہونچا۔ دربان نے گدھا سمجھ کر نہ روکا۔ لیکن جاتے جاتے کمبخت کو دربان کا شکریہ ادا کرنے کا خیال پیدا ہوا اور ساتھ ہی اس کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ دربان بھی ہوشیار آدمی تھا فوراً پہچان گیا کہ وہ گدھا حیوان نہیں بلکہ "خر انساں نما" تھا اور لگا اس کو پیٹنے۔
اتنے میں غالب کی آنکھ کھلی اور یہ شعر ان کی زبان پر تھا جس کو حالی نے جو انکی بیداری کا انتظار کر رہے تھے اس طرح نقل کیا ؎

گدھا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

غالب کا دیوان چھپنے لگا تو کاتب نے خیال کیا کہ اتنے بڑے آدمی کے کلام میں گدھے کا کیا ذکر لہٰذا گدھے کو گدا بنا دیا۔
ہمارے غالب پرست دوست آگ بگولہ ہو گئے۔ لیکن کر لیتے کیا۔ حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

دیہاتی زندگی

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے امرتسری

سوار سر پہ تھا میرے جنونِ سیر و شکار
کہ یہ بھی دنیا میں بیکاروں کے لیئے ہے کار

نکل گیا میں بہت دور تک تھک گیا لیکن
دکھائی دیتے تھے نزدیک گاؤں کے آثار

یہ جی میں آیا چلو آج چل کے دیکھیں تو
گذرتے کیسے ہیں ان بستیوں کے لیل و نہار

جو دیکھا میں نے مرقع تھا ایک عبرت کا
تھی خاکِ راہ گذر سرمۂ اولوالابصار

سنا ہوا تھا زمانہ کا جو نشیب و فراز
دکھا رہی تھی وہ آنکھوں کو راہ ناہموار

غبار اٹھا پئے احترام و استقبال
کہ مہمان کی تعظیم کا ہے عام شعار

کچھ اور آگے بڑھا پاؤں چومے کیچڑ نے
ہر اک قدم پہ تواضع تھی بالغ رفتار

تھا چاک سینہ کسی دلفگار کا گلیاں
کسی بخیل کے دل سے تھے تنگ تر بازار

گھروں کا حال نہ پوچھو عجیب نقشہ تھا
کہ منفعل ہے یہاں پر تخیل معمار

بتائے کون ہے رازِ درونِ خانہ کیا
ہوا یہ جب نہیں ہوتے ہیں منکشف اسرار

مداخلت کی نہیں آفتاب میں ہے تاب
کہ دن کو خوابِ شبِ تار کا ہے یہ گہوار

کشادہ صحن میں ہے رشک جن پہ صحرا کو
اور ان میں سلسلۂ کوہ اپلوں کا انبار

ذخیرہ اتنا ہے کثرت سے سقف خانہ پر
مگر ہیں زیورِ بام اور زینتِ دیوار

یہ اپلے چشمۂ خورشید سے ہیں چشمک زن
کہ ان کی آگ سے ہر گھر میں گرم ہے بازار

یہ رنگ روپ میں ہیں کشت زعفراں کے پھول
خطا نہیں جو انھیں کہیئے نافہ ہائے تتار

گماں یہ ہوتا ہے چیچک کے یہ پھپولے ہیں
دماغ خانہ کو یا عارضہ خلل کا ہے
یہی ہجوم خیالات تھا میرے دل میں
کہ اتنی دیر میں لوگوں نے مجھ کو دیکھ لیا
کہا یہ میں نے کہ اے ساکنان دشت جنوں
سمجھتے تم ہو کہ دنیا میں ہم بھی زندہ ہیں
زمانہ اوج پہ اور تم ہو قعر پستی میں
خبر نہیں ہے سیاہ و سفید کی تم کو
زمانہ حرف غلط کی طرح مٹا دیگا

لپٹ کے رہ گیا دیوار و در سے ہے آزار
کہ سایہ دیو سیہ کا ہے برسر دیوار
زباں پہ کلمۂ لاحول و حرف استغفار
اکھٹے ہوگئے چاروں طرف صغار و کبار
بُرا نہ مانو تو وحشت کے ہیں یہ سب آثار
یہ زندگی ہے کہ جس سے ہے زندگی کو عار
زمانہ برسر اقبال تم پہ یہ ادبار
تو سمجھو مٹ گئے تم گرا یہی ہیں لیل و نہار
تمھارے صفحۂ ہستی سے ایک دن آثار

دنیا کے تمام تیل ایک طرف

اور

نظام وجیٹبل ہیر آئل ایکطرف

تجربہ بتائیگا کہ

یہہ آواز ہماری نہیں بلکہ درحقیقت آپ ہی کی ہے

ہر جگہ ملسکتا ہے

انگلش پیکنگ تیار کردہ

دکن ہیر آئل کمپنی

حیدرآباد دکن

کراؤن سیاهیان

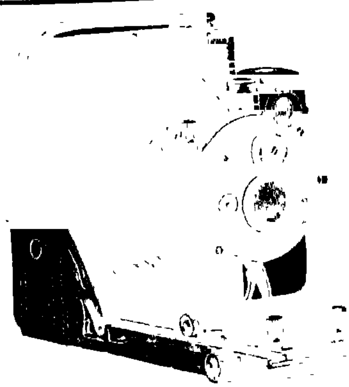
یورپ کے جدید ترین اصول پر تیار
ہوتی ہیں انکی خوبیاں استعمال ہی
سے ظاہر ہوں گی۔

تیار کردہ

کراؤن انک فیکٹری

سڑک اعظم جاہی حیدرآباد دکن



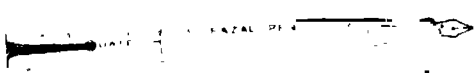


تقریب ملاقات

کیلئے کیمرہ سے بہتر اور کوئی ذریعہ
نہیں۔ اس کا اپنے پاس رکھنا گویا
سوسائٹی میں اپنا آپ تعارف کرانا ہے
یہ نہایت سحر آفرین کرے ہے۔ لطف
یہ ہے کہ ارزان عمدہ خوشنما پائدار

مہتا برادرس فوٹو گڈس ڈیلرس

رزیڈنسی حیدرآباد دکن



فضل فونٹن پن

نہایت خوشنما رنگین یورپ سے
شوروم کے لئے منگوائے گئے ہیں
جسکی بیحد مانگ ہے قیمت ارزان
چار روپیہ ۸ آنہ علاوہ اخراجات
پتہ صادر کا سامان بھی موجود ہے

فدا علی محمد علی اینڈ سنس

اسٹیشنری مرچنٹ

پتھرگٹی حیدرآباد دکن

ٹیلیفون ۷۶۵

چندر کانت پریس